معالم القرآن

جلد ہشتم

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

علم وکتاب واٹس ایپ گروپ

نام کتاب : ـــــــــــ معالم القرآن

ملکیّت : ـــــــــــ ادارہ تعلیمات قرآن سیالکوٹ

عناوین : ـــــــــــ ۲۴۴-

آیات : ـــــــــــ ۱۴۲-

طابع : ـــــــــــ محمد شریف مولوی فاضل

تزئین و آرائش : ـــــــــــ سیّد محمد انور حسین نفیس رقم لاہور

کتابت : ـــــــــــ محمود احمد صوفی گوجرانوالہ

ناشر : ـــــــــــ قاری عبدالرحمان - ایم۔ اے

صفحات : ـــــــــــ ۶۳۲-

تاریخ اشاعت : ـــــــــــ رجب المرجب ۱۴۰۱ھ مطابق مئی ۱۹۸۱ء

مطبوعہ ـــــــــــ زاہد بشیر پرنٹرز لاہور

قیمت : ۵۴ روپے

انتساب

میں تفسیر معالم القرآن کی آٹھویں جلد کو جس میں اُمّت کو دین کی تکمیل کی خوشخبری سُنا کر رہتی دُنیا تک قوامیّت اور شہادت علی الناس کے منصبِ جلیل پر فائز کیا گیا ہے قابلِ صد احترام جناب الحاج سراج الدّین صاحب (ولد محمد بخش صاحب) والد حاجی عبدالغنی صاحب سلّمہُ اللہ تعالیٰ گوجرانوالہ کے نام منسوب کرتا ہوں جن کی قرآن کی اشاعت میں ڈوبی ہوئی مخلصانہ دریا دلی سے یہ جلد زیور طباعت سے آراستہ ہو رہی ہے۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس جذبۂ خیر کو تا دیر قائم رکھے اور ان کے لیے دُنیا اور آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بنائے۔ آمین ثمّ آمین۔

قاری عبدالرحمٰن ایم۔اے
ناظم ادارہ تعلیمات قرآن سیالکوٹ

دریا بحباب اندر

حرفِ آغاز

باسمہ تعالیٰ

یہ معالم القرآن کی آٹھویں جلد ہے

اگرچہ اس بار کچھ تعلیمی اور انتظامی مصروفیتوں کی وجہ سے کام میں کچھ رکاوٹ ہوئی لیکن اس کے باوجود الحمد للہ آٹھویں جلد مکمل ہو گئی ۔

اس جلد میں مجھے جن علمی گہواروں سے استفادہ کرنے کا موقعہ ملا ہے ان کے نام یہ ہیں ،

۱۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ	ازالۃ الخفاء
۲۔ حضرت حافظ ابن تیمیہؒ	اقتضاء الصراط المستقیم
۳۔ رسائل الارکان	علامہ بحر العلوم
۴۔ ترجمان السنہ	مولانا بدر عالم میرٹھی
۵۔ منصب امامت	حضرت مولانا اسماعیل شہید
۶۔ شفاء العلیل	حافظ ابن القیمؒ
۷۔ حادی الارواح	"
۸۔ جامع العلوم والحکم	حافظ ابن رجب حنبلی
۹۔ معالم السنن	علامہ خطابی
۱۰۔ الکاشف عن حقائق السنن	علامہ طیبی

یہ جلد آٹھویں پارے کے مطالب اور تشریحات پر مشتمل ہے ۔

اصحاب علم کی طرف سے اس ناچیز خدمت کی جو پذیرائی ہوئی ہے وہ میری توقعات سے بہت زیادہ ہے ۔ میں اس کے لیے اپنے مولیٰ و آقا کا شکر گزار ہوں اور اس کی بارگاہ میں دست بدعا

ہوں کہ وہ باقی قرآن کی تشریح و تفسیر میں میرے ذہن اور قلم کو جادۂ حق پر استوار رکھے اور اس تفسیر کو خلق خدا کے لیے نافع اور میرے لیے ذریعۂ نجات بنائے۔ میں نے اس تفسیر میں کوشش کی ہے کہ مدرسۂ شاہ ولی اللہ کی علمی امانت سفینوں سے نکال کر لوگوں کے سینوں تک پہنچا دوں۔ میری دلی آرزو یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ مجھے اس کوشش میں کامیابی عطا فرمائے۔ کتاب کی ظاہری خوبیوں میں جو کمی ہے تو اس کا تعلق دفتر انجمن دارالعلوم الشہابیہ سے ہے۔ میرے نزدیک دفتر سزاوار ملامت ہرگز نہیں، وہ اس کوچے میں بالکل نووارد ہے۔

بہر حال جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ میں قرآن کو سمجھ سکا ہوں اس کی سوغات آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اور اس جذبے کے تحت پیش کر رہا ہوں کہ آئندہ کے کام کے لیے میری حوصلہ افزائی کریں۔

والسلام

محمد علی الصدیقی
دارالعلوم الشہابیہ، شہر سیالکوٹ

مقدّمہ

انسان قرآن کے نقطۂ نظر سے صرف حیوان ناطق نہیں ہے بلکہ وہ روح اور جسم کے مجموعہ کا نام ہے۔ وہ روح کے تقاضے اور جسم کے مطالبات دونوں لے کر آیا ہے اس لیے قرآن انسان کے ان دونوں تقاضوں کا جواب ہے۔ روح کے تقاضوں کی بہم رسانی کی خاطر قرآن آئین پرستش ہے اور جسم کے مطالبات کی پاسبجائی کے لیے قرآن دستور بندگی ہے۔ آئین پرستش ہونے کی حیثیت میں قرآن ذکر ہے اور دستور بندگی ہونے کی حیثیت میں قرآن ہدیٰ ہے۔

یاایہا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ، مسلمانو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ پورے داخل ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ قرآن کو آئین پرستش اور دستور بندگی کی حیثیت سے قبول کرو یہ نہ کرو کہ اسے آئین پرستش تو مانو مگر دستورِ بندگی نہ مانو۔ یا دستورِ بندگی تو مانو مگر آئین پرستش نہ مانو۔ اگر صرف آئین پرستش مانوگے تو عیسائیوں کی ضلالت کا شکار ہو جاؤ گے۔ اور اگر صرف آئین بندگی مانو گے تو یہودیوں کی طرح مغضوبیت کا نشانہ بن جاؤ گے۔ ضروری ہے کہ دونوں کو اپناؤ کہ الذین انعمت علیہم کی راہ ہے اور اسی کا نام صراط مستقیم ہے۔

پرستش اللہ سبحانہ کی محبوبیت کا تقاضا ہے جب کہ بندگی اللہ سبحانہ کی حاکمیت کا تقاضا ہے صحیح اسلامی زندگی بسر نہیں ہو سکتی جب تک مسلمان اپنے عمل کی وحدت میں ان دونوں کو حل نہ کرے یہی وجہ ہے کہ قرآن نے یہودیوں اور عیسائیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کو اُمتہ وسطاً کے لقب سے سرفراز فرمایا ہے۔ وسط کے لفظی معنے درمیان کے ہیں لہٰذا اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ایک ایسی اُمت ہیں جو ٹھیک ٹھیک جادۂ اعتدال پر گامزن ہیں۔ یہ نہیں کہ پرستش ہی کو اپنا کر بندگی کو خیرباد کہہ دیں اور یہ بھی نہیں کہ بندگی کو لے کر پرستش سے بیگانہ زندگی بسر کریں بلکہ پرستش اور بندگی کے مجموعہ کو لے کر زندگی گزارتے ہیں۔ قرآن نے ان دونوں کو

اپنے مخاطبوں کے سامنے اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ان دونوں میں جدائی ممکن نہیں۔ بازار کی شورشیں ہوں یا میدانِ جنگ کے ہنگامے قرآن مسلمانوں کو پرستش سے کہیں بیگانہ دیکھنا نہیں چاہتا۔

اس سورت میں بنیادی موضوع اگرچہ بندگی ہے لیکن قدم قدم پر پرستش کا ذکر کیا گیا ہے اس پارے کے آغاز میں بندگی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے۔

و لئن اطعتموھم انکم لمشرکون اگر تم نے ان کی اطاعت کی تو تم شرک کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ الغرض اسلام پرستش اور بندگی پر مشتمل ایک مکمل وحدت یا کلیت ہے جس کا کوئی جزو دوسرے جزو سے الگ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جدائی کی صورت میں کوئی جزو اپنی زندگی برقرار نہیں رکھ سکتا ہر جزو کی قیمت اور ہر پہلو کی صداقت اسی وقت تک قائم ہے۔ جب تک مجموعی کلیت سے اس کا رشتہ استوار ہے۔ اسی لیے اسلامی نظام حیات میں باہر سے کسی جزو کا پیوند نہیں لگایا جا سکتا۔ نہ پرستش میں رہبانیت کا اور نہ بندگی میں اشتراکیت، جمہوریت یا آمریت کا۔ جو لوگ اسلامی نظام میں بندگی کا ڈانڈا اشتراکیت یا جمہوریت یا آمریت سے ملانا چاہتے ہیں ان کی سب سے بڑی کوتاہ فہمی اور کم نظری یہ ہے کہ وہ اس کے اجزاء کو کل سے علیحدہ کر کے دیکھنا چاہتے ہیں اور اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اسلام ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے جس کا ایک جزو دوسرے جزو سے مربوط اور ہر پہلو دوسرے سے ہم رشتہ ہے۔ جہاں یہ ربط و ہم رشتگی ختم ہوئی ہر جزو بجائے خود بے قیمت ہو گیا۔ قرآن نے نظامِ بندگی کی حیثیت سے اپنے بارے میں یہ بات واشگاف طور پر بتائی ہے

ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم

بلاشبہ یہ قرآن رہنمائی کرتا ہے اس راہ کی جو سب سے زیادہ سیدھی ہے۔

اس لیے بندگی کی حد تک اس میں پیوند کاری کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ ایک دوسرے موقعہ پر ارشاد ہوا ہے:

اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتاب یتلی علیھم

کیا ان کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب اتاری ہے جو ان کے سامنے پڑھی جا رہی ہے۔

اس میں اسی حقیقت کی طرف اشارا ہوا ہے کہ قرآن کی موجودگی میں انسان کو کسی کتاب کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت امام بخاری نے سفیان بن عیینہ کے حوالہ سے انکشاف کیا ہے کہ اس ارشادِ نبوت لیس منا من لم یتغن بالقرآن کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ قرآن لے کر

سب کتابوں سے مستغنی نہیں ہوتا وہ ہم سے نہیں اگرچہ دوسرے علماء کو امام بخاری کے اس مطلب سے اتفاق نہیں لیکن بات سفیان بن عینیہ کی ہے اور پیش کرنے والے امام بخاری ہیں اس لیے اس سے بے رُخی نہیں برتی جاسکتی ہے۔

بہرحال اس سورت کا اصلی موضوع اللہ کی بندگی ہے لیکن یہ قرآن کی خصوصیت ہے کہ وہ بندگی کو پرستش سے علیحدہ کر کے پیش نہیں کرتا اس لیے قدم قدم پر پرستش کا ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ یہی دونوں کی ہم آہنگی ہے کہ سورت کے انجام میں بندگی کے موضوع پر یہ انکشاف فرمانے کے بعد انني هداني ربي الى صراط المستقيم دينا قيما ملة ابراهيم حنيفا" ، فوراً پرستش کے بارے میں فرمایا ان صلاتي و نسكي و محياي و مماتي لله رب العالمين لا شريك له فاموت ان اكون من المسلمين۔ جیسے پرستش میں ملاوٹ یعنی خدا کے علاوہ عالم غیب میں دوسروں کو معبود بنانا اور ان کے سامنے انتہائی ذلت اور مسکنت کا اظہار ان کے سامنے سجدہ ریزی ان سے دعا اور مدد کی طلب اور ان کے لیے نذر و نیاز عالمگیر جاہلیت ہے ایسے ہی سادہ اور کرار کی اطاعت، ان کی فرمانبرداری بھی نوعِ انسانی کی پرانی کمزوری ہے جو زندگی کے تمام مراحل، تغیرات اور انقلابات میں نوعِ انسانی کے پیچھے لگی رہتی ہے۔ اللہ کی غیرت اور اس کے غضب کو بھڑکاتا ہے۔ بندوں کی روحانی، اخلاقی اور تمدنی ترقی کی راہ کا روڑا بنتا ہے۔

یہی وہ دعوتِ توحید ہے جو انبیاء کی دعوت کی خصوصیت ہے۔ اللہ کی پرستش اور صرف اس کی بندگی کی دعوت ہر زمانہ اور ہر حال میں نبوت کی پہلی دعوت اور اس کا سب سے بڑا مقصد رہا ہے۔ ہمیشہ نبوت کی یہی تعلیم رہی ہے کہ اللہ ہی عبادت، دُعا، توجہ اور قربانی کا مستحق اور اللہ ہی کی ذات انسانوں کے لیے حلال و حرام کا حق رکھتی ہے۔

ان لا نعبد الا الله ولا نشرك به شيا ولا يتخذ بعضنا بعضا" اربابا من دون الله۔

اگر آپ کو قرآن سے کچھ بھی تعلق ہے تو آپ کو بدیہی اور یقینی طور پر یہ بات معلوم ہوگی کہ پرستش اور بندگی میں شرک کے خلاف صف آرائی اس سے جنگ کرنا، اس کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کرنا، اور انسانی زندگی کو اس کے چنگل سے نجات دلانا نبوت کا بنیادی مقصد تھا۔ نبوت کی دعوت کی اصلی غرض، ان کی دعوت کی اساس، ان کے اعمال کا منتہی اور ان کی جدوجہد کی غایت اصلی تھی۔ اور یہی ان کی زندگی اور ان کی دعوت کا اصل مرکز تھا۔ ان کی سرگرمیاں اس کے اردگرد

گھومتی تھیں۔

اس پارے میں انبیاء کی دعوتوں میں یہی بنیادی نقطۂ نظر بول رہا ہے۔ ایک طرف وہ اگر پرستش میں شرک کے خلاف لوگوں کو ملامت کر رہے ہیں تو دوسری طرف بندگی میں شرک کے خلاف لوگوں کو سمجھا رہے ہیں الا لہ الخلق والامر فرما کر پرستش اور بندگی کا اصولی استحقاق اللہ کے لیے ثابت کرنے کے بعد پرستش کی حد تک ادعوا ربکم تضرعاً و خفیہ فرمایا جا رہا ہے اور بندگی کی حد تک ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا، کی ہدایت ہو رہی ہے۔ حضرت نوح اگر ایک طرف ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کے خلاف دعوت دے رہے ہیں تو دوسری طرف اپنی قوم کو بندگی کی حد تک یہ کہہ کر للکار رہے ہیں یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہٗ لوگو اللہ کی بندگی کرو اللہ کے سوا تمہارا صاحب کوئی نہیں ہے۔

بہر حال سورت کا موضوع اللہ کی بندگی ہے۔ اسی نقطہ نظر سے آپ آٹھویں پارے کا مطالعہ کریں۔

پارہ ہشتم ایک نظر میں

صفات الٰہی

شرک

سیاسی قوانین

مالیاتی قوانین

اخلاقی قوانین

معاشرتی قوانین

توحید

رسالت ونبوّت

دستوری قواعد

ایمان واسلام

اجتماعی قوانین

آخرت کی زندگی

قرآن کی دُعائیں

قرآنی تمثیلات

روشنی اور تاریکی سے علم اور جہالت کا مفہوم ۱۳۲

قرآن کے قصے

قصۂ آدم و حوا علیہما السلام ۱۱ - ۱۲
" نوح علیہ السلام
" ہود علیہ السلام
" صالح " "
" لوط " "
" شعیب " "

اصطلاحاتِ قرآنیہ

اجل: اس دُنیا میں کوئی تغیر و تبدیلی ایسی نہیں جو اپنا تدریجی دور نہ رکھتی ہو۔ ہر چیز بتدریج بنتی اور بگڑتی ہے۔ بناؤ ہو یا بگاڑ ممکن نہیں کہ ایک خاص مدت گزرے بغیر کوئی حالت بھی اپنی کامل صورت میں ظاہر ہو سکے یہ مدت جو ہر حالت کے ظہور کے لیے اس کی اجل یعنی وقت مقررہ ہے۔ مختلف گوشوں اور مختلف حالتوں میں مختلف مقدار رکھتی ہے۔ اور بعض حالتوں میں اس کی مقدار اتنی طویل ہوتی ہے کہ ہم اپنے نظامِ اوقات سے اس کا حساب بھی نہیں لگا سکتے۔ قرآن نے اسے یوں تعبیر کیا ہے کہ جس مدت کو تم اپنے حساب میں ایک دن سمجھتے ہو۔ اگر اسے ایک ہزار برس تصور کر لو تو ایسے دنوں سے جو مہینے اور برس بنیں گے ان کی مقدار کتنی ہوگی۔ افراد کی موت و حیات کی طرح جماعتوں اور اور اُمتوں کی موت و حیات کا بھی ایک پیمانہ مقرر ہے اور پیمانہ کے مقرر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر قوم کو دُنیا میں جو کام کرنے کا موقعہ دیا جاتا ہے اس کی ایک اخلاقی حد مقرر کر دی جاتی ہے۔ بایں معنے کہ اس کے اعمال میں خیر اور شر کا کم سے کم تناسب برداشت کیا جا سکتا ہے جب تک ایک قوم کی بُری صفات اس کی اچھی صفات کے مقابلہ میں تناسب کی اس آخری حد سے فروتر رہتی ہیں اس وقت تک اسے اس کی تمام برائیوں کے باوجود مہلت دی جاتی رہتی ہے اور جب وہ اس حد سے گزر جاتی ہیں تو پھر اس بدکار، بد صفات قوم کو مزید کوئی مہلت نہیں دی جاتی۔

استواءِ علی العرش :- عرش تختِ شاہی کو کہتے ہیں۔ امام ابوبکر عزیزی سجستانی نزہۃ القلوب میں فرماتے ہیں۔ عرش کے معنے تختِ شاہی کے ہیں چنانچہ آیاتِ ذیل میں عرش سے یہی مراد ہے ورفع ابویہ علی العرش اور اھکذا عرشک؟ استواء علی العرش یعنی خدا کے تخت پر جلوہ فرما ہونے کا مطلب کیا ہے اس کی تفصیلی کیفیت ہمارے لیے سمجھنا مشکل ہے کیونکہ اس کا تعلق عالم

غیب سے ہے اور عالم غیب کے حقائق تک وحی کے بغیر کسی کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ استوار علی العرش سے اللہ سبحانہٗ کا موصوف ہونا مخلوقات جیسا نہیں۔ یہ بات عقل سے بھی ثابت ہے اور یہ بات بالکل بدیہی ہے اور لیس کمثلہٖ شیئٌ کی دلیل نقلی سے بھی ثابت ہے۔ نفی مماثلت کے بعد استوار کو سمجھانے کے دو طریق ہیں۔ ایک طریقہ ارباب تفویض اور سلف کا ہے اور دوسرا طریقہ ارباب تاویل اور خلف کا ہے۔ سلف استوار علی العرش کو حقیقی معنے پر محمول فرماتے ہیں اور حقیقی معنے کی حقیقت کو مفوض بعلم الٰہی کرتے ہیں اور اس کی کوئی کیفیت متعین نہیں کرتے۔ ارباب تاویل اور خلف اس میں مناسب تاویل کرتے ہیں وہ استوار کو استیلا کے معنے میں لیتے ہیں یعنی خدا کی بادشاہت کائنات ہستی میں نافذ ہوگئی کیونکہ وہی خالق ہے اور وہی مدبر بھی ہے تمام عالم ہستی اسی کے تخت جلال کے جھکی ہوئی ہے چنانچہ ایک دوسری جگہ فرمایا ثم استوی علی العرش یدبر الامر) اس موضوع پر حضرت مولانا اشرف علی نے ایک رسالہ سپرد قلم فرمایا۔ بڑی عجیب و غریب تحقیق ہے۔ سلف اور خلف کی اس میں کیوں کر وضاحت فرمائی ہے۔ رسالہ کا نام "تمجید الفرش فی تحدید العرش" ہے۔ یہاں قرآن میں اس کے ذکر کا اصل مقصد یہ ذہن نشین کرانا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض خالق کائنات ہی نہیں ہے بلکہ مدبر کائنات بھی ہے۔ وہ دُنیا کو وجود میں لانے کے بعد اس سے بے تعلق نہیں ہوگیا بلکہ عملاً وہ سارے جہان کے جزو کل پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ سلطانی و حکمرانی کے سارے اختیارات بالفعل اس کے ہاتھ میں ہیں۔ ہر چیز اس کے امر کے تابع ہیں، ذرہ ذرہ اس کے فرمان کا مطیع ہے اس لیے خالق ہونے کی وجہ سے اگر وہ انسانوں کی پرستش کا حقدار ہے تو فرمانروا اور مدبر ہونے کی وجہ سے وہ انسانوں کی بندگی کا مستحق ہے۔

امر: حکم کرنا، یہ لفظ اس بارے میں خلق کے ساتھ اللہ سبحانہٗ کے لیے آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا محض خالق ہی نہیں کہ اس کی پرستش کی جائے بلکہ وہ آمر اور حاکم بھی ہے۔ ہماری پرستاریوں کی طرح ہماری بندگی کا بھی وہ ہی مستحق ہے۔ اس نے اپنی خلق کو پیدا کر کے نہ تو دوسروں کے حوالے کیا ہے کہ وہ ان پر حکم چلائیں اور نہ پوری خلق کو یا اس کے کسی حصّہ کو خود مختار بنا دیا ہے کہ جس طرح چاہے خود کام کرے بلکہ عملاً تمام کائنات کی تدبیر خدا کے اپنے ہاتھ میں ہے لیل و نہار کی گردش اپنے آپ نہیں بلکہ خدا کے حکم سے ہو رہی ہے۔

اولیاء: یہ ولی کی جمع ہے اس کے معنے حامی اور مددگار کے ہیں۔ اور سرپرست کو بھی کہتے ہیں۔ اس بارے میں یہ لفظ سرپرستوں کے معنے میں آیا ہے یعنی انسان جس کی رہنمائی

میں زندگی گزارتا ہے اسے درحقیقت اپنا ولی و سرپرست بناتا ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے یہاں اولیاء کے معنے رفقاء کے کیے ہیں۔ قرآن نے اولیاء کا لفظ پرستش اور بندگی دونوں کے لیے بولا ہے۔ یعنی وہ ان کو بھی اولیاء بنانا کہتا ہے جن کی خدا کے علاوہ پرستش کی جاتے اور ان کے لیے بھی جن کی خدا کے علاوہ بندگی کی جاتے۔ اس بارے میں اولیاء سے وہ لوگ مراد ہیں جن کی اطاعت اور اتباع کی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ اصنام نہیں ہو سکتے بلکہ وہ اکابر مجرمین، وہ سادہ وہ کبراء اور اولیاء الشیطان ہیں جن کی طاعت کو قرآن نے اس بارے میں شرک قرار دیا ہے اور ولا تتبعوا من دونہ اولیاء میں جن کی اتباع سے روکا ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے یہ بات بڑی معنے خیز لکھی ہے۔ شرک فقط یہ نہیں ہے کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجے بلکہ شرک حکم میں ہے کہ کسی اور کا مطیع ہو جائے۔

حَکَماً: منصف، فیصلہ کرنے والا۔ حکم سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ واحد اور جمع سب کے لیے مستعمل ہے۔ خصوصی فیصلہ کرنے والے کو حکم کہتے ہیں اس لیے یہ حاکم سے زیادہ بلیغ ہے۔ شاہ صاحب نے بھی اس کے معنے منصف کے کیے ہیں۔ اصل میں یہ لفظ حکم سے بنا ہے اور حکم کے معنے لغت میں فیصلہ اور حق و باطل میں فیصلہ کرنے کے ہیں جن کا ترجمہ اردو فیصلہ کر سکتے ہیں۔ امام راغب مفردات القرآن میں لکھتے ہیں۔ کسی چیز پر حکم کرنا یا فیصلہ کرنا ہے کہ یہ چیز ایسی ہے یا ایسی نہیں ہے۔ عام اس سے کہ اس فیصلہ کا تم دوسرے کو پابند بنا سکو یا نہ بنا سکو۔ عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں حکم کے معنے علم سمجھ اور منصفانہ فیصلہ کے ہیں۔ اسی لیے خدائی حکم یعنی اسلام کے بالمقابل زندگی کو جاہلیت کہا جاتا ہے۔ اسلام کا طریقہ سراسر علم ہے کیونکہ یہ خدائی فیصلہ ہے اس کے برعکس ہر وہ طریقہ جو اسلام سے مختلف ہے جاہلیت کا طریقہ ہے۔

حیاۃ: حیات کے دو معنے آتے ہیں ایک حقیقی دوسرے مجازی، حقیقی معنے زندگی کے ہیں مجازی طور پر حیاۃ سے مراد علم و ادراک اور حقیقت شناسی کی حالت ہوتی ہے۔ اور موت سے مراد جہالت اور بے شعوری کی حالت ہوتی ہے۔ جس شخص کو صحیح اور غلط کی تمیز نہیں اور جسے معلوم نہیں کہ راہ راست کیا ہے وہ طبیعیات کے نقطہ نظر سے چاہے کیسا ہی زندہ ہو مگر حقیقت کے اعتبار سے اس کو انسانیت کی زندگی میسر نہیں ہے وہ زندہ حیوان تو ضرور ہے مگر زندہ انسان نہیں ہے۔ زندہ انسان درحقیقت صرف وہ شخص ہے جسے حق و باطل، نیکی و بدی، راستی و ناراستی کا شعور حاصل ہے۔

زخرف القول: ملمع، سنہری، سونا، آراستہ زینت اور کسی چیز کے کمال حسن کو زخرف کہتے ہیں اور اسی اعتبار سے سونے کو زخرف کہتے ہیں لیکن قول کے لیے جب اس کا استعمال ہو تو

جھوٹ سے آراستہ کرکے اور ملمع کی باتیں کرنے کے معنے ہوں گے نہ خرف القول غرورا کے معنے دھوکے اور فریب کے طور پر خوش آئند باتیں کرنے کے ہیں۔ اس سے مقصود وہ تمام چالیں، تدبیریں اور شکوک وشبہات ہیں جن سے یہ لوگ عوام کو داعی حق اور اس کی دعوت کے خلاف بھڑکانے اور اکسانے کا کام لیتے ہیں پھر ان سب باتوں کو بحیثیت مجموعی دھوکہ اور فریب سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ حق کا مقابلہ کرنے کے لیے جو ہتھیار بھی مخالفین استعمال کرتے ہیں وہ نہ صرف دوسروں کے لیے بلکہ خود ان کے لیے بھی حقیقت کے اعتبار سے محض ایک دھوکا ہوتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر وہ ان کو نہایت مفید اور کامیاب ہتھیار نظر آتے ہیں جتنے نظام حیات دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ سب اسی زخرف القول غرورا کی تخلیقات ہیں سب کے دعوے خوشنما اور پُر فریب ہوتے ہیں کوئی کہتا ہے روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ لگاتا، کوئی دنیا سے مفلسی اور محتاجی کو مٹانے کا دعویٰ کرتا ہے یہ سب اسی زخرف القول غرورا کے نمونے ہیں۔

زینتہ:۔ زیبائش، آرائش، سنگار، اسم ہے۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں زینت حقیقی وہ ہے جو انسان کو کسی حالت میں بھی معیوب نہ ہو نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ یہاں زینت سے مراد مکمل لباس ہے۔ خدا کی عبادت میں کھڑا ہونے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ آدمی اپنا ستر چھپائے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حسب استطاعت وہ اپنا پورا لباس پہنے جس میں ستر پوشی بھی ہو اور زینت بھی۔ اس آیت میں جسے زینتکم کہا ہے اسی کو اگلی آیت میں زینۃ اللہ کہا ہے۔ زینۃ اللہ سے صاف ستھرا، عمدہ اور شاندار لباس تو سب کے نزدیک مراد ہے لیکن اکثر نے اسے وسعت دے کر جملہ سامان آرائش کو اس میں شامل کیا ہے۔ امام رازی نے زینت سے مراد جمیع انواع زینت بتائی ہے۔

سوآۃ:۔ لاش، عیب، فضیحت، علامہ زمخشری فرماتے ہیں کہ سوآۃ کے معنے فضیحت کے ہیں کیونکہ اس میں برائی ہوتی ہے۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ شرمگاہ کے لیے سوآۃ بطور کنایہ بولا گیا ہے اور علامہ ابن الاثیر کا بیان ہے کہ اصل میں سوآۃ کے معنے شرمگاہ کے ہیں۔ بعد میں اس کو ہر اس شئے کے معنے میں نقل کیا گیا کہ جب وہ ظاہر ہو تو اس سے حیا آنے لگے۔ یہاں قصہ آدم میں سوآۃ سے کیا مراد ہے اس کے متعلق ابوحیان اندلسی لکھتے ہیں کہ کچھ کی رائے میں ستر مراد ہے اور اہتمام کے لیے خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے گو سارے جسم کا چھپانا مقصود ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ پوری لاش مراد ہے۔ ابن عطیہ کہتے ہیں کہ یہ بھی احتمال ہے کہ سوآۃ سے یہی حالت مراد

لی جاتے جو کہ مجموعی طور پر دیکھنے والے کو بُری لگتی ہو۔ دراصل انسان کے اندر شرم و حیا کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے اور اس کا اولین مظہر وہ شرم ہے جو اپنے جسم کے مخصوص حصوں کو دوسروں کے سامنے کھولنے میں آدمی کو فطرۃً محسوس ہوتی ہے۔ قرآن کی رہنمائی یہ ہے کہ یہ شرم انسان کے اندر تہذیب کے ارتقا سے مصنوعی طور پر پیدا نہیں ہوتی ہے اور نہ یہ اکتسابی چیز ہے بلکہ درحقیقت یہ وہ فطری چیز ہے جو روزِ اوّل سے انسان میں موجود تھی۔ شیطان نے پہلی ضرب انسان کے اس جذبۂ شرم و حیا پر لگائی اور برہنگی کے راستہ اس کے لیے خواہش کا دروازہ کھولا اور اس کو جنسی معاملات میں زیر کرنے کی کوشش کی۔ شیاطین اور اس کے رفقاء کی یہ روش آج تک جوں کی توں موجود ہے۔ "ترقی" کے نام پر عورت کی بے پردگی اس کا مظہر ہے۔

شرحِ صدر :- ربانی علم و معرفت کا ایک مقام شرحِ صدر ہے۔ شرحِ صدر کے معنے سینہ کھولنے کے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ سینہ کی تنگی اور ضیق، جہل و نادانی کی علامت ہے اور سینہ کی کشادگی اور فراخی علم کی وسعت اور معرفت کی فراوانی پر دلالت کرتی ہے۔ اسی طرح شرحِ صدر کے اصطلاحی اور مجازی معنے علم کی کثرت اور آگاہی کی وسعت کے ہیں اور خاص طور پر اس علم و معرفت اور اطلاع و آگاہی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو کسی دقیق اور مشکل مسئلہ کے متعلق دفعۃً اور یک بیک قلب میں وارد ہوتی ہے اور اس حل سے اس کی تسلی و تسکین ہو جاتی ہے اور اس کے شکوک و شبہات دور ہو کر اس کو یقین، راحت و مسرت حاصل ہو جاتی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے نبوت کا منصب ملتے وقت دعا کی تھی۔ رب اشرح لی صدری و یسر لی امری واحلل عقدۃ من لسانی دعا کے پہلے جملہ میں حضرت موسیٰ نے اپنے لیے شرحِ صدر کی استدعا کی ہے اور آخر میں فصاحتِ بیان کی یعنی اوّل میں صحیح الفاظ کے انتخاب کی دعا کی ہے تاکہ ان کی دعوت و تبلیغ کو مخاطب سمجھ سکیں لیکن یہ دولت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بن مانگے ملی۔ الم نشرح لک صدرک شرحِ صدر کی جو تشریح احادیثِ صحیح میں مذکور ہے اس کے لیے عام اصطلاح شقِ صدر ہے۔

عام لوگوں کے بارے میں قرآن میں بتایا ہے افمن شرح اللہ صدرہٗ للاسلام فھو علی نور من ربہ بھلا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا تو وہ اپنے پروردگار کی جانب سے ایک روشنی میں ہے۔ اسلام کے لیے سینہ کھول دینے سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت موثر طریقہ سے اس پر اس طرح کھل گئی کہ اس کو اسلام کی سچائی کا پوری طرح یقین ہو گیا اور اس کو اپنے اس یقین پر کامل تسکین ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس اپنی منزلِ مقصود کے ہر قدم پر

اللہ کی روشنی حاصل ہے۔ یہی شرح صدر کی حقیقت ہے اور اس روشنی کی کمی و بیشی درجوں اور منصبوں کے مطابق ہوتی ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو شرح صدر کی جو دولت عطا ہوئی تھی اس میں اور اُمت کو جو شرح صدر کی نعمت ملتی ہے ایک باریک اور جوہری فرق ہے۔ اُمتی کا سینہ کسی خاص مسئلہ اور بات کے لیے کھولا جاتا ہے۔ مثلاً اسلام کے لیے سینہ کھول دیا، جمع قرآن کے لیے ابوبکر کا سینہ کھول دیا یا تعین زکوٰۃ سے قتال کے لیے ان کا سینہ کھول دیا۔ لیکن نبوت کا سینہ کھولنے سے مقصود یہ ہے کہ نبوت کو امر و نہی میں مطلق اور عمومی شرح صدر عنایت ہوتا ہے۔ یعنی ان کو کلی اور عمومی حیثیت سے یہ چیز عطا ہوتی ہے۔ اس کی تفصیلاتی بحث پارہ ۲۳ میں آرہی ہے۔

لباس التقویٰ:۔ اسلام کی تمام تعلیمات کا خلاصہ اگر ہم صرف ایک لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو ہم اس کو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں۔ اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اسی تقویٰ کی رُوح کو پیدا کرنا ہے۔ قرآن نے کھلے لفظوں میں اعلان کیا ہے کہ اس کی تعلیمات سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو تقویٰ والے ہوں۔ ھدی للمتقین، اسلام کی ساری عبادتوں کا منشا اسی تقویٰ سے ہے روزے کا نماز کا حج کا قربانی کا بھی مقصد ہے۔ اخلاق کے معاملہ میں زاد بھی زاد تقویٰ اور لباس بھی لباسِ تقویٰ ہونا چاہیے۔ گویا اسلام کا سارا اخلاقی نظام تقویٰ کی اساس پر قائم ہے۔

روحانی اصطلاحات

علمی اصطلاحات

سیاسی اصطلاحات

معاشی اصطلاحات

وَلَوْ أَنَّنَا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلَٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَىٰ وَ
حَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوا لِيُؤْمِنُوٓا إِلَّآ أَن
يَشَآءَ اللَّهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُونَ ﴿١١١﴾ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا
لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَٰطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ
إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا ۚ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا
فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ﴿١١٢﴾ وَلِتَصْغَىٰٓ إِلَيْهِ أَفْـِٔدَةُ
الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوا
مَا هُم مُّقْتَرِفُونَ ﴿١١٣﴾

اور دیکھو اگر بالفرض ہم ان پر فرشتے بھی اتار دیتے اور ان سے مردے بھی قبروں سے اٹھ کر باتیں کرنے لگتے اور ساری چیزیں ہم ان کے روبرو جمع کر دیتے پھر بھی یہ ایسا نہ کرتے کہ ایمان لے آویں، ہاں یہ کہ اللہ ہی کی مشیت ہو لیکن ان کی اکثریت نادان ہے[۱۲۸] اور اے پیغمبر اسی طرح ہم نے ہر

نبی کے لیے انسانوں اور جنوں میں سے شیاطین کو دشمن بنا دیا ہے

جو باہم ایک دوسرے کو چکنی چپڑی باتیں لوگوں کو فریب دینے کے لیے

وحی کرتے ہیں۔ اور اگر تمہارا رب چاہتا تو وہ یہ کام نہ کرتے لہٰذا ان کو اور

ان کی افترا پردازیوں کو چھوڑ دو۔[۱۳۹] اور اس لیے بھی وہ یہ باتیں کرتے

ہیں تاکہ آخرت پر ایمان رکھنے والوں کے دل ان کی طرف متوجہ ہو جائیں

اور اس لیے بھی کہ لوگ ان کی باتوں کو پسند کریں اور اس لیے بھی کہ جیسی

کچھ وہ بدکاریاں کر رہے ہیں لوگ بھی کرنے لگیں۔[۱۴۰]

معانی مفردات

قُبُلًا سامنے بالمقابل، کچھ کی رائے میں یہ قبیل کی جمع ہے جیسے رغیف کی جمع رغف قسم قسم جماعت، الشیطان سرکش، باغی، شوریدہ سر کو کہتے ہیں۔ انسان اور جن دونوں کے لیے یہ الفاظ آتے ہیں۔ یوحی ایحاد سے ہے اس کے دقیق اور سریع اور خفی اشارہ کرنے کے آتے ہیں زخرف زینت، رونق جیسے باغوں کے لیے پھول اور عورتوں کے لیے زیور غرور، باطل کے ذریعہ دھوکہ اور فریب، صغی الیہ، مائل ہونا باب سمع سے آتا ہے، مقترفون اقتراف سے ہے اقترف المال مال کمایا، اقترف الذنب گناہ کیا عدو صدیق کی ضد ہے دشمن کے معنے ہیں واحد جمع اور مذکر مونث یکساں ہوتا ہے۔

ظاہری نشانات اور آیات

نبوت کے اصلی آثار اور علامات یہ ہیں کہ وہ آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتا ہے، زنگ آلود نفوس اور سیہ کار قلوب کو جلا دیتا ہے، لوگوں کو کتاب و حکمت اور اخلاق کی تعلیم دیتا ہے، اچھی باتوں کو پھیلاتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے، لوگوں کو خدا کی دعوت دیتا ہے، نیکوکاروں کو بشارت سناتا ہے۔ بدکاروں کو عذابِ الٰہی سے ڈراتا ہے اور اس ظلمت کدہ عالم میں وہ ہدایت کا چراغ بن کر چمکتا ہے۔ کفار صداقت نبوت کی نشانی چاہتے ہیں۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس کی صداقت کی روشنی تو اس کا سراپا وجود ہے اور اہلِ یقین کے لیے اس کی سچائی کی تمام نشانیاں ظاہر کر دی گئی ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ نبوت ظاہری آیات اور مادی نشانات سے خالی ہوتی ہے۔ تمام انبیاء کی سیرتیں بیک زبان اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ باطنی نشانیوں کے ساتھ ظاہری حصہ بھی ان کو ملتا ہے۔ بتانا یہ ہے کہ یہ مادی اور ظاہری نشانات نبوت کی اصل حقیقت نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد مقامات پر قرآن نے کفار کی مادی نشانیوں کی طلب میں آپ کی طرف سے یہ الفاظ کہے ھل کنت الا بشراً رسولاً لیکن نبوت کے ظاہری اور عامیانہ آثار و علامات یعنی خارق عادات معجزات صرف وہ فرقہ طلب کرتا ہے جس کے دل کی آنکھیں اندھی ہوتی ہیں، اور جو تعصب و عناد اور جہل کے باعث حق کے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ معاندین جو انبیاء کے مکارمِ اخلاق، حسنِ تعلیم و دیگر علمی و عملی تلقینات کو باور نہیں کرتے اور ان کے کھلے اور بدیہی دعووں کو بھی تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے اور ہر قسم کی دلیلوں کے سن لینے کے بعد بھی وہ اپنے لاعلاج مرضِ شک سے نجات نہیں پاتے تو آخر الحیل کے طور پر وہ پیغمبر سے خارق عادت معجزوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہاں قرآن نے بتایا ہے کہ اگر ان کے سامنے بڑے سے بڑا اعجاز بھی پیش کر دیا جائے تو ان کے قلوب کو اطمینان حاصل نہ ہوگا کیونکہ ان کے شک و شبہ کا منشا عناد ہے حق طلبی نہیں ہے اگر حق طلبی مقصود ہوتی تو پہلی ہی دفعہ دیکھ کر ایمان لے آتے۔ حتیٰ کہ ان سے اگر مردے بھی اس سلسلے میں ہمکلام ہو جائیں اور فرشتے بھی نازل ہو جائیں پھر بھی یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

۱۱۱۔ اور دیکھو اگر بالفرض ہم ان پر فرشتے اتار دیتے اور ان سے مُردے بھی قبروں سے اٹھ کر باتیں کرنے لگتے اور ساری چیزیں ہم ان کے روبرو جمع کر دیتے پھر بھی یہ ایسا نہ کرتے کہ ایمان لے آویں ہاں یہ کہ اللہ ہی کی مشیت ہو لیکن اکثریت ان کی نادان ہے۔ یعنی اگر ان کی فرمائش کے موافق بلکہ اس سے بھی بڑھ کر فرض کیجیے کہ آسمان سے فرشتے اتر کر آپ کی تصدیق کریں اور مُردے قبروں سے اٹھ کر ان سے باتیں کرنے لگیں اور تمام امتیں جو گزر چکی ہیں دوبارہ زندہ کر کے ان کے سامنے لا کھڑی کی جائیں تب بھی

سوءِ استعداد اور تعنت وعناد کی وجہ سے یہ لوگ حق کو ماننے والے نہیں ، بے شک اگر خدا چاہے تو زبردستی منوا سکتا ہے لیکن ایسا چاہنا اس کی حکمت اور تکوینی نظام کے خلاف ہے جس کو ان میں سے اکثر لوگ اپنے جہل کی وجہ سے نہیں سمجھتے۔ اس کی تشریح پہلے فوائد میں گزر چکی ہے [1]

ان کے یہ بھی مطالبے تھے کہ لو ما تأتینا بالملائکۃ ان کنت من الصادقین اگر تو سچا ہے تو فرشتے کیوں نہیں لاتا ہے اور کبھی کہتے فاتوا بابائنا ان کنتم صادقین اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادوں کو لے کر آؤ۔ واضح رہے کہ منکروں کی یہ فرمائشیں حجت و بُرہان کی طلب میں نہ تھیں بلکہ محض سرکشی اور ہٹ دھرمی کی باتیں تھیں جو اس لیے کہی جاتی تھیں کہ کوئی نہ کوئی بات کہہ کر اپنے انکار کے لیے سہارا پیدا کر لیا جاتے اور ہمیشہ انبیاؑ کے مقابلے میں نہ ماننے والوں کا ایسا ہی طرزِ عمل رہا ہے جب کبھی سچائی کی کوئی بات کہی جاتی ہے تو طلبِ حق رکھنے والی طبیعتیں اور کسی طرف نہیں جاتی ہیں۔ خود اسی بات پر غور کرتی ہیں اور جب سچائی پالیتی تو فوراً قبول کر لیتی ہیں لیکن ایک سرکش اور ہٹ دھرم آدمی کبھی ایسا نہیں کرتا وہ پہلے سے طے کر لیتا ہے کہ کبھی ماننے والا نہیں ہے پھر کوشش کرتا ہے کہ اپنے نہ ماننے کے لیے کوئی بات بنالے ، وہ طرح طرح کی باتیں اِدھر اُدھر کی نکالے گا ، کبھی ایک بات کہے گا کبھی دُوسری پہلے کسی ایک بات پر زور دے گا کہ اس کا جواب کیا ہے جب اس کا جواب مل جائے گا تو کوئی دوسری بات ڈھونڈ نکالے گا اور کہے گا کہ اس کا جواب تمہارے پاس نہیں۔ یہاں تک کہ اگر تم اس کی ساری کٹ حجتیوں کا جواب دے دو اور ساری شرطیں اور فرمائشیں پوری کر دو جب بھی وہ کوئی نہ کوئی اور بات ڈھونڈ نکالے گا۔ اور راست بازی کی راہ کبھی نہ چلے گا۔ قرآن نے جا بجا منکروں کی اس حالت کا ذکر کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ وہ کبھی ماننے والے نہیں اگر ماننے والے ہوتے تو اس قسم کی روش کبھی اختیار نہ کرتے۔ یہاں فرمایا ہے کہ اگر ہم بالفرض ان کے اس مطالبے کے جواب میں کہ فرشتے کیوں نہیں لاتے فرشتے بھی نازل کر دیتے اور اس مطالبہ کے جواب میں فاتوا بابائنا ان سے مُردے قبروں سے اٹھ کر بالمشافہ باتیں بھی کر لیتے بلکہ اس سے بھی ترقی کر کے حیوانات ، نباتات اور جمادات میں سے ہر قسم کے دلائل کا ان کے آگے انبار لگا دیتے تو پھر بھی یہ نہ مانتے۔ قبلاً میں دو صورتیں ہیں یہ واحد ہے اور اس کے معنے سامنے اور آگے کے ہیں یا یہ جمع ہے اور اس کا واحد قبیل ہے اور اس کے معنے کفیل کے ہیں یا گروہ کے ہیں۔ دونوں معنے صحیح ہیں لیکن ہم نے پہلے معنے کو اختیار کیا ہے از روئے بلاغت اس میں زیادہ زور ہے یعنی

[1] افادات شیخ الاسلام

پردۂ غیب کی اگر ساری چیزیں بھی ان کے سامنے کردی جائیں پھر بھی یہ ایمان لانے والے نہیں کیونکہ وہ عناد جس نے ان کی آنکھوں کو حق کی دید سے محروم کر رکھا ہے پھر بھی باقی رہتا۔

آخر میں فرمایا ہے الا ان یشاء اللہ مگر یہ اللہ چاہے۔ شارحین قرآن میں سے کچھ کہتے ہیں کہ یہ استثنائے منقطع ہے۔ مطلب یہ ہے لیکن اللہ ان معاندین منکرین میں سے کسی کو ایمان کی دولت سے مالامال کرنا چاہے تو مالامال بنادے اور کچھ کہتے ہیں کہ استثنا متصل ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ معاندین منکرین جب تک ان صفات پر رہیں گے ایمان نہیں لائیں گے اور جب اللہ ہی ان صفات کو ہٹانا چاہے گا تو ہٹا دے گا۔ یہی صحیح ہے اور بتایا جارہا ہے کہ یہ معاندین اس عناد، کبر کی موجودگی میں ایمان نہیں لائیں گے، مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں اللہ کی سنت یہ ہے کہ جو لوگ اپنی ایمانی استعداد و صلاحیت کو مسخ کر دیتے ہیں وہ نعمت ایمان سے محروم رہتے ہیں۔ اگر اللہ چاہے تو اس کے خلاف بھی کر سکتا ہے لیکن اللہ ایسا نہیں چاہتا ہے کیونکہ یہ اس کی سنت کے خلاف ہے اور نوع انسانی کی طبیعت بدلنے کے مرادف ہے۔ نوع بشری کو تمام مخلوقات میں ارادہ و اختیار سے نوازا ہے ایمان و کفر اور طاعت و معصیت ارادی و اختیاری چیزیں ہیں۔ اسی لیے قابل جزا و سزا ہیں اگر بھوک اور پیاس کی طرح یہ بھی ارادی و اختیاری نہ ہوتے بلکہ اضطراری اور طبعی تقاضے ہوتے تو ہرگز جزا و سزا کے قابل نہ ہوتے۔ ایمان کی نعمت ان کو ملتی ہے جو اس کے لیے اپنی وہ صلاحیتیں استعمال کرتے ہیں جو اللہ نے ان کے اندر ودیعت فرمائی ہیں۔ اور جو ان کو استعمال نہیں کرتے تو خدا کسی کے دل میں زبردستی ایمان نہیں ٹھونستا۔ اسی لیے اسلام میں ایمان کے حد تک اکراہ جائز نہیں رکھا گیا ہے۔ جس طرح اسلام پر جبر کرنا صحیح نہیں اسی طرح کسی کے اسلام میں بلاوجہ شک و شبہ پیدا کرنا بھی درست نہیں ہے۔ تم مسلمان ہونے پر کسی کو مجبور نہیں کر سکتے اور اگر کوئی از خود مسلمان ہوتا ہے تو بلاوجہ اس کے اسلام کو شک و شبہ کی نگاہ سے نہ دیکھو۔ گویا ایمان کے معاملہ میں کسی پہلو سے بھی قرآن نے تشدد پسند نہیں کیا۔ کوئی ایمان لاتا ہے تو بسر و چشم قبول کرلو اور نہیں لاتا تو اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دو۔ کیا اس سے بڑھ کر آزادی رائے کا کوئی اور مفہوم ہو سکتا ہے۔

بہر حال الا ان یشاء اللہ سے معاندین کے ایمان نہ لانے کی خبر میں زور پیدا کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جو لوگ معجزات کی نمائش دیکھ کر ایمان لانے کا دعوی کر رہے ہیں وہ کبھی ایمان نہ لائیں گے۔ اسی لیے نفی ایمان کے لیے ماکانوا لیومنوا کی تعبیر اختیار کی ہے۔ یہ نہیں فرمایا لا یومنون وہ ایمان نہیں لائیں گے بلکہ فرمایا کہ ایمان لانا ان کی صلاحیتوں کا تقاضا نہیں ہے۔ نفی فعل سے نفی شان

زیادہ بلیغ اور زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔

یہاں نفی ایمان کی علت میں علامہ آلوسی نے ایک لاطائل بحث انسانی اختیار کے موضوع پر کی ہے۔ حالانکہ معاملہ بالکل واضح اور صاف ہے۔ علامہ جمال کا یہ کہنا بالکل برمحل اور بجا ہے کہ یہ آیت معتزلہ کے خلاف بہت بڑا چیلنج ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ایمان و کفر اور خیر و شر کا وجود اللہ کی مشیت سے ہے سلف امت کا اس پر اتفاق ہے کہ ما شآء اللہ کان و مالم یشالم یکن جو کچھ اللہ نے چاہا ہوگیا اور جو نہ چاہا نہ ہوا۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث اسی پارے میں آگے آرہی ہے۔

قانون الٰہی سے بے خبری

آخر میں فرمایا ہے کہ ولکن اکثرھم یجھلون علامہ آلوسی نے اس کا یہ مطلب بتایا ہے کہ اکثر مسلمان ان کے ایمان نہ لانے سے بے خبر ہیں کیونکہ ان کو یہ پتہ نہیں کہ ان کے ایمان کے لیے اللہ کی مشیت نہیں ہے اور دوسرے شارحین قرآن کہتے ہیں کہ یہ فقرہ اہل کفر کے بارے میں ہے۔ اہل کفر کی جہالت زیادہ ہے لیکن قرآن کا سیاق آلوسی کا مؤید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمان سب تو نہیں لیکن اکثر اللہ کے قانون کے افراد و اقوام پر انطباق سے بے خبر ہیں۔ اسی لیے کچھ اہل ایمان معجزات مانگنے والوں کے ایمان کی خواہش کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ معجزہ کی نمائش ان کو مومن بنا دے گی۔ حالانکہ معجزات نہ تو ایمان کا لازمہ اور نہ معجزات سے طبیعت انسانی بدلتی ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کے دلوں میں ایمان کی تخلیق فرما دیتا۔ حاصل یہ کہ معاندین کے شکوک و شبہات کے بادل معجزات کی روشنی سے بھی نہیں چھٹتے۔ تمام انبیاء کی سیرتیں گواہ ہیں کہ معاندین معجزات دیکھنے پر بھی اپنے انکار و اعراض پر نہایت استقلال سے ڈٹے رہے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو بار بار معجزہ دکھایا، لیکن اس کا انکار ایمان میں نہ بدلا۔ عہد محمدی کے فرعون اور معاندوں کی نفسی کیفیت بھی یہی ہے کہ ان کو نشانیاں دکھائی جاتی ہیں مگر انہیں عناد کی کور باطنی کے باعث ان سے تسکین نہیں ہوتی۔ اس لیے بالآخر معاندین کی طلب معجزہ سے تغافل برتا جاتا ہے اور ان کے پیہم اصرار، الحاح اور طلب کی کوئی پروا نہیں ہوتی کیونکہ اس مطالبہ کو پورا کرنے کے بعد ہلاکت یقینی ہو جاتی ہے۔ اور اگر اہل کفر مراد ہوں جیسا کہ دوسرے شارحین قرآن کی رائے ہے کہ اکثر ان میں جاہل ہیں۔ جہالت کے باعث معجزات قاہرہ طلب کرتے ہیں خواہ مخواہ کی فرمائشیں جہالت کی دلیل ہے، حق کی طلب نہیں اور دلائل حقہ کی طرف توجہ و التفات نہیں بے وجہ جو دل میں آتا ہے کہہ دیتے ہیں یہ جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔

عدالت میں مدعی سے گواہی طلب کی جاتی ہے اور مدعا علیہ کو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ گواہوں پر جرح کرے اور گواہوں کا ناقابل شہادت ہونا ثابت کرے لیکن اگر مدعا علیہ مدعی کی پیش کردہ شہادت پر تو کوئی جرح نہ کر سکے اور یہ کہے کہ میں اس دعوے کو جب تسلیم کروں گا کہ فلاں فلاں شخص اس کی شہادت دیں تو عدالت مدعا علیہ کو اس کی کبھی اجازت نہ دے گی۔ ٹھیک ایسے ہی مدعی نبوت کے ذمہ صرف دلائل نبوت اور مطلق شواہد رسالت کا پیش کرنا ضروری ہے۔ فرمائشی نشانات کا پیش کرنا ضروری نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا قانونِ آزمائش

۱۴۹۔ اور اے پیغمبر اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسانوں اور جنوں میں سے شیاطین کو دشمن بنا دیا ہے جو باہم ایک دوسرے کو چکنی چپڑی باتیں لوگوں کو فریب دینے کے لیے وحی کرتے ہیں، اور اگر تمہارا رب چاہتا تو وہ یہ کام نہ کرتے لہٰذا ان کو اور ان کی افترا پردازیوں کو چھوڑ دو۔ چونکہ خدا کی حکمت بالغہ تکوینیا اسی کو مقتضی ہے کہ نظامِ عالم کو جب تک قائم رکھنا منظور ہے خیر و شر کی قوتوں میں سے کوئی قوت بھی بالکل مجبور اور نیست و نابود نہ ہو۔ اس لیے نیکی بدی، ہدایت و ضلالت کی حریفانہ جنگ ہمیشہ سے قائم ہے۔ جس طرح آج یہ مشرکین و معاندین آپ کو بیہودہ فرمائشوں سے دق کرتے اور بالنواع حیل لوگوں کو جادۂ حق سے ڈگمگانا چاہتے ہیں۔ اسی طرح ہر پیغمبر کے مقابل شیطانی قوتیں کام کرتی رہی ہیں کہ پیغمبروں کو ان کے پاک مقصد ہدایتِ خلق میں کامیاب نہ ہونے دیں۔ اسی غرض فاسد کے لیے شیاطین الجن والانس باہم تعاون کرتے اور ایک دوسرے کو فریب دہی اور ملمع سازی کی چکنی چپڑی باتیں سکھاتے ہیں۔ اور ان کی یہ عارضی آزادی اسی عام حکمت اور نظامِ تکوینی کے ماتحت ہے جو تخلیق عالم میں حق تعالیٰ نے مرعی رکھی ہے اس لیے آپ اعداء اللہ کی فتنہ پردازی اور مغویانہ فریب دہی سے زیادہ فکر و غم میں نہ پڑیں ان سے اور ان کے کذب و افترا سے قطع نظر کر کے معاملہ خدا کے سپرد کیجئے۔[1]

سابقہ مضمون سے دلالۃً یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ نشانات اور معجزات کا مطالبہ کرنے والے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہیں اور حضور انور سے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ انہیں بدگمانی سے یہ یقین ہے کہ ہماری طرح کا ایک مدعی انسان کبھی ایسی عجیب و غریب چیز پر قدرت نہیں رکھتا ہے اس لیے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

وہ کبھی کوئی خارق عادت امر پیش نہ کر سکے گا اس طرح آپ کی رسوائی عالم آشکار ہو جائے گی اور خود آپ کے ہاتھوں سے آپ کی نبوت کا تار پود بکھر جائے گا اس لیے اللہ سبحانہ نے یہاں قانونِ آزمائش پیش کر کے حضور انور کو تسلی دی ہے اور بتایا ہے کہ اس صورتِ حال سے آپ کو ہی سابقہ پیش نہیں آیا بلکہ جیسے یہ لوگ آپ کے مخالف ہیں اور آپ کی اپوزیشن بنے ہوتے ہیں ایسے ہی آپ سے پہلے جو انبیاء گزرے ہیں ان کو بھی اپنے زمانہ کے شیاطین جن و انس کے ہاتھوں اسی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا ہے یہ اللہ کا قانونِ آزمائش ہے جس سے اس کے تمام نبیوں اور رسولوں کو گزرنا پڑا ہے جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن کے دو معنے کیے گئے ایک یہ کہ شیاطین کو عدو کا بدل قرار دیا جائے۔ اس صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ ہم نے ہر نبی کے دشمن بنائے یعنی انس و جن کے شیطان، دوسری صورت یہ ہے کہ عدوا کو مفعول اول اور شیاطین کو مفعول ثانی قرار دیا جائے اور معنے یوں کیے جائیں ہم نے ہر نبی کے لیے شیاطین کو دشمن بنایا ہے۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ ہر متمرد اور سرکش کو شیطان کہتے ہیں خواہ یہ انسانوں میں سے ہو یا جنات میں سے۔ اور دشمن بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا یہ قانون ہے کہ ہر متمرد، سرکش شریر دعوتِ حق کی مخالف طاقت بن کر سامنے آجاتا ہے۔ حق و باطل کی یہ کشمکش اس دنیا میں قائم رہتی شہرت و جاہ کے رسیا اور چوہدری قسم کے لوگ اور وہ سرمایہ دار جن کو اپنی دولت و سرمایہ سے محبت ہوتی ہے نبوت کا مقابلہ کرتے ہیں۔ یہی قرآن کی زبان میں مفسدین، مترفین اور شیاطین جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، اخیار اور اشرار کی اس کشمکش کا راز حکمتِ الٰہی میں یہی ہے کہ اس کے نتیجے میں حق کا بول بالا ہو یعنی یہ آویزش اس لیے ہوتی ہے کہ حق باقی رہے اور باطل مٹ جائے۔ حق اس لیے باقی رہتا ہے کہ اسی سے بقا ہے باطل اس لیے مٹ جاتا ہے کہ وہ نقص و فساد ہے۔

اہلِ حق کی یہ آزمائش اور اہلِ باطل کے لیے یہ ڈھیل چونکہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ آزمائش کے تحت ظہور میں آتی ہے اور انسان کو اس نے جو ارادہ اور اختیار کی آزادی عطا کی ہے یہ اسی کا ایک لازمی حصہ ہے، اس وجہ سے اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

حق کے یہ مخالفین اور باطل کے علمبردار نبوت اور اہلِ حق کا کن کن ہتھیاروں سے مقابلہ کرتے ہیں، اسی اٹھتے ہوئے سوال کا قرآن نے یہ جواب دیا ہے یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول ایحاء وحی سے بنا ہے وحی مخفی اشارے کو کہتے ہیں اور یہاں لغوی معنے میں استعمال ہوا ہے اور زخرف رونق اور شوکت کو کہتے ہیں جیسے پھول پھلواری زمین کے لیے اور زیورات عورتوں کے لیے سامانِ زینت اور رونق ہوتے ہیں ایسے ہی تمام باتیں جو سننے والوں کو حقیقت سے ہٹا کر وہم کا شکار کر دیں اس سے

مراد وہ تمام چالیں اور تدبیریں اور شکوک و شبہات و اعتراضات ہیں جن سے یہ لوگ عوام کو داعی حق اور دعوت حق کے خلاف بھڑکانے اور اکسانے کا کام لیتے ہیں۔ پھر ان سب باتوں کو بحیثیت مجموعی دھوکے اور فریب سے کام لیا گیا ہے، کیونکہ حق سے لڑنے کے لیے جو ہتھیار بھی مخالفین حق کے خلاف استعمال کرتے ہیں وہ نہ صرف دوسروں کے لیے بلکہ خود ان کے لیے بھی حقیقت کے اعتبار سے محض ایک دھوکہ ہوتے ہیں اگرچہ بظاہر وہ ان کو نہایت مفید اور کامیاب ہتھیار نظر آتے ہیں۔

ہم نے زخرف القول کا ترجمہ چکنی چپڑی بات کیا ہے۔ اصل میں ملمع کاری کو کہتے ہیں۔ جھوٹی اور باطل چیز جس پر حق کا رنگ چڑھانے کی کوشش کی گئی ہو۔ یہ بدلتے ہوتے حالات میں بدلتی رہتی ہے۔ کبھی یہ ان مشرکانہ بدعات کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جسے ہر زمانے کے شیاطین ایجاد کرتے ہیں اور ان پر دین اور مذہب کا لیبل لگا کر ان کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ آج اس کی ترقی یافتہ بازار سیاست میں پائی جارہی ہے۔ شیاطین سیاست اس کے ذریعے لاتے عامہ پارٹیوں اور جماعتوں کو گمراہ کرتے ہیں، کفر خالص پر ایمان کا معصیت پر طاعت کا بغاوت پر عبادت کا لیبل لگا کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ یہ وحدت ادیان کا نعرہ اور اس کے لیے خوبصورت قرآنی آیات کی تاویل اور یہ خالص ناخدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت اشتراکیت پر اسلام کا لیبل اور اس کے لیے من مانی توجیہات، مشرکانہ افکار کسی مخلوق کو اللہ کے سوا دانائے غیب، مختار کل، حاضر و ناظر ماننا اور مشرکانہ اعمال، قبروں پر چادریں ڈالنا، پھول چڑھانا، نذریں اور منتیں اہل قبور کی ماننا ان کے ناموں کو بطور ورد جپنا، قبروں کو بوسہ دینا ان کے سامنے جبین نیاز جھکانا اور اسی قسم کے دوسرے کام کرنا اور ان پر اہل السنۃ کا لیبل لگانا سب زخرف القول ہیں اور شیاطین الانس کی ایجاد ہیں۔ یہی عوام کو اپنے دام فریب میں پھنسانے اور یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ اسلام ہے اور یہی اہل السنۃ کا مذہب ہے۔

آخر میں فرمایا ہے ولو شاء ربك ما فعلوه فذرهم وما يفترون، مطلب یہ ہے کہ اے اللہ یہ فریب دہی کا جو جال تیار کیا گیا ہے اور جو کچھ آپ کے، قرآن کے، اسلام کے اور توحید کے خلاف کر رہے ہیں اگر اللہ چاہتا کہ وہ یہ نہ کریں نہ کرتے لیکن ان کی جبلت کو تبدیل کرنا نہیں چاہا بلکہ اللہ کی مشیت یہی ہوئی کہ ہر انسان حق و باطل، خیر و شر کا استعمال کرنے کے لیے تیار ہو اور پھر اپنے ارادہ و اختیار سے ایک راہ منتخب کرے یعنی اگر وہ سب کو نیکی کی راہ پر چلاتا تو یہ بھی کر سکتا تھا لیکن اس کی حکمت نے یہی پسند فرمایا کہ وہ اس معاملہ میں جبر کی بجائے لوگوں کو اختیار و انتخاب کی آزادی دے کر ان کا امتحان کرے اور دیکھے کہ کون حق پر چلتا ہے اور کون باطل

کی طرف جاتا ہے۔ اب ان کو اور ان کی خرافات، بدعات، ہنوات کو چھوڑ کر اپنا کام کریں۔ ان کے شرکیہ افکار شرکیہ اعمال سے الگ ہو کر آپ توحید کے جادۂ حق پر جمے رہیں اور لوگوں کو توحید عبادت کی دعوت دیں پیغام پہنچانا آپ کا کام ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے۔ ہمارا قانون عنقریب حرکت میں آتے گا اور آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کا انجام کیا ہے۔

قانونِ آزمائش کی حکمتیں

۱۴۰۔ اور اس لیے بھی وہ یہ باتیں کرتے ہیں تاکہ آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل ان کی طرف متوجہ ہو جائیں اور اس لیے بھی کہ لوگ ان کی باتوں کو پسند کریں اور اس لیے بھی کہ جیسی کچھ وہ بدکاریاں کر رہے ہیں لوگ بھی کرنے لگیں۔ یعنی شیاطین ایک دوسرے کو ملمع کی ہوئی فریب کی باتیں اس لیے سکھلاتے ہیں کہ انھیں سن کر جو لوگ دُنیا کی زندگی میں غرق ہیں دوسری زندگی کا یقین نہیں رکھتے ان کا ابلہ فریب باتوں کی طرف مائل ہو جائیں اور ان کو دل سے پسند کرنے لگیں اور پھر کبھی کاموں اور کفر و فسق کی دلدل سے نکلنے نہ پائیں۔[1]

پہلے بتایا تھا کہ دُنیا میں نبوت کے مقابلے میں شیاطین اپنے نظریات کو ملمع سازی کر کے اور چکنا چپڑا بنا کر لوگوں کے سامنے اس لیے پیش کرتے ہیں کہ لوگ دھوکہ میں آکر ان کے دامِ ہمرنگ زمین کا شکار ہو سکیں۔

اب بتایا جا رہا ہے کہ وہ یہ کام اس لیے بھی کرتے ہیں۔

اولاً، ان کی جانب سے یہ ملمع کاری اس لیے کی جاتی ہے کہ وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں ان کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں، اس سے معلوم ہوا کہ شیاطین کی دعوت کا اثر ان لوگوں پر ہوتا ہے جن کے دل فکرِ آخرت سے خالی ہوتے ہیں۔ آخرت پر ایمان اور وہاں ملنے والی ابدی سعادت اور لازوال شقاوت اور ان تمام عذابوں اور تمام انعامات کا استحقاق ہی انبیاؑ کی دعوت اور ان کی پند و نصیحت کی پذیرائی کا اصلی محرک ہے۔ جو لوگ فکرِ آخرت سے بیگانہ ہو جاتے ہیں ان میں برائی کو قبول کرنے کی قابلیت ہوتی ہے اور ہر باطل کا آگے بڑھ کر استقبال کرتے ہیں۔ شیاطین کی وسوسہ اندازی سے وہی متاثر ہوتے ہیں جو اس دُنیا کے بعد آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اصل ارشاد میں لتصغی الیہ

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

افئدۃ الذین لا یومنون بالآخرۃ صغو کے معنے اصل میں مائل ہونے اور جھکنے کے آتے ہیں مطلب یہ ہے کہ شیاطین جو باطل پر حق کا لیبل لگا کر اور بے دینی کو دین بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ اس طریق سے لوگوں کو اپنے دام تزویر میں پھانسنا چاہتے ہیں اور یہ بھی وجہ ہے کہ وہ اس طریق سے یہ چاہتے ہیں کہ فکرِ آخرت سے آزاد لوگ ان کی بات کو شرفِ پذیرائی دیں، لیکن دونوں میں فرق کر دیا۔ پہلی بات کو غرور مفعول لہ لا کر ظاہر کیا جب کہ دوسری بات کو لام تعلیل کے ساتھ بیان کیا ہے کیونکہ فریب دینا اور دھوکہ دینا خود اس کا کام جو باطل کو ملمع کاری کر کے پیش کرتا ہے اور دلوں کا متوجہ ہونا اس کی دعوتِ باطل کا اثر ہے۔ دونوں میں فرق ظاہر کرنے کے لیے تعبیر میں فرق کر دیا۔

ثانیاً یہ ملمع کاری اس لیے بھی ہوتی ہے کہ لوگوں کی نگاہوں میں ان کی بات کھپ جائے اور لوگ اسے پسند کر لیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس ملمع کاری سے ان کا بنیادی مقصد رائے عامہ کو گمراہ کرنا ہے اور اس گمراہی کے لیے ضروری ہے کہ بات اس انداز سے پیش کی جائے کہ لوگوں کا مذاق اسے اپنا لے۔ اسی بات کو یہاں قرآن نے لیرضوہ سے تعبیر کیا ہے۔

ثالثاً تیسری وجہ اس ملمع کاری کی یہ بتائی گئی ہے کہ رائے عامہ بھی ان ہی برائیوں میں ملوث ہو جائے جن میں وہ شیاطین خود مبتلا ہیں۔ اقتراف کے معنے کمائی کرنے کے آتے ہیں یہاں برائیاں کمانے کے معنے میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عام شہری زندگی ان برائیوں میں مبتلا ہو جائے جن میں وہ خود مبتلا ہیں۔ خدا سے عابدانہ تعلقات ٹوٹ کر اس کی مخلوق سے لوگوں کے عابدانہ تعلقات وابستہ ہو جائیں اور اس کے نتیجے میں ساری معاشرتی، اخلاقی، معاشی اور سیاسی برائیاں ان میں جنم لے لیں۔ جھوٹ، وعدہ خلافی، خیانت اور بددیانتی، غداری اور دغابازی، حرص اور بے ایمانی، سود خواری اور شراب نوشی، فخر و غرور اور ظلم و جبر جیسے رذائل پرورش پا جائیں۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

جب صورتِ حال یہ ہے تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں ؟ حالانکہ اسی نے پوری تفصیل کے ساتھ تمہاری طرف کتاب نازل کی ہے[۱۴۱]۔ اور جن لوگوں کو ہم نے تم سے پہلے کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تمہارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے لہٰذا تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو[۱۴۲]، اور تمہارے رب کا فرمان صداقت اور عدالت کے اعتبار سے تمام ہے، کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے اور وہ سب کچھ

۱۴۳
سنتا اور جانتا ہے۔

معانی مفردات

حکمؔ، وہ جس سے لوگ فیصلہ کرائیں اور جس کے فیصلہ پر راضی ہوں، مفصّلاً کھول کر بیان کیا گیا ہو جس میں حق اور باطل، حلال و حرام کی وضاحت ہو، المُمتَرین، امتراء سے ہے شک کرنا، تردد رکھنا، کلمۃ، لفظ کلمہ فقرہ کو بھی کہتے ہیں، ایک معنے اور ایک موضوع پر مشتمل بات کو بھی کہتے ہیں، کسی موضوع پر کئی اشخاص تقریر کریں یا مقالہ لکھیں ان میں سے ہر تقریر اور ہر مقالہ کو کلمہ کہیں گے۔ اہلِ عرب پورے قصیدے کو بھی کلمہ کہتے ہیں، اسی لیے یہاں کلمہ سے مراد قرآن ہے۔ تمّت، تمام سے ہے تمام کے معنے امام راغب نے یہ بتاتے ہیں۔ بات یا کام کا اس حد تک پہنچ جانا کہ اس میں کسی اور چیز کی حاجت نہ ہو۔ صدقؔ، سچائی، راستی، عدلؔ، برابری، صداقت اخبار میں اور عدالت احکام میں ہوتی ہے۔

قرآن نبوّت کا سب سے بڑا اعجاز ہے

اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ نبوّت سے معجزات کا مطالبہ کرنے والے اپنے اس دعوے میں قطعاً جھوٹے ہیں کہ اگر معجزے کی نمائش ہو جائے تو وہ ایمان لے آئیں گے اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ نبوّت کا اعجازی شاہکار قرآن ہے۔ رسالت اور نبوّت کے موضوع پر بھی فیصلہ کن دلیل ہے۔ قرآن حکیم صرف فصاحت و بلاغت ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنی تمام حیثیات کے لحاظ سے اعجاز کامل ہے۔ اس کے اعجاز کامل ہونے کی مختصر ترین دلیل یہ ہے کہ ۱۳۹۹ سال گزرے ہیں کہ کوہ صفا کی چٹان پر کھڑے ہو کر ایک اُمّی نے دُنیا سے یہ غیر متزلزل تحدی کی کہ وہ اس کا جواب پیش کرے تو کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ان تیرہ صدیوں کا ایک ایک سال گزر گیا مگر ایک آواز بھی اس چیلنج کو قبول کرنے کے لیے بلند نہ ہوئی۔ اگر صرف فصاحت و بلاغت ہی کو معیارِ اعجاز قرار دیا جائے تو کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ عین اس وقت جب ایک اُمّی کی طرف سے جو ایک شعر تک موزوں نہ پڑھ سکتا تھا یہ مدعیانہ اعلان عرب میں شائع ہوا

اس وقت عرب کے قبیلہ قبیلہ میں زباں آور شعراء اور آتش بیان خطباء موجود تھے مگر اس صورت بردی کے سامنے سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ کفار عرب نے اسلام اور پیغمبر اسلام کی تکذیب کی کیا کیا کوششیں کیں، انہوں نے اس راہ میں جان و مال قربان کیا، دین و کیش کو برباد کیا۔ اپنے عزیزوں اور فرزندوں کو نثار کیا، خود اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھیں۔ ان کے سپاہیوں نے میدان جنگ میں پرے جمائے، ان کے دولت مندوں نے اپنے خزانے کھول دیے، ان کے شاعروں اور خطیبوں نے اپنی آتش بیانیوں سے تمام ریگستان عرب کو تنور بنا دیا۔ یہ سب کچھ کیا مگر یہ نہ ہو سکا کہ قرآن مجید کی ایک سورت کا جواب دیتے جو نبوت کے دعویٰ حق و صداقت کو پل جھپکنے میں تار تار کر دیتا، کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس کی مثال لانے سے بالکل عاجز تھے۔ اور جب وہ جو زبان کے اصل مالک اور محاورۂ عرب کے طبعی ماہر تھے اس کے مقابلہ سے عاجز تھے تو اس زمانہ کے بعد کے لوگوں کے لیے تو یہ عجز و درماندگی اور زیادہ نمایاں ہے حسان بن ثابت، عامر بن اکوع، الطفیل بن عمرو، زید الخیل، زبرقان، شماس، اسود بن سریع، کعب بن زہیر، عبداللہ بن رواحہ وغیرہ عرب کے مشہور زباں آور شاعر تھے مگر قرآن کے سامنے انہوں نے سر نیاز خم کیا۔ لبید عرب کے مشہور شاعر اور سبعہ معلقہ کی بزم مشاعرہ کے ایک رکن تھے۔ اسلام کے بعد جب حضرت عمرؓ نے ان سے چند اشعار کی فرمائش کی تو انہوں نے جواب دیا جب خدا نے مجھے بقرہ اور آل عمران سکھائی تو مجھے شعر کہنا زیبا نہیں ہے۔

یہاں قرآن نے اعجاز قرآن کے لیے فصاحت و بلاغت سے ہٹ کر دوام صداقت اور عدالت کو معیار بنا کر پیش کیا ہے۔

۱۱۴ جب صورت حال یہ ہے تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں حالانکہ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ تمہاری طرف کتاب نازل کی ہے یعنی شیاطین الانس والجن کی تلبیس و تلمیع پر بدعقیدہ اور جاہل ہی کان دھر سکتے ہیں۔ ایک پیغمبر یا اس کے متبعین جو ہر مسئلہ اور ہر معاملہ میں خدائے واحد ہی کو اپنا منصف اور حکم مان چکے ہیں کیا ان سے یہ ممکن ہے کہ وہ خدا کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی چکنی چپڑی باتوں کی طرف کان لگائیں یا معاذاللہ غیر اللہ کے فیصلہ کے آگے گردن جھکا دیں حالانکہ ان کے پاس خدا کی جانب سے ایسی معجز اور کامل کتاب ہے جس میں تمام اصولی چیزوں کی ضروری توضیح و تفصیل ہے[1] یہ بات نبوت کی زبان سے مشرکین کے مجادلہ کا جواب ہے کہ تم مجھ سے خدا کی عبادت و طاعت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے موضوع پر اُلجھ رہے ہو۔ سوال یہ ہے کہ اس معاملہ میں کہ عبادت اور طاعات کا خدا کے سوا کوئی اور بھی حقدار ہے کیا کوئی اور بھی شریک ہے یا وہ تنہا اس کا حقدار ہے کہ اس کی عبادت کی جائے سوچ کر بتاؤ کہ اس کا فیصلہ میں اللہ کے علاوہ اور کس سے کراؤں اور اللہ کے سوا اس معاملہ کا فیصلہ کون کر سکتا ہے۔ یہ بات تم بھی مانتے ہو کہ اس فیصلہ کا حق صرف اللہ کو ہے۔ اگر خدا ہی کو یہ حق ہے اور لاریب اسی کا حق ہے تو میرے لیے یہ بات کس طرح جائز ہے کہ میں اس کے سوا کسی اور کو اس معاملے میں حکم مانوں؟ اور جب تمام جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کے لیے اس نے ایک دستور زندگی تمہاری طرف اتار دیا ہے جس میں تفصیل کے ساتھ افکار و قوانین کھول کر بتا دیے ہیں پھر اب کسی آیت تکوینی یا اعجاز مادی کی ضرورت کیا ہے۔ اس کتاب الٰہی کے افکار و شرائع کا میرے جیسے شخص پر نازل ہونا اس بات کی سب سے بڑی نشانی ہے کہ یہ کتاب اللہ کی جانب سے ہے۔ میں تو چالیس سال تم میں رہ چکا ہوں۔ فقد لبثت فیکم عمراً من قبلہ۔ یہ نبوت کی صداقت کی سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل ہے یعنی ساری باتیں چھوڑ دو صرف اس ایک بات پر غور کرو کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی نہیں ہوں جس کے اطوار واحوال تمہیں معلوم نہ ہوں، تم ہی میں سے ہوں اور اعلانِ وحی سے پہلے ایک پوری عمر تم میں بسر کر چکا ہوں۔ یہ کتاب اللہ نے نازل کی یہ میرے دعویٰ نبوت کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اول تو یہ کہ یہ کتاب خدا کی نازل کردہ ہے دوسرے یہ کہ یہ کتاب کامل ہے، تیسرے یہ کہ اس میں افکار سے لے کر زندگی کے سارے عملی گوشوں کے لیے اصول کلیات کھول کر بتائے گئے ہیں۔ یہ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا سرچشمہ ہے، صحفِ انبیاء اور افکارِ عالیہ کے نقوش کا پاسبان ہے۔ اصولِ قانون، مبادی اخلاق اور محاسن علم و عمل اس کی آغوش میں ہیں، علم و حکمت کے پوشیدہ اسرار یہ فاش کرتا ہے۔ اس سے بڑھ کر میری نبوت کی صداقت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ یہ خدا کی مفصل کتاب ہی میرے نبی ہونے اور میری باتوں کی صداقت کا فیصلہ کرتی ہے۔

عُلماءِ اہلِ کتاب کی شہادت

۱۱۴ــ اور جن لوگوں کو ہم نے تم سے پہلے کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تمہارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوتی ہے لہٰذا تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔ یعنی جس کی نسبت عُلمائے اہل کتاب بھی کتب سابقہ کی بشارات کی بنا پر خوب جانتے ہیں کہ یقیناً یہ آسمانی کتاب ہے[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ قرآن کے کتاب الہٰی ہونے کی تمام وہ لوگ جو کتب آسمانی کا علم رکھتے ہیں اور جنہیں انبیاءؑ کے مشن سے واقفیت ہے شہادت دیں گے۔ یعنی یہ جہلاء اگر اس کے مخالف ہیں تو ان کی پروا نہ کرو۔ اصولی بات ہے کہ فن آشنا ہی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ اس فن کی کتاب ہے یا نہیں جیسے اگر ایک شخص ڈاکٹری کے موضوع پر کتاب لے کر آتا ہے تو اطباء ہی صاحب کتاب کے طبیب و ڈاکٹر ہونے کا فیصلہ کر سکتے ہیں، اگر نحو کی کتاب لے کر آئے تو نحوی ہی یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ صاحب کتاب نحوی ہے ٹھیک اسی طرح وحی پر ایمان رکھنے والے نبوت کو ماننے والے اور علوم نبوت کو جاننے والے ہی یہ بات جانتے ہیں کہ قرآن اللہ کی وحی ہے بلکہ وحی کا درجہ کمال لے کر نازل ہوا ہے اور انسان ساری علمی وسعتوں کے باوجود اس کی مثال نہیں لا سکتا ہے قرآن نے یہی بات دوسرے موقعہ پر اس طرح کہی ہے

اولم یکن لهم آیة ان یعلمه علماء بنی اسرائیل

یعنی علماء بنی اسرائیل اس بات سے واقف ہیں کہ جو تعلیم قرآن عزیز میں دی گئی ہے وہ ٹھیک وہی تعلیم ہے جو سابق کتب آسمانی میں دی گئی ہے۔ اہل مکہ خود علم کتاب سے نا آشنا سہی بنی اسرائیل کے اہل علم تو گرد و پیش کے علاقوں میں بکثرت موجود ہیں وہ جانتے ہیں یہ کوئی انوکھی اور نرالی بات نہیں ہے جو آج پہلی مرتبہ محمد بن عبد اللہ نے لا کر تمہارے سامنے رکھ دی ہو بلکہ ہزارہا برس سے خدا کے نبی یہی بات پے درپے کہتے رہے ہیں کیا یہ بات اس امر کا اطمینان کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ یہ قرآن اسی سلسلہ کی کڑی ہے جو پہلے انبیاءؑ کی وساطت سے دنیا میں آتی رہی ہے۔

سیرت ابن ہشام کی روایت سے معلوم ہوتا کہ ماضی قریب میں یہ واقعہ پیش آچکا تھا کہ حبشہ سے حضرت جعفر طیار کی تقریر سن کر ۲۰ آدمیوں کا ایک وفد مکہ آیا اور اس نے مسجد حرام میں قریش کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور یہ دریافت کیا کہ آپ کیا تعلیم لائے ہیں۔ حضور نے جواب میں ان کو کچھ قرآن کی آیات سنائیں اس پر ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے اور وہ اسی وقت آپ کے رسول برحق ہونے پر ایمان لے آئے، پیچھے پڑھ آئے ہو کہ نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر نے اسلام پر تقریر کی اور سورۂ مریم کی آیتیں پڑھ کر سنائیں تو نجاشی پر رقت طاری ہو گئی اور اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور کہا، خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں۔ بتانا یہ ہے کہ قرآن کی صداقت کی یہ دلیل ہے کہ علمائے بنی اسرائیل اس کو سچائی کی گواہی دیتے ہیں۔

آخر میں فرمایا فلا تکونن من الممترین، خطاب بظاہر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن روئے سخن دوسروں کی طرف ہے مطلب یہ ہے کہ حالات کی ساری ناسازگاریوں کے باوجود قرآن کے حکم ہونے

کامعاملہ ہو کر رہنا ہے کیونکہ قرآن خدا کی جانب سے الحق ہو کر نازل ہوا ہے یعنی یہ باقی اور دائم رہنے والی حقیقت ہے۔ مستقبل کو مشکوک نگاہوں سے نہ دیکھو۔ تم علمبردارِ حق ہو اور کامیابی حق ہی کی ہو کر رہے گی سو حق کی حقیقت تو خود اس کی اپنی کسوٹی پر پرکھی جاتی ہے۔ اگر اس کے حق میں خارجی شہادت ہی مطلوب ہو تو یہ بات کافی ہے کہ اہلِ علم اور نبوت آشنا لوگ اس کے حق میں شہادت دیں اگرچہ ان کی تعداد کتنی کم ہو، یہ نہ دیکھو کہ قرآن کے ساتھ اکثریت کا رویہ کیا ہے بلکہ یہ دیکھو کہ تم حق کی ہمنوائی میں اپنے فرائض کہاں تک ادا کر رہے ہو اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ حق و باطل کی جنگ میں حق ہی کا بول بالا کرتا ہے اور بس۔

قرآن کا اعجاز صدق و عدل ہے

۱۱۵- اور تمہارے رب کا فرمان صداقت اور عدالت کے اعتبار سے تمام ہے، کوئی اس کے فرامین کا تبدیل کرنے والا نہیں ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ یعنی جس کی تمام خبریں سچی اور تمام احکام معتدل اور منصفانہ ہیں جس میں کسی کی طاقت نہیں کہ تبدیل و تحریف کر سکے ایسی کتاب اور مکمل و محفوظ قانون کی موجودگی میں کیسے کوئی مسلمان وساوس و اوہام یا محض عقلی قیاسات اور مغویانہ مغالطات کا شکار ہو سکتا ہے جبکہ وہ جانتا ہے کہ خدا تعالیٰ جس کو ہم نے اپنا حکم اور جس کی کتاب مبین کو دستور العمل تسلیم کر لیا ہے وہ ہماری ہر بات سننے والا اور ہر قسم کے مواقع و احوال اور ان کے مناسب احکام و نتائج کی موزونیت کو پوری طرح جاننے والا ہے [1]

اس آیت میں قرآن کے بارے میں صداقت، عدالت کے ذریعے تمامیت کا دعویٰ کر کے اس کے دوام کا اعلان کیا ہے اور ان تینوں کی اجتماعی حالت کا نام کمال ہے۔

صداقت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن اپنی تمام خبروں میں راستی، سچائی اور واقعیت لے کر آیا ہے فطرت بشری کے عجز اور بے چارگی کا سب سے بڑا نظارہ مستقبل سے ناواقفیت اور جہالت ہے۔ انسان کی مضطرب اور بے چین فطرت مستقبل کے بحرِ ظلمات میں ہاتھ پاؤں مارتی ہے اور تھک کر اپنی نادانی اور جہالت کا اعتراف کر لیتی ہے اور اسی لیے وہ اس بات پر مجبور ہے کہ جو انسانیت سے مافوق کسی دعویٰ کا مدعی ہو اس کی آزمائش اور امتحان کے لیے اسی بحرِ بیکراں کی شناوری کو معیار اور سند قرار دے۔ چنانچہ یہی اخبارِ غیب اور پیشین گوئی کی قدرت نبوت و رسالت کے ثبوت پر نوعِ انسانی کے عام

[1] افادات شیخ الاسلام

افراد کے نزدیک ایک دلیل بیّن اور حجت قائم ہے اور اسی لیے بنی اسرائیل کے نزدیک نبی اور پیغمبر کی صرف اس قدر حقیقت ہے کہ وہ غیب کا قاصد اور جہان نادیدہ کا مخبر ہے۔ بلحاظِ صداقت قرآن کے تمام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے جو جو وعدے کیے ہیں اور جو جو خبریں دی ہیں اور مخالفین کو جو وعیدیں سنائی ہیں وہ حرف بحرف حقیقت پر مبنی اور واقعات پر مشتمل ہیں۔ سب سے زیادہ شاندار سب سے زیادہ واضح سب سے زیادہ معرکۃ الآرا غلبہ روم کی پیشین گوئی ہے۔

عرب کے چپ و راست دونوں پہلوؤں میں روم و فارس کی پرزور حکومتیں قائم تھیں۔ اس وقت ایران کا تاجدار خسرو اور روم کا فرمانروا ہرقل تھا۔ ان دونوں سلطنتوں میں ایک مدت سے معرکہ آرائیوں کا سلسلہ قائم تھا۔ بعثت نبوی کے پانچویں سال یعنی ۶۱۳ میں ان دونوں ہمسایہ سلطنتوں میں ایک خونریز جنگ شروع ہو گئی۔ اگرچہ ان دونوں قوموں میں کسی قوم نے مذہب اسلام قبول نہیں کیا۔ تاہم رومی حضرت عیسٰی کے پیرو اور اہل کتاب تھے اور ایرانیوں کے عقائد مشرکین مکہ کے عقائد کے ساتھ مطابقت رکھتے تھے اس لیے لازمی طور پر مسلمانوں کی ہمدردیاں عیسائیوں اور مشرکین کی ایرانیوں کے ساتھ تھیں دونوں جنگ کے نتائج کا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔ ان دونوں سلطنتوں کے حدود دریائے دجلہ و فرات کے کناروں پر ملتے تھے۔ رومی سلطنت مشرق میں ایشیائے کوچک حدودِ عراق، شام، فلسطین اور مصر میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایرانیوں نے دوطرفہ حملہ کیا ایک طرف تو وہ دجلہ و فرات کے کناروں سے شام کی طرف بڑھے اور دوسری طرف ایشیائے کوچک کی جانب سے آذربائیجان سے آرمینیا ہو کر موجودہ اناطولیہ میں داخل ہو گئے اور دونوں طرف سے رومیوں کو پیچھے ہٹاتے ہٹاتے سمندر میں دھکیل دیا۔ شام کی سمت میں انہوں نے یکے بعد دیگرے اس ارضِ مقدس کا ایک ایک شہر رومیوں سے چھین لیا ۶۱۴ء میں فلسطین اور اس کا مقدس شہر یروشلم صلیبی علم کے بجائے درفش کاویانی کے زیر سایہ آگیا کلیسے مسمار کیے گئے، مذہبی شعائر کی توہین کی گئی۔ ۲۶ ہزار یہودیوں نے ایرانی فوج میں شامل ہو کر ۶۰ ہزار بے گناہ عیسائیوں کا قتل عام کیا۔ ایرانی فتوحات کا سیلاب اس سے آگے بڑھ کر ۶۱۶ء میں پوری وادئ نیل پر محیط ہو گیا اور آخر اسکندریہ پر جا کر ٹھہرا اور دوسری طرف ساری ایشیائے کوچک کو تباہ کرتا ہوا باسفورس کے ساحل پر جا کر رکا اور قسطنطنیہ کی دیواروں سے جا ٹکرایا۔

جنگ کا نتیجہ جب ایسا خلافِ امید ظاہر ہوا تو مسلمانوں کو یقیناً رنج اور مشرکین مکہ کو خوشی حاصل ہوئی۔ ان حالات میں معرکہ جنگ سے بہت دور اور ایک خشک و بنجر زمین کی سنسان پہاڑی سے ایک شہزادہ امن نمودار ہوا اور واقعاتِ عالم کے بالکل خلاف قرآن کے نغمہ قدس میں اعلان کیا۔

غلبت الروم فی ادنی الارض و ھم من بعد غلبھم سیغلبون فی بضع سنین
للہ الامر من قبل و من بعد۔

رومی قریب ترین زمین میں مغلوب ہو گئے لیکن وہ چند سال میں مغلوب ہونے کے باوجود
پھر غالب ہوں گے پہلے اور بعد میں حکم اللہ ہی کا ہے۔

قرآن کی یہ خبر واقعات کے لحاظ سے اس قدر بعید از عقل اور ناقابلِ یقین تھی کہ کفار نے اس کے صحیح ہونے کی صورت میں اونٹوں کے ہارنے کی مسلمانوں سے شرط لگالی۔ اب مسلمانوں اور کافروں کو بڑی بے تابی سے واقعات کے پہلو کا انتظار تھا۔ آخر بضع سنین چند سال کے بعد دُنیا نے خلافِ اُمید پلٹا کھایا، مورخ گبن کے الفاظ میں،

شہنشاہی جو اپنی ابتدائی اور آخری زندگی میں سستی عیاشی اور اوہام کا غلام اور رعایا کے مصائب کا نام دتماشائی بنی ہوئی تھی جس طرح صبح و شام کا کہرا آفتاب نصف النہار کی روشنی میں پھٹ جاتا ہے دفعتہً ۶۲۱ محلوں کا ارکاڈیوس میدانِ جنگ کا ہیرو بن گیا اور روم و ہرقل کی عزت نہایت شاندار طریقہ سے بچالی گئی۔[1]

جس وقت ہرقل اپنی بقیہ فوج لے کر قسطنطنیہ سے چلا تھا لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ روما الکبریٰ کے لشکر ملک کا منظر دُنیا کے سامنے ہے لیکن قرآن کی خبر حرف بحرف پوری ہوئی اور اس نے دُنیا سے اپنی صداقت کا لوہا منوالیا اور یہ عین اس وقت ہوا جب مسلمانوں نے بدر کے میدان میں قریش کو شکست دی۔ اس عظیم الشان خبر کی صداقت نے دُنیا کو محوِ حیرت کر دیا۔ قریش کے بہت سے لوگ اس صداقت کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے۔ واقعہ کے ساڑھے بارہ سو برس کے بعد تاریخ زوالِ روم کا مشہور مصنف گبن اس حیرت انگیز قرآنی خبر کی صداقت سے متحیر ہو کر کہتا ہے:

مشرق کی ان دو عظیم الشان سلطنتوں کے ڈانڈے پر بیٹھ کر ان دولوں کی ایک دوسرے کو تباہ کر دینے والی روز افزوں کوششوں کی ترقی کو دلی مسرت کے ساتھ بغور مطالعہ کر رہا تھا اور عین اس وقت جبکہ ایرانیوں کو پیہم کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں اس نے اس پیشین گوئی کی جرأت کی کہ چند سال میں فتح و ظفر رومی علم پر سایہ افگن ہوگی جس وقت یہ پیشین گوئی کی گئی تھی کوئی پیشین گوئی اس سے زیادہ دور از قیاس نہیں ہو

---

[1] تاریخ زوالِ روم بحوالہ سیرت النبیؐ

سکتی تھی کیونکہ ہرقل کی بارہ سال کی ۶۱۰ سنہ سے ۶۲۲ سنہ تک حکومت نے اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ رومی شہنشاہی کا شیرازہ جلد بکھر جائے گا۔[1]

برادر اس قسم کی دوسری خبریں جو قرآن نے دی ہیں ان میں بھرپور صداقت ہے۔ صداقت کے اعتبار سے قرآن کے تمام ہونے کا مطلب شارحین قرآن نے یہی بتایا ہے کہ خبروں اور وعدوں میں قرآن پورا اُترا ہے اور یہ قرآن کا نمایاں اعجاز ہے۔ اور عدل کے اعتبار سے قرآن کے پورا ہونے کا مطلب شارحین قرآن نے ایک تو یہ بتایا ہے کہ قرآن اپنے احکام اور فیصلوں میں عدل وانصاف لے کر آیا ہے دوسرا مطلب یہ بتایا ہے کہ قرآن کا عدل میں تمام ہونا یہ ہے کہ وہ کفر وایمان کی سزا اور جزا ٹھیک بتاتا ہے۔ یعنی جو لوگ حق کے معاندین ہیں ان کو سزا ہوگی اور جو لوگ حق کو مانتے ہیں اور اس کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں ان کو جزا ملے گی۔ یہ درست ہے لیکن اگر یوں کہا جائے کہ قرآن اپنے قضایا اور احکام میں افراط وتفریط سے الگ نقطۂ اعتدال لے کر آیا ہے اور عدل کے اعتبار سے قرآن کے تمام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن قانون اور اخلاق دونوں لے کر آیا ہے۔ اگرچہ دونوں کا منشا ایک ہی ہے مگر منزل مقصود تک پہنچنے کی راہیں دونوں کی الگ الگ ہیں اور تنہا ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کمی ہے جس کی تلافی دوسرے سے ہوتی ہے۔ قانون برائیوں کو تو روک دیتا ہے مگر دل میں اس بُرائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا جو انسانیت کی جان ہے اور اخلاق پر عمل کرنے کے لیے کسی کو بزور مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اس کے ذریعے عدل وانصاف کا قیام اور برائیوں کا استیصال کلیتہً نہیں ہو سکتا۔ تورات محض قانون ہے اور انجیل محض اخلاق، اسی لیے یہ دونوں الگ الگ امن وامان اور عدل وانصاف کے قیام اور فتنہ وفساد اور بدلیوں اور برائیوں کے انسداد کے لیے پوری طرح کافی نہیں ہے۔ قرآن ایسا جامع نظامِ حیات ہے جو عدل واحسان اور قانون اخلاق کا جامع ہے۔ اس جامعیت کی شان قرآن میں دو حیثیتوں سے پائی جاتی ہے ایک تو یہ کہ قرآن نے تورات کی طرح اخلاق کو قانون کی شکل نہیں دی اور نہ انجیل کی طرح قانون کو مذہب کے ہر حصہ سے خارج کر کے قانون کو بھی اخلاق بنا دیا، بلکہ قرآن نے قانون واخلاق کے درمیان حدِ فاصل قائم کر کے ہر ایک کی حد مقرر کر دی ہے اور قانون کو قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھ کر انسانیت کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ اس طرح قرآن قانون واخلاق دونوں کا مجموعہ ہے۔

[1] تاریخ زوالِ روم بحوالہ سیرت النبیؐ

آخر میں فرمایا لا مبدل لکلماتہ یعنی قرآن کے فرامین کو بدلنے والا کوئی نہیں ہے۔ قرآن سے پہلے کوئی کتاب الٰہی دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے پورے طور پر بری نہیں رہی۔ لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دُنیا میں باقی نہیں اور جو باقی ہے وہ فنا ہو ہو کر نئے نئے قالب میں بدلتا رہا ہے۔ تورات جل جل کر خاک ہوئی پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر کی گئی اور ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی۔ انجیل میں تحریف وجعل تو اسی زمانے میں شروع ہو چکا تھا۔ پھر مترجموں کی کثرت نے حقیقت بالکل مشتبہ کر دی۔ زردشت کا صحیفہ سکندر کی نذر ہوا، ان کتابوں کا یہ حال اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دائمی اور آخری کتاب بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ اسی بنا پر ان کی دائمی حفاظت کا وعدہ نہیں کیا گیا تھا لیکن قرآن کی نسبت یہ وعدہ ہوا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے باقی اور محفوظ رہے گا اور اس میں کسی قسم کا ردّ وبدل اور تصرف نہ ہو گا لا مبدل لکلماتہ کے دو معنے ہیں ایک یہ کہ اس میں کوئی تبدیلی نہ کرے گا اس لیے یہ قیامت تک محفوظ ہے اور دوسرے یہ کہ اب کوئی اور کتاب اور نبی قیامت تک نہیں آئے گا جو اس کے احکام کو بدل دے۔ اس طرح اس فقرے میں تین باتیں آگئی ہیں ایک قرآن کے دائمی کتاب ہونے کی دوسرے اس کے ہر تغیر و تصرف محفوظ ہونے کی اور تیسرے آخری کتاب ہونے کی،

یہاں تک قرآن کا بھرپور چہرہ یہ پیش کیا گیا ہے

اولاً، یہ خدا کی اتاری ہوئی کتاب ہے

ثانیاً، اس میں ہدایت سے متعلق اصول و کلیات کی تفصیل ہے۔

ثالثاً ہمارے علمائے اہلِ کتاب کی علمی تائید حاصل ہے۔

رابعاً، یہ کتاب اپنے دامن میں الحق لے کر آئی ہے۔

خامساً، اس کتاب کا مستقبل تابناک ہے

سادساً، اس کی خبروں، وعدوں اور وعیدوں میں صداقت ہے

سابعاً، یہ قانون و اخلاق کا مکمل مجموعہ ہے

ثامناً، یہ کتاب ہر قسم کی تحریف و تصرف سے محفوظ ہے

تاسعاً، یہ کتاب دائمی اور آخری ہے

عاشراً، یہ کتابِ الٰہی حکم بن کر آئی ہے۔

آخر میں فرمایا وھو السمیع العلیم، اس فقرے کے دو مطلب ہیں اگر روئے سخن اہلِ ایمان کی طرف ہے تو مطلب یہ ہے کہ جس کی نازل کردہ اس عظیم المرتبت کتاب کو تم نے اپنا دستورِ حیات بنایا

ہے وہ تمہاری ہر بات سننے والا اور ہر قسم کے احوال کے مطابق احکام کی مناسبت کو پوری طرح جاننے والا ہے۔ اور اگر روئے سخن مخالفین و معاندین کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی جھوٹی قسموں اور مادی معجزات کے مطالبات کو سننے والا اور ان کی اہل ایمان اور نبوت کے خلاف سازشوں کو اور ان کے ہر کام میں ان کے مقاصد، ان کے ارادوں کو خوب جاننے والا ہے۔ ان سے بے پروا ہو کر کام کرو۔ ان کے مطالبات کو پرکاہ برابر وقعت نہ دو۔ لہٰذا اے مسلمانو! اس قرآن کے ہوتے ہوئے جو صداقت اور عدالت کے اعتبار سے کامل ہے تمہیں کسی کو حکم بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن کے معجزہ ہونے کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ یہ اپنی آغوش میں دوسری خوبیوں کے ساتھ صداقت اور عدالت لئے کر آیا ہے۔ تورات قانون و شریعت ہے لیکن اخلاق و موعظت نہیں۔ انجیل اخلاق و موعظت ہے لیکن قانون و شریعت نہیں۔ زبور مناجاتوں اور دعاؤں کا مجموعہ ہے لیکن دیگر صفات سے خالی۔ مسیح کے صحیفہ میں خطابت و وعظ کی ہنگامہ آرائیاں ہیں مگر استدلال اور فکر و نظر کی دعوت نہیں۔ صحف بنی اسرائیل پیشین گوئیوں سے لبریز ہیں مگر دقائق حکمت اور اسرار ایمان سے خالی ہیں۔ دنیا میں یہ ایک ہی کتاب الٰہی ہے جو قانون و شریعت بھی ہے اور اخلاق و موعظت بھی، مخاطبات قلبی اور دعاؤں کا گنجینہ بھی ہے اور دیگر کتب الٰہیہ کی مجموعی صفتوں کا حامل بھی۔ خطابت بھی ہے اور استدلال و فکر بھی۔ اظہار غیب اور پیشین گوئیوں سے لبریز بھی ہے اور دقائق حکمت و اسرار ایمان و عمل سے معمور بھی، اور ان سب کے ساتھ عین اس وقت جب کتب الٰہی تحریف و تغیر اور تراجم و تعبیر سے اپنی اصلی زبان اور اصلی الفاظ کھو چکی ہیں، اس کی بقا اور حفاظت کی یہ ذمہ داری کہ تیرہ سو برس کے بعد بھی اس کے ایک ایک حرف ایک ایک نقطہ میں تغیر و تبدل نے راہ نہیں پائی۔ وہ اپنی زندگی جاوید کے لیے کاغذ کے نقوش و حروف کی محتاج نہیں کہ لاکھوں انسان کے سینے اس کے خزانے ہیں وہ اسی زبان اور انہی الفاظ اور انہی حروف کے قالب میں اب تک جلوہ گر ہے جس میں دست قدرت نے اس کو ڈھالا تھا اور جبریل امین نے اتارا تھا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو امت کے ہاتھوں میں سونپا تھا۔ اس عظیم الشان کتاب کے ہوتے ہوئے کیا کسی اور معجزے کی ضرورت ہے اور کیا کسی اور چیز کو حکم بنانے کی ضرورت ہے۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ
اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ اِنَّ رَبَّكَ
هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَكُلُوْا
مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ وَمَا لَكُمْ
اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ
عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ
بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾
وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ
الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ
اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى
اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع ۱۴ ۱۱

اور اے پیغمبر اگر تم روئے زمین کی اکثریت کی اطاعت کرو گے تو وہ

تمہیں راہِ حق سے بہکا دیں گے وہ تو صرف گمانوں کے پیروکار ہیں اور
صرف اٹکل سے قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔[۱۴۴] بلاشبہ تیرا رب ہی خوب
جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بہک رہا ہے اور یہ بھی اسی کو خوب
علم ہے کہ راہِ ہدایت پر کون گامزن ہیں۔[۱۴۵] لہٰذا تم ان جانوروں میں
سے بلا کھٹکے کھاؤ جن پر ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو اگر تم خدا
کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو۔[۱۴۶] اور تمہارے لیے کیا رکاوٹ ہے کہ جس
جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہے اسے نہ کھاؤ حالانکہ جو کچھ تم پر حرام کیا
گیا ہے اُسے اللہ نے تمہارے سامنے کھول کر بیان کر دیا ہے ہاں
حالات کی مجبوری جو کچھ تمہیں کھلائے وہ اس سے مستثنیٰ ہے۔[۱۴۷] اور
بہت سے لوگ بغیر علم کے محض اپنی خواہشات سے لوگوں کو بہکاتے
رہتے ہیں بلاشبہ تیرا پروردگار عدوان پیشہ لوگوں سے خوب واقف ہے[۱۴۸]
اور مسلمانو! جلوت اور خلوت کا ہر گناہ چھوڑ دو، یقیناً جو لوگ

گناہ کرتے ہیں ان کو اپنے جرائم کی ضرور سزا ملے گی۔ اور یاد رکھو کہ جس [۱۴۹]
جانور پر خدا کا نام نہ لیا جائے اُسے مت کھاؤ اس کا کھانا نافرمانی کی
بات ہے۔ [۱۵۰] اور بلا ریب شیاطین اپنے رفقاء کے دلوں میں وسوسے
ڈالتے رہتے ہیں تاکہ وہ تم سے اُلجھا کریں اور اگر تم نے ان کی
اطاعت کرلی تو سمجھ لو کہ تم بھی شرک کرنے والے ہو۔ [۱۵۱]

معانی مفردات

تطع اطاعت سے ہے جس کے معنے حکم ماننے کے ہیں، صیغہ واحد مذکر حاضر مضارع، اطاعت خواہ مُردے کی ہو یا زندہ کی عربی لغت میں دونوں اطاعت ہیں۔ یضلّو ضلال سے مضارع مجزوم کا جمع مذکر غائب ہے، گمراہ کرنا، بہکانا، بھٹکانا اور سیدھے راستہ سے ہٹا دینا۔ سبیل اللہ، اللہ کا راستہ، حافظ ابو السعادات ابن الاثیر الجزری لکھتے ہیں۔
"سبیل اللہ لفظ عام ہے جو ہر اس خالص عمل کے لیے آتا ہے جس کی بدولت حق کے تقرب کی راہ پر فرائض، نوافل اور انواع عبادات کی ادائیگی کے ذریعے گامزن ہو اور جب یہ مطلق ہو تو بیشتر جہاد کے معنے میں آتا ہے حتیٰ کہ کثرت استعمال کی وجہ سے ایسا ہو گیا کہ گویا اسی معنے میں منحصر ہو۔ یتبعون، اتباع سے مضارع مرفوع کا جمع مذکر غائب ہے اس کے معنے پیروی کرنا، باب افتعال ہے۔ ظن، لغت کے اعتبار سے ظن یقین اور شک کے خلاف کسی خاص ادراک کا نام نہیں بلکہ علامات اور دلائل کی بنا پر جو انسان کا تخمینہ اور اٹکل قائم ہوتی ہے وہ ظن ہے۔ اس اعتبار سے ظن علم و یقین، شک و وہم اور کذب سب سے عام ہے اور سب کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے علمی اصطلاحات

میں ظن سے اس کے منطقی معنے مراد ہوتے ہیں لیکن لغوی اعتبار سے یہ ٹھیک ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے جہاں ہم اُردو میں اٹکل بولتے ہیں۔ یخرصون، وہ اٹکلیں چلاتے ہیں وہ تجویزیں کرتے ہیں، وہ جھوٹ بولتے ہیں، خرص سے مضارع کا جمع مذکر غائب ہے خرص اصل میں پھلوں کے اندازہ لگانے کو کہتے ہیں۔ اضطررتم، تم بے اختیار کیے لاچار کیے گئے۔ اضطرار سے ماضی مجہول کا جمع مذکر حاضر ہے۔ اضطرار کے اصل معنے انسان کو کسی ضرر رساں چیز پر مجبور کرنے کے ہیں۔ اھواء، ہوٰی کی جمع ہے۔ باب سمع سے ہَوِی یہوٰی چاہنے اور خواہش کرنے کے معنے میں ہے۔ معتدین، اعتداء سے اسم فاعل ہے حد سے گزرنے والے، عدو مادہ ہے، اسی سے عدوان ہے حد سے گزر جانے کے معنے میں ہے جلوت کے گناہ کو عدوان کہتے ہیں۔

اطاعت میں شرک کی ممانعت

اب تک توحید عبادت کے موضوع پر مشرکانہ اعمال کی تردید تھی۔ ان آیات میں توحید طاعت کے موضوع پر مشرکانہ اعمال سے منع کیا گیا ہے۔ آپ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اب تک ان کا چہرہ پیش کیا گیا ہے جو اللہ سبحانہٗ کی الوہیت پر چور دروازے سے ڈاکہ مارتے ہیں اور اب ان کا ذکر ہو رہا ہے جو اللہ سبحانہٗ کی ربوبیت پر شب خون مارتے ہیں یا یوں کہہ دو کہ یہاں تک اللہ کی پرستش میں آمیزش کرنے والوں کی اصلاح کی ہے اور اب اللہ کی بندگی میں ملاوٹ کرنے والوں کی طرف توجہ فرمائی ہے۔ عبادت میں شرک سنگین جُرم ہے۔ اس کو تو سب جانتے ہیں لیکن طاعت میں شرک بھی شرک ہے اور از روئے قرآن حرام ہے یہ عام نظروں سے ایک عرصہ سے اوجھل رہا ہے اس پر محقق اُمت شاہ عبدالعزیز نے خاص طور پر تنبیہہ فرمائی ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ شرک کی ایک قسم شرک فی الطاعۃ بھی ہے۔ دراصل اللہ سبحانہٗ کی دو شانیں ہیں، شان محبوبیت اور شان حاکمیت۔ محبوبیت کی وجہ سے اللہ کی عبادت کی جاتی ہے اور حاکمیت کی وجہ سے اللہ کی طاعت کی جاتی ہے۔ محبوبیت میں نیابت نہیں ہوتی ہے اور حاکمیت میں نیابت ہوتی ہے۔ اسی بنا پر انبیاءؑ کو اللہ کا خلیفہ کہا ہے۔ حاکمیت میں نیابت کی وجہ سے طاعت رسُول کا حکم ہے بلکہ ان تمام اہلِ ایمان کی طاعت جائز ہے جن کے ہاتھوں میں اللہ و رسُول کی طاعت کا دامن ہو۔ قرآن میں اطاعت کے موضوع پر بار بار اطیعوا اللہ کے ساتھ اطیعوا الرسُول پڑھو گے بلکہ اس سے آگے

واولی الامر منکم بھی پڑھو گے لیکن عبادت کے موضوع پر کہیں اعبدوا اللہ ورسولہ نہیں پڑھو گے۔ شاہ عبدالقادر نے اپنی تفسیر میں شرک فی العبادۃ اور شرک فی الطاعۃ کی تشریح فرمائی ہے شرک فی العبادت کے موضوع پر لا تنکحوا المشرکات پر لکھتے ہیں یہ کہ اللہ کی تعظیم کسی اور پر خرچ کرے مثلاً کسی چیز کو سجدہ کرے اور اس سے حاجت مانگے مختار جان کر اور ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ شرک فی الطاعۃ کے موضوع پر لکھتے ہیں کہ شرک فرمایا حکم میں شریک کرنے کو۔ اس دقیق فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے کچھ لوگ تو طاعت رسول ہی کو خیر باد کہہ بیٹھے اور کچھ ائمہ اجتہاد کی طاعت کو ناجائز بتانے لگے۔ اور کچھ تاویل کر کے غیر اللہ کی عبادت کرنے لگے۔ یہ سب افراط و تفریط ہے۔ جادۂ اعتدال یہ ہے کہ عبادت میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی مستحق اللہ کی ذات ہے۔ یہ اسی کی ذات ہے جو انسانوں کی پکار سنتی اور ان کی دعائیں قبول کرتی ہے۔ دعا استعانت، رکوع و سجود، نذر و نیاز، اعتماد و توکل، انابت و تضرع، خشوع و خضوع اور اس طرح کے تمام نیازمندانہ اعمال وہ اعمال ہیں جو خدا اور اس کے بندوں کا رشتہ قائم کرتے ہیں۔ اور طاعت میں اللہ کی بالذات طاعت کی جاتے اور اللہ کے رسول کی رسول ہونے کی وجہ سے طاعت کی جائے اور مجتہدین کرام کی نائب رسول ہونے کی وجہ سے۔ ہاں جن کے ہاتھ میں اللہ و رسول کی طاعت کا دامن نہ ہو وہ خواہ کوئی ہو ارباب روایت ہوں یا ارباب اجتہاد، ارباب ولایت ہوں یا ارباب سیاست کسی کی طاعت بھی از روئے قرآن صرف حرام نہیں بلکہ شرک ہے اور ان آیات میں قرآن اسی شرک کا ذکر کر رہا ہے۔ چونکہ طاعت کا مدار طاقت ہے اور طاقتوں میں سب سے بڑی طاقت عددی طاقت ہے اس لیے سب سے پہلے یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ خدا کے قانون کے مقابلے میں اگر روئے زمین کی اکثریت بھی آپ کے مقابلے پر آجاتے پھر بھی آپ کو اسی دستور پر چلنا ہے جو آپ کو دے کر ہم نے روانہ کیا ہے اور بتا دیا ہے کہ حق و باطل کے معاملے میں انسانوں کی قلت و کثرت معیار نہیں ہو سکتی بلکہ حقیقت اور سچائی کے بنیادی اصولوں پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ بسا اوقات گمراہی و حق فراموشی کے ایسے اوقات آجاتے ہیں کہ نوع انسانی کی اکثریت حق و یقین کی روشنی سے محروم ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی دور نزول قرآن کے وقت بھی دنیا پر چھایا ہوا تھا۔ فرمایا یہ نہ دیکھو کہ اکثریت کیا کہتی ہے یہ دیکھو کہ حق کیا اور کدھر ہے کون سی راہ یقین و بصیرت کی راہ ہے اور کون سی جہل و گمان کی راہ ہے۔

۱۱۶ اور اے پیغمبر اگر تم روئے زمین کی اکثریت کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں راہ حق سے بہکا

دیں گے وہ تو صرف گمان کے پیروکار ہیں اور محض اٹکل سے قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ مشاہدہ اور تاریخ بتلاتے ہیں کہ دنیا میں ہمیشہ فہیم، محقق اور با اصول آدمی تھوڑے رہے ہیں۔ اکثریت ان ہی لوگوں کی ہوتی ہے جو محض خیالی، بے اصول اور اٹکل پچو باتوں کی پیروی کرنے والے ہوں۔ اگر تم اسی اکثریت کا کہنا ماننے لگو اور بے اصول باتوں پر چلنا شروع کر دو تو خدا کی بتلائی ہوئی سیدھی راہ سے یقیناً وہ تم کو بہکالیں گے۔ یہ بات آپ پر رکھ کر دوسروں کو سنایا ہے[1]۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آپ اللہ سبحانہ کی نازل کردہ کتاب کے خلاف اہل کفر میں سے کسی کی بھی اطاعت کریں گے تو وہ آپ کو اللہ کے دین سے ہٹا دیں گے لہٰذا آپ کو اور پیروکاروں کو چاہیے کہ خدا کے نازل فرمودہ نظام حیات کی موجودگی میں کسی کے حکم کی طاعت نہ کریں خدا کا نازل کردہ دستور حیات ہی تام اور کامل دستور ہے۔ لوگوں کو آپ اسی کی دعوت دیں۔ آگے اس کی وجہ بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ ان لوگوں نے زندگی کا جو ڈھانچہ بھی فکری، روحانی، اخلاقی، عائلی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی تیار کیا ہے اس کی اساس علم و یقین پر نہیں بلکہ گمان و وہم پر ہے اور یہ جو کچھ بنا رہے ہیں محض خیالی پلاؤ، تخمین اور اندازے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ علم کی بجائے قیاس اور گمان کی پیروی کر رہے ہیں۔ ان کے عقائد، تخیلات، فلسفے، اصول زندگی اور قوانین عمل سب کے سب قیاس آرائیوں پر مبنی ہیں۔ اس کے برعکس اللہ کا راستہ یعنی اسلام دنیا میں زندگی بسر کرنے کا وہ طریقہ ہے جو اللہ کی رضا کے مطابق ہے۔ اگر آپ اس کے مقابلے میں ان کے راستہ کو اپنائیں گے اور ان کی اطاعت کریں گے تو یہ آپ کو بہکا دیں گے اور منزل مقصود آپ سے گم ہو جائے گی۔ آپ کے چلنے کے لیے راستہ صرف وہی ہے جس کا علم اللہ نے آپ کو دیا ہے نہ کہ وہ جس کو لوگوں نے بطور خود اپنے قیاسات سے تجویز کیا ہے۔ یہ نہ دیکھنا چاہیے کہ اکثریت کس طرف ہے یہ دیکھنا چاہیے کہ حق کیا اور کدھر ہے خواہ اس پر چلنے والا دنیا میں اکیلا ہو۔ آپ کو خدا کی جانب سے جو علم ملا ہے وہ وحی الٰہی کا نور مبین اور علم قطعی ہے۔ اس کے سوا دنیا میں عقل اور علوم کے نام پر جو کچھ بھی ہے سب ظن اور اٹکل ہے۔

آیت قرآنی کا منطوق تو یہی ہے لیکن اس کے مدلول اور مفہوم سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے۔

بعثت کے وقت دنیا کی ضلالت

اول یہ کہ یہ آیت بتا رہی ہے کہ بعثت کے وقت دنیا کی اکثریت گمراہی اور بے راہ روی کی شکار

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تھی۔ آئیے ہم دیکھیں کہ آفتابِ نبوت طلوع ہونے کے وقت کون کون قومیں دُنیا میں حکمران تھیں اور ان کی مذہبی و اخلاقی حالت کیا تھی۔ اس وقت رُوئے زمین کی اہم طاقتیں دو تھیں فارس اور روم، فارس کا مذہب مجوسیت تھا جس کا دائرہ عراق سے لے کر پاکستان کی سرحد تک محیط تھا اور روم کا مذہب عیسائیت تھا جو یورپ، ایشیا اور افریقہ کے تینوں براعظموں کو گھیرے ہوئے تھا لیکن مذہبی حیثیت سے دو اور قومیں بھی قابلِ ذکر ہیں جن میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ قدامت کا دعویٰ ہے اور وہ یہود اور ہنود ہیں۔ ان سب کے حالات ایک ایک کر کے تاریخ میں پڑھیے اور پھر ظہورِ اسلام کے وقت عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت پڑھیے تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ چھٹی صدی مسیحی بلا اختلاف تاریخِ انسانی کا تاریک ترین و پست ترین دور تھا۔ صدیوں سے انسانیت جس پستی و نشیب کی طرف جا رہی تھی اس کے آخری نقطہ کی طرف پہنچ گئی تھی۔ روئے زمین پر کوئی ایسی طاقت نہ تھی جو گرتی ہوئی انسانیت کا ہاتھ پکڑ سکے اور ہلاکت کے غار میں گرنے سے روک سکے نشیب کی طرف جاتے ہوئے روز بروز اس کی رفتار میں تیزی پیدا ہو رہی تھی۔ انسان اس صدی میں خدا فراموش ہو کر خود فراموش بن چکا تھا وہ اپنے انجام سے بالکل بے فکر اور بے خبر اور بُرے بھلے کی تمیز سے قطعاً محروم ہو چکا تھا۔ پیغمبروں کی دعوت کی آواز عرصہ ہوا دب چکی تھی۔ جن چراغوں کو انبیاء روشن کر گئے تھے وہ ضلالت کے ہواؤں کے طوفان میں یا تو بالکل بجھ چکے تھے یا اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اس طرح ٹمٹما رہے تھے جن سے صرف چند قدر شناس دل روشن تھے جو شہروں کو چھوڑ کر چند گھروں میں بھی اجالا نہیں کر سکتے تھے۔ دیندار اشخاص دین کی امانت کو اپنے سینہ سے لگاتے ہوتے زندگی کے میدان سے کنارہ کش ہو کر دیر و کلیسا اور صحراؤں کی تنہائیوں میں پناہ گزین ہو گئے تھے اور زندگی کی کشمکش، اس کے مطالبات اور اس کی خشک و تلخ حقیقتوں سے دامن بچا کر دین و سیاست اور روحانیت و مادیت کے معرکے میں شکست کھا کر اپنے فرائض قیادت سے سبکدوش ہو گئے تھے اور جو زندگی کے اس طوفان میں باقی رہ گئے تھے۔ انہوں نے بادشاہوں اور اہلِ دُنیا سے سازباز کر لی تھی اور ان کی ناجائز خواہشات اور ظالمانہ نظام سلطنت و معیشت میں ان کی دستِ راست اور باطل طریقہ پر لوگوں کا مال کھانے اور ان کی قوت و دولت سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں ان کے شریک و سہیم بن گئے تھے۔

رومی و ایرانی اس وقت مغرب و مشرق کی زعامت اور دُنیا کی قیادت کے اجارہ دار بنے ہوتے تھے وہ دُنیا کے لیے کوئی اچھا نمونہ ہونے کے بجائے ہر قسم کی خرابی اور فساد کے علمبردار اور ذمہ دار

تھے۔ مختلف اجتماعی، اخلاقی امراض کا عرصہ سے یہ ساری قومیں آشیانہ بنی ہوئی تھیں۔ ان کے افراد تعیش و تکلفات کی زندگی اور مصنوعی تمدن کے سمندر میں سرتاپا غرق تھے۔ بادشاہ اور حکام خواب غفلت میں مدہوش اور نشۂ سلطنت میں سرشار تھے۔ کام و دہن کی لذت اور خواہشات نفس کی تسکین کے سوا ان کو دنیا میں کوئی فکر اور زندگی میں کوئی اور مشغلہ نہ تھا۔ زندگی کی ہوس اور لذت کی حرص اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان کو کسی طرح سیری نہیں ہوتی تھی۔ متوسط طبقہ کے لوگ اس اعلیٰ طبقہ کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرتے تھے اور اس کی نقالی کو سب سے بڑا فخر سمجھتے تھے باقی رہے عوام تو وہ زندگی کے بوجھ اور حکومت کے مطالبات اور محصولات کے بار میں ایسے دبے ہوئے اور غلامی اور قانون کی زنجیروں اور بیڑیوں میں ایسے جکڑے ہوئے تھے کہ ان کی زندگی جانوروں اور چوپاؤں سے ذرا مختلف نہ تھی۔ دوسروں کی راحت کے لیے محنت کرنے اور دوسروں کی عیش و عشرت کے لیے بے زبان جانوروں کی طرح ہر وقت جتے رہنے اور جانوروں کی طرح اپنا پیٹ بھر لینے کے سوا ان کا کوئی حصہ نہ تھا۔ کبھی اگر وہ اس خشک و بے مزہ زندگی اور اس کے یکساں چکر سے اکتا جاتے تو نشہ آور چیزوں اور سستی تفریحات سے اپنا دل بہلا لیتے اور اگر کبھی زندگی کے اس عذاب سے ان کو سانس لینے کا موقع ملتا تو فاقہ زدہ اور ندیدہ انسان کی طرح مذہب و اخلاق کی پابندیوں سے آزاد ہو کر حیوانی لذتوں پر آنکھیں بند کر کے گرتے۔

دنیا کے مختلف حصوں اور ملکوں میں ایسی دینی غفلت و خود فراموشی اجتماعی بے نظمی، انتشار اور اخلاقی تنزل و زوال رونما تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ممالک تنزل و انحطاط اور شر و فساد میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون سا ملک دوسرے سے بڑھا ہوا ہے۔

اس دور میں بڑے بڑے مذہب بازیچۂ اطفال اور منافقین کا تختۂ مشق بن گئے تھے۔ ان مذاہب کی صورت و حقیقت دونوں اس درجہ مسخ ہو گئی تھی کہ اگر یہ ممکن ہوتا کہ کسی طرح ان مذاہب کے پیشوا دنیا میں آکر اپنے دین کا حال دیکھ لیں تو قطعاً وہ اپنے مذاہب نہ پہچان سکیں۔ تہذیب و تمدن کے گہواروں میں خود سری، بے راہ روی اور اخلاقی پستی کا دور دورہ تھا۔ نظام حکومت میں حد درجہ ابتری تھی، حکام کی سخت گیری اور عوام کی اخلاقی گراوٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قومیں اپنے اندرونی مسائل ہی میں الجھ کر رہ گئی تھیں۔ دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے ان کے پاس نہ کوئی پیغام تھا اور نہ انسانیت کے لیے کوئی دعوت تھی۔ درحقیقت یہ اقوام و مذاہب اندر سے کھوکھلے

ہو چکے تھے ان کی زندگی کا شجر تناخشک ہو چکا تھا۔ ان کے پاس نہ دینی ہدایات تھیں اور نہ نظامِ حکومت کے لیے مستحکم و معقول اصول۔

قرآن نے اس ساری صورتِ حال کو اکثر من فی الارض یضلوک کی معجزانہ بلیغ تعبیر میں پیش کیا ہے

عددی اکثریت میں فلاح کی ضمانت نہیں

دوسری بات اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو رہی ہے کہ اگر ایک طرف اللہ و رسول کی ہدایت ہو اور اس کے مقابلے میں دوسرا فکر دوسرا ضابطہ دوسرا قانون ہو اور اس فکر و قانون کی حامل بہت بڑی عددی اکثریت ہو۔ قرآن کی روشنی میں یہ عددی اکثریت اس عددی اقلیت کے مقابلہ جو قرآن و سنت کی حامل ہو سراسر ضلالت اور گمراہی ہے اور قرآن و سنت کے مقابلے میں پائے استحقار سے ٹھکرا دینے کے لائق ہے۔

یہاں ایک اہم سوال یہ ہے کہ افراد اور عام شہریوں کے باہمی اختلافات کو تصفیہ کرنے کے لیے وہ قوت کہاں سے آئے جو قرآن کے لفظوں میں حکم کا کام دے سکے اور جس کے فیصلے کو دونوں فریق بخوشی تسلیم کر لیں۔ یہ تو ناممکن ہے کہ افراد میں کبھی کوئی اختلاف اور نزاع نہ ہو۔ تصوری مملکت میں جب کبھی افراد اور مملکت کے درمیان نزاع ہوتی ہے تو اس جھگڑے کا ایک فریق یعنی مملکت خود ہی حکم بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حکم کے یکطرفہ فیصلوں سے دوسرا فریق یعنی فرد کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا جیسے قریش مکہ کی سرکار اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم میں نزاع ہو رہا تھا۔ پھر چونکہ سرکار مادی طاقت سے مسلح ہے اس لیے وہ اپنے فیصلے کو بجبر منوائے گی اور افراد بادلِ نخواستہ اس کے فیصلہ کی اطاعت پر مجبور ہوں گے۔ حالانکہ وہ خود اس نزاع میں ایک فریق کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مملکت کے ساتھ افراد کی وفاداری کا جذبہ کمزور ہو جائے گا جو بالآخر اس کے ضعف و انتشار پر منتج ہو گا یہ دشواری صرف تصوری مملکت ہی میں نہیں بلکہ جمہوری مملکت میں بھی ہے۔ یہاں بھی کوئی غیر جانبدار حکم باہمی اختلافات و تنازعات کا تصفیہ نہیں کر سکتا۔ جمہوری نظام میں معاملات کا تصفیہ افراد کی اکثریت کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس لیے اگر کسی امر کی نسبت اختلاف رائے پیدا ہو جائے تو اس کا تصفیہ اکثریت کی عددی طاقت سے کیا جاتا ہے یعنی یہاں بھی دو فریقوں میں سے ایک فریق خود حکم بن جاتا ہے۔ اقلیت ہمیشہ چار و ناچار اکثریت کے فیصلوں پر تسلیم و رضا کا سر جھکا دیتی ہے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ یہ اقلیت اکثریت کے مقابلے میں تعداد کے لحاظ سے بہت کم ہو بلکہ اگر افراد کا ۵۱ فی صدی حصہ ایک رائے رکھتا ہو اور ۴۹ فی صدی اس رائے سے اختلاف رکھتے ہوں تو یہ مختصر اکثریت بھی اقلیت

کو دبانے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ اس صورتِ حال سے دو امکانات پیدا ہوتے ہیں اوّلاً یہ کہ اقلیت اس حکم کا فیصلہ ماننے سے انکار کردے جو خود ایک فریق ہے۔ اس صورت میں اکثریت و اقلیت کی آویزش انقلاب اور خانہ جنگی کو جنم دے سکتی ہے جس سے معاشرتی نظام درہم برہم ہوجائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اقلیت کو عددی اکثریت کے سامنے سرنگوں ہو جانا پڑے اور اس کا فیصلہ ماننے پر مجبور ہو۔ لیکن یہ حق کی فتح نہیں طاقت کی فتح ہوگی اور اس کا کوئی یقین نہیں ہو سکتا کہ اکثریت اپنی عددی طاقت کے باوجود برسرِ حق ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اکثریت کا فیصلہ ہر صورت صحیح ہو کیونکہ تمدنی امور اور انسانی معاملات میں صحت و صداقت کا حصول یوں ہی بہت دشوار ہے اور ایسے نظام میں تو اس کا بہت کم امکان ہے جہاں عوام کے جذبات و خواہشات اور ان کی فکری رسائی پر معاملات کے تصفیہ کا دار و مدار ہو۔

اس سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آتی ہے کہ جب تک افراد کے باہمی تنازعات اور مملکت اور فرد کے اختلافات کا تصفیہ کرنے کے لیے کوئی حکم موجود نہ ہو اس وقت تک معاشرہ یا مملکت میں استحکام پیدا نہیں ہو سکتا لیکن اس حکم میں ایک خصوصیت کا پایا جانا بے حد ضروری ہے جس کے بغیر اس کا وجود بے معنے ہے وہ یہ ہے کہ فریقین یعنی افراد اور مملکت یا خود افراد کی مختلف جماعتیں اس کے عدل و انصاف اور غیر جانبداری پر مطمئن ہوں۔ نیز اس کی اصابتِ رائے اور صحتِ فکر ان سب کے نزدیک اتنی مسلّم ہو کہ وہ اس کے فیصلوں میں غلطی یا خطا کے امکان کا تصور بھی نہ کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ اس شرط کی تکمیل کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت سے نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کوئی انسان خواہ کتنا ہی صحیح الرائے کیوں نہ ہو غلطی اور خطا سے بری نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً جب کہ تمدنی اور معاشرتی امور میں انسان کے شخصی امیال و عواطف اس کا انفرادی نقطۂ نظر جو خود اس کے ذاتی تجربات پر مبنی ہوتا ہے اور اس کی ذہنی خصوصیات اس کی رائے یا فیصلہ کی تشکیل میں دخیل ہوتی ہیں۔ جماعت کے فیصلوں پر بھی یہی بات صادق آتی ہے اور اس کے علاوہ کوئی انسان ہو یا جماعت اس کے فیصلہ کی صحت سے بآسانی انکار کیا جا سکتا ہے۔ ان سب پہلوؤں پر غور و فکر کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا ناگزیر ہے کہ ان شرائط کی تکمیل صرف وہی ذات کر سکتی ہے جو انسان سے ماوراء اور مافوق ہو۔ افغیر اللہ ابتغی حکماً میں یہی بات بتائی گئی ہے اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس مملکت کی اساس الہامی ہدایات اور الہامی قوانین و ضوابط پر نہ ہو وہ سرتاسر گمراہی اور بے راہ روی کی داعی ہے وہ انسانیت کی فلاح معاشرے کے استحکام اور تمدنی امن و عافیت کا ہرگز سامان فراہم نہیں کر سکتی۔ الہامی ضابطہ اور دستور العمل ہی وہ حکم ہے جسے ایک مرتبہ تسلیم کر لینے کے بعد انسان اپنے اختلافات اور نزاعوں میں اس کی طرف

رجوع کرسکتا ہے کیونکہ اس کا ماخذ ایک فوق الانسان ہستی کا ارادہ ہے اور اس کا صدور ایک ایسی ذات کی طرف سے ہوتا ہے جو خطا اور لغزش سے پاک ہے۔ اللہ کی ذات گرامی الہامی ہدایات کا سرچشمہ ہے۔ جس مملکت کے افراد وحی پر مبنی قوانین پر اپنی معاشرتی زندگی کی بنیاد رکھتے ہیں اس کے اندر اختلافات کبھی اس حد تک نہیں بڑھ سکتے کہ وہ پورے معاشرتی اور سیاسی نظام کو خطرے میں ڈال دیں۔ ایسا سماج انقلاب کی شورشوں سے محفوظ رہے گا۔ افراد اپنے شخصی اغراض و مفاد کے لیے کتنی ہی خونریزیاں کریں لیکن معاشرہ کی بنیادیں کبھی تبدیل نہیں ہوسکتی ہیں۔

حاکمیت جمہور اور قرآن

آیت میں اکثریت پر اضلال کے قرآنی فتوے سے یہ اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حاکمیت جمہور کے خلاف ہے۔ حاکمیت جمہور کا منشا یہ ہے کہ ایک قوم کے عوام اپنی خواہشات اور اپنی آراء میں ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہیں وہ جس چیز کو چاہیں کثرت آراء سے اپنے لیے خود حلال یا حرام ٹھہرا سکتے ہیں۔ مذہب واخلاق کا کوئی ضابطہ ان کے فیصلے کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتا۔ چونکہ کسی ریاست کی اصل قوت کا انحصار وہاں کے عوام پر ہوتا ہے اس لیے اس سے خواہ مخواہ یہ نتیجہ نکال لیا گیا ہے کہ حاکمیت بھی انہی کی ہونی چاہیے۔ اس فلسفہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے حاکم و محکوم کی دوئی کو مٹا دیا ہے اب عوام ہی حاکم بھی ہیں اور محکوم بھی۔ بظاہر یہ نظریہ نہایت معقول معلوم ہوتا ہے۔ اس نظریہ کی اصل اساس یہ ہے کہ عوام کی مرضی ہی اصل حاکم ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام کی مرضی کس طرح معلوم کی جائے۔ ہر فرد کی رائے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ اتنی متضاد آراء میں سے ایک ایسی رائے کا تلاش کرنا جو سب کے لیے قابل قبول ہو جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ قرآن کے نزدیک حاکمیت جمہور کی نہیں بلکہ حاکمیت اللہ کی ہے افغیر اللہ ابتغی حکماً اس کی صراحت ہے۔ حاکمیت فرد واحد کی ہو یا ایک گروہ یا ایک پارٹی کی ہو سب کا قدر مشترک یہ ہے کہ تخت اقتدار پر متمکن ہونے کے بعد افراد اور گروہ اپنے کو غیر مسئول سمجھتے ہیں اور زندگی اس طرز پر گزارتے ہیں گویا وہ کائنات کے بلاشرکت غیرے حاکم ہیں۔ کائنات اور اس میں جو کچھ ہے وہ سب ان کا ہے وہ اسے جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ قرآن نے اسی الجھن سے انسانیت کو بچانے کے لیے حاکمیت کو اللہ کے لیے خاص کر دیا ہے ان الحکم الا للہ غیر اللہ کے آگے سر جھکانا انسان کے لیے موت ہے زمین پر خدا کے خلیفہ اور نائب کی حیثیت سے انسان کا کمال مطلوب یہ ہے کہ وہ ذات الٰہی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قرب پیدا کرے

اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ گیارہویں پارے میں آئے گی یہاں صرف اشارات پر اکتفا کیا گیا ہے۔

ظن و علم کا مفہوم اور اس کی تحقیق

یہاں تیسرا یہ سوال بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اگر اکثریت کی حاکمیت اس لیے غلط ہے کہ اکثریت گمراہی اور بے راہ روی کی شکار ہے اور گمراہی کی وجہ یہ ہے کہ ان یتبعون الا الظن وان ھم الا یخرصون کہ وہ اتباع ظن کر رہے ہیں یعنی علم و بصیرت سے ان کے دامن خالی ہیں تو پھر اصول حدیث میں جو یہ بات بتائی گئی کہ آحاد مفید ظن ہیں اور اصول فقہ میں جو یہ بتایا گیا ہے کہ اجتہادی سرمایہ ظنی ہے۔ اس کے بارے میں قرآن کی رہنمائی کیا ہے۔

یہاں ظن کی حقیقت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ایک طرف منکرین حدیث نے شور مچا رکھا ہے کہ خبر واحد مفید ظن ہوتی ہے مفید یقین نہیں ہوتی لہٰذا دین کی بنیاد غیر یقینی چیزوں پر کیسے رکھی جا سکتی ہے اور پھر اس سلسلے میں تمام وہ آیات کہ جن میں ظن کی مذمت کی گئی ہے بڑے زور شور سے پیش کر کے سادہ لوح عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔ دوسری طرف منکرین قیاس نے ہنگامہ اٹھا رکھا ہے کہ قیاس و اجتہاد پر عمل کی حیثیت اتباعِ ظن سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اس موقع پر امام رازی نے تفسیر کبیر میں ان لوگوں کی ترجمانی کی ہے اور لکھا ہے کہ تمسک نفاۃ القیاس بھذہ الایۃ یعنی قیاس کے منکرین نے مخالفتِ قیاس پر اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ ان دونوں فرقوں کے نتیجہ میں قانون کے عملی ماخذ سنّت اور خود سارے نظامِ قانون کی حیثیت عام نگاہوں میں مشکوک ہو کر رہ گئی۔

دراصل اس غلط فہمی کا اصلی سبب ظن کی حقیقت سے ناواقفیت ہے۔ اس لیے پہلے علماء کی زبانی کچھ ظن کے بارے میں سُن لیجئے :

علامہ قاضی ابو بکر بن العربی احکام القرآن میں رقمطراز ہیں :

ہمارے علماء نے کہا کہ ظن کی حقیقت دل میں دو باتوں کا ٹھہر لینا ہے اس طرح کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح ہو اور شک کا مطلب ان دونوں کو برابر رکھنا ہے اور علم کہتے ہیں ان دونوں میں سے ایک کو گرا کر دوسرے کو متعین کر دینے کو۔

اور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں :

نشان اور علامت سے جو علم حاصل ہو اس کا نام ظن ہے۔ جب علامت قوی ہو تو اُسے علم کہتے ہیں اور جو بہت زیادہ کمزور ہو تو پھر وہم کی حد سے آگے نہیں ہوتا۔ پھر

جب ظن قوی ہوتا ہے یا قوی کی طرح اس کا تصور کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ اَنَّ مشددہ
اور اَنْ کا استعمال ہوتا ہے جو مخففہ من المثقلہ ہوتا ہے اور جو ضعیف ہوتا ہے تو پھر
اس کے ساتھ اس اَنَّ اور اَنْ کا استعمال ہوتا ہے جو معدوم قول و فعل کے ساتھ خاص ہیں۔
اور علامہ مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں لکھتے ہیں۔

ظن اس تردد راجح کا نام ہے کہ جو اعتقاد غیر جازم کی طرفین کے مابین ہوتا ہے
اور محکم میں ہے کہ اس کے معنے شک اور یقین کے ہیں مگر وہ یقین نہیں جو معائنہ سے
حاصل ہو بلکہ وہ یقین جو تدبر سے پیدا ہوتا ہے اور جو یقین کہ معائنہ سے حاصل ہوتا ہے
اس کے لیے سوائے علم کے اور کسی لفظ کا استعمال نہیں ہوتا۔ اور مناوی کہتے ہیں کہ ظن
اس اعتقاد راجح کا نام ہے جس کے ساتھ اس کی نقیض کا احتمال بھی ہو۔ نیز شک اور
یقین میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اور بصائر میں ہے کہ ظن قرآن عزیز میں چار طرح
پر آیا ہے یقین کے معنے میں، شک کے معنے میں، تہمت کے معنے میں اور گمان
کرنے کے معنے میں۔

غرض لغت میں ظن یقین اور شک کے خلاف کسی خاص ادراک کا نام نہیں ہے بلکہ علامات و
نشانات اور دلائل کی بنا پر جو انسان کا ایک تخمینہ قائم ہوتا ہے وہ ظن ہے اس اعتبار سے ظن علم و یقین
شک و وہم اور کذب سب سے عام ہے اور سب کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔ رہا اس کا فیصلہ کہ کونسا
ساظن علم و یقین میں داخل ہے اور کونسا شک و وہم میں شامل ہے۔ بہ حسب تصریح ثعلب و راغب
اصفہانی ان دلائل و علامات کی بنا پر ہوگا جن کی بنا پر اس ظن کا حصول ہوا ہے۔

ہاں بلاشبہ مناطقہ کی اصطلاح میں ظن اعتقاد راجح کا نام ہے ان کے یہاں اگر قضیہ کی صورت
کا حصول بلا تردد ہو تو وہ تخییل ہے اور اگر نسبت باہمی کا ادراک اس طرح ہو کہ اس میں تردد ہے اور
جانبین کی تجویز برابر ہے تو اس کو شک کہتے ہیں اور اگر نسبت کا تصور اس طرح ہو کہ جانب مخالف
کا رجحان ہے تو ادراک مرجوح کو وہم اور ادراک راجح کو ظن کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے منطقی اصطلاح
میں ظن اس اعتقاد کا نام ہے کہ جس میں اس کی نقیض کا احتمال بھی باقی رہے اور اس اعتقاد میں نقیض کا
احتمال نہ ہو تو پھر وہ جزم کہلاتا ہے۔ پھر یہ جزم اگر مطابق واقع نہیں ہے تو جہل مرکب ہے اور اگر
مطابق واقع ہے مگر کسی شک ڈالنے والے کے شک سے زائل ہو جاتا ہے تو اس کو تقلید کہیں گے
ورنہ اس کا نام یقین ہو گا۔ اس لحاظ سے منطقیوں کے یہاں تصدیق کی سب سے اعلیٰ قسم کا نام یقین

ہے اور سب سے ادنیٰ قسم کا نام ظن ہے۔ علمی اصطلاحات میں عام طور پر ظن سے اس کے منطقی معنے مراد ہوتے ہیں۔ لیکن لغوی اعتبار سے یہ ٹھیک ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے جہاں ہم اُردو میں اٹکل کا لفظ بولتے ہیں۔ صحابہ کے استعمالات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ظن کو اُردو کے اٹکل کے موقعہ پر بولتے تھے لہٰذا جو خیال واقعہ کی تحقیق کے بغیر اپنی جانب سے پکا لیا جاتے صحابہ کے یہاں ظن کہلاتا تھا خواہ وہ رجحان کے مرتبے کو پہنچے یا نہ پہنچے۔ اسی ظن کے بارے میں حضرت عمرؓ فرماتے ہیں :

دین کے بارے میں رائے تو صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صواب تھی، ہم تو صرف اٹکل سے کہتے ہیں انما ھو منا الظن والتکلف ،

اس میں حضرت عمرؓ نے قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ کیا ہے لتحکم بین الناس بما اراک اللّٰہ اس کا مطلب صاف اور کھلے لفظوں میں یہ ہے کہ جو رائے اللہ سبحانہٗ کی اراءت اور اصابت کے ساتھ ہو اس کا نام رائے ہے اور وہی صواب بھی ہو سکتی ہے اور جو محض اپنی جانب سے اٹکل ہو خدائے تعالیٰ کی اراءت اور اصابت کے ساتھ ہو اس کا نام رائے ہے اور وہی صواب بھی ہو سکتی ہے اور جو محض اپنی جانب سے ایک اٹکل ہو اس کا نام ظن ہے۔ اسی ظن کو رائے بھی کہا جاتا ہے اور انہی معنی میں قرآن میں رائے زنی کی ممانعت ہے یعنی محض اپنی عقل سے کسی شرعی بنیاد کے بغیر کوئی بات کہہ دینا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں۔

میں کس زمین کے اوپر اور کس آسمان کے نیچے رہ سکتا ہوں اگر قرآن کی کسی آیت میں صرف اپنی رائے سے کوئی بات کہوں یا ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں،

اگر کسی کے پاس کوئی علم کی بات ہو تو وہ لوگوں کو سکھلائے اور اگر علم نہیں رکھتا تو وہ بات منہ سے نہ نکالے جس کا اس کو علم نہیں تاکہ متکلفین میں اس کا شمار نہ ہو جاتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ تکلف یہ ہے کہ جب کسی بات کا علم نہ ہو تو بے علمی کو چھپانے کے لیے اپنی جانب سے کوئی بات گھڑ لی جائے اسی کو ظن کہتے ہیں اور یہی قرآن کی اسی آیت کی روح ہے لا تقف ما لیس لک بہ علم مطلب یہ ہے کہ لوگ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں وہم و گمان کی جگہ علم کی پیروی کریں۔ اسلامی معاشرے میں اس منشا کی ترجمانی وسیع پیمانے پر اخلاق میں قانون میں، سیاست اور ملکی انتظام میں، علوم و فنون اور نظامِ تعلیم میں غرض ہر

شعبہ حیات میں کی گئی ہے۔ اور ان بے شمار خرابیوں سے فکر و عمل کو محفوظ کر دیا گیا جو علم کے بجائے گمان اور تخمین کی پیروی کرنے سے انسانی زندگی میں رونما ہوتی ہیں۔ اخلاق میں ہدایت کی گئی کہ بدگمانی سے بچو اور کسی شخص اور گروہ پر بلا تحقیق کوئی الزام نہ لگاؤ۔ قانون میں یہ مستقل طے کر دیا گیا کہ محض شبہ کی بنا پر کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ تفتیش جرائم میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ گمان پر کسی کو پکڑنا، مار پیٹ کرنا قطعاً ناجائز ہے۔ نظام تعلیم میں ان نام نہاد علوم کو ناپسند کیا گیا جو محض ظن و تخمین اور لاطائل قیاسات پر مبنی ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عقائد میں اوہام پرستی کی جڑ کاٹ دی گئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

> کتاب اللہ کا جو علم اللہ تعالیٰ تجھے مرحمت فرمائے اس پر اس کا شکر ادا کر اور اس کا جو علم اللہ نے اپنے لیے مخصوص کر رکھا ہے اور تجھے نہیں بتایا اس کے متعلق تکلف مت کر اور اس کا جو عالم ہے اس کے سپرد کر کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے فرمایا ہے قل ما اسئلکم علیہ من اجر و ما انا من المتکلفین آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے مزدوری نہیں چاہتا ہوں اور میں تکلف کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے "دین میں رائے زنی سے بچو" بتانا یہ چاہتا ہوں کہ سلف اور صدر اول میں ظن اور رائے اپنی جانب سے تخمینہ اور خیال آرائی کو کہتے ہیں۔ جو رائے کتاب اللہ اور سنت رسول کی روشنی میں ہو اس کو رائے نہیں کہا جاتا اور نہ وہ مذموم ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کے اس ارشاد میں اسی طرف اشارہ ہے۔

> جس نے کوئی ایسی رائے ایجاد کی جو قرآن میں ہے اور نہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے موافق ہے وہ نہیں جانتا کہ کل قیامت میں کیا گزرے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ رائے کی دو قسمیں ہیں ایک قانونی یعنی وہ جو کتاب اللہ کے تحت ہو۔ دوسری غیر قانونی جس کی کوئی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو۔ جس کی اصل کتاب اللہ میں ہو وہ علم ہے اور جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو وہ رائے ہے اور اس کا علم سے مقابلہ ہے۔ علم وہ ہی کہلاتا تھا جو قرآن و سنت نے بتایا یا صحابہ سے نقل ہو کر آیا۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں علم صرف وہ ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے منقول ہو اور جو ان سے منقول نہیں وہ علم ہی نہیں۔

یہ تصریحات بتا رہی ہیں کہ رائے اور علم یا ظن اور علم سلف صالحین کے یہاں دونوں تقابلی طور پر بولے جاتے تھے۔ واقعی بات کو علم اور تخمینی باتوں کو ظن کہا جاتا تھا۔ جانب راجح اور مرجوع کی

وہاں کوئی تفصیل نہ تھی۔ یہی قرآن کی اصطلاح ہے۔ ارشاد ہے :

یا ایہا الذین آمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن، ان بعض الظن اثم،

اے ایمان والو بہت گمان کرنے سے بچا کرو کیونکہ بعض گمان گناہ ہیں۔

اس آیت میں کچھ گمانوں کے گناہ ہونے کا حکم اس پر نہیں کہ وہ جانب راجح ہے یا مرجوح، بلکہ خلاف واقعہ اور بے تحقیق بات پر ہے۔ اسی آیت کے متعلق امام ابوبکر الجصاص کا یہ تشریحی نوٹ بڑا بیش قیمت ہے :

آیت اس بات کی مقتضی ہے کہ بعض ظن کی ممانعت ہو نہ کہ سارے ظنوں کی، کیونکہ کثیرا من الظن کی تعبیر ہی کہہ رہی ہے کہ سارے نہیں زیادہ گمان گناہ ہیں اور اس کے بعد ان بعض الظن کی تصریح بھی اسی بات کی تائید کر رہی ہے کہ سارے گمانوں سے ممانعت نہیں فرمائی۔

مطلب یہ ہے کہ ہر ظن ممنوع نہیں۔ یہاں کچھ ظنون قابل تعریف بھی ہیں۔ خود قرآن میں ہے یظنون انہم ملاقوا ربہم ظاہر ہے کہ یہاں ظن مقام مدح میں بولا گیا ہے اس لیے یہ حتماً علم ہے اور جیسا کہ امام راغب نے کہا ہے وہ دماغی خیال جو علامات کی تخلیق ہو اگر قوی ہو تو علم بن جاتا ہے اور کمزور ہو تو وہم سے آگے نہیں بڑھتا۔ جو ظن احادیث کے ذریعے حاصل ہوتا ہے وہ یہی ہے اور جسے فخر الاسلام بزدوی نے علم غالب الرائے کہا ہے یہ وہ اٹکل اور تخمین نہیں جس کی مذمت قرآن نے کی ہے۔ اور یہی ظن مجتہدین کے اجتہاد کی اساس ہے۔ یہ دماغی ورزش نہیں بلکہ قانونی تخلیقات ہیں۔ ان کی اساس دلائل شرعیہ ہیں۔ شریعت کے بیشتر معاملات کا دار و مدار ظن پر ہے وہ بھی غالب الرائے ہے۔ دنیا کا سارا کاروبار اسی ظن پر ہی چل رہا ہے۔ بہر حال زیر تشریح آیت میں جس ظن کی مذمت ہے وہ اٹکل کے معنے میں ہے اس میں ظن کے اصطلاحی معنے مراد نہیں اور نہ یہ وہ ظن ہے جو دلائل شرعیہ کی تخلیق ہوتا ہے۔

فخر الاسلام بزدوی نے جسے علم غالب الرائے کہا ہے احادیث اسی کا فائدہ دیتی ہیں اور مجتہدین کا اجتہاد بھی اسی کے سہارے قانونی تخلیقات کرتا ہے اور یہ صرف حدیث و اجتہاد ہی کی بات نہیں بلکہ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ انسان اکثر و بیشتر معاملات میں صرف اس تحقیق پر اعتماد کرنے کے لیے مجبور ہے جس سے ظن غالب حاصل ہوتا ہے اگر وہ اس تحقیق میں شک کرے اور علم و یقین کے بغیر ہر بات ماننے سے انکار کر دے تو وہ دنیا کے کام کا نہ رہے گا بلکہ شاید زندہ بھی نہ رہ سکے گا۔ ہماری زندگی کے

بے شمار مسائل ایسے ہیں جن میں ہم اخبارِ آحاد کو تسلیم کرتے ہیں اور انہی پر اپنے فیصلوں اور اپنے علم و عمل کا دارومدار رکھتے ہیں۔ محض خبر ہونے کی حیثیت سے ہر خبر میں سچ اور جھوٹ ہونے کا یکساں احتمال ہوتا ہے۔ مگر ہم ان دونوں پہلوؤں میں سے ایک کو ترجیح دینے کے لیے محض خبر کے خبر ہونے پر نظر نہیں رکھتے بلکہ عموماً خارجی قرائن سے مدد لے کر صدق یا کذب کے کسی ایک پہلو کو ترجیح دیتے ہیں اور بسا اوقات ہماری یہ ترجیح اتنی زیادہ قوی ہوتی ہے کہ دوسرے پہلو کے امکان کو بھی ہم تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے مثلاً ہر شخص کو یہ بات کہ وہ اپنے باپ کی جائز اولاد ہے صرف ماں کی روایت سے معلوم ہوتی ہے۔ اس خبرِ واحد میں جس کے لیے کوئی دوسرا شاہد سرے سے موجود ہی نہیں ہو سکتا۔ نفس خبر ہونے کی وجہ سے صدق و کذب یکساں احتمال ہے لیکن کوئی شریف آدمی اس میں کذب کے پہلو کو ترجیح دینا تو درکنار کسی درجہ میں بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا خواہ واقعہ کے اعتبار سے اس کا اپنی ماں کے بیان پر یقین کرنا درست نہ ہو۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا تعلق جذبات سے ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جہاں جذبات کا دخل نہیں ہوتا وہاں بھی ہم اسی طرح اخبارِ آحاد کی امکانی جانچ پڑتال کر کے صدق و کذب کے دونوں پہلوؤں میں سے ایک کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ اس ترجیح سے صرف ظن غالب حاصل ہوتا ہے لیکن اس ظن پر ہم اسی طرح عمل کرتے ہیں جس طرح علم یقین حاصل ہونے کی صورت میں کرتے ہیں۔ ہماری زندگی کے معاملات میں سب سے زیادہ اہم اور نازک معاملہ عدالت کا ہے جس میں جذبات کا ذرہ برابر دخل نہیں ہوتا بلکہ خالص اور ٹھوس عقلی امتحان پر احکام کی بنا رکھی جاتی ہے قاضی یا جج کے سامنے جتنے معاملات پیش ہوتے ہیں ان سب کا تعلق گزرے ہوئے واقعات سے ہوتا ہے۔ بیشتر معاملات میں جج کے سامنے صرف اخبارِ آحاد پیش ہوتی ہیں جنہیں وہ جرح و تعدیل، قرائن و آثار اور قیاس عقلی کی کسوٹی پر کس کر سچ اور جھوٹ کے امکانی پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو راجح قرار دیتا ہے اور جب کوئی پہلو راجح ہو جاتا ہے تو اس پر وہ فیصلہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح تجارت، تدبیر سلطنت اور دوسرے دنیوی کاروبار میں بھی رات دن اخبارِ آحاد پر ہمارے معاملات چلتے ہیں۔ کہیں بھی کوئی خبر متواتر کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ جب ایک ظن غالب حاصل ہو جاتا ہے تو اس پر لاکھوں روپے لگا دیتے ہیں۔ خالص دینی معاملات بھی اسی ظن غالب پر چل رہے ہیں سب سے بڑی چیز جس پر ہمارے ایمان کا مدار ہے۔ قرآن حکیم میں ہے اس کا کتاب الٰہی ہونا ہم کو صرف ایک گواہ کی شہادت سے معلوم ہوا ہے اور وہ گواہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے یہ خبر جس گواہ نے دی ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ ان کی راست بازی

دیانت داری اور پاکیزہ سیرت کو دیکھ کر اور جو خبر آپ نے دی ہے اس کی معقولیت اور حقانیت کا لحاظ کر کے ہم نے یقین کر لیا ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے ورنہ اب بھی دنیا میں قرآن کو خدا کی کتاب نہ ماننے والے موجود ہیں۔ دونوں میں اگر کوئی فرق ہے تو یہی کہ ہم نے صادق ومصدوق کی گواہی کو تسلیم کر لیا ہے اور ہم مسلمان ہو گئے، انہوں نے اس میں شک کیا کافر ہو گئے اور بس۔

بہرحال آیت میں جس ظن کی مذمت کی گئی ہے وہ علم کا مرادف نہیں بلکہ وہم کا مرادف ہے اور حدیث وقانون میں جس ظن کا ذکر آتا ہے وہ علم کا مرادف ہے۔

نافرمانوں کی سزا اور فرمانبرداروں کی جزا

۱۴۵۔ بلاشبہ تیرا رب ہی خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بہک رہا ہے اور یہ بھی اسی کو خوب علم ہے کہ راہ ہدایت پر کون گامزن ہیں۔ یعنی تیرا رب جس نے تیری اے پیغمبر پروردگاری کی اور کتاب مفصل کی تعلیم دی اور اس کے ذریعے تجھے ان علوم کا شناسا بنایا جن کا تجھے پہلے علم نہ تھا وہ تیرے سے اور تمام مخلوقات سے زیادہ ان لوگوں کا علم رکھتا ہے جو صراطِ مستقیم سے بہکے ہوتے یا بھٹکے ہوتے ہیں، ان کو بھی وہ ہی خوب جانتا ہے جو صراطِ مستقیم پر گامزن ہیں۔ ابوالسعود کہتے ہیں کہ چونکہ اللہ کی ذات دونوں جماعتوں سے خوب واقف ہے اس لیے آپ کو فریق اول یعنی اہل ضلالت کے بارے میں خوب محتاط رہنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ زندگی میں کہیں ان سے ہمنوائی ہو جائے اور کسی صورت میں اہل ضلالت کی طاعت نہ ہونی چاہیے۔ اور کچھ یہ کہتے ہیں کہ جب اللہ کی ذات فریقین سے واقف ہے تو اس کے حکم سے زیادہ علم وصداقت کہاں ہو سکتا ہے اس لیے آپ کو اس کی کتاب ہی کو حکم بنانا چاہیے اور کچھ نے بتایا ہے کہ اس کے اس علم کامل اور محیط کے لحاظ سے نافرمانوں کی سزا اور فرمانبرداروں کا انعام دونوں یقینی ہیں یا مطلب یہ ہے کہ اکثر من فی الارض کو دیکھ کر آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ یہ پتہ اللہ کو ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکے ہوتے ہیں اور کون ہدایت یاب ہیں لہٰذا جن کو خدا راہ یاب بتا رہا ہے ان کی راہ اختیار کرو خواہ وہ اقلیت میں ہوں، اور جن کو خدا گمراہ قرار دے رہا ہے ان سے بچ کر رہو خواہ وہ اکثریت میں ہوں۔ اکثریت اور اقلیت حق کا معیار نہیں ہے حق خود حق ہے خواہ وہ کہیں ہو۔ حق کا حق ہونا دلائل سے معلوم ہوتا ہے ووٹوں سے نہیں معلوم ہوتا۔ یہ ہدایت یافتہ لوگوں کے لیے بشارت اور گمراہوں کے لیے تہدید بھی ہے کیونکہ جب اللہ دونوں سے واقف ہے تو ان کے ساتھ معاملہ بھی اپنے علم کے مطابق ہی کرے گا۔

حلال کو حرام قرار دینا ایمان کے منافی ہے

۱۱۸ - لہٰذا ان تمام جانوروں میں سے بلا کھٹکے کھاؤ جن پر ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہے اگر تم خدا کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو۔ جاہل عوام کی ان ہی بے اصول اور اٹکل پچو باتوں میں سے ایک یہ ہے جو انہوں نے ذبیحہ کے مسئلہ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہی تھی کہ جو جانور طبعی موت سے مر جائے اسے مسلمان حرام کہتے ہیں حالانکہ وہ خدا کا مارا ہوا ہے اور جو خود ان کے ہاتھ کا مارا ہوا ہو اسے حلال سمجھتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ کئی آیتیں اس پر اتری ہیں کہ کافر کہنے لگے کہ مسلمان اپنا مارا کھاتے ہیں اللہ کا مارا نہیں کھاتے فرمایا ایسی ملمع فریب کی باتیں انسانوں کو شبہ میں ڈالنے کے لیے شیطان سکھاتے ہیں خوب سمجھ لو حلال و حرام میں اللہ کا حکم چلتا ہے محض عقلی ڈھکوسلوں کا اعتبار نہیں۔ آگے کھول کر سمجھا دیا کہ مارنے والا سب کا اللہ ہے لیکن اس کے نام کو برکت ہے جو اس کے نام سے ذبح ہوا سو حلال ہے بغیر اس کے مر گیا سو مردار ہے بتغیر یسیر[1]

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا ہے کہ روئے زمین کی اکثریت اپنے پیروکاروں کو ضلالت اور گمراہی میں لے جا رہی ہے کیونکہ وہ خود گم کردہ راہ ہیں۔ ان کی اطاعت کی اہل ایمان کو کسی حال میں اجازت نہیں ہے اہل ایمان کا فرض ہے کہ ان ضالین کی مخالفت کریں اور ان کے مقابلہ میں اس ہدایت کی پیروی کریں جو محمد رسول اللہ لے کر تشریف لائے اور نبوت کی طاعت و اتباع کے موضوع پر پہلا خاص اہتمام سے ایک معاشرتی مسئلہ کا ذکر کیا ہے۔ بظاہر یہ مسئلہ اپنے اندر کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا، لیکن جب اس خاص پہلو پر غور کیا جائے کہ مختلف مذاہب اور بالخصوص مشرکین عرب میں ذبائح کا مسئلہ عابدانہ شعائر میں شمار ہوتا تھا تو اس کی خاص اہمیت اور ضرورت بے نقاب ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ اسی لیے یہاں اصول اور عقائد کے تذکرے میں اس مسئلہ کو بیان کیا ہے، وہ ذبح کے ذریعے اپنے معبودوں سے عابدانہ تعلقات کرتے تھے اور جانوروں پر ذبح کے وقت ان کے نام پکارتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ کھلا شرک ہے چونکہ عام شارحین قرآن کے پیش نظر یہ حقیقت نہ تھی اس لیے ان کو اس پر حیرت ہے کہ جب مشرکین اس جانور کو حرام ہی نہیں سمجھتے تھے جسے خدا کے نام سے ذبح کیا جائے یہ بات

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان کے اور مسلمانوں کے درمیان نزاعی نہ تھی، نزاعی جو بات تھی وہ مردار کا کھانا ہے وہ مردار کے کھانے جائز سمجھتے تھے اور مسلمان ناجائز، قرآن نے یہاں نزاعی مسئلہ کو نظر انداز کر کے اتفاقی مسئلہ کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ذبائح میں خالص مشرکانہ عمل کرتے تھے اور اس کو جائز سمجھ کر کھاتے تھے۔ قرآن نے اہل ایمان کو خبردار کیا ہے کہ جب یہ معلوم کر چکے ہو کہ لوگوں کی اکثریت غلط کار اور غلط رو ہے اس لیے صرف وہ ذبائح کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ذبائح نہ کھاؤ جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو جیسا کہ بعد کی دو آیات میں تصریح ہے بشرطیکہ تمہارا اللہ کی جانب سے آئی ہوئی ہدایت پر ایمان ہے۔ اور اگر تم جانتے ہو شرک و کفر کی گمراہی ایمان کے خلاف ہے۔ اسی کے مدلول میں وہ جانور بھی داخل ہو گیا جو ذبح سے نہیں بلکہ اپنی موت طبعی سے مر گیا ہو جسے مشرکین حلال سمجھتے تھے یہاں دو چیزیں ہیں ایک یہ کہ مشرکین غیر اللہ کے نام پر ذبائح کو حلال سمجھتے تھے اور کھاتے تھے اور دوسرے یہ کہ وہ مردار کو حلال سمجھتے تھے۔ پہلی بات یعنی جن کو مشرکین نے اپنے مشرکانہ عمل کی بنا پر حلال سمجھ رکھا تھا اس پر تو وہ نہ بولے کیونکہ خدا کو وہ بھی مانتے تھے لیکن انہوں نے مردار کو سامنے رکھ کر یہ کہنا شروع کر دیا اور یہ بات ایک سنگین مغالطہ کی صورت میں پیش کی کہ جسے خدا مارے وہ تو حرام اور جسے ہم ماریں وہ حلال ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ کے حوالہ سے ابوداؤد اور ترمذی نے یہ بات نقل کی ہے کہ کہنے والوں نے کہا تھا کہ کیا ہم اپنا مارا ہوا کھائیں اور خدا کا مارا ہوا نہ کھائیں۔ قرآن نے بطور کلیہ کے ایک جامع بات بتا دی کہ ذبح کے وقت جس پر اللہ کا نام لیا جائے اسے کھاؤ یعنی جس پر غیر خدا کا نام لیا جائے یا خدا کے ساتھ کسی اور کا نام لیا جائے یا جو اپنی طبعی موت سے مر گیا ہو وہ نہ کھاؤ۔ اللہ کی آیات پر ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ خدا کے احکام کے مقابلے میں مشرکانہ کردار کی پرواہ نہ کرو۔ تحلیل و تحریم کا اختیار صرف اللہ کو ہے اگر کسی کے لیے یہ حق تسلیم کر لیا گیا تو یہ ایمان کے خلاف ہے۔ مقصد یہ ہے کہ حلال و حرام کے جو پیمانے لوگوں نے بطور خود اپنی عقل دلائل سے بنا رکھے ہیں اس سے نظر ہٹالو اگر تم حقیقت میں اللہ پر، اس کی آیات پر ایمان رکھتے ہو۔ مسئلہ صرف ایک چیز کے کھانے اور نہ کھانے کا نہیں بلکہ جن چیزوں کو مشرکانہ توہمات کی بنا پر حرام ٹھہرایا گیا ہے اللہ کی طرف سے ان کی حلت کے اعلان کے باوجود ان سے اجتناب کرنا یا جن چیزوں کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے لوگوں کی قیاس آرائیوں کی وجہ سے اسے حلال کہنا گویا لوگوں کی تحلیل و تحریم کے بارے میں اتھارٹی ماننا ہے اس لیے یہ مسئلہ کفر و ایمان کا مسئلہ ہے۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

> جب دلائل صحیحہ کی بنا پر تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن حکیم کی حقانیت کو تسلیم کر لیا اور کلی طور پر اس کے احکام پر ایمان لا چکے تو اب فروع و جزئیات کی صحت

کو تسلیم کرنا ناگزیر ہے۔ اگر ہر اصل و فرع اور کلی و جزئی کو قبول کرنا ہمارے عقلی قیاسات پر موقوف ہو تو وحی و نبوت کی ضرورت باقی نہ رہے[1]

جائز چیزوں سے اجتناب نہ کرو

۱۴۷۔ اور تمہارے لیے کیا رکاوٹ ہے کہ جس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اسے نہ کھاؤ حالانکہ جو کچھ تم پر حرام کیا گیا ہے اسے اللہ نے تمہارے سامنے کھول کر بیان کر دیا ہے ہاں حالات کی مجبوری جو کچھ تمہیں کھلاتے وہ اس سے مستثنیٰ ہے یعنی اضطرار و مجبوری کی حالت کو مستثنیٰ کر کے جو چیزیں حرام ہیں ان کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے ان میں وہ حلال جانور داخل نہیں جو اللہ کے نام پہ ذبح کیا جاتے۔ پھر اس کے نہ کھانے کی کیا وجہ[2] مطلب یہ ہے کہ جب محرمات کو کھول کر بیان کیا جا چکا ہے اور بتایا جا چکا ہے کہ حرام کیا کیا چیزیں ہیں تو اب ہچکچاہٹ کیا ہے۔ یہ بات تفصیل سے کہاں بتائی ہے قد فصّل ماضی کا صیغہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محرمات کی تفصیل پہلے ہو چکی ہے تفصیل کہاں ہوئی اس سوال کے جواب میں اگر سورہ مائدہ کا نام لیا جائے تو وہ درست نہیں ہے کیونکہ سورہ انعام مکی ہے اور سورہ مائدہ مدنی ہے اس لیے وہ مراد نہیں ہو سکتی۔ کچھ علماء کی رائے ہے کہ سورہ نحل میں تفصیل ہو چکی ہے کیونکہ سورہ انعام سے پہلے نازل ہوئی ہے لیکن اس میں اشکال یہ ہے کہ سورہ نحل کی اسی آیت یعنی

انما حرم علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر وما اھل بہ لغیر اللہ

کے بعد

وعلی الذین ھادوا حرمنا ما قصصنا علیک من قبل

میں سورہ انعام کی اس آیت کا حوالہ دیا ہے

وعلی الذین ھادوا حرمنا کل ذی ظفر ومن البقر والغنم حرمنا علیھم شحومھما الا ما حملت ظھورھما او الحوایا او ما اختلط بعظم ذالک جزینٰھم ببغیھم وانا لصادقون

اور اب یہاں سورہ انعام میں وقد فصل لکم ما حرم علیکم کہہ کر سورہ نحل کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ مکی سورتوں میں سورہ انعام کے بعد سورہ نحل بس ایک سورت ہے جس میں حرام چیزوں کی تفصیل

---

[1]، [2] افادات شیخ الاسلام

بتائی گئی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کون سی سورت پہلے نازل ہوئی ہے اور کون سی بعد میں۔ ہمارے نزدیک اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ پہلے سورہ نحل نازل ہوئی تھی جس کا حوالہ سورہ انعام کی اس آیت و قد فصل لکم میں دیا گیا ہے۔ بعد میں کسی موقعہ پر کفار مکہ نے سورہ نحل کی آیات پر یہ اعتراض کر دیا کہ بنی اسرائیل کی شریعت میں تو اور بھی بہت سی چیزیں حرام ہیں جن کو اسلام نے حلال کیا ہے اگر وہ شریعت خدا کی طرف سے تھی تو تم اس کی خلاف ورزی کر رہے ہو اور وہ بھی خدا کی طرف سے تھی اور یہ بھی خدا کی طرف سے تو دونوں میں اختلاف کیا ہے؟ اس اعتراض کے وقت سورہ انعام نازل ہو چکی تھی اس لیے ان کو جواب دیا گیا کہ ہم پہلے سورہ انعام میں بتا چکے ہیں کہ یہودیوں پر چند چیزیں خاص طور پر حرام کی گئی تھیں اور چونکہ یہ اعتراض سورہ نحل پر کیا گیا تھا اس لیے اس کا جواب بھی سورہ نحل ہی میں جملہ معترضہ کے طور پر درج کیا گیا۔

کچھ علماء یہ کہتے ہیں کہ قد فصل لکم ما حرم علیکم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سے پہلے تفصیل ہو چکی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کا تفصیل سے ذکر کر رہا ہے جو تم پر حرام ہیں جیسا کہ اس کے بعد قل لا اجد فیما اوحی آیت نمبر ۱۴۵ میں آ رہا ہے۔ امام رازی اور آلوسی کا بھی یہی میلان ہے، لیکن ہماری رائے میں راجح یہی صورت ہے۔

یہاں حضرت مولانا اشرف علی نے بہت مفید بات فرمائی ہے کہ ماذکر اسم اللہ علیہ میں ذبح اختیاری اور ذبح اضطراری یعنی تیر باز اور کتے کا شکار جب کہ اس کو چھوڑ دینے کے وقت بسم اللہ پڑھی جاتے اور ذکر حقیقی ذکر حکمی سب داخل ہے پس امام ابو حنیفہ کے نزدیک جس پر بسم اللہ سہواً ترک کر دی جاتے وہ حکماً یا ذکر اسم اللہ علیہ میں داخل ہے البتہ عمداً ترک کرنے سے امام صاحب کے نزدیک حرام ہوتا ہے[1]

آخر میں فرمایا ہے الا ما اضطررتم مطلب یہ ہے کہ کھانا نہ ملے اور بھوک کی شدت سے آدمی بے چین اور بے قرار ہو جاتے یعنی جان بچانے کا خطرہ ہو جاتے تو یہ ایک ضرورت ہے جس میں حرام کھا لینا جائز ہے۔ اگرچہ یہاں یہ آیت مطلق اور بے قید ہے لیکن اسی سورت میں آگے اور اس سے پہلی سورت یعنی نحل میں دو قیدیں آئی ہیں غیر باغ ولا عاد یہ مکی سورتیں ہیں مدنی سورتوں میں البقرہ میں بھی قید آئی ہے لیکن سورہ مائدہ میں فی مخمصۃ غیر متجانف لاثم کی دو قیدوں کا اور اضافہ ہے جلد دوم میں اس پر چھ دفعات پر مشتمل نوٹ نمبر ۱۷۴ میں تفصیلی تبصرہ آ چکا ہے اور جلد ششم میں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اضطرار کی شرعی حد کے عنوان کے تحت سورہ مائدہ کے نوٹ نمبر میں بھی اس پر بحث ہو چکی ہے۔

اہواء پر مبنی اعمال ضلالت ہیں

۱۱۹ اور بہت سے لوگ بغیر علم کے محض اپنی خواہشات سے لوگوں کو بہکاتے رہتے ہیں بلاشبہ تیرا پروردگار ان عدوان پیشہ لوگوں سے خوب واقف ہے۔ مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر چیز کو بالواسطہ یا بلاواسطہ خدا ہی پیدا کرتا اور مارتا ہے۔ پھر جس طرح اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں بعض کا کھانا ہم کو مرغوب اور مفید ہے جیسے سیب، انگور وغیرہ اور کچھ چیزوں سے ہم نفرت کرتے ہیں یا مضر سمجھتے ہیں جیسے ناپاک گندی چیزیں اور سنکھیا وغیرہ۔ اسی طرح اس کی ماری ہوئی چیزیں بھی دو قسم ہیں ایک وہ جن سے فطرت سلیمہ نفرت کرتی ہے یا اس کا کھانا ہماری روحانی یا جسمانی صحت کے لیے خدا کے نزدیک مضر ہو۔ مثلاً وہ حیوان دموی جو اپنی طبعی موت سے مرے اور اس کا خون وغیرہ گوشت میں جذب ہو کر رہ جاتے۔ دوسرے وہ حلال وطیب جانور جو باقاعدہ خدا کے نام پر ذبح ہو یہ بھی خدا ہی کا مارا ہوا ہے جس پر مسلمان کی چھری کے توسط سے اس نے موت طاری کی ہے مگر عمل ذبح اور خدا کے نام کی برکت سے اس کا گوشت پاک وصاف ہو گیا۔ پس جو شخص دونوں قسموں کو ایک کرنا چاہے وہ معتدی حد سے بڑھنے والا ہے[1]

عابدانہ اعمال کا پیمانہ اگر ناموس وحی اور علوم نبوت پر مبنی نہ ہوں بلکہ اپنے میلان طبع ہوائے نفس پر قائم ہو تو اس کا نتیجہ ضلال اور اضلال ہے۔ عابدانہ اعمال کے سارے پیمانے جن میں نبوت کی اتباع کا روح نہ ہو بلکہ اپنی پسند، اپنی چاہت اور اپنی خواہش سے بنائے گئے ہوں اتباع ہویٰ ہے۔ دین کی زندگی میں اعمال کی حدود میں ساری بدعتوں کا سرچشمہ اتباع ہویٰ اور افکار کی حدود میں ساری بدعتوں کا منبع اتباع ظن ہے مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کی تحریم یہ منسوب تو خدا کی طرف کرتے ہیں لیکن دراصل یہ تمام تر ان کے ہوائے نفس کے بنائے ہوئے پیمانے ہیں اللہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس باب میں ان کے پاس خدا کی طرف سے کوئی سند یا ثبوت نہیں ہے جس کو وہ پیش کر سکیں۔

آخر میں فرمایا ان ربك هو اعلم بالمعتدین اس سے مقصود دھمکی بھی ہے اور تسلی بھی۔ دھمکی تو اس لحاظ سے کہ یہ لوگ سزا سے بچ کر کہاں جائیں گے یہ تو علم الٰہی میں ہیں۔ اور تسلی اس طرح کہ یہ امت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مقابلہ میں وہ ھو اعلم بالمعتدین، کے یعنی تیرا رب جیسے معتدین کو جانتا ہے ان معتدین سے بھی واقف ہے جو حق کو چھوڑ کر باطل اور حلال کو چھوڑ کر حرام کو پسند کرتے ہیں۔

سارے گناہ چھوڑ دو

۱۲۰ اور چھوڑ دو تم جلوت اور خلوت کے ہر گناہ کو یقیناً جو لوگ گناہ کرتے ہیں ان کو اپنے جرائم کی ضرور سزا ملے گی۔ یعنی کافروں کے بہکانے پر نہ ظاہر میں عمل کرو اور نہ دل میں شبہ لاؤ، کذا فی موضح القرآن[1] اثم قانون کی زبان میں اس کو کہتے ہیں جسے اللہ نے حرام کیا ہو۔ لغت میں ہر بُری اور نقصان دہ چیز کو کہتے ہیں۔ اللہ نے اپنے بندوں پر جو کچھ حرام کیا اس میں سر تا سر بندوں کا نقصان ہی نقصان ہے چاہے جانی ہو یا مالی، اخلاقی ہو یا فکری، انفرادی ہو یا اجتماعی، معاشی ہو یا سیاسی، حافظ ابن القیم نے اثم ان گناہوں کو قرار دیا ہے جن کی جنس ہی حرام ہو جیسے زنا، جھوٹ، شراب، اور لکھا ہے کہ اثم عدوان کے ساتھ بھی آتا ہے جیسے لا تعاونوا علی الاثم والعدوان ہر اثم عدوان ہوتا ہے اور ہر عدوان اثم ہوتا ہے۔ عدوان وہ ہے جس کی مقررہ مقدار مباح ہو۔ اس مقررہ مقدار سے تجاوز عدوان ہے ورنہ اصل کے اعتبار سے اثم نام ہے ان کاموں کو کرنے کا جن سے منع کیا گیا ہے یا اوامر کے چھوڑ دینے کا اس لیے اثم وہ تمام رذائل ہیں جن کو خدا ناپسند کرتا ہے اور جن سے بچنے کا حکم اس نے بندوں کو دیا ہے جن کے کرنے والے اس کے حضور میں گنہ گار ٹھہرتے ہیں۔ جن کی برائی ہر عقلمند جانتا ہے اور مانتا ہے اور جن کی بدولت انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی اور مادی نقصان پہنچتا ہے اور ان کی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے بلکہ جب کسی قوم میں عام ہو جاتے ہیں تو پوری قوم کی تباہی اور بربادی کا سبب بن جاتے ہیں یعنی اس کی دینی و دنیوی ترقیوں کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور سعادت و اقبال کا دروازہ اس پر بند ہو جاتا ہے۔ قرآن کا اس آیت میں مطالبہ ہے کہ رذائل کو بالکل چھوڑ دو خواہ ظاہر ہوں یا باطن، ظاہر علانیہ باطن پوشیدہ یا ظاہر وہ گناہ جن کی قباحت نمایاں ہو خواہ وہ خلوت میں کیے جائیں اور باطن وہ گناہ جن کی قباحت عام نظروں سے اوجھل ہو خواہ علانیہ کیے جائیں یا ظاہر وہ گناہ جن کا تعلق جوارح سے ہو اور باطن وہ گناہ جن کا تعلق قلوب سے ہو مثلاً کبر، حسد، بغض و کینہ، حرص و طمع، ہر برائی کے تین پہلو ہوتے ہیں ذہنی، لفظی اور عینی، ذہنی باطن ہے اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لفظی اور عینی وجود ظاہر ہے۔ مثلاً شرک اس کا ذہنی وجود وہ حقیقت ہے جس کا مسکن انسان کا قلب ہے لفظی وجود اس کا وہ ہے جو زبان بولتی ہے اور عینی وجود شرک کے وہ مظاہر اور قوالب ہیں جنہیں عابدانہ طور پر اختیار کیا جاتا ہے مثلاً اصنام، دریا، شمس و قمر اور قبور۔ ہر بُرائی کے ظاہر و باطن میں گہرا لگاؤ ہوتا ہے۔ دونوں باہم ایک دوسرے کے لیے سہارا ہوتے۔ قرآن کہتا ہے کہ رذائل سے بچنا یہ ہے کہ رذائل کے ذہنی اور لفظی وجود کے ساتھ اس کے مظاہر اور قوالب بھی ختم ہو جائیں۔ اگر صرف ذہنی اصلاح کر لی گئی اور بیرونی قوالب اور مظاہر کو ختم نہ کیا گیا تو اس سے بُرائی کا استیصال نہ ہو گا۔ اسی میں وہ ساری برائیاں آجاتی ہیں جن پر شارحین قرآن نے اس آیت کی شرح میں نشاندہی کی ہے مثلاً زنا اور محرمات سے نکاح وغیرہ بلکہ اگر قانونی نقطہ نظر سے آیت پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا ظواہر سے اگر رذائل مراد ہیں تو بواطن سے وہ وسائل مراد ہیں جو ان رذائل تک پہنچاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شرک بھی چھوڑ دو اور شرک کے تمام وسائل اور ذرائع بھی ختم کر دو، زنا بھی چھوڑ دو اور زنا کے وہ وسائل بھی بند کر دو جن کے ذریعے زنا کو معاشرے میں پنپنے کا موقعہ ملتا ہے۔

آخر میں فرمایا ان الذین یکسبون الاثم الخ اس میں بتایا ہے کہ جو لوگ جنس اثم کی ہی کمائی کرتے ہیں خواہ یہ بصورت کفر و شرک ہو یا نفاق و فسوق ہو یا عصیان و عدوان ہو یا بغی و منکر اور قول اللہ کی صورت میں کچھ ہو اور پھر علانیہ ہو یا پوشیدہ ان کو اس کے نتائج سے ضرور دوچار ہونا پڑے گا بشرطیکہ ان کے کردار میں تکرار اور استمرار ہو گا۔ اگر تکرار اور استمرار نہ ہو گا بلکہ نادانی کی حالت میں کرنے کے بعد فوراً جناب الٰہی میں توبہ کر لیں گے تو اللہ کی ذات غفور رحیم ہے۔ رحمت برائی سے باز آنے والوں کا استقبال کرتی ہے ارشاد ہے:

قل للذین کفروا ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف

۱۵۰۔ اور یاد رکھو کہ جس جانور پر خدا کا نام نہ لیا جائے اسے مت کھاؤ اس کا کھانا نافرمانی کی بات ہے یعنی نہ حقیقۃً نہ حکماً، حقیقۃً متروک التسمیہ عمداً کے بارے میں ذکر حکمی کا دعویٰ کرتے ہیں[۱] اس آیت کی تفہیم میں عطاء ابن رباح سے امام رازی نے یہ بات نقل کی ہے کہ کھانے اور پینے کی ہر چیز جس پر خدا کا نام نہ لیا جائے وہ حرام ہے۔ لیکن دوسرے علماء کو ان کے اس موقف سے اتفاق نہیں ہے ان کا کہنا ہے کہ اس آیت کا مصداق عام نہیں بلکہ خاص ہے یعنی صرف ذبائح تک محدود ہے۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

امام شافعی فرماتے ہیں کہ یہ ممانعت ان جانوروں کے بارے میں ہے جو نصب پر ذبح کیے جائیں۔ نصب سے مراد وہ سب مقامات ہیں جن کو غیر اللہ کی نذر و نیاز چڑھانے کے لیے لوگوں نے مخصوص کر رکھا ہو خواہ وہاں کوئی پتھر کی مورت ہو یا نہ ہو۔ ہماری زبان میں اس کا ہم معنی لفظ آستانہ یا استھان ہے جو کسی بزرگ یا دیوتا سے یا کسی خاص مشرکانہ اعتقاد سے وابستہ ہو۔ امام شافعی نے اس خصوصیت کی وجوہ یہ بتائی ہیں اولاً، اس لیے کہ اس پر قرآن نے یہاں فسق کا حکم لگایا ہے۔ ظاہر ہے متروک التسمیہ ذبیحہ کا کھانے والا مسلمان فاسق نہیں ہوتا، ثانیاً آگے آرہا ہے ان الشیاطین لیوحون الی اولیائھم لیجادلوکم شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شبہات القا کرتے ہیں تاکہ تم سے اُلجھیں یہ مناظرہ مُردار کے بارے میں ہوا ہے ثالثاً اس پر آگے آیت میں اہلِ ایمان کو دھمکی ہے کہ اگر تم نے ان کا کھانا کھایا تو تم بھی شرک کرنے والے ہو جاؤ گے امام شافعی فرماتے ہیں کہ اس آیت کا آغاز اگرچہ ایک عمومی پیمانے سے ہوا ہے لیکن یہ تین قیدیں بزبانِ حال کہہ رہی ہیں کہ یہ مخصوص ذبیحہ کے بارے میں ہے۔ قرآن کی دوسری آیت میں ما اھل بہ لغیر اللہ کو فسق کہا ہے اس لیے یہاں بھی ما اھل بہ لغیر اللہ اور ما ذبح علی النصب مراد ہے۔

حافظ ابن کثیر نے اس موضوع پر مذاہب کی تفصیل لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کو ذبیحہ کے بارے میں رکھا جائے تو اس مسئلہ میں تین رائے ہیں ایک رائے تو یہ ہے کہ جس ذبیحہ پر خدا کا نام نہ لیا جائے خواہ جان کر نہ لیا جائے یا بھول کر وہ ذبیحہ حلال نہ ہوگا، صحابہ میں عبداللہ بن عمر اور نافع مولی عبداللہ، تابعین میں عامر الشعبی اور محمد بن سیرین اور ائمہ میں امام مالک اور ایک روایت میں امام احمد اور ابوثور اور داؤد ظاہری کا یہی مذہب ہے۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ ذبیحہ پر بسم اللہ صرف ایک امر استحبابی ہے بھول کر رہ جائے یا جان کر چھوڑ دے۔ جانور کی حلت پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ یہ امام شافعی اور ایک روایت میں امام احمد کا مذہب ہے۔ تیسرا مذہب یہ ہے کہ بھول کر اگر ذبیحہ پر بسم اللہ رہ جائے تو کوئی حرج نہیں لیکن بالارادہ چھوڑ دی جائے جان کر تو ذبیحہ حلال نہ ہوگا۔ یہی امام مالک کا مشہور مذہب ہے یہی ایک روایت میں احمد بن حنبل کی رائے ہے اور یہی امام ابو حنیفہ، ان کے اصحاب اور محدثین میں سے اسحاق بن راہویہ کا مذہب ہے۔ صحابہ میں سے عبداللہ بن عباس، اور علی مرتضیٰ، تابعین میں سے سعید بن المسیب، عطا ابن ابی رباح، الحسن البصری، جعفر بن محمد، ربیعہ بن ابی عبدالرحمان کی اسے تائید حاصل ہے۔ صاحب ہدایہ نے قبل الشافعی اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ حافظ ابن جریر فرماتے ہیں:

> جو شخص بھول کر بسم اللہ چھوڑ دینے سے ذبیحہ کو حرام کہتا ہے وہ اجماع کے مخالف ہے اور اس موضوع پر جو ارشادِ نبوت آتا ہے اس کے بھی خلاف ہے۔

ہماری رائے میں آیت جس سیاق میں آئی ہے اس کا تعلق مشرکین کے مشرکانہ عمل سے ہے مسلمانوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ جس پر خدا کا نام نہیں بلکہ غیر خدا کا نام لیا جاتے خواہ یہ ذبح کے وقت لیا گیا ہو یا ذبح ہی ان کے لیے کیا گیا ہو یہ سب حرام ہے۔ غیر اللہ کے نام پر ذبح شدہ جانور یا غیر اللہ کے لیے نامزد ان کے یہاں حلال وطیب تھا۔ ان کے یہاں کسی ذبیحہ کی حلت و طہارت کے لیے یہ چیز ضروری نہ تھی کہ لازماً اس پر اللہ کا نام لیا جائے۔

شرک فی الطاعۃ کا حکم

۱۵۱۔ اور بلاریب شیاطین اپنے رفقاء کے دلوں میں وسوسے ڈالتے رہتے ہیں تاکہ وہ تم سے الجھا کریں اور اگر تم نے ان کی اطاعت کرلی تو تم بھی شرک کرنے والے ہو۔ یعنی شرک فقط یہی نہیں کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجے بلکہ شرک کے حکم میں یہی ہے کہ کسی چیز کی تحلیل و تحریم میں مستند شرعی کو چھوڑ کر محض آرا و اہواء کا تابع ہو جائے جیسا کہ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ کی تفسیر میں مرفوعاً منقول ہے کہ اہل کتاب نے وحی الٰہی کو چھوڑ کر صرف احبار و رہبان پر تحلیل و تحریم کا مدار رکھ چھوڑا تھا[1] پہلی بات سن کر مشرکین کے مذہبی پندار کو چوٹ لگی تھی۔ انہوں نے عوام کے جذبات اہل ایمان کے خلاف بھڑکانے کے لیے پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ ان بھڑکانے والوں کو قرآن نے شیاطین کہا ہے اور جن کو وہ بھڑکاتے تھے ان کو اولیاء یعنی ان کے رفقاء کہا اور بھڑکانے کے کردار کو ایحاء سے تعبیر کیا ہے۔

یہ بھڑکانے والے کون تھے؟ حافظ ابن جریر نے اس موضوع پر روایتی نقطہ نظر سے جو سرمایہ جمع کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارس کے مجوسی نے مشرکین مکہ کو یہ کہلا کر بھیجا کہ اس پیغمبر سے یہ دریافت کرو کہ جو تم ذبح کرو وہ تو حلال ہے اور جسے اللہ ذبح کرے وہ حرام ہے اور عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ علمائے یہود قریش مکہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنے کے لیے جو باتیں سکھایا کرتے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے کہ جسے خدا مارے وہ تو حرام ہو اور جسے ہم ماریں وہ حلال ہو۔ یہ مجوسیوں کی جانب سے یا یہودیوں کی جانب سے ہو، قرآن نے ان کے اس غوغا سے بے پروا ہو کر کہا ہے کہ انہ لفسق اور اہل ایمان کو بتایا ہے کہ تم نے اگر تحلیل و تحریم

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے موضوع پر ان کی بات مان لی تو تم مشرک ہو کر رہ جاؤ گے۔ یہاں مشرکین کے لفظ میں بڑی گہری معنویت ہے یاد رہے کہ یہ شرک فی العبادۃ نہیں بلکہ شرک فی الطاعۃ ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب نے اس آیت پر جو تشریحی نوٹ لکھا ہے اس میں فرماتے ہیں،

شرک فقط یہی نہیں کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجا جائے بلکہ شرک یہ بھی ہے کہ کسی اور کا مطیع ہو جائے۔ (موضح القرآن)

شرک کے معنے سلجھے پن کے ہیں اور قرآن کی اصطلاح میں شرک نام ہے اس بات کا کہ اللہ کی ذات یا اس کی صفات میں یا ان صفات کے لوازم میں کسی اور کو اللہ کا ساجھی بنایا جائے گویا شرک کی تین قسمیں ہیں۔

ایک وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی ذات سے ہوتا ہے

دوسرے وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی صفات سے ہوتا ہے

تیسرے وہ شرک جس کا تعلق ان صفتوں کے لوازم سے ہوتا ہے۔

نبوت کا مخاطب شرک فی الذات کے نہیں بلکہ شرک فی الصفات اور شرک فی اللوازم کے مرتکب تھے اس لیے قرآن کا نقطہ بحث یہی ہیں۔ شرک فی الصفات یہ کہ اللہ تعالیٰ جن صفات سے متصف ہے ان میں سے کوئی صفت کسی مخلوق میں بھی مان لی جائے مثلاً علم اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھلی اور چھپی ہر بات کو جانتا ہے اس لیے غائب بھی حاضر ہے اور گذرا ہوا حاضر ہے، اور گذرا ہوا زمانہ یا آنے والا زمانہ بھی حال کا زمانہ ہے اب اگر کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ فلاں مخلوق بھی اسی طرح ہر بات کو جانتی ہے تو شرک فی الصفات ہوگا۔

شرک فی اللوازم کی صورت یہ ہے کہ صفات الٰہی کے جو لازمی تقاضے ہیں انہیں اور ان سب کو اللہ کے لیے خاص نہ سمجھے بلکہ ان میں سے کسی کو بعض دوسری ہستیوں کے لیے بھی ثابت اور موجود مانے۔ مثلاً صفات الٰہی کا ایک لازمی تقاضا یہ ہے کہ عبادت اور محبت صرف اللہ کا حق ہے۔ اب اگر کوئی شخص کسی اور سے بھی ایسی ہی محبت اور عقیدت رکھے یا اسی طرح کی عبادت کا اسے مستحق قرار دے تو یہ صفات الٰہی کے تقاضوں میں غیر اللہ کو شریک ٹھہرانا ہوگا۔ یہی شرک فی العبادۃ اور اللہ کی پرستش میں ملاوٹ ہے۔ اسی طرح ان صفات کا ایک اور تقاضا یہ بھی ہے کہ اقتدار اعلیٰ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور حکم دینے حلال کرنے، حرام کرنے اور قانون بنانے کا حق اصلاً اسی کو پہنچتا ہے اسی لیے اگر کسی اور کو بھی یہ حق دے دیا جائے خواہ وہ ایک فرد ہو یا بہت سے افراد کا مجموعہ تو یہ اللہ کی بندگی میں غیر اللہ کو شریک ٹھہرانا

ہوگا اور اسی کا نام شرک فی الطاعۃ ہے۔

شرک فی العبادۃ اور شرک فی الطاعۃ میں فرق

آپ چاہیں تو شرک فی العبادۃ کو پرستش اور شرک فی الطاعۃ کو بندگی کہہ دیں۔ پرستش اور بندگی میں جوہری فرق ہے۔ پرستش تقاضائے محبوبیت ہے جبکہ بندگی تقاضائے حاکمیت ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ محبوبیت میں نیابت نہیں ہوتی ہے اس لیے عبادت اور پرستش اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہے لیکن حاکمیت میں نیابت ہوتی ہے اس لیے اطاعت کا حکم اللہ نے اپنے ساتھ رسول کا بھی دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول عبادت کے لیے تو کسی ضابطہ اور قانون کی ضرورت نہیں کہ وہ تقاضائے محبوبیت ہے وہ تو ذکر، خشوع، خضوع، انابت، توکل، تضرع، دعا میں اسوہ حسنہ سے حاصل ہو سکتی ہے لیکن اطاعت چونکہ برائے حاکمیت ہے اس لیے اس کے لیے ضابطہ، دستور، آئین اور قانون کی ضرورت ہے، اللہ کی طاعت کے لیے قرآن اور رسول کی طاعت کے لیے سنت ہے۔ اسی کو آپ وحی متلو اور وحی غیر متلو کہہ سکتے ہیں اور قرآن کی زبان میں اسی کا نام حکمت ہے جس طرح خدا کی اطاعت کے حکم کی وجہ سے قرآن یعنی احکامِ خداوندی سے بے نیازی نہیں ہو سکتی اسی طرح طاعتِ رسول کی وجہ سے سنتِ رسول سے بھی بے پرواہی نہیں ہو سکتی۔ سنتِ رسول کی پیروی بھی ایسے ہی ضروری ہے جیسی کتاب اللہ کی کیونکہ دونوں کی پیروی حکمِ الٰہی کی پیروی ہے اور اللہ کی اطاعت حاکم ہونے کی وجہ سے اور اللہ کے رسول کی اطاعت دو مختلف چیزیں نہیں ہیں جس طرح قرآن کی اطاعت خود خدا تعالیٰ کی اطاعت ہے اسی طرح رسول اللہ کی اطاعت بھی حاکمیت میں نیابت کی وجہ سے خود خدا ہی کی اطاعت ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ اور قرآن نے حاکمیت میں درجہ نیابت کو آگے بھی وسیع کر دیا ہے یعنی اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کے بعد و اولی الامر منکم فرمایا ہے اس لیے طاعت کا دائرہ بھی رسول سے آگے صحابہ کرام اور ائمہ عظام اور ان سب علماء تک وسیع ہوگا جن کے علم و عمل کا مرکز قرآن و سنت ہوں گے۔ اس بنا پر خلفائے راشدین کی سنت اور صحابہ کا اجماع بھی طاعت کی حدود میں حجت ہوگا بلکہ مجتہدین کے اجتہاد کی حیثیت بھی قانونی ہے۔ اسی لیے اسلام میں مصادر قانون کی حیثیت سے چار کو اہمیت دی گئی ہے۔ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس۔ قرآن و سنت اگر اصول استناد ہیں تو اجماع و قیاس اصول اجتہاد ہیں۔ ان دونوں میں خاص ربط ہے۔ اصولِ اجتہاد کا مطلب یہ ہے کہ جہاں کسی صورتِ حال کی نسبت اصولِ استناد

خاموش ہوں وہاں اسلامی معاشرے کے ان افراد کو عقل و استدلال کا حق دیا گیا ہے جو اپنی فکری صلاحیتوں اور علم و فضل کی وسعت کے اعتبار سے اس حق کا صحیح استعمال کر سکتے ہوں۔ فکر و اجتہاد کی یہ آزادی بے قید اور غیر مشروط نہیں ہے بلکہ کچھ قیود اور تحدیدات رکھتی ہے۔ کیونکہ اگر بنیادی امور و مسائل اور اساسی اصول کو طے کرنے کے بعد انسانی عقل کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جاتا تو اندیشہ یہ تھا کہ فنی قوانین اور تفصیلی ضوابط کا رشتہ اس اساس و بنیاد سے منقطع ہو جاتا جس پر یہ قوانین و ضوابط مبنی ہیں۔ ایسا اجتہاد جو اسلام کی روح اور اصول استناد یعنی قرآن و سنت کے بنیادی اصول اور ہدایات سے متصادم ہو جائز نہیں ہے اسی غرض سے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اجتہاد وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے علم و اطلاع، اپنی اصابت رائے اور فکری صلاحیتوں کے اعتبار سے اس کے اہل ہوں۔ قرآن و سنت پر جو قانون کا ماخذ و اساس ہیں ایمان راسخ اور یقین کامل رکھتے ہوں اور متقی و متبع شریعت ہوں۔ مولانا اسماعیل شہیدؒ فرماتے ہیں:

> تحقیق کے دو طریقے ہیں اوّل اجتہاد بشرطیکہ معقول ذوی العقول ہو، دوم الہام بشرطیکہ مداخلت نفسی سے محفوظ ہو۔ پس مشابہ بانبیاء علم احکام میں یا مجتہدین مقبولین ہیں یا ملہمین محفوظین، اور چونکہ کشف و الہام کی طرف نسبت اوائل امت میں موجود نہ تھی اس لیے مشابہ بانبیاء اس فن میں مجتہدین مقبولین ہیں ان کو ائمہ فن سمجھنا چاہیے جیسے ائمہ اربعہ، اگرچہ مجتہدین دین میں بہت گزرے ہیں لیکن امت میں شہرت ان ہی کو حاصل ہے پس گویا اس فن میں مشابہت تامہ ان ہی کو حاصل ہے اور امام کے لقب سے یہی ملقب ہیں۔
>
> (منصب امامت)

بہر حال حاکمیت کا تقاضا طاعت ہے اور طاعت کے لوازم میں سے دستور و آئین، اس کی تشریح اور قانونی تفصیل ہے۔ اور یہ سب لوازم باہم منطقی ربط رکھتے ہیں۔

أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ
فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۭ
كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ
كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ۭ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا
بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

کیا پھر وہ آدمی کہ مُردہ تھا ہم نے اُسے زندگی دی اور اس کے لیے ایک روشنی ٹھہرائی کہ اس کے اُجالے میں لوگوں کے درمیان چلے پھرے اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جس کا حال یہ ہو کہ تاریکیوں میں گھرا ہوا ہے اور ان سے باہر نکلنے والا نہیں ہے۔[۱۵۲] اسی طرح کافروں کی نظر میں وہی باتیں خوشنما دکھائی دیتی ہیں جو وہ کرتے رہتے ہیں۔[۱۵۳] اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بدکردار آدمیوں کے سردار بنا دیے تاکہ وہاں مکر و فریب کے جال پھیلائیں اور فی الواقع وہ مکر و فریب

نہیں کرتے مگر اپنے ہی ساتھ لیکن اُن کو اس کا شعور نہیں ہے۔ ۱۲۴

معانی مفردات

مثلؔ، حال، شان، صفت مثال، اکابرؔ اکبر کی جمع ہے زعیم، سردار کو کہتے ہیں۔ مجرمینؔ، مجرم کی جمع ہے جرم پیشہ لوگ جن کے اعمال و اخلاق میں فساد و ضرر ہو، القریۃؔ، بہت بڑی مرکزی آبادی، آج کی اصطلاح میں دارالخلافہ شہر بول کر اہلِ شہر مراد ہوتے ہیں۔ المکرؔ دقیق اور باریک تدبیر خواہ گفتار سے ہو یا کردار سے۔

ایمان و کفر کی تمثیل

پہلی آیات میں بتایا گیا تھا کہ مشرکین مکہ میں سے بعض اشخاص جو مخالفت میں پیش پیش تھے احکام الٰہی کے خلاف کج بحثیاں کرتے اور طرح طرح کے شبہات پیدا کر کے مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتے۔ اہل ایمان کو بتایا گیا تھا کہ جدال و نزاع کرنے والوں کی راہ طلب حق کی راہ نہیں ہے۔ قرآن نے جس چیز سے روکا ہے اس میں حکمتیں ہیں اور چونکہ ہر سمجھ مصالح و حکم کا ادراک نہیں کر سکتی اس لیے چاہیے کہ راست بازی کے ساتھ خدا کی اطاعت کی جائے اور اس معاملہ میں یہ ہرگز پروا نہ کی جائے کہ اکثریت کیا کہہ رہی ہے۔ حق و باطل کے معاملہ میں انسانوں کی عددی طاقت معیار نہیں ہو سکتی بلکہ حقیقت اور سچائی کے بنیادی اصولوں ہی پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ بسا اوقات گمراہی اور حق فراموشی کے ایسے اوقات آجاتے ہیں کہ نوع انسانی کی اکثریت حق و یقین کی روشنی سے محروم ہو جاتی ہے۔ فرمایا گمراہوں کی کثرت نہ دیکھو یہ دیکھو کہ کون سی راہ یقین اور بصیرت کی راہ ہے اور کون سی جہل و گمان کی۔ اور ساتھ ہی مشرکین عرب کے ان خیالات کی تردید کی ہے جن کے لیے ان کے پاس اوہام و خرافات کے سوا علم و بصیرت کی کوئی روشنی نہ تھی۔ وہ کہتے تھے کہ جن جانوروں کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتے وہ مقدس ہیں۔ اگر ذبح کیا ہوا جانور حلال ہے تو بتوں کی نیاز چڑھا ہوا جانور جو مختلف طریقوں سے مارا جاتا ہے کیوں حلال نہیں ہے۔ قرآن نے بتایا یہ سب باتیں فسق اور بدکاری کی باتیں ہیں اور یہ ان کی اپنی من گھڑت ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ ان کو لوگوں میں پیش کرنے والے شیاطین ہیں۔ یہ خود گمراہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ لوگوں کو گمراہ کر دیں۔ اب اس ضمن میں یہاں

ایمان و کفر کی مثال بیان ہو رہی ہے۔ ایمان زندگی ہے اور علم و بصیرت کی روشنی ہے۔ کفر موت ہے اور اوہام و ظنون کی تاریکی، اس لیے ہدایت یافتہ مومن اور ضلالت میں پڑے ہوئے کافر میں نمایاں فرق ہے۔ اقتدار کے لیے ایمان و ہدایت ہے نہ کہ کفر و ضلالت۔ راہ ان کی چلنی چاہیے جو ہدایت و علم کی روشنی رکھتے ہوں جو تمام عقائد و اعمال میں علم و یقین کا خواہاں ہو اس کے لیے یہ کب جائز ہے کہ کفر و شرک کے اوہام کا اثر قبول کرے جو حیات و موت اور نور و ظلمت میں فرق ہے وہی ایمان و کفر میں ہے۔ ایمان نور ہے تو کفر ظلمت ہے۔ ایمان زندگی ہے تو کفر موت ہے، ایمان بصیرت ہے تو کفر وہم ہے۔

ایمان کی تاریخ یہی ہے کہ اس کے مقابلہ میں صرف عددی طاقت ہی نہیں بلکہ مادی طاقت بھی آتی ہے جب کسی آبادی میں داعیٔ حق کھڑا ہوتا تو وہاں کی مادی طاقت اس کو اپنے خلاف چیلنج محسوس کرتی ہے اور وہ خیال کرتی ہے۔

۱۲۲ - کیا پھر وہ آدمی کہ مُردہ تھا ہم نے اُسے زندگی دی اور اس کے لیے ایک روشنی ٹھہرائی کہ اس کے اُجالے میں لوگوں کے اندر چلے پھرے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کا حال یہ ہو کہ تاریکیوں میں گھرا ہوا ہے اور ان سے باہر نکلنے والا نہیں ہے۔ پہلے فرمایا کہ شیاطین اپنے رفقاء کے دل میں ڈالتے ہیں کہ وہ مسلمانوں سے جھگڑا کریں یعنی بحث و جدال، تلبیس و تلمیع اور وسوسہ اندازی کر کے ان کو طریق حق سے ہٹا دیں لیکن ان کو یہ ہوس خام اپنے دلوں سے نکال دینی چاہیے، وہ گروہ یا وہ شخص جو جہل و ضلالت کی موت سے مر چکا تھا پھر اس کو حق تعالیٰ نے ایمان و عرفان کی رُوح سے زندہ کیا اور قرآن کی روشنی عطا کی جسے وہ لے کر لوگوں کے ہجوم میں بے تکلف راہِ راست پر چل رہا ہے کیا اس کا حال اغوائے شیطانی کے قبول کرنے میں ان اولیاء الشیطان جیسا ہو سکتا ہے جو جہالت و ضلالت کے اندھیروں میں پڑے ٹھوکریں کھا رہے ہیں جس سے نکلنے کی راہ نہیں پاتے کیونکہ وہ اسی ظلمت کو نور اور بُرائی کو بھلائی سمجھتے ہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔[1]

اصل ارشاد میں آغاز او من کان میتاً سے ہوا ہے ہمزہ استفہام یعنی سوالیہ فقرے کی علامت بن کر آیا ہے اس کے بعد واو عطف ہے لیکن واو سے پہلا فقرہ معلوم ہونے کی وجہ سے حذف کر کے دوسرا فقرہ ذکر کیا ہے یہ قرآن کا بلیغ اختصار ہے۔ سوالیہ فقرہ میں اس نوع کا اختصار عربی زبان میں از روئے بلاغت بہت جاندار ہوتا ہے۔ پورا فقرہ اس طرح ہے اانتم مثلهم ومن کان

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ کیا تم اے اہلِ ایمان ان شیطان جیسے ہو سکتے ہو اور کیسے ہو سکتے ہو دونوں کا ذرا تقابلی مطالعہ کرو۔

ایک طرف وہ اہلِ ایمان ہیں جن کو اللہ سبحانہٗ نے کفر و جہل کی موت سے نکال کر ایمان و علم کی زندگی عطا فرمائی ہے اور اس پر مزید انعام یہ کہ قرآن کی صورت میں ایک روشنی بخشی ہے جس سے وہ خود بھی منور ہیں اور دوسروں کے لیے اُجالے کا سامان بن رہے ہیں۔ اس طرح اس فقرے میں موت سے مراد کفر کی زندگی اور جہالت اور حق سے بے خبری ہے اور حیات سے مراد ایمان کی زندگی علم و ادراک اور حقیقت آگاہی ہے جو شخص حق اور باطل میں تمیز نہیں کرتا اور نہیں جانتا کہ حق کیا اور کدھر ہے وہ یقیناً اس لائق نہیں ہے کہ اسے زندوں میں شمار کیا جائے۔ مناطقہ کی زبان میں وہ حیوان ناطق ضرور ہے مگر حقیقت میں اسے انسانیت کی زندگی میسر نہیں ہے۔ اصل میں زندگی اس کی ہے جسے حق و باطل اور نیکی و بدی کا شعور ہو۔ اور نور سے مراد وہ کتاب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حق و باطل میں امتیاز اور حلال و حرام کی تفصیل کے لیے اتارا ہے۔ کتابِ الٰہی کے روشنی ہونے کا منشا ہی یہ ہے کہ اس سے خود ہی رہنمائی حاصل نہ کرے بلکہ لوگوں میں بھی اسے لے کر نکلے تاکہ جن میں استعداد ہو وہ بھی اس سے فائدہ اٹھائیں۔ روشنی چھپا کر رکھنے کی چیز نہیں ہوتی بلکہ اونچی جگہ سرِ راہ رکھنے کی چیز ہوتی ہے۔

ان کے مقابلے میں وہ اہلِ کفر ہیں جو کفر و جہل اور اوہام کی تہ بر تہ تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں اور ان سے نکلنے کا نام نہیں لیتے حیران و سرگرداں ہیں۔ ان کے بارے میں اللہ کا قانون یہی ہے کہ جو لوگ حق کی پذیرائی کے لیے تیار نہ ہوں اور غلط راہوں پر چلتے رہنے ہی کو ترجیح دیں وہ تاریکی ہی میں رہتے ہیں اور ان کو وہی اچھی لگتی ہے اس تمثیل کے پیش کرنے کا مقصود ایک طرف تو مسلمانوں کی حوصلہ افزائی ہے کہ تم ان شیاطین کی غوغا آرائیوں کی پروا نہ کرو تم کو خدا نے حیاتِ ایمانی اور نورِ قرآنی سے مالا مال کیا ہے تمہیں شعور نصیب ہو چکا ہے اور تم علم کی روشنی میں ٹیڑھے راستوں کے درمیان حق کی سیدھی راہ کو دیکھ رہے ہو۔

دوسری اس میں مسلمانوں کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ علمبردارِ حق ہونے کی حیثیت سے تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ تم کو خدا نے ایمان کی زندگی اور علم کا نور بخشا ہے تو تم اسے لے کر آگے بڑھو اور پوری کائناتِ انسانی کو ایمان کی زندگی اور علم کے نور سے مالا مال کر دو۔ علم و ایمان کا جو سرمایہ اللہ نے تمہیں دیا ہے اس کا حق یہ ہے کہ اسے اللہ کے بندوں تک پہنچا دیا جائے یمشی بہٖ فی الناس میں اس ذمہ داری کی طرف صاف اشارہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو روشنی ملے تو اس کا حق یہ ہے کہ اس سے خود بھی فیض حاصل کرے اور لوگوں کو بھی اس کے فیضان سے متمتع ہونے کا سامان کرے۔ اگر دنیا

تاریکیوں میں بھٹک رہی ہے اور تم دیکھ رہے ہو کہ گر رہی ہے ٹھوکریں کھا رہی ہے اور تمہارے پاس روشنی موجود ہے تمہارا فرض ہے کہ گرنے اور بھٹکنے والوں کی مدد کرو۔ تمہارے پاس اگر علم و ایمان کا پانی ہے اور تم دیکھ رہے ہو کہ پوری شہری زندگی پیاسی تڑپ رہی ہے تمہارا فرض ہے کہ پیاسوں کو پانی پلاؤ۔

ایمان کی زندگی اور علم کی روشنی کو انسانوں میں لے کر چلنا کیا ہے اس کا مفہوم اور اس کی عملی شکل کیا ہے۔ اس سلسلے میں اصولاً اور مجملاً اتنا تو معلوم ہو چکا ہے کہ جس طرح حیات اور نور ایک متعین چیز ہے اسی طرح حیات اور نور کو لے کر چلنے کا مفہوم اور اس کی عملی شکل بھی متعین ہے اور یہ تعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ کرتا ہے۔ تفسیر ماثور میں عبداللہ بن عباس سے موت سے کفر اور زندگی سے ہدایت، نور سے قرآن عزیز اور ظلمات سے کفر و ضلالت اور شرک و بدعات کی تاریکیاں مراد منقول ہے۔ اسی سے ان کو لے کر چلنے کا مفہوم بھی خود بخود سمجھ میں آ رہا ہے کہ ایک مسلمان اپنی گفتار اور کردار میں غیر مسلموں کے لیے ایمان و ہدایت اور علم کی کھلی کتاب بن جاتے اور ان کے لیے اسلام کی صداقت کے پا لینے میں کوئی معقول رکاوٹ نہ رہے۔ قرآن کی یہ تمثیل بتاتی ہے کہ صحابہ کرام نے اپنی زندگیوں میں اسلام کی حقانیت پر علم و عقل کی ایسی دلیلیں اور فطرت و وجدان کی ایسی شہادتیں مہیا کر لی تھیں جن سے ان کی سچائی شاہراہ عام پر آگئی تھی۔ قرآن نے توحید و رسالت اور فکر آخرت پر جس زور اور قوت سے اور جس ہمہ گیر انداز میں دلائل پیش کیے ہیں ان کی زندگیاں اس کا بھر پور عکس بن گئی تھیں۔ ان کی انفرادی اور پرائیویٹ زندگی سے لے کر ان کی اجتماعی اور پبلک لائف اس کی عملی مثال تھی۔ اگرچہ بتانے والوں نے اس کا مصداق ایمان کی حد میں عمر بن الخطاب، حمزہ اور عمار بن یاسر اور کفر کے لیے ابوجہل کا نام لیا ہے لیکن جیسا کہ علامہ آلوسی نے فرمایا کہ قرآن میں تعبیر عمومی ہے اس لیے تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہی ہے کہ پوری جماعت اس کی مصداق تھی۔ یہ تمثیل بتا رہی ہے کہ صحابہ کرام کی جماعت انسانیت کا مثالی نمونہ تھی۔ ایمان و علم کے یہ بہترین اور مثالی نمونے صحابہ کے حالات میں اس کثرت سے ملتے ہیں کہ اگر انہیں کوئی مورخ یا ادیب یا نفسیات و اخلاق کا کوئی عالم جمع کرے اور ان سے ایک جامع اور منفرد شخصیت تیار کرے تو انسانی سیرتوں میں ایک ممتاز سیرت و شخصیت تیار ہو جاتے اور انسانیت کے عظیم مرقع اور انسانیت کی عالمی تاریخ کی جلوہ گاہ میں ایک حسین ترین پیکر کا اضافہ ہو جاتے۔ قرآن کی یہ تمثیل بزبانِ حال بتا رہی ہے کہ اس وقت تمام لوگ نہایت مسخ شدہ موت نما زندگی گزار رہے تھے۔ ہر وہ ہستی جو ان کے لیے وجود میں لائی گئی تھی اور جو ان کے تصرفات کے تابع تھی، امر و نہی، جزا و سزا کی طاقت سے محروم تھی۔ اس کی وہ پرستش کرنے لگے تھے وہ بالکل ایک سطحی اور عام قسم کی مذہبیت رکھتے تھے جس کا زندگی میں کوئی اثر اور ان کے طبائع اور

ارواح و قلوب پر کوئی اقتدار نہ تھا۔

اخلاق و معاشرت اس مذہبیت سے ذرا متاثر نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی ان کی نگاہوں میں ایسی ہے جیسا کہ ایک کاریگر اپنا کام پورا کر کے کنارہ کش اور گوشہ نشین ہو گیا ہو۔ ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ نے اپنی مملکت ان لوگوں کے حوالے کر دی تھی جن کو اس نے خلعتِ ربوبیت سے سرفراز کیا تھا۔ اب وہ حکومت پر قابض اور سیاہ سفید کے مالک تھے لیکن زندگی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ مذہب کے نام پر صرف چند بے روح رسمیں اور ایمان کی بے جان نقلیں عرب میں رہ گئی تھیں۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ قرآن آیا اور عرب قوم اس بیمار، غیر واضح اور بے جان معرفت سے نکل کر ایک ایسے واضح اور عمیق عقیدے تک پہنچ گئی جو قلب و نفس و جوارح پر قابو یافتہ تھا۔ معاشرت کو متاثر کرنے والا زندگی اور متعلقات پر حاوی تھا۔ وہ لوگ اس خدائے قدوس پر ایمان لاتے جس کے بہترین نام میں جس کی شان سب سے اونچی ہے جو اس کارخانہ عالم کا پیدا کرنے والا بھی ہے اور چلانے والا بھی، جس کے قبضۂ قدرت میں تمام عالم کی باگ ڈور ہے جو پناہ دیتا ہے۔ جنت اس کا انعام اور دوزخ اس کی سزا ہے۔

اس گہرے، وسیع اور واضح ایمان سے ان لوگوں کی نفسیات عجیب طرح سے تبدیل ہو گئیں جب بھی کوئی کفر کی گود سے نکل کر آتا اور ایمان لاتا اور شہادتین کا اقرار کرتا۔ اقرار کے ساتھ اس کی زندگی میں عظیم انقلاب رونما ہوتا۔ ایسا انقلاب جیسے موت اور حیات کا ظلمت و نور کا انقلاب ہوتا ہے ایمان اس میں پیوست ہو جاتا یقین رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتا اور اس کے جسم میں خون اور روح کی طرح دوڑ جاتا۔ کفر کے جراثیم کو ختم کر دیتا اوہام کی ظلمتیں چھٹ جاتیں۔ دل و دماغ ایمان کے فیضان سے معمور ہو جاتے اور وہ شخص پہلا آدمی نہ رہتا۔ پہلے وہ مردہ تھا اب زندہ ہوتا، پہلے بے راہ تھا اب راہ رو ہوتا، پہلے وہ ضلالت کی اندھیریوں میں تھا اب وہ ہدایت کی روشنی میں ہوتا۔ اس سے صبر و شجاعت، ایمان و یقین کے ایسے حیرت انگیز واقعات رونما ہوتے کہ عقل دنگ رہ جاتی اور فلسفہ و تاریخ انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتے

عامل کے لیے اعمال کی تزئین

۱۵۲۔ اسی طرح کافروں کی نظر میں وہی باتیں خوشنما دکھائی دیتی ہیں جو وہ کرتے تھے۔ اصل ارشاد میں کذالک آیا ہے اس کے معنے ایسے ہی اور اسی طرح کے ہیں۔ پوری بات یوں ہے کہ جیسے اللہ نے تمہارے دلوں میں نورِ ہدایت کو مزین کر دیا ہے ایسے ہی کافروں کے لیے کفر و ضلالت پر مبنی اعمال کو مزین کر دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کے سامنے روشنی پیش کی جاتی ہے اور وہ اس کے قبول کرنے سے

انکار کر دیں۔ جنہیں راہِ راست کی طرف دعوت دی جائے اور وہ اپنے ٹیڑھے راستوں پر چلتے رہنے کو ترجیح دیں، ان کے لیے اللہ کا قانون یہی ہے کہ پھر ان کو تاریکی ہی اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر چلنا اور ٹھوکریں کھا کھا کر گرنا ہی پسند کرتے ہیں۔ ان کو جھاڑیاں ہی باغ اور کانٹے ہی پھول نظر آتے ہیں۔ انہیں ہر بدکاری میں مزہ آتا ہے۔ ہر حماقت کو وہ تحقیق سمجھتے اور ہر فساد انگیز تجربے کے بعد اس سے بڑھ کر دوسرے فساد انگیز تجربے کے لیے وہ اس اُمید پر تیار ہو جاتے ہیں کہ پہلے اتفاق سے دہکتے ہوئے انگاروں پر ہاتھ پڑ گیا تھا تو اب کے لعلِ بدخشاں ہاتھ آجائے گا۔[1]

منشا یہ بتانا ہے کہ یہاں قانون یہی ہے کہ جو جس دُھن میں لگ جاتا ہے اس کو وہی اچھا اور خوشنما معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہاں زُیّنَ فعل مجہول لایا گیا ہے کیونکہ مشبہ بہ میں دونوں احتمال ہیں، پہلا تو بتایا جا چکا ہے کہ جیسے مومن کے لیے ایمان کو مزین کیا گیا ہے ایسے ہی کافر کے لیے اس کے کفر کو سجا دیا ہے اور دوسرا یہ کہ جیسا کہ کافروں کے کفر کو سجایا جاتا ہے ایسا ہی ان کے لیے کفر و ضلالت کے سارے اعمال کو سجایا گیا ہے خالق تو ہر چیز کا اللہ ہی ہے لیکن کافروں کے لیے کفر کی تزئین شیطان وسوسہ اندازی کے ذریعے کرتا ہے ابلیس کا دعویٰ قرآن میں نقل کیا گیا ہے لازینن فی الارض، اسی تمثیل کی مزید وضاحت آگے آرہی ہے۔

حق و باطل کی آویزش کا قانون

۱۵۴۔ اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بدکردار لوگوں کو سردار بنا دیا تا کہ وہاں مکر و فریب کے جال پھیلائیں اور فی الواقع وہ مکر و فریب نہیں کرتے مگر اپنے ہی ساتھ لیکن ان کو اس کا شعور نہیں ہے۔

یعنی کچھ آج رؤسائے مکہ ہی نہیں ہمیشہ کافروں کے سردار حیلے نکالتے رہے ہیں تا کہ عوام الناس پیغمبروں کے مطیع نہ ہو جائیں جیسے فرعون نے معجزہ دیکھا تو حیلہ نکالا کہ سحر کے زور سے سلطنت لینا چاہتا ہے لیکن ان کے یہ حیلے اور پیچ داؤ بحمد اللہ پکے ایمانداروں پر نہیں چلتے۔ حیلہ کرنے والے اپنی عافیت خراب کر کے خود اپنا ہی نقصان کرتے ہیں جس کا احساس انہیں اس وقت نہیں ہوتا۔[2]

اصل ارشاد میں یہاں بھی کذالک آیا ہے اس کے معنے ہیں اور ایسے ہی، یہ سنتے ہی ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ کیسے؟ اس کیسے کے جواب میں شارحینِ قرآن کی تین آرائیں ہیں۔ عموماً تو ان حالات ہی سے اس کا جواب دیا گیا ہے جن احوال و ظروف میں اس پوری سورت کا نزول ہوا ہے اور بتایا ہے کہ جیسے ہم

---

[1] تفہیم القرآن [2] افاداتِ شیخ الاسلام

مکہ والوں کے اکابر مجرمین کو داعی کا مقابلہ کرنے کے لیے مکہ میں مکر و فریب اور سازشوں کا موقعہ دیا ہے ایسے ہی ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرمین کو اس کام پر لگا دیا ہے کہ اپنے مکر و فریب کے جال پھیلائیں۔ اور کچھ کی رائے میں اس کا جواب پہلی آیت میں ہے اور پوری بات اس طرح ہے کہ جیسا کہ کافروں کے لیے ان کے اعمال مزین ہوتے ہیں ایسے ہی ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے جرائم پیشہ لوگوں کو اس کام پر لگایا ہے کہ داعی حق کے خلاف سازشیں کریں۔ گویا پہلا جواب قرینہ حالیہ سے اور دوسرا جواب قرینہ لفظیہ سے پیدا کیا گیا ہے۔ اور کچھ نے اس سوال کا جواب دونوں کی مدد سے تیار کیا ہے اور بنایا ہے کہ جیسے اہل مکہ کے اعمال ان کے لیے مزین ہوتے ہیں ایسے ہی ہم ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرمین کو اس مہم پر لگا دیا ہے کہ انسانی زندگی میں ہمارے قانون کے مطابق داعی حق کا مقابلہ کریں۔

یاد رہے کہ جعلنا، ہم نے کر دیا، لگا دیا سے مراد حکم طبعی اور قانون تکوینی ہے۔ یعنی قدرتی طور پر ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے کہ جب کسی قوم کی شامت آنے والی ہوتی ہے تو اس کے اکابر جرم پیشہ ہو جاتے ہیں اور یہ جرم پیشہ اکابر دعوتِ حق کا اپنی چالبازیوں اور عیاریوں سے مقابلہ کرتے ہیں۔

دراصل جس حقیقت پر اس آیت میں متنبہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ دعوتِ حق کا مقابلہ جو چیز کرتی ہے وہ اونچے طبقہ کے جُرم پیشہ طبقہ کی مقاومت ہے۔ لفظ اکابر یہاں اکبر کی جمع ہے۔ امام مجاہد اور قتادہ نے اس کی تفسیر عظما سے کی ہے یعنی سردار اور زعمارِ قوم۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ ہر دور میں اور ہر قوم میں جب کوئی داعی حق دعوت لے کر کھڑا ہوتا ہے تو قوم کے سردار، زعمار، حکمران اس دعوتِ حق کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اور اس مقابلہ میں داعی حق کے خلاف قسم قسم کی سازشوں کا جال بنتے ہیں۔ چونکہ انبیا کی دعوت کو وہ اپنی جاہ و اقتدار اور اپنی حکومت کے خلاف چیلنج سمجھتے ہیں اس لیے نبوت کی آواز کو دبانے کے لیے ہر ممکن سازش کرتے ہیں۔

اس تعبیر کے انداز میں لفظ جعل کے مفعول کے بارے میں شارحین قرآن کی دو رائیں ہیں۔ کچھ کا خیال ہے اکابر مجرمیھا اس کا ایک ہی مفعول ہے۔ اور کچھ کی رائے میں اکابر مجرمیھا الگ الگ دو مفعول ہیں قاضی بیضاوی نے دو مفعول بتاتے ہیں ایک اکابر مفعول ہے اور ایک مجرمیھا ہے مگر اصل میں مفعول اول مجرمیھا ہے اور اکابر مفعول ثانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے بستی کے مجرمین کو بستی کا بڑا بنا دیا ہے۔ امام رازی نے اسی کو ترجیح دی ہے اور کچھ کے خیال میں اکابر مجرمیھا مفعول ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے بستی کے بڑے جرم پیشہ لوگوں کو ہر بستی میں موقعہ دیا ہے۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ اس عبارت میں فی کل قریۃ کا تعلق جعلنا سے ہے اور اکابر مجرمیھا مفعول اول اور لیمکروا دوسرا مفعول ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے ہر بستی میں

بستی کے بڑے بڑے جرائم پیشہ لوگوں کو مکر و فریب کرنے کو لگا دیا ہے اور آلوسی نے شیخ الاسلام سے ایک لطیف بات یہ نقل کی ہے کہ اس فقرے میں کذالک مفعول ثانی ہے اسے جعلنا سے پہلے خصوصیت کی خاطر لایا گیا ہے اور اکابر مجرمیہا مفعول اول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان ہی جیسوں کو ہم نے ہر بستی میں اکابر مجرمین بنایا ہے تاکہ بستی میں داعیٔ حق کے خلاف مکر و فریب کا جال پھیلائیں۔ لیکن علامہ آلوسی نے اسے پسند نہیں کیا ہے :

مکر کے معنے اصل میں کسی شخص کے کام میں گفتار و کردار کے ذریعہ لطیف حیلہ سے رکاوٹ ڈالنے کے ہیں۔ منشا یہ ہے کہ دعوتِ حق کے مخالفین اس دعوت کی مخالفت میں جو ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے۔ ہر ملک میں، ہر قوم میں جب بھی دعوتِ حق بلند ہوئی ہے وہاں جو مادہ پرست لوگ غلط نظامِ زندگی کے علمبردار ہوتے ہیں اور جن کا اس نظامِ زندگی سے مفاد وابستہ ہوتا ہے اسی طرح اپنی تمام چالوں کے ساتھ اس کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق ان کو بھی ایک خاص وقت تک ڈھیل دیتا ہے۔

آج بھی دعوتِ حق اس کے داعیوں اور مصلحین کے ساتھ مادہ پرستوں اور حق کے مخالفوں کا یہی حال ہے حق کے خلاف مصنفین، اہلِ قلم اور اہلِ دماغ گروہ اپنی جادو بیانی، سحر طرازی اور زورِ خطابت سے پورے ملک میں ایک عام بغاوت برپا کر دیتے ہیں اور باطل کو نہایت دلفریب بنا کر پیش کرتے ہیں۔ حق کے خلاف غیظ و غضب کا جذبہ بھڑکاتے ہیں اور بس۔

یہی حال ہر باطل کا ہے خواہ اس کا نام کچھ ہو، اسلامی نظام کے مقابلے میں سرمایہ دارانہ نظام یا اشتراکی نظام، توحید کے مقابلے میں شرک ہو یا سنت کے مقابلے میں بدعت ہو، اور بالآخر آخرت کے مقابلے میں دنیا ہو۔

بہر حال اس آیت نے یہ رہنما اصول ہمیں بتایا ہے کہ جب کسی آبادی میں کوئی داعیٔ حق کھڑا ہوتا ہے تو وہاں کے اکابر و عظما جو پورے معاشرے کو جرائم میں مبتلا کیے ہوئے رہتے ہیں وہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر دعوتِ حق کامیاب ہو گئی تو ان کے ظالمانہ اختیارات کا خاتمہ ہو جائے گا اس لیے انہیں ایک طرح کی ذاتی دشمنی اور کد ہو جاتی ہے۔ وہ طرح طرح کی مکاریاں کرتے ہیں تاکہ لوگ دعوتِ حق قبول نہ کریں۔

آخر میں فرمایا وما یمکرون یعنی وہ تو دعوتِ حق کے خلاف مکاریاں کرتے ہیں لیکن یہ مکاریاں ان ہی کے خلاف پڑتی ہیں۔ حق کی مخالفت کرنے والے حق کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو تباہ کرتے ہیں لیکن چونکہ ان کے سامنے اس کا انجام نہیں ہوتا اس وجہ سے ان کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ فقرہ ایک حیثیت میں

اہل ایمان کے لیے تسلی کا پیغام ہے اور ایک حیثیت میں دعوتِ حق کے مخالفین کے لیے بہت بڑی دھمکی ہے اور ایک اجتماعی قانون کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جرائم پیشہ روسا اور علما اپنے نشہ اقتدار میں انبیا اور علمبرداران حق کے خلاف جو طرزِ عمل، غیظ و غضب اور مکر و فریب کا اختیار کیے ہوتے ہیں اس کے نتائج سے یہ خود ہی دوچار ہوں گے، دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دُنیا میں اس طرح کہ ہم انبیا کی مدد کریں گے اور مخالفین کو ہلاک کریں گے۔ حق کا بول بالا ہوگا اور باطل مٹ کر رہے گا۔ قرآن میں دوسرے موقع پر ہے ولا یحیق المکر السیئ الا باھلہ یہ حق و باطل کی آویزش کا مسئلہ ہے اور باطل کے مقابلہ میں سربلندی حق کے لیے ہے۔

وَإِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ
اللّٰهِ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا وقف لازم وقف لا
صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ﴿١٢٤﴾ فَمَنْ
يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ
يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ ؕ
كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٢٥﴾
وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿١٢٦﴾
لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٢٧﴾

اور جب ان کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو کہتے ہیں ہم ہرگز ایمان نہ لائیں
گے جب تک ہمیں ویسی ہی بات نہ ملے جیسی اللہ کے رسولوں کو مل چکی ہے [١٥٥]
اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس جگہ اور کہاں اپنی رسالت بنائے جو لوگ
جرم پیشہ بن چکے ہیں عنقریب ان کو خدا کے حضور میں ذلت و حقارت

سے دوچار ہونا پڑے گا اور ان کو اپنی مکاریوں کی پاداش میں سخت عذاب بھگتنا ہوگا۔[156] لہٰذا جس کو خدا چاہتا ہے کہ ہدایت سے نوازے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔[157] اور جس پر راہ گم کردینی چاہتا ہے اس کے سینہ کو اس طرح تنگ کردیتا ہے گویا بلندی پر چڑھ رہا ہو۔[158] اسی طرح اللہ ان لوگوں پر عذاب روانہ کرتا ہے جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے ہیں[159] اور یہ اسلام کی راہ تمہارے پروردگار کی سیدھی راہ ہے، بلاشبہ ہم نے ان لوگوں کے لیے جو نصیحت پر دھیان دینے والے ہیں نشانیاں کھول کر بیان کردی ہیں۔[160] ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس سلامتی کا گھر ہے اور ان کے اعمال کے سبب اللہ ہی ان کا مددگار اور رفیق ہے۔[161]

معانی مفردات

رسالۃ: پیغام ارسال سے اسم ہے، اس کے معنے پیغام اور خط کے آتے ہیں۔ رسالت کی شرعی تعریف علامہ سعد الدین تفتازانی نے ان الفاظ میں کی ہے ھی سفارۃ العبد بین اللہ

و بین ذوی العقول من خلیقتہ لیزیح بہا علتھم فیما قصرت عنہ عقولھم من مصالح الدنیا والاٰخرۃ ۔رسالت اللہ اور اس کی مخلوق عقل والی کے درمیان بندے کا سفیر بن کرآتا ہے تاکہ اس کے ذریعے ان کی ان بیماریوں کو دور کردے جن میں ان کی عقلیں دُنیا و آخرت کی مصالح کے ادراک سے عاجز ہیں ۔ صغار ، ذلت اور رُسوائی ۔ دو لفظ ہیں ایک صغار اور دوسرا صِغَر بروزن عِنَب دونوں کے معنے ذلت کے ہیں لیکن دونوں میں فرق ہے صغار معنوی حالات یعنی مراتب کے لیے اور صِغَر مادی اور حسی کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔صاغر کی امام راغب نے تشریح یہ کی ہے وہ شخص جو کمتر مرتبہ پر خوش ہو ۔ یشرح ، کھولتا ہے ، شرح سے مضارع کا واحد ہے اصل میں شرح کے معنے گوشت وغیرہ کے پھیلنے کے ہیں ۔ شرح صدر کا مطلب سینہ کا نور الٰہی سے کشادہ ہونا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسکین پانا ہے ضیق ، ضاق یضیق سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے تنگ ۔ امام راغب لکھتے ہیں ضیق سعۃ وسعت اور کشادگی کی ضد ہے اور دونوں طرح بولا جاتا ہے ضاد کے زیر اور زبر کے ساتھ اسی سے ضائق بہ صدرک اور یضیق صدری ہے اور اسی سے ضیقا حرجاً تنگ ہے نہایت تنگ آیا ہے حرجاً ۔ تنگ مضائقہ ، گناہ ، تنگی ۔ اصل میں حرج کے معنے کسی چیز کے مجتمع ہونے کی جگہ کے ہیں ۔ بہت سے گھنے درخت جو باہم گڈمڈ ہوں کہ ان میں جانا دشوار ہو حرج کہلاتے ہیں ۔حضرت عمر نے بنی مدلج کے ایک شخص سے حرج کے معنے دریافت کیے ۔ اس نے بتایا کہ وہ درخت جو درختوں کے درمیان ہو ، چرند اور درند کی اس تک رسائی نہ ہو ۔حضرت عمر نے فرمایا ایسے ہی منافق کا دل بھی ہوتا ہے کہ اس تک خیر کی رسائی نہیں ہوتی ۔ رجس ، ناپاک ، پلید ، گندہ ، عقوبت ، عذاب ، بلا ، اس کی جمع ارجاس آتی ہے ۔ رجس کی چار صورتیں ہیں ۔ اوّل طبیعت کی رو سے دوم از روئے عقل ، سوم بتقاضائے شریعت ، چہارم ان تینوں وجہ سے ۔ رجس شرعی جوا ، شراب ، رجس عقلی شرک لحم خنزیر اور تینوں کا مجموعہ مُردار ہے ۔ صراط ، راہ ، راستہ سیدھا اور آسان راستہ کو صراط کہتے ہیں ۔ یاد رہے کہ صراط اصل میں سراط ہے اس میں س کا ص سے قلب ہے تاکہ اطباق میں طا کے مطابق ہو جائے ۔ سرط الطعام کے معنے کھانا نگلنے کے ہیں ۔ سراط میں اس کا تصور ہے کہ راہ رو راستہ کو نگلتا ہے یا راستہ راہ گیر کو نگلتا ہے ۔

ہدایت وضلالت کا راز

ہدایت وضلالت کا راز بھی ایک بڑا ہی عجیب راز ہے۔ پہلے بتایا تھا کہ انسانی زندگی میں اللہ کی سنت یہی ہے کہ ہر قوم، ہر ملک اور ہر دور میں جرم پیشہ لوگ امامت اور قیادت کے منصب پر گامزن ہوتے ہیں اور یہی انبیاؑ ورسل کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اب یہ بتانا چاہتا ہے کہ حق وباطل کی اس کشمکش میں جبکہ حق بے بسی اور بے کسی کی حالت میں ہو اور باطل پوری قوت وطاقت سے مسلح ہو۔ قبولِ حق اور انکارِ حق کا ضابطہ کیا ہے ایک ہی بات ہے جو ہزاروں آدمیوں کے سامنے کہی جاتی ہے مگر کوئی اس کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا۔ کوئی توجہ کرتا ہے مگر وہ اس کے پردہ گوش پر سے اچٹ کر چلی جاتی ہے کوئی اس کو سنتا اور سمجھتا ہے مگر مانتا نہیں کوئی اس کی تعریف وتحسین کرتا ہے مگر قبول وتسلیم نہیں کرتا اور کسی کے دل میں وہ گھر کر جاتی ہے اور وہ اس کی صداقت پر ایمان لے آتا ہے۔ ہمارا روزانہ کا مطالعہ ہے کہ ایک شخص کو بازار میں چوٹ لگ کر گرتے ہوئے سینکڑوں آدمی دیکھتے ہیں۔ بہت سے اس کو ایک معمولی واقعہ سمجھ کر دیکھتے ہوئے گزر جاتے ہیں بہتوں کے دل میں رحم آتا ہے مگر وہ افسوس کرتے ہوتے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ بہت سے اس کا تماشہ دیکھتے ہیں اور کچھ اللہ کے بندے ایسے آتے ہیں جو بڑھ کر اسے اٹھاتے ہیں اس سے ہمدردی کرتے ہیں اس کی امداد کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ مختلف لوگوں کی مختلف نفسی کیفیات وتاثرات ہیں جن کا اختلاف زیادہ تعجب خیز نہیں ہے یہی حال ضلالت وہدایت کا بھی ہے ایک ہی قرآن تھا، ایک ہی تعلیم تھی، ایک ہی اس کو سنانے والی زبان تھی ابوجہل اور ابولہب تمام عمر اس کو سنتے رہے مگر کبھی ان کے کانوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ خدیجۃ الکبریٰؓ، ابوبکرؓ، علی مرتضیٰؓ، اور زیدؓ نے سنا، پہلے ہی لمحہ میں اس پر ایمان لے آتے بغیر اس کے کہ ان کے دل میں شائبہ گزرتا۔ عمر بن الخطاب نے بیسیوں بار سنا اور صرف یہی نہیں کہ تسلیم نہیں کیا بلکہ جوں جوں سنتے رہے مخالف ہوتے گئے لیکن ایک بار انہی کانوں نے اس کو سنا تو کان اور دل کے درمیان جس قدر آہنی دیواریں تھیں یکایک منہدم ہو گئیں اور ان پر ایسا اثر ہوا کہ ان کی زندگی کی کایا پلٹ گئی۔ ہرچند کہ نفسی نقطہ نظر سے اس اختلاف کیفیت اور اختلاف اثر وتاثر کی بہت سی توجیہیں کی جاسکتی ہیں وہ سب اپنی جگہ درست ہیں مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جو چیز چشم وگوش اور دل ودماغ کے درمیان کہیں ایک مستقل حجاب بن جاتی ہے کہیں ایک مدت تک حجاب بنی رہتی ہے اور ایک نفسی موقع پر خود بخود چاک ہو جاتی ہے کہیں سرے سے حجاب بنتی ہی نہیں۔ کہیں کسی بات کے لیے

حجاب بنتی ہے اور کسی بات کے لیے نہیں بنتی وہ بالکل انسان کے ارادے و اختیار کے تابع نہیں ہے بلکہ فطری اور جبلی طور پر انسان میں خود بخود پیدا ہوتی ہے۔ یہی نکتہ ہے جسے ان آیات میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

۱۵۵۔ اور جب ان کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک ہمیں ویسی ہی بات نہ ملے جیسی اللہ کے رسولوں کو مل چکی ہے۔ ان کی مکاری اور متکبرانہ حیلہ جوئی کی ایک مثال یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے صدق کا جب کوئی نشان دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ان دلائل و نشانات کو نہیں جانتے ہم تو اس وقت یقین کر سکتے ہیں جب ہمارے اوپر فرشتے نازل ہوں اور پیغمبروں کی طرح ہم کو ہی خدا کا پیغام سنائیں یا خود حق تعالیٰ ہمارے سامنے آجائیں۔

وقال الذین لا یرجون لقاءنا لولا انزل علینا الملائکۃ او نری ربنا لقد استکبروا فی انفسہم [1]

مطلب یہ ہے کہ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت پر ان مشرکین کے سامنے جنہوں نے قسمیں کھا کر کہا تھا لئن جاءتہم اٰیۃ لیومنن بہا کوئی نشانی ظاہر ہوتی ہے تو یہ معاندین قریش یعنی اکابر مجرمین اور رؤساء ماکرین اور ان کی تقلید میں عوام کہتے ہیں کہ ان نشانیوں سے ہم کو تسلی نہ ہوگی اور ہم یقین نہ کریں گے جب تک گزشتہ پیغمبروں کی طرح خود ہم کو بھی وہی نشانیاں نہ دی جائیں جو امتوں کے پیغمبروں کو دی گئی ہیں۔ اصل ارشاد میں حتی نوتیٰ مثل ما اوتی رسل اللہ آیا ہے۔ ابن جریر نے اس کا یہ مطلب بتایا ہے کہ ہم اس وقت تک ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک آپ کے ہاتھ پر پہلے پیغمبروں جیسے معجزات کا ظہور نہ ہو جیسے حضرت موسیٰ کے لیے سمندر کا پھٹنا، حضرت عیسیٰ کے لیے مادرزاد اندھوں کا بینا، مردوں کا زندہ ہونا۔ اور حافظ ابن کثیر نے اس کا یہ مطلب بتایا ہے کہ ہم اس وقت تک رسالت و نبوت کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں جب تک ہمیں بھی وہ رسالت نہ ملے یعنی نبوت کے تمام آثار و کیفیات خود ہم پر طاری نہ ہوں تاکہ دھوکہ اور فریب کا کوئی شبہ نہ رہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ اللہ نے ان کو رسول کیوں بنایا اور ہمیں کیوں نظر انداز کیا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ ابن جریر کے بیان کردہ مطلب میں ان کا مقصد دیگر معجزات کا مطالبہ ہے اور ابن کثیر کو شارحین قرآن کی رائے عامہ کی تائید حاصل ہے اور یہی قرآن کے سیاق و سباق کے مناسب ہے۔ گویا ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ہم پیغمبروں کے اس بیان کو ہرگز تسلیم نہ کریں گے کہ ان کے پاس فرشتہ آتا ہے اور خدا کا پیغام لایا ہے۔ ہم ان کی یہ بات صرف اس وقت مان سکتے ہیں جب کہ فرشتہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

خود ہمارے پاس آتے اور براہِ راست ہم سے کہے کہ یہ اللہ کا پیغام ہے۔ یہی بات قرآن نے ان کے مطالبہ کی صورت میں دوسرے مقام پر دہرائی ہے۔

د قالوا لولا انزل ھذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم
کہا یہ قرآن طائف اور مکہ کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اُترا ،
ظاہر ہے کہ یہ بات جو وہ کہتے تھے محض چالبازی کے طور پر کہتے تھے۔ اس سے مقصد محض اپنی کبریائی ریاست کے لیے ایک فریب کا پردہ فراہم کرنا اور رائے عامہ کو بیوقوف بنانا تھا۔ رائے عامہ مادہ پرستی کے دور میں دُنیا کے اسباب دوسائل کو بڑی چیز سمجھتی ہے۔ ان کی نظر میں جو دُنیا میں بڑا ہے وہ خدا کے نزدیک بھی بڑا ہوگا۔ یہ عوام کو پھانسنے کا اچھا نعرہ ہے۔

نبوّت وہبی ہے کسبی نہیں

۱۵۶۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس جگہ اور کہاں اپنی رسالت بناتے جو لوگ جرم پیشہ بن چکے ہیں عنقریب ان کو خدا کے حضور میں ذلت وحقارت سے دوچار ہونا پڑے گا اور ان کو اپنی مکاریوں کی پاداش میں سخت عذاب بھگتنا ہوگا۔ یعنی یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ کون شخص اس کا اہل ہے کہ منصبِ نبوّت پر سرفراز کیا جائے اور اس عظیم الشان امانتِ الٰہیہ کا حامل بن سکے یہ نہ کوئی کسبی چیز ہے کہ دُعا یا ریاضت یا دنیوی جاہ ودولت وغیرہ سے حاصل ہو سکے اور نہ یہ ہر کس وناکس کو ایسی جلیل القدر اور نازک ذمہ داری پر فائز کیا جاسکتا ہے ہاں ایسے گستاخ، متکبر، حیلہ جو مکاروں کو آگاہ رہنا چاہیے کہ عنقریب اس معزز منصب کی طلب کا جواب ان کو سخت ذلت اور عذاب شدید کی صورت میں دیا جائے گا[1]

مطلب یہ ہے کہ یہ منصبِ رسالت ایسی چیز نہیں ہے جو ہر کہ ومہ کو دے دیا جاتے، یہ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ یہ تاج وہ کس کے سر پر رکھے۔ یہ خلعتِ الٰہی اور تشریف آسمانی ہے یہ ان کو ارزانی ہوتی ہے جن کا انتخاب اللہ تعالیٰ فرماتے۔

اصل ارشاد اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ ہے اس سے بیک وقت دو باتیں معلوم ہو رہی ہیں ایک تو یہ کہ نبوّت و رسالت ایک موہبت ربّانی اور عطیہ الٰہی ہے جو صرف اسی کو عطا کیا جاتا ہے جس کو اللہ اس کے لیے منتخب فرماتے، دوسری بات یہ کہ اللہ اس کے لیے ان ہی کو منتخب فرماتا ہے جو اپنی

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

خوبیوں اور کمالات کے اعتبار سے نوعِ انسانی میں کمالِ انسانیت کے مظہر اتم ہوتے ہیں۔ پہلی بات تو سب کی جانی بوجھی ہے دوسری بات کی طرف امام رازی نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ کم از کم جو چیز حصولِ نبوّت کے لیے ناگزیر ہے وہ برائیوں مثلاً فریب، بدعہدی، کینہ اور حسد سے پاک ہونا اور نبوّت کے مخاطبوں کا یہ کہنا لن نؤمن حتی نؤتی مثل ما اوتی رسل اللہ مکر، عذر، حسد اور کینہ کا شاہکار ہے ان رذائل کی موجودگی میں نبوّت کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

دراصل نبوّت کے کچھ لوازم اور خصوصیات ہیں ان میں سب سے پہلی چیز وہبی استعداد ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مختلف انسانوں میں مختلف قسم کی فطری استعدادیں پائی جاتی ہیں اور ان ہی کی طرف ان کا طبعی میلان ہوتا ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں ان کی استعداد اور میلان طبع کا جوہر برگ و بار پیدا کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ خاص مقررہ مدت میں جا کر وہ پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے جس طرح ہر درخت سے آم کا پھل پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ اسی سے ہوگا جس کو خدا نے آم کا درخت بنایا ہے۔ پھر آم کے درخت کے آثار خواص پھل، اس کا مزہ، اس کا رنگ و بو غرض جملہ خصوصیات خود اس درخت میں اسی وقت موجود ہوتے ہیں جب وہ ہنوز تخم کی صورت میں ہوتا ہے۔ وہی تخم پودا بنتا ہے، پودا بڑھتا ہے کونپل اور شاخیں پیدا کرتا ہے اور چند سال میں پھل دینے لگتا ہے لیکن اپنی ترقی کے ہر دور میں وہ اپنی مخفی خصوصیات وہی رکھتا ہے جو ایک دن آخر میں اس سے ظاہر ہونے والے ہیں اور اس پھل کی صفت ہمیشہ اس میں بالقوہ موجود تھی۔

اسی تمثیل کے مطابق یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر انسان کوشش سے نبی نہیں ہو سکتا بلکہ وہی ہو سکتا ہے جس کو خدا نے نبی بنایا ہے اور نبوّت کے یہ آثار، خواص، کیفیات اس میں بالقوہ استعداد کی صورت میں اسی وقت سے موجود رہتے ہیں جب وہ ہنوز آب و گل کے عالم میں ہوتا ہے۔ شاید حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا

کنت نبیاً و آدم بین الماء و الطین

میں اسی وقت نبی تھا جب آدم ہنوز آب و گل میں تھے

یہی مطلب ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب سے عرصہ وجود میں قدم رکھتے ہیں اسی زمانہ سے آنے والے وقت اور ملنے والے منصب کے آثار ان سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ وہ حسب و نسب اور سیرت و صورت میں ممتاز ہوتے ہیں۔ شرک و کفر کے ماحول میں ہونے کے باوجود اس کی گندگی سے بچائے جاتے ہیں۔ اخلاقِ حسنہ سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ان کی دیانت، امانت، سچائی، راست گفتاری مسلم ہوتی

ہے اور یہ تمہیدیں اس لیے ہوتی ہیں تاکہ منصبِ نبوت ملنے کے بعد ان کے دعوائے نبوت کی تصدیق اور لوگوں کے میلانِ خاطر کا سامان پہلے سے موجود رہے۔ حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و واقعات قبل نبوت پڑھو تو آپ کو اس بات کی صداقت کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ اسی بنا پر اہلِ حق کے مسلک کی قرآن کی یہ آیت سب سے زیادہ مستحکم دلیل ہے کہ نبوت محض فضل الٰہی ہے کسب ریاضت سے نہیں بلکہ موہبت سے ملتی ہے یہاں حافظ ابن کثیر نے یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے۔ یہ مطالبہ وہ لوگ کر رہے ہیں جن کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضل، شرف، نسب، تربیت، نشو و نما گھرانہ کی صفائی ستھرائی اور پاکیزگی کا اقرار تھا جو آپ کو امین کہہ کر پکارتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کے مخاطب خانگی، نسبی اور ذاتی فضائل جانتے تھے اور ان کو اس کا اقرار تھا۔ ایک کا نہیں سب کا اقرار تاریخ میں موجود ہے اور آج بھی ہے۔ اس کے باوجود وہ کہہ رہے تھے کہ ہم تمہیں رسول اس وقت مانیں گے جب ہمارے پاس فرشتے آتے اور خدا کا پیغام دے۔ قرآن نے جواب دیا کہ اللّٰه اعلم حیث یجعل رسالتہ منصبِ رسالت ایسی چیز نہیں ہے جس کا اہل ہر کہ و مہ بن جائے یہ تو اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ نبوت کا تاج کس کے سر پر رکھے، یہ نبوت ہر ایک کا حصہ نہیں ہے۔ شرف رسالت کا ہر کس و ناکس نہیں ہو سکتا مرتبہ رسالت کے ظرف کا فیصلہ تمام تر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

آخر میں فرمایا سیصیب الذین اجرموا صغار اس میں نبوت کا مطالبہ کرنے والوں کو دھمکی ہے۔ فقرے کے شروع میں سین تاکید کے لیے ہے یعنی ان جرم پیشہ لوگوں کو اللہ کے ہاں ذلت و خواری ضرور لپٹے گی صغار کے معنے ذلت و رسوائی کے ہیں اور اللہ کے پاس ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں ان کو اس عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا یا عند اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے قانونِ تکوین کے مطابق ان کو منہ کی کھانی پڑے گی یعنی دنیا ہی میں ان کو یہ سزا مل کر رہے گی۔ اجرموا میں اگرچہ وہ تمام جرائم اور ان کی وہ ساری چالبازیاں شامل ہیں جن کے وہ مرتکب ہوتے لیکن یہاں خاص طور پر اس جرم کی طرف اشارہ ہو رہا ہے جو انہوں نے لن نومن حتی نوتیٰ الخ کہہ کر کیا ہے۔ اس کی پاداش میں ان کو ذلت اور عذاب شدید سے ہمدوش ہونا پڑے گا۔

اسلام کے لیے شرح صدر

۱۵۷۔ لہٰذا جس کو خدا چاہتا ہے کہ ہدایت سے نوازے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے

یعنی جس میں اپنی فطری سلامتی اور طہارت نفس کی وجہ سے ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے کبر اور حسد جیسے رذائل سے پاک ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے ارادے میں اس کی اہلیت رکھتا ہے کہ قبول اسلام کے لیے اسے ہدایت دی جاتے اور ہدایت کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ سبحانہ' اس کے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ اصل ارشاد میں یشرح صدرہ للاسلام آیا ہے۔ شرح کے لغوی معنے عربی زبان میں چیرنے پھاڑنے کے ہیں۔ اسی سے طب کی اصطلاح میں علم تشریح اور تشریح اجسام ہے۔ چونکہ چیرنے پھاڑنے سے اندر کی چیز کھل کر نمایاں ہوجاتی ہے اس لیے اس سے تشریح امر اور تشریح کلام شرح بیان اور شرح کتاب وغیرہ مجازی معنے پیدا ہوئے۔ اسی سے ایک محاورہ شرح صدر کا پیدا ہوا ہے جس کے معنے سینہ کھول دینے کے ہیں اور عربی زبان میں اس سے مقصود بات کا سمجھا دینا ہوتا ہے۔ قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ میں یہ محاورہ بکثرت استعمال ہوا ہے۔

نبوت کا علم وفہم انسانی تعلیم وتعلم اور مادی حکمت ودانائی سے پاک ومبرا ہوتا ہے اور وہ اپنے اخذ نتائج اور اثبات دعویٰ کے لیے گزشتہ تجربات اور منطق کے استقراء وتمثیل اور ترتیب مقدمات کے ممنون نہیں ہوتے بلکہ وہ جو کچھ جانتے ہیں اور جو کچھ سمجھتے ہیں اس کا ماخذ تعلیم الٰہی، القائے ربانی اور فہم ملکوتی ہوتا ہے۔ اسی کا نام علم لدنی ہے۔ صرف فہم وتمثیل کے لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ کبھی کبھی شعراء، مصنفین، موجدین اور دیگر عقلاء کے ذہن میں بے غور وتامل ایک بات اس طرح آجاتی ہے کہ گویا معلوم ہوتا ہے کہ سینہ یا دماغ کا دروازہ یکدم یک کھل گیا اور ایک چیز اندر داخل ہوگئی لیکن یہ شرح صدر کی نہایت معمولی مثال ہے۔ اس منصب خاص کے سینکڑوں مدارج ہیں جو انبیاء کو، اولیاء کو اور دیگر مومنین کو اپنے اپنے مرتبہ کے مطابق عطا ہوتے ہیں۔ اس آیت میں شرح صدر کا بالکل ابتدائی اور عوامی درجہ بتایا جارہا ہے۔ یعنی بلا حجت وبرہان اسلام کی صداقت اس کے سامنے آئینہ ہوجاتی ہے۔ اسلام کے لیے سینہ کھول دینے سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت مؤثر طریقہ سے اس طرح کھل گئی کہ اس کو اسلام کی سچائی کا پوری طرح یقین ہوگیا اور اس کو اپنے اس یقین پر کامل تسکین ہوگئی۔ یہی شرح صدر کی حقیقت ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کو ان کی خلافت کے زمانہ میں مشورہ دیا اور اصرار کیا کہ قرآن مجید کو اوراق ومصاحف کی صورت میں لکھوا دیجئے، لیکن حضرت ابوبکر نے مخالفت کی کہ جو کام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی زندگی میں نہیں کیا وہ ہم لوگ کیوں کر کرسکتے ہیں۔ حضرت عمر کو اس پر اصرار اور حضرت ابوبکر کو انکار رہا مگر چند روز میں یک بیک ان کی سمجھ میں بات آگئی۔ اس موقعہ پر فرمایا حتیٰ شرح اللہ صدری یہاں تک کہ خدا نے اس کام کے لیے میرا سینہ کھول دیا۔ حافظ ابن حجر نے متعدد صحابہ کے حوالہ سے بالخصوص حضرت عبداللہ

بن مسعود کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم نے جب یہ آیت فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام تلاوت فرمائی، صحابہ نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ شرح صدر کیا ہے فرمایا کہ قلب میں ایک نور داخل ہوتا ہے جس سے سینہ کھل جاتا ہے۔ پھر سوال کیا کہ یارسول اللہ اس کی نشانی کیا ہے؟ ارشاد ہوا حیات جاوید کے گھر کا اشتیاق اور فریب کدہ عالم سے دل برداشتگی اور موت سے پہلے موت کی تیاری۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ ارشادِ نبوّت متعدد طرق سے مروی ہے مرسل بھی اور متصل بھی۔

اربابِ تصوف میں سے حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے التفہیمات الالٰہیہ میں شرح صدر پر تفصیلی کلام کیا ہے لیکن اس کا یہاں محل نہیں انشاء اللہ ۲۳ جلد میں ہم شاہ صاحب کے علوم سے اور ان کے علاوہ اس موضوع پر امام غزالی اور حافظ ابن القیم کے علوم سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

ایمان قبول نہ کرنے کی علت

۱۵۸ - اور جس پر راہ گم کر دینی چاہتا ہے اس کے سینہ کو اس طرح تنگ کر دیتا ہے گویا بلندی پر چڑھ رہا ہو، اس میں ایمان نہ لانے کی وجہ بتائی جارہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ حیلہ بازیاں اور سخن سازیاں تو محض ایک بہانہ ہیں، اصلی چیز جس کے باعث ان کو قبول اسلام کی سعادت نہیں ملی ہے وہ ان کے سینہ کی تنگی ہے۔ یہ ان کے سینہ کی تنگی ہے کہ ایمان و ہدایت کی اس میں گنجائش نہیں ہے۔ اسی تنگی کا نتیجہ ہے کہ حق بات کے سننے سے اسے ایسی تکلیف اور انقباض ہوتا ہے گویا وہ بلندی پر چڑھ رہا ہو اور اس کا سانس پھول رہا ہو کانما یصعد فی السماء تشبیہ سے مقصود اس تکلیف کا بتانا ہے جو اس کو اسلام لانے سے ہوتی ہے۔ اس آیت میں ان لوگوں کا چہرہ پیش کیا گیا ہے جو اپنی فطری استعداد کو شرک کی نجاست سے آلودہ کرنے کی وجہ سے قبول اسلام کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں۔ اسلام کے تصور سے بھی ان کا سینہ بھینچتا اور دم اکھڑتا ہے گویا ان کو ایک بلندی پر چڑھائی چڑھنی پڑ رہی ہے جن دلوں میں یہ نجاست رم جاتی ہے اللہ تعالیٰ ان کے سینے اسلام کے لیے تنگ کر دیتا ہے۔ اسلام کے لیے سینے ان کے ہی کھلتے ہیں جن کے سینوں میں اس قسم کی گندگی نہیں ہوتی ہے۔ یہ چیز چونکہ بالکل سنّتِ الٰہی کے مطابق واقع ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ضلال کا عمل وہاں رونما ہوتا ہے جہاں سینہ اس قدر زیادہ تنگ ہو جس میں کسی نئی چیز کے سمانے کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ یعنی ایسی نئی چیز جو اس کے تقلیدی افکار و خیالات کے منافی ہو، جو اس کی قیادت کے لیے چیلنج ہو اور جو اس کی سیاست و امانت سے متصادم ہو، اس کو اپنانا اور قبول کرنا اس کو اتنا ہی دشوار ہو جتنا بلندی پر اپنے جسم کے بھاری بھر کم

بوجھ کوئے کر چڑھنا، یہ گویا اشارہ ہے کہ ایسے تنگ سینہ سے ایمان ایسا ہی ناممکن ہے جیسا آسمان پر چڑھنا ناممکن ہے لیکن جو امتناعِ عقلی نہیں بلکہ عادی ہے۔

ایمان و کفر میں اللہ کا ضابطہ

۱۵۹- اسی طرح اللہ ان لوگوں پر عذاب روانہ کرتا ہے جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے ہیں۔ یعنی ایسے معاندین کو کفر و شرک کی نجاست اور گندگی اچھی معلوم ہوتی ہے اور دینِ حق کی خوشبو ان کو بدبو معلوم ہوتی ہے حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ رجس سے مراد شیطان ہے کیونکہ رجس کے معنے گندا اور ناپاک کے ہیں۔ شیطان سے بڑھ کر گندا کون ہوگا۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اسی طرح شیطان کو کافروں پر مسلط کر دیتا ہے کہ قبولِ حق کی کبھی توفیق ہی نہیں ہوتی۔ شیطان ان کو بُری باتوں پر ہی اکساتا رہتا ہے۔ امام مجاہد نے رجس کے معنے ہر اس چیز کے بتاتے ہیں جس میں خیر کا کوئی تصور نہ ہو۔ عبدالرحمان بن زید بن اسلم نے رجس کو عذاب کے معنے میں لیا ہے۔ یہاں لا یؤمنون ہے اور دوسرے موقعہ پر لا یعقلون آیا ہے۔ منشا یہ ہے کہ ایمان کے بارے میں اللہ کا ضابطہ یہ ہے کہ جو شخص حقیقت کی تلاش میں بے لاگ طریقہ سے اپنی عقل کو ٹھیک ٹھیک استعمال کرتا ہے اس کے لیے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حقیقت رسی کے اسباب و ذرائع اس کی سعی و طلب کے تناسب سے مہیا کر دیے جاتے ہیں اور اس کو صحیح علم پانے اور ایمان لانے کی توفیق دی جاتی ہے۔ رہے وہ لوگ جو طالبِ حق ہی نہیں ہیں اور جو اپنی عقل کو تعصبات کے پھندوں میں پھانسے رکھتے ہیں یا سرے سے تلاشِ حقیقت میں اسے استعمال ہی نہیں کرتے تو ان کے لیے اللہ کے خزانہ میں جہالت، گمراہی کی نجاست کے علاوہ کچھ نہیں ہے وہ اپنے آپ کو ان ہی نجاستوں کا اہل بناتے ہیں، گندگی اور نجاست ان ہی لوگوں کا حق ہے۔

اسلام ہی صراطِ مستقیم ہے

۱۶۰- اور یہ اسلام کی راہ تمہارے پروردگار کی سیدھی راہ ہے، بلاشبہ ہم نے ان لوگوں کے لیے جو نصیحت پر دھیان دینے والے ہیں نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں۔ قرطبی اور بیضاوی نے ھذا کا مشار الیہ اسلام کو بتایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہی وہ اسلام ہے جس کے لیے اللہ سبحانہ اس شخص کا سینہ کھول دیتا ہے جسے اسے قبول کرنے کی توفیق دیتا ہے اور یہی تیرے اس پروردگار کا راستہ ہے جس نے تجھے اپنا رسول بنا کر روانہ کیا ہے اور جس نے تیرے سامنے اس سورت میں اس کے اصول و عقائد

دلائل وبراہین سے بیان کر دیے ہیں۔ یہ سیدھا راستہ ہے اس میں کوئی کجی نہیں ہے۔ ہر قسم کی افراط و تفریط سے پاک ہے اس کی مسند ارشاد عبادت گاہوں اور زندگی کے انفرادی دائروں ہی میں بچھی ہوئی نہیں ہے، بلکہ وہ بازاروں، کاروباری اداروں، معاشی میدانوں، تمدن کے دائروں، سیاست اور حکومت کے ایوانوں غرض کہ زندگی کے ایک ایک شعبہ میں ہدایتیں دیتا ہے۔ اس کے علاوہ سب راہوں میں کجی ہے یہی ایک سیدھی راہ ہے۔

مولانا عثمانی نے یہاں ایک جامع تبصرہ فرمایا ہے فرماتے ہیں:

جو لوگ ایمان لانے کا ارادہ نہیں رکھتے ان پر اسی طرح عذاب اور تباہی ڈالی جاتی ہے کہ رفتہ رفتہ ان کا سینہ اس قدر تنگ کر دیا جاتا ہے کہ اس میں حق کے گھسنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی ہے۔ پھر یہی ضیق صدر عذاب ہے جو قیامت میں بشکل محسوس سامنے آجاتے گا۔ مولانا شیخ الہند نے رجس کا ترجمہ جو عذاب سے کیا ہے اس کے موافق یہ تقریر ہے۔ عبدالرحمان بن زید بن اسلم نے رجس کے معنے عذاب کے کیے ہیں۔ مگر ابن عباس نے رجس سے یہاں شیطان مراد لیا ہے شاید اس لیے کہ رجس ناپاک کو کہتے ہیں اور شیطان سے بڑھ کر کون ناپاک ہوگا۔ پھر اس تفسیر پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح خدا تعالیٰ ایمان سے گھبرانے والوں کا سینہ تنگ کر دیتا ہے اسی طرح ان پر بے ایمانیوں کی وجہ سے شیطان مسلط کر دیا جاتا ہے کہ کبھی رجوع الی الحق کی توفیق نہیں ہوتی۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اول فرمایا تھا کہ کافر قسمیں کھاتے ہیں کہ آیت دیکھیں تو البتہ یقین لاویں اور اب فرمایا کہ ہم نہ دیں گے ایمان تو کیوں کر لائیں گے۔ بیچ میں مُردہ حلال کرنے کے لیے حیلے نقل کیے اب اس بات کا جواب فرمایا کہ جس کی عقل اس طرف چلے کہ اپنی بات نہ چھوڑے جو دلیل دیکھے کچھ بات بنالے وہ نشان ہے گمراہی کا اور جس کی عقل چلے انصاف پر اور حکم برداری وہ نشان ہدایت ہے ان لوگوں میں نشان ہیں گمراہی کے ان پر کوئی آیت اثر نہ کرے گی[1]

یہ آیات قرآنی علمائے کلام کے یہاں مہمات معارف میں سے ہیں۔ قدریہ، جبریہ، معتزلہ اور اشاعرہ سب نے اپنے اپنے مذاق اور اپنے اپنے طے شدہ اصولوں کے مطابق اس کی تشریح کی ہے۔ اسی بنا پر حضرت شیخ الاسلام نے لکھا ہے کہ:

یہ مسئلہ طویل الذیل اور معرکۃ الآراء ہے اس لیے ہمارا ارادہ ہے کہ اس پر ایک مبسوط مضمون لکھ کر فوائد کے ساتھ ملحق کر دیا جائے۔

میں یہاں کلامی اصطلاحات سے الگ رہ کر خالص قرآن کی روشنی میں اہلِ حق کا مسلک پیش کرتا

[1] افادات شیخ الاسلام

ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں ارنی الحق حقاً وارزقنی اتباعہ ، اصل یہ ہے کہ ان آیات میں اس فطری کیفیت کو جو ایک حق بات کو سن کر اسے قبول کر لینے کے لیے اضطراری طور پر دل میں پیدا ہوتی ہے اور جو آخر کار انسان کو ایمان کی طرف کھینچ لاتی ہے خدائی ہدایت اور اس کے پیدا کرنے کو " شرح صدر " سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس ہدایت کے برعکس انسان کے دل میں حق سے انکار اور اعراض کرنے پر آمادگی کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلط کی ہوئی گمراہی قرار دیا گیا ہے اور شرح صدر کے مقابل جو انقباضی کیفیت دل میں رونما ہوتی ہے اسے ضیق صدر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پھر اس ہدایت و ضلالت اور شرح صدر اور ضیق صدر کے پیدا ہونے کا سبب یہ بتایا ہے کہ انسان جب ایک مرتبہ خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اس کو خود بخود وہ راستہ دکھائی دینے لگتا ہے جو اسے سیدھا خدا کی جانب لے جاتا ہے اور جو شخص سرے سے یہ احساس ہی نہیں رکھتا کہ مجھے خدا کے حضور میں حاضر ہونا اور اپنے قلب و جوارح کے افعال کا حساب دینا ہے اس کو لاکھ کوئی شخص کلمہ حق سنائے اور وعظ و تلقین کرے کوئی بات اس کے دل میں نہیں اترتی اور وہ راہ راست پر نہیں آتا۔

یہاں دو باتیں ہیں اور دونوں کو الگ الگ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ایک طرف ہدایت و شرح صدر اور ضلالت و ضیق صدر کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے دوسری طرف اس ہدایت و شرح صدر کے عطا کرنے کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ انسان خدا کی طرف رجوع کرے اور ضلالت و ضیق صدر کے مسلط کر دینے کا یہ سبب بتایا گیا ہے کہ گمراہ شخص خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور اس کے سامنے مسئول اور جواب دہ ہونے کا احساس نہیں رکھتا۔

ان دونوں چیزوں کے باہمی تعلق کو اس طرح سمجھو کہ انسان کی فطرت میں اللہ سبحانہ نے ایک ایسی قوت رکھ دی ہے جو اس کو حق و باطل میں تمیز اور صحیح و غلط کا فرق سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے حق کی طرف بڑھنے اور باطل سے احتراز کرنے پر مائل کرتی ہے۔ یہی قوت وہ فطری ہدایت ہے جسے اللہ سبحانہ اپنی طرف منسوب کرتا ہے فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے خلاف ایک اور قوت بھی انسان میں کام کر رہی ہے جو اس کو برائی کی طرف کھینچتی ہے۔ غلطی اور کج روی کی طرف مائل کرتی ہے اور جھوٹ اور باطل کو اس کے سامنے مزین کرتی ہے۔ ان دونوں کے ساتھ بہت سی خارجی اور داخلی قوتیں بھی ایسی ہیں جن میں سے بعض ہدایت کی قوت کو مدد پہنچانے والی ہوتی ہیں اور بعض ضلالت کی قوت کو۔ اکتساب علم اور اس کے مختلف مدارج تربیت اور اس کی مختلف کیفیات ، سوسائٹی اور اس کے مختلف احوال یہ وہ چیزیں ہیں جو باہر سے

اس پر انداز ہوتی ہیں اور ترازو کے دونوں پلڑوں میں سے ایک میں اپنا وزن ڈالتی رہتی ہیں۔ اور انسان کا اپنا اختیار تمیزی اپنی فہم و فراست، اپنی عقل و بصیرت، اپنے ذرائع اکتساب علم سے صحیح یا غلط کام لینا اور اپنی قوتِ فیصلہ کو بیجا یا بے جا استعمال کرنا یہ وہ چیز ہے جو خود اس کے ارادے کے تابع ہے اور جس سے وہ ہدایت اور ضلالت کی متضاد قوتوں کے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ خدا کی بخشی ہوئی ہدایت اور اس کی مسلط کی ہوئی ضلالت دونوں غیر محسوس طور پر اپنا عمل کرتی رہتی ہیں۔ ہدایت کی قوت اسے راہ راست کی طرف لطیف اشارے کیا کرتی ہے اور ضلالت کی قوت اسے باطل کے ملمع پر چڑھاتے جاتی ہے مگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان غلط اثرات سے متاثر ہو کر اور خود اپنی اختیاری قوتوں کو غلط طریقے سے استعمال کر کے ضلالت کے پھندے میں گرفتار ہو جاتا ہے اور ہدایت کی پکار پر کان ہی نہیں دھرتا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ غلط راستہ پر چل رہا ہوتا ہے اور اس دوران میں کچھ بیرونی اثرات اور کچھ خود اس کی اپنی عقل اور بصیرت دونوں مل جل کر اسے گمراہی سے بیزار کر دیتے ہیں اور اس وقت ہدایت کی وہی روشنی جو پہلے مدھم تھی دفعۃً تیز ہو کر اس کی آنکھیں کھول دیتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مدت تک انسان ہدایت اور ضلالت کے درمیان مذبذب رہتا ہے۔ قوتِ فیصلہ اتنی طاقتور نہیں ہوتی کہ بالکل کسی ایک طرف مائل ہو جائے، بعض بدقسمت اسی تذبذب کی حالت میں دنیا سے رختِ سفر باندھ لیتے ہیں۔ بعض کا آخری فیصلہ ضلالت کے حق میں ہوتا ہے اور بعض ایک طویل کشمکش کے بعد ہدایتِ الٰہی کا اشارہ پا لیتے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ خوش قسمت وہ سلیم الفطرت صحیح القلب اور سدید النظر لوگ ہوتے ہیں جو خدا کی دی ہوئی عقل اس کی عطا کی ہوئی آنکھوں، اس کے بخشے ہوئے کانوں اور اس کی ودیعت کی ہوئی قوتوں سے ٹھیک ٹھیک کام لیتے ہیں۔ مشاہدات اور تجربات سے درست نتائج اخذ کرتے ہیں۔ آیاتِ الٰہی کو دیکھ کر ان سے صحیح سبق حاصل کرتے ہیں۔ باطل کی زینت ان کو رجھانے میں ناکام ہوتی ہے۔ جھوٹ کا فریب ان کو اپنا گرویدہ نہیں بناتا۔ ضلالت کی کج راہوں کو دیکھتے ہی وہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ آدمی کے چلنے کے قابل نہیں ہیں پھر جونہی وہ حق کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس کی طلب میں آگے بڑھتے ہیں حق ان کے استقبال کو آتا ہے ہدایت کا نور ان کے سامنے جھلکنے لگتا ہے اور بس۔

آئیے اب اسی سلسلے میں کچھ متکلمین کی بھی سنیے۔ قدریہ کہتے ہیں کہ اس آیت کا فیصلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو ہدایت دینا چاہتے ہیں تو اس کے سینے میں اسلام کے لیے انشراح پیدا کر دیتے ہیں، لہٰذا اس کی اسلام کے لیے پذیرائی اللہ کی تخلیق سے ہوتی ہے اور اس تخلیق کا کوئی ضابطہ نہیں ہے۔ اور جبریہ کہتے ہیں کہ کسی شخص کا اسلام قبول کرنا اس کا اختیاری اور کسبی معاملہ نہیں ہے بلکہ صرف اللہ کا فعل ہے

اور اشعریہ کہتے ہیں ہے تو کسی کا اسلام اللہ کی تخلیق لیکن اس میں بندے کا کسب ہے مگر کسب میں تاثیر نہیں ہے اور معتزلہ اس کی چند در چند تاویلات کر کے آیت کا منہ بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں ان بزرگوں نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی کسی چیز کو اٹکل سے نہیں بلکہ ایک اندازے سے بنایا ہے۔ اس کائنات میں جو کچھ، جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی ہے اللہ سبحانہٗ کی مشیت اور اس کے ارادے سے ہو رہا ہے اور اس کا ارادہ و مشیت کا رشتہ اس کی اس حکمت بالغہ سے وابستہ ہے جس کے تحت پوری کائنات ایک نظام اور تقدیر پر قائم ہے۔ انسان کا ایمان اس کا اختیاری کردار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادہ اختیار والی مخلوق بنایا ہے اس لیے انسان کا کوئی عمل اللہ کی تخلیق اور اس کی مشیت کے خلاف نہیں ہو سکتا اور نہ انسان اپنے ارادہ و اختیار میں اللہ سے مستغنی اور بے نیاز ہو سکتا ہے وہ ہر آن اور ہر لمحہ اپنے ارادہ و اختیار میں اللہ کی توفیق و امداد کا محتاج ہے۔

دراصل ان آیات میں ہدایت و ضلالت میں سنت الٰہی اور قانون بیان کر کے ان کو تسلی دی گئی ہے جن کی خواہش تھی کہ ان لوگوں کو معجزہ دکھایا جاتے جو قسمیں کھا کر کہہ رہے تھے لئن جاءتهم آية ليؤمنن بها ان کے سامنے ان آیات میں یہ واضح کی ہے کہ انسانی طبیعت و استعداد کا اختلاف فطری ہے اور خدا کی مشیت یہی ہوئی کہ یہ اختلاف ہو اگر وہ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی طرح کی طبیعت، ایک ہی طرح کی استعداد، ایک طرح کی فکری و عملی حالت پر مجبور کر دیتا مگر اس نے ایسا نہیں چاہا اس کی حکمت کا یہی فیصلہ ہوا کہ انسان میں ہر طرح کی حالت پیدا کرنے کی استعداد ہو اور ہر طرح کی راہ اس کے آگے کھول دے وہ اگر اونچا ہونا چاہے تو زیادہ سے زیادہ اونچا ہو جاتے اور پست ہونا چاہے تو زیادہ سے زیادہ پستی میں گر سکے اسی تنوع استعداد کا نتیجہ ہے کہ فکر و عمل کے ہر گوشہ میں مختلف حالتیں پیدا ہو گئیں، ایک فرد و جماعت کا ذوق ایک طرح کا ہوا دوسرے کا دوسری طرح کا ایک کی سمجھ ایک طرف گئی دوسرے کی دوسری طرف، ایک نے ایک راہ پسند کی کہ حق ہے دوسرے نے اس سے انکار کیا کہ حق نہیں ہے پھر اسی فکر و عمل کے اختلاف سے ہدایت و ضلالت کی وہ کشمکش پیدا کر دی جسے قرآن آزمائش حیات کہتا ہے لیبلوکم ایکم احسن عملاً علامہ مقبلی نے اس موضوع پر اپنی کتاب العلم الشامخ فی ایثار الحق علی الدیار والمشائخ میں اور حافظ ابن القیم نے مفتاح دار السعادۃ اور شفاء العلیل فی مسائل القضاء والقدر والحکمۃ والتعلیل میں مبسوط بحث کی ہے۔ انشاء اللہ ہم بارہویں جلد میں ان کے علوم سے استفادہ کریں گے حضرت شاہ عبدالقادر نے اس مقام پر جو بات لکھ دی ہے وہ آب زر سے لکھنے کے لائق ہے۔ پہلے بھی آپ پڑھ آئے ہیں پھر تازہ کر لیجئے، فرماتے ہیں:

جس کی عقل اس طرف چلے کہ اپنی بات نہ چھوڑے جو دلیل دیکھے کوئی حیلہ بنالے وہ نشان ہے گمراہی کا اور جس کی عقل چلے انصاف پر اور حکم برداری پر وہ نشان ہے ہدایت کا ان لوگوں میں گمراہی کے نشان ہیں ان پر کوئی آیت اثر نہ کرے گی۔

امن وسلامتی کا گھر جنت ہے

۱۶۱- ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس سلامتی کا گھر ہے اور ان کے اعمال کے سبب اللہ ہی ان کا مددگار اور رفیق ہے۔ یعنی جو اسلام اور فرمانبرداری کے سیدھے راستہ پر چلے گا وہ ہی سلامتی کے گھر پہنچے گا اور خدا اس کا ولی و مددگار ہوگا۔ یہ حال تو ان کا ہوا جن کا اللہ ولی ہے یعنی اولیاء الرحمان آگے اولیاء الشیطان کا حال بیان کیا جاتا ہے[1]۔ یہ ان لوگوں کا صلہ بیان ہو رہا ہے جن کے سینے اللہ سبحانہٗ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ فرمایا ان کے لیے اس اسلام کے قبول کرنے کے صلہ میں دار السلام ملے گا۔ انسان امن وسلامتی کا بھوکا ہے لیکن وہ اس امن وسلامتی کو اسباب راحت کے انبار میں تلاش کرتا ہے اور نہیں پاتا، وہ دُنیا میں امن کا گوشہ بلکہ امن وسلامتی کی ایک دُنیا ملے گی، وہ پرندہ جو عمر بھر چار عناصر کے قفس میں گرفتار رہا، یہاں وہ سدرۃ المنتہیٰ کی ہر شاخ پر آزادانہ پرواز کرے گا۔ جنت کے قرآن نے اور بہت سے نام بتاتے وہاں اس کا ایک نام دار السلام بھی بتایا ہے جس کے معنی امن وسلامتی کے گھر کے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو علم وعمل دے کر روانہ فرمایا ہے وہ فی الواقع اسی امن وسلامتی کی نوید و بشارت ہے۔

جنت کے ذکر میں امن وسلامتی کا ذکر قرآن پاک میں بار بار آیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے در و دیوار سے امن وسلامتی کے ترانے سنائی دیں گے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو سب سے پہلے اس امن وسلامتی کے گھر کی دعوت پیش فرمائی۔ عبداللہ بن سلام ایک یہودی عالم تھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جس صدائے نبوت نے سب سے پہلے ان کے دل میں گھر کیا وہ یہ تھی، لوگو! سلامتی پھیلاؤ، بھوکوں کو کھلاؤ جب دُنیا غفلت کی نیند سوئے تو تم اٹھ کر خدا کی عبادت کرو، امن وسلامتی کے گھر میں رہنا تم کو نصیب ہوگا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آخر میں فرمایا وهو وليهم بما كانوا يعملون - ان کے اعمال کے سبب اللہ کی ولایت ان کو حاصل ہوگی۔ بما کانوا میں بار سببیہ ہے بار مقابلہ نہیں ہے یعنی اعمال اللہ کی ولایت کا سبب ہیں اس کی قیمت نہیں ہیں -

واقعہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا و آخرت میں مومنین وصالحین کو اللہ کی ولایت حاصل ہوگی اس کی محرومی کی ساری سرگزشت ہی یہ ہے کہ اس کے اللہ سے تعلقات درست نہیں رہے اگر اللہ کی ولایت اس کو مل جائے تو اس کی ساری سعادتیں اس کے قبضے میں آگئیں ایمان کی راہ سعادت کی راہ ہے جس کے قدم اس پر جم گئے اس کے لیے یقیناً خدا کی ولایت ہے لفظ یعملون فرما کر قدریہ اور جبریہ دونوں کی تردید کر دی ہے۔ عمل کی اسناد اہل ایمان کی طرف کر کے بتا دیا کہ طاعت ارادی اور اختیاری چیز ہے اور بار سببیہ لا کر بتا دیا کہ خدائی جزا اٹکل اور اندازے سے نہیں بلکہ ایک مضبوط نظام اور تقدیر کے تحت ہے اور خدا کا ٹھہرایا ہوا ہے - قانونِ سعادت و شقاوت اور نظامِ تقدیری کے مطابق جس کو بھی راہِ کامیابی ملنے والی ہے اس کا دل اسلام کے لیے کھل جاتا ہے۔ قرآن کا عام اندازِ بیان یہی ہے کہ دنیا میں خدا کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت جو نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ ان کو براہِ راست خدا کی طرف منسوب کرتا ہے کیونکہ یہاں پورا نظام اسی کے ٹھہرائے ہوئے قوانین کے تحت چل رہا ہے -

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ۚ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِنَ الْإِنسِ ۖ وَقَالَ أَوْلِيَاؤُهُمْ مِنَ الْإِنسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَبَلَغْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَّلْتَ لَنَا ۚ قَالَ النَّارُ مَثْوَاكُمْ خَالِدِينَ فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿١٢٨﴾

اور اس روز کیا ہوگا جب خدا ان کو گھیر کر جمع کرے گا اور شیاطین سے پوچھے گا کہ اے گروہ جن تم نے تو نوعِ انسانی میں سے بڑی تعداد کو اپنے ساتھ لگا لیا[162]، اور انسانوں میں سے جو ان کے رفیق تھے وہ بول پڑیں گے خداوندا ہم دونوں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں اور اب ہم اس میعاد پر آ پہنچے ہیں جو تو نے ہمارے لیے مقرر کر دی تھی[163]۔ اللہ سبحانہ، فرمائے گا اب آگ تمہارا ٹھکانا ہے اس میں تم ہمیشہ رہو گے مگر جو اللہ چاہے بے شک تیرا رب دانا اور علیم ہے[164]۔

معانی مفردات

معشر ایسی جماعت جو ایک ساتھ رہن سہن رکھتی ہو علی ابن اسماعیل نے المحکم والمحیط الاعظم میں لکھا ہے
معشر گھر والے کو کہتے ہیں اور معشر جماعت کو کہتے ہیں خواہ بڑے ہوں یا نہ ہوں۔ معشر، نفر قوم اور رہط
سب اسم جمع ہیں ان کا واحد کوئی نہیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ جماعت مردوں کی ہو۔ انسان اور جن دونوں
کے لیے بولا جاتا ہے۔ جن دوسری مخلوقات کی طرح یہ بھی اللہ کی مخلوق ہے۔ ان کی پیدائش آگ سے ہوئی ہے
لیکن ان کی تخلیق کی تفصیلی کیفیت کا ہمیں علم نہیں جن سے مشتق ہے چونکہ عام نگاہوں سے غائب ہیں
اس لیے ان کا نام جن ہوا۔ استکثرتم یہ استکثار سے ماضی کا جمع مذکر غائب ہے۔ اس کے
معنے بہت اور زیادہ لینا ہیں بہت مانگنا اور چاہنا نہیں۔ استمتع، یہ استمتاع سے فعل ماضی ہے فائدہ
اٹھانا، متاع ایسا سامان جس سے فائدہ اٹھایا جاتے۔ بلغنا بلوغ سے فعل ماضی کا جمع متکلم ہے ہم پہنچے
اصل میں انتہائی مقصد اور منتہی تک پہنچنے کو کہتے ہیں خواہ وہ مقام ہو یا وقت۔ اجلت تاجیل سے
ماضی کا واحد مذکر حاضر ہے، اس کے معنے مقرر کرنا، اصل میں اجل ہے اس کے معنے مدت کے ہیں۔ مثوٰی
یہ ثوی یثوی سے اسم ظرف ہے اس کے معنے ٹھکانا اور جائے قرار کے ہیں۔

عقیدہ آخرت کا اہتمام

نبوت کے خدوخال نمایاں کرنے والی باتوں میں توحید کے بعد دوسری چیز عقیدہ آخرت ہے۔ قرآن عزیز نے اس سے دلچسپی اور شیفتگی کا اظہار جس تکرار کے ساتھ کیا ہے اور اس کی تبلیغ و تشہیر اور اس کی اہمیت پر جس قدر زور دیا ہے اسے دیکھ کر قرآن کا قاری محسوس کرتا ہے کہ یہ قرآن کی دعوت کا اساسی نقطہ ہے قرآن اور سیرت نبوت کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ آخرت کا انداز کیا ہے۔ اس کی تصویر نعمت و مصیبت اور سعادت و شقاوت کی تمام تفصیلات کے ساتھ اس انداز سے پیش کی گئی ہے کہ گویا آنکھوں کے سامنے کھڑی ہے۔ قرآن نے قیامت اور جنت و دوزخ کے حالات کو سب سے پہلے جن اسباب پیش کیا ہے ان کا اندازہ حضرت عائشہ کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ پہلے ایک بڑی سورت نازل ہوئی جس میں جنت و دوزخ کا بیان ہے یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوتے تب حلال و حرام کے احکام نازل ہوتے اور اگر پہلے ہی یہ حکم اترتا کہ شراب نہ پیو، بدکاری نہ کرو تو لوگ نہ مانتے بل الساعۃ

موعدهم والساعة ادهی وامر، مکہ معظمہ میں اتری اور میں اس وقت کم سن بچی تھی، کھیلتی تھی، بقرہ اور نسآ کی سورتیں اس وقت اتریں جب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں آخرت کو ایمان کے اصول واساس میں کیوں داخل کیا ہے۔ اگر یہ تعلیم عقائد میں داخل نہ ہوتی تو دلوں میں اعمال کی جزا وسزا کی ہیبت اور عظمت نہ بیٹھتی اور نہ احکام الٰہی کی تعمیل کی طرف دلی رجحان اور میلان ہوتا بلکہ یہودیوں کی طرح جن کے صحیفوں میں زیادہ تر دنیوی ہی جزا وسزا کا ذکر باقی رہ گیا ہے دوسرے اہل ایمان کے دل بھی سخت ہوتے اور تاثر سے خالی ہو جاتے۔ چنانچہ قرآن نے اس فلسفہ کو خود بیان کیا ہے۔

فالذین لا یومنون بالاخرۃ قلوبھم منکرۃ وھم مستکبرون ،

جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کے دل نہیں مانتے اور وہ غرور میں ہیں۔

اسی لیے مسلمانوں کو حکم ہوا کہ نماز کی ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کی تلاوت کریں جس میں یہ ہے مالک یوم الدین تاکہ ہر لمحہ استحضار فکر آخرت رہے۔ قرآن چاہتا ہے کہ فکر آخرت مسلمانوں کے دلوں میں پوری طرح گھر کر جائے۔

۱۶۲۔ اور اس روز کیا ہوگا جب خدا ان کو گھیر کر جمع کرے گا اور شیاطین سے پوچھے گا کہ اے گروہ جن تم نے نوع انسانی میں سے بڑی تعداد کو اپنے ساتھ لگالیا۔ یعنی اے شیاطین الجن تم نے بہت سے بدبخت انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور اپنی راہ پر لگا لیا[1]

اصل ارشاد میں یوم یحشرھم جمیعاً آیا ہے۔ اس قسم کی تعبیر قرآن میں قیامت کے تذکرے میں بہت جگہ آئی ہے۔ عام شارحین یہاں فعل کو محذوف بتاتے ہیں جیسے اذکر یا تقول اور ضمیر ھم سے مراد شیاطین الانس والجن ہیں اور جمیعاً تاکید کے لیے آیا ہے اور یہ بات بتا رہا ہے کہ شیاطین انس کے ساتھ ساتھ شیاطین الجن کو بھی جمع کیا جاتے گا۔ ان سب کو جمع کر کے اللہ تعالیٰ شیاطین الجن کو مخاطب کر کے فرماتے گا یامعشر الجن قد استکثرتم من الانس، اے جنوں کے گروہ تم نے انسانوں میں بہتوں کو اپنا عابد بنالیا تھا۔ مشرکین عرب بھوت پریت اور جنات کے قائل تھے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔ وجعلوا اللہ شرکاء الجن اور انہوں نے جنوں کو عبادت میں اللہ کا شریک بنالیا تھا۔ صحیح مسلم کی کتاب التفسیر میں ہے کہ ذیل کی آیت ان عربوں کی شان میں نازل ہوئی جو جنات کی عبادت کرتے تھے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اولٰئک الذین یدعون یبتغون الیٰ ربھم الوسیلۃ

سورہ جن میں اللہ تعالیٰ نے جنوں کا مقولہ نقل فرمایا ہے۔

انہ کان رجال من الانس یعوذون برجال من الجن

اور کچھ انسان جنوں کی دہائی مانگا کرتے تھے۔

خدا اور جنات میں رشتے اور ناطے بناتے تھے،

وجعلوا بینہ و بین الجنۃ نسباً

خدا اور جنات میں رشتہ قائم کیا ہے۔

روز قیامت اللہ سبحانہ، فرشتوں سے دریافت کرے گا کہ اھؤلاء ایاکم کانوا یعبدون کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کرتے تھے، فرشتے جواب دیں گے

سبحانک انت ولینا من دونھم بل کانوا یعبدون الجن

آپ کی ذات اس سے منزہ ہے کہ کوئی آپ کا شریک ہو ہمارا ان سے کوئی واسطہ نہیں، امر واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہماری نہیں بلکہ جنوں کی عبادت کرتے تھے۔

جن سے مراد شیاطین جن ہیں۔ ان ہی اجنہ اور شیاطین کا زور توڑنے کے لیے قرآن نے یہاں قیامت کے اس سوال و جواب کا انداز اختیار کیا ہے کہ ان کے دوست انسان وہاں بھی ان کی دوستی کا دم بھرتے جائیں گے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عرب جاہلوں پر ان کا کس قدر استیلا تھا۔

یہ آیت صریح طور پر ان لوگوں کے خیال کی غلطی واضح کر دیتی ہے جو جن کو پہاڑی علاقے کے باشندوں یا دہقانوں اور صحراؤں کے معنے میں لیتے ہیں کیا کوئی صاحبِ عقل آدمی اس آیت کو پڑھ کر یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہ شہریوں اور دیہاتیوں کا مکالمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ، شیاطین الجن سے دریافت کرے گا کہ کیا تم نے اپنے اغواء اور اضلال سے انسانوں کی بڑی تعداد کو اپنا عابد بنالیا تھا۔ عبداللہ بن عباس نے مطلب یہ بتایا ہے کہ کیا تم نے انسانوں کی اکثریت کو گمراہ کر رکھا تھا۔ امام مجاہد، قتادہ اور الحسن البصری نے بھی یہی مطلب بتایا ہے۔ آیت کا مدلول یہ بھی ہے کہ آبادی کی اکثریت شیاطین کے دام تزویر میں اگر خدا کی عبادت کو چھوڑ کر جنات و شیاطین کو اپنا حاجت روا سمجھے ہوتے تھی۔ اور ان کے آگے نذر و نیاز پیش کرتے تھے۔ بعض جگہ خاص طور سے ان کے نام کی قربانی کی جاتی تھی۔ ان میں سے ایک مشہور مقام دراہم تھا جہاں کے رہنے والے جنوں پر جانور ذبح کرتے تھے تاکہ قربانی کرنے والے ان کی شرارت سے محفوظ رہیں۔ قبیلہ خزاعہ کی شاخ بنو ملیح خاص طور سے جنوں کی عبادت کرتے تھے بلکہ کہانت

ہوئے عرب میں پھیلی ہوئی تھی۔ اہلِ عرب کا خیال تھا اور خود کاہنوں کا دعویٰ تھا کہ ان کے ساتھ ایک جن رہتا ہے اور وہی ان کو القا کرتا ہے۔ وہ اپنی شکل و صورت ایسی بناتے تھے کہ پہچان لیے جاتے تھے۔ یہ کاہن تمام مقدمات اور نزاعات کا فیصلہ بھی کرتے تھے اور اس بنا پر تمام ملک پر ان کا اثر چھایا ہوا تھا۔ الجاحظ نے ان کے کاہنانہ فقرے البیان والتبیین میں نقل کیے ہیں۔ یہ کاہن جو خبریں بتلاتے یا تلقین کرتے وہ بڑے مقفیٰ اور مسجع فقرے ہوتے۔ جب لوگ ان سے غیب کی خبریں پوچھتے یا وہ خود آئندہ کے متعلق پیشین گوئی کرتے تو ایک خاص کیفیت ان پر طاری ہو جاتی تھی۔ مرد بھی کاہن ہوتے تھے اور بعض عورتیں بھی ہوتی تھیں جو کاہنہ کہلاتی تھیں۔ یہ مصیبتوں، بلاؤں کے دور کرنے کے لیے مشرکانہ علاج اور تدبیر بتاتے تھے۔ یہ اپنی کہانت کی اُجرت میں بڑی بڑی رقمیں اور نذرانے وصول کرتے تھے۔ غرض ان کاہنوں نے عوام فریبی کا بڑا جال پھیلا رکھا تھا اور یہ ان ہی کا اثر تھا کہ ملک کا ملک سینکڑوں قسم کی وہم پرستیوں میں مبتلا ہو گیا تھا اور شعراء کی نسبت بھی عرب کا خیال تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک شیطان الجن رہتا ہے اور وہی اس کو اشعار القا کرتا ہے۔ ستفنان اور شیعبان رؤسائے شیاطین الجن تھے جو شاعر کہلاتے تھے۔ پوری عرب زندگی پر اس طرح شیاطین کا قبضہ تھا۔ یہی مطلب ہے استکثرتم من الانس اے جنات کے گروہ تم نے انسانی اکثریت کو گمراہ کیا ہے۔ تابع و متبوع، عابد و معبود، مقتدی و مقتدا سب ہی اللہ کی بارگاہ میں پیش ہوں گے اور مقتداؤں سے سوال ہو گا کہ اے گروہ تم نے انسانوں کی اکثریت کو اپنے فتراک ضلالت کا نخچیر بنایا تھا اور انسانی زندگی تمہارے دام تزویر میں پھنس کر اللہ سے بغاوت کر رہی تھی۔

مجرمین کا اقرار جرم

۱۲۸ - اور انسانوں میں سے جو ان کے رفیق تھے وہ بول پڑیں گے خداوندا ہم دونوں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں اور اب ہم اس میعاد پر پہنچ گئے ہیں جو تو نے ہمارے لیے مقرر کر دی تھی، دنیا میں جو انسان بت وغیرہ پوجتے ہیں وہ فی الحقیقت خبیث جن و شیاطین کی پوجا ہے، اس خیال پر کہ ہمارے کام نکالیں گے ان کو نیازیں چڑھاتے ہیں اور ویسے بھی بہت سے اہلِ جاہلیت تشویش و اضطراب کے وقت جنوں سے استعانت کرتے تھے جیسا کہ سورۂ جن میں اشارہ کیا ہے اور ابن کثیر وغیرہ نے روایات نقل کی ہیں۔ جب آخرت میں وہ شیاطین الجن اور انسان برابر پکڑے جائیں گے اور حقائق کا انکشاف ہو گا تب مشرک یوں عذر کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہم نے پوجا نہیں کی لیکن آپس میں وقتی کارروائی

کرلی تھی۔ اور موت کا وعدہ آنے سے پہلے پہلے دنیوی کاروبار میں ہم ایک دوسرے سے کام نکالنے کی کچھ ترکیب کرلیا کرتے تھے ان کی عبادت مقصود نہ تھی[1]

دراصل یہ اقرار جرم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے پروردگار بے شک ہم قصوروار ہیں ہم نے دُنیا میں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا ہے یعنی جنوں نے آدمیوں سے فائدہ اور آدمیوں نے جنوں سے، جنوں نے آدمیوں سے یہ فائدہ اٹھایا کہ آدمیوں نے ان کی عبادت کی حلال وحرام میں ان کی اطاعت کی اور باہمی نزاعات اور مقدمات میں ان کی فرمانبرداری کی اور آدمیوں نے جنوں سے یہ فائدہ اٹھایا کہ نفسانی خواہشات اور لذات کے عجیب عجیب طریقے ان کو وساوس کے ذریعے جنوں نے سکھلاتے اور ان کی خواہشات کو مزین اور مستحسن کرکے ان کو شہوتوں کا دلدادہ بنایا، اس طرح ہم نے خوب مزے اڑائے اور شہوات حاضرہ کو لذات غائبہ پر ترجیح دی۔ حتیٰ کہ ہم نے خواہشات کے حصول اور ان کی خاطر میں تگ و دو میں بے حد مشقتیں برداشت کی ہیں۔ یہ تو ہم نے جنات سے فائدہ اٹھایا اور جنات نے ہم سے یہ فائدہ اٹھایا کہ ہم نے ان کو سردار بنالیا۔ ان کے احکام پر چلے، ان کی نذریں نیازیں اور چڑھاوے چڑھاتے۔ عبادت بھی ان کی کی اور طاعت بھی ان کی کی۔ منشا یہ ہے کہ ہم ان کے آلہ کار بنے، ہم نے ان کی پوجا کی، ان کے تھانوں پر قربانیاں پیش کیں اور ان کے کہنے پر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنایا، اسی طرح ہمارے کاہنوں ساحروں اور سیانوں نے ان کو اپنے مقاصد مزعومہ کے لیے استعمال کیا۔ امام الحسن البصری فرماتے ہیں کہ استمتاع صرف یہی تھا کہ جنات نے حکم دیا اور انسانوں نے اس پر عمل کیا۔

شیاطین اور جراثیم کی تاثیر

ارواح انسانی شیاطین سے اسی طرح اثر پذیر ہوتی ہیں جیسے اجسام انسانی جراثیم سے اثر قبول کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں جسم انسانی سینکڑوں بیماریوں کا شکار ہوجاتا ہے۔ آج کے علمی انکشافات میں یہ بات مانی ہوئی ہے کہ جراثیم کے ذریعے انسانی جسم میں بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور آج ہم خوردبینوں کے ذریعے اس کا مشاہدہ کررہے ہیں۔ آج سے ایک ہزار سال پہلے اگر یہ بات کہی جاتی کہ جسم انسانی میں ہوا، پانی اور کھانے کے ذریعے جراثیم بھی جاتے ہیں اور وہ تیزی سے اتنے بڑھتے اور پلتے ہیں کہ کروڑوں بن جاتے ہیں اور ان سے مہلک بیماریاں اور وبائیں پیدا ہوتی ہیں تو بلاشبہ سننے والے اسے مجنون کی بڑ

[1] افادات شیخ الاسلام

کہتے ۔ حیرت ہے کہ لوگ اجسام میں جراثیم کو مانتے ہیں لیکن ارواح میں شیاطین نہیں مانتے ۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ ڈاکٹر کی نظر جراثیم کو دیکھتی ہے اور انبیاؑ کی نگاہ شیاطین کو دیکھتی ہے وہ طبیب جسمانی ہے اور یہ طبیب روحانی ہے ۔

بہرحال انہوں نے اقرار کرلیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے رہے یہاں تک کہ ہم اس دن میں آپ کے حضور میں پیش ہوگئے اب ہمارا معاملہ آپ کے سپرد ہے اصل ارشاد میں و بلغنا اجلنا الذی اجلت لنا آیا ہے یعنی ہم پہنچ گئے مقررہ وقت کو جس کو تونے ہمارے لیے ٹھہرایا تھا ۔ یہاں اجل اور وقت سے کیا مراد ہے بیشتر شارحین قرآن کا خیال ہے کہ اس سے قیامت کا دن مراد ہے اور الحسن البصری اور ابن جریج کی رائے میں موت ہے ۔ علامہ آلوسی نے قیامت کو ترجیح دی ہے ۔ سید سلیمان ندوی نے یہ عجیب نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ اجل سے مراد تو قیامت ہی ہے مگر بلغنا ہم پہنچ گئے کی تعبیر کنایۃً بتاتی ہے کہ وہ قیامت سے پہلے عذاب کے ایک دور سے کو ختم کر چکے ہیں ۔ بعض حدیثوں میں بھی اس کنایہ کی تصریح آتی ہے ۔ کنز العمال میں ایک حدیث ہے :

> ابن عمر سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میری امت کے لوگوں کا اپنی قبروں میں طول قیام ان کو گناہوں سے خالص کرتا ہے ۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے :

> میری امت کے لوگوں کو زیادہ تر عذاب ان کی قبروں میں ہوگا ۔

اس حدیث کا منشا یہ ہے کہ امت محمدیہ کے اکثر افراد اسی برزخ کے محدود زمانے کے عذاب میں نکھر کر اور پاک وصاف ہوکر جنت کے قابل ہوجائیں گے اور عذاب دوزخ کی ضرورت ان کو نہ پیش آئے گی ۔ حافظ ابن القیم ایک موقع پر لکھتے ہیں :

> اگر ان بیماریوں کا یہ علاج اس دنیا میں نجات کے لیے پورا ہوگیا تو خیر ورنہ برزخ کی سزا سے علاج کیا جائے گا ۔ (شفاء العلیل)

برزخ کی حدیث میں وہ منظر دکھایا گیا ہے جس میں گنہ گار عذاب کے دور سے نکل کر اور نہر حیات میں نئی زندگی پاکر جنت کے مستحق قرار پاتے ہیں ۔ غالباً ان ہی نجات پانے والوں کو دیکھ کر مشرکین بھی روز قیامت کہیں گے بلغنا اجلنا الذی اجلت لنا ۔ یہ الفاظ کہ ہم اپنے وقت کو جس کو تو نے مقرر کیا تھا پہنچ چکے ہیں یہ معنے رکھتے ہیں کہ عالم برزخ کا مقررہ دورۂ عذاب ہم ختم کر چکے ہیں اور اب حشر و نشر کے عذاب کا دوسرا دور شروع ہونے والا ہے اس لیے بعض دوسرے نیک بختوں کی طرح ہم کو بھی اب چھٹکارا مل جائے ۔

مجرموں کو دوزخ کا عذاب

۱۶۴ - اللہ سبحانہ فرماتے گا اب آگ تمہارا ٹھکانا ہے اس میں ہمیشہ تم رہو گے مگر جو چاہے اللہ، بے شک تیرا رب حکمت والا اور علم والا ہے۔ یہ جو فرمایا کہ جو چاہے اللہ اس واسطے کہ دوزخ کا عذاب دائمی ہے تو اسی کے چاہنے سے ہے وہ جب چاہے موقوف کرنے پر قادر ہے لیکن ایک چیز چاہ چکا اور اس کی خبر پیغمبروں کی زبانی دی جا چکی وہ اب ٹل نہیں سکتی۔ وہ مجرموں کے جرائم سے پوری طرح باخبر ہے اور حکمت بالغہ سے ہر جرم کی برمحل اور مناسب سزا دیتا ہے[1]

یہ استیناف بیانی ہے متبوعین کی خاموشی اور تابعین کے جواب کے بعد قاری اور سامع کو انتظار تھا کہ پھر کیا ہوا۔ بتایا کہ اللہ نے فرمایا کہ آتش دوزخ تمہارا ٹھکانا ہے اس میں سدا رہو گے لیکن یہ کہ اللہ جو چاہے، مطلب یہ ہے کہ ان مجرمین کے لیے عذاب نار میں جانے کے بعد امید کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے۔ کسی کی سعی و کوشش، کوئی سفارش، کسی کا زور، کسی کی فریاد وہاں کارگر نہ ہو گی۔ اختیار و ارادے کی ساری حدیں ختم ہو جائیں گی۔ توبہ اصلاح اور حسرت و ندامت کی مہلتیں گزر جائیں گی۔ جو چیز وہاں کارفرما ہو گی وہ اللہ کی مشیت ہے اور اپنی مشیت کے بھید کو وہ ہی جانتا ہے۔ وہ فعال لما یرید اور حکیم و علیم ہے اور الا ماشاء کے استثناء، اس کے مدلول، اس کی غایت اور اس کے مطلب کو وہ ہی بہتر جانتا ہے ہمیں اس کے علم کا احاطہ اتنا ہی ہے جتنا اس نے چاہا ہے۔

اس آیت میں الا ماشاء اللہ شارحین قرآن کی جولانی طبع کا بہت بڑا شاہکار ہے۔ اس استثناء نے ہمارے شارحین قرآن کو بہت زیادہ پریشان کر دیا ہے کیونکہ یہ بادی النظر بتا رہا ہے کہ خالدین فیہا میں خلود دوام اور لا متناہی مدت کے معنے میں نہیں ہے۔ اسی لیے کچھ لوگوں نے ماکو من کے معنے میں لے کر یہ مطلب بتایا ہے بجز ان کے جن کو اللہ بچانا چاہے لیکن علامہ آلوسی نے اسے ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ جہنم کا عذاب دائمی ہے یا نہیں۔ اس موضوع پر ابتدائی اسلامی فرقوں میں بہت سے مناظرے ہو چکے ہیں جن کی تفصیل ملل و نحل کی کتابوں میں موجود ہے۔ ایک دو کو چھوڑ کر اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ جنت کا وجود دائمی اور ابدی ہے لیکن دوزخ کا دوام اور ابدیت میں کسی قدر اختلاف ہے۔ عام اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ جہنم اور جنت دونوں کا وجود دائمی ہے جو گنہگار مومن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اپنے گناہ کے بقدر عذاب اٹھا کر یا خدا کی رحمت سے مایوس ہو کر بالآخر جنت میں داخل کیے جائیں گے لیکن مشرک و کافر کے گناہ کبھی معاف نہ ہوں گے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ فقہا اور محدثین کا ایک گروہ جو مرجئہ کہلاتا ہے اس بات کا قائل ہے جو مومن ہوگا وہ گنہ گار بھی دوزخ میں نہ جائے گا بلکہ معافی سے سرفراز ہو کر شروع ہی سے جنت میں داخل ہوگا۔ اس کے برخلاف خوارج اور معتزلہ کا یہ عقیدہ ہے کہ مومن بھی اگر گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا تو وہ بھی کفار کی طرح ہمیشہ دوزخ ہی میں رہے گا۔ اور بھی اس بارے میں لوگوں کی مختلف رائیں ہیں۔

اہل السنہ کا ایک مختصر گروہ کا جس میں صحابہ کرام اور تابعین کے نام بھی ہیں اور متاخرین میں جس کے پرجوش حامی حافظ ابن القیم ہیں۔ یہ خیال ہے کہ جب گنہ گار اپنے اپنے گناہوں کے بقدر عذاب پا چکیں گے تو جہنم فنا کر دی جائے گی۔ حافظ ابن القیم نے اپنی دو کتابوں شفاء العلیل اور حادی الارواح میں قرآن و حدیث، آثار صحابہ اور عقل کی پچیس دلیلوں سے اپنے مسلک کو مبرہن کیا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ نے بھی اس نظریہ کو سلف اہل السنہ کے ایک فریق کا خیال تسلیم کیا ہے۔ ایک یمنی زیدی عالم شیخ مقبلی نے بھی اس کو اپنی کتاب العلم الشامخ فی ایثار الحق علی الاباء والمشائخ میں قبول کیا ہے۔ صوفیہ میں شیخ محی الدین بن عربی اور ان کے متبعین یہ فرماتے ہیں کہ کافر و مشرک جن پر خلود نار کا حکم ہے وہ بالآخر دوزخ میں رہتے رہتے ایسے ہو جائیں گے کہ ان کو وہی دوزخ والے محسوس ہونے لگے گی جیسے بعض کیڑے غلاظت کو پسند کرتے ہیں۔

اس موضوع پر تفصیلی بحث تو ان شاء اللہ بارہویں جلد میں آ رہی ہے لیکن ہم یہاں جمہور اہل السنہ والجماعۃ کا مسلک بیان کرتے ہیں۔

جمہور اہل السنہ والجماعۃ کا مذہب یہ ہے کہ بہشت کی طرح دوزخ بھی ہمیشہ رہے گی اور ان لوگوں کو جو شرک و کفر کے مرتکب ہوں گے کبھی دوزخ سے نجات نہ ملے گی۔

اس عقیدے کے مطابق گنہ گاروں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو اگرچہ گنہ گار تھے مگر دل میں ایمان رکھتے تھے، ایسے لوگ عذاب کے بغیر ہی یا عذاب کے بعد اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم سے سرفراز ہو کر بالآخر جنت میں جائیں گے۔ دوسرے وہ جو ہمیشہ شرک و کفر میں مبتلا رہے اور اس سے توبہ کیے اور ایمان لائے بغیر مر گئے ایسے لوگوں کی بخشش کبھی نہ ہوگی وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں داخل ہوں گے۔ ان کی گنہ گاری اس درجہ کی ہوگی کہ وہ اللہ کی رحمت کو اپنی طرف کسی طرح کبھی جذب نہ کر سکیں گے۔ یہ وہ زمینِ شور ہوں گے جس میں اس رحمت عام کی بارش بھی کوئی روئیدگی پیدا نہ کر سکے گی۔

جمہور اپنے مسلک کے لیے قرآن کی ان آیتوں سے استدلال کرتے ہیں جن میں جہنمیوں کے بارے میں

صراحتہً خالدین فیہا ابداً آیا ہے یعنی وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔ اور جب عذاب ہمیشہ ہوگا۔ تو عذاب کی جگہ بھی ہمیشہ قائم رہے گی۔ اس کے علاوہ ایسی آیات بھی ہیں جن میں تصریح ہے کہ جہنمی جہنم سے نکل نہ سکیں گے۔ کہیں وما ھم بخارجین اور کہیں لا یخرجون آیا ہے۔ ایسی آیات بھی ہیں جن میں جہنمیوں کے بارے میں عذاب مقیم کی خبر دی گئی ہے اور ایسی آیات بھی ہیں جن میں عدم تخفیف عذاب کا ذکر کیا گیا ہے اور شرک و کفر کا نام لے کر بتایا گیا ہے کہ ان کی ہرگز بخشش نہ ہوگی۔ کہیں فرمایا ہے لا یغفر ان یشرک بہ اور کہیں بتایا لن یغفر اللہ لھم اور کہیں اعلان کیا کہ اللہ نے ان پر جنت حرام کر دی ہے کہیں کافر و مشرک کا جنت میں جانا ممکن نہیں ہے۔ یہ اور اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ مرتے دم تک شرک و کفر میں مبتلا رہے اور توبہ نہیں کی ان کا گناہ نہ بخشا جائے گا اور وہ کبھی جنت میں نہ جائیں گے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ دوزخ ہمیشہ آباد نہ رہے گا ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ مدت کے بعد ایک دن جہنم کی آگ رحمتِ الٰہی کے چھینٹوں سے بالآخر سرد ہو جائے گی۔ ان کا استدلال قرآن کی زیرِ تشریح آیت میں الا ما شاء اللہ کے استثناء سے ہے وہ کہتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شرک و کفر کی سزا تو اصل میں قانوناً یہی ہے کہ دائمی دوزخ میں سزا جاری رہے گی مگر اس کی رحمت کا تقاضا کچھ اور ہے لیکن وہ حکیم و علیم ہے اس لیے وہ اپنا ہر کام اپنی حکمت اور مصلحت اور علم کے مطابق کرتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس کے حق میں کیا کرنا چاہیئے اور کب کرنا چاہیئے۔

جمہور کی جانب سے اس کے جوابات دیے گئے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ الا ما شاء اللہ کا استثناء صرف اللہ کی مشیت و اختیار کو بتانے کے لیے آیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ کفر و شرک کے عذاب کا دوام اللہ کے ارادے اور مشیت پر موقوف ہے وہ جب چاہے ختم کر سکتا ہے اور یہ بھی جواب دیا گیا ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے رہنا تو ان کو دوزخ میں ہے مگر جو اور زیادہ چاہے تیرا رب وہ اسی کو معلوم ہے کیونکہ دوام اور ابدیت کا اصلی مفہوم جسے لامحدود زمانہ کہنا چاہیئے وہ اللہ ہی جانتا ہے اور اسی کے علم غیر متناہی کے ساتھ مخصوص ہے اور اس استثناء سے یہ بھی تنبیہہ فرمادی ہے کہ خدا کے ہمیشہ رہنے اور مخلوق کے ہمیشہ رہنے میں فرق ہے۔ کسی مخلوق کا ہمیشہ رہنا بہمہ وجوہ خدا کی مشیت پر موقوف ہے وہ جب چاہے فنا کر سکتا ہے اس کے علاوہ بھی جمہور کی جانب سے جوابات دیے گئے ہیں انشاء اللہ بارہویں جلد میں سیر حاصل بحث آئے گی۔

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًاۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿١٢٩﴾
يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ
عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا
عَلٰۤى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰۤى
اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿١٣٠﴾ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ
مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿١٣١﴾ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ
مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٣٢﴾

اور اسی طرح ہم ظالموں کو ایک دوسرے کا ساتھی بنا دیں گے ان اعمال کے مطابق جو وہ کرتے تھے۔[165] اے جنوں اور انسانوں کی جماعت کیا تمہارے پاس تم میں سے وہ رسول نہیں آئے جو تم کو میری آیات سناتے اور اس دن کے انجام سے تم کو ڈراتے تھے۔[166] وہ کہیں گے ہاں ہم اپنے خلاف گواہی دیتے ہیں، دنیا کی

زندگی نے ان کو دھوکے میں ڈالے رکھا اور انہوں نے اپنے خلاف اقرار[167]
کرلیا اس بات کا کہ وہ کافر تھے۔[168] یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ تیرا
رب بستیوں کو ان کے ظلم پر ہلاک کرنے والا نہیں ہے جب کہ
باشندے بے خبر ہوں۔[169] اور سب کے لیے ان کے اعمال کے مطابق
درجے ہیں اور تیرا رب لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔[170]

معانی مفردات

نُوَلّی، تولیہ سے مضارع کا جمع متکلم ہے، مادہ ولا ہے دو چیزوں یا ایک طرح کی کئی چیزوں کے درمیان حصول یا عمل میں لگاؤ اور تعلق کو کہتے ہیں۔ ولایت واو کے زبر اور زیر کے ساتھ نصرۃ اور حکومت کے معنے میں آتا ہے اور ولایت سے صفت کا صیغہ ولی اور ولایت یعنے حکومت سے والی آتا ہے۔ اسی سے وضو میں موالات اور قبلہ کی طرف منہ کرنے کو تولیہ کہتے ہیں۔ اسی سے وَلّی کے معنے حاکم بنانا آتے ہیں اور تولّی کے معنے مدد کے ہیں۔ رُسُل، رسول کی جمع ہے۔ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں رسُول وہ ہے جس کو اللہ نے شریعت جدیدہ دے کر مبعوث فرمایا ہو تاکہ وہ لوگوں کو اس کی طرف دعوت دے۔ ملا علی قاری شرح الفقہ الاکبر میں فرماتے ہیں رسُول وہ ہے جو تبلیغ پر مامور ہو اور نبی وہ ہے جس کی طرف وحی کی جائے خواہ تبلیغ پر مامور ہو یا نہ ہو۔ شھدنا، ہم نے گواہی دی۔ یہ شہد یشہد سے ماضی کا جمع متکلم ہے۔ اس کا مصدر شہادت اور شہود ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں کہ شہود اور شہادت کے معنے موجود رہنا اور سامنے ہونے کے ہیں جو مشاہدہ کے ساتھ ہو خواہ مشاہدہ بصر کے ساتھ ہو یا بصیرت سے ہو اور کبھی صرف حضور کو کہتے ہیں جیسے

عالم الغیب والشہادۃ وہ دانائے غیب وحضور ہے لیکن شہود کا استعمال حضور مجرد کے ساتھ اولیٰ ہے اور شہادت کا اس حضور کے لیے کہ جو مشاہدہ کے ساتھ ہو۔

نبوّت کی دعوت سے بے نیازی کا انجام

اس سے پہلے وقال اولیاءھم من الانس میں انسانوں اور شیاطین کی ولایت کا تذکرہ تھا اب بتایا کہ ان کا باہم تعاون و تناصر اللہ کے قانونِ تکوین کے تحت ہوتا ہے۔ اللہ کا قانون ہی یہ ہے کہ ہم شیاطین کو انسانوں کے اعمال کے مطابق ان پر تسلط دیتے ہیں۔ ہر شخص اپنے مذاق اور اپنے کردار کے مطابق اپنا رفیق تلاش کرتا ہے۔ اچھے انسانوں کے تعلقات اچھے انسانوں سے اور برے انسانوں کے تعلقات برے انسانوں اور شیاطین سے ہوتے ہیں۔ ظالم ظالموں سے ملتے ہیں یعنی کند ہم جنس باہم جنس پرواز، اس کے بعد فرمایا کہ یہ تو دنیا میں اللہ کے قانونِ تکوین کے تحت جزا ہے آخرت میں ان کی جزا کیا ہوگی جو نبوت سے روگرداں ہو کر شیاطین سے رفاقت پیدا کر رہے ہیں۔ انسان ہوں یا جن سب بارگاہ الٰہی میں پیش ہوں گے اور سب سے دریافت کیا جائے گا الم یاتکم رسل منکم کیونکہ اللہ کی ذات اس کی صفات، اس کے احکام، اس کی مرضیات اور عقائد و اعمال کی خاصیات اور صحیح و غلط، اچھے اور برے اخلاق کے نتائج کا علم، آخرت میں نیک و بد، ثواب و عذاب اور جنت و جہنم کی معرفت کا انبیائے کرام کا واحد سرچشمہ اور ذریعہ علم ہیں۔ اس زندگی کے بعد کے حالات اور اس عالم میں ہونے والے حشر و نشر، انعام و عذاب اور نعمت و نقمت کے علم کے لیے اللہ نے اپنی مرضی کے مطابق انبیائے کرام کو مخصوص فرمایا ہے۔

اسی وجہ سے قرآن بار بار زور دیتا ہے کہ اللہ کی ذات اور اس کی حقیقی صفات کی نشاندہی کرنے والے صرف انبیائے کرام ہی ہیں اور وہی اللہ کی صحیح معرفت کا جس میں نہ جہالت ہے نہ غلط فہمی کا شائبہ واحد وسیلہ ہیں اور ان کے بتائے ہوئے طریقوں کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے وہ معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ نہ تنہا عقل رہنمائی کر سکتی ہے نہ ذہن کی تیزی اور ذکاوت کافی ہو سکتی ہے نہ فطرت کی سلامتی اس کا ذریعہ ہو سکتی ہے نہ ذہن کی بلند پروازی کی وہاں گنجائش ہے نہ عقل و خرد کی کاوشیں اس تک پہنچ سکتی ہیں نہ تجربات کا خزانہ ہی مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

مہذب اور ترقی یافتہ قومیں جو اپنے زمانے میں تہذیب و ثقافت، ذہانت اور علمی ایجادات میں بلند ترین مقام پر پہنچی ہوئی تھیں وہ بھی انبیائے کرام کی لائی ہوئی تعلیمات اور ان کے مخصوص علم کی

اتنی ہی ضرورت مند تھیں جتنا کہ دریا میں ڈوبنے والا سہارے کے لیے کسی کشتی کا محتاج ہوتا ہے یا زندگی سے مایوس مریض کو اکسیر دوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان ترقی یافتہ قوموں کے افراد اس مخصوص اور ضروری علم کے اعتبار سے طفلِ شیرخوار، جاہلِ محض اور تہی دست و بے بضاعت تھے اور انہوں نے اپنی علمی کامیابیوں اور تمدنی ترقیوں کے باوجود جب علومِ نبوت کو رد کر دیا اور اس کا مذاق اڑایا، تو انہوں نے اپنے لیے اور اپنی قوم کے لیے تباہی و ہلاکت کو دعوت دی۔ متعدد ترقی یافتہ قومیں اس انکار تکبر، غرور اور خود پرستی اور اپنے علوم اور صنعتوں پر فخر کا شکار ہو چکی ہیں۔ اپنے زمانے کے نبی کی لائی ہوئی تعلیمات کو انہوں نے حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھا۔ اس سے بے نیازی برتی، اس کو بیکار اور بے قیمت سمجھا تو وہ اس غرور ہی کی نذر ہو گئیں اور انہوں نے اپنے کیے کا مزہ چکھ لیا۔

۱۶۵۔ اور اسی طرح ہم ظالموں کو ایک دوسرے کا ساتھی بنا دیں گے، ان کے اعمال کے مطابق جو وہ کرتے تھے جیسے تم نے شیاطین الجن اور ان کے اولیاء انس کا حال سنا، اسی طرح تمام ظالموں کو اور گنہگاروں کو ان کے ظلم اور سیہ کاریوں کے تناسب سے دوزخ میں ہم ایک دوسرے کے قریب کر دیں گے اور جو جس درجہ کا ظالم اور گنہگار ہو گا اس کو اسی کے طبقہ عصاۃ میں ملا دیں گے [1]

اصل ارشاد میں تولّی آیا ہے اس کا مصدر واو کے زیر اور زبر کے ساتھ وِلایت آتا ہے۔ اگر یہ زیر والے وِلایت سے بنا ہے تو تولیہ کے معنے مسلط کر دینے کے ہیں، اور اگر واؤ کے زبر والے وَلایت سے بنا ہے تو تولیہ کے معنے مددگار بنا دینے کے ہیں۔ اسی اختلاف کی وجہ سے شارحینِ قرآن نے اس کی تفسیر میں دو مختلف رائیں اختیار کی ہیں اور یہ اختلاف تشریح صحابہ اور تابعین میں بھی موجود ہے اور دونوں صحیح ہیں فرق صرف اس قدر ہے کہ اگر ایک مطلب آیتِ قرآنی کا منطوق ہے تو دوسرا مدلول ہے۔

جو لوگ اسے وَلایت بفتح الواوَ سے مشتق بتاتے ہیں وہ آیت کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ جیسے وہ دُنیا میں گناہ کرنے میں ایک دوسرے کے شریک تھے، اسی طرح وہ آخرت میں بھی سزا کے موقعہ پر ایک دوسرے کے ساتھ ہوں گے۔ یعنی آخرت میں لوگوں کی جماعتیں نسل و وطن، رنگ اور زبان کی بنیاد پر نہیں بلکہ اعمال و اخلاق اور افکار کی اساس پر ترتیب پائیں گے، نیکوکار نیکوکاروں اور بدکار بدکاروں کے ساتھ ہوں گے۔ اس مطلب کی صورت میں یہ آخرت میں ہونے والے معاملہ کی خبر ہے لیکن اگر بغور مطالعہ کیا جائے اور آیت کے سیاق و سباق کو دیکھا جائے اور کذالک نولی کے زور کو پیشِ نظر رکھا جائے تو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

معلوم ہوگا کہ اس آیت میں دُنیا ہی کے بارے میں ایک اور سنتِ الٰہی اور قانونِ خداوندی کا چہرہ پیش کیا جا رہا ہے کہ اللہ کی سنت انسانی زندگی میں یہ ہے کہ اعمال نفسیات سے متعلق ہوں یا جوارح سے ہر عمل ایک اثر رکھتا ہے تکرار کے ساتھ وہی اعمال اخلاق بن جاتے ہیں اور افراد ہوں یا جماعتیں جس نوع کے اخلاق سے ہمدوش ہوتی ہیں، اسی کے دائرے اور حدود میں ایک دوسرے سے ملتی ہیں تعاون کرتی ہیں یعنی مشترکہ مشن میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور ایک مشن والے باہم یکجہتی پیدا کرکے اس کا مقابلہ کرتے ہیں جو مشن میں ان کا مخالف ہوتا ہے آیتِ قرآنی کا مطلب یہ ہے کہ جیسے انسان اور جنوں میں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے کیونکہ دونوں کے مقاصد میں ہم جنسی اور مشارکت ہے۔ اسی طرح ہم بدکردار لوگوں میں باہم ان کے مشترکہ اعمال کی اساس پر نصرت و تعاون اور ایک دوسرے سے ملنے کا سامان پیدا کر دیتے ہیں اور ایسا ہمارے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ بدکار لوگ بدکاروں سے مل کر سنگٹھنیں قائم کرتے ہیں۔ حضرت قتادہ نے آیت کا منشا یہی سمجھا ہے فرماتے ہیں :

> اللہ سبحانہٗ لوگوں کے درمیان ان کے اعمال کے مطابق موالات پیدا کرتا ہے۔ مومن اہلِ ایمان سے موالات کرتا ہے خواہ کہیں ہو اور کافر بھی، کافروں سے تعلقات رکھے گا خواہ کوئی ہو اور کہیں ہو، ایمان ولولوں، آرزوؤں اور خوش آئند زینت کاری کا نام نہیں بخدا اگر تو دُنیا کی زندگی میں اللہ کا مطیع بن کر رہے اور تجھے اللہ کے طاعت گزاروں کا پتہ نہ ہو تو تیرا اس سے کچھ نہ بگڑے گا اور اگر تو نافرمانی کی زندگی گزارے اور طاعت گزاروں سے تیرے تعلقات ہوں تو تجھے اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

یعنی اہلِ ایمان سے صرف نسبت تجھے بغیر ایمان کے کبھی مومن نہ بنائے گی اور اگر ایمان و عمل موجود ہو اور بے خبری کی وجہ سے اہلِ ایمان سے تعلقات نہ ہوں، اس سے تیرا کوئی نقصان نہ ہوگا کیونکہ باخبر ہو جانے کے بعد ان سے تعلقات ناگزیر ہیں۔ علامہ آلوسی نے اسی کو اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے لیکن ان کے خیال میں یہ آیت کا مدلول ہے اور امام رازی فرماتے ہیں کہ خبیث ارواح خبیث روحوں سے ملتی ہیں۔ اور جن لوگوں نے اس آیت میں نولّی کا مادہ ولایت واو کے زیر کے ساتھ قرار دے کر تولیہ کے معنے مسلط کر دینے کے لیے ہیں وہ ا[illegible] مطلب یہ بتاتے ہیں کہ یہ جو شیاطین نے بے شمار انسانوں پر تسلط جما رکھا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جس قسم کے لوگ اعمال اختیار کرتے ہیں، اعمال کے مطابق ہم ان پر مسلط کر دیتے ہیں۔ ظالموں پر ظالموں، بدکاروں پر بدکاروں کو تسلط کر دیتے ہیں۔ منصور بن ابی الاسود کہتے ہیں کہ میں نے امام اعمش سے اس آیت کے بارے میں دریافت کیا کہ آپ نے صحابہ سے کیا سنا ہے فرمایا میں نے

ان سے بھی سنا ہے کہ جب لوگ خراب ہو جائیں گے تو ان پر بدترین لوگ حکومت کریں گے۔ حافظ سیوطی نے الدر المنثور میں حاکم کی تاریخ اور بیہقی کی شعب الایمان کے حوالہ سے یہ ارشادِ نبوت بھی اسی آیت کے تحت نقل کیا ہے کما تکونون یولی علیکم۔ تم پر حکمران ویسے ہی بنائے جائیں گے جیسے تم ہو گے۔ اسی بنا پر حافظ ابن کثیر نے آیت گرامی کا یہ مطلب بتایا ہے جیسا کہ ہم نے ان انسانوں پر شیاطین کو تسلط دیا ہے ایسے ہم ظالمین پر ظالمین کو تسلط دیتے ہیں اور بعض کو بعض کے ذریعے ہلاک کرتے ہیں اور بعض کا بعض سے انتقام لیتے ہیں مطلب یہ ہے کہ رعایا جب ظالم ہوتی ہے تو ہم ان پر حاکم بھی ظالم ہی مسلط کر دیتے ہیں۔ اس تسلط کی بنیاد اعمال کی ہم جنسی ہوتی ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس تولیت کی جو زمانہ جاہلیت سے تصویر پیش کی ہے میں نے اس سے بہتر تصویر کسی مصنف کے قلم سے نہیں دیکھی فرماتے ہیں :

صدیوں سے آزادانہ حکومت کرتے کرتے اور دنیا کی لذتوں میں منہمک رہنے، آخرت کو فراموش کرنے اور شیاطین کے زیر اثر میں آجانے کی وجہ سے ایرانیوں اور رومیوں نے زندگی کی آسائشوں اور سامانِ آرائش میں بڑی باریک بینی اور نازک خیالی پیدا کر لی تھی اور اس میں ہر قسم کی ترقی اور نفاست میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے اور فخر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دنیا کے مختلف گوشوں سے ان مرکزوں میں بڑے بڑے اہلِ ہنر اور اہلِ کمال جمع ہو گئے تھے۔ اس سامانِ آرائش اور نفاست میں نزاکتیں پیدا کرتے تھے اور نئی نئی تراش خراش نکالتے تھے۔ ان پر عمل فوراً شروع ہو جاتا تھا۔ اور اس میں برابر اضافے اور جدتیں ہوتی رہتی تھیں، اور ان باتوں پر فخر کیا جاتا تھا، زندگی کا معیار اتنا بلند ہو گیا کہ امراء میں سے کسی کا ایک درہم سے کم ٹپکا باندھنا اور تاج پہننا سخت معیوب تھا۔ اگر کسی کے پاس عالی شان محل، فوارہ، حمام، باغات، خوش خوراک اور تیار جانور، خوش رو جوان اور غلام نہ ہوتے کھانے میں تکلفات اور لباس و پوشاک میں تجمل نہ ہوتا تو ہم چشموں میں اس کی کوئی عزت نہ ہوتی۔ اس کی تفصیل بہت طویل ہے۔ اپنے ملک کے بادشاہوں کا جو حال دیکھتے اور جانتے ہو اسی پر قیاس کر لو۔ یہ تمام تکلفات ان کی زندگی اور معاشرت کا جزو بن گئے تھے اور ان کے دلوں میں اس طرح رچ اور بس گئے کہ کسی طرح نکل نہیں سکتے تھے۔ اس کی وجہ سے ایک ایسا لاعلاج مرض پیدا ہو گیا تھا جو ان کی پوری شہری زندگی اور ان کے پورے نظامِ تمدن میں سرایت کر گیا تھا۔ یہ ایک مصیبت عظمیٰ تھی جس سے عام و خاص اور امیر و غریب میں سے کوئی محفوظ نہیں رہا تھا ہر شہری پر یہ پُر تکلف اور امیرانہ زندگی ایسی مسلط ہو چکی تھی جس نے اس کو زندگی سے عاجز کر دیا تھا اور اس کے سر پر غم و افکار کا ایک پہاڑ ہمیشہ رکھا رہتا تھا۔ بات یہ تھی کہ یہ تکلفات بیش قرار رقمیں خرچ کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے تھے اور یہ رقمیں اور بے پایاں دولت کاشت کاروں، تاجروں اور دوسرے پیشہ وروں پر محصول اور ٹیکس بڑھانے اور ان پر تنگی کیے بغیر دستیاب

نہیں ہوسکتی تھیں۔ اگر وہ ان مطالبات کے ادا کرنے سے انکار کرتے تو ان سے جنگ کی جاتی اور ان کو سزا دی جاتی۔ اور اگر وہ تعمیل کرتے تو ان کو گدھے اور بیلوں کی طرح بنا لیتے جن سے آب پاشی اور کاشت کاری میں کام لیا جاتا اور صرف خدمت کرنے کے لیے ان کو پالا جاتا اور محنت و مشقت سے ان کو کسی وقت چھٹی نہ ملتی، اس مشقت اور حیوانی زندگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو کسی وقت سر اٹھانے اور سعادت اخروی کا خیال بھی کرنے کا موقعہ اور مہلت نہ ملتی۔ بسا اوقات پورے پورے ملک میں ایک فرد بشر بھی ایسا نہ ملتا جس کو اپنے دین کی فکر اور اہمیت ہوتی [1]

نجات کے لیے نبوّت پر ایمان ضروری ہے

۱۶۶۔ اے جنوں اور انسانوں کے گروہ کیا تمہارے پاس تم میں سے وہ رسول نہیں آئے جو تم کو میری آیات سناتے اور اس دن کے انجام سے تم کو ڈراتے تھے۔ اوپر جن وانس کی شرارت اور سزا کا بیان تھا اور اولیاء الجن کی زبانی فی الجملہ معذرت بھی نقل کی گئی تھی۔ اب بتلایا جاتا ہے کہ ان کا کوئی عذر معقول اور قابل سماعت نہیں دنیا میں خدا کی حجت تمام ہو چکی تھی جس کا خود ان کو اقرار کرنا پڑے گا۔ یہ خطاب روزِ قیامت ہوگا اور جن وانس دونوں مخاطب ہوں گے یعنی کل مکلفین کا مجموعہ، ہر جماعت الگ الگ مخاطب نہیں جو یہ اعتراض ہو کہ رسول تو ہمیشہ انسانوں میں آتے، قومِ جنّ میں سے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا گیا۔ پھر رسل منکم کہنا کیسے صحیح ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ مجموعہ مخاطبین میں سے اگر کسی نوع میں سے بھی رسولوں کا آنا متحقق ہو جائے جس کی غرض تمام مخاطبین کو بلا تخصیص فائدہ پہنچانا ہو تو مجموعہ کو خطاب کرنے میں کوئی اشکال نہیں رہتا۔ مثلاً کوئی یہ کہے اے عرب و عجم کے باشندو اور یورپ و پچھم کے رہنے والو کیا تم ہی میں سے خدا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے انسان کامل کو پیدا نہیں کیا۔ اس عبارت کا مطلب کسی کے نزدیک یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو عرب میں پیدا کیے گئے اور دوسرے عجم میں ہونے چاہئیں۔ اسی طرح پورب کے علیحدہ اور پچھم کے علیحدہ محمدؐ ہوں تب یہ عبارت صحیح ہوگی ایسے ہی یہاں سمجھ لیجئے! معشر الجن والانس کا مدلول صرف اس قدر ہے کہ جن وانس کے مجموعہ میں سے پیغمبر بھیجے گئے باقی یہ تحقیق کہ ہر نوع میں الگ الگ آتے یا ہر ایک پیغمبر کل افراد جن وانس کی طرف مبعوث ہوا۔ یہ آیت اس کے بیان سے خاموش ہے دوسری نصوص سے جمہور علماء نے یہ ہی قرار دیا ہے کہ نہ ہر ایک پیغمبر کی بعثت عام ہے اور نہ کسی جن کو اللہ

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد اوّل

مستقل رسُول بنا کر بھیجا ہے اکثر معاشی اور معادی معاملات میں اللہ تعالیٰ نے ان کو انسانوں کے تابع بنا کر رکھا ہے جیسا کہ سورہ جن کی آیات اور نصوص حدیثیہ اس پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ کوئی ضابطہ نہیں کہ مخلوق کی ہر نوع کے لیے اس نوع کا کوئی شخص رسُول ہوا کرے۔ باقی انسانوں کی طرف فرشتہ کو رسُول بنا کر بھیجنے کا جو قرآن کے متعدد مواقع میں انکار کیا گیا ہے اس کا اصلی منشا یہ ہے کہ عام انسان ہیبتِ اصلیہ اس کی رویت کا تحمل نہیں کر سکتے اور بے اندازہ خوف و ہیبت کی وجہ سے مستفید نہیں ہو سکتے اور بصورتِ انسان آئیں تو بے ضرورت التباس رہتا ہے اسی پر قیاس کر لو کہ قومِ جنّ میں منصبِ نبوت کی اہلیت ہوتی تو وہ بھی انسانوں کے لیے مبعوث نہ کیے جا سکتے تھے۔ کیونکہ وہاں بھی یہی اشکال تھا ہاں رسُول انسی کا جنوں کی طرف مبعوث ہونا اس لیے مشکل نہیں کہ جنوں کے حق میں انسان کی رویت نہ تو ناقابلِ تحمل ہے اور نہ انسان کا صوری خوف و رعب استفادے سے مانع ہو سکتا ہے۔ اور پیغمبر کو وہ قوتِ قلبی عطا فرما دیتا ہے کہ اس پر جن جیسی ہیبت ناک مخلوق کا کوئی رُعب نہیں ہوتا ہے[1]

پہلی آیت کو سُن کر اور پڑھ کر واقعی ذہن میں یہ سوال چٹکیاں لیتا ہے کہ ان ظالموں کا روزِ قیامت کیا حال ہوگا۔ اس آیت میں بطورِ استیناف ذہن میں اُٹھے ہوتے اسی سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ ان کو پکارا جائے گا اور ان سے دعوتِ انبیاؑ کے بارے میں پوچھا جائے گا الم یاتکم رسل منکم میں استفہام تقریری ہے اور مقصود توبیخ ہے۔ واقعی رسل منکم کا ظاہری سانچہ اگرچہ اسی کا مقتضی ہے کہ انبیاؑ اور رسُولوں کی بعثت انسانوں اور جنات دونوں میں سے ہو، اور کچھ نے سمجھا بھی ایسا ہی ہے چنانچہ ضحاک سے جب اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو کہنے لگے کیا اللہ کو یہ فرماتے نہیں سُنا یامعشر الجن والانس۔ کلبی کا بیان ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جنّ و انس دونوں میں رسُول مبعوث ہوتے تھے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ جنّ و انس سب کی طرف مبعوث ہو کر آئے۔ حافظ عسقلانی نے حافظ ابن حزم ظاہری کے بارے میں فتح الباری میں لکھا ہے کہ وہ کہتے ہیں حدیث میں آیا ہے وکان النبی یبعث فی قومہ اور نبی اپنی قوم میں مبعوث ہوتا تھا اور جنات انسانوں کی قوم نہیں لہٰذا ثابت ہوا کہ جنّ کے لیے جنّ ہی انبیاؑ ہوتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ بجز ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی پیغمبر کی بعثت جنّ و انس کے لیے نہیں ہوئی ہے صرف آپ کی بعثت بالاتفاق جنّ و انس کے لیے عام ہے۔

اردو تفاسیر میں مولانا امین احسن اصلاحی بھی اسی کے قائل ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اندر انسانوں ہی میں سے رسُول بھیجے اسی طرح جنوں کے اندر بھی جنوں ہی میں سے رسُول بھیجے ہیں۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

لیکن جمہور اُمت اس کے خلاف ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جیسے رسُول ہونے کے لیے قرآن کے بیان کردہ ضابطہ کے مطابق مرد ہونا اور ذریت نوح وابراہیم ہونا ضروری ہے ویسے ہی رسُول کا انسان ہونا بھی ضروری ہے۔ یہاں منکم سے افراد نہیں بلکہ جملہ اور مجموعہ مراد ہے اس کی نظیر خود قرآن میں موجود ہے۔ قرآن میں مرج البحرین کے بعد ارشاد ہے یخرج منھما اللولؤ والمرجان ، حالانکہ لولوٗ ومرجان سب سمندروں سے نہیں نکلتے ہیں بلکہ کچھ سے نکلتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے جمہور کے موقف کو دلائل سے ثابت کیا ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں۔

جمہور ضحاک کے استدلال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ رسل انس وہ رسُول ہیں جو انسانوں کی طرف اللہ کی جانب سے بھیجے گئے اور رسُل جن کو اللہ نے زمین میں منتشر کیا کہ وہ رسُل انس کی باتوں کو سُن کر اپنی قوم کو تبلیغ کریں اسی لیے ان کا کہنے والا کہتا ہے انا سمعنا کتابا انزل من بعد موسیٰ۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ جن پہلے سے حضرت موسیٰ اور کتب آسمانی پر ایمان لائے ہوئے تھے۔ قرآن سننے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ یہ وہی تعلیم ہے جو پچھلے انبیاء دیتے چلے آرہے ہیں۔

نبوت کا کام اس آیت میں یہ بتایا ہے یقصون علیکم اٰیاتی وینذرونکم لقاء یومکم ھذا تم کو میری آیات پیش کرتے ہیں اور اس دن کے پیش آنے سے ڈراتے ہیں۔ آیات دو قسم کی ہوتی ہیں ایک ظاہری اور مادی اور دوسری باطنی وروحانی۔ ظاہر ومادی آیات تو وہ خوارق ہیں جن کو لوگ عام طور پر معجزات کہتے ہیں باطنی اور روحانی آیات وہ تشریعی احکام ہیں جو نبوت لے کر آتی ہے۔ جس میں اصُول ایمان ، مکارم اخلاق اور محاسن اعمال کی تفصیل ہے۔ اسی میں نبوت کی صداقت ، معصومیت، تزکیہ، تاثیر، تعلیم وہدایت، ارشاد، فلاح اور تائید داخل ہے۔ الغرض نبوت کا کام یہ ہے کہ آیات الٰہی کی تلاوت کرتا ہے۔ زنگ آلود نفوس اور سیہ کار قلوب کو جلا دیتا ہے۔ لوگوں کو کتاب وحکمت اور اخلاق کی تعلیم دیتا ہے، اچھی باتوں کو پھیلاتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔ وہ طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام کرتا ہے۔ وہ قوموں سے بوجھ کو اتارتا ہے اور ان کے پاؤں کی بیڑیوں کو کاٹتا ہے۔ وہ خدا کا گواہ بن کر اس دُنیا میں آتا ہے۔ لوگوں کو یگانہ خدا کی عبادت کی دعوت دیتا ہے ، نیکوکاروں کو بشارت سناتا ہے۔ بدکاروں کو عذاب الٰہی سے ڈراتا ہے اور اس ظلمت کدہ عالم میں وہ ہدایت کا چراغ بن کر چمکتا ہے۔ نبوت اپنے کام میں توحید اور ایمان بالآخرت کو اساسی اہمیت دیتی ہے نبوت کو آخرت پر ایمان کی دعوت اور اس کی اہمیت صرف اخلاقی یا اصلاحی ضرورت کے تحت نہیں، بلکہ اس کی حیثیت اس بنیاد کی ہے جس کے بغیر اسلامی معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا۔ عقیدہ آخرت کا اہتمام اس سے دلچسپی اور شیفتگی کا اظہار اس کی تبلیغ وتشہیر اور اس کی اہمیت پر اتنا زور کہ یہی پورے دین کی

دعوت کی اساس بن جاتے، جن لوگوں نے نبوت کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ آخرت ہمیشہ اس کی نظروں میں ہوتی ہے اور اس کی تصویر نعمت و مصیبت اور سعادت و شقاوت کی تمام تفصیلات کے ساتھ ان کی آنکھوں کے سامنے رہتی ہے وہ ہمہ وقت جنت کے شدید اشتیاق اور جہنم سے شدید خوف کے عالم میں رہتے ہیں اور یہ فطری بات ہے کہ یہ بات ان کے لیے بالکل مشاہدہ ہے اور ایک واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے جو ان کے شعور و احساس، اعصاب اور قوت فکریہ پر غالب رہتی ہے۔

آخرت سے غفلت کا راز

۱۶۷ - وہ کہیں گے ہاں ہم اپنے خلاف گواہی دیتے ہیں، دنیوی زندگی نے ان کو دھوکے میں ڈالے رکھا یعنی دنیا کی لذات و شہوات نے انہیں آخرت سے غافل بنا دیا، کبھی خیال بھی نہ آیا کہ اس احکم الحاکمین کے سامنے جانا ہے جو ذرے ذرے کا حساب لے گا۔[1]

مطلب یہ ہے کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ کی طرف سے رسول پر رسول آتے رہے اور ہمیں حقیقت سے خبردار کرتے رہے مگر یہ ہمارا اپنا قصور ہے کہ ہم نے ان کی بات نہ مانی[2] یہاں غرتھم الحیاۃ الدنیا کا اشارہ کر دیا کہ ان کے انکار اور سرکشی کا اصلی باعث دنیا کی وہ پُر فریب زندگی ہے جس کی ساری کامرانیاں اور دلفریبیاں بے ثبات اور ہنگامی ہیں جہاں کسی چیز اور حالت پر بھروسہ نہیں کہ یہ ضرور ایسی ہی رہے گی۔ اول تو زندگی ہی چند روزہ ہے پھر اس کا بھی ٹھکانا نہیں۔ پھر زندگی کے عیش و تنعم کی جتنی دلفریبیاں ہیں سب کا حال یہ ہے کہ صبح ہیں تو شام نہیں۔ ایسی حالت میں اس سے بڑھ کر غفلت اور گمراہی کی اور کیا بات ہوگی کہ انسان اس سے دھوکہ کھا جاتے اور حق و راستی کی راہ چھوڑ کر سرکشی پر اتر آئے اور کسی کے بھروسے پر مال، جاہ ریاست اقتدار پر اس زندگی کے سر و سامان اور اقتدار کے بھروسہ پر جسے چند لمحوں کے لیے قرار نہیں ہے لیکن انسانی غفلت کے عجائب کا یہی حال ہے وہ دیکھتا ہے کہ نبوت کی دعوت کہ اپنا بادشاہ امیر کو زندگی کے تمام حقوق اور تمام معاملات میں عام شہریوں کے برابر کر دے گا اس لیے اس کا غرور اس کی بڑائی نبی کے اور اس کے درمیان اپنی دیوار بن جاتی ہے کوئی نہیں جو اس حقیقت سے بے خبر ہو مگر کوئی نہیں جو اس غرور باطل کی سرگردانیوں سے اپنی نگہداشت کر سکے۔ یہی غرور ہے جسے نبوت دور کرنے آتی ہے وہ دنیا اور اس کی کامرانیوں سے نہیں روکتی مگر اس کے غرور باطل اور بے اعتدالانہ انہماک کی

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

راہیں بند کر دینا چاہتی ہے کیونکہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے فتنوں کا سرچشمہ بھی دُنیا کا غرور ہے۔ بتایا یہ جا رہا ہے کہ نبوت کی دعوت کے انکار کی بنیاد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس دُنیا کی ظاہر فریبی نے ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ دنیوی زندگی کا سارا کارخانہ چونکہ جزا و سزا کے اصُول پر نہیں بلکہ ابتلا کے اصُول پر چل رہا ہے جس میں حق کے ساتھ باطل کو بھی پھلنے اور پھولنے کی مہلت ملی ہوئی ہے اس وجہ سے ان کو دھوکہ ہو گیا ہے کہ جزا و سزا ہے ہی نہیں ہے اور انبیاؑ کی دعوت کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

آج بھی غور سے دیکھو تو معلوم ہو گا کہ انسانیت اور نبوت کی راہ میں یہی الحیاۃ الدنیا کے غرور کی دیوار حائل ہے۔ یورپ و امریکہ و رُوس کو دیکھو یہی الحیاۃ الدنیا یعنی مادہ پرستی اُن کا مذہب ہے اس کے متعلق ایک مفکر لکھتا ہے:

یورپ کا عام اور متوسط آدمی وہ جمہوری ہو یا فاشسٹی، سرمایہ دار ہو یا اشتراکی ہاتھ سے کام کرنے والا ہو یا دماغی محنت کرنے والا ایک ہی مذہب جانتا ہے، وہ کیا؟ مادی ترقی کی پرستش اور یہ عقیدہ کہ اس زندگی کی غرض و غایت، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ آسان اور پُر راحت اور آزاد اور بے قید بنائے۔ اس مذہب کے گرجے اور عبادت گاہیں، کارخانے، تھیٹر، کیمادی دار الصنائع ناچ گھر اور بجلی کے مرکز ہیں۔ اس مذہب کے پروہت بینکوں کے افسران، اداکار عورتیں، فلم اسٹار اور تجارت و صناع ہیں۔ طاقت و ہوس کی اس لذت اور حورپن کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ حریف گروہ سامان جنگ سے اور جنگی تیاریوں سے مکمل لیس تیار کھڑے ہیں اور جہاں تک تہذیب کا تعلق ہے انسانوں کا ایک ایسا ٹائپ پیدا ہو چکا ہے جس کا عقیدہ ہے کہ نیکی اور اخلاق نام ہے عملی فائدہ کا اس کے نزدیک معیار صرف مادی کامیابی ہے۔

اور سنیے:

> مغربی تہذیب صاف صاف پُر زور طریقہ پر خدا کا انکار کرتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے دینی نظام میں اللہ کی کوئی جگہ نہیں ہے اور نہ اس کی ضرورت سمجھتی ہے۔
>
> (انسانیت کی تعمیر اور اسلام)

بہت ممکن ہے کہ اس بیان کو زیادہ وقعت نہ دی جائے کیونکہ ان خیالات کا پیش کرنے والا اسلامی افکار سے متاثر ہے اس لیے ہم ذیل میں چند دوسرے مفکرین کی آراء پیش کرتے ہیں۔ ان سے اس رجحان کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

پروفیسر جوڈ اپنی کتاب دی فلاسفی آف آور ٹائمز میں لکھتے ہیں:

صدیوں سے انگلستان کے تخیّل پر دولت اندوزی کا اصول غالب ہے حصول دولت کی خواہش پچھلے دو سو سال سے دیگر محرکاتِ عمل سے زیادہ بڑھ کر کار فرما رہی ہے۔ کیونکہ دولت حصولِ ملکیت کا ذریعہ ہے اور ذاتی ملکیت کی بہتات اور عظمت و نشان سے انسان کی قابلیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سیاسیات ادب، ریڈیو، سینما اور کبھی کبھی گرجاؤں کے منبروں سے سال بسال سامعین کو بھی تعلیم دی جاتی رہی ہے کہ مہذب قوم وہی ہے جس میں تملیکی جذبہ انتہائی ترقی کر چکا ہو۔ اسی غرض حیات دُنیا کا یہ اثر ہے کہ اس زمانے میں انسان صرف حصولِ زر اور جلبِ منفعت کے لیے زندہ ہے اس سے زیادہ کچھ بھی سوچنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، پروفیسر جوڈ نے بالکل صحیح کہا ہے۔

جو نظریہ حیات اس زمانے پر مستولی اور غالب ہے وہ اقتصادی نظریہ ہے دوسرے لفظوں میں ہر مسئلہ کو پیٹ یا جیب کے نقطۂ نظر سے دیکھنا اور جانچنا۔

نبوّت سے کافرانہ تعلق کا انجام

۱۶۸۔ اور انہوں نے اپنے خلاف اس بات کا اقرار کر لیا کہ وہ کافر تھے۔ اس سورت میں اوپر مذکور ہوا کہ اوّل کافر اپنے کفر کا انکار کریں گے پھر حق تعالیٰ تدبیر سے ان کو قائل کرے گا[1] پہلے ان کے اقرار کا ان کی زبانی ذکر تھا اور یہ اللہ سبحانہ کی جانب سے بطورِ مذمت ان کے کفر کا بیان ہے تاکہ سننے والوں کو عبرت ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ روزِ محشر اس کے مختلف مواقف میں سے کفر کا کھلے بندوں اقرار کریں گے۔ جب ان کے خلاف حجت قائم ہو جائے گی کہ وہ دُنیا کی زندگی میں نبوّت کی پیش کردہ ہدایات اور نوامیس کا انکار کرتے تھے۔ وہاں نہ وہ جھوٹ بول سکیں گے نہ کوئی بات بنا سکیں گے۔ نبوّت کا کفر صرف ان کی تکذیب ہی نہیں ہے بلکہ یہ بھی کفر ہے کہ نبوّت کی باتوں کو اپنی زندگی میں شرف پذیرائی نہ دے۔ کفر دو قسم کا ہے ایک یہ کہ جو کچھ نبوّت لے کر آئی ہے اسے نہ مانے اور ایک یہ ہے کہ نبوّت جو کچھ پیش کر رہی ہے اس پر نہ چلے۔ مطلب یہ ہے کہ اسلام گو انقیادِ ظاہری کا نام ہے مگر ایمانِ باطن اس کے لیے شرط ہے اسی طرح ایمان گو انقیادِ باطن کا نام ہے مگر انقیادِ ظاہری اس کے لیے ضروری ہے اس سے ظاہر ہو گیا کہ اسلام بلا ایمان کے اور ایمان بغیر اسلام کے شرعاً

---

[1] افادات شیخ الاسلام

معتبر نہیں ہے۔ اتحاف السعادہ المتقین میں علامہ مرتضیٰ زبیدی نے اس تلازم پر اشاعرہ اور حنفیہ کا اتفاق نقل کیا ہے۔ قرآن نے کفر کو ایمان و اسلام دونوں کا مقابل قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے کیف یھدی اللّٰہ قوماً کفروا بعد ایمانھم اس میں ایمان کفر کا مقابل ہے اور ارشاد ہے ایامرکم بالکفر بعد اذ انتم مسلمون اس میں اسلام کفر کا مقابل ہے۔ اس سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے کہ دونوں کا نتیجہ کفر ہے۔ آیت میں کفر ایمان و اسلام دونوں کے لیے بولا گیا ہے۔

مواخذے کے بارے میں قانونِ الٰہی

۱۶۹۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ تیرا رب بستیوں کو ان کے ظلم پر ہلاک کرنے والا نہیں ہے جب کہ باشندے غافل اور بے خبر ہوں۔ یعنی خدا کی یہ عادت نہیں ہے کہ بدون آگاہ اور خبردار کیے کسی کو اس کے ظلم و عصیان پر دنیا یا آخرت میں پکڑ کر ہلاک کر دے اسی لیے رسول اور نذیر بھیجے کہ وہ خوب کھول کر تمام جن و انس کو اس کے بھلے اور برے اور آغاز و انجام سے خبردار کر دیں[1] مطلب یہ ہے کہ اُمتوں میں پیغمبروں کو اُمتوں کی اجتماعی، روحانی اصلاح اور اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونے کے خطرہ سے آگاہ کرنے کے لیے رسولوں کو اس لیے روانہ کیا جاتا ہے کہ اللہ کی سنت اور قانون یہ نہیں ہے کہ اُمتوں کو عذاب، استیصال یا کسی اور عذاب کے ذریعے ایسی حالت میں ہلاک کر ڈالے کہ گناہ پر ان کو خبردار کرنے والا اور آگاہ کرنے والا کوئی نہ آیا ہو۔ یعنی ہم عذاب دینے سے پہلے رسول روانہ کرتے ہیں جو گناہوں میں ملوث لوگوں کو آگاہ کریں۔ صلاح، حق، عدل، تقویٰ اور فضائل کی راہ بتائیں۔ اور لوگوں کو ان کی غفلت سے چونکائیں۔ رسولوں کی روانگی کا مقصد لوگوں پر اللہ کی حجت پورا کرنا ہے تاکہ بندے اللہ کے مقابلے میں یہ احتجاج نہ کر سکیں تو نے حق بتایا ہی نہ تھا اور ہمیں حقیقت سے آگاہ ہی نہیں کیا تھا، ہم تو بے خبر تھے اور بے خبری کی حالت میں ہی ہم سے گناہ ہوتے ہیں اسی حجت کو ختم کرنے کے لیے اللہ نے پیغمبر روانہ کیے ہیں۔ بہشت اور دوزخ جو کچھ بھی ہے انسان کے اپنے ہی عمل کا لازمی نتیجہ ہے۔ جس طرح دُنیا کے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نتیجہ ہے مثلاً کھانے کا نتیجہ شکم سیری، پینے کا سیرابی، بھوک کا تکلیف، بیماری کا بے آرامی، گرنے کا چوٹ، زہر کا موت، شہد کا مٹھاس غرض ہر اچھے اور بُرے عمل کا ایک لازمی جسمانی نتیجہ ہے۔ اسی طرح ہم کو اپنے اعمال کا ایک روحانی اور حقیقی نتیجہ آخرت میں ملنے والا ہے تو جس طرح زہر کھا کر مرنے کی

[1] افادات شیخ الاسلام

ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم زہر کھا کر مرکیوں گئے، اسی طرح ہم یہ سوال بھی نہیں کر سکتے کہ ہم کو ان کے اعمال کے بعد دوزخ کی سزا کیوں ملی۔ دونوں ہمارے اعمال کے یکساں لازمی نتیجے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی غایت رحمت سے ہم کو اعمال کے نتیجوں سے قبل از وقت مطلع فرما دیا ہے ہم کو نیک و بد کی تمیز کا احساس بخشا۔ عقل عنایت کی ضمیر عطا کیا۔ پھر انبیا اور رسول روانہ کیے۔ شریعت دی کتاب مرحمت کی لیکن ظالم و نادان انسان نے نبوت کی رحمت کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ اللہ کا دستور یہی ہے کہ انبیا روانہ کر کے لوگوں پر اتمام حجت کرتا ہے۔ قرآن کی آیت کا سادے لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ کسی قوم کو اس کی بد اعمالیوں، بد اخلاقیوں، بد معاملگیوں اور غلط افکار پر اس کے نتائج و عواقب سے آگاہ کیے بغیر عذاب نہیں دیتا وہ کسی کو سزا دیتا ہے تو اس سے پہلے ان کو اچھی طرح آگاہ کر دیتا ہے تاکہ وہ توبہ و اصلاح کرنا چاہیں تو توبہ و اصلاح کر لیں اور اگر نہ کرنا چاہیں تو اپنی ذمہ داری پر اس کے نتائج بھگتیں۔

حافظ ابن جریر آیت کے دو مطلب بتاتے ہیں ایک تو وہی جو سُن چکے ہو دوسرا مطلب یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کی بے خبری میں ظلماً ہلاک نہیں کرتا ہے لیکن ابن کثیر اور ابن جریر دونوں نے پہلے مطلب کو ترجیح دی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو دونوں باتیں صحیح ہیں یہ بات بھی درست ہے کہ اللہ سبحانہٗ لوگوں کو ان کے گناہوں کی بنا پر بغیر آگاہ کیے ہلاک نہیں کرتا یعنی جب تک لوگوں کو آگاہ نہ کر دے اس وقت تک عذاب نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ کے نظام عدالت میں پیغمبر ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ پیغمبر ہی بندوں پر اللہ کی حجت ہے۔ قرآن میں اس کی تائید موجود ہے۔

وکذالک اخذ ربک اذا اخذ القری وھی ظالمۃ

اور یہ بھی صحیح ہے کہ خدا لوگوں کو ظلماً بے خبری میں ہلاک نہیں کرتا ہے۔ قرآن میں ہے

وما کان ربک لیھلک القری بظلم واھلھا مصلحون

ایمان کے لحاظ سے درجہ بندی

۱۷۰۔ اور سب کے لیے ان کے اعمال کے مطابق درجے ہیں اور تیرا رب لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ یعنی جس درجہ کا عمل ہوگا حق تعالیٰ اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ فرمائیں گے[1] مطلب یہ ہے کہ انسانوں اور جنوں کے ان تمام افراد کے لیے جن کے پاس نبوت کی دعوت پہنچی ہے ان کے اعمال کے مطابق

---

[1] افادات شیخ الاسلام

درجات ہیں اور اللہ ان کے اعمال سے پوری طرح باخبر ہے بلکہ عالم ہونے کے ساتھ پورے اعمال اس کے احاطہ قدرت میں ہیں۔ اعمال اچھے ہوں یا بُرے، بُرائی کا نتیجہ بُرا ہے لیکن اچھائیاں اپنے پیچھے صرف اچھا نتیجہ ہی نہیں رکھتی ہیں بلکہ اس کے نتائج ترقی پذیر ہوتے ہیں۔ اچھا کا نتیجہ اچھا اگر عدل ہے تو اس کی ترقی پذیری اللہ کا فضل ہے۔ آیت میں کُل سے اگر انبیاؑ کو نہ ماننے والے مراد ہوں یعنی مکذبین اور کافرین جیسا کہ یہاں سیاق کا تقاضا تو لفظ درجات بمعنی درکات ہے۔ کیونکہ درجات کا استعمال خیر اور خوبی اور اس کی جزا میں ہوتا ہے اور درکات اس کے مخالف ہے اور امام راغب نے درجا اور درکہ میں یہ فرق بتایا ہے کہ درجہ بلندی اور بالائی کے لحاظ سے ہوتا ہے جب کہ درکہ پستی اور تنزل کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اور عام شارحین قرآن نے یہاں تغلیبی طور پر لفظ درجات کو یہاں مومنین اور کافرین کے لیے رکھا ہے۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ
مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ﴿١٣٣﴾
إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ ۖ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿١٣٤﴾ قُلْ يَا قَوْمِ
اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَنْ
تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ

اور تیرا رب بے نیاز رحمت والا ہے[۱۸۱]۔ اگر وہ چاہے تو تمہیں ہٹا دے اور تمہارے بعد جس گروہ کو چاہے تمہارا جانشین بنا دے، جیسا کہ ایک دوسری قوم کی نسل سے تمہیں اٹھایا ہے[۱۸۲]۔ جس بات کا تم سے وعدہ کیا ہے وہ یقیناً ہونے والی ہے اور تمہارے بس میں نہیں کہ خدا کو عاجز کر دو[۱۸۳]۔ اے پیغمبر لوگوں سے کہہ دو کہ اے میری قوم تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ میں بھی کام کر رہا ہوں، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ آخر کار اس کا انجام

بخیر ہے، بلاشبہ ظلم کار لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ ۱۸۴

معانی مفردات

ذوالرحمۃ ذو کے معنے والا اور صاحب کے آتے ہیں۔ یہ ہمیشہ مضاف ہو کر آتا ہے اور اسم ظاہر اس کا مضاف الیہ ہوتا ہے اس کا تثنیہ بھی آتا ہے اور اس کا مونث ذات ہے ذو کی جمع اولو اور ذات کی جمع اولات آتی ہے۔ علامہ سہیلی رقمطراز ہیں، ذو وصف میں صاحب سے زیادہ بلاغت ہے اور اس کے ذریعے اضافت میں زیادہ شرف ہے، کیونکہ ذو تابع کی طرف مضاف ہوتا ہے جبکہ صاحب متبوع کی طرف۔ حضرت ابوہریرہ کو کو صاحب النبی بولتے ہیں النبی صاحب ابی ھریرہ نہیں بولتے اور ذو کے ساتھ جب ذوالمال بولو گے تو اسم متبوع ہو گا تابع نہیں۔ یہی فرق ہے جس کی وجہ سے حضرت یونس کو سورہ انبیاء میں ذوالنون مچھلی والا اور سورہ قلم میں صاحب الحوت کہا ہے۔ ذریۃ اولاد اصل میں چھوٹے چھوٹے بچوں کا نام ذریت ہے مگر عرف میں چھوٹی اور بڑی اولاد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ جمع ہے مگر واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے ذریتہ کے بارے میں تین رائیں ہیں ایک یہ کہ ذرا سے بنا ہے جس کے معنے پیدا کرنے اور پھیلانے کے ہیں جیسے بریۃ اور خطیۃ، دوسرے یہ کہ اس کی اصل ذرویتہ ہے، تیسرے یہ کہ ذر سے بنا ہے جس کے معنے بکھرنے کے ہیں۔ ذراری اور ذریات اس کی جمع آتی ہے۔ سوف تعلمون تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔ سوف کے معنے عنقریب، جلدی، اب آخر، امام راغب مفردات میں لکھتے ہیں سوف حرف ہے جو فعل مضارع کو استقبال کے ساتھ خاص کر کے حال سے علیحدہ کر دیتا ہے۔ سوف تعلمون، میں اس پر تنبیہہ ہے کہ جو چیز طلب کر رہے ہیں گو فی الوقت حاصل نہیں ہے مگر بعد میں لامحالہ وہ ہو کر رہے گی اور یہ ڈھیل اور تاخیر کے معنے چاہتا ہے۔ السیوطی نے ابن باب شاہ کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے کہ سوف کا غالب استعمال وعید میں ہوتا ہے اور سین کا وعدے میں۔ اور کبھی سوف وعدے اور سین وعید میں۔ عاقبۃ، عاقبت، انجام، آخر، یہ اصل میں عقب کا مصدر

ہے جس کے معنے پیچھے سے آنے کے ہیں لیکن اس کا استعمال ہر شے کے آخر اور انجام کے لیے ہوتا ہے۔ امام راغب نے تصریح کی ہے کہ اس کا استعمال ثواب کے لیے مخصوص ہے جیسے والعاقبۃ للمتقین اور اضافت کی صورت میں کبھی عقوبت کے لیے بھی ہوتا ہے اس کی جمع عواقب آتی ہے ۔

اتمام حجت کا اہتمام تقاضائے رحمت ہے

انسانی فطرت خیر و شر کے شعور سے محروم نہیں ہے اور نہ عقل حق و باطل میں امتیاز سے قاصر ہے انسان کو اللہ تعالیٰ نے احسن تقویم پر پیدا کیا ہے اور اس کو خیر و شر کی معرفت بخشی ہے لیکن اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ عقل و فطرت کی رہنمائی کے ساتھ وحی و نبوت کی رہنمائی سے بھی انسان کو نوازے تاکہ عقل و فطرت کے تقاضے اس کے سامنے بالکل مبرہن ہو کر آجائیں اور گمراہی کے لیے ادنیٰ عذر بھی باقی نہ رہے یعنی انبیاء کے روانہ کرنے کی ایک ہی مصلحت تھی اور وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نوع انسانی پر اتمام حجت کرنا چاہتا تھا تاکہ آخری عدالت کے موقعہ پر کوئی گمراہ مجرم اس کے سامنے یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ ہم ناواقف تھے اور آپ نے ہمیں حقیقت حال سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ اسی مصلحت کے لیے خدا نے دُنیا کے تمام گوشوں میں انبیاء روانہ کیے اور کتابیں نازل کیں۔ لیکن اس مصلحت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انبیاء کی روانگی سے اللہ کی انسانوں سے کوئی غرض ہے اللہ کی ذات غنی مطلق ہے اسے کسی درجہ میں کسی چیز کی احتیاج نہیں ہے یہ کام اس کے محتاج ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ اس کا نظام ربوبیت ہے۔ جس طرح اس کی ربوبیت نے ہر ذرہ کے لیے سیرابی اور ہر چیونٹی کے لیے کارسازی رکھی ہے اسی طرح اس نے انسانی رُوح کی سعادت کے لیے بھی قاعدہ اور قانون بنایا ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی پروردگاری اجسام کی پرورش کے لیے تو آسمان سے پانی برسائے لیکن ارواح کی پرورش کے لیے اس کے پاس ایک قطرۂ فیض نہ ہو۔ روحانی سعادت کی اسی بارش کا نام وحی و نبوت ہے لیکن اس کی یہ ربوبیت کسی غرض سے ہرگز آلودہ نہیں ہے اس کی ذات اغراض، غایات سے بالا ہے۔ غرض محتاجی ہے اور احتیاج سے اس کی ذات پاک ہے۔ پھر ایسا انتظام کیوں ہے؟ قرآن نے یہاں اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اللہ سبحانہٗ رب ہونے کے ساتھ ذوالرحمۃ ہے یعنی رحمت والا ہے جو رحمت کارخانہ ہستی کے ہر گوشہ میں افادۂ فیضان کا سرچشمہ ہے کیونکہ ممکن ہے کہ انسان کی روحانی سعادت کے لیے اس کے پاس کوئی فیضان نہ ہو اور وہ انسان کو نقصان د

ہلاکت کے لیے چھوڑ دے۔ یہاں ربک الغنی ذوالرحمۃ فرما کر اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نبوت کا فیضان اس لیے نہیں ہے کہ اللہ کی کوئی غرض ہے، اللہ کی ذات غرض سے بالا ہے بلکہ اس لیے کہ اللہ کی ذات رحمان و رحیم ہے اور اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ انسانوں کی روحانی سعادت کے لیے نبوت آئے۔ اپنی صفتِ غنا کی وجہ سے اس کو کسی کی پروا نہیں ہے وہ سب سے بے نیاز سب سے مستغنی اور سب سے بے پرواہ ہے۔ سب اس کا انکار کر دیں تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا اور سب اس کے گن گائیں تو اس کا کچھ نہیں بنتا۔ وہ اگر اپنے رسول بھیجتا ہے تو اس لیے نہیں کہ لوگوں کے ایمان کے بغیر اس کا کام اٹکا ہوا ہے بلکہ یہ اس لیے ہے کہ وہ غنی ہونے کے ساتھ ذوالرحمۃ ہے۔ اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں پر اتمامِ حجت کر دے۔

۱۳۳۔ اور تیرا پروردگار بے نیاز رحمت والا ہے۔ پہلی آیت کے آخر میں فرمایا تھا و ما ربک بغافل عما یعملون تیرا رب ان کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے اور یہاں فرمایا و ربک الغنی ذوالرحمۃ تیرا رب بے نیاز رحمت والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عاملوں اور ان کے اعمال سے باخبر ہونے کے باوجود اللہ کو ان عاملوں اور ان کے اعمال کی پروا نہیں ہے بلکہ وہ ہر چیز سے مستغنی ہے۔ علمائے بلاغت کی زبان میں یہ فقرہ حصر کا فائدہ دے رہا ہے۔ یعنی اللہ ہی کی ذات کامل ترین غنا رکھنے والی اور پوری رحمت والی ہے۔ بے نیازی اور غنا اللہ سبحانہٗ میں واقعی اور حقیقی ہے۔ اس کے سوا دنیا اور کائنات کی ہر چیز اپنے وجود اور بقا میں اللہ کی محتاج ہے۔ لوگوں میں غنا اضافی ہے، ایک سرمایہ دار جسے ہم غنی کہتے ہیں وہ زیادہ محتاج ہے اور ایک سے زیادہ لوگوں کا محتاج ہے۔ بیوی کا ملازم کارکن کا ڈاکٹر کا اور حاکم کا محتاج ہے۔ اور سب اشیا کا محتاج ہے اپنے وجود اور بقا کے لیے اسباب کا اور اسباب سے بالا اللہ کا محتاج ہے لیکن اللہ کی ذات میں غنا ہے حقیقی ہے، نہ اسے طاعت گزاروں کی طاعت کوئی فائدہ پہنچاتی ہے اور نہ گنہ گاروں کا گناہ اسے نقصان دیتا ہے۔

مسند احمد، ترمذی، اور صحیح مسلم میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث قدسی میں اللہ کی شانِ استغنا کی شاندار تصویر پیش کی ہے:۔

> ابوذر غفاری سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ سبحانہٗ کا فرمان ہے اے میرے بندو تم سب قصوروار ہو مگر وہ جسے میں بچا لوں میرے سے بخشش طلب کیا کرو میں تمہیں بخش دوں گا۔ جو شخص یہ جانتا ہے کہ مجھ میں بخشنے کی طاقت ہے پھر مجھ سے بخشش مانگتا ہے تو میں اسے بخش دیتا ہوں اور کوئی

پرواہ نہیں کرتا ہوں، تم سب گم کردہ راہ ہو مگر وہ جسے راہ میں دکھلاؤں تو مجھ سے ہدایت مانگا کرو میں تمہیں ہدایت دوں گا تم سب محتاج ہو مگر وہ جسے میں بے نیاز کردوں تم مجھ سے مانگو میں تمہیں بے نیاز کردوں گا۔ اگر تمہارے اگلے پچھلے اور ایک روایت میں ہے کہ انسان اور جن، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت، زندہ اور مردہ، تر اور خشک سب مل کر میرے بندوں میں سب سے زیادہ شقی القلب بندہ کی طرح ہو جائیں تو میری سلطنت میں مچھر کے پر کے برابر کوئی کمی نہیں آتی اور اگر سب کا دل متقی سے متقی انسان کی طرح ہو جائے تو میری سلطنت میں ایک مچھر کے پر کے برابر زیادتی نہیں ہو سکتی۔ اگر تمہارے اوّل و آخر اور ایک روایت میں ہے انسان و جن، چھوٹے اور بڑے، مرد و عورت، زندہ و مردہ، تر اور خشک سب ہوں اور ان میں سے ہر سائل مجھ سے وہ مانگے جو اس کی انتہائی آرزو ہو، پھر ان میں سے ہر ہر سائل کو میں اس کی منہ مانگی مراد دے دوں تو میرے خزانے میں اتنی بھی کمی نہ آئے گی جیسے کہ تم میں کوئی شخص سمندر کے کنارے گزرے اور اس میں سوئی ڈبو کر نکال لے۔ اسی طرح میری سلطنت میں کوئی کمی نہ آئے گی۔ یہ اس لیے کہ میں سخی ہوں بزرگی والا ہوں، بے نیاز ہوں بات میری بخشش اور بات میرا عذاب ہے اور جب میں کسی کام کے کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں تو صرف یہ کہہ دیتا ہوں کہ ہو جا وہ موجود ہو جاتی ہے۔ اے میرے بندو یہ تمہارے اعمال ہیں ان کو میں تمہارے لیے درج کرتا ہوں پھر ان اعمال ہی کی میں تم کو پوری جزا دوں گا۔ لہٰذا جو شخص بھلائی اور نیکی پائے اسے اللہ کا شکر کرنا چاہیے اور اگر اس کے سوا کچھ اور پائے تو اسے اپنے ہی کو ملامت کرنا چاہیے۔

یہ ارشادِ الٰہی ایک طرف اگر اللہ سبحانہٗ کی شانِ استغنا کی عکاسی کر رہا ہے تو دوسری طرف اللہ سبحانہٗ کی توحید اور عظمتِ شان کی وہ روح پھونک رہا ہے کہ اس کے بعد اب کوئی ہاتھ نہ رہے جو خدا کے سوا کسی دوسرے کی طرف اٹھے، کوئی دوسری بارگاہ نہ رہے جس پر حاجت روائی کا گمان کیا جا سکے۔ گنہگار اگر گناہ کرتا ہے تو جان لے کہ اس کا نقصان اسی کو ہے۔ عابد اگر عبادت کرتا ہے تو سمجھ لے کہ اس کا نفع اسی کی ذات تک محدود ہے۔ اللہ کی بے نیازی کا یہ عالم کہ اگر تمام مجرمین کو بخش ڈالے تو پروا نہیں فیاضی کی یہ انتہا کہ اگر ایک ایک کو منہ مانگی مراد دے تو اس کے خزانۂ غیب میں کوئی نقصان نہیں سلطنت کی یہ قہرمانی کہ اس کے ارادہ و مراد میں تخلف نہیں۔ دنیا میں بڑے سے بڑا انقلاب

اسباب و عمل کا گرفتار ہے مگر اللہ کی یہ شان کہ اسباب و مسببات اس کے حکم کے منتظر ہیں۔ یہ ہے ربک الغنی کا مطلب۔ آئیے الغنی ہونے کے ساتھ ذوالرحمۃ پھر بھی یہاں برائے تقریب سخن، ایک اجمالی نظر ڈال لیجئے۔ رحمت کا ابتدائی تعارف اگرچہ ربک کے ذریعے سے قائم ہے کیونکہ ربوبیت کی اصل روح رحمت ہی ہے اگر رحمت نہ ہوتی تو ربوبیت کا یہ نظام بھی نہ ہوتا بلکہ یہ رحمت ہی کا جوش ہے کہ عدم کو وجود کا لباس ملا۔ یہاں رحمت کا ہر چھینٹا اللہ کی رحمت کا فیضان ہے۔ صحیحین میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عمر کے حوالہ سے ایک ارشاد آتا ہے۔

حضرت عمر فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ قیدی آئے ان میں ایک عورت پر نظر پڑی جو اپنا بچہ تلاش کرتی پھرتی تھی۔ جوں ہی اس کو اپنا بچہ مل گیا اسی وقت اس نے اٹھا کر اپنے سینہ سے لگالیا اور دودھ پلانے لگی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے مخاطب ہوکر فرمایا تمہارا کیا خیال ہے کیا یہ عورت اپنے اس بچہ کو آگ میں ڈال سکتی ہے ہم نے عرض کیا خدا کی قسم نہیں بالخصوص جبکہ اس کو آگ میں نہ ڈالنے کی قدرت بھی ہے اس پر آپ نے ارشاد فرمایا بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے اس عورت کے مقابلہ میں زیادہ پیار ہے۔

بخاری اور مسلم نے حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے یہ ارشادِ نبوت بھی نقل کیا ہے کہ:

خدائے تعالیٰ کے لیے سو رحمتیں ہیں جن میں اس نے جن و انس، جانوروں میں بہائم اور موذی جانوروں میں رحمت کا صرف ایک حصہ اتارا ہے اسی ایک حصہ سے وہ باہم ایک دوسرے پر لٹو ہیں اور ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ اسی ایک حصہ کی وجہ سے وحشی جانور اپنے بچہ سے الفت کرتا ہے بقیہ رحمت کے ننانوے حصے اس نے قیامت کے دن کے لیے رکھ چھوڑے ہیں کہ ان کے ذریعے اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا۔

دراصل اللہ سبحانہ کی غیر محدود رحمت کے تصور سے انسان عاجز ہے اور نبوت اسے یہ سمجھانا چاہتی ہے کہ تمام کائنات میں پھیلی ہوئی رحمت اور تنہا خدا کی اس رحمت میں جو روزِ قیامت ظاہر ہوگی کیا فرق ہے اسی فرق کے ذہن نشین کرانے کے لیے یہ ایک فرضی حساب بیان کیا گیا ہے تاکہ فکرِ انسانی کو غیر محدود رحمت کے اندازہ کرنے کا راستہ مل جاتے ورنہ غیر محدود کو نہ عدد میں محصور کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کی تقسیم ہوسکتی ہے۔ علماء لکھتے ہیں کہ رحمت کی دو قسمیں ہیں ایک وہ رحمت جو صفت ذات ہے

دوسری وہ رحمت جو اللہ کی صفتِ فعلی ہے۔ اس دوسری قسم ہی کو سو کے عدد میں محصور کر کے تقسیم کیا ہے حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ درجاتِ جنت سو ہیں اور جنت میں جانا چونکہ بلا رحمت الٰہیہ ہو نہیں سکتا اس لیے ہر درجہ کے مقابلہ میں رحمت کا ایک حصہ بنایا گیا ہے۔ امام رازی نے اس آیت کے ذیل میں مسلک اہل السنہ اور مسلک معتزلہ پر بحث کر کے آخر میں اپنے والد ماجد کے حوالہ سے یہ فیصلہ خوب نقل کیا ہے کہ اہل السنہ کی نظر اللہ سبحانہ کی قدرت و مشیت پر ہے اور معتزلہ کی نظر تنزیہ اور صفتِ عدل پر اور دونوں کی تشفی و تسلی کے لیے یہی فقرہ وربك الغنی ذوالرحمۃ کافی ہے۔

اللہ کی قدرت کی عظمت

۱۷۲۔ اگر وہ چاہے تو تمہیں ہٹا دے اور تمہارے بعد جس کو چاہے تمہارا جانشین بنا دے جیسا کہ ایک دوسری قوم کی نسل سے تمہیں اٹھایا ہے۔ خدا نے رسول بھیج کر اپنی حجت تمام کر دی۔ اب اگر تم نہ مانو اور سیدھے راستہ پر نہ چلو گے تو وہ غنی ہے اسے تمہاری کچھ پروا نہیں ہے وہ چاہے تو تم کو ایک دم لے جائے اور اپنی رحمت سے دوسری قوم کو تمہاری جگہ کھڑا کر دے جو خدا کی مطیع و فرمانبردار ہو اور تم کو لے جا کر دوسری قوم کا لے آنا خدا کے لیے کیا مشکل ہے آج تم اپنے جن آباؤ اجداد کے جانشین بنے بیٹھے ہو آخر ان کو اٹھا کر تم کو دنیا میں اسی خدا نے جگہ دی ہے۔ بہر حال خدا کا کام رک نہیں سکتا، تم نہ کرو گے دوسرے کھڑے کیے جائیں گے[1]

اصل میں مشرکینِ مکہ سے خطاب ہے اور بطورِ اتمامِ حجت بتایا جا رہا ہے کہ اگر وہ دعوتِ حق کی مخالفت سے باز نہ آئے تو اللہ سبحانہ ان کو راہِ حق سے ہٹا دے گا اور ان کی جگہ ایک دوسرا گروہ کھڑا کر دے گا وہ اسی طرح پہلی قوموں کو گراتا اور نئی قوموں کو اٹھاتا رہتا ہے۔ اس کی کوئی غرض تم سے اٹکی ہوئی اس کا کوئی مفاد تم سے وابستہ نہیں ہے کہ تمہارے دعوتِ حق کے ٹھکرا دینے سے اس کا کچھ بگڑ جائے۔ تمہاری راست روی سے اس کا کوئی فائدہ اور غلط روی سے اس کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ یہ تو اس کی مہربانی ہے کہ وہ تمہیں نبوت کے ذریعے صحیح طرز کی تعلیم دیتا ہے جس سے تم اولاً دنیا میں کامیاب ہو جاؤ۔ اور پھر آخرت میں بلند مدارج تک ترقی کرنے کے قابل بن سکو۔ ورنہ اگر تم کو فنا کرنا چاہے تو جب چاہے فنا کر دے اور تمہاری جگہ جس کو چاہے دے دے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جو تمہارے قیاس سے بالا ہو آخر تم بھی تو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس زمین میں روزِ اول سے نہیں ہو۔ تم سے پہلے اس ملک میں دوسری قومیں آباد تھیں جن کی تاریخ سے تم واقف ہو تو جس خدا نے ان کو مٹا کر تمہیں ان کا وارث بنایا، اگر وہ خدا تمہیں ہٹا کر دوسروں کو تمہارا وارث بنا دے تو کون ہے جو اس کا ہاتھ پکڑ سکے۔ تاریخ کے اوراق کھلے ہوتے ہیں اس کی گواہی ہے کہ ایسا ہی ہوا ان نبوت کے معاندین کو ختم کیا گیا اور ان کی جگہ زمین میں ان کو خلافت دی گئی جنہوں نے نبوت کی دعوت کو قبول کیا یہی وہ مہاجرین و انصار ہیں جو انسانیت کے لیے اللہ کی رحمت کا سب سے بڑا مظہر بنے۔ ان کے زمانے میں روحانی، اخلاقی، دینی و علمی روحانی وسائل انسان کامل اور صالح ترین تمدن منصۂ شہود پر آیا۔ اس حکومت میں جس کا شمار دنیا کی عظیم ترین حکومتوں میں تھا اور ایسی سیاسی و مادی قوت کے ساتھ جو اپنے زمانے کی طاقتوں سے برتر تھی اعلیٰ اخلاقی نمونے معیار کا کام دیتے تھے اور اخلاقی تعلیمات زندگی اور نظامِ حکومت کے لیے میزان کا درجہ رکھتی تھی تجارت و صنعت کے ساتھ اخلاقی فضائل بھی اپنے پورے عروج پر تھے۔ فتوحات کی وسعت اور تمدن کی ترقی کے ساتھ اخلاق و روحانیت کی ترقی بھی جاری تھی۔ اسلامی حکومت کی غیر معمولی وسعت آبادی کی انتہائی افزونی عیش و عشرت کے وسائل اور ترغیبات کے باوجود جرائم بہت کم تھے۔ فرد کا دوسرے فرد سے اور فرد و جماعت کا باہمی تعلق حیرت انگیز تھا۔ یہ ایک معیاری دور تھا، یگانے تو یگانے بیگانے بھی مان گئے۔ تاریخ کی آنکھوں نے کوئی فاتح اہلِ عرب سے عادل اور شفیق نہیں دیکھا ہے۔

یہ آیت گرامی وربک الغنی ذوالرحمۃ کے بعد بالکل وہی معنویت رکھتی ہے جو فاطر کی یہ آیت رکھتی ہے:۔

یا ایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ واللہ ھو الغنی الحمید

لوگو تم ہی اللہ کے محتاج ہو اور اللہ غنی ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہے:

ان یشأ یذھبکم ایھا الناس ویات بخلق جدید

اگر اللہ چاہے تو تمہیں ہٹا دے اور نئی خلقت تمہاری جگہ لے آئے۔

اور سورہ محمد میں بھی اسی قسم کی بات ارشاد ہوئی ہے:

واللہ الغنی وانتم الفقراء وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم۔

اللہ ہی غنی ہے اور تم ہی فقیر ہو۔ اگر تم روگرداں ہو گئے تو اللہ بدلے میں لے آئے گا

ایسی قوم کو جو تمہارے علاوہ ہو گی اور تم جیسے نہ ہوں گے۔

اعمال کے نتائج ناگزیر ہیں

۱۷۳- جس بات کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ یقیناً ہونے والی ہے اور تمہارے بس میں نہیں کہ خدا کو عاجز کر دو۔ یعنی یہ سوچ رکھو کہ یہی بغاوت و شرارت رہی تو خدا کا عذاب اٹل ہے تم اگر سمجھو کر بھاگ کر یا کسی کی پناہ لے کر سزا سے بچ جاؤ گے تو یہ محض حماقت ہے۔ خدا کو ساری مخلوق مل کر بھی اس کی مشیت کے نفاذ سے عاجز نہیں کر سکتی ہے[1] اصل ارشاد میں ما توعدون، یہ ایعاد سے مضارع مجہول ہے یا وعدے خواہ کچھ ہو معنے دھمکی ہوں یا وعدہ اس سے مراد کیا ہے آخرت میں سزا یا دنیا میں عذاب۔ اگر آخرت کی سزا مراد ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں اعمال کی جزا ضرور ہونی ہے اور اس سے بھاگ کر یا اس کو رد کر کے تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے تو اللہ سبحانہ کو تمہاری موت کے بعد زندگی پر ایسی قدرت ہے جیسے تمہارے اولاً پیدا کرنے پر قدرت تھی۔ اس دنیا کی ہر چیز کے کچھ خواص اور آثار ہیں مثلاً آگ کی خاصیت جلانا ہے پانی کی خاصیت بجھانا ہے۔ اسی طرح ہر جڑی بوٹی میں بھی کچھ خاصیتیں ہیں، ایسے ہی انسان کے مادی اعمال کے بھی خواص و آثار ہیں مثلاً وہ کھانا کھاتا ہے تو اس سے اس کی بھوک مرتی ہے، آسودگی آتی ہے، اسی طرح پانی پینے سے پیاس بجھتی ہے، زہر کھانے سے آدمی مر جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کے اخلاق و اعمال اور افکار خواہ اچھے ہوں یا برے اس کے مادی اعمال و افکار سے زیادہ اہم ہیں اس لیے ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کے اخلاق و اعمال اور افکار کا کوئی اثر کوئی نتیجہ اور کوئی خاصیت ہی نہ ہو مثلاً ایک شخص اپنا کھانا خود کھانے کے بجائے دوسروں کو کھلاتا ہے اور خود بھوکا رہتا ہے یا کسی پیاسے کو پانی پلاتا ہے اور خود پیاسا رہتا ہے یا کسی لاوارث بیمار کی تیمارداری کرتا ہے یا غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کی خبر گیری کرتا ہے تو انسانی عقل اور فطرت کا یہ کھلا ہوا تقاضا ہے کہ ان نیک اعمال کے بھی اثرات اور نتائج ہوں۔

بہر حال جب انسان کے مادی اعمال کے نتائج یہاں ظاہر ہو رہے ہیں تو ضروری ہے کہ ایک زندگی اور بھی ہو جہاں اس کے اچھے برے اخلاقی اور روحانی اعمال و افکار کے آثار و خواص اور نتائج ظاہر ہوں اور انسانوں کو ان کے اچھے اور برے اعمال کی جزا اور سزا ملے اور اگر اسی زندگی میں اعمال کی جزا و سزا مل جاتے تو یہ زندگی ابتلائی نہ رہے حالانکہ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے امتحان گاہ بنایا ہے اور جزا و سزا کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پردۂ غیب میں رکھ کر نبوت کے ذریعہ یہ اعلان کیا ہے کہ جو بھی یہاں اچھے احکام کی پیروی کرے گا میں اس کو آئندہ زندگی میں انعام دوں گا اور جو یہاں نافرمانی اور سرکشی کی زندگی گزارے گا اس کو سزا دوں گا۔ بہر حال اس آیت میں بتایا جارہا ہے کہ اس دنیا کی زندگی کے بعد دوسری زندگی میں جو تم سے جزا و سزا کا وعدہ کیا جا رہا ہے وہ ہو کر رہنا ہے اور جب اس کا ظہور ہوگا تو تم خدا کے قابو سے کسی طرح باہر نہ نکل سکو گے۔ شیخ الاسلام کے تشریحی نوٹ میں اشارہ ہے کہ ما توعدون سے دنیوی عذاب مراد ہے۔ یعنی وہ عذاب جو رسول کی تکذیب کی صورت میں آتا ہے اس کی بھی گنجائش ہے۔

انجام کی کامیابی ایمان کے لیے ہے

۱۳۴- اے پیغمبر کہہ دو کہ اے میری قوم تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ میں بھی کام کر رہا ہوں۔ عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ آخر کار کس کا انجام بخیر ہے، بلاشبہ ظلم کار لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ یعنی ہم سب نیک و بد اور نفع و ضرر سے آگاہ کر چکے ہیں۔ اس پر بھی اگر تم اپنی جانوں پر ظلم کرنے سے باز نہیں آتے ہو تو تم جانو، تم اپنا کام کیے جاؤ میں اپنا فرض ادا کرتا ہوں، عنقریب کھل جائے گا کہ اس دنیا کا آخری انجام کس کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ بلاشبہ ظالموں کا انجام اچھا نہیں ہو سکتا آگے ان کے چند اعتقادی اور عملی ظلم بیان کیے جاتے ہیں جو ان میں راسخ تھے اور سب سے بڑا ظلم وہی ہے جسے فرمایا ان الشرک لظلم عظیم[1] مطلب یہ ہے کہ اگر میرے سمجھانے سے تم نہیں سمجھتے ہو اور مخالفت حق سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہو تو جس ڈگر پر تم چل رہے ہو چلو یعنی جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر لو میں بھی اپنے موقف سے ایک انچ برابر ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ آیت اعملوا اور عامل کا تقابل لطیف ہے اعملوا فعل کا صیغہ ہے جب کہ عامل اس کے مقابلہ صفت کا صیغہ ہے۔ صفت لاکر بتادیا کہ میرے عمل میں دوام، استمرار، استقلال اور عزم ہے جب کہ تمہارے عمل کی ساری کہانی وقت کا ایک ہنگامی دفتر ہے فسوف تعلمون میں بتادیا ہے کہ انجام کار جو کچھ ہوگا وہ تمہارے سامنے آجائے گا اور تمہیں پتہ لگ جائے گا کہ انجام کی کامیابی کس کو حاصل ہوتی ہے۔ عاقبۃ کا لفظ انجام کے معنے میں آتا ہے، اچھا ہو یا برا لیکن یہاں اچھے انجام کے معنے میں ہے جیسے ان العاقبۃ للمتقین الدار سے مراد دار آخرت ہے کیونکہ نتائج کے ظہور کی اصلی جگہ وہی ہے۔ اہل ایمان دنیا میں جو جدوجہد اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

محنت کرتے ہیں وہ آخرت ہی کو پیش نظر رکھ کر کرتے ہیں۔ ان کو دنیا میں جو کامیابی حاصل ہوتی ہے اگرچہ کامیابی وہ بھی ہے لیکن وہ فیصلہ کن نہیں ہے اس لیے اصل توجہات کا مرکز یہ دنیا نہیں بلکہ آخرت ہے آخرت پر ایمان اور وہاں ملنے والی ابدی سعادت اور لازوال شقاوت اور ان تمام انعامات اور تمام عذاب کا ہمہ وقت نگاہوں میں ہونا یہی نبوت کی دعوت کا اصلی محرک ہے، یہی اس کو پریشان کرتا رہتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے نیند اڑا دیتا ہے، اس کی پرسکون زندگی کو مکدر کر دیتا ہے۔ ان کو کسی حالت میں سکون اور کسی پہلو قرار نہیں ملتا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے پھیلے ہوئے شر و فساد، حالات کی ابتری اور ماحول میں خرابیوں کے پروان چڑھنے کی صورت میں ان کے دل و دماغ پر سب سے زیادہ اثر انداز اور اس کے لیے سب سے طاقتور محرک بھی فکر آخرت ہے۔ اس لیے اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے جب تک آخرت میں کامیابی نہ ہو اس وقت تک یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ کس کی جیت رہی اور کون ہارا۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اس دنیا میں مخالفین حق جو دندناتے پھر رہے ہیں یہ اترانے کی چیز ہے یہ عارضی ڈھیل ہے۔ کل ان کو پتہ لگ جائے گا کہ اصل کامیابی کس کو حاصل ہوتی انہ لا یفلح الظلمون کہہ کر بات کھول دی کہ انجام کار کی کامیابی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے جو کفر و شرک کے جرائم کر رہے ہوں یہ تو اس آیت کا منطوق ہے اس آیت کا مدلول یہ بھی ہے کہ الدار سے دنیا مراد ہو اور مقصد یہ بتانا ہو کہ حق و باطل کی اس کشمکش میں جو نبوت اور اس کے مخالفین کے درمیان قائم ہے کامیابی حق کی ہے باطل کی نہیں ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ یہاں زندگی و عمل کی مہلتیں سب کو ملتی ہیں اس بات سے دھوکا نہ کھانا چاہیے اور یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ نتائج اعمال کے قوانین نہیں ہیں دیکھنا یہ چاہیے کہ نتیجہ کی کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے اور آخر کار آبرومند کون ہوتا ہے۔ اللہ کا قانون یہی ہے کہ ظلم کرنے والوں کے لیے کامیابی و سعادت کی راہ نہیں کھلتی مگر یاد رہے کہ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب حق و باطل کا میدان عمل میں مقابلہ ہو۔ اہل حق کے دامن میں عمل کا استمرار، دوام، استقلال اور عزم بالجزم ہو اور اہل باطل میں عمل کا ہنگامہ ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ اہل باطل عمل کے میدان میں ہوں اور اہل حق گوشہ نشین ہو کر حق کی کامیابی کی امید رکھتے ہوں، یہ اللہ کے قانون کے خلاف ہے۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ حق و باطل کی آویزش میں کامیابی حق کے لیے ہے اور ہزیمت و خسران باطل کے لیے۔

اگر آیت کا مدلول مقصود ہو تو یہ آیت اخبار بالغیب کی وجہ سے اس دنیا میں صداقت نبوت کا اعجازی شاہکار ہے۔ دنیا نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ایسا ہی ہوا۔

یہاں حافظ ابن کثیر نے آیت کے اس مدلول کا تصریحاً ذکر کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور صحابہ کرام کو اس دارِ دُنیا میں کُفر کے مقابلہ میں کامرانی اور کامیابی حاصل ہوگی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں تمام جزیرۃ العرب آپ کے زیرِ نگیں آگیا۔ یمن اور بحرین سے لے کر حدودِ شام تک آپ کی حکومت ہوگئی پھر آپ کے بعد صحابہ کرام کے ہاتھوں فتوحات کا سیلاب آگیا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں قد فعل اللہ ذالک

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا
لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ
اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا
يَحْكُمُوْنَ ﴿١٣٦﴾ وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ
اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿١٣٧﴾ وَقَالُوْا هٰذِهٖ
اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ
وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا
افْتِرَآءً عَلَيْهِ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿١٣٨﴾ وَقَالُوْا مَا فِيْ
بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ۚ
وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ؕ اِنَّهٗ
حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿١٣٩﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ

عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

اور ان لوگوں نے اللہ کے لیے خود اسی کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے لیے ہے بزعمِ خود اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے پھر جو حصہ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کے لیے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے کیسے بُرے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ[۱۳۶]۔ اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ ان کو تباہی کا نشانہ بنالیں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں، اور اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ ایسا ہرگز نہ کرتے لہٰذا ان کو اور ان کی افتراء پردازیوں کو چھوڑ دو[۱۳۷]، اور وہ

ہیں کہ یہ جانور اور کھیت ممنوع ہیں، ان کو صرف وہ لوگ کھا سکتے ہیں
جن کو ہم اپنے خیال کے مطابق کھلانا چاہیں[178]۔ اور اسی طرح کچھ جانور
ہیں جن پر سواری اور باربرداری حرام کر دی گئی ہے[179]، اور کچھ جانور
ایسے ہیں کہ ان پر خدا کا نام نہیں لیتے ہیں، یہ سب کچھ ان کی افترا
پردازیاں ہیں، اللہ ان کو ان کی افترا پردازیوں کی ضرور سزا دے گا[180]
اور کہتے ہیں کہ ان جانوروں کے پیٹ سے جو زندہ بچہ نکلے وہ
صرف ہمارے مردوں کے لیے حلال ہے ہماری عورتوں کے لیے
حلال نہیں ہے لیکن اگر مُردہ ہو تو دونوں اس کے کھانے میں
شریک ہو سکتے ہیں اللہ ضرور ان کو ان کی گھڑی ہوئی باتوں کی
سزا دے گا بلاشبہ وہ حکمت والا اور علم والا ہے[181]۔ بلاشبہ وہ لوگ
تباہ و برباد ہو گئے جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت اور نادانی سے
قتل کیا اور اللہ کے دیے ہوئے رزق کو اللہ پر افترا پردازی

کہ کے حرام ٹھہرایا یقیناً وہ بھٹک گئے اور ہرگز وہ سیدھی راہ پر نہ تھے۔[۱۸۲]

معانی مفردات

ذرأ اس نے پیدا کیا اس نے پھیلایا، ماضی کا واحد مذکر غائب، ذرار مصدر ہے جس کے معنے پیدا کرنے بکھیرنے کے آتے ہیں۔ کچھ کے خیال میں ذریۃ بمعنے اولاد اسی سے بنا ہے اس کی ہمزہ ترک کردی گئی ہے جیسے بریۃ وغیرہ بزعمھم ان کا خیال، ان کا گمان زعم یزعم کا مصدر ہے جو مضاف ہے اور ھم ضمیر جمع مضاف الیہ ہے۔ علامہ احمد فیومی، المصباح المنیر میں لکھتے ہیں زعم میں تین لغات ہیں۔ اہل حجاز کے نزدیک زار کا زبر ہے قبیلہ اسد کے نزدیک پیش ہے اور قبیلہ قیس کے بعض افراد کے نزدیک زیر ہے، اسی لیے زعمت الحنفیۃ زعم سیبویہ بولا جاتا ہے اور قرآن میں او تسقط السماء کما زعمت بھی اسی معنے میں ہے۔ نیز ظن یعنی گمان کے معنے میں بھی بولتے ہیں فی زعمی کذا میرا گمان یہ ہے اور اعتقاد کے لیے استعمال ہوتا ہے زعم الذین کفروا، ازہری کہتا ہے کہ زعم زیادہ تر اس شے میں ہوتا ہے جس میں شک کیا جاتا ہو اور متحقق نہ ہو اور کچھ کی رائے میں یہ کذب سے کنایہ ہوتا ہے۔ مرزوقی کا بیان ہے کہ اس کا استعمال اکثر اس چیز کے لیے ہوتا ہے جو باطل ہو یا غلط ہو اور ابن القوطیہ کا خیال ہے کہ زعم زعماً کے معنے ہیں ایسی بات کہی جس کے متعلق پتہ نہیں کہ صحیح ہے یا غلط۔ حجر، ممنوع، عقل اصل میں جس مکان کا احاطہ پتھروں سے بنایا جاتے وہ حجر کہلاتا ہے۔ اسی لیے ثمود کی آبادیاں چونکہ پتھروں سے تراش کر بنائی گئی تھیں حجر کہلائیں۔ چونکہ پتھروں کے احاطہ سے مقصود روک تھام ہوتی ہے اور عقل بھی انسان کی حفاظت کرتی ہے اور اس کو روکتی رہتی ہے اس لیے اس کو بھی حجر کہتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ چیز جس سے روکا جائے اور منع کیا جاتے حجر کہلاتی ہے۔ قرآن میں حجراً محجوراً اسی سے ہے۔

مشرکین کا شش نکاتی ضابطہ

اوپر کا سلسلہ بیان اس بات پر پورا ہوا تھا کہ اگر یہ لوگ نصیحت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اپنی جاہلیت پر اصرار کیے جاتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ تم اپنے طریقہ پر عمل کرو میں اپنے طریقہ پر عمل کر رہا ہوں ۔ روزِ قیامت تمہیں پتہ لگ جائے گا کہ انجام کیا ہوتا ہے ۔ اس کے بعد اس جاہلی نظام کی کچھ تشریح کی جاتی ہے جس پر وہ لوگ اصرار کر رہے تھے اور جسے چھوڑنے کے لیے کسی طرح آمادہ نہ ہوتے تھے ۔ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ تمہارا وہ ظالمانہ نظام کیا ہے جس پر قائم رہتے ہوئے تم کبھی فلاح نہیں پا سکتے ۔ یہاں خاص طور پر ان دفعات کی نشاندہی کی جا رہی ہے جو انہوں نے اپنے من گھڑت توہمات کے تحت حلال و حرام پر مبنی قانون سازی کر رکھی تھی ۔ قرآن نے ان آیات میں ان کا چھ نکاتی قانون بتایا ہے یہ ہے :

۱۔ وہ منتیں مانتے کہ اپنی زراعت اور مویشی میں سے اتنا حصہ خدا کے لیے نکالیں اور اتنا بتوں کے لیے ۔ خدا کا حصہ فقیروں کو دے دیتے اور بتوں کا ان کے مجاوروں کو ۔ اگر خدا کے حصے میں سے کچھ کم و بیش ہو جاتا تو اس کی پرواہ نہ کرتے لیکن بتوں کی نیاز کی بڑی نگہداشت کرتے اور کہتے کہ ان کے حصے میں سے کچھ کم نہ ہونا چاہیے ۔

۲۔ لڑکیوں کو قتل کر دیتے اور اسے بڑی فخر و شرافت کی بات سمجھتے ، ان کے کاہنوں اور بزرگوں نے انہیں حکم دیا تھا کہ ایسا کیا کریں ۔

۳۔ اپنی فصل اور مویشی کا ایک حصہ بت خانوں کے لیے مخصوص کر دیتے اور کہتے کہ مجاوروں کے سوا اور کسی کے لیے یہ کھانا جائز نہیں ہے ۔

۴۔ بتوں کے نام جانور چھوڑتے اور سمجھتے کہ اب ان سے کام لینا جائز نہیں ۔

۵۔ جو جانور بتوں کے نام پر قربان کرتے ان پر خدا کا نام نہ لیتے ۔

۶۔ جانور ذبح کیا جاتا اور اس کے پیٹ سے بچہ نکلتا تو اگر زندہ رہتا صرف مرد کھاتے ، عورتوں کے لیے جائز نہ تھا ، مردہ ہوتا تو عورتیں بھی کھاتی تھیں ۔

یہ تھا ان کا شش نکاتی تحلیل و تحریم پر مشتمل ضابطہ ۔ ان کے بارے میں قرآن بتاتا ہے کہ یہ انتہائی جہالت ، سفاہت کی باتیں ہیں اور یہ سب بے دینی ہے ، لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے اللہ پر افتراء پردازی کی جا رہی ہے ۔

مشرکانہ ضابطہ کی پہلی دفعہ

۱۳۶- اور ان لوگوں نے اللہ کے لیے خود اسی کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے لیے ہے بزعم خود اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے پھر جو حصہ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کے لیے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے کیسے برے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ کافر اپنی کھیتی میں اور مواشی کے بچوں میں سے اللہ کی نیاز نکالتے اور بتوں کی بھی نیاز نکالتے پھر بعضا جانور اللہ کے نام کا بہتر دیکھا تو بتوں کی طرف بدل دیا مگر بتوں کی طرف کا اللہ کی طرف نہ کرتے اس سے زیادہ ڈرتے۔ اسی طرح غلہ وغیرہ میں سے اگر بتوں کے نام کا اتفاقاً اللہ کے حصہ میں مل گیا تو پھر جدا کر کے بتوں کی طرف لوٹا دیتے اور اللہ نام کا بتوں کے حصہ میں جا پڑا تو اسے نہ لوٹاتے۔ بہانہ یہ کرتے تھے کہ اللہ تو غنی ہے اس کا کم ہو جائے تو کیا پروا ہے بخلاف بتوں کے کہ وہ ایسے نہیں۔ تماشہ یہ ہے کہ یہ کہہ کر بھی شرماتے نہ تھے کہ جو ایسے محتاج ہوں ان کو معبود و مستعان ٹھہرانا کہاں کی عقلمندی ہے۔ بہر حال ان آیات میں ساء ما یحکمون سے مشرکین کی اس تقسیم کا رد کیا گیا ہے۔ یعنی خدا کی پیدا کی ہوئی کھیتی اور مواشی میں سے اول تو اس کے مقابل غیر اللہ کا حصہ لگانا، پھر بری اور ناقص چیز خدا کی طرف رکھنا کس قدر ظلم اور ناانصافی ہے[1]

دراصل پہلی آیات میں دو قسم کے مشرکانہ افکار کا ذکر تھا۔ ایک شرک فی العبادت، دوسرے شرک فی الطاعت، شرک فی العبادت یہ کہ اللہ کے ساتھ اوروں سے بھی عابدانہ تعلقات رکھے جائیں اسے پرستش کہتے ہیں اور شرک فی الطاعت یہ کہ اللہ کے ساتھ حکم میں کسی اور کی بھی طاعت کی جاتے۔ سورہ انعام کے آغاز سے شرک فی العبادت پر مشتمل افکار کی تشریح اور تردید ہو رہی ہے اور اس بارے میں ــــ افغیر اللہ ابتغی حکماً سے شرک فی الطاعت کی توضیح اور تردید کی جا رہی ہے۔ اب یہاں دونوں یعنی شرک فی العبادت اور شرک فی الطاعت کی عملی مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔ زیادہ تر روئے سخن شرک فی الطاعت کی طرف ہے۔ شرک فی العبادت یہاں ضمناً مذکور ہے۔ آغاز ہی جعلوا سے کیا گیا ہے اس میں اشارہ ہے شرک فی الطاعت کی طرف۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کام انہوں نے خود کیا ہے اور عمل کا یہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پیمانہ ان کا اپنا بنایا ہوا ہے اللہ کا نازل کردہ نہیں ہے۔ اسی لیے آخر میں یحکمون لاتے ہیں۔ حالانکہ اس پوری کائنات کا جس کا ہماری یہ دنیا بھی ایک حصہ ہے مقتدر اعلیٰ اللہ ہی ہے۔ حکم دینے، منع کرنے، حلال و حرام کا پیمانہ بنانے اور اپنی مرضی پوری کرنے کا حق صرف اللہ کا ہے۔ حقیقی شارع اور قانون ساز وہی ہے۔ کسی مخلوق کی زندگی کا ذریعہ متعین کرنے، اس کے معاملہ کا فیصلہ کرنے، اسے معاف کرنے یا سزا دینے کا اختیار بھی پورے کا پورا اسی کے ہاتھ میں ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ حکم دینے اور قانون بنانے کا حق اصلاً اسی کو پہنچتا ہے اس لیے اگر کسی اور کو بھی یہ حیثیت دے دی جائے خواہ وہ جماعت ہی کیوں نہ ہو تو یہ شرک ہوگا۔ حضرت شاہ صاحب نے بھی اس آیت سے شرک فی الطاعۃ سمجھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ :

> اب جاننا چاہیے کہ اللہ کی نیاز دینی یہ کہ اس کی راہ میں جن کو دلوا دے ان کو دینا اس کا فائدہ اللہ کو نہیں پہنچتا اس کی حکم برداری ہے اور خیر سے فقیر کو فائدہ اور ثواب سے فائدہ دینے والے کو پھر جو کسی بزرگ کے واسطے کچھ دے اگر اسی وضع پر دے شرک ہے جس پر اللہ نے الزام دیا مگر اس بزرگ کو اپنی جگہ ٹھہرا دے کہ اس کی طرف سے اللہ کی راہ میں کھانے کو ان کو دے تو حکم برداری اللہ کی اور چیز فقیر کو اور ثواب اس شخص کے بدلے بزرگ کو۔

اس کی روح یہی ہے کہ اس آیت میں حکم برداری میں شرک کا بیان ہو رہا ہے آیت میں جعلوا اور پھر بزعمھم کی تصریح بھی اسی کی نشاندہی کر رہی ہے۔ آئیے اب پوری آیت پر ایک جامع نظر ڈال لیجئے۔

سب سے پہلی بات اس سلسلے میں یہ بتائی گئی ہے کہ انہوں نے جو پیمانہ بنا رکھا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے خدا کا ایک حصہ مقرر کیا ہوا ہے اور ایک حصہ ان کا جن کو خدا کا شریک بنایا ہوا ہے خدا کے لیے جو حصہ مقرر کیا ہے اس کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ یہ اللہ کے لیے ہے۔ ان کی یہ بات نقل کر کے قرآن نے اس پر یہ تبصرہ کیا ہے بزعمھم، یعنی یہ تمام تر ان کے وہم اور گمان کی تخلیق ہے۔ پہلے جعلوا کہہ کر بتایا کہ یہ ان کی بناوٹ ہے اور اب بزعمھم کہہ کر بتایا کہ یہ ان کی اپنی تخلیق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے نام پر دینا اپنی جگہ اچھی بات ہے اور اس کے حسن اور اس کی خوبی میں کوئی کلام نہیں مگر اس کا پیمانہ وحی الٰہی سے الگ ہو کر خود بنانا اور اسے رسم و دستور اور قانون بنا دینا ان کا کام نہیں۔ یہ حاکمانہ حیثیت صرف اللہ کو حاصل ہے۔ اعتراض اس پر نہیں کہ خدا کے نام پر کیوں دیتے ہیں بلکہ اس پر ہے کہ خدا کے نام پر دینے کو بطور قانون حاکمانہ حیثیت

میں نافذ کرنا ان کا کام نہیں ہے جعلوا اور بزعمھم میں اس کی صراحت ہے اور یہی غیر اللہ کی حکم برداری اور شرک فی الطاعت ہے اگر زکوٰۃ کی طرح خدائی ہدایت اور وحی کی رہنمائی میں وہ یہ کام کرتے تو قرآن کو ان کے اس عمل پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایسی تمام رسمیں ایسے تمام رواج جو انسانی رائے، انسانی خیال پر مبنی ہوں اگرچہ وہ خالصۃً خدا کے نام پر کیے مگر وحی الٰہی نے اس کی رہنمائی نہ کی ہو۔ ان کا حکم یہی ہے۔ کیونکہ اس میں غیر اللہ کی حکم برداری اور طاعت ہے۔ یہ ہے شرک فی الطاعت۔ آگے ھذا لشرکائنا، میں شرک فی العبادت کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے شریکوں کے لیے ہے۔ یہاں شرکاء سے ان کے وہ معبود مراد ہیں جن سے ان کے عابدانہ تعلقات تھے۔ یہ شرکاء کون تھے فرشتوں، جنّات، آسمانی ستاروں اور بزرگان سلف کی تصاویر ان کی تماثیل ان کے اصنام تھے۔ ان کے بارے میں ان کا تصور یہ تھا کہ اس زندگی میں جو کچھ اللہ کا فضل ان پر ہو رہا ہے۔ وہ ان کے طفیل اور ان کے صدقے میں ہے اس لیے وہ اپنے کھیتوں کی پیداوار اور اپنے جانوروں میں سے دو حصے نکالتے تھے۔ ایک حصہ اللہ کے نام کا اس شکریے میں کہ اس نے یہ پیداوار کی اور دوسرا حصہ اپنے قبیلے یا خاندان کے سرپرست معبودوں کی نذر و نیاز کا تاکہ ان کی مہربانیاں ان کے شامل حال رہیں۔ اللہ سبحانہٗ نے یہاں سب سے پہلے جعلوا اور بزعمھم لاکر اس پر گرفت کی ہے کہ اپنے شارع خود بن بیٹھے ہیں آپ ہی جو حصہ چاہتے ہیں اللہ کے لیے مقرر کر لیتے ہیں اور جو چاہتے ہیں دوسروں کے لیے طے کر دیتے ہیں حالانکہ اپنی بخشش کا اصل مالک اللہ ہے اور یہ بات اسی کے حکم کے مطابق طے ہونی چاہیے کہ اس بخشش میں سے کتنا حصہ اللہ کے نام کا نکالنا چاہیے۔ پانچواں، دسواں، بیسواں یا چالیسواں، اس خود مختارانہ طریقہ سے خود ہی حاکم و شارع بن کر جو حصہ یہ لوگ خدا کے لیے نکالتے ہیں یہ کوئی نیکی نہیں ہے۔ قاضی بیضاوی نے یہی بات سمجھی ہے ذالک مما اخترعوہ لم یامرھم اللہ بہ یہ ان کا من گھڑت قانون ہے۔ اللہ نے یہ بات ہرگز نہیں بتائی ہے۔ اور اردو شارحین قرآن میں سے شاہ عبدالقادر نے اسی کو منطوق قرآنی قرار دیا ہے۔ دوسری گرفت اس پر ہے کہ یہ سب مویشی اور کھیتیاں اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں اور اسی کی بخشش ہیں۔ ان میں یہ دوسروں کی نذر و نیاز دینا کھلا ظلم ہے۔ محسن کے احسان کو جو اس نے سراسر خود تم پر کیا ہے تم دوسروں کی مداخلت کا نتیجہ قرار دے کر عابدانہ اعمال میں ان کو شریک کرتے ہو۔ یہ بات ھذا لشرکائنا سے معلوم ہو رہی ہے۔

عجیب و غریب قانون

اس پر بھی بس نہیں بلکہ ان کے قانون ساز اداروں نے یہ عجیب و غریب قانون بھی بنا رکھا تھا

ماکان لشرکائھم فلایصل الی اللہ یعنی جو حصّہ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا لیکن جو اللہ کے لیے ہے وہ شرکاء کو پہنچ جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عوام سے جو آمدنی ہوتی تھی اس کی مدات دو تھیں ایک بنامِ خدا دوسرے بنامِ شرکاء۔ بنامِ خدا کے مصارف یہ تھے، مہمان نوازی، غریبوں کی امداد، بیچوں کی اعانت۔ اور بنامِ شرکاء کے مصارف یہ تھے مجاوروں کے اخراجات، قربان گاہوں کے اخراجات۔ اس میں انہوں نے قانون یہ بنا رکھا تھا۔ بنامِ خدا کی مد سے مجاوروں کے اخراجات اور بتوں کی قربانیوں کے مصارف تو ہو سکتے ہیں لیکن بنامِ شرکاء کی مد سے غریبوں کی امداد اور مہمان نوازی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اس طرح وہ چالبازیاں کر کے بنامِ خدا مد کو کم کرتے رہتے اور بنامِ شرکاء مد کو بڑھانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی شارحینِ قرآن نے ان کی عیاریوں کے اسی سلسلے میں نمونے پیش کیے ہیں مثلاً جو غلّہ یا پھل وغیرہ خدا کے نام پر آتا اس میں اگر کچھ گر جاتا تو اسے بنامِ شرکاء میں شامل کر دیتے اور اگر بنامِ شرکاء سے گر جاتا تو اسے اسی میں واپس کر دیتے۔ کھیت کا جو حصّہ شریکوں کی نذر کے لیے مخصوص کیا جاتا اگر اس میں سے پانی اس حصّہ کی طرف چلا جاتا جو بنامِ خدا کے لیے مخصوص ہوتا تو اس کی ساری پیداوار بنامِ شرکاء میں داخل کر دی جاتی۔ اگر کبھی خشک سالی کی وجہ سے نذر و نیاز کا غلّہ خود استعمال کرنے کی ضرورت پیش آجاتی تو بنامِ خدا کی مد کو کھا لیتے لیکن بنامِ شرکاء کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی بلا نازل نہ ہو جائے۔ اگر اتفاق سے بنامِ شرکاء کی بکری مر جاتی یا چوری ہو جاتی یا بنامِ شرکاء کا غلّہ چوہے کھا جاتے تو اس کی تلافی بنامِ خدا سے کر دیتے یہ تھی وہ من گھڑت قانون سازی جس کے بارے میں قرآن نے کہا ہے۔ ساء ما یحکمون کتنا بُرا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں۔

اس فیصلے کے بُرا ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے یہ جان لینا ضروری ہے کہ عرب جاہلیت یہ سمجھتی تھی کہ وہ خود شارع اور قانون ساز ہے اور اسے کسی خدائی ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن نے اس فقرے میں ایک طرف خدا کے مقابلے میں ان کے حاکمانہ ادعا کو بتایا ہے اور دوسری طرف اس حاکمانہ اقتدار کے نشہ میں جو قانون بناتے تھے اس کی قباحت کا اعلان کیا ہے۔ قباحت کی پہلی وجہ یہ ہے کہ خدا کے مقابلہ میں خود شارع اور قانون ساز بنے ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ، کہ غیر اللہ کی نذر مان کر شرک فی العبادت کر رہے ہیں حالانکہ تقربات میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ خدا کے مقابلہ میں اپنے شرکاء کا حق مرجح سمجھتے ہیں۔ قرآن نے دوسری جگہ بتایا ہے کہ مشرکین اپنے معبودوں سے خدا کے بالمقابل زیادہ محبت کرتے ہیں۔ یہ چیز مشرکینِ مکہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ تمام مشرک قوموں کا اشتراکی سرمایہ ہے بلکہ

یہ خود شرک کی فطرت ہے۔ مشرکین جن چیزوں کو خدا کا شریک بناتے ہیں ظاہر ہے کہ اس خیال سے بناتے ہیں کہ ان کی تمام معاشی ضروریات انہی سے وابستہ ہیں اور اگر خدا سے کوئی ضرورت وابستہ ہے بھی تو وہ بھی بہرحال ان ہی کی وساطت سے پوری ہوتی ہے یہاں تک کہ اگر خدا پوری نہ کرنی بھی چاہے جب بھی اگر یہ چاہیں تو پوری کرا سکتے ہیں۔ اس کے ہوتے ہوتے خدا کی اہمیت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ چنانچہ ان مشرکین کے نزدیک بھی خدا کی حیثیت بس معاذ اللہ اتنی تھی جتنی گھر میں ایک بڑے بوڑھے کی ہوتی ہے وہ اسی حیثیت سے خدا کے ساتھ معاملات کرتے تھے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ ان کی اس رسم اور قانون سازی کے لیے جیسے نقلی ہدایت کوئی نہ تھی خود عقلی روشنی بھی کوئی نہ تھی۔

شش گانہ نکات کی دوسری دفعہ

۱۳۷ - اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کے شرکاء نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ ان کو تباہی میں ڈال دیں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں اور اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ ہرگز ایسا نہ کرتے لہٰذا ان کو اور ان کی افتراء پردازیوں کو چھوڑ دو۔ یہاں شرکاء کی تفسیر امام مجاہد نے شیاطین سے کی ہے۔ مشرکین کی انتہائی جہالت اور سنگدلی کا ایک نمونہ یہ تھا کہ بعض اپنی بیٹیوں کو سسر بننے کے خوف سے اور بعض اس اندیشے سے کہ کہاں سے کھلائیں گے حقیقی اولاد کو قتل کر دیتے تھے اور بعض اوقات منت مانتے تھے کہ اگر اتنے بیٹے ہو جائیں گے یا فلاں مراد پوری ہو جائے گی تو ایک بیٹا فلاں بت کے نام پر ذبح کریں گے پھر اس ظلم اور بے رحمی کو بڑی عبادت اور قربت سمجھتے تھے شاید یہ رسم شیطان نے سنۃ خلیل اللہ کے جواب میں سجھائی ہو گی یہودیوں میں بھی مدت تک قتل اولاد کی رسم بطور ایک عبادت و قربت کے جاری رہی ہے جس کا انبیائے بنی اسرائیل نے بڑی شد و مد سے رد کیا۔ بہرحال اس آیت میں قتل اولاد کی تمام صورتوں کی شناعت بیان فرمائی جو جاہلیت میں رائج تھیں۔ یعنی شیاطین قتل اولاد کی تلقین و تزئین اس لیے کرتے ہیں کہ ان لوگوں کو دنیا و آخرت دونوں جگہ تباہ و برباد کر چھوڑیں اور ان کے دین میں گڑبڑ ڈالیں کہ جو کام ملت ابراہیمی کے بالکل متضاد و منافی ہے اسے ایک دینی کام باور کرائیں۔ والعیاذ باللہ کجا سنت ابراہیمی اور کجا یہ حماقت و جہالت [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

واقعی آیت میں شرکا سے مراد امام مجاہد کی رائے میں شیاطین ہیں لیکن شیاطین سے وہ شیاطین الانس مراد ہیں جنہوں نے قتلِ اولاد کو ان لوگوں کی نگاہ میں ایک جائز اور پسندیدہ عمل بنا رکھا تھا۔ ان کو مشرک شرک فی العبادت کی وجہ سے نہیں بلکہ شرک فی الطاعت کی وجہ سے کہا گیا ہے اور آپ بار بار سن آئے ہیں کہ قرآن میں دونوں شرک مذموم ہیں۔ جس طرح پرستش کا مستحق اللہ سبحانہٗ ہے ایسے ہی بندگی کا مستحق بھی اللہ سبحانہٗ ہے اور ان آیات کا اصل موضوع شرک فی الطاعت ہے۔ جس طرح دوسرے کے سامنے پرستش کے افعال میں سے کوئی فعل کرنا اسے خدا کا شریک بنانے کا ہم معنے ہے اسی طرح کسی کے خود ساختہ قانون کو برحق سمجھتے ہوئے اس کی طاعت کرنا بھی اسے خدائی میں اللہ کا شریک بنانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شیاطین الانس نے عوام کے سامنے قتلِ اولاد جیسے شنیع عمل کو مزین کر کے پیش کیا۔ اس تزئین کی صورت کیا تھی؟

تاریخ نے اس کا سرمایہ جو کچھ محفوظ رکھا ہے وہ یہ ہے کہ

اولاً لڑکیوں کا قتل اس تزئین سے کہ کوئی ان کا داماد نہ بنے یا اس تزئین سے کہ جنگ کی صورت میں وہ دشمن کے قابو نہ آئیں۔ اسی تزئین کی بنا پر وہ عورت کی جنس کو جو مرد کی طرح ایک انسانی جنس ہے ذلیل و حقیر سمجھتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی اولاد کو خود اپنے ہاتھوں قتل کر دینے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں یہ ظلم و معصیت کی تزئین کی ایک مسلسل سرگزشت ہے اور اسی تزئین کا ایک سب سے زیادہ وحشیانہ نمونہ دختر کشی کی رسم ہے۔ قرآن آیا تو عرب کے اکثر قبیلوں میں یہ رسم اسی طرح جاری تھی جس طرح ہندوستان کی مختلف قوموں میں پچھلی صدی تک ستی کی رسم جاری رہ چکی ہے۔ اس عمل کو ان کے رہنماؤں، لیڈروں، اکابر مجرمین نے اس طرح مزین کر رکھا تھا کہ وہ کہتے تھے۔ ہمارے قبیلہ کے افراد بیٹی کے باپ ہونے کا ننگ گوارا نہیں کر سکتے۔ لیکن قرآن نے نہ صرف یہ رسم مٹا دی بلکہ وہ ذہنیت بھی مٹا دی جو ان تمام وحشیانہ مظالم کے اندر کام کر رہی تھی۔ اس نے اعلان کر دیا کہ مرد و عورت کا جنسی اختلاف کسی برتری اور محرومی کی ہرگز بنیاد نہیں ہے۔ انسان ہونے کی حیثیت میں دونوں برابر ہیں۔ سورہ تکویر میں جہاں قیامت کی ہولناکیوں کا تذکرہ ہے وہاں پرستش اعمال میں سب سے زیادہ نمایاں جگہ اسی ظلم کو دی ہے واذا المؤودۃ سئلت بای ذنب قتلت؟

ثانیاً بچوں کا قتل اس طرح ان کے ذہنوں میں مزین کیا گیا تھا کہ ان کی پرورش کا بار نہ اٹھایا جا سکے گا اور ذرائع معاش کی کمی سے وہ ناقابل برداشت بوجھ بن جائیں گے۔ قرآن میں ہے کہ اپنی جاہلیت کے دور میں عرب کی سرزمین کا یہ عام رواج تھا کہ محض معاشی دشواریوں پر غالب آنے اور حبِ مال سے

جذبہ کی تسکین کے لیے وہاں کے باشندے اپنے جگر گوشوں کو بھی ذبح کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے تھے قرآن کو اسی رواج کے انسداد کے لیے ایک سے زیادہ مقام پر ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق کا قانون نافذ کرنا پڑا۔ اس سفاکانہ رسم کی تزئین کے لیے بھی وہی اور صرف وہی بیان کی گئی ہے جیسے آج برتھ کنٹرول سے جواز بلکہ وجوب کے سلسلے میں عموماً پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں تک عرب کا تعلق ہے قرآنی حکم کے بعد پھر سنگدلی اور قساوت کے اس جانگداز فعل کو اس ملک میں آج تک نہیں دہرایا گیا ہے۔ لیکن یہ تو جاہل عرب اپنی جاہلیت کے دور میں کرتا تھا۔ آج تعلیم یافتہ یورپ اور امریکہ پیدا ہونے سے پہلے ہی ماؤں کے پیٹوں میں جو قتل اولاد کا عمل کر رہے ہیں اور اس کی تزئین جس طرح کر رہے ہیں اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ مال کے عاشقوں نے اپنے سرمایہ کو بچانے کی یہ ایک سائنٹفک تدبیر نکالی ہے کہ معاشی پریشانیوں میں جن سے اضافہ کا اندیشہ ہے اپنے ان بچوں کو پیدا ہونے سے پہلے ہی زندگی سے محروم کر دیا جائے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ معاشی دشواریوں کے مسئلہ کے حل کا ایک طریقہ وہ تھا جسے عرب کے جاہل قتل اولاد کی صورت میں اپناتے ہوئے تھے اور ایک وہ ہے جسے آج یورپ کے پڑھے لکھے لوگ ضبط تولید کے نام سے پیش کر رہے ہیں۔ ذہن دونوں کا ایک ہے۔

ثالثاً، تزئین یہ کہ بچوں کو اپنے معبودوں کی خوشنودی کے لیے نذر چڑھا دیتے تھے۔ یہ سنگین جرم بعض مزعومہ سرکش جن بھوتوں کو راضی رکھنے کے لیے کیا جاتا تھا، غالباً سخت قسم کے جاہل مشرکین اس وہم کے تحت کہ فلاں وادی یا فلاں درخت کے جن کو انہوں نے اپنی کسی اولاد کی نذر دے کر راضی نہ رکھا تو وہ ان کی ساری اولاد یا ان کے سارے خاندان پر آفت لائے گا یہ حرکت کرتے تھے۔ اس قسم کے اوہام تمام مشرک اور وہم پرست قوموں میں پہلے بھی موجود رہے ہیں اور زمانہ کی ترقی کے باوجود اب بھی بعض قوموں کے نچلے طبقوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان اوہام کے پختہ کرنے میں شیاطین جن کے ان ایجنٹوں کو بڑا دخل ہوتا ہے جو انسانوں میں سے ان کے مرید بن جاتے ہیں۔ عرب جاہلیت میں جہاں جہاں بھوتوں کے تھان اور استھان تھے۔ ان کے پروہت کاہن اور مجاور اپنی طرف رجوع کرنے والے سادہ لوحوں کو ورغلاتے کہ فلاں جن تم پر بڑا غضبناک ہے اگر تم نے اپنے کسی بیٹے یا بیٹی کی قربانی دے کر اس کو راضی نہ کیا تو وہ تمہارے سارے خاندان کو چٹ کر جائے گا بے وقوف لوگ ان کے چکمے میں آکر یہ بیدردانہ اور سنگدلانہ جرم کر بیٹھتے اور اس طرح اپنے دین اور اپنی دنیا دونوں برباد کرتے۔ بہرحال تزئین کی کوئی صورت ہو۔ یہ تزئین ان کے شرکاء یعنی ان شیاطین الانس کی جانب سے ہوتی تھی جن کی لوگ طاعت کرتے تھے۔ قرآن نے آگے بتایا ہے کہ اس تزئین سے ان شرکاء کا کیا

مقصد تھا فرمایا دو گونہ مقاصد تھے ایک لیردوھم دوسرے لیلبسوا علیھم دینھم دونوں جگہ لام تعلیل ہے اور اچھا یہ ہے کہ لام عاقبت کہا جائے۔ پہلا مقصد اس تزئین سے ان کا یہ تھا کہ وہ لوگوں کو ہلاک کر ڈالیں۔ یہ ردٰی ازدار سے بنا ہے اس کے معنے ہلاک کرنا ہیں۔ ہلاکت کئی طرح کی ہوتی ہے اخلاقی ہلاکت، قومی ہلاکت، اخلاقی ہلاکت یہ کہ جو شخص سنگدلی اور قساوت کی اس حد کو پہنچ جاتے کہ اپنی اولاد کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنے لگے۔ایسا جوہر انسانیت ہی نہیں رہتا جو اپنی اولاد پر رحم نہیں کرتا اس سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ انسانوں پر رحم کرے گا۔ قومی ہلاکت یہ کہ قتل اولاد کا لازمی نتیجہ آبادی کی کمی ہے۔ جس سے قوم کی افرادی قوت ختم ہو کر رہ جاتی ہے اس طرح پوری قوم آہستہ آہستہ تباہی کے گڑھے میں گر جاتی ہے اور اگر لام تعلیل کے لیے نہیں بلکہ عاقبت کے لیے ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ قتل اولاد کی اس تزئین کا انجام اور نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری قوم ہلاک ہو جائے گی اور ظاہر ہے کہ جو لوگ نسل کشی کا عمل کریں گے ان کی بقا کا دنیا میں کوئی سوال ہی نہ ہوگا۔

دوسرا مقصد اس تزئین سے یہ تھا کہ اس طرزِ عمل سے قربانی کے اس عمل کی روح کو وہ پامال کر دیں جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے دین کا بہت بڑا حصہ تھی۔اس سنتِ ابراہیمی کی جگہ اس خود ساختہ بدعت کو لوگوں میں قائم کر کے دین کو تباہ کر دیں۔ اصل اور نقل میں کوئی تمیز نہ رہے۔ بدعت کا مزاج ہی یہ ہے کہ وہ سنت کو ہڑپ کر جاتی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بدعت کا سنت سے تقابل کر کے فرماتے ہیں:

> کسی قوم نے بدعت ایجاد نہیں کی مگر اس کی مقدار میں سنت اس سے اٹھالی گئی لہٰذا سنت پر کاربند رہنا بدعت کی ایجاد سے اچھا ہے۔

حضرت حسان بن ثابت فرماتے ہیں:

> کسی قوم نے دین میں بدعت نہیں نکالی مگر اللہ تعالیٰ نے اتنی ہی مقدار میں سنت اس سے اٹھالی اور پھر قیامت تک وہ واپس نہ ہو گی۔

آخر میں ہدایت وضلالت کے باب میں سنتِ الٰہی یہ بتائی ہے ولو شاء اللّٰہ ما فعلوہ فذرھم وما یفترون۔ اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔اب ان کو اور ان کی افترا پردازیوں کو چھوڑ دیجئے۔یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ اگر یہ اپنی حماقتوں اور سنگدلانہ حرکتوں کی حمایت میں تم سے لڑتے جھگڑتے ہیں تمہاری بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ان کو ان کے من گھڑت فتنوں میں پڑا رہنے دو۔ ان کا کام کسی کو باندھ کر راہ پر لگانا نہیں ہے۔اللہ نے اس دنیا میں باطل کو بھی

مہلت دی ہے جو باطل پر جمے رہنا چاہتے ہیں خدا ان کو ان کے باطل ہی پر چھوڑ دیتا ہے۔ ہدایت و ضلالت کے معاملہ میں اس نے جبر کو پسند نہیں کیا۔ اگر وہ زور سے لوگوں کو ہدایت پر لانا چاہتا تو یہ سب ہدایت پر ہو سکتے کوئی بھی اس گمراہی پر جما نہ رہتا۔ جب سنتِ الٰہی یہ ہے تو آپ کیوں ان کی اس بے راہ روی سے پریشان ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا کہ یہ شرکاء تزئین کا یہ کام نہ کریں۔ یا مشرکین قتلِ اولاد نہ کریں تو وہ نہ کرتے۔ اللہ اپنے قانونِ تخلیق کو تبدیل کر کے ان کو ایسا نہ کرنے پر مجبور کر دیتا لیکن اس کا قانونِ تخلیق اور اس کی سنت بدل نہیں سکتی ہے اور یا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو ان کو پیدا ہی عبادت والی جبلت پر کرتے اور ان کے ارادہ و اختیار کو اس میں دخل نہ ہوتا جیسے یہ ملائکہ کی تو شان ہے۔ انسان کو اللہ نے استعداد ہی ایسی عطا فرمائی ہے جس میں خیر و شر دونوں قبول کرنے کی صلاحیت ہے اور دونوں طاعت اور معصیت ارادی و اختیاری ہیں۔

ششش گانہ نکات کی تیسری دفعہ

۱۳۸۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ جانور اور کھیت ممنوع ہیں ان کو صرف وہ لوگ کھا سکتے ہیں جن کو ہم اپنے خیال کے مطابق کھلانا چاہیں۔ مثلاً مرد کھائیں، عورتیں نہ کھائیں یا صرف مہنت کھا سکیں جو بت خانوں کے مجاور تھے۔ یہ قیود اپنے خیال میں بعض مواشی اور کھیتوں کے متعلق عائد کر رکھی تھیں جو بتوں کے نام پر وقف کیے جاتے تھے[1] حجر کے معنے ممنوع کے ہیں۔ یہ بھی ان کے ششش گانہ نکات میں سے ایک اسم ہے، انہوں نے یہ ضابطہ بنا رکھا تھا کہ زمینی پیداوار اور جانوروں کے جو چڑھاوے اور نیازیں آتی تھیں ان کے کھانے کے معاملہ میں چڑھاوے کی نوعیت کے اعتبار سے بڑی بڑی پابندیاں لگا رکھی تھیں۔ یہ چڑھاوے غلّوں کی صورت میں بھی آتے تھے۔ گندم، چاول، دالیں وغیرہ اور جانوروں کی صورت میں بکرے، بھیڑیں، دنبے، مرغ، گائیں وغیرہ ان کے لیے ان کے یہاں ایک مفصّل ضابطہ تھا جس کی رُو سے مختلف نذروں، نیازوں، منتوں کو خاص قسم کے لوگ کھا سکتے تھے۔ اللہ سبحانہٗ نے ان کے اس فیصلہ کو نہ صرف غلط قرار دیا ہے بلکہ بتایا ہے کہ ان کا یہ فیصلہ خود ان کا تراشیدہ تھا وحی الٰہی کی اس موضوع پر کوئی رہنمائی نہ تھی یعنی جس خدا کے رزق میں سے وہ یہ منتیں مان رہے ہیں اور نیازیں دے رہے ہیں اس نے نہ ان منتوں اور نیازوں کا حکم دیا ہے اور نہ ان کے کھانے کے

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

متعلق یہ پابندیاں لگائی ہیں۔ یہ سب کچھ ان کا اپنا ہی کیا دھرا ہے بزعمھم کی تعبیر اسی بات کو ظاہر کرنے کے لیے لائی گئی ہے اور چونکہ یہ فیصلے تمام تران کے مجاوروں کے خود ساختہ قانون پر مبنی تھے اور وہی اس کے عالم بھی تھے۔ رائے عامہ کا اس میں کوئی دخل نہ تھا اور نہ اس کے خلاف کچھ کہنے یا کرنے کا کسی میں یارا تھا اس لیے یہاں اس خود ساختہ قانون کی نسبت ان کی طرف کی گئی ہے الا من نشاء بزعمھم شرک کی روح سب جگہ ایک ہوتی ہے لیکن شرک کے قوالب بدلتے رہتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی اس سے ملتا جلتا ضابطہ ہے۔ بی بی کی صحنک کو مرد نہ کھائیں، لونڈی نہ کھائے، جس عورت نے دوسرا شوہر کیا ہو وہ نہ کھائے۔ شاہ عبدالحق کا توشہ حقہ پینے والا نہ کھائے، یہ اور اس قسم کی خرافات کا حکم بھی ہے کہ یہ سب کچھ ہر دور کے مجاوروں کا اپنا بنایا ہوا ضابطہ ہوتا ہے۔ اس میں دوگونہ شرک ہے ایک غیر اللہ کی عبادت کی وجہ سے یہ خالص مشرکانہ فعل ہے خواہ عرب کے بتوں کے نام پر یا اولیاء اور بزرگوں کے نام پر ہو۔ دوسرے غیر اللہ کی اطاعت ہے کہ خدا کے حکم کے بغیر مجاوروں اور مہنتوں کے رجحان نفس اور میلان طبع پر مبنی ضابطہ کی اطاعت ہو رہی ہے:

شش گانہ نکات کی چوتھی دفعہ

۱۳۹۔ اور اسی طرح کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی ہے یعنی اسی طرح بعض جانوروں کی پیٹھ پر سواری اور بار برداری کو حرام سمجھتے تھے[1] جس طرح ہمارے ملک میں گائے، بیل، بکرے کسی بت کے نام پر یا قبر یا دیوتا یا پیر کے نام پر چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ اور ان سے کوئی خدمت لینا یا انہیں ذبح کرنا یا کسی طور پر ان سے فائدہ اٹھانا حرام سمجھا جاتا ہے اسی طرح زمانہ جاہلیت میں اہل عرب بھی جانوروں کو مختلف طریقوں سے پن کر کے چھوڑ دیا کرتے تھے اور ان جانوروں کے الگ الگ نام رکھتے تھے۔ سورہ مائدہ میں ان کا ہی تعارف بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام سے کرایا گیا تھا۔ یہ سب عرب جاہلیت کی نذریں اور منتیں تھیں۔ اس قسم کے جانور آزاد چھوڑ دیے جاتے جس گھاٹ سے چاہتے پانی پیتے اور جس کی چراگاہ میں چاہتے پھرتے نہ ان کو کوئی روک سکتا تھا نہ چھیڑ سکتا تھا ان کو مذہبی تقدس کا ایسا درجہ حاصل تھا کہ ہر شخص ان کو چھیڑنے کے وبال سے لرزہ بر اندام رہتا تھا۔ ان پر سوار ہونا یا ان کو بار برداری کے لیے استعمال کرنا ان کی خود ساختہ شریعت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

میں قطعاً حرام تھا۔ قرآن نے واضح فرمادیا ہے کہ ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ یہ صرف اوہام کی ایجاد ہیں جن کو اللہ کی طرف منسوب کرنا اللہ اور اس کی شریعت پر اتہام ہے۔ جو لوگ عقل سے محروم ہیں وہ اس قسم کی حرکات کرتے ہیں۔ اس کے برعکس قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اپنے دُنیا کے کاموں میں اللہ کو یاد رکھیں اور اس کی تعظیم کرتے رہیں تاکہ ایمان درست رہے اور ان کاموں میں بھی برکت ہو۔ جیسے اڑے کام پر اللہ کی نذر ماننی اور مشکل کے وقت اس کو پکارنا اور ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنا اور جب اولاد ہو تو اس کے شکر میں اس کے نام کا جانور ذبح کرنا اور کھیت باغ میں تھوڑا بہت اس کے نام کا رکھنا اور دہن اور ریوڑ میں سے کچھ اس کی نیاز کرنا اور جو جانور اس کے نام کے لیے بیت اللہ لے جائے ان کا ادب کرنا یعنی ان پر سوار نہ ہونا اور ان کو بار برداری کے لیے استعمال نہ کرنا وغیرہ وغیرہ، یہ کام خالص خدا کے لیے ہیں، ان میں کسی کی کوئی شرکت نہیں۔ اب اگر کوئی بھی اعمال غیر اللہ کے لیے پیر، امام، شہید، نبی، ولی کی اس قسم کی تعظیم کرے اڑے وقت میں ان کی نذر مانے، مشکل میں ان کو پکارے، اولاد ہو تو ان کی نذر و نیاز کرے۔ کھیت و باغ میں ان کا حصہ لگا دے پیداوار میں پہلے ان کی نیاز دے اور دہن ریوڑ میں ان کے نام کے جانور چھوڑے اور پھر ان جانوروں کا ادب کرے، پانی سے نہ ہانکے، لکڑی پتھر سے نہ مارے، یہ سب مشرکانہ اعمال ہیں۔

شش گانہ نکات کی پانچویں دفعہ

۱۸۰۔ اور کچھ جانور ایسے ہیں کہ ان پر خدا کا نام نہیں لیتے، یہ سب کچھ ان کی افتراء پردازیاں ہیں، اللہ ان کو ان کی افتراء پردازیوں کی ضرور سزا دے گا۔ بعض جانوروں کی نسبت یہ قرار دیا تھا کہ ذبح کرنے یا سواری لینے یا دودھ نکالنے کے وقت ان پر خدا کا نام نہ لیا جائے، کہیں بُتوں کی چیز میں خدا کی شرکت نہ ہو جائے، پھر غضب یہ تھا کہ ان خرافات اور جہالتوں کو خدا کی طرف منسوب کرتے تھے گویا اس نے معاذ اللہ یہ احکام دیے ہیں اور ان ہی طریقوں سے اس کی خوشنودی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ایسی بدعنوانیوں کے ساتھ یہ افتراء و بہتان عنقریب ان گستاخیوں کی سزا سے ان کو دوچار ہونا پڑے گا۔[1]

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ عرب کے ہاں بعض مخصوص منتوں اور نذروں کے جانور ایسے

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ہوتے تھے جن پر خدا کا نام لینا جائز نہ سمجھا جاتا تھا بلکہ ممنوع تھا۔ ان پر سوار ہو کر حج کرنا منع تھا، کیونکہ حج کے لیے لبیک اللھم لبیک کہنا پڑتا تھا۔ اسی طرح ان کا دودھ دوہتے وقت یا ان پر سوار ہونے کی حالت میں یا ان کو ذبح کرتے یا ان کو کھانے کے وقت اہتمام کیا جاتا تھا کہ خدا کا نام زبان پر نہ آئے[1] حالانکہ یہ ساری خرافات ان کے مشرکانہ اوہام پر مبنی ہیں لیکن اس کے باوجود ان کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں جیسا کہ ہر مبتدع کا قاعدہ ہے کہ ایجاد خود کرتا ہے اور نام لیتا ہے اللہ کا، اسی لیے قرآن نے اس کو یہاں افتراء سے تعبیر کیا ہے یعنی یہ خدا پر سب سے بڑا بہتان ہے اور اللہ سبحانہ، ان کو ان کی اس افتراء پردازی کی سزا ضرور دے گا۔

ششش گانہ نکات کی چھٹی دفعہ

۱۸۱ - اور کہتے ہیں کہ ان جانوروں کے پیٹ سے جو زندہ بچہ نکلے وہ صرف ہمارے مردوں کے لیے حلال ہے ہماری عورتوں کے لیے حلال نہیں ہے لیکن اگر مردہ ہو تو دونوں اس کے کھانے میں شریک ہو سکتے ہیں، اللہ ضرور ان کو ان کی گھڑی ہوئی باتوں کی سزا دے گا بلاشبہ وہ حکمت و علم والا ہے۔ ایک مسکر بنا رکھا تھا کہ بحیرہ اور سائبہ کو اگر ذبح کیا جائے اور اس کے پیٹ میں سے زندہ بچہ نکلے تو اسے مرد کھائیں عورتیں نہ کھائیں اور اگر مُردہ نکلے تو سب کھا سکتے ہیں۔ اس طرح کے بے سند، مسئلے گھڑنے والوں کے جرائم سے اللہ بے خبر نہیں ہے، ہاں وہ اپنی حکمت کے مطابق مناسب وقت میں سزا دے گا[2]

مطلب یہ ہے کہ اہل عرب میں نذروں اور نیازوں کے جانوروں کے متعلق جو خود ساختہ شریعت بنی ہوئی تھی۔ اس قانون کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ان جانوروں کے پیٹ میں سے جو بچہ پیدا ہو اس کا گوشت صرف مرد کھا سکتے ہیں اور عورتوں کے لیے ان کا کھانا جائز نہیں ہے لیکن اگر وہ بچہ مُردہ ہو یا مر جائے تو اس کا گوشت کھانے میں مرد و عورت سب شریک ہو سکتے ہیں۔ کچھ شارحین قرآن نے بحائرہ اور سوائب کی تخصیص کی ہے اور کچھ نے عام بتایا ہے یعنی نذر و نیاز کے تمام جانوروں کے بارے میں یہ قانون بنا رکھا تھا کہ ان کے اندر جو کچھ بھی ہے خواہ وہ بچہ ہو یا دودھ ہو وہ مردوں کے لیے تو حلال ہے لیکن عورتوں کے لیے حرام ہے اور اگر بچہ مردہ پیدا ہو یا پیدا ہونے کے بعد اپنی طبعی موت سے مر جائے تو عورتیں اور مرد سب کھا سکتے ہیں۔ فرمایا کہ سیجزیھم وصفھم

[1] تفہیم القرآن [2] افادات شیخ الاسلام

اللہ تعالیٰ عنقریب ان کو ان کی کذب بیانی کی سزا دے گا۔ اللہ کے علم و حکمت کے یہ بات منافی ہے کہ وہ ان لوگوں کو سزا نہ دے جو اس دلیری کے ساتھ اللہ کے نام پر جعلی کرنسی چلاتے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے نام پر شریعت سازی کے کارخانے کھولتے ہیں اور بڑی بے باکی کے ساتھ خدا کے نام پر مسئلے گھڑ گھڑ کے بیان کرتے ہیں ان کا انجام خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ہماری شریعت میں اسی کا نام بدعت ہے۔ علامہ شاطبی نے بدعت کی تعریف یہ کی ہے:

دین میں ایسا اختراع کیا ہوا طریقہ جو شریعت کے مشابہ ہو اور جس پر عمل سے اللہ کی عبادت میں مبالغہ مقصود ہو۔

حافظ ابن رجب حنبلی جامع العلوم والحکم میں لکھتے ہیں:

جس نے بھی کوئی چیز ایجاد کی اور اس کو دین کی طرف منسوب کیا جب کہ اس کی دین میں کوئی اصل نہیں ہے پس وہ گمراہی ہے اور اللہ کا دین اس سے بری ہے، خواہ وہ ایجاد کردہ چیز اعتقادات سے ہو۔ یا اعمال یا اقوال ظاہرہ و باطنہ سے۔

دین میں اختراع کرنے والوں کا انجام

۱۴۲۔ بلا شبہ وہ لوگ تباہ برباد ہو گئے جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت اور نادانی سے قتل کیا اور اللہ کے دیے ہوئے رزق کو اللہ پر افترا پردازی کر کے حرام ٹھہرایا یقیناً وہ لوگ بھٹک گئے اور ہرگز وہ سیدھی راہ پر نہ تھے۔ اس سے بڑی خرابی اور نقصان و خسران کیا ہو گا کہ بیٹھے بٹھائے بلا وجہ دنیا میں اپنی اولاد سے محروم ہو گئے اور سنگدلی، بداخلاقی و جہالت میں مشہور ہو گئے اور آخرت کا دردناک عذاب سر رکھا نہ عقل سے کام لیا نہ شریعت کو پہچانا، سیدھی راہ پر آتے تو کیسے آتے[1] مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وہ لوگ جنہوں نے یہ رسم و رواج گھڑے تھے تمہارے باپ دادا تھے، تمہارے مذہبی بزرگ تھے، تمہارے پیشوا اور سردار تھے لیکن حقیقت بہر حال حقیقت ہے ان کے ایجاد کیے ہوئے غلط طریقے صرف اس لیے صحیح اور مقدس نہیں ہو سکتے کہ وہ تمہارے اسلاف اور بزرگ تھے۔ جن ظالموں نے قتل اولاد جیسے وحشیانہ فعل کو رسم بنایا ہو جنہوں نے خدا کے دیے ہوئے رزق کو خواہ مخواہ خدا کے بندوں پر حرام کیا ہو۔ جنہوں نے دین میں اپنی طرف سے نئی نئی باتیں شامل کر کے خدا کی طرف منسوب کی ہوں

[1] افادات شیخ الاسلام

وہ آخر فلاح یاب اور راست رو کیسے ہو سکتے ہیں چاہے وہ تمہارے اسلاف اور بزرگ ہی کیوں نہ ہوں، بہرحال تھے وہ گمراہ اور اپنی اس گمراہی کا بُرا انجام بھی وہ دیکھ کر رہیں گے[1]

اس آیت میں ان کے دو سنگین جرم بتاتے ہیں ایک قتلِ اولاد، دوسرے تحریم رزق، قتل اولاد کے کردار کی علت حماقت اور جہالت بتائی ہے۔ یعنی یہ ایک ایسا قبیح اور بدترین عمل ہے جس کا ارتکاب کوئی عقل و ہوش والا آدمی اور کوئی باخبر شخص نہیں کر سکتا ہے یہ ایک طرف اگر جہل و کوری کی علامت ہے تو دوسری طرف احمق اور عقل سے بیگانہ ہونے کی نشانی ہے۔ شاید اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا ہے اگر تم عرب کی جہالت کا مرقع دیکھنا چاہتے ہو۔ تو قرآن عزیز کی یہ آیت قد خسر الذین قتلوا اولادھم پڑھو۔ اللہ اکبر کیا انقلابِ حال ہے ایک بات جو کل تک عرب بدو کہتا تھا جہالت تھی اور وہ ہی جب یورپ کا ڈاکٹر ضبطِ تولید کے خوشنما اور پرشوکت نام سے پیش کرتا ہے تو عقلمندی اور دانائی بن گئی دوسری بات یعنی تحریم رزق کی علت یہ بتائی ہے کہ اللہ کے بندوں پر رزق خداوندی کے لیے تحریم کا قانون بنانا اور اسے دین کے نام پر پیش کرنا یہ خدا پر سب سے بڑا بہتان ہے۔ ان دونوں باتوں کے نتیجے میں وہ سرتاسر دُنیا اور آخرت میں نقصان اور گھاٹے میں رہیں گے یہاں پہنچ کر یکبارگی ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیسے؟ جواب میں بطور استیناف بیانی فرمایا قد ضلوا و ما کانوا مھتدین۔ یہ لوگ راہِ حق سے بھٹک گئے ہیں اور اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ جو ہدایت دے کر روانہ کیا ہے اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔

---

[1] تفہیم القرآن

وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّ
النَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا
وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ
يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿١٤١﴾
وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَ
لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٤٢﴾
ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ
ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ
الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّئُوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١٤٣﴾ وَ
مِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ
حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ
اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ

افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٤٤﴾

اور دیکھو وہ خدا ہی ہے جس نے باغ پیدا کر دیے ٹٹیوں پر چڑھائے اور بغیر اس کے[۱۸۳] ۔ اور کھجور کے درخت اور کھیتیاں جن کے پھل مختلف قسموں کے ہوتے ہیں، نیز زیتون اور انار کے درخت صورت و شکل میں ایک دوسرے سے ملتے ہوتے اور ایک دوسرے سے الگ[۱۸۴] ۔ خدا کی اس پیداوار کو شوق سے کھاؤ جب اس میں پھل لگ جائیں اور چاہیے کہ جس دن فصل کاٹو اس کا حق بھی دے دیا کرو، اور اسراف نہ کرو، خدا انہیں دوست نہیں رکھتا جو اسراف کرنے والے ہیں[۱۸۵] ۔ اور دیکھو اسی خدا نے چارپایوں میں سے کچھ تو بوجھ اٹھانے والے پیدا کر دیے اور کچھ زمین سے لگے ہوتے، پس جو کچھ خدا نے تمہاری روزی کے لیے پیدا کر دیا ہے اسے کھاؤ اور شیطان

کے قدم بقدم نہ چلو وہ بلاشبہ تمہارا کھلا دشمن ہے[۱۸۶]۔ چار پایوں میں
جن کا گوشت کھایا جاتا ہے آٹھ قسمیں پیدا کی ہیں، بھیڑ میں سے دو قسم
نر اور مادہ اور بکری کی دو قسمیں نر و مادہ، اے پیغمبر ان لوگوں سے
دریافت کرو خدا نے ان جانوروں میں سے کس جانور کو حرام کیا ہے؟
دونوں قسم کے نروں کو یا مادہ کو یا پھر اس بچہ کو جسے دونوں قسم کی
مادہ اپنے پیٹ میں لیے ہوتے ہے اگر تم سچے ہو تو مجھے علم کے
ساتھ بتاؤ[۱۸۷]۔ اور دیکھو اسی طرح اونٹ میں سے دو قسمیں ہیں اور
گائے میں سے دو قسمیں ہیں تم ان سے پوچھو کیا ان میں سے نر کو
حرام کر دیا ہے یا مادہ کو یا اس کو جو دونوں کی مادہ اپنے پیٹ میں
لیے ہوتی ہے کیا تم اس وقت حاضر تھے جب خدا نے اس بارے
میں حکم دیا تھا بتاؤ تو اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو گا جو خدا پر
افتراء پردازی کرے تا کہ لوگوں کو بغیر علم کے گمراہ کرے، بلاشبہ

اللہ ظلم کار لوگوں کے لیے ہدایت کا سامان نہیں کرتا ہے۔ ۱۸۸

معانی مفردات

انشا، انشا سے ماضی ہے مادہ نشأ ہے۔ اس کے معنے نشو ونما دینا اور تربیت کرنا ہیں۔ ایسی تمام چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کی تربیت اور نشو ونما ہیں تدریج ہو جیسے باغات، بادل، علم و فن کی کتابیں۔ اسی سے مضمون نگاری کو انشا کہتے ہیں۔ جنات، جنت کی جمع ہے جن سے مشتق ہے درختوں والا ہر وہ باغ جس کے درخت زمین کو چھپالیں جنت کہلاتا ہے۔ جنت کو جنت یا تو دنیوی باغات سے تشبیہہ دے کر کہا گیا، اگرچہ دونوں میں یوں بعید ہے۔ معروشات، عرش مصدر سے اسم مفعول کی جمع مونث ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں عرش اصل میں مسقف چیز کو کہتے ہیں اور اس کی جمع عروش آتی ہے۔ ارشاد ہے وھی خاویۃ علیٰ عروشہا اور اسی سے عرشت الکرم کے معنے انگور کی بیلوں کے لیے ٹٹیاں اور چھتریاں لگانے کے آتے ہیں۔ معروشات اسی سے ہے۔ حصاد، یہ مصدر ہے اس کا باب نصر ہے اس کے معنے کھیتی کاٹنے کے ہیں لیکن اس میں باغات میں پھلوں کا چننا بھی داخل ہے۔ حمولۃ، حمل مصدر ہے اس کے معنے بوجھ اٹھانے والا چوپایہ، یہ صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ فرشا، وہ جانور جو ذبح کے وقت لٹاتے جاتے ہیں۔ بعض حمولہ بڑے جانور کو اور فرش چھوٹے چھوٹے جانوروں کو کہتے ہیں۔ ازواج، زوج کی جمع ہے، جوڑا، قسم قسم، طرح طرح، المصباح المنیر میں ہے زوج وہ شکل ہے جس کی کوئی نظیر ہو جیسے اصناف والوان، یعنی مختلف قسمیں اور رنگ اور یا اس کی کوئی نقیض ہو جیسے خشک و تر، نر و مادہ، شب و روز، شیریں و تلخ۔ ابن درید کہتے ہیں زوج ہر دو کو کہتے ہیں فرد کی ضد ہے۔ الضان، بھیڑ، دنبہ جس پر اون ہوتی ہے ضائن کی جمع ہے جیسے رکب راکب کی، ضائن، میش نر یعنی نر دنبہ یا نر بھیڑ کو کہتے ہیں جو معز کی ضد ہے یعنی بکری کی۔

مشرکانہ میلانات کی تردید

دور سے شرک فی العبادت اور شرک فی الطاعت کی تردید ہو رہی ہے اور اسی پر بھرپور تبصرہ ہو رہا ہے اور بتایا ہے کہ یہ ساری باتیں انتہائی جہالت اور حماقت کی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ خدا نے نباتات و حیوانات میں سے جتنی اچھی چیزیں پیدا کی ہیں سب انسان کے استعمال کے لیے ہیں۔ قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ جو کچھ بھی تمہارے سامنے ہے سب کچھ تمہارا ہے اسی لیے کہ جس حد تک اپنی اکتسابی قوتوں کو بیدار کر کے تم ان سے استفادہ کرنا چاہو استفادہ کر سکتے ہو۔ ان سے فائدہ اٹھاؤ، خدا کا شکر ادا کرو۔ قرآن کے اس رجائی صلائے عام اور حوصلہ پرور ندائے دوام سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس افسردہ قنوطی پیغام میں کوئی ادنیٰ مناسبت بھی ہو سکتی ہے جس میں انسان کو باور کرایا جاتا ہے کہ جو کچھ تمہارے سامنے ہے اس میں کچھ بھی تمہارا نہیں انسانیت کا کمالی ارتقاء اسی گریز و فرار کے ساتھ وابستہ ہے جو دنیا میں خدا کی پیدا کی ہوئی نعمتوں کے متعلق اختیار کیا جائے۔ کتنوں پر کھانے بند کیے گئے، ان کے منہ سے لقمے چھینے گئے۔ جانداروں سے محروم کیا گیا۔ زمین کی پیداوار اور مال مویشی پر قدغن قائم کی گئی ہے۔ قرآن بتا رہا ہے کہ یہ باغ اور کھیت اور یہ جانور جو تم کو حاصل ہیں یہ سب اللہ کے بخشے ہوئے ہیں۔ کسی دوسرے کا اس دین میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس لیے بخشش کے شکریے میں بھی کسی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ پھر یہ کہ جب یہ سب کچھ اللہ کا عطا کردہ ہے تو ان کے استعمال میں اللہ ہی کے حکم کی پیروی ہونی چاہیے کسی دوسرے کو حق نہیں پہنچتا کہ ان کے استعمال پر اپنی طرف سے کوئی پابندی لگائے اور اس کے لیے حدود مقرر کرے۔ اللہ کے سوا کسی اور کی مقرر کردہ رسموں اور قوانین کی پابندی کرنا اور اللہ کے سوا کسی اور کے آگے شکرِ نعمت کی نذر پیش کرنا اور اللہ کے سوا اور کے آگے شکرِ نعمت کی نذر پیش کرنا حد سے گزرنا ہے۔ اور یہی شیطان کی پیروی ہے۔ مزید برآں یہ کہ یہ سب چیزیں اللہ نے انسان کے کھانے کے لیے اور استعمال کے لیے پیدا کی ہیں اس لیے پیدا نہیں کی ہیں کہ ان کو خواہ مخواہ حرام کر لیا جائے اپنے اوہام اور خیالات کی بنا پر جو پابندیاں لوگوں نے خدا کے رزق اور اس کی بخشی ہوئی چیزوں کے استعمال پر عائد کر لی ہیں وہ سب منشائے الٰہی کے خلاف ہیں۔

۱۸۳۔ اور دیکھو وہ خدا ہی ہے جس نے باغ پیدا کیے ہیں۔ ٹٹیوں پر چڑھائے ہوئے اور بغیر ٹٹیوں پر چڑھائے ہوئے۔ جو ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں مثلاً انگور وغیرہ اور جو ایسے نہیں مثلاً کھجور، آم وغیرہ تنہ دار درخت یا خربوزہ، تربوز وغیرہ جن کی بیل بغیر کسی سہارے کے زمین پر پھیلتی

ہے لے اس آیت میں وھوالذی انشاء کے زور پر غور کرو، انسان کتنا ہی غافل ہو جاتے اور کتنا ہی اعراض کرے لیکن حق کی وسعت اور ہمہ گیری کا عالم یہ ہے کہ کسی حال میں بھی اس سے اوجھل نہیں ہو سکتیں ایک انسان تمام دُنیا کی طرف سے آنکھیں بند کرلے لیکن بہرحال اپنے شب و روز کے مشاہدے کی طرف سے آنکھیں نہیں بند کر سکتا جو باغات اس کے سامنے ہیں ان پر نظر ڈالے یہ کیا ہیں۔ ایک انگور کا دانہ اپنے ہاتھ میں لے لو اور اس کی پیدائش سے لے کر اس کی پختگی و تکمیل تک کے تمام احوال وظروف پر غور کرو کیا یہ وجود میں آسکتا تھا، اگر تمام کارخانۂ ہستی اس کی بناوٹ میں سرگرم نہ ہوتا، اگر دُنیا میں یہ نظام موجود ہے تو کیا یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ کے علاوہ یا اللہ کے ساتھ کوئی اور ربوبیت رکھنے والے شرکاء موجود ہوں۔ جب یہ باغات پیدا کیے ہوئے تو خدا کے ہیں تو ان میں تم نے دوسرے دیویوں اور دیوتاؤں کو کیوں شریک بنا رکھا ہے۔ جنات کہنے کے بعد خاص طور پر معروشات اور غیر معروشات کہہ کر انگور کے باغوں کا ذکر اور اس عموم کے ساتھ کہ کچھ انگور وہ ہیں جن کی بیلیں ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو ٹٹیوں پر نہیں چڑھائی جاتی ہیں بلکہ زمین پر پھیلتی ہیں۔ کچھ انگوروں کی بہتات بتانے کے لیے کیا ہے۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ مشہور صحابی حضرت عمرو بن العاص فاتح مصر کا طائف میں وہط نامی تاکستان تھا اس میں انگور کی بیلوں کے دس لاکھ ڈنڈے تھے جن پر بیلیں چڑھی ہوتی تھیں اور امیر شکیب ارسلان ہی نے حاضر العالم الاسلامی میں نقل کیا ہے کہ جب طرابلس فتح ہوا اور جبل اخضر پر حضرت عمرو بن العاص کی نظر پڑی تو فرمایا وہط میں باغبانی کا انتظام کرچکا ہوں ورنہ یہاں باغبانی کرتا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں انگوروں کا کیا حال تھا۔ یہ تو طائف کا ذکر ہے اسی حجاز میں خیبر بھی ہے آج بھی جن لوگوں نے اس کا معائنہ کیا ہے لکھا ہے کہ بہتی ہوئی سات ندیاں اور نخلستانوں کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے وادی القریٰ کا بھی یہی حال ہے اور اگر غیر معروشات سے انگور کے علاوہ دوسری بیلیں مراد ہوں، مثلاً خربوزے، تربوز، ککڑیاں، کھیرے وغیرہ تو اس میں سبزیاں بھی داخل ہو جائیں گی۔ قرآن میں سورہ عبس میں ان دونوں کا یکجا ذکر بھی آیا ہے عنباً و قضباً" انگور میں چونکہ تینوں صلاحیتیں موجود ہیں، میوہ بھی ہے غذا بھی ہے اور پینے کے لیے فرحت زا مشروب بھی ہے۔ خود قرآن میں انگور کے بارے میں اس کی تصریح ہے۔

لے افادات شیخ الاسلام

باغوں اور کھیتوں کی بوقلمونی

۱۸۴۔ اور کھجور اور کھیتیاں جن کے پھل مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ نیز زیتون اور انار صورت و شکل میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور ایک دوسرے سے مختلف۔ یعنی صورت و شکل میں ملتے جلتے مزہ میں جدا جدا [1]

انگوروں کے بعد پہلے کھجوروں کا ذکر ہے، کھجور کے بعد زرعی پیداوار کا اور زیتون اور انار کا، کھجور بھی انگوروں کی طرح باغات سے تعلق رکھتی ہے لیکن ان باغات سے تعلق رکھتی ہے جو تنے والے ہوتے ہیں۔ انگور ہو یا کھجور اور زیتون ہو یا انار اور یا پھر کھیتیاں ہوں۔ ان کی گوناگونی اور بوقلمونی ان کی پیداوار کے تنوع اور ان کے انواع و اقسام کے اختلاف کو یہاں خاص طور پر نمایاں کیا ہے جس سے مقصود یہ جتانا ہے کہ جس نے یہ سب کچھ پیدا کیا ہے وہ بڑا ہی کریم و فیاض اور مہربان و سخی ہے۔ اس نے بندوں میں رزق کی احتیاج رکھی ہے۔ احتیاج کے پورا کرنے کے لیے قسم قسم کی نعمتوں کے انبار لگا دیے، باغ اگاتے تو گوناگوں اقسام کے غلے پیدا کیے تو بے شمار اقسام کے زیتون وانار اور دوسرے پھل پیدا کیے تو طرح طرح کے انواع کے۔ سوچنے کی بات ہے کہ زندگی باقی رکھنے کے لیے تو یہ تنوعات یہ بوقلمونیاں ناگزیر نہ تھیں لیکن اللہ سبحانہٗ نے بغیر اس کے کہ اس کی کوئی ضرورت ہم سے وابستہ ہو ہمارے لیے اتنا وسیع دسترخوان بچھایا کہ ہم اس کے لذائذ کے انواع و اقسام گننا چاہیں تو گن نہیں سکتے یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ انسان یہ جانے کہ وہ اس کا شکر گزار بنے۔ شکر گزاری کا یہی احساس اللہ کی عبادت اور طاعت کی بنیاد ہے۔

قرآن اور زراعت و باغبانی

یہاں خصوصی طور پر باغات اور زراعت کا ذکر کیا ہے حالانکہ قرآن نے اپنے خطاب کا آغاز جس قوم اور ملک سے شروع کیا ہے خصوصاً قریش مکہ، ظاہر ہے کہ ان کا ماحول زراعت وغیرہ سے گویا بے تعلق تھا اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سوچتا ہوں کہ قرآن اس راہ سے مسلمانوں میں انسانی معاش کے ان دو بابوں باغبانی اور زراعت سے ایک گونہ زیادہ مناسبت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ باغبانی و زراعت پر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اسلام کا کتنا زور ہے۔ وہ اس کی اہمیت پر کس حد تک کتنا اصرار کرنا چاہتا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ باغبانی اور زراعت کا ذکر کرنے کے بعد اس پر یہ حکم مرتب کیا ہے کلوا من ثمرہ اذا اثمر و آتوا حقہ یوم حصادہ اس کے پیداوار کو استعمال کرو اور کٹائی کے دن اس کا حق ادا کرو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے اسی اشارے سے متاثر ہو کر فرمایا ہے۔

اگر قیامت بھی قائم ہو جاتے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں کوئی پودا ہو اگر اس کے بس میں ہو کر کھڑا نہ ہو جب تک اس کو لگائے تو چاہیے کہ اس پودے کو لگا دے۔ (کنز العمال بحوالہ مسند احمد)

یہ تو حضرت عائشہ کی روایت ہے اور خالص باغبانی کے متعلق ہے لیکن اس موضوع پر صرف یہی ایک روایت نہیں بلکہ تقریباً مشہور و مستفیض روایتوں کی صورت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات بھی ہیں جن میں آپ نے صرف کاشتکاری اور باغبانی کو نہیں جس سے کاشتکار اور باغبان کو فائدہ ہو رہا ہے بلکہ اس میں جس سے وہ نفع اندوز بھی نہ ہو اس کے متعلق بھی مختلف پیرایوں میں آخرت کے ثواب کی بشارت سناتے ہوئے فرمایا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے نہیں ہے کوئی مسلمان جس نے کھیتی کی ہو یا درخت لگایا ہو پھر اس کھیتی یا درخت سے پرند کھائے یا آدمی یا جانور مگر یہ کہ ہوگا وہ اس کی طرف سے صدقہ۔ (صحیح بخاری)

وجہ ظاہر ہے کہ اس کھیت یا باغ لگانے والوں کو اگر نفع نہ پہنچا تو کیا ہوا اس نے تو اپنا فرض ادا کر دیا اور جس نے خدا کے فرض کو ادا کیا وہ ثواب کا ضرور مستحق ہے۔ اسی ارشاد میں یہ بھی اشارہ ہے کہ کاشتکار اور باغبان نے خدا کی دی ہوئی قوتوں سے کام لے کر اس چیز کو جو معدوم تھی وجود کے لباس میں جلوہ گر ہونے کا موقع دیا۔ اس سے اگر فرد کو نفع اٹھانے کا موقع نہیں ملا تو نہ ملے لیکن جماعت کی خدمت کا فرض تو وہ بجالایا اور جماعت ہی نہیں بلکہ خدا کی دوسری مخلوقات مثلاً پرند چرند اگر اس سے مستفید ہوتے تو قصداً نہ سہی ضمناً اپنے وجود اور توانائیوں کو اس نے مفید ثابت کیا اور قرآن یہی چاہتا ہے کہ خدا کی عطا کی ہوئی قوتوں کو بیکار اور ضائع ہونے سے بچایا جائے۔ بات طویل ہو جاتے گی مگر زبان قلم پر آگئی کہے دیتا ہوں۔ مشہور صوفی و بزرگ شیخ ابو المکارم علاء الدولہ سمنانی رحہ جو تصوف اور حقائق کے ایک خاص مکتب خیال کے پیشوا ہیں۔ مولانا جامی نے نفحات الانس میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ،

حق تعالیٰ نے زمین اور کھیتوں کو حکمت سے پیدا کیا ہے اور خدا چاہتا ہے کہ یہ زمین آباد رہے اور اس سے مخلوق کو نفع پہنچے ۔ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ زمین کی آباد کاری جس سے فائدہ اور آمدنی مقصود ہو۔ اس میں کتنا ثواب ہے اگر لوگوں کو اس کا صحیح علم ہو جائے تو ہرگز زمین کی آباد کاری نہ چھوڑیں ۔

اور فرماتے ہیں :

اسی طرح اگر لوگوں کو پتہ ہو جاتے کہ آباد کاری کا کام چھوڑنے اور زمین کے بیکار پڑا رہنے میں کتنا گناہ ہے تو ہرگز وہ یہ نہ کریں کہ آبادی کے جو ذرائع ہیں ان کو چھوڑ دیں ۔

اس کے بعد تمثیل سے اس قرآنی نظریہ کی تشریح باین الفاظ کرتے ہیں :-

جو کوئی زمین کا ایک ایسا قطعہ رکھتا ہے کہ اس سے ہزار من غلہ سالانہ حاصل ہو سکتا ہے ۔ اگر اس کی کوتاہی اور کاہلی و سستی سے تو سو من غلہ اس زمین سے حاصل ہوا اور اس کی وجہ سے سو من غلہ سے مخلوق محروم ہو گئی تو قیامت کے روز اس کاشتکار سے سو من غلہ کے بارے میں باز پرس ہو گی ۔ (نفحات الانس)

یہ اسلام ہی ہے کہ ثواب آخرت کو حصول دنیا اور معاشی کاروبار کی گرم بازاری کے لیے استعمال کرتا ہے اور بغیر کسی دغدغہ کے یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کی خلاف ورزی کرنے والوں بلکہ دنیا کے کاروبار میں پوری توجہ اور انہماک سے نہ کام کرنے والوں کو باز پرس کی دھمکی دے رہا ہے ۔

آج پاکستان کے ان کاشتکاروں کو جنہوں نے محض اپنی قدامت پرستی کے تحت کشاورزی کے جدید آلات اور طریقوں کو ترک کر کے اس ملک کی پیداوار کو تقریباً سارے جہان کی پیداوار کے مقابلے میں انتہائی پستی کی حالت میں ڈال رکھا ہے ۔ یورپ اور امریکہ کے کسان زمین کے جس رقبہ سے سو سو من غلہ نکال لیتے ہیں پاکستانی کسان اپنے باپ دادوں کے تقلیدی آسیب کا مارا ہوا اسی رقبہ سے بمشکل دس من غلہ نکالنے میں دشواری محسوس کرتا ہے ۔ اسلام کے سوا کون سا دین ہے جو پاکستانی کسانوں کے اس طرز عمل کو مذہبی گناہ اور دینی جرم بتا کر ان کی عملی قوتوں میں بیداری پیدا کر سکتا ہے ۔

قرآن نے زمین کی آباد کاری کو بھی ان فرائض میں داخل کیا ہے جن کی بجا آوری پر جنت کی آبادی کے وعدے کیے گئے ۔ آخرت کو آباد کرنے کے لیے دنیا کو آباد کرو ۔ اس کی دعوت قرآن کے سوا کس نے دی ہے ۔ اپنی توانائیوں کو تعطل اور بے کاری سے مفلوج کر کے فقیرانہ زندگی بسر کرنے والے خدا جانے کیا سوچتے ہیں لیکن اسلام کی پکار تو وہی ہے جسے شیخ سمنانی نے

ان الفاظ میں پیش کیا ہے :-

جو شخص اپنی کاہلی سے زمین کی آبادکاری چھوڑ بیٹھے اور اس کا نام ترکِ دُنیا اور زُہد رکھے تو یہ شیطان کی پیروی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اور قرآنی حکم سے اعراض کرکے جو دوسری مخالف راہ اختیار کرے گا اگر وہ شیطان کی پیروی نہیں تو اور کیا ہے۔

پیداوار کی زکوٰۃ

۱۸۵۔ سو غذا کی اس پیداوار کو شوق سے کھاؤ جب اس میں پھل لگ جائیں اور چاہیے کہ جس روز فصل کاٹو اس کا حق بھی دے دو اور اسراف نہ کرو خدا انہیں دوست نہیں رکھتا جو اسراف کرنے والے ہیں۔ یعنی جو غلّے اور پھل حق تعالیٰ نے پیدا فرماتے ہیں ان کے کھانے سے بدون سند کے زرکو ہاں دو باتوں کا خیال رکھو، ایک یہ کہ کاٹنے اور اتارنے کے ساتھ ہی جو اللہ کا حق ہے وہ ادا کردو، دوسرے فضول اور بے موقع خرچ مت کرو۔ اللہ کے حق سے کیا مراد ہے۔ اس میں علمائے سلف کے مختلف اقوال ہیں۔ ابن کثیر کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابتداءً مکہ معظمہ میں کھیتی اور باغ کی پیداوار میں سے کچھ حصہ نکالنا واجب تھا جو مساکین و فقراء پر تقسیم کیا جاتے۔ مدینہ طیبہ پہنچ کر ۲ سنہ ہجری میں اس کی مقدار وغیرہ کی تعیین و تفصیل کردی گئی یعنی بارانی زمین کی پیداوار میں بشرطیکہ خراجی نہ ہو دسواں حصہ اور جس میں پانی دیا جائے بیسواں حصہ واجب ہے۔[1]

اس میں تین اہم باتوں پر زور دیا گیا ہے ایک یہ کہ جو کچھ پیداوار ہو اسے بغیر خطرے کے اپنے استعمال میں لاؤ، دوسرے یہ کہ پیداوار میں فصل کاٹنے اور باغات کا پھل حاصل کرنے کے وقت اللہ کا حق ادا کرو۔ تیسری یہ کہ حد سے نہ گزرو حد سے گزر جانے والے اللہ کو پسند نہیں ہیں، چونکہ تینوں باتیں اپنی جگہ خصوصی اہمیت رکھتی ہیں اس لیے ضروری ہے کہ تینوں پر الگ الگ تبصرہ کیا جائے۔

پیداوار کو استعمال کرنے کے لیے اصل میں تعبیر یہ اختیار کی ہے کہ کلوا من ثمرہ کھاؤ ان کی پیداوار کو، اگرچہ بتانے والوں نے یہی بتایا ہے کہ یہاں امر اباحت کے لیے ہے اور ہے بھی یہ حقیقت لیکن سوال یہ ہے کہ ایک مباح کام کے لیے یہ ایجابی اندازِ تعبیر کیوں اختیار کیا گیا ہے۔ بتانا صرف یہ ہے کہ

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام کرے۔ کیونکہ تحریم صرف اللہ سبحانہ کا قانونی حق ہے۔ اگر کوئی اس خدائی حق کو اپنے لیے استعمال کرتا ہے وہ اپنے کو خدا کے قانونی حق میں شریک گردان رہا ہے اور جو شخص خدا کے علاوہ کسی اور کے لیے حق تسلیم کرکے اس کی اطاعت کرتا ہے وہ شرک فی الطاعت کا سنگین جرم کر رہا ہے۔ یاد رہے کہ گفتگو صرف تعبدی قانون میں ہے اگر کوئی شخص آپ کو گوشت کھانے سے تعبداً روکتا ہے تو یہ شخص شرک فی الحکم کر رہا ہے۔ اور اگر آپ اس کی طاعت کرتے ہیں تو یہ مشرکانہ طاعت ہے۔ اس سے یہ بات بھی خود نکل آئی کہ اگر آپ کو ڈاکٹر نے بیماری کی وجہ سے پھل کھانے سے روک دیا یا اگر سرکار نے ہیضہ کے اندیشے سے پھلوں پر پابندی لگادی تو یہ ہرگز ہرگز وہ تحریم نہیں ہے جس میں اشراک کی روح کارفرما ہو۔ یہ تحریم تشریعی نہیں بلکہ یہ صیانتہ مصالح اور درء مفاسد کے قبیل سے ہے۔ ایسے ہی اگر سرکار کسی وقت لوگوں کے مصالح کے پیشِ نظر خاص حالات میں پرندوں کے شکار پر پابندی عائد کردے تو یہ تحریم شرعی نہیں ہے۔

دوسری بات کہ پھل کاٹنے کے وقت اللہ کا حق ادا کرو۔ اگرچہ اذا اثمر اس سے پہلے کلوا کے بعد آیا ہے لیکن اس کا تعلق کلوا اور اتوا حقہ، دونوں سے ہے یعنی جس طرح پیداوار سے انتفاع منحصر ہے پیداوار حاصل ہونے پر ایسے ہی اس کے حق شرعی کی ادائیگی واجب ہے اس کے پیدا ہونے اور کھیت سے کھلیان تک پہنچنے پر۔ اس آیت میں حقہ، کی ضمیر کا مرجع اللہ بھی ہو سکتا ہے اور پھل بھی دونوں صورتوں میں فرق کوئی نہ ہوگا۔ اس حق سے کیا مراد ہے؟ عبداللہ ابن عباس، جابر بن زید، محمد بن الحنفیہ، الحسن البصری، سعید بن المسیب، طاؤس، زید بن اسلم، قتادہ اور ضحاک کہتے ہیں کہ اس حق سے مراد پیداوار کی زکوٰۃ ہے۔ اور کچھ کی رائے میں اس حق سے مراد عام صدقہ ہے اور پیداوار کی حدیث سے یہ آیت منسوخ ہے۔ اس پر تو اتفاق ہے کہ پیداوار میں زکوٰۃ ہے لیکن اختلاف اس میں ہے کہ اس آیت سے ثابت ہے یا ارشادِ نبوت سے۔ جو لوگ ارشادِ نبوت سے پیداوار کی زکات کو ثابت کرتے ہیں وہ اسے منسوخ کہتے ہیں اور شاید یہ کشمکش اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ سورہ انعام مکی ہے اور زکوٰۃ کی قانونی تشکیل مدینے میں ہوتی ہے۔ حافظ ابن کثیر کی یہ بات واقعی جی کو لگتی ہے کہ حکم مکی زندگی میں ہوا ہے اور مقدار کی قانونی تشکیل مدینے میں ہوتی ہے آخر زکوٰۃ کی فرضیت بھی تو مکی زندگی میں ہوئی تھی۔ بعثت کے پانچویں سال جب حضرت جعفر وغیرہ ہجرت کرکے حبشہ گئے تھے۔ اور نجاشی نے اپنے دربار میں بلاکر ان سے اسلام کی حقیقت دریافت کی ہے اور حضرت جعفر نے اس کے جواب میں جو تقریر کی ہے اس میں ہے کہ اور وہ پیغمبر ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھیں روزے رکھیں، زکوٰۃ دیں[1] اس سے معلوم ہوا کہ عام زکوٰۃ یا مالی خیرات کا آغاز اسلام کی ابتداء ہی میں ہو

[1] مسند احمد

چکا تھا۔ اور وفد عبدالقیس جو تقریباً ۵ھ میں آیا تھا اس کے سوال کے جواب میں آپ نے جن احکام کی تعلیم دی ان میں ایک زکوٰۃ بھی تھی[1]۔ ۶ھ میں جب نجاشی نے نامہ مبارک پہنچنے کے بعد ابوسفیان سے جو اس وقت تک کافر تھے اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو انہوں نے دوسری چیزوں کے ساتھ زکوٰۃ اور صدقہ کا بھی تذکرہ کیا[2]۔ ان واقعات سے بخوبی واضح ہے کہ ۲ھ سے پہلے بلکہ ہجرت سے پہلے بھی بعثت کے بعد ہی نماز کے ساتھ زکوٰۃ کی تعلیم بھی موجود تھی۔ لیکن چونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تعلیم صرف نظریات کا پیش کرنا نہ تھا بلکہ اُمت کو عملاً اسلام کی تعلیمات پر کاربند کرنا بھی تھا۔ اس لیے حالات کے اقتضا اور مناسبت کے ساتھ ساتھ تعلیمات کے تفصیلی اجزاء اور ان کے متعلقہ احکام کی تشریح آہستہ آہستہ تکمیل کو پہنچائی گئی۔ مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کی پریشانی پراگندگی، شکستہ حالی اور غربت و مسکینی کی جو کیفیت تھی اس کی بنا پر اتنا ہی ان کے لیے کافی تھا کہ وہ کسی یتیم و مسکین اور بھوکے کو کھانا کھلائیں۔ چنانچہ اس زمانہ میں اسی قسم کی تعلیم دی گئی۔

فک رقبۃ او اطعام فی یوم ذی مسغبۃ یتیماً ذا مقربۃ او مسکیناً ذا متربۃ

کسی قرض دار یا قیدی غلام کی گردن چھڑا دینا۔ بھوک کے دن میں رشتہ کے کسی یتیم بچے کو یا خاک میں پڑے ہوئے کسی محتاج کو کھانا کھلانا۔

مدینہ منورہ میں آکر جب مسلمانوں کو کسی قدر اطمینان ہوا اور انہوں نے اپنا کچھ کاروبار شروع کیا تو روزے کے ساتھ ساتھ ۲ھ میں صدقۃ الفطر واجب ہوا۔ اس کے بعد مسلمانوں کو صدقہ اور خیرات کی تاکید کی گئی۔ انہوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ ماذا ینفقون؟ کیا خیرات کریں، ارشاد ہوا العفو (تمہاری ضرورت سے جو کچھ زیادہ ہو)۔ یہ زکوٰۃ کی تعیین میں اسلام کا پہلا قدم ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار و نصاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کو حکم تھا کہ جو کچھ بچے وہ خدا کی راہ میں دے دو آئندہ کے لیے کچھ بچا کر نہ رکھیں۔ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی حالت اسی کی مقتضی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد جب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہوئیں زمینیں اور جاگیریں ہاتھ آئیں، تجارت کی آمدنی شروع ہوئی تو حکم ہوا۔

انفقوا من طیبات ما کسبتم ومما اخرجنا لکم من الارض

اپنی کمائی میں سے کچھ اچھی چیزیں اور جو کچھ تمہارے لیے زمین پیدا کرے اس میں سے کچھ خیرات کرو۔

---

[1] [2] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ

الجصاص کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے کہ جیسے اتوالزکوٰۃ مکی ہے اور مدینہ کی زندگی میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد فی مائتی درھم خمسۃ دراھم دوسو درہم میں پانچ درہم زکوٰۃ ہے۔ اتوالزکوٰۃ کے لیے بیان ہو کر آیا ہے ٹھیک اسی طرح اٰتوا حقہ یوم حصادہ مکی ہے اور مدینہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد:

فیما سقت السماء والعیون العشر و فیما سقی بالنضح نصف العشر

بارش اور چشمے سے سیراب ہونے والی زمینوں میں دسواں حصہ اور چرسہ وغیرہ سے سیراب ہونے والی زمینوں میں بیسواں حصہ ہے۔

اس کا بیان ہو کر آیا ہے۔ الجصاص نے آخر میں لکھا ہے کہ اس آیت میں حق سے مراد وہ عشر اور نصف عشر ہی ہے جو حضور انور کے بیان سے ثابت ہے اس لیے یہ آیت قرآنی مسلمانوں سے پیداوار کی زکوٰۃ کا مطالبہ کر رہی ہے اس لیے حافظ ابن کثیر کی یہ بات بالکل برمحل ہے کہ عشر کا وجوب تو مکہ میں ہو چکا تھا لیکن مدینے میں حضور انور نے اس کی تفصیل بیان فرمائی اس کی مقدار متعین کی اور یہ سب کچھ ۲ سنہ ہجری میں ہوا ان کے الفاظ یہ ہیں قد کان شیئاً واجبا فی الاصل ثم انہ فصل بیانہ و بین مقدار المخرج وکمیتہ قالوا کان ھذا فی السنۃ الثانیۃ من الھجرۃ۔

دراصل محنت اور سرمایہ سے خود دولت پیدا ہوتی ہے اس میں سب سے پہلی چیز اس کی پیداوار ہے تورات نے ہر قسم کی زمین کی پیداوار پر عشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا تھا۔ اسلام نے نہایت نکتہ سنجی سے سے پیداوار کی مختلف قسموں پر مختلف شرح زکوٰۃ کی تفصیل کی۔ سب سے پہلے پیداوار کے ان اصناف پر زکوٰۃ مقرر ہوئی جو کچھ زمانے تک محفوظ رہ سکتے ہیں تاکہ ان سے حسب منشا خانگی، تجارتی فائدہ اٹھایا جا سکے اور نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔ اسی طرح اس مالیت پر جس میں نشوونما اور ترقی کی صلاحیت نہیں مثلاً آلات، مکان، لباس، سامان، اسباب سواری ان پر زکوٰۃ نہیں رکھی گئی۔

کچھ دنوں تک رہنے والی اور نشوونما پانے والی چار چیزیں ہیں۔ پیداوار زمین جانور، سونا، چاندی یا ان کے سکے اور تجارتی مال، چنانچہ ان چاروں چیزوں پر زکوٰۃ مقرر ہوئی۔

زمین کی دو قسمیں کی گئیں ایک وہ جس کے جوتنے اور بونے کی محنت اور مزدوری کا خرچ گو کاشتکار کرتا ہے مگر موسمی اور اقلیمی خصوصیت کی وجہ سے ان کے سیراب کرنے میں کاشتکار کی کسی بڑی محنت اور مزدوری کو دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ بارش یا نہر کے پانی یا زمین کی نمی اور شبنم سے آپ سیراب ہوتی ہے اس پر بلا محنت والی اتفاقی دولت سے آدھی زکوٰۃ یعنی عشر مقرر کیا گیا یعنی مال غنیمت کے مقابلہ میں

اور دفینہ کے مقابلہ میں جو کسی کو بلا محنت اتفاقاً مل جاتا ہے اس میں پانچواں حصہ زکوٰۃ ہے۔

زمین کی دوسری قسم یعنی وہ جس کی سیرابی کاشتکار کی خاصی محنت اور مزدوری سے ہو مثلاً کنویں سے پانی نکال کر لانا یا نہر بنا کر پانی لانا تو اس میں قسم اول سے بھی نصف یعنی بیسواں حصہ مقرر ہوا۔ نقدی سرمایہ میں جس کی ترقی و حفاظت، نشوونما اور افزائش میں انسان کو شب و روز سخت محنت کرنی پڑتی ہے اور جس کی افزائش کے لیے بڑے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے اور جس میں ہر قدم پر چوری، گم شدگی، لوٹ اور نقصان کا اندیشہ رہتا ہے۔ زمین کی دوسری قسم کا بھی آدھا یعنی چالیسواں حصہ مقرر ہوا۔

زمینی پیداوار اور نقد سرمائے میں شرح زکوٰۃ کی کمی بیشی کی ایک دقیق اقتصادی علت اور بھی ہے انسان کی اصلی ضرورت جس پر اس کا چلنا منحصر ہے صرف غذا ہے۔ زمین کے مالکوں کو یہ چیز براہ راست خود اپنی محنت سے حاصل ہوتی ہے اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے وہ بے پروا ہو جاتے ہیں۔ لیکن سونے اور چاندی کے مالکوں اور تاجروں کی جو دولت ہے وہ براہِ راست ان کی زندگی کی اصل ضرورت میں کام نہیں آتی بلکہ مبادلہ اور خرید و فروخت کے ذریعہ سے وہ اس کو حاصل کرتے ہیں۔ وہ کاشت کاروں کی پیداوار کو خرید کر ان کو نقد روپیہ دیتے ہیں جس سے ان کی دوسری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ پھر وہ اس پیداوار کو لے کر گاؤں گاؤں، شہر شہر اور ملک بملک پھرتے ہیں اور اس کی بھی اجرت ادا کرتے ہیں۔ نیز جو محنت زمین کی پیداوار حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہے اس سے بدرجہا زیادہ نقد کے حصول میں صرف کرنی پڑتی ہے۔ سونا چاندی صدیوں کے فطری انقلابات کے بعد کہیں پیدا ہوتی ہے اور غلہ سال اور سال کی ہر فصل میں انسان کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے سونا چاندی کی قیمت کا معیار غلہ سے گراں تر ہے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ کاشت کار اور زمینوں کے مالک عموماً دیہاتوں میں رہتے ہیں اور شہروں سے دور ہوتے ہیں۔ نیز وہ عموماً سونا چاندی اور سکوں سے بھی محروم رہتے ہیں اس لیے نسبتہً وہ قومی ضروریات دین کی مالی خدمات اور مستحقین کی امداد میں اس خیرات کی گرفت سے آزاد رہتے ہیں جن کو عموماً نقد صورت میں دولت کے مالک اور تاجر پورا کیا کرتے ہیں اس وجہ سے بھی سخت ضرورت تھی کہ ان کے لیے قانونِ خیرات کی شرح اہل زمین سے مختلف رکھی جاتے۔

بہرحال اسلام میں عشر اور نصف عشر زمینی پیداوار کا نصاب زکوٰۃ ہے اور عشر یعنی پیداوار کا دسواں حصہ مسلمانوں کی اس زمین سے لیا جائے گا۔ جو بارش کے پانی سے سیراب ہوتی ہوں یا جن کی سینچائی تالاب، چشمہ، دریا، نہر کے ذریعہ اس طور پر کی گئی ہو کہ کاشت کار کو اس پر نہ تو قابلِ

لحاظ مصارف اٹھانے پڑتے ہوں اور نہ کوئی خاص محنت کرنی پڑی ہو مثلاً صرف اسے اتنا کرنا پڑا ہو کہ دریا یا نہر سے ایک گول کے ذریعے پانی اپنے کھیت میں لے آئے۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں جب آبپاشی کے لیے نہریں تعمیر کرائی گئیں تو ان سے پانی حاصل کرنے پر کوئی محصول علیحدہ وصول کیا گیا اس لیے ایسی نہروں سے سینچی جانے والی زمینوں کی پیداوار پر بھی عشر عاید کیا گیا۔ ان تمام صورتوں میں پیداوار کی زکوٰۃ کل پیداوار کا دسواں حصہ ہوگی اور یہ زکوٰۃ فصل کٹنے پر وصول کی جائے گی کیونکہ قرآن کی آیت وآتوا حقه یوم حصاده میں حق کا اصل تعلق پیداوار سے ہے نہ کہ زمین سے۔

اور جب پیداکنندہ نے زمین کو اپنی محنت سے سینچا ہو تو زکوٰۃ کی شرح ۵ فی صد ہوگی۔ یعنی کل پیداوار کا بیسواں حصہ نصف عشر وصول کیا جاتے۔ کنویں سے پانی کھینچ کر سینچائی کرنے یا اپنے مصارف سے ٹیوب ویل تعمیر کر کے سینچائی کرنے کی شکل میں نصف عشر واجب ہوگا۔ قیاس چاہتا ہے کہ اگر سینچائی نہر کے پانی سے ہوتی ہو اور کاشت کار نے اس کے حاصل کرنے کے لیے آبیانہ کے طور پر ایک قابل لحاظ رقم دی ہو تو اس سے بھی نصف عشر۔ مولانا محمد تقی ـــ نے اسلام کے زرعی نظام میں یہی رائے ظاہر کی ہے۔ ہماری رائے میں شریعت کے اصولوں اور عملی مصالح دونوں کے اعتبار سے بہتر یہ ہوگا کہ اسلامی ریاست سینچائی کے لیے نہریں تعمیر کرائے لیکن پانی کا محصول وصول نہ کرے۔ اگر ریاست آبیانہ وصول کرتی ہے تو اسے نصف عشر وصول کرنا چاہیے۔ اور اگر نہروں کا پانی مفت دیا جاتا ہو تو پیداوار کا دسواں حصہ وصول کرنا چاہیے۔

زرعی پیداوار کی زکوٰۃ سے متعلق مذکورہ بالا بنیادی امور سنت نبوی، خلفائے راشدین کے تعامل کی روشنی میں واضح طور پر ثابت ہیں اور ان پر تمام فقہا کا اتفاق ہے۔

اختلاف صرف تین باتوں میں ہے اور تینوں اپنی جگہ اہم ہیں، اول یہ کہ عشر ہر مسلمان کی پیداوار پر واجب ہے یا ان زمینوں کی پیداوار اس سے مستثنیٰ ہیں جو اصلاً خراجی ہیں۔ قانون میں زمین کو دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے ایک عشری اور دوسری خراجی۔ عشری زمینیں وہ ہیں جن کے مالک ان پر قابض رہتے ہوئے اسلام لاتے ہوں بغیر جنگ کے یا جن کو امام نے غنیمت میں حصہ کے طور پر کسی فرد کی ملکیت میں دیا ہو یا جو پہلے افتادہ رہی ہوں مگر اب احیاء کے ذریعے یا امام کے بطور جاگیر عطا کرنے پر کوئی شخص ان کا مالک ہوا ہو ان زمینوں کو عشری کہتے ہیں۔

خراجی زمینیں وہ ہیں جن کے غیر مسلم مالکوں سے صلح کرلی گئی ہو یا جن کو بزور قوت فتح کرنے کے بعد امام نے ان کے سابق مالکوں کے قبضہ میں رہنے دیا ہو ان زمینوں پر ان شرطوں کے مطابق

محصول وصول کیا جائے گا جو ازروئے معاہدہ طے پاتی ہوں یا جو سرکار نے مقرر کی ہو۔ یہ تفصیل کتاب الاموال ابی عبید اور کتاب الخراج قاضی ابویوسف میں موجود ہے، دوم یہ کہ زکوٰۃ ہر طرح کی پیداوار۔ غلہ جات پھل پھول، میوہ جات، سبزیاں کپاس وغیرہ پر واجب ہے یا کچھ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

سوم یہ کہ وجوب زکوٰۃ کے لیے زرعی پیداوار میں بھی کسی مقدار نصاب کا لحاظ کیا جائے جس سے کم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے یا زکوٰۃ بلا لحاظ مقدار پیداوار پر واجب ہے۔

آئیے ان تینوں پر تفصیلی تبصرہ بھی پڑھ لیجئے:۔

عشر ہر مسلمان کی پیداوار پر واجب ہے

یہ مسئلہ کہ عشر ہر مسلمان کی پیداوار میں واجب ہے قدرے اختلافی ہے۔ احناف کا مسلک اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ ابوبکر الجصاص رازی نے احکام القرآن کی جلد سوم میں بیان کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ عشر اور خراج جمع نہیں ہو سکتے۔ یہی امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف اور امام محمد اور امام زفر کا مسلک ہے۔ اس مسلک کی تائید الجصاص نے حضرت فاروق اعظم کے اس عمل سے کی ہے کہ عراقی زمینوں پر آپ نے خراج لگایا تھا اور پیداوار سے کوئی عشر نہیں لیا اور حضرت عمر نے یہ کام صحابہ کے مشورے سے کیا تھا۔ اس طرح اس میں ایک نوع کی اجماعی فیصلہ کی قوت رکھیے۔ اگر عشر و خراج دونوں کا اجماع جائز ہوتا تو حضرت عمر ایسے ضرور کرتے۔ اس لیے احناف کے یہاں یہ بات اصول کے طور پر تسلیم کر لی گئی لا یجتمع العشر والخراج عشر اور خراج جمع نہیں ہوتے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عشری زمین سے سرکار نے خراج لے لیا تو عشر کی ذمہ داری ختم ہو گئی بلکہ مطلب یہ ہے کہ خراجی زمین سے عشر نہ لیا جائے گا اور عشری زمین سے خراج نہ لیا جائے گا۔ اگر عشری زمین سے خراج لے لیا گیا تو عشر اپنی جگہ ہے وہ ہر حال میں دینا ہی پڑے گا۔ اس کے برعکس امام شافعی، امام مالک، امام احمد، امام اوزاعی، امام لیث اور امام ابو یعلیٰ کا مسلک یہ ہے کہ عشر اور نصف عشر ہر مسلمان کی پیداوار پر واجب ہے قطع نظر اس سے کہ اس کی زمین خراجی ہو یا عشری، جیسا کہ امام ابوعبید نے کتاب الاموال میں لکھا ہے۔ قرآن کی آیت اٰتوا حقہ یوم حصادہ کے عموم اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد فیما سقت السماء والعیون العشر وفیما سقی بالنضح نصف العشر کے عموم سے یہی ثابت ہے کہ ہر مسلمان کو اپنی زرعی پیداوار کی زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے۔ خلفائے راشدین اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اسی اصول پر عمل کیا ہے۔ اسی پر عمل میں

انتظامی سہولتیں بھی ہیں اور یہی قابل ترجیح ہے۔ اللہ سبحانہٗ اپنی رحمتوں کی برکھا برسائے حضرت مفتی محمد شفیع پر وہ یہ فرما کر پاکستان کے مسلمانوں کے لیے عشر کے مسئلہ کو حل فرما گئے۔

۱۔ غیر مسلموں کی متروکہ زمینیں جو حکومت پاکستان نے مسلم مہاجرین میں تقسیم کی ہیں یہ سب زمینیں عشری ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے خواہ ان کی حیثیت کچھ ہو کیونکہ بنابر پاکستان اور دونوں حکومتوں کے معاہدہ تبادلہ جائداد ختم ہو جانے کے بعد یہ سب اراضی بیت المال کے حکم میں داخل ہو کر حکومت کی تقسیم کے ذریعے مسلمانوں کی ملک ابتدائی بن گئیں اور مسلمانوں کی زمینوں میں پیداوار پر عشر ہی لگایا جانا چاہیے، اس لیے یہ سب پاکستانی زمینیں عشری ہیں۔

۲۔ ایسے ہی وہ زمینیں جو پاکستان بننے سے پہلے غیر آباد تھیں اور کسی کی شخصی ملکیت نہ تھیں انگریز حکومت نے ان میں آب رسانی کے ذرائع مہیا کر کے لوگوں میں مالکانہ انداز پر تقسیم کر دیں۔ ان میں جو زمینیں مسلمانوں کو ملی ہیں وہ عشری ہیں اور جو غیر مسلموں کو ملی ہیں وہ خراجی ہیں۔ اسی طرح جن زمینوں کی حکومت پاکستان نے پانی کی بہم رسانی کا سامان کر کے آباد کیا ہے۔ اور مسلمانوں کو دے دی ہیں۔ مثلاً پنجاب میں تھل کا علاقہ اور سندھ میں کوٹری کا علاقہ یہ سب عشری ہیں۔

۳۔ وہ زمینیں جو پاکستان بننے سے پہلے مسلمانوں کی ملک ہیں ان کے عشری ہونے کا مدار اس پر ہے کہ اگر یہ ثابت ہو جائے مثلاً کہ ہندوستان کی ابتدائی فتوحات میں یہ زمینیں کسی مسلمان کو مالکانہ طور پر دے دی گئی ہیں تو یہ بھی عشری ہیں۔ یہاں قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے حنفی ہونے کے باوجود بڑی اچھی اور فیصلہ کن بات ارشاد فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں:

> یہ آیت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ عشر واجب ہے ہر زمین کی پیداوار پر، کیونکہ آیت قرآنی مطلق ہے اس میں کسی قسم کی کوئی قید نہیں ہے۔ اگر مسلمان کسی خراجی زمین کا مالک ہوتا ہے تو دو ہی صورتیں ہیں اول یہ کہ اس سے خراج ختم ہو جائے اور عشر واجب ہو جائے یا یہ کہ دونوں جمع ہوں خراج زمین میں واجب اور عشر پیداوار میں ہو۔ یہ جمہور کا مذہب ہے کیونکہ خراج زمین کا ٹیکس ہے اور عشر پیداوار کی زکوٰۃ ہے نہ کہ زمین کی اسی لیے پیداوار میں نصاب شرط ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ خراج خراجی زمین سے کبھی ختم نہ ہو گا اور ایک زمین پر عشر اور خراج جمع نہیں ہوتے کیونکہ ان کے خیال میں عشر زمین کی زکوٰۃ ہے پیداوار کی نہیں ہے اسی لیے پیداوار میں ان کے خیال میں کوئی نصاب نہیں۔ خراج کے ساقط ہونے نہ ہونے کے موضوع کا عشر سے کوئی تعلق نہیں ہے باقی رہا

عشر و خراج کے جمع نہ ہونے کی بات تو امام ابوحنیفہ نے اس دعوے کی کوئی دلیل پیش نہیں فرمائی ہے باقی وہ حدیث جس کی ابن عدی نے کامل میں بحوالہ عبداللہ ابن مسعود تصریح کی ہے کہ حضور انور کا ارشاد ہے کہ مسلمان پر خراج اور عشر جمع نہیں ہوتا۔ یہ روایتی طور پر نہ صرف یہ کہ ثابت نہیں بلکہ باطل ہے۔ ابوحاتم کہتے ہیں کہ یہ ارشادِ نبوت نہیں ہے۔ اس کا واضع یحییٰ بن عینیہ واضع حدیث دجال ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نام سے جھوٹی احادیث بنانے میں مشہور ہے اور خود ابن عدی کا کہنا کہ سارے دفتر حدیث میں یحییٰ بن عینیہ کے سوا اس حدیث کو بیان کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ ارشادِ نبوت نہیں بلکہ ابراہیم نخعی کا قول ہے صاحب ہدایہ نے امام ابوحنیفہ کے موقف پر اجماع سے بھی استدلال کیا ہے لیکن اجماع کا دعویٰ صحیح نہیں ہے کیونکہ ابن المنذر نے عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے کہ انہوں نے عشر اور خراج دونوں وصول کیے ہیں اور معلوم ہے کہ عمر بن عبدالعزیز سے زیادہ فاروق اعظم پر چلنے والا کون ہے؟ اگر مسئلہ اجماعی ہوتا تو عمر بن عبدالعزیز کی نگاہوں سے ہرگز اوجھل نہ ہوتا۔

بہرحال اس موضوع پر قابلِ ترجیح رائے یہی ہے کہ عشر ہر مسلمان کی پیداوار پر واجب ہے خواہ اس کی زمین عشری ہو یا خراجی۔

کیا ہر قسم کی پیداوار پر عشر ہے؟

زکوٰۃ ہر قسم کی پیداوار پر واجب ہے یا کچھ پیداواریں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ احناف کے نزدیک گھانس پھونس اور نرکل کے سوا زمین سے پیدا ہونے والی تمام کارآمد چیزوں، غلے، جوٹ اور کپاس پھل پھول اور سبزیوں، گنے زعفران سب پر زکوٰۃ واجب ہے۔ قرآن کی آیت کا عموم اسی کا مقتضی ہے اور ارشادِ نبوت کے عموم کا بھی یہی مدلول ہے اور قرآن کی یہ آیت جس موقع و محل میں آئی ہے کہ پہلے جنات پھر معروشات وہ بیلیں جو ٹٹیوں پر چڑھتی ہیں جیسے انگور غیر معروشات وہ بیلیں جو زمین پر پھیلتی ہیں، اس میں کدو، خربوزے، کھیرے، تربوز، ککڑی اور ساری سبزیاں داخل ہیں۔ والنخل نخلستان، والزرع اس میں ہر قسم کی کھیتیاں داخل ہیں، زیتون رمان اور اس جیسے تمام پھل دار درخت۔ یہ فرمانے کے بعد ارشاد ہوا ہے "اتوا حقہ یوم حصادہ" تو سب کا حکم یہی ہے کہ ان میں عشر ہے۔ امام مالک کے نزدیک بھی قابل زکوٰۃ اجناس کی فہرست تقریباً اتنی

ہی طویل ہے۔ حنابلہ کے نزدیک ہر قابلِ ذخیرہ زرعی پیداوار قابلِ زکوٰۃ ہے لیکن شوافع کے نزدیک صرف وہ قابلِ ذخیرہ اجناس قابلِ زکوٰۃ ہیں جو غذائی اغراض کے لیے استعمال کی جاتی ہوں۔ اس کی پوری تفصیلات علامہ عبدالرحمان الجزیری نے الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں فراہم کردی ہیں۔

نصابِ زکوٰۃ کی تعیین

احناف کے نزدیک زرعی پیداوار کا کوئی نصاب نہیں ہے پیداوار کم ہو یا زیادہ اس میں سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی بقیہ سارے اماموں کے نزدیک زرعی پیداوار کا نصاب ۵ وسق ہے ایک وسق وہ بوجھ ہے جس کو عادۃً ایک اونٹ اٹھا سکتا ہو جو ہمارے وزن کے اعتبار سے تقریباً ۱۹ من کے برابر ہوتا ہے۔ اور ابن المنذر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ امام ابوحنیفہ کو چھوڑ کر پوری اُمت کا اجماع ہے کہ پیداوار میں ۵ وسق سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ الجصاص نے امام ابوحنیفہ سے جوابات بھی دیے ہیں لیکن قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اشتراط نصاب پر جمہور کے مذہب کی تائید میں بخاری و مسلم کی حدیث ابی سعید خدری کو بطور حجت پیش کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ پیداوار ہ وسق سے کم ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ احناف نے اس آیت اور ان احادیث سے استدلال کیا ہے جن میں بالکل عام انداز میں تمام پیداوار کا ذکر آیا ہے۔ ہماری رائے میں عقل اور نقل دونوں کا تقاضا ہے کہ زرعی پیداوار پر زکوٰۃ عائد کرنے کے سلسلے میں ایک قدر نصاب ملحوظ رکھی جائے کیونکہ شریعت نے دوسرے اموال میں زکوٰۃ عائد کرنے میں نصاب کا لحاظ رکھا ہے۔ اور یہ صرف قیاس ہی نہیں کیونکہ صراحۃً حدیث میں نصاب کی تعیین آچکی ہے۔ اس کی ایک مصلحت یہ ہے کہ نصاب سے کم مال کا مالک خود اس مال کا اتنا ضرورت مند ہوتا ہے کہ اس سے اس کا ایک حصہ دوسرے ضرورت مندوں کے لیے لینا مناسب نہ ہوگا۔ اُصولی طور پر زکوٰۃ اغنیاء سے لی جاتی ہے اور نصاب سے کم مال کا مالک غنی نہیں ہوتا ہے۔ جس کاشت کار کی مجموعی پیداوار ۱۹ ار من سے بھی کم ہو وہ نہ تو غنی ہے نہ یہ پیداوار اس کی ضرورت سے زائد ہے جیسا کہ ابن رُشد نے لکھا ہے اگرچہ اس موضوع پر احناف کا موقف دلائل کے لحاظ سے زیادہ طاقتور نہیں ہے۔ لیکن ابن العربی مالکی نے احناف کے مسلک کو مساکین کی معاشی ضروریات کے خاطر زیادہ طاقتور اور عملی اعتبار سے زیادہ محتاط قرار دیا ہے۔ یہ بات شوکانی نے ابن العربی کے حوالہ سے پیش کی ہے۔

وجوب عشر کی شرطیں

پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ مسلمان ہو۔ غیر مسلم سے عشر کا مطالبہ نہ ہوگا کیونکہ عشر میں ایک حیثیت عبادت کی ہے اور کافر عبادت کا اہل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اگر کسی مسلمان کی عشری زمین کو کوئی کافر خرید ے تو اس زمین پر بجائے عشر کے خراج لیا جائے گا کیونکہ عشر ایک اسلامی عبادت ہے کافر میں اس کی اہلیت نہیں ہے۔

دوسری شرط زمین سے پیداوار کا حاصل ہونا ہے اگر کسی وجہ سے پیداوار نہ ہو عشر واجب نہ ہوگا کیونکہ عشر زمین پر نہیں بلکہ پیداوار پر ہے۔ "اٰتوا حقہ یوم حصادہ" کا مفہوم یہی ہے۔ اول اس لیے کہ حقہ، کی ضمیر کا مرجع اگر پیداوار ہے تو پھر پیداوار نہ ہونے کی صورت میں حق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ یوم حصادہ کا مفہوم یہ ہے کہ کٹائی کے دن زکوٰۃ دی جائے۔ پیداوار نہ ہونے کی صورت میں شرط ہی موجود نہیں ہے اس لیے عشر کا موقعہ ہی نہیں ہے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ پیداوار ایسی چیز ہو جس کو اُگانے اور بونے کا عادۃً رواج ہو اور عادۃً اس کی کاشت کر کے اس سے استفادہ کیا جاتا ہو، خودرو گھاس یا خودرو درخت اگر کسی زمین میں ہو جائیں تو ان میں عشر نہیں ہے۔

ان تینوں شرطوں کے ساتھ عشر واجب ہوتا ہے۔ عاقل ہونا، بالغ اور زمین کا مالک ہونا عشر کے وجوب کی شرط نہیں ہے۔ مالک اگرچہ نابالغ بچہ ہو یا پاگل اور مجنوں ہو لیکن اگر زمین سے پیداوار ہو رہی ہے تو اس پر عشر واجب ہے۔ اسی طرح ملکیتِ زمین بھی وجوب عشر کے لیے شرط نہیں۔ وقف کی زمین جس کا کوئی مالک نہیں ہوتا۔ اس کی پیداوار پر بھی عشر واجب ہے۔ زمین اگر عاریۃً لی ہو یا کرایہ پر لی ہو اور اس میں زراعت کی تو پیداوار پر عشر واجب ہے اور اس شخص کے ذمہ ہے جو پیداوار حاصل کر رہا ہے۔ اگر زمین دوسرے شخص کو زراعت پر دی ہے یعنی بٹائی پر کہ پیداوار میں نصف نصف یا ایک تہائی یا دو تہائی پر دونوں میں معاملہ ہو گیا تو اس صورت میں عشر دونوں پر اپنے پیداواری حصّہ کے مطابق لازم ہوگا۔

سرکاری مالگذاری اور عشر

جب یہ بات "اٰتوا حقہ یوم حصادہ" کے مطالبہ سے واضح ہو کر سامنے آگئی کہ عشر زکوٰۃ کی طرح

ایک عبادت ہے تو اس سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ کوئی حکومت خواہ وہ مسلمانوں کی ہو یا غیر مسلموں کی۔ اگر زمینداروں اور کاشت کاروں سے سرکاری ٹیکس وصول کرتی ہے تو اس ٹیکس کی ادائیگی سے عشر ادا نہ ہوگا بلکہ مسلمانوں کے ذمہ ضروری ہوگا کہ وہ بطورِ خود عشر نکالیں اور اس کو اس کے مصرف میں لگائیں۔ جیسے انکم ٹیکس کی ادائیگی سے اموالِ تجارت اور نقد میں زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی ایسے ہی زمین یا اس کی پیداوار پر کسی قسم کے ٹیکس کی ادائیگی سے عشر کی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہوتا۔ غیر مسلم حکومت میں تو معاملہ بالکل واضح اور صاف ہے ہاں البتہ اگر حکومت اسلامی ہو اور وہ مسلمانوں سے زکوٰۃ کے اُصول کے مطابق زکوٰۃ کہہ کر وصول کرے اور زکوٰۃ کو اس کے مصارف پر خرچ کرنے کی پابندی کا اعلان کرے تو پھر زکوٰۃ یا عشر جو حکومت کو دیا جائے گا وہ شرعاً زکوٰۃ اور عشر ہی میں شمار ہوگا اور مسلمان ادائیگی کے بعد زکوٰۃ و عشر کے مطالبہ سے سبکدوش ہوجائیں گے۔

قرآن نے زکوٰۃ و عشر کا معاملہ ایک خاص نظام سے متعلق کیا ہے اس نظام کا تقاضا ہے کہ حکومت اپنے وسائل سے ہر شخص سے زکوٰۃ و عشر وصول کرکے جمع کرے۔ اگر صدقات کی ادائیگی کے لیے حکومت ضروری نہ ہوتی تو قرآن مصارف صدقات میں والعاملین کی مد کا ہرگز ذکر نہ کرتا۔ اصل یہی ہے کہ زکوٰۃ ہو یا عشر اس کی ادائیگی کے لیے تنظیم ہو۔ اس نظام کی پہلی اینٹ خدا جانے کن اسباب کے تحت اپنی جگہ سے سرک گئی۔ کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے صدقات کی اور تمام مدوں کی شکل میں جو وصول ہوتی تھی ان کو تو باقی رکھا لیکن نقد کی صورت میں جو سرمایہ تھا اس کی زکوٰۃ کو بجائے حکومت کو دینے کے انفرادی طور پر دینے کی اجازت دے دی۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ گیارہویں پارے میں آئے گی۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ عشر ہو یا زکوٰۃ اس کی تنظیم حکومتِ اسلامی کے فرائض میں ہے ان کو دینے کے بعد مسلمانوں کی ذمہ داری ختم ہوجاتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ عشر یا نصف عشر کا حساب لگاتے وقت پیداوار پر آنے والے مصارف مثلاً بیج کی قیمت، زمین کا لگان، فصل کی حفاظت اور کٹائی و لوائی وغیرہ پر آنے والے مصارف مزدوروں کی مزدوری وغیرہ کو منہا نہیں کیا جائے گا بلکہ پوری پیداوار کا دسواں یا بیسواں حصہ لیا جائے گا۔

کیا محصُول اور چُنگی بھی عُشر ہے؟

یہی عشر جس کی تفصیل آپ پہلے سُن چکے ہیں مسلمانوں سے دوسری چیزوں یعنی مویشی و کاشت

سے صدقات کی مد کا محصول بنام زکوٰۃ و عشر لیا جاتا تھا، اسی طرح تجارتی اموال سے زکوٰۃ بحساب چالیس فی صد وصول کی جاتی تھی پھر کبھی یہ زکوٰۃ دکانوں سے وصول کی جاتی تھی اور کبھی بحری و بری گزرگاہوں سے جب کوئی تجارتی مال گزرتا تھا اس سے چالیسواں حصہ لیا جاتا تھا اور پھر سال بھر تک اس مال سے کوئی جدید محصول وصول کرنا ناجائز تھا۔ اسی طرح غیر مسلموں کے دکانوں کے تجارتی اموال تو محصول سے مستثنیٰ تھے لیکن باہر سے جب وہ اسلامی ملک میں مال لاتے تھے تو ان سے بجائے زکوٰۃ کے چالیس فی صدی کے اعتبار سے خراج کے طور پر وصول کیا جاتا تھا۔ اسی طرح غیر ممالک کے غیر مسلم تجار جب اسلامی علاقہ میں تجارتی مال لے کر آتے تھے تو قاعدہ یہ مقرر تھا کہ جس ملک کے وہ باشندے ہوتے تھے اس ملک کی حکومت مسلمانوں کے تجارتی مال پر جتنا محصول عائد کرتی تھی اسی قدر اسلامی حکومت بھی ان سے وصول کرتی تھی۔ اگر مسلمانوں کے تجارتی مال کو محصول سے مستثنیٰ کر دیا جاتا تو اس ملک والوں سے اسلامی حکومت بھی کچھ نہ لیتی تھی۔ البتہ اگر ان کی حکومت کا طرز عمل معلوم نہ ہوتا تھا مثلاً وہاں مسلمان کبھی تجارت کے لیے نہ گئے ہوں تو ان کے تجارتی اموال سے خواہ وہ کسی نوعیت کے ہوں دس فی صدی کے حساب سے محصول لیا جاتا تھا۔ اسی کو العشور کہا جاتا تھا اور اس پر کام کرنے والے سرکاری افسر کو العاشر کے نام سے پکارا جاتا۔ یہ آمدنی اگر غیر مسلموں سے ہوتی تو اسے سرکاری خزانے میں "خراج" کے فنڈ میں جمع کیا جاتا تھا۔ اور اگر یہ آمدنی مسلمانوں سے ہوتی تو خزانے میں الصدقات کی مد میں جمع ہوتی تھی کیونکہ دراصل یہ ان کے تجارتی مال کی زکوٰۃ میں ملتی تھی۔ قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں لکھتے ہیں :-

> مسلمانوں سے العشور کے نام سے جو محصول وصول کیا جاتا ہے اس کا شمار زکوٰۃ کی مد میں ہوگا اور اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کے مال سے العشور جو وصول کیا جاتا ہے یا جو غیر اسلامی حکومت کی غیر مسلم آبادی سے العشور وصول ہو ان سب کا شمار خراج میں ہوگا۔
>
> (کتاب الخراج ص ۷۸)

خلاصہ یہ ہے کہ تجارتی سامان اسلامی مملکت میں کسی راہ سے آئے بری سے یا بحری سے ان سے وہی عشر والی مد کا محصول سال بھر میں ایک دفعہ وصول کیا جاتا۔ اس محصول کا آغاز فاروق اعظم نے کیا تھا۔ جب آپ کو یہ بتایا گیا کہ جو مسلمان تاجر غیر مسلم علاقوں میں تجارت کا

مال لے کر جاتے ہیں ان سے وہاں کی حکومت چنگی لیتی ہے تو آپ نے بھی باہر سے مال لے کر آنے والے غیر مسلموں سے چنگی وصول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس محصول سے مسلمان تاجروں اور غیر مسلم تاجروں کے درمیان ایک گونہ عدل قائم ہو گیا کیونکہ مسلمان تاجر بہر صورت اپنے مال تجارت پر زکوٰۃ ادا کرنے کے ذمہ دار تھے۔ جب کہ عشور کا نظام قائم ہونے سے پہلے غیر مسلم تاجروں سے اس قسم کا کوئی محصول نہیں لیا جاتا تھا اور انہیں تجارتی مسابقت میں مسلمان تاجروں کے مقابلے میں ایک سہولت حاصل تھی۔ یہ تھا محصول جو ہر تاجر سے وصول کیا جاتا تھا مگر مسلمان تاجروں کے لیے یہ نیا نہ تھا بلکہ یہ ان کے لیے مال تجارت کی زکوٰۃ تھی جو سال میں ایک بار وصول کی جاتی تھی اس کی شرح بھی ڈھائی فی صد تھی، البتہ غیر مسلم تاجروں کے لیے یہ ایک نیا محصول تھا جس کی شرحیں مختلف تھیں عشور کی عام شرح حربی کے لیے دس فیصدی تھی اور اسلامی مملکت کے غیر مسلم شہری اور مستامن کے لیے پانچ فی صد تھی۔ لیکن بعض مقامات پر اجتماعی مصالح کے پیش نظر چنگی کی شرح کم رکھی گئی ابو عبید کی کتاب الاموال میں ہے کہ حضرت عمر نبطی تاجروں سے زیتون کے تیل اور گیہوں پانچ فیصد وصول کرتے تھے تاکہ مدینہ میں درآمد زیادہ ہو۔ مشہور ہے کہ ایک عیسائی تاجر سے عاشر نے دو دفعہ محصول وصول کر لیا۔ عیسائی حضرت عمر کے پاس گیا آپ اس وقت بتقریب حج مکہ میں تھے۔ اس نے شکایت کی۔ اسی وقت حضرت عمر نے عاشر کو ڈانٹ کہلا بھیجی اور اس کا مال واپس دلایا گیا۔ عرصہ کے بعد بھی عیسائی حضرت عمر کی خدمت میں پھر آیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا انا الشیخ النصرانی الذی کلمتک فی زیاد میں وہی بوڑھا عیسائی ہوں جس نے آپ سے زیاد عاشر کے بارے بات کی تھی۔ حضرت عمر نے اسی لہجے میں جواب دیا دانا الشیخ الحنیف الذی قضیت حاجتک میں بھی وہی بوڑھا حنیف ہوں جس نے تیری ضرورت پوری کی تھی۔ قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر ملکیوں نے حضرت عمر سے درخواست کی کہ ان کو تجارت کے لیے دارالاسلام میں آنے کی اجازت دی جائے اور اس اجازت کے عوض ان سے چنگی وصول کی جائے تو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ انہوں نے آپ کو یہ درخواست منظور کرنے کا مشورہ دیا چنانچہ آپ نے چنگی عائد کرنے کا طریقہ اختیار کیا[1] جرجی زیداں نے لکھا ہے کہ:

یمن کے عاشر اس محصول کو ان جہازوں سے وصول کرتے جو ان کے

---

[1] کتاب الخراج

ساحلوں پر ہندوستان سے آتے ہوئے گزرتے تھے جن پر خوشبودار لکڑیاں مختلف قسم کی مشک کافور، عنبر، صندل، چینی وغیرہ ہوتے۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی ممالک میں امن و امان اور عام خوش حالی کی وجہ سے ہر قسم کے اموال کے طلب کا یہ نتیجہ تھا کہ بکثرت غیر ممالک کے تاجر اسلامی مملکت میں تجارت کے لیے آتے جاتے رہتے تھے اور اس سلسلے میں حکومت کو کافی آمدنی ہوتی تھی۔ جرجی زیدان کا بیان ہے:۔

واثق باللہ کے زمانے میں جہازوں سے عشور کی آمدنی بہت زیادہ ہو گئی تھی بلکہ زیدان ہی کا خیال ہے کہ یورپین ممالک میں اُ بنائے جبل الطارق پر لوگ بکثرت محصول ادا کرنے کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ موجودہ زمانے میں انگریزی میں جو TAREF کا لفظ محصول کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ عربی کے لفظ طریف سے جو جبل الطارق پر عشور کی چوکی کا نام تھا بگڑا ہوا ہے یا پھر تعریفہ سے ٹیرف بنا ہے۔ پھر عشور اور عشر کی لفظی مناسبت سے میں نے عشور کے متعلق یہ بات یہاں لکھ دی ہے ورنہ اس کی اصل جگہ موضوع خراج ہے، اور خراج پر تفصیلی بحث انشاءاللہ اٹھائیسویں پارے فیئ کے ضمن میں آئے گی۔ اور اسی جگہ خراج اور عشر کا تقابلی مطالعہ بھی بتایا جائے گا۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے لا تسرفوا ان اللہ لا یحب المسرفین اسراف مت کرو بے شک اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔ شارحین قرآن کا اس میں اختلاف ہے کہ اس فقرے کا تعلق کس سے ہے۔ پہلے آیت میں بتایا گیا ہے کلوا من ثمرہ، پیداوار سے فائدہ اٹھاؤ اور پھر فرمایا کہ اتوا حقہ، کہ ادائے حق کرو یعنی پیداوار کا صدقہ نکالو۔ اس حکم لا تسرفوا، اسراف نہ کرو کا تعلق اگر کلوا سے ہے تو مطلب یہ ہے کہ پیداوار کو استعمال کرو، لیکن استعمال میں اسراف نہ کرو اور اگر اتوا حقہ، سے ہے تو مطلب یہ ہے کہ راہ خدا میں خیرات کرو لیکن خیرات میں اسراف نہ کرو اور اگر دونوں سے ہے تو مطلب یہ ہے کہ پیداوار میں سے کھاؤ اور راہ خدا میں دو لیکن اسراف نہ کرو۔ اور اگر اس آیت کا تعلق کسی سے نہیں تو یہ ایک مستقل دفعہ ہے اور اس کا پوری زندگی سے تعلق ہے مطلب یہ ہے کہ زندگی کے کسی گوشہ میں بھی حد سے تجاوز نہ کرو اور اسراف نہ کرو۔ اس طرح یہ ایک حکیمانہ قانون ہے جو زندگی کے تمام شعبوں پر یکساں حاوی ہے۔ انسان اگر اسی پر عمل کرے تو اخلاق معاملات، سیاسیات معاشرت انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ساری شاخوں کی مشکلات حل ہو سکتی ہیں اور بڑے

بڑے پتھر پانی ہو کر رہ سکتے ہیں۔ ابن جریر اور ابن کثیر کا خیال یہی ہے۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں، یہ آیت اپنے موقعہ کے لحاظ سے بالکل ویسی ہی ہدایت پر مشتمل ہے جیسے سورہ بنی اسرائیل میں ہے لا تجعل یدك مغلولۃ الی عنقك ولا تبسطها کل البسط،

اپنا ہاتھ نہ اتنا سکیڑ گویا گردن میں بندھ جائے اور نہ بالکل پھیلا ہی دے۔

لیکن امام بغوی نے عبداللہ ابن عباس کے حوالہ سے بتایا ہے کہ ثابت بن قیس نے پانچ سو کھجوروں کا پھل اتارا اور ایک ہی روز میں سارا خیرات کر دیا، گھر والوں کے لیے بالکل نہ چھوڑا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، لیکن اس پر شرح صدر نہیں ہے کیونکہ سورہ انعام مکی ہے اور مکی زندگی میں مسلمانوں میں اتنا تمول ہی نہ تھا اور پھر روایت بھی بحوالہ کلبی آئی ہے جس کے بارے میں آپ کو پانچویں جلد میں ہم بتا چکے ہیں۔ امام بغوی ہی نے سدی کے حوالہ سے لکھا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ سارا سرمایہ راہِ خدا میں نہ دو کہ خود محتاج ہو کر رہ جاؤ۔ علامہ آلوسی نے بھی اولیت اسی کو دی کہ راہِ خدا میں دینے میں ہاتھ اتنا کھلا نہ رکھو کہ بس حد سے باہر ہو جاؤ۔ اور دل کا پتہ نہیں مگر میں اس فقرے کا مطلب یہاں یہی سمجھتا ہوں کہ صدقہ و خیرات میں اسراف نہ کرو۔

ایک شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے سونے کی ڈلی یہ کہتے ہوئے پیش کی کہ یہ میری طرف سے صدقہ ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس نے پھر توجہ دلائی، بار بار وہ توجہ دلاتا تھا اور آپ بے رخی فرماتے تھے تا آنکہ جب اس کا اصرار حد سے گزر گیا۔ تب مجبوراً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سونے کی ڈلی کو ہاتھ میں لیا اور اس کے بعد اس زور سے اس شخص کی طرف دے مارا کہ راوی کے لفظوں میں کہ "اگر اس کے لگ جاتی تو ٹیک کھل جاتی۔" اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ تم میں ایک شخص اپنا سارا مال اٹھا کر لے آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ صدقہ ہے۔ اس کے بعد خالی ہاتھ ہو کر گھر میں بیٹھ جاتا ہے پھر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا:

خیر الصدقۃ ما کان عن ظهر غنی

سب سے اچھا صدقہ وہ ہے جو تونگری کی پشت پناہی میں ہو۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنا سارا مال خرچ کر ڈالیں اور دراصل یہی وہ مسئلہ ہے جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہو رہا ہے۔ مشہور شارح حدیث امام خطابی نے اس حدیث خیر الصدقۃ ما کان عن ظهر غنی کی تشریح

کرتے ہوئے ظہرِ غنی کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ

یعنی ایسی تونگری جس پر بھروسہ کر سکتا ہو اور جس کی پشت پناہی حاصل کر سکتا ہو اس وقت جب مصائب اور حوادث کا وہ شکار ہو۔

(معالم السنن)

امام خطابی نے اس مطلب کو بیان کرتے ہوئے اپنی تائید میں دوسری حدیث پیش کی ہے جس میں ارشاد ہے:

خیر الصدقۃ ما ابقت غنیً

بہترین صدقہ وہ ہے جو آدمی کی تونگری باقی رکھے۔

جس کا صاف اور کھلا مطلب یہی ہوا کہ صدقہ کرتے ہوئے اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ اتنا سرمایہ آدمی کے پاس رہ جائے جس سے وہ آئندہ آمدنی پیدا کرے یا اخراجات میں مدد لے سکے خطابی کے الفاظ یستظہر بہ کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ ہے اس آیت میں اسراف کا مطلب، باقی کھانے پینے میں اسراف کی ممانعت تو وہ پہلے گزر چکی ہے اور اسکا بارے میں انشاء اللہ سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۳۱ میں آ رہی ہے۔ وہاں اس پر تبصرہ کریں گے۔ یہاں جس سیاق و سباق میں یہ آیت آئی ہے اس کا تقاضا یہی ہے جو ہم نے ہدیۂ ناظرین کر دیا ہے۔

حیوانات بھی اللہ کی نعمت ہیں

۱۸۶۔ اور دیکھو اسی خدا نے چار پایوں میں سے کچھ بوجھ اٹھانے والے پیدا کر دیے ہیں اور کچھ زمین سے لگے ہوئے، پس جو کچھ خدا نے تمہاری روزی کے لیے پیدا کر دیا ہے اس میں سے کھاؤ اور شیطان کے قدم بقدم نہ چلو وہ بلا شبہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ بوجھ اٹھانے والے جیسے اونٹ وغیرہ اور زمین سے لگے ہوتے چھوٹے قد و قامت کے جانور جیسے بھیڑ بکری، یہ اللہ کی نعمتیں ہیں ان سے منتفع ہونا چاہیے شیطان کے قدموں پر چلنا یہ ہے کہ ان کو خواہی نخواہی بدون حجت شرعی کے حرام کر لیا جائے یا شرک و بت پرستی کا ذریعہ بنا لیا جائے شیطان کی اس سے زیادہ کھلی ہوئی دشمنی کیا ہو گی کہ ان نعمتوں سے تم کو دنیا میں محروم رکھا اور آخرت کا عذاب الگ رہا[1] حمولہ سے مراد وہ چوپائے ہیں جو سواری اور باربرداری

[1] افادات شیخ الاسلام

کے کام آتے ہیں مثلاً اونٹ وغیرہ، رکوبہ اور حلوبہ کی طرح ہے۔ اہل عرب اونٹ کے لیے زیادہ بولتے ہیں فرش سے مراد وہ چھوٹے جانور ہیں جو سواری اور باربرداری کے لیے موزوں نہیں صرف ذبح یا دوسری ضروریات کے کام آتے ہیں۔ فرش اس زمین کو بھی کہتے ہیں جہاں نباتات کی کثرت ہو۔ اس کھیتی کو بھی کہتے ہیں جو ابھی ڈنٹھلوں پر کھڑی نہ ہوئی ہو۔ یہاں جانوروں کے لیے اس لیے بولا گیا ہے کہ وہ چھوٹے قد کے ہوتے ہیں اور زمین سے لگے چلتے ہیں یا اس لیے کہ وہ ذبح کے لیے زمین پر لٹائے جاتے ہیں اور علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ اس لیے کہ ان کی کھالوں اور اُون سے فرش بنائے جاتے ہیں جیسے قالین وغیرہ لیکن چونکہ یہاں فرش کا لفظ حمولہ کے مقابلے پر آیا ہے اس وجہ سے بلاشبہ چھوٹے جانور ہی مراد ہیں۔ نباتات کے تذکرے میں معروشات غیر معروشات آیا تھا اس لیے یہاں حیوانات کے تذکرے میں حمولہ و فرشا بولا ہے۔ حمولہ سے معروشات کا اور فرش سے غیر معروشات کا تقابل دلادیا ہے اس لفظی تجانس نے زبان کا ذوق رکھنے والوں کے لیے کلام میں حسن فراہم کر دیا ہے۔

خدا کی نعمتوں سے انتفاع کا حکم

کلوا مما رزقکم اللہ اللہ کی بخشش کی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ اس فقرے کا جہاں یہ منطوق ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو استعمال کرو اکل برتنے اور فائدہ اٹھانے کے معنے میں ہے اور رزق اللہ کی بخشش کی ایک جامع تعبیر ہے وہاں ایسے ہی اس کے مفہوم میں یہ داخل ہے کہ اللہ کی ان نعمتوں کو حاصل کرنے کے لیے وسائل اختیار کرو۔ اور اس کا مدلول یہ بھی ہے کہ انسان خدا کی نعمت اور بخشش کو اپنی دینی زندگی کے لیے قابل اجتناب نہ سمجھے۔ مادے کو اپنی روح کا قفس نہ گمان کرے۔ اپنی جبلی ضرورتوں اور خواہشوں کی تکمیل کو خدا پرستی کی راہ کی آفت نہ خیال کرے دوسرے لفظوں میں یہ کہ مسائل زندگی سے کنارہ کش ہو رہنے، دنیا چھوڑ دینے کو خدارسی کا ذریعہ نہ سمجھے جسے رہبانیت کہتے ہیں بلکہ اسے چاہیے کہ زندگی کے مسائل سے پوری طرح وابستہ رہے۔ متاہل اور متمدن زندگی گزارے۔ اپنی ایک ایک فطری قوت کو زندہ و کار فرما رکھے۔ غرض آبادی سے جنگلوں کی طرف نہیں بلکہ جنگلوں سے آبادی کی طرف آئے اور یہ سب کچھ خدا کا حکم اور دین کا مطالبہ سمجھ کر کرے۔ اور اس یقین کے ساتھ کرے کہ اس کے خلاف طرز عمل اختیار کرنے میں دینداری کا نقص کمال بندگی سے محرومی ہے جس طرح نباتات کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کلوا مما رزقکم اللہ اللہ نے یہ نعمتیں تمہیں دی ہیں جن جن پہلوؤں سے تمہارے لیے نافع ہیں ان سے فائدے اٹھاؤ ان کا گوشت کھاؤ، ان کو سواری کے لیے استعمال کرو ان سے باربرداری کا

کام لو، ان کا دودھ پیو، دُودھ سے انواع واقسام کی نعمتیں بناؤ، ان کی خلاف کپڑے بناؤ۔ لیجئے۔ یہ
سب باتیں کلوا کا مدلول ہیں اور دینداری کے نام پر ان نعمتوں پر ہرگز کوئی قدغن قائم نہ کرو یہ کہہ کر
یہ حرام ہے اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کو اللہ کے سوا کبھی کسی کی عبادت کے کام میں نہ لاؤ۔ اگر ایسا کرو گے
تو یہ اتباع رحمان نہیں بلکہ اتباع شیطان ہے۔ اسی لیے لا تتبعوا خطوات الشیطان انہ لکم عدوٌ مبین
اللہ کی حلال کردہ چیزوں میں سے کسی بھی چیز کو حرام کرنا شیطان کے نقش قدم کو اپنانا ہے۔ مطلب یہ ہے
کہ اللہ کی جائز کی ہوئی چیزوں کو حرام قرار دینا شیطان کی پیروی ہے۔ یہ حکم تو ہر شیطانی روش کے لیے عام
ہے لیکن یہاں خصوصیت کے ساتھ تعلق اللہ کی حلال کردہ غذاؤں سے ہے خواہ ان کا تعلق نباتات
سے ہو یا حیوانات سے۔ تحلیل وتحریم کا منصب خدا ہی کو سجتا ہے اس میں کسی کی شرکت کی گنجائش
نہیں ہے۔ اور تو اور خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بار اپنی یہ پوزیشن واضح فرمائی ہے کہ تحلیل و
تحریم میرا کام نہیں ہے۔ یہ صرف اللہ سبحانہ کا منصب ہے۔ مثلاً

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو نباتات میں سے لہسن کھا کر مسجد میں آنے
> سے منع فرمایا اس پر بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ شاید لہسن حرام ہے جب آپ کو یہ خبر ہوئی
> تو آپ نے لوگوں کو واضح طور پر سمجھایا کہ
>
> لوگو! جو چیز اللہ نے میرے لیے حلال کی ہے مجھے اس کے حرام کرنے کا کوئی
> حق حاصل نہیں ہے لیکن میں لہسن کی بو کو پسند نہیں کرتا ہوں [1]
>
> ایک روایت میں اس طرح آیا ہے:
>
> لوگو! خدا کی قسم جو چیز اللہ نے حلال کی ہے مجھے اس کے حرام کرنے کا کوئی
> حق نہیں ہے لیکن میں لہسن کی بو کو پسند نہیں کرتا ہوں [2]

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں آخری نماز مسجد نبوی میں باجماعت پڑھی تو اس
کے بعد آپ حجرہ کے پہلو میں تشریف فرما ہو گئے اور لوگوں کو فتنوں سے آگاہ کرتے رہے۔ آپ نے یہ
بھی فرمایا کہ بخدا میری طرف حلال وحرام کی نسبت نہ کی جائے۔ خبردار میں حلال نہیں کرتا مگر صرف
اس چیز کو جس کو اللہ نے حلال کیا ہے اور میں حرام نہیں کرتا مگر صرف اس چیز کو جس کو اللہ نے
حرام کیا ہے۔ (مسند امام شافعی)

---

[1] صحیح مسلم [2] صحیح ابو عوانہ ج ا ص ۱۲۴

ضرورت تو نہیں کہ قرآن وحدیث کی واضح ہدایات کے بعد کسی اور کا بھی ذکر کیا جائے لیکن شاید کوئی یہ سمجھ لے کہ اس موضوع پر کسی نے کچھ نہیں کہا اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلم علمائے امت اور فقہائے ملت کے چند حوالے بھی عرض کر دیے جائیں ۔

امام عبدالوہاب الشعرانی الیواقیت والجواہر میں شیخ اکبر قدس اللہ سرہ العزیز کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

ہم یقیناً جانتے ہیں کہ شارع صرف اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ہے ۔ باقی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے احکام کے مبلغ ہیں ۔ آپ کبھی اپنی طرف سے کوئی بات نہ فرماتے تھے اور نہ آپ ان احکام کو بھول لیتے تھے جن کے پہنچانے کا آپ کو اللہ نے حکم دیا ہے ۔

حافظ ابن الہمام اپنی مشہور کتاب التحریر میں فرماتے ہیں:

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حکم دینے والا صرف اللہ سبحانہ ہے

محدثین میں حافظ بدرالدین عینی فرماتے ہیں:

کسی چیز کا حلال کرنا اور حرام کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے ۔ کسی انسان کا اس میں کوئی تعلق نہیں ہے ۔

اشعۃ اللمعات میں شاہ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

ان ابراھیم حرام مکۃ میں حرام کرنے کی نسبت حضرت ابراہیم کی طرف اس لیے ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کا حکم پہنچایا کیونکہ شرائع اور احکام کا فیصلہ کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اور اس کا حکم قدیم ہے اور انبیاء اس کے احکام کے مبلغ ہیں ۔

حضرت شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں:

اس کا راز یہ ہے کہ تحلیل وتحریم دراصل اس تکوینی آئین کا نام ہے جو عالم ملکوت میں نافذ ہے کہ فلاں چیز پر مواخذہ ہوگا یا نہ ہوگا یہی تکوین مواخذے کا باعث ہے اور یہ تکوین اللہ کی صفات میں سے ایک صفت ہے ۔ باقی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تحلیل وتحریم کی نسبت تو اس لیے ہے کہ اس عالم میں آپ کا ارشاد اس بات کی کھلی نشانی ہے کہ اسے اللہ نے حلال کیا ہے یا حرام کیا ہے اور ائمہ مجتہدین کی طرف حلال وحرام کی نسبت اس لیے ہے کہ وہ اس کو شارع کے بیان سے روایت کرتے ہیں یا شارع کے کلام سے استنباط کرتے ہیں ۔

اس تفصیل سے یہ بات الم نشرح ہو کر سامنے آگئی کہ تحلیل وتحریم اللہ کی صفت ہے اور نصوص قطعیہ

سے یہ عقیدہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت میں غیر کو شریک کرنا شرک ہے اور جب قرآن و اسلام میں پیغمبر کا یہ مقام ہے تو دوسروں کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ نباتات ہوں یا حیوانات ان کی تحلیل و تحریم کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔ مشرکانہ بدعات جو ہر دور کے شیاطین جن و انس نے باہمی گٹھ جوڑ سے ایجاد کی ہیں پھر الٹا ان پر شریعت کا لیبل لگا کر ان کو رواج دیا ہے ان کی پیروی ہرگز نہ کرو یہ سب خطوات شیطان ہیں اور یہ سب گمراہی ہے۔

تحریم پر نقلی و عقلی دلیل کا مطالبہ

۱۴۳۔ چوپایوں میں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے اللہ نے آٹھ قسمیں پیدا کی ہیں، بھیڑ میں سے دو قسم نر اور مادہ اور بکری کی دو قسمیں نر اور مادہ، اے پیغمبر ان لوگوں سے دریافت کرو کہ اللہ نے ان جانوروں میں سے کون سے جانور کو حرام کیا ہے۔ دونوں قسم کے نروں یا ماداؤں کو یا پھر اس بچہ کو جس نے دونوں قسم کی مادہ اپنے پیٹ میں لیے ہوتے ہے اگر تم سچے ہو تو مجھے علم کے ساتھ بتاؤ۔ ایک نر ایک مادہ اس طرح ہر نوع دو زوج ہوتے اور مجموعہ آٹھ ہو گیا۔ یعنی کسی چیز کو حلال و حرام کہنا صرف اللہ کے حکم سے ہو سکتا ہے۔ پھر ان میں سے نر کو یا مادہ کو یا بچہ کو جو مادہ کے پیٹ میں ہے اگر تم سب آدمیوں کے یا بعض کے حق میں حرام کہتے ہو جیسا کہ پچھلی آیات میں گزرا ہے اس کی سند تمہارے پاس کیا ہے جب خدائی حکم ہونے کی کوئی سند نہیں رکھتے ہو تو محض اٹکل پچو سے خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو حلال یا حرام قرار دینا اس کا مترادف ہے کہ خدائی کا منصب تم اپنے لیے تجویز کرتے ہو یا خدا پر جان بوجھ کر افترا کر رہے ہو، دونوں صورتیں تباہ کن اور مہلک ہیں۔[1]

محققین کی رائے میں ثمانیۃ ازواج منصوب ہے کیونکہ یہ حمولۃ وفرشا سے بدل ہے۔ زوج کا لفظ عربی میں جیسے جوڑے کے لیے آتا ہے ایسے جوڑے کے ایک فرد کے لیے بھی آتا ہے۔ دونوں کو ملا کر زوجین کہتے ہیں انہ خلق الزوجین الذکر والانثی پہلے بتایا تھا کہ چوپائے دو قسم کے ہیں ایک حمولہ بار برداری اور سواری والے اور دوسرے فرشا چھوٹے جانور زمین سے لگے ہوئے حمولہ اونٹ اور گائے اور فرش بھیڑ اور بکری، اب بتاتے ہیں کہ ان کی آٹھ قسمیں ہیں۔ ان چاروں میں سے یا مذکر ہیں یا مونث، پہلے اس آیت میں چار کو بیان کیا ہے۔ ضان میں مینڈھا، دنبی، معز میں بکرا بکری

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ چاروں گویا فرشا کی قسمیں ہوتی ہیں۔ اے پیغمبر ان سے دریافت کرو کہ علم کی نپی تلی ترازو رکھ کر مجھے بتاؤ کہ ان چاروں میں سے اللہ نے کس کو حرام کیا ہے۔ علمی دلیل دو قسم کی ہوتی ہیں نقلی و عقلی۔ دلیل نقلی یہ کہ دین ابراہیم کی کوئی قابل اعتماد سند پیش کرو۔ یا پھر کوئی عقلی و فطری دلیل یا قرینہ پیش کرو جس سے تمہارے دعوے کی صحت پر اعتماد کیا جا سکے اگر اس طرح کی کوئی چیز نہیں تو صرف واہمہ پر یا رواج کی بنا پر جانوروں کو حرام کر دینا کہاں کی دانشمندی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے نزدیک علم نام ہے دو قسم کی دلیلوں کا۔ نقلی اور عقلی، اسی کی طرف سورہ ملک میں لوکنا نسمع او نعقل کہہ کر اشارہ کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں ذرہ برابر بھی صداقت رکھتے ہو کہ فلاں چیز یا فلاں جانور فلاں کے لیے حرام ہے تو اس کی دلیل پیش کرو۔ اگر پیش نہیں کر سکتے تو کیوں اللہ پر جھوٹا بہتان اٹھاتے ہو اور اس کی سزا انتہائی سنگین ہے۔ باپ دادا کا کسی رسم کو اپنا لینا کسی چیز کے حلال یا حرام ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ آخر یہ کیسے یقین کیا جائے کہ باپ دادا جو کچھ کرتے ہیں وہ کسی علمی سہارے کے تحت کرتے تھے۔

تحلیل وتحریم خدا کے حکم سے ہوتی ہے

۱۸۸۔ اور دیکھو اسی طرح اونٹ میں سے دو قسمیں ہیں اور گائے میں سے دو قسمیں ہیں۔ تم ان سے پوچھو کیا ان میں سے نر کو حرام کر دیا ہے یا مادہ کو یا اس کو جو ان دونوں کی مادہ اپنے پیٹ میں لیے ہوتی ہے کیا تم اس وقت حاضر تھے جب خدا نے اس مادہ میں حکم دیا تھا۔ تو اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا؟ جو خدا پر افترا پردازی کرے تاکہ لوگوں کو بغیر علم گمراہ کرے۔ بلاشبہ اللہ ظلم کار لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ہے۔ اشیاء کی تحلیل و تحریم محض خدا کے حکم سے ہو سکتی ہے اور خدا کا حکم بالواسطہ انبیاء پر ہوتا ہے یا بلا واسطہ اللہ کسی کو مخاطب فرماتے تو اس کو علم ہو۔ یہاں دونوں صورتیں منفی ہیں۔ پہلی شق کے انتفاء پر نبئونی بعلم میں اور دوسری کی نفی پر ام کنتم شھداء میں متنبہ فرمایا ہے۔ پھر مشرکین کے دعاوی میں افتراء و اضلال کے سوا اور کیا چیز باقی رہ گئی۔ بلاشبہ اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو خدا پر بہتان باندھے اور علم و تحقیق سے تہی دست ہونے کے باوجود لوگوں کو باطل اور غلط مسائل بیان کر کے گمراہ کرتا پھرے جس شخص نے اس قدر ڈھٹائی اختیار کر لی اور ایسے ظلم عظیم پر کمر باندھ لی، اس کی ہدایت پانے کی توقع رکھنا عبث ہے[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ اونٹ اور گائے میں بھی دو دو ہیں۔ اونٹ میں اونٹ اونٹنی اور گائے میں سے بیل اور گائے، بتاؤ ان میں سے کون سا حرام ہے۔ مشرکین مکہ چوپاؤں میں سے کچھ کو حرام کہتے تھے قرآن نے ان کے اس طرزِ عمل پر یہاں پُر زور احتجاج کیا ہے اور ان کے اس طرزِ عمل کی غیر معقولیت واضح کی ہے یہ بات کہ ایک ہی جانور کا نر حلال ہو اور مادہ حرام ہو یا مادہ حلال ہو اور نر حرام ہو۔ یا پھر جانور خود حلال ہو اور اس کے پیٹ کا بچہ حرام ہو، یہ اس قدر کھلی حماقت ہے کہ عقل اسے ماننے سے انکار کرتی ہے اور کوئی ذی ہوش شخص یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ خدا نے ایسا حکم دیا ہو۔ علامہ الوسی نے اس کی اچھوتے انداز میں توضیح فرمائی ہے۔ بہرحال جس انداز سے قرآن نے ان کی لغویت کو بیان کیا ہے یہ قرآن ہی کا حصہ ہے۔

عرب میں بُت پرستی کی تاریخ

آخر میں فرمایا ہے فمن اظلم ممن افترٰی علی اللہ کذبا لیضل الناس بغیر علم اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ کا بہتان باندھے اور اس لیے یہ طوفان اٹھائے کہ لوگوں کو گمراہ کرے۔ مطلب یہ ہے کہ جب صورتِ حال یہ ہے کہ تم پر تمہارے ان توہمات کی غیر معقولیت واضح کر دی گئی تو پھر اس شخص سے زیادہ ظلم کار انسان کون ہو سکتا ہے جو علم و بصیرت سے تہی دامن ہو کر انسانی زندگی کی بے راہ روی کی خاطر خدا پر جھوٹ بولے اور یہ بہتان اٹھائے کہ فلاں جانور یا فلاں پیداوار حرام ہے یا فلاں جانور کا بچہ مردوں کے لیے حلال اور عورتوں کے لیے حرام ہے، استفہام انکاری ہے یعنی ایسے شخص سے زیادہ کوئی ظالم نہیں جو بغیر علم کے لوگوں کو اپنی فکری آوارگی سے گمراہ کرے۔

عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ عرب تاریخ میں بنی اسماعیل کی گمراہی کا قائد عمرو بن لحی ہوا ہے جس نے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کی مشرکانہ بدعت نکالی تھی اور ابراہیمی و اسماعیلی دین کا ستیاناس کر ڈالا تھا۔ مسند احمد، صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بحوالہ حضرت ابوہریرہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کان اول من سیب السوائب اور حضور انور ہی نے اس کا پورا نام عمرو بن لحی بن قمعہ بن خندق اور اس کی کنیت ابو خزاعہ بتائی ہے جیسا کہ امام بخاری نے کتاب المناقب میں ابوہریرہ کے حوالہ سے لکھا۔ ارباب روایت بیان کرتے ہیں کہ حضرت اسماعیل کے بعد ان کی اولاد دینِ ابراہیمی پر قائم تھی، ان میں رفتہ رفتہ بُت پرستی کا شیوع اس طرح ہوا کہ خانہ کعبہ جو پتھروں سے بنا تھا،

ان کے نزدیک مقدس تھا۔ جب وہاں سے کسی اور مقام پر چلنے لگتے تو اس کا ایک پتھر تبرکاً اٹھا لیتے، بعد کو خانہ کعبہ کا امتیاز بھی اٹھ گیا جو پتھر اچھا ساچکنا پڑا مل جاتا اسی کو اٹھا لیتے اور اس کو اپنے گھر کا دیوتا بنا لیتے[1]

قدیم تحریری شہادتوں کے سب سے پہلے' بابل کے کتبات میں ہم کو ۶۴۵ ق م میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنو قیدار اور انباط استار یعنی زہرہ کو پوجتے تھے۔ اشور منی پال شاہ نینوی شاہان عرب شمالی کی مفتوحی کی داستان میں کہتا ہے :

عادیر ملکہ عرب عم العدی شاہ قیدار میں مفتوح ہوتے اور گرفتار کرکے نینوی لائے گئے اور ایک دوسرے شہزادہ یوتنع بن بیرودا کے بے شمار جنگجو لوگ تباہ برباد کیے گئے اور ان کے خیمے جلاتے گئے اور ایک تیسرا سردار ابی یاتی کو مع اس کے ساتھیوں کے یعنی یوقع ابن خرابل ناتان شاہ انباط اور استار کے پوجنے والوں کے شکست دی گئی۔ (تاریخ مورخین عالم)

ہیرو ڈوٹس ۵۰ئہ ق م میں شہادت دیتا ہے کہ اہل عرب دو دیوتاؤں کو پوجتے تھے جن کے نام 'البلات' اور 'اورتل' ہیں۔ البلات تو صاف لات ہے اور اورتل نہ معلوم کیا ہے۔

اسماعیلی قبائل کے بارہ سلسلوں میں صرف تین کی نسبت ہم کو کچھ حالات معلوم ہیں۔ قیدار، اصحاب الرس، نبایوط، اصحاب الحجر، اور قیدار۔ اصحاب الرس کی مذہبی تاریخ کی قرآن نے کوئی تفصیل نہیں بتائی۔ صرف مجرم قوموں کی فہرست میں ان کا نام لیا ہے۔ دوسرے تاریخی ذرائع سے ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوا۔ پہلی صدی عیسوی کے اوائل کا مورخ اسٹرابو جو اس قوم کا معاصر تھا کہتا ہے کہ :

مذہباً یہ سبا والوں کے دیوتا آفتاب کی پوجا کرتے ہیں اور اس دیوتا کا ہیکل یا قربانگاہ مکانات کی چھتوں پر بناتے اور اس پر شراب چڑھاتے ہیں اور اندر ہر روز بخور جلاتے ہیں۔

حجر کے نبطی کتبوں جو عموماً قبروں کی لوحین ہیں ان کے دیوتاؤں کے نام بھی ملتے ہیں مثلاً ذوالشری، لات، منوت، ہبل، قیس، عمی ند، خریشی۔ ان آخر دو ناموں کے علاوہ بقیہ اور دیوتا

[1] سیرت ابن ہشام

زمانہ اسلام تک عرب کے شمالی علاقہ کے قبائل میں پوجے جاتے تھے۔ ذوالشریٰ اوس کا دیوتا تھا۔ لات ثقیف میں پوجا جاتا تھا اور منوت یعنی مناۃ اوس و خزرج کا معبود تھا۔ قیس جو عربی میں قیس ہے گو اس نام کے بت کے تصریح نہیں ملی لیکن عرب ناموں میں عبد القیس، امرالقیس ملتے ہیں اور چونکہ اہل عرب اپنے دیوتاؤں کے نسبت سے نام رکھتے تھے اس لیے یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ عبد القیس کا قبیلہ قیس کے پرستاروں میں ہو۔

ہومل اسلام کی انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے کہ اہل یمن کی طرح انباط میں بھی چاند گھٹنے اور بڑھنے کی حالت میں دو توام دیوتا سمجھا جاتا تھا۔

اوس و خزرج ازد اور غسان کی شاخ تھے۔ اس بنا پر مذہبی حیثیت سے بھی ان میں اتحاد پایا جاتا تھا۔ چنانچہ مناۃ دیگر قبائل ازد اور غسان کا معبود بھی تھا اس کے علاوہ ان قبائل اور ان کی شاخوں میں اور بھی چند دیوتا تھے۔ مثلاً۔

نام	مقام	پرستار
اقیصر	حدودِ شام	قضاعہ، لخم، جذام وغیرہ
عائم	"	ازد، السراۃ
فلس	جبس	طی
ذوالشریٰ	"	دوس ازد
ذوالکفین	"	دوس
باجر	"	ازد
ودّ	"	کلب
یغوث	"	انعم

ان قبائل میں ستارہ پرستی بھی تھی۔ لخم اور جذام ستارہ مشتری کو پوجتے تھے اور طے سہیل کے پرستار تھے۔ اس لیے ممکن ہے فلس کا ہیکل سہیل کے نام سے ہوا اور اقیصر مشتری ہو۔

بنو قیدار ابتداءً اپنے باپ دادا حضرت اسماعیل حضرت ابراہیم کے مذہب پر تھے۔ خانہ کعبہ کا رسم ابراہیمی کے مطابق حج کیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ مسئلہ حج کی غلط فہمی سے ان میں سنگ پرستی کا آغاز ہوا۔ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ مکہ اور حجاز میں بت پرستی کا بانی ایک شخص عمرو بن لحی ہے اس کے ملک شام سے تعلقات تھے۔ وہیں سے بت لا کر اس نے خانہ کعبہ اور اطرافِ مکہ میں پھیلا

دیے تھے۔ عدنانی قبائل کا سب سے بڑا بت، دیوتا ہبل تھا جو خانہ کعبہ میں نصب تھا۔ لات کا ہیکل شہر طائف میں تھا۔ مکہ سے چند میل دور عزیٰ نام ایک دیوی کا مسکن تھا۔ عدنانی قبائل کے یہ تین سب سے بڑے دیوتا تھے۔ ان پر چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔ قربانیاں ہوتی تھیں، ان کی نذریں مانی جاتی تھیں۔

یہ صرف عرب میں بت پرستی کی رُوداد ہے۔ یہ بت پرستی کس پس منظر میں کی جاتی تھی ان کے عابدوں کے تصورات کیا تھے اسے ہم یہاں نظرانداز کرتے ہیں، انشاء اللہ نویں پارے میں اس پر مبسوط بحث آئے گی۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ
اَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ
اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ
رَبَّکَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَعَلَی الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا کُلَّ ذِیْ
ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ
ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَایَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۭ ذٰلِكَ جَزَیْنٰهُمْ بِبَغْیِهِمْ ۡ
وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ فَاِنْ کَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّکُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ
وَلَا یُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۱۴۷﴾

آپ ان سے کہہ دیجیے کہ جو وحی میرے پاس آتی ہے اس میں تو میں کوئی چیز ایسی نہیں پاتا ہوں جو کھانے والے پر اس کا کھانا حرام ہو بجز اس کے کہ مردار ہو، یا بہتا خون یا سور کا گوشت کہ یہ بلاشبہ گندگی ہے یا پھر وہ چیز جو گناہ کا موجب ہو کہ اس پر نام پکارا

جائے اللہ کے سوا کسی اور کا، پھر جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور اس کا مقصد نافرمانی نہ ہو اور نہ حدِ ضرورت سے تجاوز کرنے والا ہو، تو تیرا رب بخشنے والا مہربان ہے۔[189] اور یہودیوں پر ہم نے تمام ناخن والے جانور حرام کر دیے اور گائے اور بکری کی چربی بھی حرام کر دی تھی ہاں وہ چربی ہم نے حرام نہیں کی تھی جو ان کی پیٹھ کو لگی ہو یا انتڑیوں سے جمی ہو یا ہڈی سے پیوست ہو، یہ ہم نے ان کی سرکشی کی سزا دی تھی اور ہم بالکل سچ بتا رہے ہیں۔[190] اس کے باوجود اگر وہ آپ کی تکذیب کریں تو آپ ان سے کہہ دیجئے کہ تمہارا رب بڑی ہی وسیع رحمت والا ہے اور مجرموں سے اس کا عذاب ٹلنے والا نہیں ہے۔[191]

معانی مفردات

مسفوحؔ سفح سے اسم مفعول ہے۔ سفح کے معنے ہیں بہتا ہوا خون حرام ہے خون بستہ

حرام نہیں ہے۔ رجس: ناپاک، پلید، گندا، سزا، بلا جمع ارجاس ہے۔ رجس کی چار صورتیں ہیں ۔۱۔ باعتبارِ طبیعت، ۲۔ باعتبارِ عقل، ۳۔ باعتبارِ شریعت، ۴۔ تینوں حیثیت سے رجس شرعی جوا اور شراب، رجس عقلی شرک اور لحم خنزیر تینوں کا مجموعہ مردار، اللہ تعالیٰ نے سب کے لیے رجس استعمال فرمایا ہے۔ فسق: کے اصل معنے نکل جانا ہیں اسی لیے یہ لفظ معروف سے منکر اور طاعت سے نافرمانی کی طرف نکل جانے کے لیے استعمال ہوا۔ قرآن میں یہ لفظ عام منکرات سے لے کر کفر و بغاوت تک سب کے لیے استعمال ہوا ہے ائمہ لغت کہتے ہیں کہ لفظ فاسق ان معنی میں عربی میں اسلام سے پہلے عہد جاہلی میں استعمال نہیں ہوا۔ فسق بحیثیت فعل بے جان چیزوں کے لیے ضرور استعمال ہوا ہے۔ لیکن بحیثیت اسم فاسق کا استعمال انسان کے لیے کلام عربی میں نہیں۔ اس معنے میں اس کا استعمال تمام تر قرآنی ہے۔ زبیدی کہتے ہیں لا یعرف اطلاقہ علیٰ ھذا المعنی قبل الاسلام۔ اھل: اہلال سے ماضی مجہول ہے۔ اہلال کے معنے آواز بلند کرنے کے ہیں۔ امام راغب لکھتے ہیں۔ چاند دیکھتے وقت جو آواز بلند کی جاتی ہے۔ اس کو اہلال کہتے ہیں، پھر یہ مطلقاً ہر آواز کے لیے استعمال ہونے لگا اور اسی سے بچہ کی پیدائش کے وقت بچہ کے رونے کی آواز کو اہلال کہتے ہیں۔ اور ما اُھل بہ لغیر اللہ کے معنے یہ ہیں کہ جس جانور پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ یعنی غیر اللہ کے لیے نام زد کرنا اور شہرت دینا اہلال ہے۔ اضطر: اضطرار سے ماضی مجہول ہے اور اضطرار ضرورت سے باب افتعال بنا ہے۔ اسلامی قانون میں نظریہ ضرورت کا یہی ماخذ ہے۔ الحوایا، حویۃ کی جمع ہے جیسے بلیۃ کی جمع بلایا، عطیہ کی جمع عطایا ہے۔ اس کے معنے آنت اور انتڑی کے ہیں۔ باس: لڑائی، دبدبہ، سختی، آفت، جنگ کی شدت اصل میں اس کے معنے سختی کے ہیں اور آفت کے ہیں۔ مگر لڑائی اور غلبہ کے معنے میں اس کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ بغی: سرکشی، زیادتی، ضد، مصدر ہے جہاں میانہ روی چاہیے وہاں میانہ روی سے بڑھنے کو بغی کہتے ہیں۔ بغی کا استعمال کمیت اور کیفیت دونوں میں ہوتا ہے۔

شریعتِ ابراہیمی کے محرمات

مشرکین کی حرام کردہ چیزوں کو جب قرآن نے حلال کر دیا تو مشرکین نے یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ مسلمانوں نے ان چیزوں کو بھی حلال کر دیا ہے جو حضرت ابراہیم و اسماعیل کے زمانے سے حرام چلی آ رہی تھیں۔ چونکہ اس قسم کے معاملات میں طبیعتیں حساس ہو جاتی ہیں اس وجہ سے مسلمانوں پر اس پروپیگنڈے کا کچھ اثر ہوا۔ قرآن نے اس پروپیگنڈے کی واضح لفظوں میں تردید کی اور آیت ۱۱۸ سے ۱۲۱ تک سمجھایا۔ اس کے بعد قرآن نے مشرکین کو مخاطب کر کے کہا کہ تم کس علم کے برتے پر ان جانوروں کو حرام کرتے ہو کوئی نقلی یا عقلی دلیل پیش کرو۔ اب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جا رہا ہے کہ آپ ان کو ان چیزوں کی فہرست بتا دیجئے جو اصلاً ملتِ ابراہیم میں حرام تھیں۔ اس سے مقصود مشرکین کی تردید ہے کہ انہوں نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت کچھ چوپایوں کو حرام قرار دے دیا ہے یہ بالکل بے سند بات ہے۔ ملتِ ابراہیمی میں جو چیزیں حرام تھیں وہ صرف یہ ہیں - مردار، خون، سور کا گوشت اور غیر اللہ کی نذر و نیاز۔ قل لا اجد کے سیاق و سباق کو سامنے رکھ کر غور کیجئے تو صاف معلوم ہو گا کہ حضور کو مشرکین کے سامنے اس امر کی وضاحت کا حکم ہو رہا ہے کہ تم نے جو بعض چوپایوں کی حرمت کو ملتِ ابراہیمی کی طرف منسوب کر رکھا ہے یہ بالکل بے سند بات ہے مجھ پر ملتِ ابراہیمی کے حلت و حرمت سے متعلق جو بات وحی کی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ میتہ، خون، لحم خنزیر اور ما اُھل بہ لغیر اللہ کے سوا چوپایوں میں سے کوئی چیز بھی ملتِ ابراہیم میں حرام نہیں ہے۔ اور چونکہ یہودیوں میں بھی کچھ پابندیاں لگی تھیں۔ قرآن نے یہاں موقعہ کی مناسبت سے ان پابندیوں کا تاریخی پس منظر بھی پیش کر دیا اور بتا دیا کہ ان پر یہ پابندیاں سزاءً عائد کی گئی تھیں ورنہ اصل میں ان پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ بہرحال ان آیات کا مطالعہ اسی پس منظر میں کرنا چاہیے جن لوگوں نے ان آیات کا مطالعہ اس سے ہٹ کر کیا ہے وہ اسلام میں محرمات کے موضوع پر بے حد الجھنوں کے شکار ہو گئے ہیں۔ سید رشید رضا اسی پریشانی میں بہت دور جا نکلے ہیں۔

۱۸۹- آپ ان سے کہہ دیجئے کہ جو وحی میرے پاس آتی ہے اس میں تو میں کوئی ایسی بات نہیں پاتا ہوں کہ کھانے والے پر اس کا کھانا حرام ہو بجز اس کے کہ مردار ہو یا بہتا خون یا سور کا گوشت کہ یہ بلاشبہ گندگی ہے یا پھر وہ چیز جو گناہ کا موجب ہو کہ اس پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا۔ پھر جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور اس کا مقصد نافرمانی نہ ہو اور نہ حدِ ضرورت سے زیادہ تجاوز کرنے والا ہو تو تیرا رب بخشنے والا مہربان ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں، یعنی جن جانوروں کے کھانے

کا دستور ہے ان میں سے یہی حرام ہے۔ اس آیت میں کفار کو یہی بتلانا ہے کہ جو چیزیں اوپر مذکور ہوئیں حلال تھیں جن کو تم نے حرام بنا لیا ہے اب وہ چیزیں بتلائی جاتی ہیں جو واقعی حرام ہیں اور تم ان کو حلال سمجھتے ہو باقی مضمون آیت کی تفسیر و توضیح سورۃ مائدہ میں گزر چکی ہے۔ یعنی حرمت علیکم المیتۃ والدم الخ کے تحت وہاں ملاحظہ کر لیا جائے۔[1]

یہاں سب سے اہم بات سمجھنے کی یہ ہے کہ اس آیت میں جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے اس کا بنیادی مقصد کیا ہے کیا اس میں اسلام کا ضابطہ، حلت و حرمت بیان ہو رہا ہے؟ یا اس میں ملتِ ابراہیمی میں جانوروں کی حلت و حرمت کا پیمانہ بتایا جا رہا ہے؟ عام شارحینِ قرآن نے چونکہ اس آیت کو جانوروں کے موضوع پر اسلام کا ضابطہ حلت و حرام سمجھ لیا ہے اس لیے ان کو یہاں اس آیت کی تشریح میں پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا اور انہوں نے اسی روشنی میں آیت کے قصر کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے نتیجہ میں انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ حیوانی غذاؤں میں صرف یہی چار چیزیں حرام ہیں ان کے سوا ہر چیز جائز ہے لیکن قرآن کے سیاق و سباق کی روشنی میں یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہاں مشرکینِ مکہ کو بتایا جا رہا ہے کہ تم نے اپنے مشرکانہ توہمات سے حیوانی غذاؤں میں جو چیزیں حرام قرار دے رکھی ہیں، یہ بے سند بات ہے۔ ملتِ ابراہیمی میں تو صرف یہ چار چیزیں حرام ہیں۔ اس آیت کے سیاق و سباق کو سامنے رکھ کر اس پر غور کیجئے تو صاف معلوم ہوگا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے مشرکین کے سامنے یہ وضاحت ہو رہی ہے کہ تم نے جو بعض چوپاؤں کی حرمت کو ملتِ ابراہیم کی طرف نسبت دے رکھی ہے یہ بالکل بے سند بات ہے۔ مجھ پر ملتِ ابراہیم کے ضابطہ حرمت و حلت سے متعلق جو وحی آئی ہے وہ تو یہ ہے کہ ان چار چیزوں کے سوا ملتِ ابراہیم میں کچھ بھی حرام نہیں ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنے افادات میں شاہ عبدالقادر کی جانب سے جو بات نقل کی ہے اس سے حضرت شاہ صاحب کا میلان بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جن جانوروں کا کھانا دستور ہے ان میں سے یہی چار چیزیں حرام ہیں۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں کہ اللہ کے نزدیک صرف یہ چار چیزیں حرام ہیں اور جن چیزوں کو مشرکین نے اپنی رائے سے حرام ٹھہرا لیا ہے وہ حرام نہیں ہیں۔ حافظ ابن کثیر کا میلان بھی اسی طرف ہے وہ فرماتے ہیں:

قرآن کی اس آیت کا منشا ان مشرکین کی تردید ہے جنہوں نے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اور حام کی ملتِ ابراہیمی میں بدعات نکال لی تھیں۔ اللہ سبحانہٗ نے اپنے رسول کو حکم دیا ہے کہ اعلان کر دو کہ اس موضوع پر میرے پاس جو وحی آتی ہے اس میں ان کی حرمت کا کوئی ذکر نہیں ہے حرام تو صرف یہ چار چیزیں ہیں مردار، خنزیر، بہتا خون اور غیر خدا کے نام پر پکاری ہوئی چیز، ان کے علاوہ کوئی حرام نہیں تم کیسے خیال کرتے ہو کہ فلاں چیز حرام ہے، تم کہاں سے حرام کرتے ہو۔

ضرورت ہے کہ آیت کا اسی پس منظر میں مطالعہ کیا جائے۔ جن لوگوں نے آیت کو سیاق و سباق سے ہٹا کر سمجھنے کی کوشش کی ہے اور انہوں نے اس آیت کو اسلام کا ضابطہ حلال و حرام سمجھ لیا ہے ان کو اس آیت کے سمجھنے میں بے حد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ اسلام میں صرف وہی چیزیں حرام نہیں ہیں جو آیت میں مذکور ہیں بلکہ ان کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں حرام ہیں۔ قاضی بیضاوی نے الی الغایۃ ابھی تک قید لگا کر اپنے مخاطبوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ آیت تو اسلام کا ضابطہ حلت و حرمت ہی بتا رہی ہے مگر مطلب یہ ہے کہ وحی الٰہی نے ابھی تک تو بس یہ چار چیزیں ہی حرام کی ہیں۔ یہ مراد نہیں کہ کل محرمات یہی ہیں لیکن قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے یہ کہہ کر اسے رد کر دیا ہے کہ ھذا القول غیر صحیح عندی اور کچھ کہتے ہیں کہ آیت میں تو یہ ہی بتایا ہے کہ محرمات چار ہی ہیں مگر آیت میں احادیث کے ذریعے تخصیص پیدا کی جا سکتی ہے لیکن امام رازی نے اسے یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ یہ تخصیص نہیں بلکہ تنسیخ ہے۔

اصل یہی ہے کہ یہ موقعہ محل سے ہٹا کر آیت کا مطلب ہے ورنہ آیت اپنے سیاق و سباق کے لحاظ سے اپنے مطلب میں بالکل واضح اور صاف ہے اور اس میں کوئی گنجلک نہیں کہ مشرکین نے جو چیزیں حرام ٹھہرا رکھی ہیں یہ محض من گھڑت ہیں، ملتِ ابراہیم میں چوپایوں کی حلت و حرمت سے متعلق جو وحی میرے پاس آئی ہے اس میں ان من گھڑت حرمتوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔ وہ چیزیں حرام نہیں ہیں جو یہ لوگ بتاتے ہیں بلکہ ملتِ ابراہیم میں صرف چار ہی حرام ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ اسلام میں صرف چار حرام ہیں اسلامی محرمات کا یہاں ذکر نہیں ہے۔ اسلامی محرمات کا ذکر المائدہ میں ہے۔

طاؤس یمانی کہتے ہیں کہ اہل جاہلیت کچھ چیزوں کو حلال اور کچھ کو حرام کہتے تھے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے کہا کہ ان سے کہہ دو لا اجد فیما اوحی الی محرماً اور ابوبکر الجصاص کہتے ہیں کہ اندازِ خطاب بھی طاؤس کا مؤید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے آیات میں مشرکین کی تحریمات کا ذکر کیا ہے اور مشرکین کی اس بات پر مذمت کی ہے کہ وہ خدا کی حلال کردہ چیزوں کو حرام بتاتے ہیں۔ اس کو ان کی جہالت اور حماقت قرار دیا اور پھر ان سے اپنے موقف پر دلیل کا مطالبہ کیا۔ اس کے بعد

فرمایا قل لا اجد فیما اوحی الی محرما" یعنی جن کو تم حرام کہتے ہو وہ حرام نہیں حرام تو صرف چار ہیں۔
جہاں تک اسلام کے ضابطہ حلت و حرمت کا معاملہ ہے دو سورہ مائدہ، سورہ بقرہ میں بیان ہو چکا ہے۔ المائدہ میں تکرار کے ساتھ اُحل لکم الطیبات کہہ کر کھلے لفظوں میں بتا دیا کہ اسلام میں حلت کی فطری بنیاد طیبات ہیں یعنی جو طیبات ہیں وہ حلال ہیں۔ طیبات کی ضد خبائث ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ خبائث حرام ہیں اور سورۂ اعراف میں نبوت کے مقاصد میں سے اہم مقصد یہ بتایا ہے یحل لھم الطیبات و یحرم علیھم الخبائث۔ یہ آیت مجمل ہے ارشادات نبوت اسی اجمال کی وضاحت ہیں۔ طیبات سے مراد ظاہر ہے کہ وہ چیزیں ہیں جو مزاج اور سرشت کے اعتبار سے پاکیزہ اور معتدل صحت بخش اور نافع ہوں۔ خبیثات سے مراد اس کے برعکس وہ چیزیں ہیں جو اپنے مزاج اپنی جبلت اور انسان کے مزاج و طبیعت پر اثر کے لحاظ سے مضر اور مفسد ہوں۔

اسلام میں حلت و حرمت کا اصل ضابطہ یہی ہے۔ اس ضابطہ کی موجودگی میں حلال و حرام کا معلوم کر لینا کچھ مشکل نہیں لیکن دُنیا میں نہ چوپاؤں کی کوئی حد ہے نہ پرندوں کی اور نہ دریائی جانوروں کی اور طیبات و خبائث میں تفاوتِ درجات اور فرقِ مراتب ہے۔ کوئی چیز زیادہ طیب ہوتی ہے کوئی چیز کم۔ اسی طرح کوئی چیز زیادہ خبیث ہوتی ہے کوئی کم۔ اس فرقِ مراتب کا اثر لازماً اس سے متعلق حکم پر بھی پڑتا ہے مثلاً ایک چیز حرام کر دی جاتی ہے، دوسری چیز کراہت ہی کے درجے میں رہتی ہے۔ اسی طرح بعض علامات میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک چیز کے اندر بجائے خود تو کوئی خرابی نہیں ہوتی لیکن کسی خارجی سبب سے اس کو کوئی خرابی لاحق ہو جاتی ہے اور وہ خبیث ہو جاتی ہے۔

اس بنا پر بہت سی چیزوں کے بارے میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہمارے فقہاء نے بہت سی چیزوں میں یہ اختلاف بھی کیا ہے اور معیار یہ بنا ہے کہ جس کی حلت کے بارے میں قانون اعلان کر دے وہ طیب ہے اور جس کو حرام کہہ دے وہ خبیث ہے۔ جن کے بارے میں شارع کی جانب سے قول کا حکم آجائے یا اسے خبیث فاسق کہہ دیا جائے وہ بھی خبیث حرام ہے۔ اور جن چیزوں کے بارے قرآن و سنت میں کوئی وضاحت نہیں ان میں کسوٹی یہی ہے کہ ان کو صحت بخشی، نافعیت پاکیزگی اور اعتدال کو پیش نظر رکھ کر طیبات کی ترازو میں تول کر طیب اور ان کے اضرار، انحراف انگیزی اور افساد کے پیش نظر خبائث کے پیمانہ سے ناپ کر خبیث قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی بنیاد پر درندہ جانوروں اور شکاری پرندوں، مردار خوار حیوانات کو امام ابوحنیفہ مطلقاً حرام قرار دیتے ہیں، مگر

امام مالک اور امام اوزاعی کے نزدیک شکاری پرندے حلال ہیں۔ لیث کے نزدیک بلی حلال ہے۔ امام شافعی کے نزدیک صرف وہ درندے حرام ہیں جو انسان پر حملہ کرتے ہیں۔ جیسے شیر، بھیڑیا، چیتا وغیرہ، عکرمہ کے نزدیک کوا اور بجو دونوں حلال ہیں۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ تمام حشرات الارض کو حرام قرار دیتے ہیں لیکن ابن ابی لیلے امام مالک اور اوزاعی کے نزدیک سانپ حلال ہے۔

میرے نزدیک اس موضوع پر احناف کا مسلک قرآن کے بیان کردہ ضابطہ حلت پر سب سے زیادہ پورا اترتا ہے۔ لیکن جیسے اجتہادی مسائل میں شریعت میں توسع ہے ایسے ہی ان کی وضاحت و بیان میں بھی اہلِ علم کے سینوں میں وسعت کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کے نزدیک ایک چیز ناجائز ہے اور آپ حنفی ہیں لیکن ایک مالکی کو دیکھتے ہیں کہ وہ ہی چیز وہ کھا رہا ہے تو آپ کو یہ حق نہیں ہے کہ آپ اسے مرتکب حرام قرار دیں۔

آئیے اب ایک جامع نظر خود آیتِ قرآنی کے معانی پر بھی ڈال لیجئے۔

ارشاد ہے لا اجد فیما اوحی الی محرما "جو وحی میرے پاس آئی ہے میں اس میں کسی چیز کو ان چار چیزوں کے علاوہ نہیں پاتا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مدار تحریم انسانی خیال، گمان، برادری کا رواج، ملک کا مفاد اور قومی مصالح نہیں بلکہ مدارِ تحریم صرف اللہ کی وحی ہے اور وحی عام ہے اس سے کہ متلو ہو یا غیر متلو۔

علی طاعم یطعمہ کسی کھانے والے جو اس کو کھائے۔ اس میں ایک طرف ان مشرکین کی تردید ہو رہی ہے جن کی تحریمات خالص توہمات کی تخلیق ہوتے ہیں۔ دوسری طرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لطیف استنباط بھی فرمایا کہ مُردار کا کھانا حرام ہے لیکن اس کی کھال دباغت کے بعد پاک ہو سکتی ہے اور وہ استعمال میں آسکتی ہے۔ مسند احمد میں ہے۔

عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ سودہ بنت زمعہ کی بکری مر گئی۔ انہوں نے یہ بات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی۔ آپ نے فرمایا تم نے اس کی کھال کیوں نہ لے لی۔ سودہ نے کہا کیا مری ہوئی بکری کی کھال ہم لے لیں، فرمایا کہ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے علی طاعم یطعمہ تم اسے کھاؤ گے نہیں، دباغت کر لو اور پھر استعمال میں لاؤ۔ سودہ نے آدمی بھیج کر کھال اتروا لی۔ اسے دباغت کرائی۔ بعد ازیں اس کا مشکیزہ بنا لیا۔

اس آیت میں چار چیزوں کی حرمت کا ذکر ہے مردار، لحم خنزیر، دم مسفوح اور غیر اللہ کے نام کیا ہوا۔ سورۃ مائدہ میں میتہ کی ذرا تفصیل بتائی گئی ہے۔ یعنی وہ جانور جو گلا گھونٹ کر مر گیا ہو یا

یا چوٹ کھا کر یا بلندی سے گر کر یا ٹکر کھا کر مرا ہو یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو۔ یہ دراصل میتہ کی تشریح ہے کہ مردار وہ ہی نہیں جو اپنی موت آپ مر جائے بلکہ جو جانور اس طرح ہلاک ہو وہ بھی مردار ہے۔

سورہ بقرہ کی آیت اور سورہ مائدہ میں دم مطلق ہے۔ یہاں مسفوح کی قید ہے۔ یعنی ایسا خون جو کسی جانور کو زخمی کر کے یا ذبح کر کے نکالا گیا ہو۔ یہ بھی تشریح ہے۔

یہاں لحم خنزیر کے بعد فرمایا ہے فانہ رجس بلاشبہ وہ ناپاک ہے۔ خنزیر کے بارے میں خاص طور پر یہ کہنا یہ بتانے کے لیے کہ اس کی نجاست بالذات ہے اسی لیے سُور کے تمام اجزاء میں سے کسی حصّہ کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے۔ اگر مُردار بھی بالذات حرام ہوتا تو اس کی کھال سے دباغت کے بعد بھی انتفاع جائز نہ ہوتا، ایسے ہی اگر خون بالذات حرام ہوتا تو تلی اور کلیجی حلال نہ ہوتی سُور چونکہ بالذات قرآن کے نزدیک نجس ہے اس لیے اس سے کسی حال میں انتفاع جائز نہیں ہے آخری چیز کی حُرمت یعنی ما اُھل بہ لغیر اللہ کی حرمت ذاتی نجاست کی وجہ سے نہیں بلکہ معنوی نجاست کی وجہ سے ہے۔ غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنا شرک ہے اور شرک معنوی نجاست ہے اس وجہ سے جس چیز کو شرک کی چھوت لگ جاتی ہے وہ بھی نجس ہو جاتی ہے۔ اس معنوی نجاست کو یہاں فسق کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کی حرمت محض حکمی نہیں بلکہ فطری اور عقلی بھی ہے۔

قرآن کا نظریۂ ضرورت

آیت کا آخری حصّہ فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فان ربک غفور رحیم۔ اضطرار ضرّ سے باب افتعال ہے۔ عربی زبان کے قاعدے کے مطابق ض کی مناسبت سے افتعال کی ت ط سے بدل گئی ہے۔ ضرہ الیہ کے معنے ہیں اس کو فلاں چیز کی طرف مجبور کر کے دھکیل دیا۔ اضطرہ الیہ کے معنے ہیں اس کو فلاں چیز کی طرف مجبور کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بھوک یا پیاس سے مجبور ہو جائے تو وہ حرام کردہ چیزیں بھی جان بچانے کے لیے استعمال کر سکتا ہے لیکن یہ اضطرار واقعی ہو تو اس کے اندر حرام کی کسی چاہت کو دخل ہو اور نہ آدمی اس حد سے آگے بڑھے جس حد تک آگے بڑھنا جان بچانے کے لیے ناگزیر ہو۔ ان احتیاطوں کے ساتھ کسی واقعی مجبوری میں اگر کوئی شخص کسی حرام چیز سے فائدہ اٹھاتے تو فرمایا ہے کہ اللہ غفور و رحیم ہے۔ ضرر اور ضرورت میں اگرچہ بنیادی فرق ہے اور ضرورت ضرر سے ہلکا درجہ ہے لیکن فقہائے نے اسی آیت سے نظریہ ضرورت بھی پیدا کر لیا ہے۔ حافظ ابن القیم نے دونوں میں باعتبارِ مرتبہ فرق رکھا ہے۔ ضرر کی حالت میں

اصل حرام اور وہ چیزیں جو بالذات حرام ہیں جائز ہو جاتی ہے لیکن ضرورت کی حالت میں صرف وہ چیزیں جائز ہوئی ہیں جو بالذات حرام نہیں ہیں بلکہ ذریعہ حرام ہونے کی وجہ سے حرام ہیں۔ اس کی بہترین مثال ابن القیم نے ربائے نسیئہ اور ربائے فضل سے دی ہے۔ ربائے نسیئہ کہ آپ کسی کو اُدھار دیں اور بڑھا چڑھا کر وصولیابی کریں یہ بالذات حرام ہے اور ربائے فضل یہ ہے کہ آپ اجناس میں سے ایک دوسرے سے زیادتی یا کمی کیساتھ تبادلہ کریں۔ یہ ذریعہ حرام ہونے کی وجہ سے حرام ہے۔ فقہائے نے اسی سے یہ بھی استنباط کیا ہے کہ ضرر کا ازالہ ضروری ہے اور بڑے ضرر کے ازالہ کے لیے اگر ناگزیر ہو تو ایسے طریقے بھی اختیار کیے جا سکتے ہیں جو اس سے کمتر ضرر کے حامل ہوں۔ نیز یہ کہ اجتماعی ضرر انفرادی ضرر کے مقابلہ میں زیادہ وزنی اور قابلِ لحاظ ہے۔ اس کی روشنی میں بہت سے معاشی، اجتماعی مسائل حل کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً اسلامی ریاست انفرادی حقوقِ ملکیت میں ہر وہ مداخلت کر سکتی ہے جو ضررِ عام کے ازالہ اور اجتماعی مصالح کے تحفظ کے لیے ناگزیر ہو۔ عام حالات میں افراد کے وسیع مالکانہ حقوق میں کوئی مداخلت نہ کی جائے گی لیکن مخصوص حالات میں ریاست عام اصُول کے برخلاف انفرادی آزادی اور انفرادی حقوقِ ملکیت مداخلت کر سکتی ہے۔

ہماری رائے میں اسلامی ریاست کو اسی اصُول کی بنا پر یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ضرر کے ازالہ کے لیے کسی کاروباری ادارے یا صنعت کو افراد کی ملکیت سے نکال کر قومی تحویل میں لے لے۔ البتہ ایسا کرتے وقت وہ متعلق افراد کو ضرر سے بچانے کے لیے ان کی ملکیت کا پورا معاوضہ دے گی اور ان کے ہونے والے نقصان کی ہر ممکن تلافی کرے گی۔

بہرحال یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں ہے۔ ازالہ ضرر اور ضرورت کی بہت صورتیں ہیں۔ اضطرار اور اکراہ کا تقابلی مطالعہ ہم انشاء اللہ چودھویں پارے میں کریں گے۔

یہود پر کچھ طیّبات کی حُرمت

۱۹۰- اور یہودیوں پر ہم نے تمام ناخن والے جانور حرام کر دیے اور گائے اور بکری کی چربی بھی حرام کر دی تھی۔ ہاں وہ چربی ہم نے حرام نہیں کی تھی جو ان کی پیٹھ کو لگی ہو یا انتوں سے چمٹی ہوئی ہو یا ہڈی سے پیوستہ ہو۔ یہ ہم نے ان کی سرکشی کی سزا دی تھی اور ہم بالکل سچ بتا رہے ہیں۔ یعنی اصلی حرمت تو ان چیزوں میں ہے جو اوپر مذکور ہوئیں۔ البتہ وقتی مصلحت سے بعض چیزیں عارضی طور پر بعض اقوام پر پہلے حرام کی جا چکی ہیں۔ مثلاً یہود پر ان کی شرارت کی پاداش میں ہر ناخن، کھروالا جانور جس کی انگلیاں

پھٹی نہ ہوں جیسے اونٹ، شتر مرغ، بطخ وغیرہ حرام کیا گیا تھا۔ نیز گائے، بکری کی جو چربی پشت یا انتڑیوں پر نہ لگی ہو یا ہڈی کے ساتھ نہ لگی ہو ان پر حرام کر دی گئی تھی جیسے گردہ کی چربی۔ بنی اسرائیل کا دعویٰ غلط ہے کہ یہ چیزیں ابراہیم و نوح علیہما السلام کے زمانہ ہی سے مستمر طور پر حرام چلی آتی ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی عہد ابراہیمی میں حرام نہ تھی۔ یہود کی نافرمانیوں اور شرارتوں کی وجہ سے یہ سب چیزیں حرام ہوئیں۔ جو کوئی اس کے خلاف دعویٰ کرے جھوٹا ہے جیسے چوتھے پارے کے آغاز میں قل فاتوا بالتوراۃ فاتلوھا ان کنتم صادقین سے ان دعویٰ کرنے والوں کو چیلنج کیا گیا ہے[1]

جو بات یہاں آیت ۱۴۶ میں یہودیوں کے بارے میں کہی گئی ہے یہی بات چھٹی جلد آیت ۱۶۰ میں اور چوتھی جلد آیت ۹۳ میں آچکی ہے اور آئندہ چودھویں جلد میں آیت نمبر ۱۱۹ میں آرہی ہے۔ لیکن جو تفصیل یہاں پیش کی جارہی ہے دوسری جگہ نہیں ہے۔ چوتھے پارے میں یہ بات اس طرح کہی گئی ہے

کل الطعام کان حلاً لبنی اسرائیل الا ما حرم اسرائیل علیٰ نفسہ من قبل ان تنزل التوراۃ قل فاتوا بالتوراۃ فاتلوھا۔

کھانے کی یہ ساری چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں ہاں کچھ چیزیں ایسی تھیں جن کو تورات کے نازل ہونے سے پہلے اسرائیل نے خود اپنے آپ پر حرام کر لی تھیں۔ ان سے کہو کہ اگر سچے ہو تو تورات لاؤ اور پڑھو۔

اس کے بعد سورۂ نساء کی آیت ۱۶۰ میں یہ بات اس طرح دہرائی گئی ہے۔

فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبات احلت لھم

غرض یہودیوں کے اس ظالمانہ رویہ کی وجہ سے ہم نے ان پر بہت سی وہ پاک چیزیں حرام کر دی ہیں جو پہلے حلال تھیں۔

اور اب یہاں فرمایا جارہا ہے کہ ہم نے ان پر ناخن والے جانور حرام کر دیے اور بکری اور گائے کی چربی بھی ان کے لیے حرام ٹھہرادی اور یہ اس لیے ہوا کہ ہم نے ان کو ان کی سرکشیوں کی سزا دی ہے۔ ذالک جزیناھم ببغیھم یعنی چربی کی اور ناخن والے جانوروں کی حرمت اس لیے نہ تھی کہ یہ چیزیں ذات میں کوئی ایسی علت رکھتی تھیں جس کی بنا پر ان کو حرام قرار دیا ہے بلکہ ان کے حرام ہونے کی اصلی علت خود بنی اسرائیل کے کردار میں تھی۔ ان کی حرمت میں اصل دخل ان کے فساد مزاج کو تھا۔ ان کے

---

[1] لہ افادات شیخ الاسلام

اخلاقی فساد کو روکنے کے سزا کے طور پر بہت سی جائز چیزوں پر ان کے لیے پابندی لگا دی گئی تھی۔ موجودہ تورات میں ان محرمات کا تذکرہ موجود ہے۔ پہلے چربی کی حرمت کا مسئلہ پڑھیے۔

اور خداوند نے موسیٰ سے کہا بنی اسرائیل سے کہہ کہ تم لوگ نہ تو بیل کی نہ بھیڑ کی اور نہ بکری کی کچھ چربی کھانا۔ جو جانور خود بخود مر گیا ہو اور جس کو درندوں نے پھاڑا ہو ان کی چربی اور کام میں لاؤ تو لاؤ پر تم کسی حال میں نہ کھانا کیونکہ جو کوئی ایسے چوپائے کی چربی کھاتے جسے لوگ آتشیں قربانی کے طور پر خداوند کے حضور چڑھاتے ہیں وہ کھانے والا آدمی اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے۔

(احبار باب ۷، آیت ۲۲-۲۵)

دوسرے مقام پر چربی کی ان تمام قسموں کی تفصیل بھی بتائی گئی ہے۔

جس چربی سے انتڑیاں ڈھکی رہتی ہیں اور وہ سب چربی جو انتڑیوں پر لپٹی رہتی ہے اور دونوں گردے اور ان کے اوپر کی چربی جو کمر کے پاس رہتی ہے اور جگر پر کی جھلی گردوں سمیت ان سب کو وہ الگ کرے اور کاہن ان کو مذبح پر جلائے۔ یہ اس آتشیں قربانی کی غذا ہے جو راحت انگیز خوشبو کے لیے ہوتی ہے، ساری چربی خداوند کی ہے۔ یہ تمہاری سب سکونت گاہوں میں نسل در نسل ایک دائمی قانون رہے گا کہ تم چربی یا خون مطلق نہ کھاؤ۔

(احبار باب ۳)

آیتِ قرآنی تو صرف یہ بتا رہی ہے کہ جو چربی گوشت کے حصہ کی حیثیت رکھتی ہو، کمر یا ہڈیوں یا آنتوں میں اس طرح شامل ہو کہ اس کو آسانی سے الگ نہ کیا جا سکے اس کے سوا تمام چربی بنی اسرائیل پر حرام تھی۔ اور تورات کی یہ تصریحات بتا رہی ہیں کہ چربی بلا قید حرام تھی۔ قرآن کی بات قرینِ قیاس ہے۔ شاید یہ اضافہ یہودی علماء و فقہاء کا کارنامہ ہے۔

آیت میں کُل ذِی ظُفر، سے کیا مراد ہے۔ ظفر ناخن کو کہتے ہیں۔ امام راغب نے تصریح کی ہے کہ ظفر کا استعمال انسان اور غیر انسان دونوں کے لیے ہوتا ہے۔ اور لسان العرب میں اس پر یہ اضافہ ہے کہ جو جانور شکار نہیں کرتے ان کے ناخنوں کو ظفر کہتے ہیں اور جو شکار کرتے ہیں ان کے پنجہ کو مخلب کہتے ہیں۔ تورات میں ان جانوروں کی احبار اور استثناء میں بہت بڑی تفصیل دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ صرف وہ جانور حلال ہیں جن کے پاؤں چرے ہوتے ہیں اور وہ جگالی بھی کرتے ہوں جن کے اندران میں سے کوئی شرط بھی مفقود ہو وہ ان کے ہاں حرام ہے۔ احبار میں ہے:

پھر خداوند نے موسیٰ اور ہارون سے کہا کہ تم بنی اسرائیل سے کہو کہ زمین کے سب

حیوانات میں سے جن جانوروں کو تم کھا سکتے ہو وہ یہ ہیں۔ جانوروں میں جن کے پاؤں چرے ہوتے ہیں وہ جگالی کرتے ہیں یا جن کے پاؤں الگ ہیں ان میں سے تم ان جانوروں کو نہ کھانا، یعنی اونٹ کو کیونکہ وہ جگالی کرتا ہے پھر اس کے پاؤں الگ نہیں وہ تمہارے لیے ناپاک ہے اور خرگوش کو کیونکہ وہ جگالی تو کرتا ہے پر اس کے پاؤں الگ نہیں وہ بھی تمہارے لیے ناپاک ہے اور سُور کو کیونکہ اس کے پاؤں الگ اور چرے ہوتے ہیں اور وہ جگالی نہیں کرتا وہ بھی تمہارے لیے ناپاک ہے تم ان کا گوشت نہ کھانا اور ان کی لاشوں کو نہ چھونا وہ تمہارے لیے ناپاک ہیں۔　　　　(احبار باب ۱۱ آیات ۱ تا ۸)

اس روشنی میں اگر ذی ظفر کا مفہوم متعین کیا جائے تو اس سے مراد وہ جانور ہوں گے جن کے پاؤں چرے ہوئے نہیں ہیں بلکہ سم کی شکل میں وہ بند اور ان کے سامنے کے حصہ پر ناخن ہیں۔ یہود پر اس طرح کے تمام جانور حرام تھے۔

قرآن نے پہلے حرمنا کہہ کر تصریح کی ہے کہ ہم نے یہود پر یہ چیزیں حرام کی تھیں۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ بھی انکشاف فرمایا کہ ایسا ہم نے کیوں کیا فرمایا ذالک جزینٰھم ببغیھم ہم نے یہ کام ان کے باغیانہ کردار کی پاداش میں کیا۔ بغی کے معنے سرکشی کے آتے ہیں۔ بنی اسرائیل کی اس بغاوت کا ذکر خود تورات میں بھی موجود ہے اور قرآن میں بھی بغاوت کے واقعات بتائے گئے ہیں۔ ان کے اس باغیانہ مزاج کا اثر ان کی شریعت پر بھی پڑا۔ جس طرح کسی سرکش جانور کا مالک اس کو سخت بندھنوں کے اندر رکھنے پر مجبور ہوتا ہے یا سرکش رعایا کا حکمران سخت قوانین نافذ کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان سرکشوں کی نہایت سخت قوانین کے ذریعے گوشمالی کی ہے۔ یہ کہنا کہ یہ تحریم خدائی تحریم نہیں بلکہ یہودی احبار کی اپنی خود ساختہ و پرداختہ ہے۔ اور پھر یہ کہنا کہ خدائی تعزیم کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے باغی بندوں پر بناوٹی شارعوں اور جعلی قانون سازوں کو مسلط کر دے، پھس پھسی بات ہے۔ جب خود قرآن کہتا ہے کہ یہ تحریم خدا کی جانب سے ہوئی ہے اور ان کی باغیانہ زندگی کی پاداش میں ہوئی ہے تو پھر ان دوراز کار موشگافیوں کی ضرورت کیا ہے ؟ اس صورت میں آیت کے مطالب بالکل پیچیدہ ہو کر رہ جائیں گے۔ حالانکہ معاملہ بالکل واضح اور صاف ہے کہ یہ تحریم اللہ سبحانہ کی جانب سے ہوئی اور اس کی علت یہود کی سرکشی اور گردن کشی تھی۔ یعنی تحریم میں اصل دخل یہود کے فساد اخلاق کو تھا۔ جس طرح ایک طبیب بسا اوقات کسی مریض کو ایک جائز و طیب چیز کے استعمال سے بھی روک دیتا ہے کہ اس سے اس کی صحتِ جسمانی کو ضرر کا

اندیشہ ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہود کے اخلاقی فساد کی وجہ سے سزا کے طور پر بہت سی جائز چیزیں بھی ان پر حرام ٹھہرا دی تھیں۔

یہ سوال کہ یہودیوں کی وہ بغاوت کیا تھی جس کی پاداش میں اللہ نے ان پر یہ چیزیں حرام کی تھیں؟ اس کا جواب خود قرآن نے سورۂ نسآء میں دیا ہے کہ ان کی سرکشی اور بغاوت یہ تھی۔ ان کی ظالمانہ روش راہ خدا میں قدم قدم پر رکاوٹیں سُود خواری اور حرام خوری، یہی چار باتیں اس تحریم خداوندی کی علت ہیں۔

اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا بھی بالکل بے معنی اور عبث ہے کہ علی الذین ھادوا چونکہ قصر کا فائدہ دے رہا ہے یعنی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں صرف یہود پر حرام ہوئی تھیں۔ اور آیت سے ظفر سے پنجہ مراد لینا اس لیے تمام درندے اور وہ تمام پرندے جو پنجہ دار ہیں صرف یہودیوں کے لیے حرام ہیں مسلمانوں کے لیے حرام نہیں ہیں۔ آیت میں اس مطلب کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ الجصاص نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ:

> اللہ تعالیٰ کی یہ تحریم ان کے حق میں زبانِ نبوت سے عمل میں آئی ہے۔ یہ تحریم ہماری شریعت میں معتبر ہوگی جب تک اس کا کوئی ناسخ نہ ہو۔ کتوں اور درندوں کی تحریم کا نسخ ثابت نہیں اس لیے وہ حرام ہی رہیں گے۔

حیرت ہے کہ کچھ شارحینِ قرآن نے صحیح احادیث کو رد کرنے میں بھی بڑی بے باکی کا مظاہرہ کیا ہے۔

مکذبین کو دھمکی

۱۹۱۔ اس کے باوجود اگر وہ آپ کی تکذیب کریں تو آپ ان سے کہہ دیجیے کہ تمہارا رب بڑا ہی وسیع رحمت والا ہے اور مجرموں سے اس کا عذاب ٹلنے والا نہیں ہے۔ اس میں دونوں کو دھمکی ہے قریش اور یہود کو یا صرف یہود کو۔ اکثر شارحینِ قرآن کہتے ہیں کہ یہود کو، لیکن ہماری رائے میں دونوں کو دھمکی ہے، اصل میں قریش مخاطب ہیں اور ضمناً یہود، قرآن بتا رہا ہے کہ اگر اس ساری وضاحت کے باوجود بھی اگر یہ آپ کی تکذیب کریں تو آپ ان کو بتا دیں کہ اللہ کے دو قانون ہیں ایک قانونِ امہال ہے اور دوسرا قانونِ اخذ ہے۔ قانونِ امہال اس کی رحمت کا تقاضا ہے اور قانونِ اخذ اس کے عدل کا تقاضا ہے۔ اللہ چونکہ بڑی رحمت والا ہے اس لیے وہ سرکشوں اور باغیوں کو ڈھیل پر ڈھیل اور مہلت پر مہلت دیتا ہے لیکن ڈھیل پر مغرور نہ ہونا چاہیے۔ اس سے اللہ کی پکڑ پیچھے تو ہٹ جاتی ہے لیکن اس سے اس کی سنت باطل نہیں ہوتی۔ اس نے جو قانون پکڑ کے لیے مقرر کر رکھا ہے،

جب اس کا نفاذ ہو گا تو کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتا۔ شاید کہنے والوں نے اٰنّا لصادقون سن کر کہا ہو گا اگر سچے ہو تو عذاب کیوں نہیں آتا۔ فرمایا اس لیے کہ اس کی وسیع رحمت کا تقاضا ہے کہ مہلت پر مہلت دے لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ مجرموں سے عذاب ٹل جائے گا۔ دیر تو ہے مگر اندھیر نہیں ہے۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا
وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ
حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ
إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ﴿۱۴۸﴾
قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۖ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۱۴۹﴾
قُلْ هَلُمَّ شُهَدَاءَكُمُ الَّذِينَ يَشْهَدُونَ أَنَّ اللَّهَ حَرَّمَ
هَٰذَا ۖ فَإِنْ شَهِدُوا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ
الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ
وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ ﴿۱۵۰﴾ ع

یہ مشرک لوگ ضرور کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے، اے پیغمبر بالکل اسی طرح ان لوگوں نے بھی حق کو جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے

ہیں تا آنکہ ان کو ہمارے عذاب کا مزہ چکھنا پڑا[192]۔ اے پیغمبر تم کہہ دو کیا تمہارے
پاس کوئی علم کی روشنی ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو اگر ہے
تو لاؤ، تم تو محض گمان و وہم پر چل رہے ہو اور تم تو صرف اٹکل اور اندازے
کے تیر چلا رہے ہو، اے پیغمبر تم کہہ دو کہ لوگو حقیقت رس اور پکی دلیل
تو اللہ ہی کی ہے اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت عطا کر دیتا[193]۔ ان سے
کہو کہ اپنے وہ گواہ پیش کرو جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ نے ان
چیزوں کو حرام کیا ہے پھر اگر ان کے گواہ گواہی دے دیں تو آپ ان
کی ہاں میں ہاں نہ ملائیں اور آپ ان لوگوں کی خواہش کی پیروی نہ
کریں جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے اور جو آخرت پر
یقین نہیں رکھتے ہیں اور وہ دوسری ہستیوں کو اپنے رب کے برابر
ٹھہراتے ہیں[194]۔

معانی مفردات

ذاقوا ذوق سے ماضی کا واحد مونث غائب ہے جس کے معنے چکھنا ہیں۔

تخرصون، خرص سے مضارع کا جمع مذکر حاضر، تم اٹکلیں چلاتے ہو، تم تجویزیں کرتے ہو، تم جھوٹ بولتے ہو۔ اصل میں خرص پھلوں کا اندازہ لگانے کو کہتے ہیں اور اسی لیے ہر وہ بات جو ظن و تخمین کی بنا پر ہو خرص کہلاتی ہے خواہ وہ حقیقت کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ حجۃ، کسی دعویٰ کی دلیل اور سند کو کہتے ہیں اور بالغہ کے معنے ہیں اپنی متانت، مضبوطی اور اثبات دعویٰ میں آخری حد کو پہنچی ہوئی ایمان بالغہ تاکید میں انتہا کو پہنچی ہوئی قسمیں۔ یہاں الحجۃ البالغہ کے معنے ہیں مضبوطی اور پائداری میں انتہا کو پہنچی ہوئی دلیل۔ ھلم یہ اسمائے افعال میں سے حجاز والے اس کو اسی طرح بولتے ہیں اور بنی تمیم اس کی مونث تثنیہ اور جمع کی صورتیں بھی بنا لیتے۔ مثلاً ھلما، ھلمی اور ھلموا وغیرہ۔ لازم اور متعدی دونوں طرح آتا ہے۔ یہاں متعدی ہے۔ یعدلون، عدل سے مضارع کا جمع مذکر غائب ہے۔ اس کے معنے برابر کرنا ہیں۔ انصاف کو عدل اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ حقوق میں برابری ہے۔

غلط کاری کے لیے مجرمین کا عذر لنگ

انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ ارادے کی پوری قوت اور اپنے بدن کی ساری توانائیاں برائیوں کو پروان چڑھانے میں خرچ کرتا رہتا ہے۔ شرک کرتا ہے کفر کرتا ہے۔ سارے معاصی کا ارتکاب کرتا ہے لیکن جب اس سے برائیوں سے رکنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ یہ عذر لنگ پیش کر دیتا ہے کہ ہمارے حق میں اللہ کی مشیت یہی ہے۔ اگر خدا چاہتا کہ ہم ایسا نہ کریں تو کیونکر ممکن تھا کہ یہ کام ہم کرتے۔ قرآن نے جا بجا مشرکوں کا یہ عذر لنگ نقل کیا ہے کہ شرک اگر کوئی برائی ہے تو خدا ہمیں کیوں برائی کرنے دیتا ہے اگر وہ چاہتا کہ ہم شرک نہ کریں تو کبھی ایسا نہ ہو سکتا کہ ہم اور ہمارے باپ دادا ایسی بات کر سکتے۔ اگر وہ چاہے تو اب بھی ہمیں روک سکتا ہے۔ قرآن نے ان کے اس عذر لنگ کا یہاں بھی جواب دیا ہے اور دوسرے مواقع پر بھی دیا ہے اور بتایا ہے کہ اپنی غلط کاری اور بدعملی کے لیے مشیتِ الٰہی کو معذرت بنا کر پیش کرنا اور اسے بہانہ بنا کر صحیح رہنمائی کو قبول کرنے سے انکار کرنا مجرموں کا ہمیشہ سے وطیرہ رہا ہے اور اس کا انجام یہ ہوا ہے کہ وہ تباہ ہو گئے۔ یہ معذرت دراصل حقیقت آگاہی پر مبنی نہیں بلکہ ان کے محض گمان اور تخمینہ کی تخلیق ہے۔ انہوں نے خدا کی مشیت کو کہیں سن لیا ہے اور اس پر اپنے گمانوں سے خیالات کا ایک محل بنا لیا۔ ان کو یہ پتہ ہی نہیں ہے کہ انسان کے حق میں فی الواقع اللہ کی مشیت کیا ہے۔

انہوں نے خدا کی مشیت کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ چور اگر مشیتِ الٰہی کے تحت چوری کر رہا ہے تو وہ مجرم نہیں ہے حالانکہ دراصل انسان کے حق میں خدا کی مشیت یہ ہے کہ وہ شکر و کفر ہدایت اور ضلالت طاعت اور معصیت میں سے جو راہ بھی اپنے لیے منتخب کرے گا خدا وہ ہی راہ اس کے لیے کھول دے گا۔

دراصل یہاں دو صداقتیں ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام دُنیا اور اس کے ذرّے ذرّے پر قدرت رکھتا ہے۔ آسمان، زمین اور بحر و بر میں کوئی چیز نہیں جو اس کی مشیت اور ارادے کے بغیر حرکت کر سکے اس طرح انسان اور اس کے تمام اعمال بھی اسی کی قدرت اور مشیت کے ماتحت ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے کہ انسان کو اپنے اعمال کے کرنے نہ کرنے کا کسی نہ کسی طرح اختیار ضرور بخشا گیا ہے۔ اگر یہ اختیار تسلیم نہ کیا جائے اور انسان کو اسی طرح سراپا مجبور فرض کیا جائے جس طرح دوسری مخلوقات ہے تو پھر انسان کے لیے خیر و شر کا امتیاز، جزا و سزا، شریعت، کتابی تعلیم اور انبیاء کی بعثت یہ تمام چیزیں بے کار ہو کر رہ جائیں۔ ظلم و انصاف دُنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے۔ الغرض یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں ایک یہ کہ خدا کو اپنی مخلوقات پر قدرت تامہ حاصل ہے اور اس کی مشیت ہر جز و کل پر حاوی ہے۔ دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے عمل کا ذمہ دار ہے۔ قرآن نے ان دونوں صداقتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے اور ان کی تبلیغ کی ہے۔

۱۹۲- یہ لوگ ضرور کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ اے پیغمبر بالکل اسی طرح ان لوگوں نے بھی حق کو جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں تا آنکہ ان کو ہمارے عذاب کا مزہ چکھنا پڑا۔ گزشتہ رکوع میں مشرکین سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ جن حلال و طیب چیزوں کو تم نے حرام ٹھہرا لیا ہے اور اس تحریم کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہو۔ اس کی سند اور دلیل پیش کرو۔ یہاں ان کی جانب سے یہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو اس کو قدرت تھی کہ ہم کو اور ہمارے اسلاف کو اس تحریم سے بلکہ تمام مشرکانہ افعال و اقوال سے روک دیتا جب نہ روکا اور یوں ہی ہوتا رہا تو معلوم ہوا کہ اس کے نزدیک ہماری یہ کارروائیاں پسندیدہ ہیں، ناپسند ہوتیں تو ان کے کرنے میں ہم کو اب تک آزاد کیوں چھوڑتا؟

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ایک نیک نام مدبّر گورنمنٹ کسی باغیانہ تحریک میں حصہ لینے والوں کو باوجود یقینی اطلاع اور کافی قدرت کے پہلے ہی دن پکڑ کر پھانسی نہیں دے دیتی۔ وہ اس کی حرکات

کی نگرانی رکھتی ہے۔ کبھی رویہ درست رکھنے کی ہدایت کرتی ہے اور موقع دیتی ہے کہ آدمی ایسی حرکات کا انجام سوچ کر خود سنبھل جائے۔ کبھی اصلاح سے مایوس ہو کر ڈھیل چھوڑتی ہے کہ اس کی بغاوت کا ایسا باضابطہ اور مکمل مواد فراہم ہو جائے جس کے بعد اس کی انتہائی مجرمانہ غداری قانونی حیثیت سے علی رؤس الاشہاد ثابت کی جا سکے۔ ان تمام صورتوں میں مجرم کی باگ ڈھیلی چھوڑ دینے اور فوراً سزا نہ دینے سے کیا یہ ثابت ہوگا کہ گورنمنٹ کی نظر میں وہ کارروائی جرم و بغاوت نہیں ہے۔ گورنمنٹ کی نگاہ میں ان افعال کا جرم ہونا اوّل تو اس کے شائع کیے ہوئے قانون سے ظاہر ہے۔ دوسرے یہ کہ جب یہ مجرم مہلت پوری ہونے پر عدالت کے کٹہرے میں لایا جائے گا اور باضابطہ اثبات و اظہار جرم کے بعد پھانسی یا حبس دوام کی سزا بھگتے گا تب برای العین مشاہدہ ہو جائے گا کہ گورنمنٹ کی نظر میں یہ کتنا بڑا جرم تھا۔

بہر حال گورنمنٹ کا کسی جرم پر باوجود علم و قدرت کے کسی مصلحت سے فوری سزا نہ دینا اس کی ہرگز دلیل نہیں ہے کہ وہ جرم کو جرم ہی تصور نہیں کرتی۔ اسی پر قیاس کر لیجئے کہ وہ احکم الحاکمین ابتدائے آفرینش سے آج تک بتوسط اپنے صادق القول اور پاکباز نائبین کے ہر قسم کے قوانین و احکام سے بندوں کو مطلع فرماتا رہا اور کھول کھول کر بتلا دیا کہ کونسی بات اسے پسندیدہ ہے اور کون سی ناپسندیدہ، کبھی پے درپے کبھی تھوڑے وقفہ کے بعد ان احکام و ہدایات کی یاددہانی بھی ہوتی رہی۔ اس دوران میں خلاف ورزی کرنے والوں سے مسامحت اور درگذر کی حد تک درگزر اور چشم پوشی کی گئی۔ معمولی تنبیہات کی ضرورت ہوئی تو وقتاً فوقتاً انہیں بھی کام میں لایا گیا اور جن کی شقاوت کا پیمانہ لبریز ہونے والا تھا اس کو ڈھیل دی گئی کہ وہ صاف اور علانیہ طور پر اپنے خدا کی سزا کے مستحق ٹھہر کر کیفر کردار کو پہنچیں۔ چنانچہ بہت سی قومیں اپنے جرائم کی پاداش کا دنیا ہی میں تھوڑا تھوڑا مزہ چکھ چکی ہیں۔ پھر ان حالات کی موجودگی میں کسی قوم کے چند روز جرائم میں مبتلا رہنے اور فوراً نہ پکڑے جانے سے کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ معاذ اللہ وہ جرائم خدا کے نزدیک پسندیدہ ہیں ورنہ خدا انہیں ایک گھنٹہ کی بھی مہلت نہ دیتا۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

رہا یہ سوال کہ خدا نے انسان کی ساخت ہی ایسی کیوں نہ بنا دی کہ وہ برائی کی طرف قطعاً جا ہی نہیں سکتا۔ اور اس طرح فطرۃً اسے مجبور کر دیا جاتا کہ نیکی اور بھلائی کے سوا کوئی چیز اختیار ہی نہ کر سکے۔

اگر ذرا غور کیا جاتے تو اس سوال کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو ایسا کیوں نہ پیدا کیا گیا کہ وہ انسان نہ ہوتا اینٹ پتھر ہوتا جو ادراک و شعور اور کسب و اختیار سے یکسر خالی ہے یا گدھے گھوڑے وغیرہ جانوروں کی طرح جزئی احساس و ارادہ رکھنے والا حیوان ہوتا جو ازل سے ابد تک اپنے مخصوص و متشابہ افعال و احوال کے محدود دائرے میں چکر لگاتا ہے اور یا بہت عزت دی جاتی تو فرشتوں کی صف میں بٹھلایا جاتا جو محض طاعت و عبادت کے اختیار کرنے پر مجبور و مفطور ہیں۔ الحاصل یہ کلی ادراکات اور عظیم الشان کسبی تصرفات رکھنے والی ترقی پذیر نوع ہی صفحہ ہستی پر نہ لائی جاتی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ کوئی انسان اپنے شرف و مجد کا بلند بانگ دعوی رکھتے ہوتے اس قسم کی یاوہ گوئی نہ کرے گا کر سرے سے اپنی نوع کے وجود کا ہی مخالف ہو جاتے۔ پھر اگر نوع انسانی کا اس کی عقلی و عملی قوتوں اور کسب و اختیار کی موجودہ آزادی کے ساتھ پیدا کرنا نظام عالم کی تکمیل کے لیے ناگزیر ہے تو اس نظام تکوینی کے آثار و نتائج کا قبول کرنا بھی ضروری ہے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مادی اور معاشی زندگی کے شعبوں میں تو انسانوں کی عقلی و کسبی آزادی کی بدولت بے شمار انواع و اقسام کے مختلف مظاہر سامنے آئیں لیکن معادی و روحانی میدانوں میں وہی دل و دماغ اور کسب و اختیار کی قوتیں رکھنے والا ترقی پذیر انسان سب کے سب ایک ہی پگڈنڈی پر چلنے کے لیے مجبور ہو جائیں اور کوئی قدم اِدھر اُدھر ہٹانے کی قدرت نہ رکھے۔ لہٰذا اگر نوعِ انسانی کا اس انداز وجود کے ساتھ اس مجموعہ عالم میں پایا جانا ضروری ہے تو نیک و بد کا اختلاف بھی ناگزیر ہے اور یہ اختلاف ہی اس بات کی نشانی ہے کہ ہر وہ فعل جو یہاں وجود میں آتے ضروری نہیں کہ خدا کے نزدیک پسندیدہ ہو ورنہ ماننا پڑے گا کہ افعال کے اس اختلافی ہجوم میں مختلف افعال خدا کو پسند ہوں۔ مثلاً خوش اخلاقی بھی خدا کو پسند ہو اور بداخلاقی بھی ایمان لانا بھی پسند ہو اور ایمان نہ لانا بھی جس کا بطلان بالکل نمایاں ہے۔

یہ درست ہے کہ اگر خدا چاہتا تو انسان کی ساخت ایسی بنا سکتا تھا کہ سب ایک ہی راستہ پر چلنے کے لیے مجبور ہو جاتے لیکن ایسا نہیں ہوا اور خدا کی مشیت یہ نہیں ہے تو یہ خدا کی حجت بالغہ ان لوگوں پر ہے جو لو شاء اللہ ما اشرکنا، کہہ کر مشیت اور رضائے الٰہی میں تلازم ثابت کرنا چاہتے ہیں کیونکہ اس قدر شدید اختلافات کی موجودگی میں ان کے اصول کے موافق ماننا پڑے گا کہ توحید خالص بھی اللہ کے نزدیک صحیح اور مرضی ہو اور اس کی نقیض شرک جلی بھی وقس علی ہذا ان دلائل سے ثابت ہوا کہ مشرکین کا یہ استدلال لو شاء اللہ ما اشرکنا محض لغو اور پادر ہوا ہے [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ دراصل نبوت کے مقابلہ میں آخری حربہ ہے جو مشرکین نے اپنایا ہے۔ مشرکین جب ہر طرف سے منہ کی کھا چکے اور ان کو دلیل اور علم کے میدان میں کوئی کامیابی نہ ہوئی تو آخرالحیل کے طور پر نبوت کے مقابلے میں یہ بات کہی کہ اگر ہم جو کچھ کر رہے ہیں غلط ہے تو خدا کے اختیار میں ہے وہ ہمیں روک دے اگر وہ نہیں روکتا تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں یہی اس کی مرضی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جہالت اور حماقت کا ایک شاہکار ہے۔ انسان کو کرنے کے لیے کسی کام کی آزادی ملنا اس بات کی ہرگز دلیل نہیں ہے کہ یہ اللہ کی مرضی پر پورا اترتا ہے۔ اگر اس دلیل میں کوئی جان ہے تو یہ دلیل تو ہر احمق اپنی حماقت اور ہر ظالم اپنے ظلم کے جواز کے لیے پیش کر سکتا ہے۔ بالکل یہی روش ان کے پچھلے ہم مشربوں نے اختیار کی یہاں تک کہ وہ خدا کے عذاب سے دوچار ہوتے۔ یہی انجام ان کے ساتھ ہونا ہے۔

قریش سے علمی دلیل کا مطالبہ

۱۹۷۔ اے پیغمبر تم کہہ دو کیا تمہارے پاس کوئی علم کی روشنی ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو۔ اگر ہے تو لاؤ تم تو محض گمان و وہم پر چل رہے ہو اور تم تو صرف اٹکل کے تیر چلا رہے ہو اے پیغمبر کہہ دو کہ لوگو حقیقت رس اور پکی دلیل تو اللہ ہی کی ہے اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت عطا کر دیتا۔ کوئی علمی اصول تمہارے پاس نہیں ہے جسے عقلمندوں کے سامنے پیش کر سکو، تمہارے پاس محض اٹکل کے تیر اور تخمینی باتیں ہیں جن کو خدا کی حجت بالغہ رد کرتی ہے جس کی طرف فلو شاء لھداکم اجمعین میں اشارہ فرمایا ہے یعنی انسان کی فطرت ایسی نہیں بنائی گئی کہ سب کے سب راہ ہدایت پر چل پڑیں۔ اس کو کسب و اختیار کی آزادی اللہ سبحانہ نے عطا فرمائی ہے جس کا عطا کیا جانا کسی مخلوق کے لیے ممکن تھا اس لیے ضروری ہے کہ اس آزادی کے استعمال کے وقت راہیں مختلف ہو جائیں۔ کوئی نیکی کو اختیار کرے کوئی بدی کو۔ کوئی حق تعالیٰ کی رضا و رحمت کا مظہر بن جائے کوئی غضب کا اس طرح وہ آخری مقصد جو خالق کائنات نے آفرینش عالم سے ارادہ کیا ہے یعنی اپنی تمام صفات جلال و جمال کا اظہار ہو بھرپور طریقہ پر پورا ہو لیبلوکم ایکم احسن عملاً ورنہ اگر تمام عالم ایک ہی حال پر فرض کر لیا جائے تو بعض صفات الٰہیہ کا ظہور ممکن ہو گا اور دوسری بعض کے ظہور کے لیے کوئی محل نہ ملے گا۔

یہاں تک جو کچھ ہم نے کہا وہ اس تقدیر پر تھا کہ مشرکین کے قول لوشاء اللہ ما اشرکنا سے یہ غرض ہو کہ وہ اپنی خرافات و کفریات کا استحسان ثابت کرنا چاہتے تھے جیسا کہ ان کے احوال سے ظاہر ہے اور اگر لوشاء اللہ ما اشرکنا سے ان کا مقصود صرف معذرت ہو کہ جو کچھ خدا چاہتا ہے وہ ہم سے کراتا

ہے اچھا ہو یا برا بہرحال اس کی مشیت سے ہے۔ پھر مشیت الٰہی کے مقابلے میں انبیاء و رسل ہم سے کیوں مزاحمت کرتے ہیں اور عذاب الٰہی کی دھمکیاں کیوں دیتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس خدا کی مشیت سے تم ان افعال شنیعہ کا کسب کرتے ہو اسی کی مشیت سے انبیاء و رسل تمہاری مزاحمت کرتے ہیں اور وہ ہی مشیت تمہارے کسب پر مناسب عذاب بھیجتی ہے جس طرح قدرت نے سانپ کو پیدا کیا اور وہ ہی مارگزیدہ کے حق میں ہلاکت کا اثر مرتب کرتی ہے خواہ سانپ کے کاٹنے میں مارگزیدہ کے فعل و اختیار کو کچھ دخل ہو یا نہ ہو، اسی طرح تمہارے کفر و شرک میں ہلاکت دائمی کی اور ایمان و عمل صالح میں نجات ابدی کی تاثیرات رکھ دینا اسی کی قدرت اور مشیت کا کام ہے جس نے تمام سلسلہ اسباب و مسببات کی تخلیق وجود میں آئی ہے۔ لہٰذا اگر تم اپنے مشرکانہ اطوار سے باز نہ آنے میں مشیت کے عموم سے استدلال کر سکتے ہو تو ارسال رسل اور انزال عذاب وغیرہ امور کو بھی اسی کی مشیت کی کارفرمائی کا نتیجہ سمجھ کر خدا کی حجت بالغہ کو تمام سمجھو۔ بے شک خدا چاہتا تو سب کو راہ ہدایت پر لگا دیتا، لیکن اس نے تمہاری سوء استعداد کی وجہ سے ایسا نہیں چاہا۔ آخر تمہارے سوء اختیار سے جو افعال صادر ہوئے ان کا طبعی اثر عذاب کی صورت میں مرتب ہو کر رہا والعیاذ باللہ۔[1]

اصل ارشاد میں **هل عندكم من علم** کہہ کر مخاطبوں سے ان کے موقف پر علمی دلیل کا مطالبہ کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے اس موقف پر کوئی علمی دلیل پیش کرو یا خدا نے تمہیں اس کا حکم دیا ہے یا کوئی عقل کی شہادت ہو اس قسم کی کوئی چیز تو تمہارے پاس ہے نہیں۔ محض اٹکل کے تیروں اور قیاس کے بے لگام گھوڑے دوڑانے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا کیونکہ تمہاری وہمی تخلیقات کا نام علم نہیں ہے خلاصہ ان کے استدلال کا یہ ہے کہ خدا جب ہر چیز پر قادر ہے اور باوجود قدرت اس نے ہمیں شرک و تحریم سے روکا نہیں تو یہ شرک و تحریم خدا کی جناب میں پسندیدہ ہونے کی علامت ہے اور مغالطہ اس استدلال میں یہ ہے کہ مشیت تکوینی اور رضائے تشریعی کو مرادف سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ رضائے الٰہی تشریعی کا قانون الگ ہے اور مشیت تکوینی کا قانون جدا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کارفرما ہیں۔ دونوں کے درمیان کوئی تصادم و تزاحم نہیں ہے قانون مشیت نے انسان کو ہر طرح کی آزادی دی ہوئی ہے۔ انسان اپنے طریق عمل کے انتخاب میں آزاد ہے وہ اپنے ارادے کا مالک و مختار ہے اچھی اور بری جو راہ چاہے اپنی پسند و قصد سے اختیار کرے لیکن رضائے الٰہی کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تشریعی قانون کا حکم یہ ہے کہ وہ بدی کی راہ سے بچے اور نیکی کی راہ پر چلے۔ بحیثیت قادر مطلق سب کچھ اس کی مخلوق ہے لیکن بحیثیت حاکم اس کا حکم یہی ہے کہ بیماری کا علاج کیا جائے اور زہر کا توڑ تریاق سے کیا جائے جو کج فہم خدا کی قدرت اور اپنی بے دینی اور بدکرداری کے لیے حیلہ بناتے ہیں وہ آخر بیماری میں اپنا علاج کیوں کرتے ہیں اور روحانیات کی طرح جسمانیات میں اپنے کو معذور و مجبور کیوں نہیں سمجھتے؟

ہدایت وضلالت میں اللہ کا قانون

آخر میں فللہ الحجۃ البالغۃ میں ہدایت وضلالت کے بارے میں اللہ کا جو قانون ہے اس کو واشگاف انداز میں پیش فرمادیا اور بتادیا کہ اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی مشیت کے زور سے جسے چاہے ہدایت دے۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو اسے کوئی روک نہیں سکتا تھا لیکن اس معاملے میں اس نے جبر کو پسند نہیں کیا بلکہ دلیل وحجت کے ذریعے وہ رہنمائی کرتا ہے اور لوگوں کو اس نے اختیار دیا ہے کہ وہ چاہیں تو اس رہنمائی کو قبول کریں اور چاہیں تو رد کردیں۔ فرمایا کہ اگر خدا تم سب کو ہدایت دے دیتا یعنی خود خدا ان کو زبردستی حق کے قبول کرنے پر مجبور کردیتا اور فرشتوں کی طرح پیدائشی طور پر راست رو بنا تا لیکن نوع انسانی کے بارے میں اس طرح نیک وبد بنا دینا اللہ تعالیٰ کی سنت کے خلاف ہے اس کی یہ سنت نہیں ہے کہ وہ بندے کے ارادے اور کوشش کے بغیر ازخود کسی کو ہدایت دے۔ اگر انسان کے حق میں اللہ کی مشیت یہ ہوتی تو وہ ضرور ایسا کرسکتا تھا۔ لیکن یہ اس کی مشیت نہیں ہے کہ زور سے کسی کو ہدایت دے یہ تو حجت ودلیل اور عقل کا سودا ہے فمن شاء فلیؤ من ومن شاء فلیکفر، حجت بالغہ تو اللہ کا حکم ہے جس چیز کا وہ حکم کرے وہ پسندیدہ ہے اور جس سے روک دے وہ بری اور ناپسندیدہ ہے۔

اخلاق وافعال اور افکار میں حسن وقبح کا معیار اس کا امر ونہی ہے جس فکر جس عمل کا وہ حکم کرے وہ خدا کے نزدیک مستحسن اور پسندیدہ ہے اور جس سے روکدے وہ قبیح اور ناپسندیدہ ہے۔ خداتعالیٰ کی قدرت ومشیت اعمال واخلاق اور افکار کے حسن وقبح کے لیے کسوٹی نہیں ہے اس لیے کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ مقدر الٰہی ہے اور سب کچھ اس کی مشیت سے ہے۔ اس کی قدرت اور مشیت تمام اضداد کو حاوی ہے۔ عطر وگلاب ہو یا پاخانہ وپیشاب، طہارت ونجاست، نور وظلمت، ایمان وکفر اور ہدایت وضلالت جو کچھ بھی ہے سب اس کی قدرت اور مشیت سے ہے۔ دیکھئے

کی چیز اللہ کی مشیت نہیں بلکہ اللہ کا حکم اور اس کی ممانعت ہے۔ یہی امر و نہی انبیا کے وساطت سے آیا ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنے ارادہ و اختیار سے راہ راست پر آئیں اس طرح اللہ کی حجت لوگوں پر پوری ہو گئی ہے لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل یعنی تمام پیغمبروں کے روانہ کرنے کی غرض یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نوع انسانی پر اتمام حجت کرنا چاہتا ہے تاکہ آخری عدالت کے موقعہ پر کوئی گمراہ مجرم یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ ہم ناواقف تھے۔ آپ نے ہمیں حقیقت حال سے آگاہ کرنے کا کوئی انتظام نہ کیا تھا۔ اسی مقصد کی خاطر خدا نے دنیا کے مختلف گوشوں میں پیغمبر روانہ کیے اور کتابیں روانہ کی ہیں۔ اب حجت بالغہ اللہ کے پاس ہے لوگوں کے پاس نہیں۔

تحریم کے لیے شہادت کا مطالبہ

۱۹۴۔ ان سے کہو کہ اپنے وہ گواہ پیش کرو جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے پھر اگر ان کے گواہ گواہی دیں تو آپ ان کی ہاں میں ہاں نہ ملائیں اور آپ ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے اور جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور وہ دوسری ہستیوں کو اللہ کے برابر ٹھہراتے ہیں۔ یعنی دلیل عقلی کا حال تو اوپر معلوم ہو چکا ہے۔ اب اگر اس من گھڑت تحریم پر کوئی دلیل نقلی ہے تو وہ لاؤ۔ کیا تمہارے پاس ایسے گواہ موجود ہیں جو یہ بیان کریں کہ ہاں ان کے روبرو اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو حرام کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے واقعی گواہ کہاں دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اگر دو چار گستاخ جھوٹے بنیا بر گواہی دینے کو کھڑے ہو جائیں تو ایسوں کی بات پر آپ کان نہ دھریں اور نہ ان کی پروا کریں[1] مطلب یہ ہے کہ محض اٹکل اور خیال سے بات نہ کرو بلکہ علم کی روشنی میں سمجھاؤ اور بتاؤ کہ جو چیزیں تم نے حرام قرار دے رکھی ہیں کیا فی الواقع اللہ نے حرام کی ہیں تو لاؤ شہادت پیش کرو۔ واضح رہے کہ تحریم کے لیے گواہی کی بنیاد صرف دو چیزیں ہوتی ہیں۔ نبوت کا لایا ہوا علم اور نبوت کا عمل۔ یہاں قرآن نے ان دونوں قسم کی گواہیوں کا مطالبہ کیا ہے۔ مشرکین اپنے کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل سے منسوب کرتے تھے۔ منشا یہ ہے کہ اگر دونوں کے علم و عمل میں اس قسم کی کوئی گواہی ہے تو اس کو پیش کرو ورنہ اس حجت کو قبول کرو جو قرآن تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے فان شھدوا فلا تشھد معھم اگر یہ لوگ شہادت کی ذمہ داری محسوس کیے بغیر اتنی بے باکی پر اتر آئیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کر خدا کا نام لے کر جھوٹی شہادت دینے میں بھی تامل نہ کریں تو ان کے اس جھوٹ میں تم ان کے ساتھی نہ بنو کیونکہ ان سے یہ شہادت اس لیے طلب نہیں کی جا رہی ہے کہ اگر یہ شہادت دے دیں تو آپ ان کی بات مان لیں گے بلکہ اس کی غرض صرف یہ ہے کہ ان میں سے جن لوگوں میں تھوڑی بھی راستی موجود ہے۔ ان کے سامنے یہ لوگ ننگے ہو جائیں اور ان کو معلوم ہو جائے کہ ان چیزوں کے حرام ہونے کی نبوت کے علم و عمل میں کوئی شہادت نہیں ورنہ خدا تو جانتا ہی ہے کہ ایسی کوئی شہادت نہیں ہے۔

اس کے بعد نبوت کو ہدایت ہے کہ آپ ان کی ہمنوائی نہ کریں اور کسی حال میں ان کی خواہشات پر مبنی بدعات کی پیروی نہ کریں۔ یہ بدعات کن لوگوں کی ایجاد کردہ ہیں۔ یہاں قرآن نے ان کے تین اوصاف بیان کیے ہیں ایک یہ کہ اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے ہیں دوسری یہ کہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں۔ تیسری یہ کہ اپنے رب کے ہمسر بناتے ہیں۔

یہ دراصل ان شہدار کے اوصاف ہیں جن سے عام شہری حلال و حرام کی حد تک علمی استفادہ کرتے تھے اور جنہوں نے بغیر علم کے شہریوں کو گمراہ کر رکھا تھا۔

قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ
شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ
نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ
مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ
ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿١٥١﴾ وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ
الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ
وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا وَإِذَا قُلْتُمْ
فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ
بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿١٥٢﴾ وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا
فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ
ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٥٣﴾

اے اللہ کے رسول ان سے فرما دیجیے کہ آؤ میں تمہارے سامنے بیان

کرو ں جو کچھ اللہ نے تم پر حرام کیا ہے[195]۔ یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو[196]۔ اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو[197]۔ اور اپنی اولاد کو مُفلسی کے اندیشہ سے قتل نہ کرو ہم تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی[198]۔ اور بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ کھلے طور پر ہوں یا چھپی ہوں[199]۔ اور کسی جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے ہاں یہ کہ کسی حق کی بنا پر قتل کرنا پڑے[200]۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی خدا نے تمہیں وصیّت کی ہے تاکہ تم سوجھ بوجھ سے کام لو[201]۔ اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ لیکن ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو یہاں تک کہ وہ اپنے سنِ رشد کو پہنچ جائے[202]۔ اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو ہم کسی پر اس کی مقدور سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے[203]۔ اور جب بات کہو تو پورے انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ داری کا کیوں نہ ہو[204]۔ اور اللہ کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا ہے اُسے پورا کرو[205]۔ ان

باتوں کی اللہ نے ہدایت کی ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو[۲۰۶]، اور یہ کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ خدا کے راستہ سے ہٹا کر تمہیں تتر بتر کر دیں گے، یہ بات ہے جس کا خدا نے حکم دیا ہے تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ[۲۰۷]۔

معانی مفردات

تعالوا تم آؤ۔ مصدر تعالی ہے جس کے معنے بلند ہونے اور آنے کے ہیں۔ امر کا جمع مذکر حاضر ہے اصل میں تعالِ کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو بلند مقام کی طرف بلایا جاتے، پھر ہر جگہ بلانے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ بعض علماء نے تصریح کی ہے کہ یہ علو سے بنا ہے جس کے معنے رفعت منزلت کے ہیں۔ گویا تعالوا میں بلند مقام اور ارتقاء منزل کی دعوت ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں تعالوا استعمال ہوا ہے وہاں یہ چیز موجود ہے۔ املاق۔ باب افعال کا مصدر ہے اس کے معنے ہیں تنگ دست ہونا اور تنگ دستی۔ الفواحش فاحشہ کی جمع ہے۔ اس کی ایک صورت فحشاء بھی ہے۔ یہ لفظ فحش سے نکلا ہے جس کے اصلی معنے حد سے بڑھ جانے کے ہیں اور اس کے دوسرے لازمی معنے قبح یعنی برائی کے ہیں کیونکہ جس چیز کی حد خالق فطرت نے مقرر کر دی ہے اس سے آگے بڑھنا برائی ہے یا یہ کہ جو برائی حد سے زیادہ ہو جاتے وہ فاحشہ ہے اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر فحش گوئی اور فحش کاری پر ہوتا ہے۔ لا نکلف، ہم تکلیف نہیں دیتے ہیں، جمع متکلم مضارع معروف، مصدر تکلیف ہے۔ اس کے معنے کسی شخص سے ایسی چیز کی خواہش کرنے کے ہیں کہ جس میں رنج و محنت ہو۔

راست بازی کی بنیادی سچائیاں

اس سے پہلے ان محرمات کی بھرپور تردید کی گئی ہے جن کو مشرکین نے اپنے اوہام و خرافات سے حرام سمجھ

رکھا ہے اور وہ یہ سوچے ہوتے ہیں کہ بس سارا دین اب یہاں بتایا جارہا ہے کہ جن چیزوں کو تم حرام کہتے ہو وہ حرام نہیں۔ حرام تو وہ اعمال اشیائیں ہیں جو حقیقت اور راستی کے خلاف ہیں اور جن سے خدا کے تمام پیغمبروں نے متفقہ طور پر نوع انسانی کو روکا ہے۔ اس کے بعد ان برائیوں کا ذکر کیا ہے جو انسانی شقاوت کی بنیادی برائیاں ہیں اور ان اچھائیوں کی دعوت دی ہے جو راست بازی کی بنیادی سچائیاں ہیں۔ بتانا یہ ہے کہ تمہارے رب کی عائد کردہ پابندیاں وہ نہیں ہیں جن میں تم گرفتار ہو بلکہ اصلی پابندیاں یہ ہیں جو اللہ نے انسانی زندگی کو منضبط کرنے کے لیے عاید کی ہیں اور جو ہمیشہ سے شرائع الٰہیہ کی اصل الاصول رہی ہیں بنی نوع انسانی کے لیے خدا کا ٹھہرایا ہوا دین ہے۔ یہی الدین القیم ہے۔ یعنی سیدھا اور درست دین جس میں کسی طرح کی کجی اور خامی نہیں ہے۔ یہی دین حنیف ہے جس کی دعوت حضرت ابراہیم نے دی تھی۔ ان اعمال وافکار کی اچھائی اور برائی پر نوع انسانی کے تمام عہدوں اور تمام نبیوں کا عالمگیر اتفاق رہا ہے۔

ان آیات میں دسویں دفعہ وان ھذا صراطی مستقیما، کہہ کر کس خوبی کے ساتھ اس حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایک ہی دین ہے جو نوح کو ابراہیم کو موسیٰ کو اور محمد رسول اللہ کو دیا گیا ہے۔ اور سب نے اپنے اپنے وقت پر ان باتوں پر اتفاق کیا ہے جن کا ذکر ان آیات میں ہے۔ اگر دنیا آج بھی ان باتوں پر ایکا کرے تو دنیا کی ساری مشکلات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اس میں اخلاقی تعلیمات ہیں حقوق فضائل، رذائل کی طرف رہنمائی کیا ہے۔ آپ غور فرمائیں اگر اپنے فکر وعمل میں توحید کا علمبردار ہو، والدین کا فرمانبردار ہو، بچوں کی پرورش کرتا ہو۔ خلوت وجلوت کی تمام برائیوں سے بے داغ ہو، کسی قوجداری جرم کا مرتکب نہ ہو، دیانت کا یہ حال ہو کہ مال یتیم کی طرف نگاہ بھی نہ اٹھاتا ہو، لین دین میں عدل وانصاف کا دامن تھامے ہوتے ہو، زبان سے کبھی کوئی بات عدل وانصاف کے خلاف نہ کہتا ہو، اللہ کے تمام عہدوں کا پکا وفادار ہو۔ آپ بتائیں کہ اس مثالی انسان میں کہاں کمی ہے اور انسانی زندگی اگر ایسے افراد کا مجموعہ بن جائے تو دنیا امن کا گہوارہ کیسے نہ بنے۔ اس پر انسانیت کی خیر وبرکت اور تمدن کی تعمیر وترقی کا دارومدار ہے۔ اسی لیے عبداللہ ابن عباس نے ان آیات کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ محکمات ہیں ان میں کچھ بھی منسوخ نہیں ہے۔ اس میں جو کچھ ہے وہ تمام نبیوں کی شریعتوں کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ یہ کتاب الٰہی کی جان ہے۔ ان پر عمل پیرا ہونے والا جنتی ہے اور ان کا تارک دوزخی ہے۔ اور اسی لیے حضرت عبادہ ابن الصامت فرماتے ہیں:۔

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا لوگو! تم میں سے کون ہے جو ان تین آیتوں پر میرے سے بیعت کرے۔ پھر حضور نے یہ تین آیات تلاوت فرمائیں۔ تلاوت سے

فراغت ہوئی تو فرمایا جو شخص وفاداری کرے گا یعنی ان مطالبات کی پابجائی کرے گا اس کو اللہ اجر دے گا اور جو کوتاہی اور کمی کرے گا اس کی اگر دنیا میں پکڑ ہو گئی تو وہ سزا ہو گی اور اگر اس کے معاملہ کو اللہ نے آخرت پر ڈال دیا تو پھر اس کا معاملہ اسی کے سپرد ہے چاہے تو عذاب دے اور چاہے تو معاف کر دے۔ (ابن کثیر)

۱۹۵- اے اللہ کے رسول ان سے فرما دیجئے کہ آؤ میں تمہارے روبرو بیان کر دوں کہ جو کچھ تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے۔ یہاں تک ان چیزوں کا بیان تھا جنہیں مشرکین نے محض اپنی رائے و ہوا سے حرام ٹھہرا رکھا تھا۔ پھر اس تحریم کے لیے حیلے اور باطل عذر کرتے تھے اب وہ چیزیں بیان کی جاتی ہیں جنہیں خدا نے حرام کیا ہے اور ہمیشہ سے حرام رہی ہیں اور یہ مشرکین ان میں مبتلا ہیں[1] اصل موضوع چونکہ تحریم ہے اس لیے آغاز اسی سے کیا ہے اور رب کی طرف تحریم کی نسبت کر کے اشارہ کر دیا کہ بندوں کے لیے کسی چیز کو حرام کرنا صرف ان کے رب کا حق ہے۔ رب کے سوا دوسرے کا یہ حق نہیں ہے کہ وہ بندوں پر کوئی چیز حرام کرے۔ مشرکین چونکہ شرک تحریم میں مبتلا تھے اس لیے خاص طور پر یہاں اس پر تنبیہ فرما دیا اور لفظ رب لا کر جتا دیا کہ اللہ کے لیے ہی تحریم کا حق اس کی ربوبیت کا تقاضا ہے۔ گویا تحریم اگر دعویٰ ہے تو ربکم اس دعویٰ کی دلیل ہے اور پیشانی پر تعالوا لگا کر نبوت کی زبان سے بتا دیا کہ میں جس چیز کی دعوت دے رہا ہوں یہ وہ بے بہا دولت ہے جس پر انسانیت کی خیر و برکت اور تمدن کی تعمیر و ترقی موقوف ہے اور وہ قیمتی سرمایہ جس میں انسانی ارتقاء کی بھرپور ضمانت ہے۔ یہی راست بازی کی وہ بنیادی سچائیاں ہیں کہ انسانی تاریخ میں جب بھی ان سے بے رخی برتی گئی انسانوں کی فطرت میں تغیر رونما ہوا اور ان میں ارتقاء کی جگہ پستی کے آثار ظاہر ہوئے۔ اور جب بھی ان کو اپنایا گیا تو اس کے نتیجہ میں انسانیت سے عاری حیوانوں میں ایسے نیک نفس لوگ پیدا ہوئے جن کے انفاس سے دنیا معطر ہو گئی۔ جن کے حسن و جمال سے انسانیت کی تاریخ میں دل کشی اور رعنائی آ گئی جو رفعت و منزلت میں فرشتوں سے آگے نکل گئے اور انہیں برگزیدہ مثالی اور قابل تقلید نفوس کی برکت سے تباہ و برباد ہونے والی انسانیت کو نئی زندگی مل گئی عدل و انصاف کا دور دورہ ہو گیا، کمزوروں میں طاقت والوں سے اپنا حق وصول کرنے کی ہمت و طاقت پیدا ہوئی۔ فضاؤں میں رحم و کرم کی خنکی چھا گئی۔ عفت و پارسائی کی خوشبو پھیل گئی۔ سعادت کا بازار گرم ہو گیا۔ راست بازی کی یہ بنیادی سچائیاں کیا ہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ ہیں:

---

[1] افادات شیخ الاسلام

راست بازی کی اولین اساس توحید

۱۹۶ - یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ مثبت انداز میں راست بازی کی اولین بنیاد تو توحید ہے بقول شاہ ولی اللہ بھی اصل اصول البرّ اور عمدۃ انواع البر ہے۔ اسی کے ذریعے انسان کا اپنے مالک وخالق سے رشتہ عبادت استوار ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت ساری نیکیوں میں قلب کی ہے۔ قلب صحیح ہے تو ساری روحانی زندگی درست ہے۔ توحید کے مخالف تصور کا نام شرک ہے۔ یہاں دو وجہ سے توحید کے اس مخالف تصور کو پیش کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ مخاطبوں کے احوال وظروف کا تقاضا بھی تھا۔ ان کا اللہ سے عبادت وطاعت میں رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ دوسرے یہ کہ ذہنوں میں کوئی تصور اسی وقت واضح ہوتا ہے جب کہ اس کے مخالف تصور کو بھی بیان کیا جائے۔ اسی لیے توحید کی تعلیم میں الا اللہ سے پہلے لا الٰہ لایا گیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ توحید کا بے آمیز تصور پیدا نہیں ہو سکتا جب تک شرک کی پوری طرح پہلے وضاحت نہ ہو جائے۔

شرک کے معنے ساجھے پن کے ہیں اور اصطلاحی زبان میں شرک نام ہے اللہ کی ذات یا اس کی صفات میں یا ان صفات کے لازمی تقاضوں میں کسی کو اس کا ساجھی بنانے کا گویا شرک کی تین قسمیں ہیں:

ایک وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی ذات سے ہوتا ہے

دوسرا وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی صفات سے ہوتا ہے

تیسرا وہ شرک جس کا تعلق اس کی صفتوں کے لوازم سے ہوتا ہے

پہلے شرک کی عملی صورتیں یہ ہیں۔ کسی کو اللہ تعالیٰ کا ہم جنس قرار دیا جائے۔ اسے اس کا باپ یا اس کی اولاد سمجھ لیا جائے۔ یہ مان لیا جائے کہ وہ کسی اور ہستی کے ساتھ مل کر ایک قالب ہو گیا ہے۔ یہ تصور کر لیا جائے کہ وہ کسی مخلوق کی شکل اختیار کر کے نمودار ہوا کرتا ہے۔ یعنی کوئی مخلوق اس کا اوتار ہو سکتی مثلاً اہل عرب فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں اور جنوں کو اس کی ذات برادری سمجھتے تھے۔ اسی طرح عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا اکلوتا بیٹا اور اس کا اوتار قرار دیتے تھے۔ یہ سب کا سب شرک فی الذات تھا۔

دوسری قسم کے شرک کی عملی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن صفتوں سے موصوف ہے ان میں سے کوئی صفت کسی اور میں مان لی جائے اور اسی معنے ومفہوم میں مانی جائے جس معنے ومفہوم میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اندر پائی جاتی ہے۔ مثلاً علم اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھلی اور چھپی بات کو خود بخود جانتا ہے۔ اس کے لیے غائب بھی حاضر ہے اور گزرا ہوا یا آنے والا زمانہ بھی حال کا زمانہ

ہے۔ اب اگر کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ فلاں مخلوق بھی اسی طرح ہر بات کو جانتی ہے تو شرک فی الصفات ہوگا۔ اسی طرح نفع یا نقصان پہنچانا اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے مسرت اور راحت کا سامان عطا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے محروم کر دیتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ خیال رکھے کہ فلاں پیر، فرشتہ یا جن یا بزرگ انسان بھی ہماری بگڑی بنا سکتا ہے یا ہمیں تکلیف یا نقصان پہنچا سکتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت میں اسے ساجھی ٹھہرا رہا ہوگا اور اس کے اس کام شرک فی الصفات کہا جائے گا۔

تیسرے قسم کے شرک کی صورت یہ ہے کہ صفاتِ الٰہی کے جو لازمی تقاضے ہیں۔ انہیں اور ان سب کو اللہ ہی کے لیے خاص نہ سمجھا جائے بلکہ انہیں یا ان میں سے کسی کو بعض دوسری ہستیوں کے لیے بھی ثابت اور موجود مان لیا جائے۔ مثلاً صفاتِ الٰہی کا ایک تقاضا یہ ہے کہ حقیقی عبادت اور محبت صرف اللہ کا حق ہے اب اگر کوئی شخص کسی اور سے بھی ایسی محبت رکھے یا اسی طرح کی عبادت کا اس کو مستحق قرار دے تو صفاتِ الٰہی کے تقاضوں میں غیر اللہ کو شریک کرنا ہوگا۔ اسی طرح ان صفات کا ایک اور تقاضا یہ بھی ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے اور حکم دینے اور قانون بنانے کا حق اصلاً اسی کو پہنچتا ہے۔ اس لیے اگر کسی اور کو بھی یہ حیثیت دے دی جائے خواہ وہ ایک فرد ہو یا بہت سے افراد کا مجموعہ ہو تو یہ شرک ہوگا۔

ان تینوں قسموں میں سے خواہ کسی قسم کا بھی شرک ہو اس کی موجودگی میں توحید کا اسلامی عقیدہ باقی نہیں رہ جاتا اور جہاں توحید باقی نہ رہ گئی ہو ممکن نہیں کہ وہاں ایمان موجود ہو۔ اسی لیے شرک کو قرآن نے سب سے بڑا ظلم قرار دیا ہے ان الشرک لظلم عظیم اور فرمایا ہے کہ خدا کے یہاں ہر گناہ کی معافی ہے مگر شرک کی معافی نہیں آخر جہاں بیج ہی نہ ہو وہاں درخت کیسے وجود میں آ سکتا ہے؟

لا تشرکوا بہ شیئاً کا مثبت مطالبہ یہ اور صرف یہ ہے کہ یگانہ خدا کی عبادت اور اسی کی اطاعت کرو۔ جیسا کہ اس نے اپنے رسول کے ذریعے تمہارے لیے ہدایات دی ہیں نہ اپنی اہواء اور خواہشوں پر مبنی شریعت بناؤ اور نہ کسی اور کی۔ یہی وہ بنیادی مقصد ہے جسے نبوت نے دی ہے۔ شرک کی ممانعت کا یہ لازمہ ہے۔

راست بازی کی دوسری دفعہ والدین سے حُسنِ سلوک

۱۹۷۔ اور والدین سے حسنِ سلوک کرو۔ یعنی دوسری بات جو میں تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں

یہ ہے کہ والدین کے ساتھ نیکی کرو۔ اس میں ادب، تعظیم، اطاعت، رضاجوئی، خدمت، مہربانی، نرمی سب داخل ہیں۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں اس میں والدین کو سخت جواب دینے، ان کو غصہ آمیز نگاہوں سے دیکھنے، ان کے سامنے اونچی آواز کرنے کی ممانعت بھی ہے۔ قرآن نے متعدد آیات میں توحید کے بعد والدین کی خدمت کا حکم دیا ہے۔ اللہ کی ذات اگر انسان کے وجود میں موثر حقیقی ہے تو والدین اسی کے لیے موثر ظاہری ہیں۔ بات ذرا لمبی ہو جائے گی مگر جی چاہتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوقِ والدین کو جس موثر انداز میں پیش کیا ہے اس کی ایک جھلک آپ بھی دیکھ لیں۔

ایک شخص نے خدمتِ اقدس میں آکر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ سب سے زیادہ میرے حسنِ سلوک کا کون مستحق ہے۔ فرمایا تیری ماں، پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، اس نے عرض کیا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں۔ تین بار آپ نے یہی جواب دیا۔ چوتھی بار پوچھنے پر ارشاد ہوا "تیرا باپ"، ایک روز حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے چار بڑے گناہوں کا ذکر کیا۔ اور سرِ فہرست ماں کی نافرمانی کو قرار دیا اور فرمایا کہ تمہارے خدا نے ماؤں کی نافرمانی تم پر حرام کی ہے۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں مخلوقاتِ انسانی میں جنس لطیف ہی کی ایک صنف کو سب سے برتری حاصل ہے اور یہ برتری بالکل فطری ہے۔ انسان اپنے وجود میں جن کا ممنون ہے اور جو اس کی تخلیق کی مادی علت ہیں وہ خالق اکبر کی ذات علت فاعلہ کے بعد ماں اور باپ ہیں لیکن باپ کی حد تک مادی علیت چند لمحوں اور اپنے جسم کے چند قطروں سے زیادہ نہیں مگر ماں وہ ہستی ہے جس نے اسے اپنا خون پلا پلا کر بڑھایا اور نو مہینے تک اس کی مشکل سہہ کر اور سختی اٹھا کر اپنے پیٹ میں رکھا۔ پھر اس کے جننے کی ناقابلِ برداشت تکلیف کو ہنسی خوشی برداشت کیا۔ پھر اس نوپیدا مضغہ گوشت کو اپنی چھاتیوں سے لگا کر اپنا خون پانی کر کے پلایا اور اس کی پرورش اور غور و پرداخت میں اپنی ہر راحت قربان، اپنا ہر آرام ترک اور اپنی ہر خوشی نثار کر دی۔ ایسی حالت میں کیا ماں سے بڑھ کر انسان اپنے وجود میں مخلوقات میں کسی اور کا محتاج ہے۔ اس لیے حضور انور نے جا بجا اپنی تعلیم میں جو بلند سے بلند مرتبہ اس کو عنایت کیا ہے وہ اس کی مستحق ہے۔

ماں کے ساتھ جو دوسری ہستی بچہ کی تولید میں شریک ہے وہ باپ ہے اور شک نہیں کہ اس کی نشوونما اور تربیت میں ماں کے بعد باپ ہی کی جسمانی و مالی کوششیں شامل ہیں اس لیے جب بچہ ان کی محنتوں اور کوششوں سے قوت کو پہنچے تو اس پر فرض ہے کہ اپنی اس ماں باپ کی کوششوں سے حاصل کی ہوئی قوت کا شکرانہ ماں باپ کی خدمت کی صورت میں ادا کرے۔ چنانچہ اسلام نے نہ صرف پہلے مذاہب کی طرح ان کی عزت کرنے ان سے ڈرتے رہنے کے وعظ پر اکتفا کی بلکہ ان کی خدمت ان کی

اطاعت، ان کی امداد اور ان کی دلداری ہر چیز فرض قرار دی بلکہ یہاں تک تاکید کی کہ ان کا کسی بات پر اُف نہ کی جائے
ان کے سامنے باادب رہو ان کی دعاؤں کو اپنے حق میں قبول سمجھو۔ ان کی خدمت انسان کا سب سے بڑا جہاد
ہے بلکہ ان کی خوشنودی خدا کی خوشنودی ہے۔ قرآن حکیم میں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک، نیکی اور خدمت
کی تاکید ۱۲ مختلف آیتوں میں بیان ہوئی ہے۔ اور اکثر موقعوں پر یہ تعلیم توحید اور خدا پرستی کی تعلیم کے بعد
آئی ہے کہ پہلی تخلیق انسانی کی علت فاعلی اور دوسری علت مادی ہے۔ خدا کی دائمی اور غیر متبدل شریعت
میں شرک سے زیادہ بری چیز کوئی نہیں قرار دی گئی۔ اس پر بھی اگر کسی کے ماں باپ مشرک ہوں تو اس حالت
میں بھی ان کی خدمت سے دست کش ہونا روا نہیں ہے بجز اس کے کہ اگر وہ شرک کی دعوت دیں تو ان کا
اس بات کو قبول نہ کیا جائے لیکن ان کی دنیوی خدمت اور حسنِ سلوک میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔

راست بازی کی تیسری دفعہ حقوقِ اولاد

۱۹۸۔ اور اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشے سے قتل نہ کرو ہم تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی۔
عرب مفلسی کی وجہ سے بعض اوقات اولاد کو قتل کر دیتے تھے کہ خود ہی کھانے کو نہیں اولاد کو کہاں سے کھلائیں
گے۔ اسی لیے فرمایا کہ رزق دینے والا تو خدا ہے۔ تم کو بھی اور تمہاری اولاد کو بھی۔ دوسری جگہ من املاق کی جگہ
خشیۃ املاق فرمایا ہے یعنی مفلسی کے اندیشہ سے قتل کرتے تھے۔ یہاں ان کا ذکر ہے جو فی الحال مفلس
نہیں مگر ڈرتے ہیں کہ جب عیال زیادہ ہو گی تو کہاں سے کھلائیں گے چونکہ پہلے طبقہ کو عیال سے پہلے اپنی
روٹی کی فکر ستا رہی تھی اور دوسرے کو زیادہ عیال کی فکر نے پریشان کر رکھا تھا، شاید اسی لیے یہاں
نرزقکم وایاھم فرمایا اور خشیۃ املاق والی آیت میں نرزقھم وایاکم ارشاد فرمایا[1]

اصل میں ارشاد ہوا ہے لا تقتلوا اولادکم من املاق مطلب یہ ہے کہ جب اللہ سبحانہٗ نے تمہیں اولاد
کی زندگی کا واسطہ بنایا ہے تو بالقصد اولاد کے نقشِ زندگی کے مٹانے کا سبب نہ بنو بلکہ اس کی حیات کی
تکمیل اور اس کے نشو و نما کی ترقی کے وہ تمام وسائل اختیار کرو جو قوت اور استطاعت میں ہوں۔ یہی وجہ ہے
کہ اسلام نے بالقصد حمل کے ضائع کرنے کو گناہ قرار دیا ہے اور پیدا ہونے کے بعد اس کے مار ڈالنے کی
جاہلانہ رسم کو اس حکم کے ذریعہ جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کی ہے۔
عرب کے سفاکانہ مراسم میں سب سے زیادہ بے رحمی اور سنگدلی کا کام معصوم بچوں کو مار ڈالنا

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

تھا۔ یہ بے رحمی کا کام والدین خود اپنی خوشی اور مرضی سے کرتے تھے۔ اس رسم کے جاری ہونے کے متعدد اسباب تھے ایک تو وہ ہی مذہبی تھا جس کا پہلے وکذالک زین لکثیر من المشرکین قتل اولادھم میں ذکر ہو چکا یعنی والدین اپنے بچوں کو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے ذبح کر کے ان پر چڑھاوا چڑھاتے، منت مانتے تھے کہ فلاں کام ہوگا تو اپنے بچے کی قربانی کریں گے۔ یہ قابلِ نفرت رسم نہ صرف عرب میں بلکہ بہت سی بت پرست قوموں میں رائج تھی۔ روما الکبریٰ کے عظیم الشان متمدن قانون میں اولاد کو مار ڈالنے کا باپ کے لیے حق تسلیم کیا گیا تھا اور اولاد کشی کا کثرت سے رواج تھا۔ ہندوستان کے راجپوتوں میں یہ دردناک منظر لڑکیوں کی شادی کی شرم و عار سے بچنے اور بیواؤں کی ستی کی صورت میں رائج تھا۔

اس ہولناک گناہ کا دوسرا سبب اہلِ عرب کا عام فقر و فاقہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اولاد ہوگی تو اس کے کھانے پینے کا سامان کرنا ہوگا۔ اس لیے وہ اس کے خون سے اپنا ہاتھ رنگ کر اس فرض سے سبکدوش ہوتے تھے۔ قرآن نے ان کو بتایا کہ ہر بچہ اپنا رزق اور اپنی قسمت ساتھ لے کر آتا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کو نہیں کھلاتا بلکہ وہ خدا ہی ہے جو سب کو کھلاتا ہے اور وہی ہر جاندار کی روزی کا مبر سامان ہے۔ ان کو بتایا گیا کہ نحن نرزقکم وایاھم۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ایک بار ایک صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ سب سے بڑا گناہ کون سا ہے فرمایا۔ شرک، پوچھا اس کے بعد فرمایا، والدین کی نافرمانی، پھر عرض کی کہ اس کے بعد، فرمایا، کہ تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی۔ یہ جواب حقیقت میں اسی آیت کی تفسیر ہے۔ ان ہی تعلیمات نے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا تھا کہ رازق اللہ ہے۔ اسی کے ہاتھ میں رزق کی کنجی ہے۔ ہر بچہ اپنے رزق کا آپ سامان لے کر آتا ہے۔ اس ایمان و یقین نے اس جرم کا خاتمہ کر دیا تھا۔

قرآن کی اس آیت کی روشنی میں وہ معاشی نظریہ بہت ہی پامال اور فرسودہ ہے جو نسل کو گھٹانے اور محدود کرنے کی تدابیر بتاتا ہے۔ آیت میں املاق کا اضافہ ہی یہ بتانے کے لیے ہے کہ فلاسفہ اور منکرینِ جاہلیت اپنے معاشی نظریہ کی فلاسفی بھی بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ یورپ میں جو تحریک منع حمل کی صورت میں اٹھی ہے اس کا محرک بھی خوفِ افلاس ہے۔ افراد تو افراد اب تو حکومتیں اپنے دائرۂ اختیار میں اسی پر مبنی قانون سازی کر رہی ہیں اور سوچ رہی ہیں کہ اتنے عرصہ میں ہم آنا غلہ پیدا کریں گے اور اسی حساب سے اتنے بچے پیدا ہونے دیں گے اور اگر کوئی بغیر پرمٹ کے آئے گا تو ہم سائنسی ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اس کا مقابلہ کریں گے۔

سوچیے جس غلط فہمی کے شکار عرب کے جاہل تھے کہ رہنے کے لیے جگہ کھانے کے لیے روٹی

اور پہننے کے لیے کپڑا نہیں ہے۔ یا اب تو ہے لیکن اگر تعداد کمانے والوں کی زیادہ ہو گئی تو کمی آ جائے گی اس لیے آنے والوں کو ختم کر دیا جائے گا۔ ٹھیک یہی حربہ اسی ذہن کے ساتھ اس زمانہ کی متمدن حکومتیں استعمال کر رہی ہیں۔ چیز ایک ہے اور دونوں جگہ روح ایک ہے صرف قالب بدلے ہوئے ہے۔ عرب ان پڑھ اور جاہل تھے اس وجہ سے قتل کی بھیمانہ صورت اختیار کی۔ موجودہ زمانہ کا انسان مہذب اور تعلیم یافتہ ہے اس نے اس کے لیے خوبصورت عنوان اختیار کیا ہے۔ ذہن دونوں کا ایک ہے۔ انہوں نے بھی رزاق اپنے کو سمجھا اور یہ بھی رزاق اپنے کو ہی سمجھ بیٹھے ہیں۔ قرآن نے لا تقتلوا کے بعد نحن نرزقکم وایاھم کہہ کر عربوں کو سمجھا دیا اور وہ بات سمجھ گئے مان بھی گئے۔ لیکن اس زمانے کے پڑھے لکھے بدو کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے فانا للّٰہ والی اللّٰہ المشتکی۔

راست بازی کی چوتھی دفعہ فواحش سے بچنا

۱۹۹۔ اور بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ کھلے طور پر ہوں یا چھپی ہوں۔ قریب نہ جاؤ سے شاید یہ مراد ہو کہ ایسے کاموں کے مبادی اور وسائل سے بھی بچنا چاہیے۔ مثلاً زنا کی طرح نظر بد سے بھی اجتناب لازم ہے[1]۔ اصل ارشاد میں فواحش آیا ہے اس کے معنے میں بہت وسعت ہے صرف زنا ہی اس کے معنے نہیں ہیں۔ بدکاری، بے حیائی، فحاشی کی تمام صورتیں اس میں داخل ہیں۔ اس پر اور اضافہ یہ کہ لا تقربوا فرمایا یعنی قریب نہ پھٹکو اور پھر ما ظھر منھا وما بطن لا کر تعمیم کو بہت ہی وسیع کر دیا اس میں بے حجابی، لباس میں بے ستری وغیرہ کی تمام صورتیں خواہ پبلک میں ہوں یا پرائیویٹ سب حرام ہو گئیں۔

یہ ممانعت جس انداز میں کی گئی ہے وہ بلاغت کی جان ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن جس طرح بدکاری سے بچنے کو شرافت گردانتا ہے اسی طرح اس کی تقریب اور تمہید کے کاموں سے بھی بچنے کو شرافت کا اقتضا قرار دیتا ہے۔ اسی وجہ سے اسلام کا قانون فوجداری اپنی سیاسی طاقت سے ایک طرف تو فواحش کو زبردستی روکتا ہے اور دوسری طرف شریف ارکان کو بدنیت لوگوں کی بدزبانی سے بھی محفوظ کرتا ہے مطلب یہ ہے کہ قرآن کی اخلاقی تعلیم انسان کو اندر سے درست کرتی ہے تاکہ اس میں بدی اور فواحش کی طرف رجحان ہی نہ ہو اور اس کا تعزیری قانون اس کو باہر سے درست کرتا ہے تاکہ اخلاقی تربیت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے ناقص رہ جانے سے اگر اس قسم کے رجحانات پیدا ہو جائیں اور وہ قوت سے فعل میں آنے لگیں تو ان کو بجبر روک دیا جائے۔ آیت میں خلوت و جلوت میں فواحش پر قدغن قائم کر کے اصلاحِ باطن کی اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔ اس تعلیم سے نظامِ معاشرت کو اس طرح درست کیا گیا ہے کہ اخلاقی تربیت کے نقائص سے جو کمزوریاں افراد و جماعت میں باقی رہ جائیں ان کو ترقی کرنے اور قوت سے فعل میں آنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ سوسائٹی میں ایک ایسا ماحول پیدا ہو جائے جس میں بُرے میلانات کو نشو و نما دینے والی آب و ہوا مفقود ہو، ہیجان انگیز تحریکات ناپید ہوں، صنفی انتشار کے اسباب امکانی حد تک کم ہو جائیں اور ایسی تمام صورتوں کا سدِ باب ہو جائے جن سے نظامِ تمدن میں برہمی پیدا ہونے کا امکان ہو۔

راست بازی کی پانچویں دفعہ انسانی جان کا احترام

۲۰۰۔ اور کسی جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے ہاں یہ کہ کسی حق کی بنا پر قتل کرنا پڑے اصل ارشاد میں الا بالحق آیا ہے یہ استثنا ضروری تھا جس میں قاتل عمد، زانی، محصن اور مرتد عن الاسلام کا قتل داخل ہے جیسا کہ احادیثِ صحیحہ میں اس کی تصریح وارد ہو چکی ہے اور ائمہ مجتہدین کا اس پر اجماع ہے[1]

مطلب یہ ہے کہ جس جان کے قتل کرنے کو اللہ نے اسلام کی وجہ سے یا اسلامی نظام کے تحت شہری ہونے کی وجہ سے یا معاہد ہونے کی وجہ سے یا سیاسی پناہ لینے کی وجہ سے حرام کر دیا ہے۔ اس کو مت قتل کرو۔ آیت کے عموم میں یہ سب داخل ہیں ہاں اگر ان پر حق کی بنا پر موجباتِ قتل میں سے کوئی سبب پایا جائے اس کی قرآن و سنت میں پانچ صورتیں بتائی گئی ہیں۔

ایک یہ کہ انسان دوسرے انسان کے قتلِ عمد کا مجرم ہو اور اس پر فردِ جرم لگ گئی ہو تو پھر قصاص میں اس کو قتل کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ میدانِ جنگ میں ہو اور اللہ کے دین کے قیام کی راہ میں مزاحم ہو۔ اور اس سے جنگ کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو۔

تیسرے یہ کہ دارالاسلام کی حدود میں بدامنی پھیلائے، اسلامی نظامِ حکومت کو تہ و بالا کرنے کی کوشش کرے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

چوتھے یہ کہ شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے۔

پانچویں یہ کہ اسلام کو چھوڑ کر مرتد ہو جائے۔

ان پانچ صورتوں کے سوا کسی صورت میں انسان کا قتل انسان کے لیے حلال نہیں ہے خواہ وہ مومن ہو یا ذمی ہو یا معاہد ہو یا مستامن ہو یا عام کافر ہو۔ الغرض اس قسم کے حق شرعی و قانونی کے بغیر کسی کو قتل کرنا جائز نہیں۔

ان رذائل کا مرتکب عقل سے محروم ہے

۱۰۲۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی خدا نے تمہیں وصیت کی ہے تاکہ تم سوجھ بوجھ سے کام لو۔ اس آیت سے ان چیزوں کا حرام ہونا ثابت ہوا، شرک باللہ، والدین کے ساتھ بدسلوکی، قتل اولاد، سب بے حیائی کے کام مثلاً زنا وغیرہ۔ کسی شخص کو ناحق قتل کرنا[1] یعنی اس آیت میں بیان شدہ رذائل وہ اخلاق ذمیمہ ہیں جن سے بچنے کی اللہ نے ہدایت کی ہے جن کے کرنے والے اس کے حضور میں گنہ گار ٹھہرتے ہیں، جن کی برائی کو ہر عقلمند جانتا اور مانتا ہے اور جن کی بدولت انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی اور مادی نقصانات پہنچتے ہیں اور ان کی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے بلکہ جب وہ کسی میں عام ہو جاتے ہیں تو پوری قوم کی تباہی بربادی کا سبب بن جاتے ہیں۔ یعنی اس کی دینی و دنیوی ترقیوں کی راہیں مسدود، سعادت اور اقبال کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور اس میں مخاطبوں کے طرز عمل پر طنز ہے کہ تم جن چیزوں کو حرام قرار دے رہے ہو اس کے پیچھے کوئی عقلیت نہیں ہے اور خدا نے جن سے بچنے کا حکم اپنے بندوں کو دیا ہے اس میں سراسر عقلیت ہے کیونکہ ان رذائل سے بچ کر ہی انسان فضائل کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ شرک سے بچ کر انسان توحید سے وابستہ ہوتا ہے اور یہ بالکل ٹھیٹھ عقلی بات ہے کہ بندگی کے تعلقات اس ذات سے قائم کرنا جو ازلی ہے ابدی ہے اور واجب الوجود ہے جو سب کو نعمت وجود عطا کرتا ہے جو سب کی پروردگاری کرتا ہے جو مالک ہے حاکم ہے جو علیم و حکیم ہے، جو عزیز اور عادل ہے، جو اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔ اس سے ہٹ کر کسی بھی مخلوق سے بندگی کے تعلقات بالکل بے عقلی اور حماقت ہے۔ ایسے ہی والدین سے حسن سلوک اخلاقی فضائل کی اساس ہے۔ معاشرتی نیکیوں کی بنیاد ہے۔ والدین کی بے حرمتی ان کی تذلیل، ان سے بے رخی تقاضائے عقل کے خلاف ہے۔ اولاد کشی کی جگہ اولاد کی تربیت، تعلیم، ان کی نگہداشت وہ اخلاقی فضیلت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے جس پر صحت مند معاشرے کا دارومدار ہے۔ والدین کا احترام اور اولاد سے شفقت یہ وہ اصول ہے جس پر معاشرے کی صحت کی عمارت اٹھتی ہے۔ یہی حال منع فواحش کا ہے۔ معاشرے کی برتری کا سب سے اونچا معیار یہی ہے۔ دُنیا میں سارے فساد کا سرچشمہ فواحش ہیں آخر میں انسانی زندگی کے احترام کی دفعہ ہے۔ ان میں سے ہر بات میزانِ عقل پر پوری اترتی ہے۔ بلاشبہ جس معاشرے میں شرک کی نجاست والدین سے بدسلوکی، اولاد کشی، فواحش کی گرم بازاری اور انسانی خون کی ارزانی ہوگی۔ وہ معاشرہ عقل وخرد سے محروم ہوگا اور اس پر انسانی ترقی کی ساری راہیں مسدود ہوں گی۔ یہ ایسی برائیاں ہیں جسے عقلِ انسانی کبھی گوارا نہیں کرتی ہے قرآن کی اصطلاح میں ایسی تمام برائیاں جن کی برائی ہر عقل کے لیے کھلی ہوئی ہو منکر کہلاتی ہے اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

راست بازی کی چھٹی دفعہ مال یتیم سے پرہیز

۲۰۲ - اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ لیکن ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے۔ یتیم کے مال میں بے جا تصرف کرنا حرام ہے۔ ہاں بہتر و مشروع طریقہ سے احتیاط کے ساتھ اس میں ولی یتیم تصرف کرسکتا ہے۔ جب یتیم جوان ہوجائے اور اپنے فرائض کو سنبھال سکے تو اس کے حوالہ کردیا جائے[1] مطلب یہ ہے کہ جب تمہیں کسی یتیم کا ولی بننے کا موقعہ ملے یا کاروبار میں یتیم کے مال پر مشتمل یتیم کے ولی یا وصی کی وساطت سے معاملہ کرنا پڑے تو یتیم کے مال میں بہت بڑی احتیاط کا مظاہرہ کرو اس طریقہ سے معاملہ کرو جو زیادہ سے زیادہ بے غرضی، نیک نیتی اور یتیم خیر خواہی پر مبنی ہو اور جس پر خدا اور خلق کسی کی طرف سے بھی تم اعتراض کے مستحق نہ ہو۔ یعنی سوائے بہتری کی نیت اور اصلاح کے خیال کے صاحب جائداد یتیموں کی جائداد کے پاس بھی کسی اور غرض سے نہ جائے اور دیانتداری سے ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھے۔ ہم اس موضوع پر سیر حاصل بحث سورۃ نساء میں کرچکے ہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ قرآن نے یہاں یتیموں کے ولیوں کو یہ ہدایت کی ہے کہ ان کے مالوں کے جب تک تم نگران ہو یہ بات تمہارے فرائض میں ہے کہ ہر وقت یتیموں کی بہتری کا خیال رکھو اور اس میں صرف اس طرح تصرف کرو کہ تمہارا تصرف یتیم کے حق میں مفید ہے۔ اور یہ یتیم کے مال کی نگرانی کا فرض تم اس وقت تک ادا کرو کہ یتیم اپنی طاقت کی عمر کو پہنچ جائے۔ اصل ارشاد میں حتی یبلغ اشدہ ہے۔ اس کے معنے طاقتو

[1] افادات شیخ الاسلام

ہونا، جوان ہونا ہیں۔ دوسری آیت میں اسی کو رشد کہا ہے فان آنستم منھم رشداً یعنی اگر ان میں صلاحیت دیکھو۔ دونوں کو ملا کر نتیجہ یہ نکلا کہ عمر کے اعتبار سے بالغ ہو اور شعور بھی بالغ ہو۔ جب یتیم بالغ ہونے کے بعد طاقتور اور جوان ہو جاتے تو وہ یتیمی کے دائرے سے نکل جاتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں آج کے مادہ پرستوں کی طرح صرف طاقت کا لوہا مانتے تھے اور حق کی حقیقت کا قوت و طاقت سے الگ ہو کر کبھی اعتراف نہ کرتے تھے اسی لیے قرآن میں ان دو کمزوروں یتیم اور عورت کی ہمدردی کی زیادہ وصیت کی ہے۔ اس دور میں اپنی جان، مال اور آبرو کی حفاظت صرف جسمانی اور عقلی قوت سے ہوتی تھی اس لیے قرآن نے یتیم کے بارے میں دونوں باتوں کو ملحوظ رکھا ہے جسم کی قوت کو بھی اور عقل کے بلوغ کو بھی۔

راست بازی کی ساتویں دفعہ دیانتداری

۲۰۳۔ اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو ہم کسی پر اس کی مقدور سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔ یعنی طاقت کے موافق ان احکام کی بجا آوری میں کوشش کرو اسی کے تم مکلف ہو خدا کسی کو اس کی مقدار سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا[1]

ناپ تول میں کمی و بیشی کرنا فی الواقع دوسرے کے حق پر چھاپہ مارنا ہے جو کوئی لینے میں تول کر بڑھاتا اور دینے میں گھٹاتا ہے وہ دوسرے کی چیز پر بے ایمانی سے قبضہ کرتا ہے۔ اور یہ بھی چوری ہے۔ اسی لیے قرآن میں اس سے بچنے کی خاص طور پر تاکید آئی ہے۔ حضرت شعیب کی قوم سوداگری کرتی تھی اسی لیے ان کی دعوت میں ناپ تول میں ایمانداری کی تاکید بار بار آتی ہے۔ مثبت انداز میں اور منفی انداز میں دونوں طرح سے سمجھایا ہے۔ منفی انداز میں ارشاد ہوا ولا تنقصوا المکیال والمیزان انی اراکم بخیر ناپ تول میں کمی نہ کرو۔ اس میں مجھے تمہاری خیر نظر آتی ہے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ ناپ تول کی بے ایمانی سے خیر و برکت جاتی رہتی ہے اور ظاہری نظر سے دیکھئے تو یوں کہیے کہ بازار میں ایسے لوگوں کی جو ناپ تول میں کمی بیشی کرتے ہیں ساکھ جاتی رہتی ہے اور یہ بالآخر ان کے بیوپار کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے یہ چاہتے تو یہ ہیں کہ اس بے ایمانی سے کچھ اپنا سرمایہ اور نفع بڑھائیں۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ ان کی یہ اخلاقی برائی ان کی اقتصادی اور معاشی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

اس بداخلاقی کے پیدا ہونے کا اصلی سبب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دلوں سے یہ یقین جاتا رہتا ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ ان کے اس چھپے ہوئے کرتوت کو دیکھنے والی آنکھ ہر وقت کھلی رہتی ہے اور ایک دن آئے گا جب ان کو خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ہر کام کا حساب دینا ہوگا۔

آخر میں فرمایا کہ لا نکلف نفساً الا وسعھا ہم ہر شخص پر اس کی مقدور کے مطابق ذمہ داری کا بوجھ ڈالتے ہیں۔ یعنی اللہ سبحانہ، لوگوں پر ان کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا ہے۔ یہ بطور استیناف بیانی ایک اٹھتے ہوئے سوال کا جواب ہے کہ انصاف کے مطابق بالکل پورا دینا کہ ماشہ اور رتی کا فرق نہ رہے بے حد دشوار ہے۔ میوہ، غلہ اور سبزیوں میں اس قسم کا نقطہ عدل قائم کرنا زندگی کو ایک بہت آزمائش میں ڈال سکتا ہے۔ جواب میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر ان کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص اپنی حد تک ناپ تول اور لین دین کے معاملات میں عرف کے مطابق راستی و انصاف سے کام لینے کی کوشش کرے وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے۔ بھول چوک نادانستہ کمی بیشی ہو جائے اس سے باز پرس نہ ہوگی۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ احکام جو دیئے انسان کی فطرت اور اس کی صلاحیتوں کو تول کر دیئے ہیں۔ ان میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اس کے تحمل سے باہر ہو۔ مطلوب جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص پوری دیانت و صداقت کے ساتھ ان احکام کی تعمیل کرے۔ اگر بلا ارادہ کسی پہلو میں کوئی بھول چوک ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر کوئی گرفت نہیں ہے۔

بہر حال ناپ تول کی درستگی اور یہ اصل کہ خرید و فروخت میں جو جس کا حق ہو اسے پورا ملنا چاہیے انسانی معیشت کی وہ بنیادی صداقت ہے جس کی سب نبیوں نے تلقین کی ہے۔ سید رشید رضا نے بالکل درست لکھا ہے کہ اگر مسلمان اس وصیت خداوندی پر عمل کر لیں تو ان کے سارے معاملات میں استقامت آجاتی اور باہم اعتماد کی فضا بحال ہو جاتی اور دنیا میں مفسدین کے لیے حجت بن کر رونما ہو جائیں۔

راست بازی کی آٹھویں دفعہ حق و عدل کا اہتمام

۲۰۴۔ اور جب بات کہو تو پورے انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو یعنی حق و انصاف کی بات کہنے میں کسی کی قرابت و محبت مانع نہ ہونی چاہیے [1] یوں تو زندگی کے ہر گوشہ میں عدل کا مطالبہ ہے لیکن شہادت یا فیصلہ کے وقت میں دو حالتوں میں اکثر لوگوں کا ایمان ڈگمگاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ فریق مقدمہ اپنا قرابت دار ہو یا اس سے گواہ یا حاکم کو عداوت ہو لیکن قرآن کی اخلاقی تعلیم اس حالت

[1] افادات شیخ الاسلام

میں بھی عدل وانصاف سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتی اور حکم ہے کہ گواہی دینی ہو یا فیصلہ کرنا ہو جب بات کہو زبانِ دہن سے ہو یا زبانِ قلم سے انصاف کا پاس کرو خواہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ عدل وانصاف کی راہ میں سب سے زیادہ کٹھن منزل وہ ہے کہ اپنے نفس کے مقابلے میں بھی عدل وانصاف کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ قرآن نے اس کٹھن منزل کی طرف بھی یہ کہہ کر رہنمائی کی ہے ولو علی انفسکم خواہ تمہارے اپنے خلاف ہو، انصاف کی بات کہو۔ اس آیت کے عموم نے عدل کے خلاف ایک ایک ریشہ کو زندگی سے نکال دیا ہے کہا گیا ہے اذا قلتم فاعدلوا کہ ہر حال میں عدل وانصاف کی حمایت تمہارا مقصد ہو جو کچھ کہو اور جب کہو خدا لگتی کہو اور خدا کے واسطے کہو اور دوسری جگہ بات کھول کر بتائی ہے کہ ولو علی انفسکم اوالوالدین والاقربین ان یکن غنیا او فقیرا، نہ تو اپنے نفس کا خیال بیچ میں آئے نہ عزیزوں اور قرابت داروں کا نہ دولت مند کی طرفداری کا، نہ محتاج پر رحم کا۔ پھر فیصلہ ہو یا گواہی ان میں کوئی بات لگی لپٹی نہ کہی جائے نہ حق کا کوئی پہلو جان بوجھ کر بچایا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ فیصلہ یا گواہی میں دولت مند کی خاطر نہ کرو اور نہ محتاج پر ترس کھاؤ اور نہ قرابت کو دیکھو جو حق ہو وہ کہو، پھر حق کہنے میں کوئی توڑ مروڑ نہ کرو کہ سننے والا شبہ میں پڑ جائے یا پوری بات نہ کہو کچھ چھپا لو یہ سب باتیں عدل وانصاف کے خلاف ہیں۔ کسی غریب کی غربت پر ترس کھا کر عدل وانصاف میں رد وبدل کر دینا بظاہر نیکی کا کام معلوم ہوتا ہے مگر فی الواقع یہ ایک مقدس فریب ہے۔ فیصلہ میں ترس کھا کر بے ایمانی کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسا کسی کی خاطر بے ایمانی کرنا ہے۔ غرض یہ ہے کہ عدل وانصاف کی راہ میں کوئی اچھا یا برا جذبہ حاکم کے لیے ٹھوکر کا باعث نہ بنے۔

لوگ عدل وانصاف کے فیصلہ یا گواہی میں اس لیے غلط بیانی کرتے ہیں کہ جس فریق کی طرفداری مقصود ہے اس کو فائدہ پہنچ جائے تو ارشاد ہوا کہ فاللہ اولی بھما اللہ اپنے امیر اور غریب دونوں بندوں کے حق میں تم سے زیادہ خیر خواہ ہے۔ تمہاری کم بین نظر اس پاس تک جا کر رہ جاتی ہے اور اللہ کی نظر میں سب کچھ ہے وہ سب کچھ دیکھ کر اور سب کچھ جان کر اپنے بندوں کے ساتھ وہ کرتا ہے جس میں ان کی بھلائی ہے۔ غور فرمایئے ان لفظوں میں عدل وانصاف کا فلسفہ کس خوبی سے ادا کیا گیا ہے کہ ایسا کرنے والا اس طرح فی الواقع سچائی کا خون کر کے نظم عالم کو تباہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور دنیا میں ظلم کی بنیادیں استوار کر رہا ہے جس سے عالم کے امن وامان کے درہم برہم ہونے کا خطرہ ہے۔ غلط گو انسان کی محدود نگاہ میں صرف ایک جزئی واقعہ کے نفع ونقصان کا خیال ہے اور اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف کے حکم میں سارے عالم کی خیر خواہی کا بھید چھپا ہوا ہے جس کا ایک فرد وہ خاص

انسان بھی ہے۔

راست بازی کی نویں دفعہ ایفائے عہد

۲۰۵ - اور اللہ کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا ہے اُسے پورا کرو یعنی اس کے اوامر اور نواہی پر پابندی سے عمل کرو۔ خدا کے لیے جو نذر مانو یا قسم کھاؤ بشرطیکہ غیر مشروع بات کی نہ ہو اسے پورا کرنا چاہیے۔[1]

عام طور پر لوگ عہد کے معنے صرف قول و اقرار کے سمجھتے ہیں لیکن قرآن کی نگاہ میں اس کی حقیقت بہت وسیع ہے وہ اخلاق، معاشرت، مذہب اور معاملات کی ان تمام صورتوں پر مشتمل ہے جن کی پابندی انسان پر عقلاً، شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً فرض ہے اور اس لحاظ سے یہ مختصر فقرہ انسان کے بہت سے عقلی، شرعی، قانونی، اخلاقی اور معاشرتی فضائل کا مجموعہ ہے اسی لیے اللہ سبحانہٗ نے قرآن میں اس کا بتکرار ذکر کیا ہے اور مختلف حیثیتوں سے کیا ہے۔ تمام عہدوں میں سب سے پہلے اس عہد کو پورا کرنا واجب ہے جو اللہ سبحانہٗ اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے۔ یہ عہد ایک تو وہ فطری معاہدہ ہے جو روزِ الست کو بندوں نے اپنے رب سے باندھا اور جس کا پورا کرنا ان کی زندگی کا پہلا فرض ہے اور دوسرا وہ عہد ہے جو خدا کا نام لے کر کسی بیعت اور اقرار کی صورت میں کیا گیا ہے اور تیسرا وہ عہد ہے جو عام طور سے قول و قرار کی صورت میں باہم ہوا کرتا ہے اور چوتھا وہ عہد ہے جو اہلِ حقوق کے درمیان فطرۃً قائم ہے اور جن کے ادا کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے۔ اسی طرح عہدِ الٰہی میں خدا کے وہ احکام بھی داخل ہیں جن کے بجالانے کا ایمان کی صورت میں تم نے اقرار کیا ہے گویا کہ اللہ کے سارے اوامر و نواہی کی پابجائی کا عہد ایمان کی صورت میں ایک مسلمان اللہ سے کرتا ہے۔ اسی طرح یہ مختصر جملہ نذر، منت اور قسم کو مشتمل ہے جس کو خدا کے مقدس نام سے تم نے مانا ہے۔

قرآن راست بازی کی جو روح انسانوں میں پیدا کرنی چاہتا ہے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی بدعہدی کی بداخلاقی گوارا نہیں کرتا۔ اس نے وفائے عہد اور احترام مواثیق کا جو معیار قائم کیا ہے وہ اس درجہ قطعی، بے لچک اور عالمگیر ہے کہ انسانی اعمال کا کوئی گوشہ بھی اس سے باہر نہیں رہ سکتا۔ فرد ہو یا جماعت ذاتی معاملات ہوں یا سیاسی، عزیز ہو یا اجنبی، ہم قوم و مذہب ہو یا غیر قوم و مذہب، دوست ہو یا دشمن، امن کی حالت ہو یا جنگ کی، کسی حال میں عہد شکنی جائز نہیں ہے، وہ ہر حال میں جرم ہے معصیت ہے۔ اللہ کے

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ساتھ عہد کر کے اسے توڑ دیتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ راست بازی کی یہ نویں دفعہ نہایت جامع ہے۔ پوری زندگی کے ہر گوشہ کو اپنے اندر سمیٹے ہوتے ہے۔ ہر عہد کی عند اللہ ذمہ داری ہے اس وجہ سے ہر عہد اللہ کا عہد ہے اگر وہ خدا کی حدود میں ہے۔

احکام کی غرض تذکیر ہے

۲۰۶۔ ان باتوں کی اللہ نے تم کو ہدایت کی ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔ اصل ارشاد میں تذکرون آیا ہے یہ ذکر سے بنا ہے۔ ذکر کے اصلی معنے کسی چیز کا ذہن میں آنا ہے۔ اسی کو ذکر قلبی کہتے ہیں اور یہی زبان پر آجائے تو ذکر لسانی ہے۔ اور مجازاً لفظ ذکر شہرت کے معنے میں بھی آتا ہے اور ذکر بول کر علم بھی مراد لیتے ہیں۔ قرآن کو اسی معنے میں ذکر کہا ہے۔ تذکیر کے معنے کسی چیز کو دل میں یاد رکھنے کے لیے کچھ تکلف کرنا اور اس میں فکر ہونا اور اسی لحاظ سے وعظ اور نصیحت کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہاں تذکیر کے معنے نصیحت یاب ہونا اور نصیحت قبول کرنا ہیں۔ جمال الدین قاسمی رقمطراز ہیں کہ شرک، حقوق والدین، مفلسی کے اندیشہ سے قتل اولاد، فواحش کا ارتکاب، خونریزی، ان سب کا پس منظر جہالت اور قوت غضب کی پیروی ہے۔ اور یہ صراحۃً عقل کے خلاف ہیں اس لیے ان کو بیان کرنے کے بعد لعلکم تعقلون فرمایا اور مال یتیم کا کھانا، ناپ تول میں کمی کرنا، غلط فیصلہ یا جھوٹی گواہی کا پس منظر حرص ہے اور شہوات کا غلبہ ہے اس لیے ان کے ذکر کے لیے لعلکم تذکرون فرمایا۔ اور علامہ نسفی فرماتے ہیں کہ پہلے عقلیت اور پھر تذکیر اس لیے لاتے ہیں کہ اولاً سن کر غور کرے گا، غور کے بعد نصیحت قبول کرے گا اور نصیحت قبول کرنے کے بعد زندگی میں محتاط ہو کر رہے گا۔ دوسرے علماء نے اس کے سوا اور بھی نکتہ آفرینی فرمائی ہے۔ مثلاً آلوسی لکھتے ہیں جن کاموں کے بعد عقل کو مخاطب کیا ہے ان میں صیغہ نہی لا کر کاموں سے منع کیا گیا ہے اور جن کاموں کے بعد تذکیر آیا ہے ان میں صیغہ امر آیا ہے گویا نواہی کے بعد عقل لا کر اشارہ کیا ہے کہ ان کی برائی عقلی ہے اور اس کے خلاف اقدام خالص بے عقلی ہے اور اوامر کے بعد تذکیر لا کر اشارہ کیا ہے کہ ان میں تمہاری صلاح مضمر ہے بشرطیکہ تمہیں یاد رہے اور تم باہم یاد کراتے رہو۔ تعقل اور تذکیر میں بڑا گہرا معنوی ربط بھی ہے انسان جب سنجیدگی سے ایک بات پر غور کرنے کا عزم کرتا ہے تو یہ تعقل ہے۔ اس تعقل سے وہ حقائق آشکارا ہوتے ہیں جو فطرت انسانی کے اندر ودیعت ہیں لیکن انسان کی غفلت کی وجہ سے ان پر ذہول کا پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے ان حقائق کا آشکارا ہونا تذکر ہے۔

راست بازی کی دسویں دفعہ راہِ نبوت پر چلنا ہے

۲۰۷۔ اور یہ کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ خدا کے راستہ سے ہٹا کر تمہیں تتر بتر کردیں گے۔ یہ بات جس کا خدا نے حکم دیا ہے تاکہ تم پرہیزگار ہوجاؤ۔ یعنی احکام مذکورہ بالا کی پابندی اور خدا کے عہد کو اعتقاداً و عملاً پورا کرنا ہی صراطِ مستقیم ہے جس کی طلب کی سورۃ فاتحہ میں تلقین کی گئی تھی۔ یہ راہ تم کو دکھلا دی گئی ہے اب چلنا تمہارا کام ہے جو کوئی اس کے سوا دوسرے راستہ پر چلا وہ خدا کے راستہ سے بھٹکا[1]

یہاں صراط سے اشارہ اس دعوت کی طرف ہے جسے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں اسی کے بارے میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ یعنی یہ سیدھی راہ جو میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں بس اسی کی پیروی کرو۔ خدا کی بتائی راہ یہی ہے۔ یہی حضرت ابراہیم کو دی ہوئی راہ ہے جس پر چلنے کی انہوں نے اپنی اولاد کو وصیت کی تھی۔ اس کے مخالف جس قدر راہیں ہیں، ان سے بچ کر رہو اور یہ بہت زیادہ ہیں۔ ان پر پڑ کر ہر شخص اس سیدھی راہ سے بھٹک جائے گا۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ صراط مستقیم کے لیے واحد کی تعبیر اور غلط راہوں کے لیے جمع کی تعبیر یہ بتانے کے لیے اختیار کی گئی ہے کہ حق ایک ہے اور باطل ایک سے زیادہ اور متعدد ہے جیسے نور ایک ہے اور تاریکیاں ایک سے زیادہ ہیں لہٰذا اگر تم کجی کے مقابلے میں راستی اور استقامت کے خواہاں ہو اور ضلالت کے مقابلے میں ہدایت کے طالب ہو تو میرے راستہ پر چلو اور دوسری راہوں پر نہ چلو۔ کیونکہ اس کے مقابلے میں ہر دوسرے راستہ کی پیروی انسان کو اس راہ سے ہٹا دے گی جو خدا کے قرب اور اس کی رضا تک پہنچنے کی ایک ہی راہ ہے اور اس راہ سے ہٹتے ہی بے شمار پگڈنڈیاں ہیں جن میں بھٹک کر پوری نوعِ انسانی پراگندہ ہوجاتی ہے اور اس پراگندگی کے نتیجہ میں نوعِ انسانی کا ارتقائے مطلوب ایک پریشان خواب ہو کر رہ جاتا ہے۔

نبوت کا یہی راستہ ایک راستہ ہے جس میں روح کو حقیقی اطمینان حاصل ہوسکتا ہے۔ اس کے ماسوا جس قدر راہیں ہیں وہ تذبذب کی راہیں ہیں، وہ تفرق کی راہیں ہیں اور تردد کی راہیں ہیں، نہ روح کے لیے ان میں کچھ تسلی ہے نہ نفس کو کچھ تشفی۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِیْۤ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا
لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ
يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَ
اتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ اَنْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ
عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ
لَغٰفِلِيْنَ ﴿۱۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّاۤ
اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّ
رَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ؕ
سَنَجْزِی الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا
كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی حسن کاری کرنے والے پر اپنی نعمت پوری
کرنے کے لیے اور ہر بات کو کھول کر بیان کرنے کے لیے اور اس لیے

کہ لوگوں پر ہدایت و رحمت ہو تاکہ وہ اپنے پروردگار کی ملاقات پر ایمان لائیں[208]
اور یہ کتاب جسے ہم نے اتارا ہے سراپا برکت والی ہے لہٰذا بس اس کی
پیروی کرو اور نافرمانی سے بچو تاکہ تم پر رحمت کی جائے[209]۔ یہ کتاب ہم نے
اس لیے نازل کی کہ تم یہ نہ کہو کہ خدا کی کتاب تو صرف ہم سے پہلے دو
جماعتوں پر اتاری گئی ہے اور ہمیں تو ان کے پڑھنے اور پڑھانے
کی خبر بھی نہ تھی[210]۔ یا تم یہ کہو کہ اگر کتاب ہم پر نازل ہوتی تو ہم ان
جماعتوں سے زیادہ ہدایت والے ہوتے لہٰذا تمہارے پروردگار کی جانب
سے ایک دلیل، ہدایت اور رحمت تمہارے پاس آچکی ہے[211]۔ اب اس شخص
سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ کی آیات کی تکذیب کرے اور ان سے
کنی کترائے، یاد رکھو کہ جو لوگ ہماری آیات سے کنی کتراتے ہیں ہم ان
کو اس کنی کترانے کی پاداش میں ضرور سنگین سزا
دیں گے[212]۔

معانی مفردات

ثُمَّ پھر حرف عطف ہے۔ ماقبل سے مابعد کے متاخر ہونے پر دلالت کرتا ہے خواہ یہ متاخر ہونا بالذات ہو یا باعتبار مرتبہ کے یا وضع کے لحاظ سے ہو۔ یہاں اس بارے میں شارحین کا کچھ اختلاف ہے کہ اس جملہ کا ثُمَّ کے ذریعے کس پر عطف ہے۔ ابن جریر تو یہ فرماتے ہیں کہ یہاں قل محذوف ہے اور اصل میں عبارت ثُمَّ قل اور اس کا عطف قل تعالوا اتل ما حرم ربکم پر ہے۔ اور کشاف میں زمخشری نے لکھا ہے کہ اس کا عطف وصاکم پر ہے اور ثُمَّ تراخی کے لیے ہے۔ حافظ ابن کثیر نے ابن جریر پر یہاں تنقید کی ہے اور بتایا ہے کہ یہاں خبر کا عطف خبر پر ہے۔ پہلے اللہ سبحانہ نے ان ھذا صراطی مستقیما فرما کر قرآن کے بارے میں خبر دی تھی اب اس آیت میں ثُمَّ لاکر تورات کی تعریف ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ بھی شارحین قرآن نے دادِ تحقیق دی ہے۔ مبارک۔ برکت سے بنا ہے مصدر مبارکہ آتا ہے اس کے معنے ہیں برکت دیا گیا یا برکت۔ یہ تورات کے مقابلے میں قرآن کی صفت بیان کی گئی ہے۔ دراستہم۔ یہ مصدر ہے اس کے معنے پڑھنے اور پڑھانے کے آتے ہیں۔ ان تقولوا یہاں ان سے پہلے لام اور ان کے بعد لا محذوف ہے۔ پوری تعبیر یوں ہے لئلا تقولوا عربی زبان میں یہ اندازِ بیان قانونی اور عام ہے۔ صدف، ماضی ہے اس کا مصدر صدف اور صدوف آتا ہے۔ اس کے معنے کترانے، منہ موڑنے کے ہیں۔ اصل میں صدف کے معنے سخت روگردانی کرنے کے ہیں۔ لازم اور متعدی دونوں آتے ہیں۔

ملتِ ابراہیم اور ملتِ موسیٰ کا چہرہ

پہلی آیت میں اللہ سبحانہ کے عالمگیر دین کی حقیقت ظاہر کرنے کے لیے صراطِ مستقیم کی تعبیر اختیار کی گئی، ان ھذا صراطی مستقیما یہی میری راہ ہے سیدھی۔ کسی مقام تک پہنچنے کے لیے خواہ آپ کتنی راہیں نکال لیں لیکن ان میں سیدھی راہ ہمیشہ ایک ہوگی اور اسی پر چل کر ہر مسافر منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔ علاوہ ازیں سیدھی راہ ہی ہمیشہ شاہراہ عام کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ تمام مسافر خواہ کسی گوشہ کے رہنے

والے ہوں لیکن سب مل جل کر وہی اختیار کریں گے ٹھیک اسی طرح دین کی سیدھی راہ بھی ایک ہے اور وہ اوّل دن سے موجود ہے۔ ہر عہد، ہر قوم، ہر ملک اسی پر چل کر منزلِ مقصود تک پہنچا ہے۔ بعد کو پیروان مذاہب نے ایسا کیا کہ اپنے میلانِ نفس اور رجحان طبع سے بہت سی راہیں نکال لی ہیں۔ چنانچہ یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے جب صراطِ مستقیم کی اس تفسیر پر نظر ڈالی جائے جو خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائی ہے۔

عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلی سے ایک لکیر کھینچی اور فرمایا کہ یوں سمجھو کہ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا راستہ ہے، بالکل سیدھا، اس کے بعد اس لکیر کے دونوں طرف بہت سی ترچھی لکیریں کھینچ دیں اور فرمایا یہ طرح طرح کے راستے ہیں جو بنا لیے گئے ہیں اور ان میں کوئی راستہ نہیں جس کی طرف بلانے والا ایک شیطان موجود نہ ہو۔ پھر یہ آیت پڑھی۔ ان هذا صراطی مستقیما الخ

اس سے معلوم ہوا کہ تمام ادھر اُدھر کے ٹیڑھے راستے سبل متفرقہ ہیں جو انسانوں کو مجتمع کرنے کی جگہ متفرق کر دیتے ہیں۔

نبوت کی راہ کا سیدھا ہونا اور سبل متفرقہ کا پرپیچ اور خم ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر انسان بغیر کسی عقلی کاوش کے سمجھ سکتا ہے۔ خدا کا دین اگر انسان کی ہدایت کے لیے ہے تو ضروری ہے کہ خدا کے تمام قوانین کی طرح یہ بھی صاف اور واضح ہو۔ اس میں کوئی راز نہ ہو۔ کوئی پیچیدگی نہ ہو، نا قابلِ فہم تحکم نہ ہو، اعتقاد میں سہل ہو اور عمل میں ہلکا ہر عقل اسے بوجھ لے اور ہر طبیعت اس پر مطمئن ہو جائے۔ غور فرمائیے حضرت ابراہیم سے لے کر حضرت موسیٰ تک دین کے نام پر جن احکام کا یہاں حوالہ دیا گیا ہے وہ تعداد میں نو یا دس ہیں یہی احکام درحقیقت دُنیا کے تمام خیر و شر کی بنیاد ہیں کوئی اخلاق کی تفصیل پر دفتر کے دفتر سیاہ کر ڈالے تاہم ان احکام عشرہ کے حلقہ سے باہر نہ نکل سکے گا۔ مختصر اور سادہ عبارت میں یہ احکام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اللہ سبحانہٗ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔
۲۔ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو
۳۔ اپنی اولاد کو فقر اور تنگدستی کے خیال سے قتل نہ کرو
۴۔ بے حیائیوں کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔
۵۔ کسی کا ناحق خون نہ کرو۔
۶۔ یتیموں کے مال میں ناحق تصرف نہ کرو۔

۷- ناپ تول میں کمی نہ کرو۔
۸- ناانصافی کی بات نہ کہو،
۹- اللہ کے عہد کو پورا کرو
۱۰- صراطِ مستقیم کا اتباع کرو۔

اب بتایا جارہا ہے کہ آدم سے لے کر حضرت موسیٰ تک ہم نے یہی ہدایت نامہ انسانی زندگی کی فلاح کے لیے جاری رکھا۔ اس کے بعد پھر ہم نے حضرت موسیٰ کو تورات دی اور دوسرے احکام و قوانین بتائے پہلے گویا ملت ابراہیم تھی اور اب یہ ملتِ موسیٰ کا ذکر ہو رہا ہے۔ حضرت موسیٰ کو جو کتاب دی گئی اس کی اساس بھی یہی احکام عشرہ ہیں۔ انشاء اللہ ہم پندرھویں جلد میں تورات سے اس کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کریں گے۔

۲۰۸- اور پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی حسن کاری کرنے والے پر اپنی نعمت پوری کرنے کے لیے اور ہر بات کو کھول کر بیان کرنے کے لیے اور اس لیے کہ لوگوں پر ہدایت و رحمت ہو تاکہ وہ اپنے پروردگار کی ملاقات پر ایمان لائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو احکام اوپر قل تعالوا اتل ماحرم علیکم ربکم سے پڑھ کر سنائے گئے یہ ہمیشہ سے جاری تھے۔ تمام انبیاء اور شرائع کا ان پر اتفاق تھا۔ بعدہٗ حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ پر تورات اتاری جس میں احکامِ شرع کی مزید تفصیل تھی۔ تورات عطا فرما کر اس زمانے کے نیک کام کرنے والے لوگوں پر خدا نے اپنی نعمت پوری کر دی۔ ہر ضروری چیز کو شرح و بسط سے بیان فرمادیا اور ہدایت و رحمت کے دروازے کھول دیے تاکہ اسے سمجھ کر لوگ اپنے پروردگار سے ملنے کا یقین حاصل کریں[1]

جیسے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ثم حرف عطف کے ذریعے اس آیت کو ما قبل کے ساتھ مربوط کرنے میں شارحینِ قرآن کا اختلاف ہے لیکن ہمیں زمخشری کی رائے قابلِ ترجیح معلوم ہوتی ہے کہ اس کا عطف ذالکم وصاکم بہ لعلکم تتقون فعل وصاکم پر ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے یہاں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ وصاکم کا خطاب پوری انسانیت سے از آدم تا ابندم ہے اور ثم واقعی تراخی کے لیے اور مطلب یہ ہے کہ اے انسانو! ہم نے تم کو آغاز آفرینش سے ان احکام کی بجا آوری کی وصیت کی تھی اور تمام انبیاء کی شریعتوں میں یہی احکام رہے ہیں۔ یعنی یہی احکام تمام پیغمبروں کے ادیان کا مشترکہ سرمایہ رہے ہیں، تا آنکہ موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے کتاب دی۔ حضرت موسیٰ کو جو کتاب دی گئی اس میں بھی بنیادی احکام یہی تھے۔ آپ کو سب سے پہلے جو احکام لکھ کر دیے گئے احکامِ عشرہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اس کے بعد قرآن نے حضرت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

موسیٰ کو کتاب دینے کی وجوہات سے بحث کی ہے۔

پہلی وجہ یہ بتائی ہے تماما علی الذی احسن یعنی نیکوکاری کی روش پر چلنے والے انسان پر اتمام نعمت کی خاطر ہم نے یہ کتاب نازل کی ہے۔ اس سے مراد ایک شخص ہے یا جماعت، قاضی بیضاوی نے دونوں لکھے ہیں لیکن ہماری رائے میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی رائے قابلِ ترجیح ہے کہ الذی احسن سے مراد خود حضرت موسیٰ کی ذات گرامی ہے۔ حضرت موسیٰ کے لیے یہاں یہ صفت اسی طرح آئی ہے جیسے سورہ نجم میں حضرت ابراہیم کے تعارف میں الذی وفیٰ آیا ہے۔ مقصد یہ بتانا ہے کہ حضرت موسیٰ کی ذات گرامی میں اس اتمام نعمت کو قبول کرنے کی پوری پوری صلاحیت تھی یعنی اللہ نے ان کو اس نعمت سے اس لیے نوازا ہے کہ وہ زندگی کے تمام گوشوں میں حسن کار تھے۔ احسان کے معنے حسن کاری کرنے کے ہیں۔ اللہ نے ان کے ظاہر و باطن میں جو کچھ ان کو بخشا اس کا حق انہوں نے پہچانا اور ہر معاملہ میں صرف کرنے کا نہیں بلکہ حسن کاری کا مظاہرہ کیا۔ اسی محنت و مشقت اور جانفشانی کی بنیاد پر یقیناً وہ اس کے مستحق تھے کہ اللہ کی نعمتوں کا اتمام ہو۔ کیونکہ ان کی پوری زندگی خالق و مخلوق کے باہمی تعلقات کی تصحیح میں حسن کارانہ مجاہدوں کے ساتھ بسر ہوئی ہے۔ اور جب وہ کسی کو منصب نبوت کے انتخاب کرنا چاہتا ہے تو وہ ایسے ہی حسن کار کو منتخب کرتا ہے جو علوم کو حالات اور حالات سے مقامات کی حد تک پہنچا دیتا ہے۔

دوسری وجہ یہ بتائی ہے کہ تفصیلا لکل شیئ، موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اس لیے دی گئی ہے کہ ان اصول و مبادی کی جو پہلے سے انبیاء کی شریعت میں موجود تھے جو ملت ابراہیمی کا سرمایہ تھے ان میں سے ہر چیز کی ان کے زمانہ کی استعداد کے مطابق مثلاً عبادات تمدنی معاملات تعزیری قوانین اور دفاعی ضوابط کی تفصیل کر دی جاتے اور دین کی زندگی میں انسانوں کو جس چیز کی ضرورت ہو اسے کھول کر بیان کر دیا جاتے۔

تیسری وجہ یہ بتائی ہے وھدیً یعنی یہ کتاب حضرت موسیٰ اس لیے دی گئی تھی کہ انسانوں کو زندگی بسر کرنے کا وہ طریقہ بتاتے جو اللہ کی رضا پر پورا اترے اور ان کو فلاح و سعادت کی راہ چلا۔ ے بدعملیوں سے روکتی رہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس صراط مستقیم کی رہنما بن کر رہے جس پر چلنے کا تمام انبیاء نے مطالبہ کیا ہے۔ ہدایت ہی کتاب الٰہی کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔

آخری وجہ یہ بتائی ہے ورحمۃ یعنی ہم نے حضرت موسیٰ کو تورات اس لیے دی ہے کہ وہ آخرت میں اور دنیا میں خدا کے بندوں کو خدا کی رحمت کا سزاوار بناتے اور اپنے انجام کے اعتبار سے ان کے لیے رحمت ہو یعنی ظلم و قساوت اور بغض و تنفر سے اپنے ماننے والوں اور برتنے والوں کو بچاتے اور رحم و محبت اور امن و عافیت کی روح سے ان کو معمور کرے۔

بالکل آخر میں بتایا کہ ان اوصاف پر مشتمل یہ کتاب ہم نے اس بنیادی مقصد کی خاطر دی ہے کہ لوگ اللہ کی ملاقات پر ایمان لائیں اور اسے مقصد زندگی بنا کر زندگی گزاریں۔ رب کی ملاقات پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جواب دہ سمجھ کر ذمہ دارانہ زندگی گزارے۔

قرآن آخری اور مکمل کتاب ہے

۲۰۹ - اور یہ کتاب جسے ہم نے اتارا ہے سراپا برکت والی ہے لہٰذا بس اس کی پیروی کرو اور نافرمانی سے بچو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔ یعنی تورات تو تھی ہی جیسی کچھ تھی لیکن ایک یہ کتاب ہے قرآن کریم جو اپنے درخشاں اور ظاہر و باہر حسن و جمال کے ساتھ تمہارے سامنے ہے اس کی خوبصورتی اور کمال کا کیا کہنا۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

اس کی ظاہری و باطنی برکات اور صوری و معنوی برکات و کمالات کو دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ مے دارد
برنگ اصحاب صورت را بہ بوار باب معنیٰ را

اب دائیں اور بائیں دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر خدا کی رحمت سے حظ وافر لینا چاہتے ہو تو اس آخری اور مکمل کتاب پر چل پڑو اور خدا سے ڈرتے رہو کہ اس کتاب کے کسی حصہ کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے[1] پہلے تورات کا ذکر تھا اب یہاں اس کے مقابلے میں قرآن کا ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ قرآن بسا اوقات قرآن اور تورات کا تقابلی مطالعہ پیش کرتا ہے۔ مثلاً سورہ ہود میں ہے۔

ومن قبلہ کتاب موسیٰ اماما ورحمۃ وھذا کتاب مصدق

سورہ انعام میں آیت ۹۱ اور ۹۲ میں بھی تقابلی مطالعہ پیش ہو چکا ہے۔

یہاں قرآن کا جوہری وصف مبارک پیش کیا ہے۔ قرآن کا یہ وصف تورات کے مقابلے میں دو درجے اہمیت رکھتا ہے اور اس کی اہمیت کی شان جملہ اسمیہ ہونے کی وجہ سے دو بالا ہو گئی۔ مبارک ہونے کی پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہے اس لیے جو کوئی اس کو قبول کرتا ہے وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں کو قبول کر لیتا ہے یہ حیثیت قرآن کے سوا کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں ہے۔ اسی اعتبار سے قرآن کو مہیمن کہا گیا ہے۔ قرآن کے مبارک ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن سے بے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کوئی کتاب الٰہی دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے پورے طور پر محفوظ نہیں رہی۔ لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دُنیا میں باقی نہیں اور جو باقی ہے وہ فنا ہو ہو کر نئے نئے قالب میں بدلتا رہا ہے۔ تورات جل جل کر خاک ہوئی۔ پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر کی گئی اور تراجم کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی۔ انجیل میں تحریف دجعل تو اسی زمانے میں شروع ہو چکا تھا۔ پھر مترجموں کی کتر بیونت نے حقیقت بالکل مشتبہ کر دی۔ زردشت کا صحیفہ سکندر کی نذر ہوا۔ ان کتابوں کا یہ حال اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دائمی مبارک اور آخری کتابیں بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ قرآن کو مبارک دائمی اور آخری کتاب بنا کر روانہ کیا۔ اس کی بقا و حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ نے اپنے ذمہ لی اور اعلان کیا وانالہ لحافظون یگانے تو یگانے اب بیگانے بھی اعتراف کر رہے ہیں مستشرقین اور یورپی محققین جو قرآن کو الہامی کتاب نہیں مانتے وہ بھی اس سے متفق ہیں۔ ہم یہاں کچھ مسیحی محققین کے خیالات درج کرتے ہیں۔ سر ولیم میور جو اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق اپنے تعصب میں مشہور ہیں وہ اپنی کتاب "لائف آف محمد" میں لکھتے ہیں:

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ربع صدی بعد کے اندر ہی ایسے شدید مناقشات اور فرقہ بندیاں پیدا ہو گئیں جس کے نتیجے میں حضرت عثمان شہید ہو گئے اور یہ اختلافات آج بھی باقی ہیں لیکن ان سب فرقوں میں قرآن ایک ہی ہے۔ ہر زمانہ میں تواتر کے ساتھ ان سب فرقوں کا ایک ہی قرآن پڑھنا اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ آج ہمارے سامنے وہی صحیفہ ہے جو اس بدقسمت خلیفہ کے حکم سے تیار کیا گیا تھا۔ شاید پوری دُنیا میں کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں جس کی عبارت بارہ صدیوں تک اس طرح بغیر تبدیلی کے باقی رہی ہو۔ قرآن میں قرأت کے اختلافات بھی حیرت انگیز طور پر بہت کم تعداد میں ہیں اور یہ بھی ان اعراب کی وجہ سے جو بہت بعد کے زمانے میں لگائے گئے۔

دھیری اپنی تفسیر قرآن میں لکھتا ہے کہ تمام قدیم صحیفوں میں قرآن سب سے زیادہ غیر محفوظ اور خالص ہے۔ قرآن کا مشہور انگریزی مترجم پامر لکھتا ہے کہ حضرت عثمان کا ترتیب دیا ہوا قرآن کا متن اس وقت سے آج تک سطے شدہ اور مسلمہ صحیفہ رہا ہے۔

لین پول کہتا ہے:

قرآن کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی اصلیت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ ہر حرف جو ہم آج پڑھتے ہیں اس پر بڑا اعتماد کر سکتے ہیں کہ تقریباً تیرہ صدیوں سے غیر مبدل رہا ہے[1]

[1] یہ شہادتیں مولانا ابوالحسن کے خطبات "منصب نبوت" سے ماخوذ ہیں۔

آیت میں لفظ مبارک صیغۂ صفت ہونے کی وجہ سے برکت کے اسی دوام کو بتلا رہا ہے۔ مبارک ہی کی تعبیر قرآن نے خانہ کعبہ کے لیے اختیار کی ہے ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکاً و ھدی للعالمین جیسے خانہ کعبہ سے برکات کا جدا ہونا ممکن نہیں اور اس میں دوام ہے ایسے ہی قرآن سے برکات کا جدا ہونا ممکن نہیں ہے۔ لفظ مبارک اس بارش کے لیے قرآن میں آیا ہے جو زمین کی سیرابی روئیدگی، سرسبزی کا ذریعہ بنتی ہے اس کے خزانوں، اس کی برکتوں کو ابھارتی ہے اور اس کے مردہ اور بے آب و گیاہ ہونے کے بعد اس کو از سرِ نو حیاتِ تازہ بخشتی ہے۔ جیسے قرآن کے لیے اس لفظ کے استعمال میں یہ استعارہ ہے کہ یہ بھی دُنیا کو اس کی روحانی موت کے بعد از سرِ نو حیاتِ تازہ بخشنے کے لیے نازل ہوا ہے ایسے ہی اس لفظ کو صفت کا صیغہ بنا کر لانے میں اس کے دوام کی طرف بھی اشارہ ہے۔

قرآن کا یہ جوہری وصف بیان کرنے کے بعد پوری انسانی زندگی سے اللہ سبحانہٗ نے دو مطالبے کیے ہیں ایک یہ کہ اسی کا اتباع کرو، دوسرے یہ کہ اس کی نافرمانی سے بچو۔ اگر یہ دو کام تم نے کر لیے تو پھر تم اس لائق ہو کہ تم پر اللہ کی رحمت ہو۔ اتباع یہ کہ اس کے اوامر کی پابجائی کی جائے اور اتقا یہ کہ اس کے نواہی سے بچا جائے۔ بالفاظِ دیگر فرائض کی ادائیگی کرو اور محرمات سے دامن بچا کر رکھو۔ اگر فکرِ صحیح کے ساتھ ان دو باتوں کو اپنا لو گے تو خدا کی رحمت تمہاری طرف متوجہ ہو جائے گی۔

نزولِ قرآن سے معذرت کا خاتمہ

۲۱۰ - یہ کتاب ہم نے اس لیے نازل کی کہ تم یہ نہ کہو کہ خدا کی کتاب تو صرف ہم سے پہلے دو جماعتوں پر پر اتاری گئی ہے اور ہمیں تو ان کے پڑھنے اور پڑھانے کی خبر بھی نہ تھی۔ یعنی اس مبارک کتاب قرآن حکیم کے نزول کے بعد عرب کے اُمیین کے لیے یہ کہنے کا موقعہ نہیں چھوڑا گیا کہ بیشتر جو آسمانی کتابیں شرائع الٰہیہ کو لے کر اتریں وہ تو ہمارے علم کے موافق ان ہی دو فرقوں یہود و نصاریٰ پر اتریں بے شک وہ لوگ آپس میں اسے پڑھتے پڑھاتے تھے اور بعضے اس کا ترجمہ بھی عربی میں کرتے تھے۔ مثلاً ورقہ بن نوفل وغیرہ، اور بہت سے مدت تک اس دھن میں لگے رہے کہ عرب کو یہودی یا نصرانی بنالیں لیکن ہمیں ان کی تعلیم و تدریس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس سے بحث نہیں کہ یہود و نصاریٰ جو کچھ پڑھتے پڑھاتے تھے وہ چیز کہاں تک اپنی اصلی مادی صورت میں محفوظ تھی۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ ان شرائع اور کتب کی اصلی مخاطب فقط قوم بنی اسرائیل تھی خواہ وہ اس تعلیم کے بعض اجزاء مثلاً توحید اور اصولِ دینیہ کی دعوت کو وسعت دے کر بنی اسرائیل کے سوا دوسری اقوام کے حق میں بھی عام کر دیا گیا ہو تاہم جو شریعت اور کتابِ سماوی

بحیثیتِ مجموعی کسی خاص قوم پر اسی کے مخصوص فائدے کے لیے اتری ہو۔ اس کے درس و تدریس سے اگر دوسری اقوام خصوصاً عرب جیسی غیور قوم کو دلچسپی اور لگاؤ نہ ہو تو کچھ مستبعد نہیں۔ بنابریں وہ کہہ سکتے تھے کہ کوئی آسمانی کتاب و شریعت ہماری طرف نہیں آئی اور جو کسی مخصوص قوم کے لیے تھی اس سے ہم نے چنداں واسطہ نہیں رکھا۔ پھر ہم ترکِ شرائع پر کیوں ماخوذ ہوں گے مگر آج ان کے لیے اس طرح کے حیلے حوالوں کا موقع نہیں رہا۔[1] مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ رحمت اس لیے نازل فرمائی کہ مبادا کل کو تم خدا کے سامنے یہ عذر کرو کہ جس طرح بنی اسرائیل کو کتاب ملی آخر بنی اسماعیل کو اسی طرح کی کتاب کیوں نہیں ملی۔ ہمیں ان کے علوم سے کیا واسطہ۔ دراصل پہلے قرآن کو مبارک فرما کر اس عالمگیر برکت کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی بشارت عرب کے بارے میں حضرت ابراہیم کو دی گئی تھی۔ پیدائش باب ۲۲ میں ہے :

> خداوند فرماتا ہے اس لیے کہ تو نے ایسا کام کیا اپنا بیٹا اور اپنا اکلوتا بیٹا دریغ نہ رکھا میں نے قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی۔

اس برکت کے پورا ہونے اور ان کا حقیقی مصداق بننے کے لیے نسلِ ابراہیم کی ضرورت تھی اس لیے اللہ نے بنی اسماعیل میں حضورِ انور روانہ فرماتے اور آپ پر قرآن نازل کیا۔ اب اہلِ عرب یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ ہم نسلِ ابراہیم ہونے کے باوجود برکات سے محروم رہے اور فقرہ و ان کنا عن دراستھم کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان تمام اثرات سے محفوظ رہے جو قوموں کے عادات و اخلاق کو بدل دیتے ہیں۔ مثلاً باوجود اس کے کہ وہ ہر چہار طرف سے مختلف بڑے بڑے مذہبوں سے ٹکرا رہے تھے مگر کوئی مذہب ان کو فتح نہیں کر سکا۔ یہودیت یمن اور حجاز کی تجارت گاہوں پر قابض تھی، عیسائیت اپنی فوج و لشکر اور راہبوں اور قسیسوں کے دل یمن سے لے کر شام کی حدود تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور بعض افراد اور بعض قبیلوں کو وہ برائے نام عیسائی بھی بنا چکے تھے مگر پورا عرب بدستور اپنی خالص حالت پر تھا۔ عرب میں جو نیک طبع ہوتے وہ یہودی یا نصرانی ہونے کے بجائے اپنے کو دینِ ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے اور اسی لیے اپنے مذہب کا نام دینِ حنیفی رکھتے تھے۔ یہ سب اس لیے ہو رہا تھا کہ ان کے ذریعے دینِ ابراہیمی کی دعوت و تجدید کا راستہ کھلا رہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

قرآن خدا کی عظیم بینہ ہے

۲۱۹ - یا تم یہ کہو کہ اگر کتاب ہم پر نازل ہوتی تو ہم ان جماعتوں سے زیادہ ہدایت والے ہوتے لہٰذا تمہارے پروردگار کی جانب سے ایک دلیل ہدایت رحمت تمہارے پاس آ چکی ہے۔ یعنی پہلی اُمتوں کا حال سن کر تم کو رشک ہوتی اور دل میں ولولہ اٹھتا کہ ہمارے پاس خدا کی کتاب آتی تو ہم دوسروں سے بڑھ کر عمل کر کے دکھلاتے سو تم کو ان سے بہتر کتاب دی گئی۔ خدا کی حجت اس کی روشن کتاب اور ہدایت و رحمت عامہ کی بارش خاص تمہارے گھر میں اتاری گئی تاکہ وہ اولاً اس سے مستفید ہوں، پھر اس امانتِ الٰہیہ کو تمام احمر و اسود اور مشرق و مغرب کے باشندوں تک حفاظت و احتیاط کے ساتھ پہنچا دیں کیونکہ یہ کتاب کسی قوم کے لیے نہیں اتاری گئی، اس کا مخاطب تو سارا جہان ہے۔ چنانچہ خدا کے فضل و کرم سے عرب کے ذریعہ سے خدا کا یہ عام پیغام آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچ گیا۔ الحمد للہ علی ذالک[1]

قرآن کے لیے یہاں ہدایت و رحمت کے ساتھ بینہ کا لفظ بولا ہے۔ بینہ کے معنے روشن دلیل اور حجت قاطعہ کے ہیں۔ قرآن کی حیثیت صرف کتاب کی نہیں بلکہ نبوتِ محمدیہ کے لیے ایک علمی اعجاز کی ہے اس لیے اسے بینہ کہا ہے۔ بینہ وہ ہے جس کے ذریعے حق کا اظہار ہو۔ قرآن عقائد کو دلائل کے ساتھ اور فضائل و آداب، اصولِ قانون کو انسانی زندگی کے اجتماعی تقاضے کے مطابق پیش کرتا ہے۔

قرآن کے بینہ ہونے کے لیے ذرا اس پر غور فرمائیے کہ ایک اُمّی محض جو اُمیوں کی گود میں پلا ہوا اور پل کر جوان ہوا، اس نے ہوش سنبھالا تو گرد و پیش تاریکیوں اور ظلمتوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن ایک عاری ملک عاری شہر اور عاری خاندان کے اندر نشو و نما پاتی، جہاں اہلِ فکر اور اربابِ علم کا وجود نہ تھا وہ خود اس کا خاندان اور اس کا وطن نوشت و خواند کے نقوش و حروف سے ناآشنا تھا۔ گزشتہ صحفِ انبیاء اور افکارِ عالیہ کا ایک حرف اس کے کان میں کبھی نہ پڑا تھا اور دانشوروں کی صحبت اس نے نہیں اٹھائی تھی۔ اصولِ قانون، مبادی اخلاق، محاسنِ علم و عمل کی کوئی ظاہری تعلیم اس کو نہیں ملی بلکہ مدرسہ علم و حکمت کے سایہ دیوار تک کبھی اس کا گزر بھی نہیں ہوا اور اسی طرح وہ اپنی زندگی کے چالیس دورے پورے کرتا ہے کہ دفعتہً غارِ حرا کے ایک دہانے سے اجالا ہوتا ہے۔ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا سرچشمہ اُبلتا ہے۔ ظاہری نوشت و خواند کے نقوش و حروف کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے، صحفِ انبیاء اور

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

افکارِ عالیہ کے اوراق اس کی زبان پر جاری ہوجاتے ہیں اس کے پرتو صحبت سے اُمّی اور جاہل علماء دہر اور دانشوران روزگار بن کر نکلنے لگتے ہیں۔ اصول قانون مبادی اخلاق اور محاسن علم و عمل کی تعلیم کا غلغلہ اس کی بزم فیض کے گوشہ گوشہ سے بلند ہوتا ہے۔ کلام ربانی کے پردے سے علم و حکمت کے پوشیدہ اسرار فاش ہونے لگتے ہیں۔ اس سے بڑھکر قرآن حکیم کے بینظیر ہونے کی اور کیا دلیل ہوسکتی ہے۔

تورات قانون شریعت ہے لیکن اخلاق اور موعظت نہیں انجیل اخلاق و موعظت ہے لیکن قانون و شریعت نہیں۔ زبور مخاطبات قلبی اور دعاؤں کا مجموعہ ہے لیکن دیگر صفات سے خالی۔ مسیح کے صحیفے میں خطابت کی ہنگامہ آرائیاں ہیں مگر استدلال اور فکر و نظر کی دعوت نہیں۔ صحف بنی اسرائیل پیشین گوئیوں سے لبریز ہیں مگر دقائق حکمت اور اسرار ایمان و عمل سے خالی ہیں۔ دنیا میں ایک ہی کتاب الٰہی ہے جو قانون و شریعت بھی ہے اور اخلاق موعظت بھی، مخاطبات قلبی اور دعاؤں کا گنجینہ بھی ہے۔ اور دیگر کتب الٰہیہ کی مجموعی صفتوں کی حامل بھی، خطابت بھی ہے اور استدلال و فکر بھی، اظہار غیب اور پیشین گوئیوں سے لبریز بھی ہے۔ اور دقائق حکمت و اسرار ایمان و عمل سے معمور بھی اور ان سب کے ساتھ عین اس وقت جب اور کتب الٰہی تحریف اور تغییر اور تراجم و تغیر سے اپنی اصلی زبان اور اصلی الفاظ کھوچکی ہیں۔ اس کی بقاء اور حفاظت کی یہ ذمہ داری کہ تیرہ برس کے بعد بھی اس کے ایک نقطہ ایک حرف ایک نقطہ میں تغیر و تبدل نے راہ نہیں پائی۔ وہ اپنی زندگی جاوید کے لیے کاغذ کے نقوش و حروف کی محتاج نہیں کہ لاکھوں انسانوں کے سینے اس خزانے کے صندوق ہیں اور وہ اسی زبان اور انہی الفاظ اور انہی حروف کے قالب میں اب تک جلوہ گر ہے جس میں دست قدرت نے اسے ڈھالا تھا اور جبریل امین نے اسے اتارا تھا۔ اور محمد عربی نے اس کو امت کے ہاتھوں سونپا تھا کیا یہ بینہ نہیں ہے۔

قرآن سے روگردانی کا انجام

۲۱۲۔ اب اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ کی آیات کی تکذیب کرے اور ان سے کنی کترائے، یاد رکھو کہ جو لوگ ہماری آیات سے کنی کتراتے ہیں ہم ان کو کنی کترانے کی پاداش میں ضرور سنگین سزا دیں گے۔ یعنی اب ایسی بے مثال روشن کتاب آنے کے بعد اگر اس کی آیتوں کو کوئی جھٹلائے اور اس کے احکام کو قبول کرنے سے کترائے یا دوسروں کو روکے، اس سے بڑا ظالم کون ہوگا۔ صدف عنہا کے دونوں معنے سلف سے منقول ہیں روکنا اور اعراض کرنا حضرت شیخ الہند نے دوسرے معنے لے کر کترائے ترجمہ کیا ہے[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

صدف لازم اور متعدی دونوں آتا ہے یعنی اعراض کرنا اور منہ پھیرنے کے معنے میں بھی اور کسی کو اس سے پھیرنے اور موڑنے کے معنے میں بھی۔ جن لوگوں نے اسے متعدی کے معنے میں لیا ہے ان کی بات قوی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کذب بآیات اللہ ہے جس کے اندر اعراض اور روگردانی کا مفہوم ہے۔ اس کے بعد موزوں بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس کو متعدی معنے ہی میں لیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ جنہوں نے آیاتِ الٰہی کی تکذیب کی اور دوسروں کو اس کے سننے سے روکا۔ چنانچہ کبار قریش تکذیب کرتے تھے اور عرب کے عام شہریوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے سے روکتے تھے اور اس لیے روکتے تھے کہ وہ قرآن نہ سن سکیں کہ اس کے نتیجہ میں حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں۔ متعدی فعل کی صورت میں ان کا جرم صرف ضلال نہیں بلکہ اضلال بھی ہوگا۔ استفہام انکاری ہے یعنی ایسے شخص سے زیادہ ظالم کوئی نہیں ہے جو اللہ کی آیات کی تکذیب کرتا ہے اور خود اس سے روگرداں ہوتا ہے اور اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ لوگوں کو اس سے روکتا ہے۔ ان کی سزا کیا ہے؟ اس کو یہاں بتایا ہے کہ اس کردار رکھنے والے ظالموں کو ان کی اس روگردانی سے روکنے کی پاداش میں بدترین سزا ملے گی۔ اس میں عذاب ملنے کا سبب علیحدہ بتایا ہے حالانکہ الذین یصدفون میں بیان ہو چکا تھا لیکن پھر تصریحاً فرمایا بما کانوا یصدفون۔ اسی طرح کی تعبیر سورہ نحل میں بھی آئی ہے۔

الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ زدناھم عذاباً فوق العذاب بما کانوا یفسدون

جن لوگوں نے خود کفر کی راہ اختیار کی اور دوسروں کو اللہ کی راہ سے روکا انہیں عذاب پر عذاب دیں گے اس فساد کے بدلے جو وہ دنیا میں کرتے تھے۔

یعنی ایک عذاب خود کفر کرنے کا اور دوسرا عذاب دوسروں کو راہِ خدا سے روکنے کا۔ یہاں بھی یوں ہی سمجھو کہ مطلق عذاب تو ہوگا آیات سے خود روگردانی کا اور بدترین عذاب ہوگا لوگوں کو اللہ کی آیات سے روکنے کا۔ اس طرح ایک ہی آیت میں صدف لازم اور متعدی دونوں طرح آیا ہے۔ جیسے یہاں اس دھمکی سے پہلے قرآن کے بینہ، ہدایت اور رحمت ہونے کا ذکر ہے اسی طرح سورہ نحل میں عذاب کی دھمکی کے بعد قرآن کے بیان، ہدایت، رحمت اور اہلِ ایمان کے لیے بشارت ہونے کا ذکر ہے۔

ونزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکل شیئ وھدی ورحمۃ وبشریٰ للمسلمین۔

ہم نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے جو ہر چیز کو صاف صاف وضاحت سے بیان کرنے والی ہدایت رحمت اور ان کے لیے بشارت ہے جنہوں نے سرِ طاعت خم کر دیا ہے۔

یعنی جو لوگ آج اس کو مان لیں گے اور اطاعت کی راہ اختیار کر لیں گے ان کو یہ زندگی کے ہر معاملہ میں صحیح رہنمائی دے گی اور اس کی پیروی کی وجہ سے ان پر اللہ کی رحمتیں ہوں گی اور انہیں یہ کتاب خوشخبری دے گی کہ

فیصلے کے دن اللہ کی عدالت میں وہ کامیاب ہوں گے، برخلاف اس کے کہ جو لوگ اس کو نہ مانیں گے وہ صرف یہی نہیں کہ ہدایت و رحمت سے محروم رہیں گے بلکہ قیامت کے روز جب خدا کے پیغمبر اُن کے مقابلے میں گواہی دینے کھڑے ہوں گے تو یہی دستاویز ان کے خلاف ایک زبردست حجت ہوگی۔

هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّآ أَن تَأْتِيَهُمُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ أَوْ يَأْتِىَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِىَ بَعْضُ
ءَايَٰتِ رَبِّكَ ۗ يَوْمَ يَأْتِى بَعْضُ ءَايَٰتِ رَبِّكَ لَا يَنفَعُ نَفْسًا إِيمَٰنُهَا
لَمْ تَكُنْ ءَامَنَتْ مِن قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فِىٓ إِيمَٰنِهَا خَيْرًا ۗ قُلِ
ٱنتَظِرُوٓا۟ إِنَّا مُنتَظِرُونَ ﴿١٥٨﴾

کیا پھر یہ لوگ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ آسمان سے ان کے پاس فرشتے آجائیں یا خود آپ کا پروردگار آجائے یا پھر آپ کے پروردگار کی کچھ نشانیاں نمودار ہو جائیں جس روز آپ کے پروردگار کی کچھ نشانیاں نمودار ہوں گی اس روز کسی انسان کو جو پہلے سے ایمان نہ لا چکا ہو یا اپنے ایمان میں نیکی نہ کمالی ہو ایمان لانا سود مند نہ ہوگا، اے پیغمبر آپ کہہ دیجیے تم بھی انتظار کرو ہم بھی انتظار کر رہے ہیں۔

معانی مفردات

الملائکۃ یہ لفظ جمع ہے اس کا واحد ملک، ملاک اور مالک تین طرح سے استعمال ہوتا ہے

اس کے لغوی معنے قاصد اور رسول کے ہیں۔ ان سے مراد وہ غیر مادی مخلوق نیک ہستیاں یا ارواح ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عالم اور اس کے اسباب وعلل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں۔ آیات، آیت کی جمع ہے اس کے معنے نشانی اور علامت کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو علم و احساس کے جو ذرائع عطا کیے ہیں وہ حقیقت میں صرف آیات و علامات کی شناخت اور یاد ہے۔ دنیا میں جس قدر چیزیں ہیں تم ان کو کس طرح جانتے ہو۔ صرف آیات و علامت سے۔ کلیات سے لے کر جزئیات تک جو کچھ ہم کو خارج سے علم حاصل ہوا ہے وہ محض نشانیوں کو دیکھ کر ہم جانتے ہیں خدا شناسی کی آیات، نبی شناسی کی آیات اور قیامت شناسی کی آیات کو اسی لیے آیات کہا جاتا ہے۔ آیات دو قسم کی ہیں تکوینی اور تشریعی۔ یہاں آیات رب سے قیامت کی علامات مراد ہیں۔ ایمان، یہ امن سے بنا ہے۔ اس کے لغوی معنے ماننے کے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ ایمان لغت میں اگرچہ تصدیق کے لیے ہی استعمال ہوا ہے مگر شارع نے اس لفظ کو جب استعمال کیا ہے تو ایک خاص نوع کی تصدیق کے لیے استعمال کیا ہے اس لیے قرآن و سنت میں اس لفظ سے وہی تصدیق مراد ہوگی جو اس کے تکرار سے متعین ہو چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان صرف تصدیق نہیں ہے بلکہ انقیاد قلبی اور التزام طاعت بھی اس کا اہم حصہ ہے۔ اگر ایک شخص صرف تصدیق رکھتا ہے مگر عہد وفاداری نہیں کرتا وہ مومن نہیں کہلا سکتا اور اسی طرح اگر فرمانبرداری کے لیے تو آمادہ ہے مگر قلب و زبان سے تصدیق نہیں کرتا تو وہ بھی مومن نہیں ہے۔ ایمان صرف اس صورت کا نام ہے کہ قلب و زبان تصدیق سے مزین ہوں اور شریعت پر عمل پیرا ہونے کا عزم بھی پکا ہو۔ گویا شرعی تصدیق اسی کا نام ہے۔

ایمان صرف اختیاری معتبر ہے

یہاں تک آداب و فضائل کی حد تک اصول دین بیان ہو چکے ہیں۔ آخر میں ان کی فرسودہ معذرت کو بھی بتا دیا ہے۔ اب ان سے کہا جا رہا ہے کہ ان تنبیہات و تہدیدات کے بعد بھی جو لوگ جادۂ مستقیم پر ہموار نہ ہو سکے بلکہ شیطان کے پیچھے بھٹکتے رہ گئے اب بھی اگر وہ کسی چیز کے منتظر ہیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ اس کے خواہش مند ہیں کہ غیبی نشانی کے ذریعے ان کو ایمان پر مجبور کر دیا جائے اور اختیاری طور پر ایمان نہیں بلکہ اضطراری طور پر راہ ایمان کو اپنائیں۔ لیکن اضطراری ایمان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ ایمان ارادی و اختیاری

ہی معتبر ہے۔ اس دُنیا میں انسان کی ساری آزمائش صرف اس بات میں ہے کہ وہ حقیقت کو دیکھے بغیر مانتا ہے یا نہیں اور ماننے کے بعد اتنی اخلاقی طاقت رکھتا ہے یا نہیں کہ نافرمانی کا اختیار رکھنے کے باوجود فرمانبرداری اختیار کرے چنانچہ اللہ سبحانہٗ نے انبیاء کی بعثت میں کتابوں کی تنزیل میں حتیٰ کہ معجزات تک میں عقل کے امتحان اور اخلاقی قوت کی آزمائش کا ضرور لحاظ رکھا ہے اور کبھی حقیقت کو اس طرح بے پردہ نہیں کر دیا ہے کہ آدمی کے لیے مانے بغیر چارہ نہ رہے کیونکہ اس کے بعد تو آزمائش بالکل بے معنی ہو جاتی ہے اور امتحان میں کامیابی و ناکامی کا کوئی مفہوم ہی باقی نہیں رہتا۔ اسی لیے یہاں فرمایا ہے کہ اس وقت کا انتظار نہ کرو کہ جب اللہ اور اس کی سلطنت کے کارکن فرشتے خود سامنے آجائیں گے کیونکہ پھر تو فیصلہ ہی کر ڈالا جائے گا۔ ایمان لانے اور اطاعت میں سر جھکا دینے کی ساری قدر و قیمت اسی وقت تک ہے جب تک حقیقت تمہارے حواس سے پوشیدہ ہے اور تم محض دلیل سے اس کو تسلیم کر کے اپنی دانشمندی کا اور محض فہمائش سے اس کی پیروی و اطاعت اختیار کر کے اپنی اخلاقی طاقت کا ثبوت دیتے ہو ورنہ جب حقیقت بے نقاب سامنے آجائے اور تم بچشم سر دیکھ لو کہ یہ خدا اپنے تخت جلال پر متمکن ہے اور یہ ساری کائنات کی سلطنت اس کے فرمان پر چل رہی ہے اور یہ فرشتے زمین و آسمان میں لگے ہوئے ہیں اور یہ تمہاری ہستی اس کے قبضۂ قدرت میں پوری بے بسی کے ساتھ جکڑی ہوئی ہے اس وقت تم ایمان لائے اور طاعت کی تو اس ایمان و طاعت کی قیمت و قدر ہے باقی اس وقت جب پردہ ہٹ جائے گا تو کٹے سے کٹا کافر اور بد سے بدتر مجرم بھی انکار و سرکشی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ایمان لانے اور اطاعت قبول کرنے کی مہلت بھی اسی وقت تک ہے جب تک پردہ کشائی کی وہ ساعت نہیں آتی، جب وہ ساعت آگئی تو پھر نہ آزمائش ہے نہ مہلت بلکہ وہ فیصلہ کا وقت ہے۔ اس وقت کا ایمان و عمل کوئی معتبر نہیں ہے۔

یہ ایک ہی آیت ہے اس لیے اس کا تشریحی نوٹ بھی ایک ہی ہے۔ پہلے شیخ الاسلام کی زبانی سنیے فرماتے ہیں۔ یعنی اللہ کی طرف سے ہدایت کی جو حد تھی وہ پوری ہو چکی، انبیاء تشریف لائے، شریعتیں اتریں، کتابیں آئیں، حتیٰ کہ اللہ کی آخری کتاب بھی آچکی تب بھی نہیں مانتے تو شاید اب اس کے منتظر ہیں کہ اللہ آپ آئے یا فرشتے آئیں یا قدرت کا کوئی بڑا نشان۔ مثلاً قیامت کی کوئی بڑی علامت ظاہر ہو تو یاد رہے کہ قیامت کے نشانوں میں سے ایک نشان وہ بھی ہے جس کے ظاہر ہونے کے بعد نہ کافر کا ایمان لانا معتبر ہو گا نہ عاصی کی توبہ۔ صحیحین کی احادیث بتلاتی ہیں کہ یہ نشان آفتاب کا مغرب سے طلوع کرنا ہے۔ یعنی جب خدا کا ارادہ ہو گا کہ دُنیا کو ختم کرے اور عالم کا موجودہ نظام درہم برہم کرے تو موجودہ قوانین طبیعیہ کے خلاف بہت سی عظیم الشان خوارق وقوع میں آئیں گے۔ ان میں ایک یہ ہے کہ آفتاب مشرق کے بجائے

مغرب سے طلوع ہوگا۔ غالباً اس حرکت مقلوبی اور رجعت قہقری سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جو قوانین قدرت اور نوامیس طبیعیہ دُنیا کے موجودہ نظم ونسق میں کارفرما تھے ان کی میعاد ختم ہونے اور نظامِ شمسی کے الٹ پلٹ ہوجانے کا وقت آپہنچا ہے گویا اس وقت سے عالم کبیر کے نزع اور جانکنی کا وقت شروع ہوتا ہے اور جس طرح عالم صغیر یعنی انسان کی جانکنی کے وقت کا ایمان معتبر اور توبہ مقبول نہیں کیونکہ وہ حقیقت میں اختیاری نہیں ہوتا اسی طرح طلوع شمس از مغرب کے بعد مجموعہ عالم کے حق میں یہی حکم ہوگا کہ کسی کا ایمان و توبہ معتبر نہ ہو۔ بعض روایات میں طلوع شمس از مغرب کے ساتھ چند دوسرے نشانات بھی بیان ہوئے۔ مثلاً خروج دجال، خروج دابہ وغیرہ۔ ان روایات کی مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب ان سب نشانات کا مجموعہ متحقق ہوگا اور وہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ طلوع الشمس من المغرب بھی متحقق ہو تو دروازہ توبہ کا بند کر دیا جائے گا۔ الگ الگ ہر انسان پر یہ حکم متفرع نہیں ہے۔ ہمارے زمانہ میں بعض ملحدین جو ہر غیر معمولی واقعہ کو استعارہ کا رنگ دینے کے خوگر ہیں وہ طلوع شمس من المغرب کو بھی استعارہ بنانے کی فکر میں ہیں۔ غالباً ان کے نزدیک قیامت کا آنا بھی ایک طرح کا استعارہ ہوگا [1]

مطلب تو بالکل واضح اور صاف ہے کہ ان تمام حیلے اور بہانوں کو دلائل کی قوت سے ختم کر دیے گئے اور ان پر حجت قائم کر دی گئی ہے۔ اس کے باوجود اگر نہیں مانتے ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ اس بات کی انتظار میں ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا خدا خود ان کے لیے جلوہ نمائی کرے جیسا کہ ان کا مطالبہ ہے یہ نہیں تو قیامت کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہوجائے یا عذاب الہٰی کی نشانیوں میں سے کوئی فیصلہ کن نشانی ظاہر ہو۔ عام شارحین قرآن یہی کہتے ہیں کہ بعض آیات سے قیامت کی نشانی مراد ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ امام بخاری نے صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ:

> قیامت بپا نہ ہوگی تا آنکہ سورج مغرب سے طلوع نہ ہوگا جب سورج مغرب سے طلوع ہوگا تو سب لوگ اس کا مشاہدہ کرلیں گے تو یہی وہ وقت ہوگا کہ کسی کو اس کا ایمان کچھ فائدہ نہ دے گا جو پہلے ایمان نہ لایا ہو یا جس نے اپنے ایمان میں کوئی بھلائی نہ کمائی ہو۔

اس ارشاد کی روشنی میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ ایمان لانے کے لیے اپنی موت کا

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

انتظار کر رہے ہیں یا پورے عالم کی موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں وقتوں کا ایمان معتبر نہ ہو گا۔ کیونکہ یہ ایمان ارادی اور اختیاری نہ ہوگا اور ایمان کے معتبر ہونے کے لیے ارادی اور اختیاری ہونا ضروری ہے۔ ایمان معتبر صرف وہ ہے جو آنکھ کان، دل و دماغ اور عقل کی صلاحیتوں کو استعمال کر کے لایا جائے نہ موت کا ڈنڈا دیکھ کر خواہ یہ شخصی موت ہو یا کائنات کی موت ہو۔ موت کے وقت غرغرہ کی حالت میں کسی کا ایمان کچھ سودمند نہیں ہے۔ سودمند ایمان وہی ہوگا جو پہلے لایا جاتے اور اس میں کچھ عمل صالح کی کمائی کرلی جائے۔ واقعی اس آیت کی تفسیر جو روایات مذکور ہیں۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس آیت میں پروردگار کی بعض نشانیوں سے مراد آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا ہے اور عقلاً بھی ایسے حادثہ کا ظہور کم از کم موجودہ علمائے ہیئت کے نزدیک ناممکن نہیں ہے اس کی قدرت سے کیا بعید ہے کہ زمین کی روزانہ کی حرکت ہی تبدیل ہوجاتے مشرق مغرب ہو جاتے اور مغرب مشرق ہو جاتے۔ یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ ہوگا کہ موجودہ قوانین طبعی کی میعاد ختم ہو رہی ہے اور نظام شمسی کے درہم برہم ہونے کا وقت آگیا ہے۔ کعب احبار کے ایک بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جسے امام بخاری نے تاریخ میں اور حافظ ابن عساکر نے نقل کیا ہے۔

اللہ جب یہ ارادہ فرمائے گا کہ سورج مغرب سے طلوع ہو تو زمین کے محور کو پھیر دے گا مشرق کو مغرب اور مغرب کو مشرق بنا دے گا۔

جس حدیث کا شارحین قرآن نے اس آیت کی تفسیر میں سہارا لیا ہے اور جسے ہم ابو ہریرہ کے حوالہ سے نقل کر آئے ہیں۔ یہ امام بخاری نے کتاب الرقاق میں نقل کی ہے۔ اور کتاب التفسیر میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے اور کتاب الفتن میں اسی مضمون کو طویل کر کے پیش کیا ہے۔ جس میں اس نشانی کے ساتھ دوسری علاماتِ قیامت کا بھی ذکر ہے مثلاً،

تین باتیں ایسی ہیں جب وہ ظاہر ہو جائیں گی تو کسی شخص کو ایمان لانا سودمند نہ ہوگا اول سورج کا مغرب سے نکلنا دوسرے دجال کا ظہور تیسرے دابۃ الارض۔

یہ حدیث ان احادیث کے خلاف ہے جن میں خروج دجال کے بعد نزول ابن مریم کا ذکر ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ لوگ آپ پر ایمان لائیں گے۔ اگر ایسا ہے تو پھر ایمان کے سودمند نہ ہونے کا مسئلہ سنگین اور پیچیدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ علاماتِ قیامت کے متعلق جو احادیث آئی ہیں ان میں اس سے زیادہ پیچیدہ اشکالات ہیں۔ مثلاً اکثر احادیث میں قیامت کی علامات کبریٰ کی جو ترتیب مذکور ہے۔ بعض حدیثوں میں وہ ترتیب مختلف ہے۔ پھر ان روایات میں تعارض بھی موجود ہے اس

علاوہ جو حدیثیں سند کے لحاظ سے صحیح ہیں ان کے متن میں اضطراب ہے۔ ان حدیثوں میں باہم اختلاف کا بڑا سبب یہ ہے کہ اکثر احادیث کی روایت بالمعنی ہے اور چونکہ یہ باتیں عالم غیب سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے راویوں کے فہم اور سمجھ کے اختلاف کے اعتبار سے ان کی تعبیر میں اختلاف ہوا ہے اسی لیے ان آیات کی ترتیب میں اختلاف ہوا ہے۔ بلاشبہ طلوع شمس من المغرب آخری علامات ہے اور اس کے بعد ایمان مقبول نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ آلوسی نے روح المعانی نے یہی موقف اختیار کیا ہے کہ مغرب کی طرف سے آفتاب طلوع ہونے کا واقعہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تشریف آوری کے کافی زمانہ بعد ہوگا۔ شارحین قرآن نے یہاں علامات قیامت تو بیان کی ہیں مگر ان کی ترتیب کی طرف کسی نے کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ انشاء اللہ اس پر تفصیلی بحث جلد ۲۶ میں آئے گی۔

آیئے اب اسی روشنی میں شارحین قرآن کی زبانی آیت کی تشریح بھی سن لیجئے۔ حافظ ابن جریر فرماتے ہیں۔

> آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو کافر آفتاب کے مغرب کی طرف سے نکلنے سے پہلے ایمان نہیں لایا تھا اسے طلوع آفتاب کے بعد ایمان لانا سودمند نہ ہوگا اور جس مومن نے طلوع آفتاب سے پہلے عمل صالح نہیں کیا تھا اسے طلوع آفتاب کے بعد کوئی عمل فائدہ نہ دے گا۔ کیونکہ اس وقت ایمان اور عمل کا معاملہ بالکل ایسا ہوگا جیسے قرب موت میں ایمان لائے یا عمل کرے جیسے اس وقت کوئی ایمان و عمل مفید نہیں ایسا ہی مغرب سے طلوع آفتاب کے بعد ایمان و عمل معتبر نہ ہوگا۔ قرآن میں ہے فلم ینفعھم ایمانھم لما راوا باسنا عذاب کی رونمائی کے بعد ایمان مفید نہیں ہے اور حدیث صحیح میں ہے ان اللہ یقبل توبۃ العبد مالم یغرغر اللہ تعالیٰ غرغرہ کی حالت میں کسی کو توبہ قبول نہیں فرماتا۔

مطلب یہ ہے کافر کو ایمان اور فاسق کو توبہ اس عظیم نشانی کے ظاہر ہونے کے بعد کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی۔ کیونکہ یہ زمانہ زمانہ تکلیف نہ ہوگا اور حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

> مغرب سے آفتاب طلوع ہونے کے بعد کافر ایمان لائے گا یا جو شخص طلوع آفتاب سے پہلے مومن تھا اگر اس کی زندگی ہی صالح تھی تو وہ بہار بہار میں ہے۔ لیکن اگر زندگی عاصیانہ تھی اور وہ اب طلوع آفتاب کے بعد توبہ کر کے زندگی صالح بنائے گا تو دونوں کا ایمان اور عمل قبول نہ ہوگا او کسبت فی ایمانھا خیرا کا یہی مطلب ہے کہ مومن کا عمل صالح قبول نہ ہوگا جب کہ پہلے وہ عمل صالح نہیں کر رہا تھا۔

اور کچھ علماء نے اس آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ اس آیت میں حضور کے مخاطبوں کو حالات کے

مطابق بتایا جا رہا ہے کہ کیا یہ لوگ عذاب استیصال کا انتظار کر رہے ہیں۔ مولانا اصلاحی کا میلان بھی یہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

سنت الٰہی کے مطابق اب ایک ہی چیز باقی رہ گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ حق و باطل کے درمیان فیصلہ فرمادے باطل نابود اور حق کا بول بالا ہو۔

لیکن دوسرے علما نے وہی مطلب بتایا ہے کہ بعض آیات سے مراد آثار قیامت ہیں اور یہی زیادہ راجح ہے

ایک سنگین شبہ اور اس کا ازالہ

آیت کی اس تشریح پر شارحین قرآن نے ایک شبہ نقل کیا ہے اور اس کے متعدد جوابات دیے ہیں۔ آیت لم تکن امنت من قبل او کسبت فی ایمانھا خیرا میں او حرف تخییر کے ذریعے جو بات بتائی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کو جیسے قیامت کی نشانی دیکھنے کے بعد ایمان لانا کام نہ دے گا ایسے ہی جو مومن پہلے سے ہوگا اسے قیامت کی نشانی دیکھنے کے بعد اپنی ایمانی زندگی کے لیے خیر بھی کام نہ دے گا۔ بالفاظ دیگر بغیر عمل صالح کے ایمان بھی سودمند نہ ہوگا۔ اگر ایک شخص ایمان نہیں رکھتا ہے وہ بلاشبہ عمل صالح بھی نہیں کر سکتا کیونکہ عمل کے صالح ہونے کے لیے ایمان کی زمین میں ہونا شرط ہے۔ اگر او حرف تخییر ہے اور اپنے معنے میں ہے تو او کسبت فی ایمانھا خیرا محض تکرار ہوگا۔ اور پھر ایمان نہ رکھنا خلود فی النار کے لیے مستقل سبب ہے۔ اس کے بعد او کسبت فی ایمانھا خیرا کا اضافہ زائد ہے۔ ایسے ہی ایمان عمل صالح کے ساتھ جنتی ہونے اور آگ سے بچنے کا اگر سبب ہے تو پہلے امنت میں کوئی معنویت نہیں ہے۔ او حرف تخییر کی وجہ سے یہ پیچیدگی پیدا ہوئی ہے۔ کیونکہ اگر کوئی یہ کہے کہ سوار ہونے کے بعد کسی کو سامان فائدہ نہ دے گا جس کے پاس سوار ہونے سے پہلے سامان نہ ہو، یا جس کے سامان میں روپے نہ ہوں اسے اس کا سامان فائدہ نہ دے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کا صاف لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ سامان سے استفادے کے لیے سامان میں روپے کا ہونا ضروری ہے۔ ایسے ہی یہاں بھی سمجھ لیجیے کہ ایمان سے استفادے کے لیے عمل صالح کا ہونا ضروری ہے۔ یہاں قرآن نے ایمان کو ظرف قرار دیا ہے۔ معتزلہ نے اس تعبیر سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اور اپنے اس موقف کے لیے کہ عمل کے بغیر ایمان سودمند نہیں ہے۔ اس سے استدلال کیا ہے۔ علماء اہل السنۃ نے اس کے مختلف جوابات دیے۔ ان میں سب سے بہتر جواب وہ ہے جو مولانا شبیر احمد عثمانی نے نہایت اختصار کے ساتھ پیش فرمایا ہے :

اور جملہ او کسبت فی ایمانھا خیرا کا عطف امنت من قبل پر ہے۔ تقدیر عبارت کی ابن المنیر وغیرہ محققین نے یہ بتائی ہے لا ینفع نفسا ایمانھا او کسبھا خیرا لم تکن

امنت من قبل اولم تکن کسبت فی ایمانہا خیراً، یعنی جو پہلے سے ایمان نہیں لایا اس وقت اس کا ایمان نافع نہ ہوگا اور جس نے پہلے سے کسبِ خیر نہیں کیا اس کا کسبِ خیر نافع نہ ہوگا یعنی توبہ قبول نہ ہوگی۔[1]

علامہ ابن المنیر نے الانتصاف میں لکھا ہے کہ اس آیت میں از روئے بلاغت لف کا انداز تعبیر اختیار کیا ہے یہ علم بدائع کی محسنات معنویہ میں ہے۔ علامہ زمخشری نے کشاف میں ومن ایاتہ منامکم باللیل والنہار وابتغاءکم من فضلہ میں بھی لف قرار دیا ہے۔ اصل میں پوری بات اس طرح تھی کہ جس روز تیرے رب کی کچھ نشانیاں ظاہر ہوں گی اس روز کسی ایسے شخص کو جو پہلے ایمان نہ لایا ہو ایمان لانا سود مند نہ ہوگا اور نہ کسی ایسے شخص کو جس نے کوئی کارِ خیر پہلے نہ کیا ہو خیر کمانا فائدہ نہ دے گا۔ دونوں باتوں کو اختصار کی خاطر ایک بات بنا دیا ہے۔ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ نشانیاں ظاہر ہونے کے بعد اکتسابِ خیر تو فائدہ نہ دے گا لیکن نشانیاں ظاہر ہونے سے پہلے کا ایمان عدم خلودِ نار کے لیے نافع ہوگا۔

ابن الحاجب نے امالی میں یہی مطلب بتایا ہے اور علامہ طیبی نے اس موضوع پر ائمہ فن کی تصریحات پیش کی ہیں اور لکھا ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے مخالفین کو یہ کہہ کر مخاطب کیا تھا ھذا کتاب انزلناہ پھر نزولِ قرآن کی یہ وجہ بتائی کہ ان تقولوا تم یہ نہ کہہ سکو کہ جیسے یہود و نصاریٰ کو کتابیں مل چکیں ہمیں نہیں مل چکیں، اس کے بعد ان کو جتایا کہ فقد جاءکم بینۃ تو تمہارے پاس بھی اللہ کی واضح دلیل آچکی ہے اب تمہارے پاس نہ ماننے کا کوئی عذر نہیں ہے۔ اب بھی اگر کوئی نہیں مانتا تو فمن اظلم اس سے بڑھ کر محروم القسمۃ کون ہوگا جس کے پاس ایسی کتاب آجو ان کے لیے حجت و برہان ہو جو ابرِ رحمت بن کر برسے جو رہنمائی کے لیے روشنی کا مینار ہو اور نصرت میں خدا کی رحمت کی ضامن ہو اس کے بعد ارشاد ہوا ھل ینظرون یعنی یہ لوگ ماننے کے لیے اب صرف عذابِ الٰہی کا انتظار کر رہے ہیں یہ عذابِ الٰہی دنیا میں یا تو فرشتوں کے ذریعے آ گرے اور یا یہ عذابِ الٰہی آخرت کا پورے نظامِ عالم کو تباہ کر کے آئے۔ اس وقت ان کے پاس فرصت کے یہ موجودہ لمحات نہ ہوں گے جس میں ایمان سود مند ہے اور جس ایمان کی زمین میں عمل صالح فائدہ بخش ہے بلکہ وہ وقت جب اللہ کی نشانی کا ظہور ہوگا کسی کو نہ تو ایمان فائدہ دے گا اور نہ ایمان کی زمین

[1] افادات شیخ الاسلام

میں عمل صالح فائدہ دے گا، جب تک وہ اس وقت سے پہلے ایمان نہ لا چکا ہو گا یا ایمان کی زمین پر عمل صالح نہ کر چکا ہو گا۔ لہٰذا آیت میں فی الواقع لف ہے۔ دو باتوں میں سے ایک کو نشر کے تعاون سے حذف کر دیا گیا ہے۔

اس کے بعد علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ اسی پارے میں قرآن کی ایک اور آیت بھی اسی کے ہم معنیٰ آ رہی ہے علامہ کی مراد سورہ اعراف کی آیت ۵۲، ۵۳ ہے۔ انشاء اللہ ہم اسی جلد میں وہاں تبصرہ کریں گے۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ
إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿١٥٩﴾ مَن جَاءَ
بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ۖ وَمَن جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَىٰ
إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿١٦٠﴾

اے پیغمبر بلاشبہ جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور فرقے ہو گئے آپ کا ان سے کوئی سروکار نہیں ہے ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے پھر وہی بتلائے گا جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں[۲۱۳]۔ جو کوئی نیکی کی پیش کش کرے گا تو اس کے بدلہ میں اس کو دس گنا ہے اور جو کوئی برائی لے کر آئے گا تو برائی کا بدلہ برائی کے برابر دیا جائے گا اور لوگوں کے ساتھ ناانصافی بالکل نہ ہو گی[۲۱۴]۔

معانی مفردات

۱ دینؔ عربی میں دین کے معنے بدلہ اور مکافات کے ہیں خواہ اچھائی کا ہو خواہ برائی کا۔ دین کے معنے جزا،

اطاعت، شریعت، بدلہ، اطاعت کرنا اور شریعت کی پابندی کے معنے میں ہوتا ہے۔ دان یدین کا مصدر ہے۔ جمع اس کی ادیان ہے۔ شیعۃ، شیعۃ کی جمع ہے۔ فرقہ، گروہ، اصل میں شیاع کے معنے انتشار اور تقویت کے ہیں۔ جن سے انسان کو تقویت ہو اور جو اس سے نکلے اور پھیلے ہوں۔ وہ اس انسان کے شیعہ یعنی اس کا فرقہ اور پارٹی ہیں شیعہ کا اطلاق واحد تثنیہ جمع، مذکر مونث سب پر ہوتا ہے۔ شیع اور اشیاع جمع ہے۔ حسنۃ، خوبی، بھلائی، نیکی نعمت ہر وہ نعمت جو انسان کو اس کی جان یا بدن یا حالات میں حاصل ہو کر اس کے لیے مسرت کا سبب بنے حسنہ کہلاتی ہے، سیئہ اس کی ضد ہے۔ یہ دونوں اسم جنس ہیں جن کے تحت مختلف انواع داخل ہیں چنانچہ ارشاد ہے و ان تصبھم حسنۃ یقولوا ھذہ من عند اللہ یہاں حسنہ سے مراد خوش حالی اور فصل کی عمدگی ہے۔ حسن، حسنۃ اور حسنیٰ میں فرق یہ ہے کہ حسن ذوات اور اشخاص اور معاملات و حالات دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اسی طرح حسنہ صفت ہو کر دونوں کے لیے بولی جاتی ہے اور اسم ہو کر صرف واقعات اور حالات کے لیے آتی ہے لیکن حسنیٰ کا استعمال صرف واقعات کے لیے ہوتا ہے۔ ذوات و اشخاص کے لیے نہیں ہوتا سیئۃ برائی گناہ حسنہ کی ضد ہے۔ ساء یسوء سے صفت کا صیغہ ہے۔ اس کا مذکر سیئ آتا ہے۔ اور اس کی جمع سیئات آتی ہے۔

نجات ہدایت سے ہٹنے میں نہیں

وصایائے عشر کا خاتمہ اس وصیت پر کیا تھا کہ ان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ جو کچھ میں پیش کر رہا ہوں یہ صراط مستقیم ہے اس پر چلو طرح طرح کی راہوں پر نہ چلو، وہ تمہیں خدا کی راہ سے ہٹا کر تتر بتر کر دیں گی۔ اس عظیم وصیت کے بعد شریعت موسیٰ اور شریعت محمد رسول اللہ کا تقابلی مطالعہ پیش کیا اور بتایا کہ شریعت موسیٰ بھی اپنے وقت میں ہدایت اور رحمت تھی لیکن شریعت محمدیہ ہدایت و رحمت ہونے کیساتھ مبارک بھی ہے اور بہتر بھی ہے۔ اب یہی کامل ہدایت ہے اسی کی پیروی کرو اور بقیہ مذاہب اپنی موجودہ حالت میں کامل نہیں ہیں یعنی وہ ابدی کامل ہدایت جو اپنے اپنے وقتوں میں سب نبی لے کر آتے رہے ہیں چونکہ ان کے پیرو اپنی تاویلات، تحریفات، تصرفات اور اختلافات سے برباد کر چکے ہیں۔ اسی لیے قرآن اسی کو لے کر آخری بار آیا ہے۔ اب یہ ہدایت، رحمت یا برکت ہے۔ اور

دلائل کے جلو میں آنے کی وجہ سے بہتر ہے اس لیے کامل ہے اور کامل ہی ہمیشہ رہے گی کبھی ناقص نہ ہو گی۔
صراطی مستقیما کہہ کر اس حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھایا تھا کہ صراط مستقیم ایک ہے جو میں لے کر آیا ہوں یہی نوح، ابراہیم اور موسیٰ کو عطا کی گئی تھی۔ اگلوں کے بعد پچھلوں نے اپنی ذہنی تحریفات اور دستی تصرفات سے اس میں تفرقے پیدا کیے اور اس کی ضد اور تعصبات سے فرقہ داری کی الگ الگ راہیں نکالی ہیں۔ المقدسی نے البدء والتاریخ میں لکھا ہے کہ قرآن کے اولیں مخاطب مختلف فرقوں میں بٹے ہوتے تھے۔ قبیلہ تمیم میں مزدکیہ اور مجوسیت تھی۔ غسان میں یہودیت اور نصرانیت تھی اور شرک سب میں مشترک تھا۔ اور صراط مستقیم ان کے نرغے میں گم ہو کر رہ گئی تھی اور سب اصل دین سے ہٹ گئے تھے یا سب نے دین میں تفرقہ ڈال دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے صراط مستقیم پھر دنیا کے لیے کھولی۔

۲۱۳۔ اے پیغمبر بلاشبہ جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور فرقے ہو گئے آپ کو ان سے کوئی سروکار نہیں ہے ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے پھر وہی بتلائے گا جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔

پچھلے رکوع میں قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم سے بہت سے احکام بیان فرما کر ارشاد ہوا تھا

وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ۔

یعنی صراط مستقیم دین کی سیدھی راہ ہمیشہ سے ایک رہی ہے اس سے ہٹ کر گمراہی کے راستے بہت ہیں تمام انبیاء و مرسلین اصولی حیثیت سے اسی ایک راہ پر چلے اور لوگوں کو بلاتے رہے۔ ارشاد ہے۔

شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحاً والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ

ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ (شوریٰ)

اصول دین میں ان میں باہم کوئی تفریق نہیں ہے۔ زمان و مکان اور خارجی احوال کے اختلاف سے فروع شرعیہ میں جو تفاوت ہوا وہ تفرق نہیں بلکہ ہر وقت کے مناسب رنگ میں ایک ہی مشترک مقصد کو حاصل کرنے کے ذرائع کا تنوع ہے۔ جو دین انبیائے سابقین لے کر آتے۔ موسیٰ علیہ السلام کی کتاب بھی اس کی مخالفت کے لیے نہیں بلکہ اس کی تفصیل کی غرض سے اتاری گئی۔ سب کے آخر میں قرآن آیا ہے جو تمام کتب سابقہ کی تتمیم و تصدیق اور ان کے علوم و معارف کی حفاظت کرنے والا ہے درمیان میں ان کتب و شرائع سے اعراض کرنے والوں کا حال بیان کر کے ان الذین فرقوا دینھم سے پھر اصل مطلب کی طرف عود کیا گیا۔ یعنی دین الٰہی کا رستہ صراط مستقیم ایک ہے جو لوگ اصل دین میں پھوٹ ڈال کر جدا جدا راہیں نکالتے اور فرقہ بندی کی لعنت میں گرفتار ہوتے ہیں خواہ وہ یہود ہوں یا نصاریٰ یا وہ مدعیان اسلام جو مستقبل میں عقائد دینیہ کی چادر کو پھاڑ کر پارہ پارہ کرنے والے تھے۔ ان لوگوں سے آپ کو

کچھ واسطہ اور سروکار نہیں۔ یہ سب فتفرق بکم عن سبیلہ میں داخل ہیں۔ آپ ان سے بیزاری اور برأت کا اظہار کر کے خدا کے اسی ایک راستہ صراط مستقیم پر جمے رہیے اور ان کا انجام اللہ کے حوالے کیجئے وہ ان کو دنیا و آخرت میں جتلائے گا جو کچھ دین میں گڑبڑی کرتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب فرقوا دینھم کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں جو باتیں یقین لانے کی ہیں اصول دین ہیں ان میں فرق نہ چاہیے اور جو کرنے کی ہیں فروع دین ہیں ان کے طریقے کئی ہوں تو بُرا نہیں [1]

اس آیت میں فرقوا آیا ہے۔ یہ جمہور کی قرأت ہے لیکن امام حمزہ اور کسائی نے فارقوا پڑھا ہے فرقوا تفریق سے بنا ہے تفریق کے معنے ایک چیز کو اجزاء میں تقسیم کرنا اور الگ الگ کر دینا ہیں۔ فارقوا مفارقہ سے بنا ہے اس کے معنے علیحدہ ہو جانا اور چھوڑ دینا ہیں۔ فرقوا قرأت کے لحاظ سے معنے یہ ہوتے کہ انہوں نے دین کے ٹکڑے کر دیے تھے۔ دین کی کچھ باتوں کو مانتے تھے اور کچھ کو نہیں مانتے تھے۔ یعنی کتاب الٰہی کے کچھ حصے کو مانتے تھے اور کچھ کو نہیں مانتے تھے۔ قرآن کی یہ آیت اس کی موید ہے۔

ا فتومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض

کیا تم کچھ کتاب الٰہی کو مانتے ہو اور کچھ کو نہیں مانتے ہو۔

اور اس کی مثال تفریق بین الرسل بھی ہے۔ تفریق بین الرسل کے معنے یہ ہیں کہ خدا کے رسولوں میں باعتبار تصدیق تفرقہ و امتیاز کرنا اور کہنا کہ نؤمن ببعض ونکفر ببعض ہم کچھ کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے۔ تفریق خواہ کتاب سے متعلق ہو اور یا رسولوں سے متعلق ہو دونوں صورتوں میں دین کی تفریق اور اس کے حصے بخرے کر دینے کے مترادف ہے۔ جس طرح کتاب الٰہی کے کچھ حصہ کو نہ ماننا کفر ہے ٹھیک اسی طرح انبیاء میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ اور تفریق بین الاحکام اور تفریق بین الرسل کا لازمی نتیجہ دین سے علیحدگی اور مفارقت ہے۔ کیونکہ دین کے اجزائے ترکیبی دو ہی ہیں۔ اللہ کے رسول اور اُن کی لائی ہوئی کتابیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص یا جو جماعت خدا کی کتاب سے یا خدا کے رسول سے ایمان کی حدود میں یا عمل کی حدود میں علیحدگی اختیار کرے وہ قرآن کی نظر میں تفرق ہے۔ اس نظر سے جب اس آیت کا مطالعہ کیا جائے تو جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ آیت کا مصداق اہل کتاب ہیں اور جن لوگوں نے یہ کہا کہ آیت کا مصداق فرق اسلامیہ ہیں دونوں صحیح ہیں۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ اہل کتاب کے فرقے آیت کا منطوق ہیں اور اسلامی فرقے اس آیت کا مدلول ہیں۔ اور اگرچہ اصلاً اہل کتاب ہی کے فرقے مراد ہیں لیکن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

چونکہ قرآن نے مسلمانوں کو خاص طور پر اس معاملہ میں اہلِ کتاب کی کاپی کرنے سے منع کیا ہے اس لیے آیت میں اسلامی فرقے بھی مراد ہیں۔ ارشاد ہے:

لا تكونوا كالذين تفرقوا واختلفوا من بعد ماجاءهم البينات اولئك لهم عذاب عظيم۔

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو فرقہ فرقہ ہو گئے اور اختلاف کر بیٹھے باوجودیکہ ان کے پاس اللہ کی واضح دلیلیں آ چکی تھیں ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔

روایات سے دونوں کی تائید ہوتی ہے۔ عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضورِ انور کی تشریف آوری سے یہود و نصاریٰ اختلافات کا شکار ہوتے۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان الذین فرقوا دینھم الخ اور حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس اُمت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی دوسری روایات ہیں لیکن ان کی روایتی صحت زیادہ وزنی نہیں ہے۔

اس موضوع پر علامہ شاطبی نے الاعتصام میں بڑی فکر انگیز بات لکھی ہے:

ابن عطیہ کہتے ہیں کہ یہ آیت اپنے عموم کی وجہ سے سب کو اپنے دامن میں لیے ہوتے ہے۔ اہلِ اہواء و بدعت اور فروع میں اور کلامی مسائل میں اہلِ تعمق، یہ سب صراطِ مستقیم سے ہٹے ہوتے ہیں۔ شاطبی کہتے ہیں فروع میں اہلِ تعمق سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا ذکر ابن عبدالبر نے رائے کی مذمت کے سلسلے میں کیا ہے۔ ابن بطال نے شرح بخاری میں امام ابوحنیفہ کا یہ واقعہ قلم بند کیا ہے کہ آپ جب عطاء ابن ابی رباح سے ملنے گئے۔ امام ابوحنیفہ نے ان سے کوئی سوال کیا۔ حضرت عطاء نے سوال سنتے ہی دریافت کیا کہ کہاں کے رہنے والے ہو فرمایا کہ کوفہ کا رہنے والا ہوں، فرمایا کیا اس بستی سے تعلق رکھتے ہو جہاں کے باشندوں نے دین کے ٹکڑے کر دیے اور فرقے بن گئے۔ امام ابوحنیفہ نے جواباً فرمایا جی ہاں عطاء نے دریافت کیا تم کن سے تعلق رکھتے ہو فرمایا میں ان لوگوں سے تعلق رکھتا ہوں جو سلف کو بُرا نہیں کہتے تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں اور کسی مسلمان کو گناہ کی وجہ سے کافر نہیں بناتے یعنی نہ میں شیعہ ہوں نہ قدری ہوں اور نہ خارجی ہوں۔ حضرت عطاء نے فرمایا سمجھ گیا۔ یہاں رہو۔ حضرت الحسن کہتے ہیں۔ ایک روز حضرت عثمان تقریر کے لیے تشریف لاتے اثنا تقریر میں لوگوں نے ہنگامہ کر دیا اور ہنگامہ بھی ایسا کہ آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ اسی شور میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے حجروں سے ایک آواز آئی۔ شور ہوا سنو ام المومنین

کی آواز ہے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے خود سنا فرما رہی تھیں لوگو آگاہ رہو تمہارا پیغمبر ایسے تمام لوگوں سے بیزار ہے جو اپنی دین میں پارٹیاں بنا لیتے ہیں اور قرآن کی یہی آیت تلاوت فرمائی ان الذین فرقوا دینھم قاضی اسماعیل کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ یہ ام المومنین حضرت ام سلمہ ہوں گی اور بعض روایات میں اس کی تصریح بھی ہے کیونکہ حضرت عائشہ تو اس موقعہ پر حج کو گئی ہوئی تھیں۔ ابوہریرہ بھی کہتے ہیں کہ یہ آیت اسی امت کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور ابوامامہ کہتے ہیں کہ یہ آیت خارجیوں کے متعلق ہے۔ قاضی اسماعیل کی رائے ہے کہ ظاہر قرآن یہی کہتا ہے کہ دین میں ہر مبتدع خواہ خارجی ہو یا کوئی اور اس آیت میں داخل ہے کیونکہ بدعت کا نتیجہ جدال باہمی ہے اور جدال کا انجام باہم پارٹی بازی ہوتی ہے۔

قاضی اسماعیل کی یہ بات بالکل برمحل ہے کہ آیت قرآنی اپنے مطالب کے اعتبار سے بالکل عام ہے بہرحال الذین فرقوا دینھم کا بنیادی طور پر مصداق وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین میں تفریق پیدا کی یعنی کچھ کتابوں کو مانا اور کچھ کو نہ مانا یا کچھ رسولوں کو مانا اور کچھ کو نہیں مانا۔ اس کا مصداق یقیناً اور بلاشبہ یہود و نصاریٰ ہیں کیونکہ یہود نے تورات کو مان کر انجیل اور قرآن کو نہیں مانا اور نصاریٰ نے انجیل کو مان کر قرآن کا انکار کیا۔ اسی طرح یہود نے حضرت موسیٰ کو مان کر حضرت عیسیٰ اور محمد رسول اللہ کا انکار کیا اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ کو مان کر محمد رسول اللہ کا انکار کیا۔ اصلاً یہی فرقوا دینھم کا مصداق ہیں لیکن قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ آیت کی مراد یہ نہیں ہے بلکہ مقصود یہ بتانا ہے کہ انہوں نے دین میں ان چیزوں کی ملاوٹ کر دی جن کا دین سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اور یہ سب کچھ اپنے میلان طبع اور خواہشوں کو سامنے رکھ کر کیا۔ اس معنے کے اعتبار سے آیت قرآنی عام ہے ان تمام متبدعین کے لیے جو دین میں دین کے نام پر نت نئے افکار، نت نئے اعمال کے پیمانے بناتے رہتے ہیں۔ چاہے دین کے نام پر دین میں یہ بگاڑ پیدا کرنے والے پہلی امتوں میں سے ہوں یا اس امت میں سے۔ بہرحال کوئی ہو سب کو یہ آیت مشتمل ہے اور یہی بات قابل ترجیح ہے۔ آیت میں مخاطب اگرچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لیکن آپ کے واسطہ سے دین حق کے تمام پیرو اس کے مخاطب ہیں۔ بتانا یہ ہے کہ اصل دین ہمیشہ یہی رہا ہے اور اب بھی یہی ہے کہ علم و عمل میں خدا کی کتاب اور خدا کے رسول کی مرکزی حیثیت تسلیم کی جاتے اور ان وسیع اصول و کلیات کے مطابق زندگی بسر کی جاتے جن کی تعلیم اللہ نے اپنے رسول اور کتاب کے ذریعہ دی ہے۔ یہی دین تمام انسانوں کو آغاز آفرینش

سے دیا گیا تھا۔ بعد میں جتنے مختلف مذاہب بنے وہ سب کے سب اس طرح بنے کہ مختلف زمانوں میں لوگوں نے اپنے ذہن کی غلط اپج سے یا خواہشاتِ نفس کے غلبہ سے یا عقیدت کے غلو سے اس دین کو بدلا اور اس میں نئی نئی باتیں ملائیں۔ اس کے عقائد میں اپنے اوہام سے کمی بیشی اور تحریف کی، اس کے احکام میں بدعات کے اضافے کیے۔ خود ساختہ قوانین بنائے، جزئیات میں موشگافیاں کیں۔ فروعی اختلافات میں مبالغہ کیا۔ اہم کو غیر اہم بنایا۔ اس طرح بے شمار مذاہب اور فرقے بنتے چلے گئے۔

نبوت کی نظر میں بدعت کا مقام

اسی بنا پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے نام پر قرآن وسنت یعنی نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے ہٹ کر نت نئی ایجادات سے منع کیا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے خطبہ میں جبکہ ہزاروں کا مجمع تھا، پُرزور اور بلند آواز سے فرمایا۔

اما بعد فان خیر الحدیث کتاب اللّٰہ وخیر الھدی ھدی محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم وشر الامور محدثاتھا وکل بدعۃ ضلالۃ۔

اما بعد بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین نمونہ اور سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے اور بُرے کام وہ ہیں جو نئے گھڑے جائیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ (مسلم ج ۱)

اس ارشاد میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ اور اپنی سیرت کا بدعت سے تقابل کر کے یہ بات واضح کر دی ہے کہ قرآن وسنت کے خلاف جو کچھ ایجاد کیا جائے گا وہ سب بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہر ایجاد بری نہیں بلکہ صرف وہ احداث وایجاد بُری ہے جو قرآن وسنت کے خلاف ہو۔ لہٰذا جو چیز کتاب وسنت کی روش کے خلاف نہ ہو گی وہ بدعت گمراہی نہ ہو گی اور گمراہی کو مٹانے کے لیے اللہ سبحانہٗ نے انبیاء روانہ فرماتے ہیں اور ان پر کتابیں نازل کیں۔ امام نسائی نے اس روایت میں یہ الفاظ بھی بتائے ہیں وکل ضلالۃ فی النار اور ہر گمراہی دوزخ میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ بدعت کو تمام کائنات کی لعنت کا مستحق قرار دیا ہے۔ اور ان کی تعظیم وتوقیر سے منع فرمایا ہے اور ان کی تمام عبادات کو رائیگاں قرار دیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مدینہ منورہ مقام عیر سے لے کر مقام ثور تک حرم ہے جس نے اس میں کوئی بدعت ایجاد کی یا کسی بدعتی کو پناہ دی تو اس پر اللہ تعالیٰ اور

فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہو نہ اس کی فرضی عبادت قبول کی جائے گی اور نہ نفلی۔
اس ارشاد میں حدود حرم کی قید محض قباحت اور شناعت کے اظہار کے لیے ہے یہ قید احترازی نہیں کہ حرم مدینہ میں تو بدعت بُری ہے اور خارج از حرم وہ بُری نہ ہو۔ جو چیز بدعت اور بُری ہے وہ ہر جگہ اور ہر وقت بدعت اور بُری ہی ہو گی، ہاں البتہ شرفِ مکان یا فضیلتِ زمان کی وجہ سے اس کی بُرائی اور قباحت اور بڑھ جاتی ہے۔ بدعت اور بدعتی کی تردید اور مذمت کے لیے اس سے بڑھ کر اور سخت الفاظ کیا ہو سکتے ہیں جو جناب رؤف و رحیم اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہیں۔ بدعت کی تردید کے لیے یہ ارشادِ نبوت کافی ہے لیکن بطورِ شہادت و اعتبار چند ارشادات اور بھی پڑھ لیجئے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بدعتی کے عمل کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے تا وقتیکہ وہ اپنی بدعت کو نہ چھوڑے۔

اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی بدعتی کا نہ روزہ قبول کرتا ہے نہ نماز نہ صدقہ، نہ حج، نہ عمرہ، نہ جہاد، نہ فرضی عبادت نہ نفلی۔ بدعتی اسلام سے ایسا خارج ہو جاتا ہے جیسے آٹے سے بال۔

اور حضرت ابراہیم بن میسرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے بدعتی کی تعظیم و تکریم کی اس نے اسلام کے گرانے پر اس کی مدد کی۔

یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام کو بدعت اور اہلِ بدعت سے انتہائی نفرت تھی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ کے پاس ایک شخص کسی کا سلام لایا تو حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ:

مجھے سلام بھیجنے والے کی یہ شکایت معلوم ہوئی ہے کہ اس نے کوئی بدعت ایجاد کی ہے اگر واقعی اس نے کوئی بدعت ایجاد کی ہے تو میرا سلام اس کو نہ دینا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

من احدث فی امرنا ھذا مالیس منہ فھو ردّ

جس نے ہمارے اس معاملہ میں کوئی نئی بات نکالی وہ مردود ہے۔

اصل ارشاد فی امرنا ھذا کی تعبیر آئی ہے۔ اس سے مقصود اللہ کا وہ دین ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

لے کر آتے ہیں۔ حافظ ابن رجب فرماتے ہیں :

جس نے دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کی جس کی اجازت اللہ در سُول نے نہیں دی ہے تو اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حافظ صاحب موصوف یہ بات واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہر احداث مردود نہیں ہے بلکہ جو احداث فی الدین ہو وہ مردود ہے۔ نیز لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے بعض الفاظ میں صراحۃً فی امرنا ھذا کی جگہ فی دیننا کا لفظ آیا ہے۔ جب خود زبانِ نبوت ہی فی امرنا کی جگہ فی دیننا بولے تو اس سے بڑھ کر اور کیا تفسیر ہو سکتی ہے۔

بہرحال یہاں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی رائے ہی قابلِ ترجیح ہے کہ فرقوا سے مراد وہ لوگ جو اپنی اہوا کے ذریعے اللہ کے دین کا چہرہ بگاڑ کر رکھ دیں۔ خواہ یہ پہلی اُمتوں میں سے ہوں یا اُمتِ اسلامیہ میں سے ہوں۔

حدیث افتراقِ اُمت

یہاں قاضی صاحب نے علامہ شاطبی نے اور عام شارحینِ قرآن نے حدیث افتراق پیش کی ہے اور اپنے مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات اتارنے کی کوشش کی ہے کہ گویا یہ روایت اس آیت میں آئی ہوئی تفریق کی شرح کر رہی ہے۔ آیئے پہلے وہ روایت گوش گزار فرمالیجئے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تفرقت الیھود علی احدی وسبعین او اثنتین وسبعین فرقۃ والنصاریٰ مثل ذالک وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین فرقۃ۔ (ترمذی)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہود اکہتر یا بہتر فرقوں میں منقسم ہوئے اور نصاریٰ بھی اتنے ہی فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری اُمت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو گی۔

امام ترمذی نے حدیث افتراق اُمت روایت کرنے والوں میں چار صحابہ کا ذکر کیا ہے جن میں حضرت ابوہریرہ اور عبداللہ بن عمرو کی روایت تفصیل کے ساتھ پیش کی ہے اور حضرت سعد اور حضرت عوف بن مالک کا صرف حوالہ دے کر چھوڑ دیا ہے۔ پھر اول الذکر صحابی کی حدیث پر صحت کا حکم لگایا اور ثانی الذکر کی حدیث کو غریب قرار دیا ہے۔

حافظ سخاوی نے بھی مقاصد حسنہ میں اس حدیث کی صحت کو تسلیم کیا ہے اور شیخ محمد طاہر نے تذکرۃ الموضوعات میں اسے نقل فرما کر کوئی اختلاف رائے ظاہر نہیں کیا۔ امام شاطبی نے کتاب الاعتصام میں ابوہریرہ

کی روایت پر کئی جگہ صحت کا حکم لگایا ہے۔

حدیث ابی ہریرہ کو نہ صرف ترمذی نے صحیح کہا ہے بلکہ دوسرے محدثین نے بھی اس کی صحت کو تسلیم کیا ہے لیکن اس کے علاوہ اس موضوع پر وہ تمام حدیثیں جو اس زیادت کے ساتھ آتی ہیں۔

کلھم فی النار الا ملۃ واحدۃ قالوا من ھی یا رسول اللہ قال ما انا علیہ واصحابی

میری اُمت میں تہتر فرقے ہوں گے سب دوزخی ہوں گے سوائے ایک کے، صحابہ نے دریافت کیا وہ کون ہے فرمایا جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ ابن عمر کی حدیث اس تفسیر کے ساتھ غریب ہے اور غرابت کی وجہ علماء نے یہ قرار دی ہے کہ اس میں عبدالرحمان بن زیاد افریقی ہے اور ان کے بارے میں محدثین کی رائے اچھی نہیں ہے اس زیادتی کے بغیر علامہ زاہد کوثری نے بھی ابو داؤد اور ترمذی کی ابو ہریرہ کی روایت کو صحیح مانا ہے۔ اس زیادتی والی تمام روایات کی صحت میں محدثین کو کلام ہے۔ حافظ نور الدین ہیثمی نے اس زیادت والی حدیث کے تمام طرق پر مبسوط کلام کیا ہے۔ اور سب سے زیادہ مبسوط بحث علامہ زیلعی نے احادیث کشاف کی تخریج کی ہے۔ علامہ کوثری فرماتے ہیں۔

ھو اوسع من تکلم فی طرق ھذا الحدیث۔

امام زیلعی نے اس حدیث کے طرق پر مبسوط کلام کیا ہے۔

حافظ ابن حزم، حافظ محمد بن ابراہیم اور علامہ مجدالدین فیروز آبادی نے جس کے بارے میں صحیح نہ ہونے اور ثابت نہ ہونے کا فیصلہ دیا ہے وہ یہی زیادت والی حدیث ہے ورنہ ابو ہریرہ کی حدیث کے بارے میں ان کا یہ فیصلہ نہیں ہے جیسا کہ مولانا بدر عالم نے ترجمان السنہ کے مقدمہ میں اپنے مخاطبوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حزم رقمطراز ہیں:

ابو محمد کہتے ہیں یہ دونوں حدیثیں باعتبار سند قطعاً صحیح نہیں ہیں۔

کون سی دو حدیثیں ہیں جن کو وہ کہہ رہے ہیں کہ صحیح نہیں ہیں یہ بھی ان کی زبانی سنیے:

لوگوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کر کے ایک تو یہ حدیث بیان کی ہے کہ قدریہ اور مرجیہ اس اُمت کے مجوسی ہیں اور دوسری یہ کہ یہ اُمت ستر سے زیادہ فرقوں میں بٹ جائے گی۔ اور ایک کے سوا سب جہنمی ہوں گے۔

(الفصل فی الملل والنحل)

حافظ محمد ابن ابراہیم الوزیر نے بھی صراحتہً یہ بات لکھی ہے۔ چنانچہ العواصم والقواصم میں رقمطراز ہیں:

خبردار اس زیادتی سے دھوکہ میں نہ پڑ جانا کہ ایک کے سوا سب جہنمی ہوں گے۔ حدیث میں یہ زیادتی غلط ہے بلکہ یہ بات بعید نہیں کہ یہ ملاحدہ کے ہاتھ کی صفائی ہو۔ ابن حزم نے کہا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے۔

ہمیں علامہ زاہد کوثری کا یہ فیصلہ پسند ہے۔

اُمت کے تہتّر فرقوں میں بٹ جانے کے موضوع پر حدیثیں آتی ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جن میں ہلاک ہونے والوں کا کوئی ذکر نہیں ہے، کچھ ایسی ہیں جن میں ایک کے نجات یافتہ ہونے اور باقی کے ہلاک ہونے کا ذکر ہے۔ اور کچھ ایسی ہیں جن میں ایک کے سوا سب کے نجات یافتہ ہونے کا ذکر ہے۔ جیسے اہل علم کا ان حدیثوں کے ثبوت اور عدم ثبوت میں کلاً یا بعضاً اختلاف ہے ایسے ہی اس میں بھی اختلاف ہے کہ ۷۳ کے عدد سے تحدید مراد ہے یا تکثیر اور اس میں بھی اختلاف ہے کہ اُمت سے اُمتِ دعوت مراد ہے یا اُمت اجابت۔

بہرحال ابو ہریرہ کی صحیح حدیث میں اس اُمت میں ۷۳ فرقوں کے ہونے کی زبانِ نبوت نے خبر دی ہے اور دوسری ضعیف روایات میں ایک کے ناجی ہونے اور باقی کے ناری ہونے کی خبر دی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ناجی کون ہے خواہ اس کی روایتی حیثیت کچھ ہو اور خواہ اس حدیث کے راویوں کی تعداد بقول مولانا بدر عالم ۱۵ تک پہنچ گئی ہو۔ علماء نے ان دونوں کے منطوق پر بہت کچھ کام کیا ہے۔ متعدد علماء نے ۷۳ کی تفصیل اور تعیین پر کتابیں لکھی ہیں۔ اس موضوع پر ابو الحسین الملطی متوفی ۳۷۷ھ نے رد الاہواء والابتداع میں، ابو منصور عبدالقاہر بن طاہر بغدادی متوفی ۴۲۹ھ نے الفرق بین الفرق میں، ابو المظفر السفرائنی متوفی ۴۷۱ھ نے التبصیر میں، ابو الفتح محمد بن عبدالکریم الشہرستانی متوفی ۵۴۸ھ نے الملل والنحل میں، ان کے بعد غنیۃ الطالبین شرح المواقف خطط المقریزی، نشر الطوالع جیسی بے شمار کتابوں میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔ شارحینِ حدیث میں سے حافظ ابو بکر ابن العربی نے عارضۃ الاحوذی میں اس پر مبسوط کلام کیا ہے۔

کچھ ہو اس حدیث کا مطالعہ بتا رہا ہے کہ ۷۳ فرقوں میں ایک ناجی ہے اور ناجی وہ ہے جو اس شاہراہ پر ہو جس پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام تھے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتا رہا ہے کہ امت افتراق کا شکار ہوتی ہے۔ اور یہ بات اپنی جگہ فیصلہ شدہ ہے کہ حق میں تعدد نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ تحقیق طلب ہے کہ ناجی کون ہے۔ اسلامی فرقوں میں ہر گروہ کا خیال ہے کہ وہ ہی فرقہ ناجیہ ہے اور وہ ہی اس شاہراہ پر گامزن ہے جس پر حضور انور اور صحابہ کرام تھے۔ میر باقر داماد نے تو کمال ہی کر دیا۔ فرماتے ہیں کہ حدیث میں ۷۳ فرقوں سے شیعوں کے فرقے مراد ہیں اور ان میں فرقہ ناجیہ امامیہ ہیں۔ ایسے ہی دوسرے تمام فرقوں میں

ہر فرقہ کا دعویٰ یہی ہے کہ وہی ناجیہ ہے۔ اگر بیرونی اور تاریخی حقائق سے الگ ہو کر صرف اس حدیث کی روشنی میں فرقہ ناجیہ کی تعیین کرنی ہے تو پھر ہماری رائے میں قاری محمد طیب کی تحقیق قابلِ ترجیح ہے کہ اہل السنۃ والجماعۃ کا نام اس ارشادِ نبوت کی عکاسی کر رہا ہے۔ ما انا علیہ واصحابی کی رو سے معیارِ حق اگر ان دونوں کا مجموعہ ہے تو انا سے السنہ اور اصحابی سے الجماعۃ ہے۔ اس لحاظ سے اسلامی فرقوں میں صرف اہل السنۃ والجماعۃ کو یہ فخر یا شرف حاصل ہے کہ ان کا لقب خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا تجویز فرمودہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ برحق وہی ہوگا جس میں یہ دونوں بنیادی اجزاء موجود ہوں۔ غور کیا جائے تو یہی لقب اس بنیادی حقیقت کو ظاہر بھی کر سکتا تھا جو اہل السنۃ والجماعۃ میں ما اور انا کے امتزاج سے نمایاں ہوئی۔ مثلاً اگر اہل السنۃ والجماعۃ کا اہلِ قرآن، اہلِ حدیث، اہلِ فقہ، اہلِ تصوف، اہلِ کلام اور اہلِ اصول نام ہوتا تو اس سے ما کا مصداق یعنی شخصیتوں کا تصور نہ آسکتا۔ اس لیے لقب اکہرا اور نا تمام ہوتا اور اس کا لقب اہلِ جماعت یا متبعینِ صحابہ یا اصحابِ محدثین و مجتہدین یا اتباعِ فقہاء یا محبین اہلِ بیت ہوتا تو اس سے بلاشبہ انا کے مفہوم پر تو روشنی پڑتی لیکن ما کے کلمہ کا حق ادا نہ ہوتا اور یہ معلوم ہوتا کہ یہ فرقہ شخصیت پرست یا طبقہ پرست ہے جس کے پاس شخصیتوں کے سوا کوئی اصول نہیں کہ جس کی یہ پیروی کرے۔ اس لیے لقب اہل السنۃ والجماعۃ رکھا گیا تاکہ اس کے مسلک کے یہ دو بنیادی اصولیت اور شخصیت، بادیٔ وہلہ نام ہی سے ظاہر ہو جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ اہل السنۃ والجماعۃ کا یہ مرکب دو اجزاء سے مل کر بنا ہے ایک السنہ اور دوسرے الجماعۃ۔ السنہ کے لفظ سے اصول، قانون اور دستور نمایاں ہے اور الجماعۃ کے لفظ سے ذوات، شخصیات اور فقہاء طریق نمایاں ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس مسلک میں اصول و قوانین بغیر ذوات کے اور ذوات بغیر اصول و قوانین کے معتبر نہیں۔ قوانین ذوات کے راستہ سے آئے ہیں اور ذوات کو قوانین کے ذریعے پہچانا گیا ہے۔ ان دونوں میں ماخذ اور ماخوذ کی نسبت ہے۔ ماخذ کو لینا ماخوذ کو چھوڑ دینا یا ماخوذ کو لینا اور ماخذ کو چھوڑ دینا دانشمندی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو قرآن ہی نہیں دیا بلکہ ذاتِ پیغمبر بھی دی ہے۔ ایسے ہی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف قرآنی قانون ہی نہیں دیا بلکہ قانون دان ذوات و شخصیات بھی دی ہیں۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ دین اور دینی ہدایت اور تربیت کے لیے صرف کتاب یا صرف شخصیت کافی نہیں بلکہ قانون کے ساتھ معلمینِ قانون اور دستور کے ساتھ مربیانِ دستور کی بھی ناگزیر ضرورت ہے تاکہ صرف قانون ہی کا علم نہ ہو بلکہ ذوات سے وابستہ ہو کر اس کا رنگ بھی آئے اور اس کی حقیقی و معنوی کیفیات بھی قلوب میں راسخ ہوں۔ اس لیے مسلک اہل السنۃ والجماعۃ میں حسبِ روشِ نبوت یہی دو بنیادیں ذوات اور قانون بطورِ رکن اختیار کی گئیں۔ حدیث میں ما سے نبوت کی روش کی طرف اشارہ ہے جو دین کا دستور و آئین ہے اور انا و اصحابی سے برگزیدہ شخصیتوں کی

طرف اشارہ ہے جو ذات پیغمبر سے شروع ہوئی اور بعد میں دینی شعبوں میں سے کسی نہ کسی شعبہ میں حذاقت اور مہارت سے بنتی رہی ہیں۔ اس لیے اہل السنۃ والجماعۃ نے اپنے مسلک کی جامع حقیقت جس جامع لقب سے ظاہر کی وہ حقیقت پر مبنی ہے اور یہ لقب اسی ارشادِ نبوت سے لیا گیا ہے بلکہ ابوداؤد کی معاویہ والی روایت میں تو صراحتہً "انا واصحابی" کی جگہ الجماعۃ موجود ہے۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ بشرط زندگی جلد ۱۲ میں آئے گی۔ وہاں ہم بتائیں گے کہ تاریخی لحاظ سے اُمت میں تفرق کے اسباب کیا ہیں۔

علامہ شاطبی نے الاعتصام میں حقیقت افتراق سے بحث کرتے ہوئے یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ جو چیز ممنوع ہے وہ مطلق افتراق نہیں بلکہ افتراق مقید ہے۔ یعنی دین میں ایسی پارٹی بازی کہ باہم الفت، اخوت اور ہمدردی نہ رہے۔ افتراق کی ضد اجتماع ہے۔ قرآن کا اُمت سے مطالبہ اجتماع و ایتلاف کا ہے اور مقصود وہ حالت ہے جب مختلف کارکن قوتیں کسی ایک مقام، ایک مرکز ایک سلسلے ایک وجود ایک طاقت اور ایک فردِ واحد میں اپنی مناسب قدرتی ترکیب و ترتیب کے ساتھ اکٹھی ہو جاتی ہیں اور تمام مواد، قویٰ، اعمال اور افراد پر ایک اجتماعی و انضمامی دور طاری ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہ ہر قوت اکٹھی، ہر عمل باہم جڑا ہوا، ہر چیز بندھی اور سمٹی ہوئی، ہر فرد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متحد و متصل ہو جاتا ہے، کسی چیز کسی گوشہ کسی عمل میں علیحدگی نظر نہیں آتی۔ انتشار اور فرد فرد ہو کر رہنے والی حالت نہیں ہوتی۔ مادے میں جب یہ انضمام و اجتماع پیدا ہوتا ہے تو اسی سے تخلیق و تکوین کے تمام مراتب کی نمائش ہوتی ہے۔ لہٰذا زندگی نام ہے اجتماع و ایتلاف کا اور موت کہتے ہیں افتراق و انتشار کو، یہی حالت جب افعال و اعمال پر طاری ہوتی ہے تو علمائے اخلاق اس کو خیر کہتے ہیں اور شریعت کی زبان میں اسی کا نام عمل صالح ہے اور جب جسم انسانی پر طاری ہوتی ہے تو طب کی اصطلاح میں تندرستی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور پھر یہی حالت جب قومی و جماعتی زندگی کی قوتوں پر طاری ہوتی ہے تو اس کا نام حیاتِ قومی و اجتماعی ہوتا ہے۔ اور اس کا ظہور قومی اقبال و ترقی اور نفوذ و تسلط کی شکل میں دنیا دیکھتی ہے۔ اس حالت کی ضد افتراق و انتشار ہے افتراق و انتشار سے مقصود وہ حالت ہے جب اجتماع و ایتلاف کی جگہ الگ الگ ہو جاتے، متفرق اور پراگندہ ہوتے اور باہمدگر علیحدگی و بیگانگی کی حالت طاری ہو جاتے۔ مواد میں قویٰ میں، اعمال میں، افراد میں ہر بات میں پہلی حالت سے بالکل متضاد حالت پیدا ہو جاتے۔ یہ حالت جب مادے پر طاری ہوتی ہے تو اس کا نام بیماری، اور پھر موت ہے، اعمال پر طاری ہوتی ہے تو عصیان و عدوان ہے اور جب قوموں اور اُمتوں کی اجتماعی زندگی پر طاری ہوتی ہے تو اقبال کی جگہ ادبار، عروج کی جگہ تسفل، ترقی کی جگہ تنزل، عظمت کی جگہ ذلت، حکومت کی جگہ محکومی ہوتی ہے۔ یہی تفرق و افتراق ہے جس سے قرآن نے لا تفرقوا کہہ کر منع کیا ہے

اسی تفریق کا عمل متعدی تفریق ہے جس کا قرآن نے یہاں دوسروں کی طرف نسبت کرکے ذکر کیا ہے اور یہ تفریق مطلق نہیں بلکہ وہ تفریق ہے جس کا تعلق دین سے ہے۔ آیت کی مراد بقول امام رازی یہ ہے کہ اہل اسلام کو ہدایت کی جارہی ہے کہ مسلمانوں کی بات ایک ہو، دین میں تفرق نہ ہو اور نت نئی بدعات کے ذریعے مختلف رائیں نہ پیدا کی جائیں۔ لست منهم فی شیئ کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ ان سے قطعاً بری ہیں۔

آخر میں فرمایا ہے انما امرهم الی الله ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے وہی ان کو تفریق کی یا دین سے مفارقت کرکے گروہ در گروہ بننے اور اُمت کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی سزا دے گا۔ دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور آپ کو ان سے کچھ سروکار نہیں ہے۔ آپ اپنا فرض ادا کر چکے ہیں۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ وہ ہی ان کو ان کے کردار سے آگاہ کرے گا۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ آیت اپنے ظاہر کے اعتبار سے عام ہے اور ہر اس شخص کے خلاف چیلنج ہے جو اللہ کے دین سے مفارقت کرے اور اس کا مخالف ہو کیونکہ اللہ سبحانہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو الہدیٰ اور دین الحق دے کر روانہ کیا ہے تاکہ تمام ادیان پر اس کا غلبہ ہو۔ آپ کا قانون ایک ہے اس میں کوئی اختلاف اور افتراق نہیں ہے۔ اب اگر کوئی اس میں راہِ اختلاف نکالتا ہے اور پارٹی در پارٹی بناتا ہے جیسے اہلِ اہوار اور گمراہ پیشہ لوگ کرتے ہیں تو اللہ نے اپنے رسول کو اس سے بری قرار دیا ہے۔

جزا و سزا کا خدائی قانون

۲۱۴۔ جو کوئی نیکی کی پیش کش کرے گا تو اس کے بدلے میں اس کو دس گنا ہے اور جو کوئی برائی لے کر آئے گا تو برائی کا بدلہ برائی کے برابر دیا جائے گا اور لوگوں کے ساتھ ناانصافی بالکل نہ ہوگی ثم ینبئهم بما کانوا یفعلون میں ان کے افعال شنیعہ کی مجازات پر متنبہ کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی ہر نیک و بد کی مجازات کا قانون عام بتلا دیا گیا کہ بھلائی کا بدلہ کم از کم دس گنا ہے اور برائی کا زائد از زائد اس کے برابر، یعنی جس نے ایک نیکی کمائی تو کم از کم دس نیکیوں کا ثواب ملے گا زائد کی حد نہیں واللہ یضاعف لمن یشاء اور جو ایک بدی کا مرتکب ہوا تو ویسی ایک بدی کا جس قدر سزا مقرر ہے اس سے آگے نہ بڑھیں گے تخفیف کردیں یا بالکل معاف یہ اختیار ہے پھر جہاں وفور رحمت کی یہ کیفیت ہو وہاں ظلم کا کیا امکان ہے[1] گویا جماعت کی بقا و فنا کا ضابطہ بیان فرمانے کے بعد کہ اُمتوں میں اجتماعی زندگی اور دین سے وابستگی ادبار کی جگہ اقبال تسفل کی جگہ عروج تنزل

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کی جگہ ترقی اور ذلت کی جگہ عزت لاتی ہے اور اُمتوں میں افتراق اور دین سے مفارقت اور اس میں تفریق کا عمل اقبال کی جگہ ادبار عروج کی جگہ تسفل ترقی کی جگہ تنزل اور عظمت کی جگہ ذلت لاتا ہے۔ اب یہاں بتایا جا رہا ہے کہ افراد کی تندرستی اور صحت، بیماری اور موت کا معیار کیا ہے۔ فرمایا افراد میں حسنہ کی حالت صحت اور تندرستی ہے اور سیئہ کی کیفیت بیماری اور موت ہے۔ اگرچہ قرآن نے نیکی اور بدی کے لیے جیاء کی تعبیر اختیار فرمائی ہے مگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تحدث اور ہم تک عام فرما دیا۔ یعنی دل میں خیال کرنے اور ارادہ کرنے کو بھی اس میں داخل فرما دیا۔ صحیح بخاری اور مسلم میں بحوالہ حضرت ابوہریرہ کا یہ ارشاد آیا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے کہ میرا بندہ جب اپنے دل میں نیکی کرنے کا خیال کرتا ہے تو صرف اس خیال پر میں ایک نیکی لکھ دیتا ہوں جب تک وہ اسے کرتا نہیں اور جب وہ یہ نیکی کر لیتا ہے تو اب اس کو دس گنا لکھتا ہوں اور جب دل میں وہ کسی برائی کا خیال کرتا ہے تو اسے معاف کر دیتا ہوں اور اگر کر لیتا ہے تو صرف ایک برائی لکھتا ہوں۔

صحیح مسلم میں اسراء کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نیکی پر دس گنا ملنے کا ضابطہ ان خصوصی انعامات میں داخل ہے جو معراج کی پراسرار شب میں آپ کو دیئے گئے تھے۔ اللہ اکبر جس اُمت کو تھوڑی مدت میں دوسری اُمتوں پر بلند و بالا اور فائق کرنا منظور تھا۔ اس کی صورت یہی ہو سکتی تھی کہ اس کے قلیل عمل کے لیے تضعیف کا قانون بنایا جائے تاکہ اس جدید قانون کے ماتحت اس کے تھوڑے عمل بھی دوسری اُمتوں کے طویل مدتوں کے عمل سے زیادہ ہو جائیں اور اس پیرایہ سے عمل کی بازی جس اُمت کو جتانی منظور تھی وہ جیت بھی جائے اور قانون عدل و فضل دونوں کا اقتضا بھی پورا ہو جائے۔

کسی نیک کام یا بدکام کے عملی جامہ پہنانے کی چار صورتیں ہیں۔ اول نیکی کا ارادہ کرے اور اس پر عمل بھی کرے۔ دوم نیکی کا صرف ارادہ کرے اور اس پر عمل نہ کرے۔ بدی کی بھی یہی دو صورتیں ہیں۔ اس طرح یہ چار صورتیں ہو گئیں۔ پہلی صورت میں ایک نیکی دس گنا۔ دوسری صورت میں صرف ارادے پر ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے لیکن بدی کا یہ حکم نہیں۔ یہاں عمل کی صورت میں صرف ایک بدی لکھی جاتی ہے۔

بدی کا ارادہ کے بعد نہ کرنے پر نیکی

صحیح بخاری اور مسلم کی سابقہ حدیث میں یہ ارشاد بھی نقل ہوا ہے کہ

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ فرشتے عرض کرتے ہیں خداوندا یہ تیرا بندہ

بری کرنے کا ارادہ کر رہا ہے حالانکہ خوب جانتا ہے ارشاد ہوتا ہے ابھی انتظار کرو اگر کرے تو صرف ایک برائی لکھ لو۔ اور اگر چھوڑ دے تو اب اس کے حق میں اسے بھی ایک نیکی لکھ لو کہ اس نے میرے ہی خوف سے اس برائی کو چھوڑا ہے۔

عزم معصیت کے بعد اس پر عمل نہ کرنے پر نیکی صرف اس صورت میں لکھی جاتی ہے جبکہ اس معصیت کا نہ کرنا خدا کے خوف پر مبنی ہو۔ اگر حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے ارادہ کے باوجود معصیت وجود میں نہ آئی یا سہو و نسیان کی بنا پر ذہن سے نکل گئی تو اس قسم کی صورت میں گناہ نہ کرنے سے وہ نیکی کا حقدار نہ ہوگا۔ صحیح مسلم میں اسی روایت میں ابن عباس سے حدیث النفس کی بجائے ھَمّ کا لفظ آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں صرف خطرہ کا درجہ مراد نہیں بلکہ ارادہ کا وہ مرتبہ مراد ہے جس کے بعد عمل کے لیے دل میں فکر پیدا ہو جاتی ہے اسی کا نام ھَمّ ہے۔ حزیم بن فاتک کے الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عزم مراد ہے صرف وسوسہ و خیال مراد نہیں۔ ارشاد ہے:

جس نے کسی نیکی کا ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ پر یہ بات ثابت کر دی کہ وہ اس کا برابر احساس کر رہا ہے اور اس کو عمل میں لانے کے لیے حریص ہے۔ پھر ان مراحل کے بعد بھی اگر اس کو نہ کیا تو بے شک اب اس کے لیے نیکی ہے۔

صرف حسنہ کے ارادے پر ایک نیکی لکھے جانے پر تو کوئی تفصیل نہیں ہے لیکن سیئہ کے ارادے کر لینے کے بعد نہ کرنے پر ایک حسنہ ملنے پر قدرے تفصیل کی حاجت ہے۔

عزم علی المعصیت کی وہ صورت جس سے مقصود شریعت کا استخفاف و استہزاء ہو یہاں زیر بحث نہیں یہ تو کھلا کفر ہے۔ اسی طرح وہ صورت بھی زیر بحث نہیں ہے جہاں ایک شخص صرف اپنی خواہش نفس کی بنا پر کسی معصیت کا عزم کر لیتا ہے لیکن اس کے بعد خدا کے خوف سے وہ اس معصیت کا ارتکاب نہیں کرتا۔ یہاں بلاشبہ اس کے خوف و خشیت کی وجہ سے اسے ایک نیکی کا ثواب ملنا چاہیے جیسا کہ صورت مذکورہ میں اگر ترک معصیت کا داعیہ مخلوق کا خوف یا محض ریاکاری ہو تو اس کی گرفت ہونی چاہیے۔ غور طلب صورت صرف یہ ہے کہ اگر ایک شخص عزم کر لینے کے بعد خود بخود اپنے ارادے میں سست پڑ جاتا ہے اور اس لیے عمل کی نوبت ہی نہیں آتی ہے تو کیا اس طرح صرف عزم بھی معصیت شمار ہوگا۔ یا جب کہ عمل کی حد تک نہ پہنچنے کی وجہ سے قابل درگزر ہوگا۔ فقہاء، متکلمین اور محدثین کا مختار یہ ہے کہ چونکہ اس نے پختہ ارادہ کر لیا تھا اس لیے اس کی گرفت ہونی چاہیے یہ گرفت اصل جرم کے لحاظ سے ہلکی ہو۔

امام عبداللہ بن المبارک اور امام سفیان ثوری سے دریافت کیا گیا کہ کیا آدمی کا ارادہ بھی قابل گرفت ہے

فرمایا ہاں جب ارادہ پختہ ہو جاتے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ صرف ارادے پر کوئی گرفت نہیں جب تک منہ پر نہ لائے یا اس پر عمل نہ کرے۔ یہ تمام تفصیل ان معاصی کے ارادے میں تھی جن کا تعلق جوارح سے ہے جیسے چوری زنا وغیرہ باقی رہے وہ اعمال جن کو اعمالِ قلبیہ کہا جاتا ہے مثلاً کفر حسد وغیرہ تو یہاں صرف عزم بلکہ ہم پر گرفت ہوگی۔

فقہاء و متکلمین اور امام شافعی کے درمیان زیرِ اختلاف شق اب بھی تشنہ ہے۔ ہمارے نزدیک جامع العلوم والحکم میں حافظ ابن رجب حنبلی کی تفصیل یہاں بے حد پسندیدہ اور دلآویز ہے۔ ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص کسی معصیت کا پہلی ہی مرتبہ ارادہ کرتا ہے یعنی ابھی اس نافرمانی کی عمر بھر میں کبھی نوبت ہی نہ آئی تھی تو پہلی مرتبہ عزم پر اس کی گرفت نہ ہوگی۔ لیکن اگر وہ اس معصیت کا ذائقہ کبھی پہلے چکھ چکا ہے اور اب پھر اس کا عزم کر رہا ہے تو اس کے اس عزم پر بھی مواخذہ ہونا چاہیے کیونکہ اب اسے صرف عزم نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ اصرار کی تعریف میں آتا ہے یہ قابلِ اغماض نہیں ہے جیسے کہ وہ شخص جو عزم کے بعد اپنی جانب سے تو اس عمل کے تمام مقدمات پورے کر چکا ہو۔ پھر کچھ آسمانی اسباب ایسے رونما ہو جائیں جو اس کو عملی جامہ پہنانے میں حائل ہو جائیں وہ بھی اس قدرتی معذوری کی بنا پر معذور نہیں کہا جا سکتا۔ اسی لیے جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قاتل و مقتول کے بارے میں وعید سنائی تو سامعین نے دریافت کیا کہ بے چارہ مقتول جہنم میں کیوں گیا آپ نے فرمایا انہ کان حریصاً علیٰ قتل صاحبہ وہ بھی تو اپنے بھائی کے قتل کی فکر میں تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی سبب سے وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قاتل و مقتول دونوں گناہ میں برابر ہیں بلکہ منشا یہ ہے کہ جو پورے عزم کے بعد عمل کے لیے قدم اٹھا چکا ہے۔ اگرچہ کسی سبب سے کامیاب نہ ہو سکا لیکن وہ اپنی اس غیر اختیاری ناکامی سے اپنے اس اختیاری عزم اور اس کو پورا کرنے کے اختیاری سعی کے جرم سے بری نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح عزم کے بعد عمل کے لیے سعی کرنا قابلِ مواخذہ ہو سکتا ہے اسی طرح کسی معصیت کے بعد اس کا پھر ارادہ کرنا بھی قابلِ مواخذہ ہے کیونکہ یہ صرف عزم نہیں بلکہ عمل کی ابتدائی کڑی ہے۔

جزا میں قانونِ تضعیف

اگرچہ جزا میں عام قانون تو یہی ہے کہ ایک نیکی کے بدلے میں دس گنا ثواب ملے گا لیکن ایک ارشادِ نبوت سے معلوم ہوتا ہے اور قرآن کی دوسری آیات بھی اس کی مؤید ہیں کہ اسلامی زندگی میں اگر حسن کاری کو اپنا لیا جائے تو عام حسنات دس گنا سے ترقی کر کے سات سو گنا تک پہنچ جاتی ہیں۔ ارشاد ہے:

ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جب تم میں سے

کوئی اپنے اسلام میں حسن کار بن جاتا ہے تو پھر جو نیکی کرتا ہے وہ اس کے نامہ اعمال میں دس گنا سے سات گنا تک لکھی جاتی ہے۔

راجح یہی ہے کہ یہ تضعیف بھی عام ہے لیکن حسنات میں تضعیف کی ابتداء اس وقت ہوتی ہے جب ایمان و اسلام سے گزر کر صفتِ احسان میں قدم رکھا جاتے۔ حافظ ابن رجب حنبلی فرماتے ہیں کہ ایک نیکی پر اس کا دس گنا تو اس اُمت کے حق میں عام ضابطہ ہے لیکن خدا کی رحمت اپنا دروازہ اس حد پر پہنچ کر بند نہیں کرتی بلکہ سات سو اور اس سے بھی زیادہ دینے کے لیے کھلا رکھتی ہے۔ جیسے یہ صفتِ احسان کامل ہوتی جاتے گی یعنی عبادت میں جتنا خلوص اور اللہ تعالیٰ کی رویت کا جتنا تصور غالب ہوتا جاتے گا اتنا ہی ایک نیکی کا ثواب بڑھتا جاتے گا۔ اسی طرح بعض اوقات خود عمل کی برتری و فضیلت اور وقت کے تقاضے کا احساس بھی ایک نیکی کو بے شمار نیکیاں بنا دیتا ہے۔ ابن عمر سے دریافت کیا گیا کہ من جاء بالحسنۃ فلہٗ عشر امثالہا تو عام مسلمانوں کے بارے میں ہے فرماتیے مہاجرین کے لیے کیا قانون ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس سے اور زیادہ اور یہ آیت تلاوت کی۔

وان تک حسنۃ یضاعفہا ویوت من لدنہ اجراً عظیماً

اور اگر نیکی ہو تو اس کو بڑھاتا ہے اور اپنے پاس سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے۔

ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک نیکی پر بیس لاکھ نیکیاں بھی لکھ دیتا ہے۔

بہر حال نیکیوں کی تضعیف اور زیادتی کا ضابطہ سات سو گنا ہی پر ختم نہیں ہوتا اس سے بھی کہیں زیادہ پہنچتا ہے بے شک جس کی رحمت بے پایاں ہو اس کے انعامات بھی بے پایاں ہونے چاہئیں لیکن یہ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ بے حساب داد و دہش اسلام کے اس اعلیٰ مرتبہ سے شروع ہوتی ہے جس کا نام احسان ہے۔

یہاں حسنات و سیئات کے اس جزائی قانون پر قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے ایک سوال کے ذریعے خوب نکتہ آفرینی کی ہے کہ نیکیاں ہوں یا برائیاں ان کے بدلہ کا اندازہ اللہ کا اپنا مقرر فرمودہ ہے۔ اس میں عقل انسانی کی دسترس نہیں ہے کیونکہ عمل اور جزا میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔ حسنہ کی جزا وہ ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر فرمائی ہے۔ اس بنا پر یہ بات ذہنِ انسانی کی گرفت میں نہیں کی ہے کہ جو ایک کرے گا اس کو دس گنا ملے گا۔ اگر ہر نیکی کرنے والے کو دس گنا ہی ملے گا پھر تقابل کہاں رہا۔ ایک شخص کو اگر آپ ایک کام میں ایک درہم دیں اور دوسرے کو دس دیں تو یہ تو دس گنا ہے کیونکہ تقابل ہے لیکن اگر آپ سب کو ہی دس دے رہے ہیں تو دس گنا کہاں ہے۔ قاضی صاحب نے ہی جواب یہ دیا ہے کہ دراصل

نیکی کی جزاء علمِ الٰہی میں ایک مقرر ہے۔ کچھ کو یہ مقررہ ملے گی اور کچھ کو اخلاص کی قوت سے دس گنا اور اس سے زیادہ ملے گی۔ اور اگر یوں کہا جائے کہ جزا کا جو پیمانہ عام اُمتوں کے لیے اللہ نے مقرر کیا ہے اس کے مقابلے میں اُمت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دس گنا جزا ملے گی اور اس پر قرب و اخلاص کی بنا پر تضعیف ہوگی۔

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ
اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿١٦١﴾ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ
وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿١٦٢﴾ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ
اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿١٦٣﴾ قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّ
هُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ ۭ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ
وِّزْرَ اُخْرٰی ۚ ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿١٦٤﴾ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَ
رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ ۭ
اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿١٦٥﴾ ع

اے پیغمبر کہہ دو کہ مجھے میرے پروردگار نے سیدھا راستہ دکھایا ہے
وہی درست اور صاف دین ہے ابراہیم کا طریقہ جو ایک خدا کا
ہو کر رہا اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا[۲۱۵]۔ کہہ دو میری نماز

میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے
جہانوں کا مالک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے[۲۱۶]۔ مجھے اسی
بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں مسلموں میں سے سب سے پہلے فرمانبردار
ہوں[۲۱۷]۔ آپ ان لوگوں سے دریافت کریں کہ کیا میں خدا کے سوا
کوئی دوسرا رب تلاش کروں حالانکہ وہ ہی ہر چیز کا رب ہے[۲۱۸]۔
اور دیکھو ہر آدمی اپنے کردار سے جو کچھ کماتا ہے اس کی ذمہ داری
اسی پر ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا
پھر بالآخر تم سب کو اپنے رب کے حضور میں پیش ہونا ہے
وہ بتلائے گا جن باتوں میں تم اختلاف کرتے تھے[۲۱۹]۔ اور وہی
ہے جس نے تمہیں ایک دوسرے کا زمین میں جانشیں بنایا اور
تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی[۲۲۰]، تاکہ جو کچھ تمہیں
دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے بلاشبہ تمہارا پروردگار جلد سزا

دینے والا اور بلاشبہ وہ بخشنے والا رحمت والا ہے۔[۲۲۱]

معانی مفردات

قیماً۔ اسے دو طرح پڑھا گیا ہے ایک تو یہی جو قرآن میں لکھا ہے دوسرے یا مشدد سے قیّماً۔ پہلا مصدر ہے۔ صغر اور کبر کے انداز پر۔ اصل میں قِوَم تھا جیسے عوض اور حول، لیکن صرف اس لیے کہ اس کے فعل میں تعلیل ہوتی ہے۔ اس میں بھی واو کو یا سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔ بطور مبالغہ اسے دین کی صفت بنایا گیا ہے۔ یعنی سیدھا جس میں کوئی کجی نہیں ہے۔ اور اگر یہ تشدید کے ساتھ ہو تو یہ فیعل کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے۔ قام یقوم سے قیم جیسے ساد یسود سے سید۔ ملّۃ، امام راغب نے دین اور ملت میں یہ فرق بتایا ہے کہ لفظ ملت کی اضافت صرف انبیاء کی طرف ہوتی ہے نہ کسی غیر نبی کی طرف ہوتی ہے اور نہ اللہ کی طرف ہوتی ہے۔ اسی سے ملتی، ملۃ زید اور ملۃ اللہ نہیں بولا جاتا۔ ہاں دین کا استعمال عام ہے۔ دین اللہ، دین الانبیاء اور دین زید صحیح ہے۔ یہ فرق اس نظریہ پر مبنی ہے کہ ملت صرف اس دستور الٰہی کا نام ہے جو انبیاء کی وساطت سے روانہ کیا جاتا ہے۔ ملۃ املت الکتاب سے ماخوذ ہے۔ گویا اللہ کی جاری کردہ یا تحریر کردہ چیز ملت ہوئی اور دین کے معنے میں طاعت اور یہ ایک اضافی چیز ہے۔ اطاعت کرنے والا بھی ہونا چاہیے اور جس کی اطاعت کی جائے اس کا ہونا بھی ضروری ہے اس لیے دین کی اضافت مطیع اور مطاع دونوں کی طرف ہو جاتی ہے۔ خلائف، خلیفہ کی جمع ہے۔ اس کے معنے جانشین کے ہیں۔ خلف سے صفت کا صیغہ ہے۔ مصدر خلافت ہے جس کے معنے جانشین ہونے کے ہیں۔ نسک، عبادت پرستش قربانی، اسی سے ناسک عابد، اسی سے مناسک عبادت کے طریقے قربانی کی جگہ، دین کا راستہ اسی سے تنسک عبادت کرنا۔

صراط مستقیم کا واقعی چہرہ

پہلے دعویٰ کیا تھا کہ ھذا صراطی مستقیماً یہ میرا سیدھا راستہ ہے اور مطالبہ کیا کہ اس پر چلو، دوسری

راہوں پر چلوان میں تمہاری سرتاسر پراگندگی ہے۔ اب بتایا جارہا ہے کہ اس صراط مستقیم کی واقعاتی اور تاریخی حیثیت کیا ہے؟ فرمایا یہ میری خود ساختہ نہیں بلکہ میرے رب کی بتائی ہوئی ہے کیونکہ انسان اپنی کمزوری کی وجہ سے اس پورے عرصہ حیات پر بیک وقت ایک متوازن نظر ڈال نہیں سکتا۔ اس بنا پر انسان اپنے لیے خود زندگی کا راستہ بھی ایسا نہیں بنا سکتا جس میں اس کی ساری قوتوں کے ساتھ انصاف ہو۔ اس کی تمام خواہشوں کا ٹھیک ٹھیک حق ادا ہو جائے۔ اس کے سارے جذبات ورجحانات میں توازن قائم رہے۔ اس کے سب اندرونی و بیرونی تقاضے تناسب کے ساتھ پورے ہوں۔ اس کے اجتماعی زندگی کے تمام مسائل کی مناسب رعایت ہو اور ان سب کا ایک ہموار اور متناسب حل نکل آئے۔ اور مادی اشیا کو بھی شخصی اور تمدنی زندگی میں عدل وانصاف کے ساتھ استعمال کیا جاسکے۔ جب انسان خود اپنا شارع بنتا ہے تو حقیقت کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک پہلو زندگی کی ضرورتوں میں سے، کوئی ایک ضرورت حل طلب مسئلوں میں سے، کوئی ایک مسئلہ اس کے دماغ پر اس طرح مسلط ہو جاتا ہے کہ دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ وہ بالارادہ بے انصافی کرنے لگتا ہے۔ اور اس کی اس رائے کے زبردستی نافذ کیے جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے اور وہ بے اعتدالی کی کسی ایک انتہا کی طرف ٹیڑھی چلنے لگتی ہے۔ پھر جب یہ ٹیڑھی چال اپنے آخری حدود پر پہنچتے پہنچتے انسان کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے تو وہ پہلو اور وہ ضروریات اور وہ مسائل جن کے ساتھ بے انصافی ہوئی تھی بغاوت شروع کر دیتے ہیں اور زور لگانا شروع کر دیتے ہیں کہ ان کے ساتھ انصاف ہو مگر پھر بھی انصاف نہیں ہوتا، کیونکہ پھر وہی عمل رونما ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک جو سابق بے اعتدالی کی بدولت سب سے زیادہ دبایا گیا تھا انسانی دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے اور اسے اپنے مخصوص مقتضا کے مطابق ایک خاص رخ پر بہائے جاتا ہے جس میں پھر دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ بے انصافی ہونے لگتی ہے۔ اس طرح انسانی زندگی کو کبھی سیدھا چلنا نصیب نہیں ہوتا ہمیشہ وہ ہچکولے ہی کھاتی رہتی ہے اور تباہی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف ڈھلکتی رہتی ہے۔ تمام وہ راستے جو انسان نے خود بنائے ہیں غلط سمت سے چلتے ہیں اور غلط سمت پر ختم ہوتے ہیں۔ ان تمام غلط راستوں کے درمیان ایک ایسی راہ جو بالکل وسط میں واقع ہو جس میں انسان کی تمام قوتوں اور خواہشوں کے ساتھ اس کے تمام جذبات ورجحانات کے ساتھ اس کی روح اور جسم کے تمام مطالبوں اور تقاضوں کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا گیا ہو جس کے اندر کوئی ٹیڑھ، کوئی کجی، کسی پہلو کی بے رعایتی اور کسی دوسرے پہلو کے ساتھ ظلم اور بے انصافی نہ ہو۔ انسانی زندگی کے صحیح ارتقا اور اس کی کامیابی کے لیے ناگزیر ہے۔ اس کی طرف صرف خدا ہی راہ نمائی کر سکتا ہے اور خدا نے اپنے رسول اسی لیے روانہ کیے

کہ اس راہ راست کی طرف انسانوں کی رہنمائی کریں، اسی کا چہرہ انتی ھدانی ربی الی صراط مستقیم میں پیش فرمایا ہے۔

۱۶۱ - اے پیغمبر کہہ دو مجھے میرے پروردگار نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے وہی درست اور صاف دین ہے ابراہیم کا طریقہ جو ایک خدا کا ہو کر رہا اور مشرکوں میں سے نہ تھا - یعنی تم دین میں جتنی چاہے راہیں نکالو اور جس قدر معبود چاہو ٹھہرالو - مجھ کو میرا پروردگار صراط مستقیم بتلا چکا ہے اور وہی خالص توحید اور کامل تفویض و توکل کا راستہ ہے جس پر موحد اعظم ابراہیم خلیل اللہ بڑے زور شور سے چلے جن کا نام آج بھی تمام عرب اور کل ادیان سماویہ غایت عظمت و احترام سے لیتے ہیں[1] تمام انبیائیں سے خاص طور پر حضرت ابراہیم کا نام نامی اور اسم گرامی شاید اس لیے لیا گیا ہے کہ حضور انور کے مخاطب مشرکین، یہودی اور عیسائی سب کے لیے حضرت ابراہیم کی ذات گرامی عظمت و احترام کا مشترکہ سرمایہ تھی اگر چہ یہی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کا بھی طریقہ تھا لیکن یہودیوں نے حضرت موسیٰ کو یہودیت اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کو مسیحیت کا پیشوا بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ یہودیت اور عیسائیت دونوں بعد کی پیداوار ہیں - یہودیت اپنے اس نام اور مذہبی خصوصیات اور رسوم و قواعد کے ساتھ تیسری چوتھی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئی اور عیسائیت جن عقائد اور مخصوص تصورات کا نام ہے وہ تو حضرت مسیح کے بھی ایک مدت بعد وجود میں آتے ہیں - اس لیے حضرت ابراہیم کا طریقہ فرمایا۔

یہاں صراط مستقیم کا چہرہ پیش کرتے ہوئے دو باتیں بنیادی طور پر فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ یہی دین قیم ہے دوسرے یہ کہ یہی ملت ابراہیم ہے - قیم اور قیّم دونوں ہم معنے ہیں - یعنی سیدھا اور فطری دین جس میں کوئی کجی اور انحراف نہیں ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے علاوہ جس قدر ادیان ہیں وہ سیدھے نہیں بلکہ کج ہیں اور ان میں انحراف ہے - اور اس کے تعارف میں سب سے پہلے یہ فرمایا کہ ھدانی ربی یہ کسی انسانی دماغ کی تراشیدہ نہیں بلکہ رب العالمین کی بنائی ہوئی ہے - اس مکمل تعارف کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنے ذہن میں یہ بات اتار لیں کہ ہم جب کائنات اور اس کے مظاہر پر اس نقطہ نظر سے غور کرتے ہیں کہ ہماری عقلی قوتیں ان کے فہم و ادراک میں کہاں تک مدد دے سکتی ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے فکر کے دو مختلف میدان ہیں جو اپنی نوعیت اور فطرت میں ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہیں - ایک عالم مادی، دوسرا عالم انسانی -

---

[1] افادات شیخ الاسلام

عالمِ مادی اور عالمِ انسانی کا فرق

عالمِ مادی بے جان اشیاء کے مجموعہ سے عبارت ہے جو ارادے کی صفت سے محروم اور آزادیٔ عمل سے نا آشنا ہیں۔ یہ عالم اپنے معین قوانین رکھتا ہے جنہیں تجربے، مشاہدے اور قیاس سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس عالمِ انسانی کے قوانین اتنے پیچیدہ، مبہم اور غیر معین ہیں کہ تجربے اور مشاہدے کی گرفت میں مشکل سے آتے ہیں۔ اور آتے بھی ہیں تو ان پر وثوق و اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ جو عالمِ مادہ کے قوانین کی نسبت عام طور پر کیا جا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے مادی دنیا کے مظاہر کی صحیح توجیہہ ممکن ہے لیکن انسانی امور و معاملات اور تمدنی مظاہر کی توجیہہ صحت کے ساتھ بہت دشوار ہے۔ عالمِ مادی اور عالمِ انسانی میں سب سے زیادہ نمایاں فرق یہ ہے کہ عالمِ مادی میں انسان شاہد کی حیثیت رکھتا ہے اور عالمِ مادہ کی حیثیت مشہود کی ہے برعکس اس کے عالمِ انسانی میں انسان خود ہی شاہد ہے اور خود ہی مشہود۔ اس فرق کی وجہ سے عالمِ مادی کے مشاہدات اور تجربات اور نظریات و عقائد میں خالص معروضی نقطہ نظر اختیار کیا جا سکتا ہے اور نتائج کے استنباط میں عقل اپنی غیر جانبداری قائم رکھ سکتی ہے لیکن انسانی امور و معاملات اور تمدنی مسائل میں یہ معروضیت ناممکن ہے جہاں انسان خود اپنی زندگی کے مسائل پر غور کرنا شروع کرتا ہے وہیں اس کی شخصی اور اجتماعی زندگی جذبات و میلانات سے متاثر ہوتی ہے۔

عالمِ مادی اور عالمِ انسانی کا یہ فرق معلوم کرنے کے بعد کوئی دیانتدار شخص اس بات سے انکار نہیں کرے گا کہ مادی دنیا میں صحت و صداقت کی تلاش اور اتفاقِ رائے کا حصول جس قدر آسان ہے عالمِ انسانی اور تمدنی مسائل میں اتنا ہی دشوار اور ناممکن ہے۔ تمدنی زندگی کے بنیادی مسائل محض عقل کی وساطت سے حل نہیں ہو سکتے کیونکہ اس میدان میں عقلی استدلال نتائج کی صحت تک رہنمائی نہیں کر سکتا۔ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے مکتوبات میں اس مضمون کو بار بار دہرایا ہے۔ فلسفہ، اشراق اور مذاہب کی تاریخ بھی اس کی پوری طرح تائید کرتی ہے۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ انسانی معاملات اور تمدنی مسائل کے حل کے لیے وحی آئی ہے۔ یہ کسی انسان کی ساختہ و پرداختہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا صدور ایک ایسی ذات سے ہوا ہے جو بہترین حق و صداقت ہے۔ جس کی عقل کائنات کے ہر گوشہ پر حاوی اور جس کی ہمہ بین آنکھ زمین و آسمان کی ہر شے کو محیط ہے۔ مجدد الف ثانی اسی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں:

> انبیاء بہترین موجودات ہیں اور بہترین دولت ان کے سپرد کی گئی ہے۔ اولیاء کی انتہا، انبیاء کی ابتداء ہے نہ کہ عکس نبوت کی پیروی میں قرب بالنفس حاصل ہوتا ہے۔

کمالاتِ ولایت کمالاتِ نبوت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے وہ نسبت بھی نہیں جو قطرہ کو سمندر سے ہوتی ہے۔

اور ایک جگہ فرماتے ہیں:

ولایت میں سینہ کی تنگی کی وجہ سے مخلوق کی طرف پوری توجہ نہیں ہوتی اور نبوت میں سینہ کی انتہائی فراخی کی وجہ سے نہ توجہ حق توجہ مخلوق سے مانع ہوتی ہے اور نہ توجہ خلق حق میں حائل ہوتی ہے۔

بہر حال امورِ انسانی کو اللہ کی جانب سے بواسطہ وحی نبوت حل کرتی ہے۔ اسی کو یہاں ھدانی ربی کہہ کر پیش کیا گیا ہے اور یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس کے اجزاءِ ترکیبی نبوت کا لایا ہوا علم و عمل ہے۔ اسی کو سورہ فاتحہ میں صراط الذین انعمت علیھم سے تعبیر کیا ہے، انعام یافتہ ذوات انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔ کتابِ الٰہی علمِ نبوت ہے اور ان ذوات کا کردار عملِ نبوت ہے۔

یہاں اس صراطِ مستقیم کے تعارف میں دینا قیماً ملۃ ابراھیم فرمایا ہے یعنی صراطِ مستقیم ہی جس کی مجھے اللہ نے ہدایت دی ہے سیدھا اور صاف نظامِ زندگی ہے۔ یہی راہِ عمل نوعِ انسانی کے لیے خدا کا ٹھہرایا ہوا فطری دین ہے۔ یہی الدین القیم یعنی سیدھا اور درست دین جس میں کسی طرح کی کجی اور خامی نہیں۔ یہی دین حنیف ہے جس کی دعوت حضرت ابراہیم نے دی تھی۔ اس میں نہ تو بوجھل عقیدے ہیں نہ ناقابلِ فہم عقیدوں اور ناقابلِ برداشت عملوں کی ایک طول طویل فہرست ہے۔ یہ اتنا واضح اتنا سہل اتنا مختصر ہے کہ عقائد و اعمال کی پوری فہرست صرف دو فقروں میں ختم کی جا سکتی ہے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ حافظ ابن تیمیہ الرد علی البکری میں فرماتے ہیں:

دین اسلام کے دو اصول ہیں جو شخص ان میں سے ایک کو چھوڑ دے نہ اس کا دین معتبر ہے نہ کوئی عمل، ایک یہ کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں دوسرے یہ کہ اس طریقہ کے مطابق کریں، جو شریعت سے مقرر کردہ ہوں نو ایجاد نہ ہوں یہی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی حقیقت ہے۔

اس میں عقائد کے لیے کوئی بوجھ نہیں، اعمال میں طبیعت کے لیے کوئی سختی نہیں، ہر طرح کے پیچ و خم سے پاک ہر معنے میں اعتقاد و عمل کے لیے سیدھی سیدھی بات ہے۔ مسند احمد میں حضرت عباس نے روایت کیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

دینوں میں سب سے زیادہ پیارا دین حنیفیہ اور محمدیہ ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں الحنیفیہ وہ دین ہے جو ملتِ ابراہیمی کی طرح شعائر اللہ کے استحکام اور

شعائر شرک سے استیصال اور رسوم فاسدہ اور عقائد باطلہ کے ابطال پر مبنی ہو اور سمحہ وہ ہے جس کی تعلیم میں رہبانیت اور ناقابل برداشت مجاہدات نہ ہوں۔ بہرحال صراط دین قیم اور ملت حنیف ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اے پیغمبر تم واضح الفاظ میں کہہ دو کہ مجھے تو میرے پروردگار نے صراط مستقیم دین قیم ملت ابراہیم کی ہدایت بخشی ہے، میں تو انسانی زندگی کے مسائل اس کے ذریعے حل کرتا ہوں اور یہی ایک راہ سیدھی راہ ہے۔

توحیدِ عبادت کا اعلان

۲۱۶۔ کہہ دو میری نماز میرا حج میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا مالک ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس آیت میں توحید و تفویض کے اونچے مقام کا پتہ دیا گیا ہے جس پر ہمارے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فائز ہوتے، نماز اور قربانی کا خصوصیت سے ذکر کرنے میں مشرکین پر جو بدنی عبادت اور قربانی غیر اللہ کے لیے کرتے تھے تعریضاً رد ہو گیا[1] اس آیت میں توحید عبادت کا عملی نقشہ پیش کیا ہے۔ صلاۃ کا لفظ عربی میں نماز کے لیے ہے۔ لغت عربی میں صلاۃ کے معنے دُعا کے ہیں اس لیے نماز کی لفظی حقیقت خدا سے درخواست و التجا ہے اور اس کی معنوی حقیقت بھی یہی ہے۔ قرآن ہی میں حضرت موسیٰ کے قصہ کے ضمن میں نماز کی حقیقت صرف ایک لفظ میں ظاہر کی گئی ہے یعنی خدا کی یاد اقم الصلاۃ لذکری انسان کو اپنی روحانی تڑپ، دل بے چینی، قلبی اضطراب اور ذہنی شورش کے عالم میں جب دُنیا و دُنیا کی ہر چیز فانی، عقل کی ہر تدبیر درماندہ، جسم کی ہر قوت عاجز اور سلامتی کا ہر راستہ بند نظر آتا ہے تو سکون و اطمینان کی راحت اس کو صرف ایک قادر مطلق کی پکار اور التجا میں ملتی ہے۔ وحی الٰہی نے اس نکتہ کو اس طرح پیش کیا ہے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب، یہاں صلاۃ سے مراد ہر قسم کی فرض و نفل نماز ہے اور اگر اس کی حقیقت ملحوظ ہو تو ہر قسم کی دُعا و طلب گاری، استعانت رکوع، سجود، عجز و نیاز، اعتماد و توکل اور اس طرح کے تمام نیاز مندانہ اعمال مراد ہیں۔ نماز بھی دین ابراہیمی میں موجود ہے۔ عرب کا ایک جاہلی شاعر جران العود کہتا ہے۔

وادرکن اعجازا من اللیل بعد ما
اقام الصلاۃ العابد المتحنف

اور ان سواریوں نے رات کے پچھلے حصہ میں اس وقت کے بعد جب عبادت گزار حنیفی نماز پڑھ

[1] افادات شیخ الاسلام

چکا تھا، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ نماز مذہب ان اصولوں میں سے ہے جن پر دُنیا کے تمام مذاہب متفق ہیں تو یہ کوئی مبالغہ نہیں۔ قرآن کی تصریح کے مطابق دُنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس نے اپنی اُمت کو نماز کی تعلیم نہ دی ہو اور اس کی تاکید نہ کی ہو۔ خصوصاً ملتِ ابراہیمی میں اس کی حیثیت سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ حضرت ابراہیم جب اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل کو مکہ میں آباد کیا تو اس کی غرض یہ بتائی کہ ربنا لیقیموا الصلاۃ حضرت ابراہیم اپنی اور اپنی نسل کے لیے دُعا کرتے ہیں رب اجعلنی مقیم الصلاۃ ومن ذریتی حضرت اسماعیل کے بارے میں قرآن کا انکشاف ہے وکان یامر اھلہ بالصلاۃ، حضرت شعیب کو ان کی قوم طعنہ دیتی ہے۔

اصلاتک تامرک ان نترک ما یعبد اباؤنا۔

کیا تمہاری نماز تم کو حکم دیتی ہے کہ اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں۔

حضرت لوط، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب سب کے بارے میں قرآن نے بتایا ہے

اوحینا الیھم فعل الخیرات واقام الصلاۃ

ہم نے ان کو نیک کاموں کے کرنے اور نماز قائم کرنے کی وحی کی تھی۔

بہر حال نماز ملتِ ابراہیمی میں موجود تھی۔ لیکن سب نماز کو بھلا بیٹھے تھے۔ یہودیوں میں نماز صرف چند رسوم کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی۔ عیسائیوں نے خدا کی نماز کے ساتھ انسانوں کی نمازیں بھی شروع کر دی تھیں۔ حضرت عیسٰی حضرت مریم کے علاوہ اور بھی سینکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی عبادت میں مصروف ہو گئے تھے۔ دینِ ابراہیمی کی پیروی کے مدعی صرف اپنے قیاس سے کچھ ارکان ادا کر لیتے تھے۔ الغرض آپ کی بعثت سے پہلے نماز کی خالص اور موحدانہ حقیقت دنیا سے گم ہو گئی تھی اور جو کچھ تھی اس میں مشرکانہ رسوم کی آمیزش تھی۔

نسکی عام شارحینِ قرآن نے اس کے معنے قربانی کیے ہیں کچھ نے حج مراد لیا ہے اور کچھ نے اس کے معنے عبادت کیے ہیں۔ ان میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ اگر حج مراد ہو تو اس میں قربانی بھی ہے اور وہ عبادت بھی ہے اور اگر قربانی مراد ہو تو وہ بھی حج کا حصہ ہے اور عبادت بھی ہے۔ قرآن سے یہ بات ثابت ہے کہ ملتِ ابراہیمی کی اصلی بنیاد قربانی ہے اور یہی قربانی حضرت ابراہیم کی پیغمبرانہ اور روحانی زندگی کی اصل خصوصیت تھی اور اسی امتحان میں پورے اترنے کی وجہ سے وہ ان کی اولاد ہر قسم کی برکتوں اور نعمتوں سے مالا مال کی گئی لیکن یہ قربانی کیا تھی؟ یہ محض خون اور گوشت کی قربانی نہ تھی بلکہ روح اور دل کی قربانی تھی۔ احساسات اور جذبات کی قربانی تھی۔ یہ ماسوی اللہ اور غیر کی محبت کی قربانی خدا کی راہ میں تھی۔ یہ اپنی عزیز ترین متاع کو خدا کے حضور میں پیش کر دینے کی نذر تھی۔ یہ خدا کی اطاعت بندگی کا بے مثال منظر تھا۔ یہ تسلیم و رضا اور صبر و شکر کا وہ

امتحان تھا جس کو پُر کیے بغیر دُنیا کی پیشوائی اور آخرت کی سرفرازی نہیں مل سکتی۔ یہ باپ کا اپنے اکلوتے بیٹے کے خون سے زمین کو رنگین کر دینا نہ تھا بلکہ خدا کے سامنے اپنے تمام جذبات اور خواہشوں، تمناؤں اور آرزوؤں کی قربانی تھی۔ اور خدا کے سامنے اپنے ہر قسم کے ارادے اور مرضی کو معدوم کر دینا تھا اور جانور کی ظاہری قربانی اس اندرونی نقش کا ظاہری عکس اور اس خورشید حقیقت کا ظل مجاز تھا۔

یہاں تک ایک گونہ تخصیص تھی۔ اس کے بعد محیای و مماتی فرما کر پوری تعمیم کر دی اور بتا دیا کہ صرف نظام تشریع نہیں بلکہ نظام تکوین میں بھی میرے سارے اعمال میری ساری طاعات اللہ کے لیے ہیں۔ اور اس لیے ہے کہ اللہ کی ذات تمام کائنات کی پروردگار، مالک کارساز اور حاجت روا ہے اور جیسے اس کی ربوبیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اسی طرح عبادت میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ خدمت کی آمادگی کا ترانہ اور یہ توحید کی صدا ہے جو محمد رسول اللہ بلند کر رہے ہیں اور یہی حضرت ابراہیم نے بلند کی تھی۔

اسلام قربانی کا نام ہے

۲۱۷۔ مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں مسلموں میں سب سے پہلے فرمانبردار ہوں۔ مفسرین عموماً اول المسلمین کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اس اُمت محمدیہ کے اعتبار سے آپ اول المسلمین ہیں لیکن جب ترمذی کی حدیث کنت نبیا و آدم بین الروح و الجسد کے موافق آپ اول الانبیاء ہیں تو آپ کے اول المسلمین ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کہ یہاں اولیت زمانی مراد نہ ہو بلکہ تقدم رتبی مراد ہو۔ یعنی سارے جہان کے فرمانبرداروں کی صف اوّل میں نمبر اول اور سب سے آگے میں ہوں۔ شاید حضرت شیخ الہند نے ترجمہ میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں کی جگہ سب سے پہلے فرمانبردار ہوں کہہ کر اسی طرف اشارہ کیا ہو۔ کیونکہ محاورات کے اعتبار سے یہ تعبیر اولیت رتبی کے ادا کرنے میں زیادہ واضح ہو[1]

آیت میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں ایک بذالک امرت اور دوسری انا اول المسلمین اور اسی کی مجھے ہدایت ہوئی۔ یعنی توحید میں اسی تجرید اور شرک جلی اور خفی سے اس کھلی برأت کی مجھے ہدایت ملی ہے۔ یعنی یہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں کہ میری ہر قسم کی عبادت، عجز و نیاز، زندگی اور موت کے سارے کوائف بلا شرکت اللہ رب العالمین کے لیے ہیں، اسی کا مجھے حکم ہوا ہے۔ اسی توحید کے لیے میں اللہ کی جانب سے مامور ہوں اور چونکہ مامور ہوں اس لیے وہی کچھ کہتا ہوں جس کے کہنے کا مجھے حکم ہوا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے سب سے آگے بڑھ کر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس کو اپنا لیا ہے - اوّل دو معنے میں آتا ہے ایک عددی یعنی اوّلیت دوسری رتبی یعنی اولویت - اس اُمت میں اس کام میں اولیت کا شرف بھی مجھے حاصل ہے اور اس کام میں باعتبار علو درجہ و مرتبہ اولویت بھی میرے لیے ہے یعنی اللہ سبحانہٗ نے تمام نبیوں میں جو درجہ اور مرتبہ مجھے دیا ہے - اس کے اعتبار سے خدا کے اوامر اور نواہی پر بھرپور اذعان و یقین میرا ہی حصہ ہے - اسلام کے لفظی معنے اپنے کو کسی دوسرے کو سپرد کر دینے اطاعت اور بندگی کے لیے گردن جھکا دینے کے ہیں - الغرض دعوتِ محمدی کی حقیقت یہی ہے کہ اپنے آپ کو خدا کے ہاتھ میں سونپ دیا اور اس آستانہ پر اپنا سر جھکا دیا یہی اسلام کی حقیقت ہے -

توحید طاعت کا اعلان

۲۱۸ - آپ ان لوگوں سے دریافت کریں کہ کیا میں خدا کے سوا کوئی رب تلاش کروں حالانکہ وہ ہی ہر چیز کا رب ہے - پہلے توحید فی الالوہیت کا ذکر تھا اب توحید فی الربوبیت کی تصریح فرمائی - یعنی جس طرح معبود اس کے سوا کوئی نہیں ہے مستعان بھی اس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا کیونکہ استعانت ربوبیت عامہ پر متفرع ہے ایاک نعبد و ایاک نستعین[1]

اس سے پہلی آیت میں پرستش کے بارے میں اعلان ہوا تھا - اب یہاں بندگی کے بارے میں اعلان ہوا ہے - آپ چاہیں تو یوں کہہ دیں کہ پہلے توحید عبادت کو بتایا گیا ہے اب توحید طاعت کو بتایا جا رہا ہے یعنی جیسے میری عابدانہ نیاز مندیوں کا مستحق اللہ کے سوا کوئی نہیں اور میں صرف اسی کی عبادت کرتا ہوں، ٹھیک اسی طرح اس شعوری اور اختیاری زندگی میں میری طاعتوں کا مرکز اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے - جب کائنات کی ساری چیزوں کا رب تو اللہ ہے اور ہر چیز غیر اختیاری اور غیر ارادی طور پر اللہ کی اطاعت کر رہی ہے تو میرا رب کوئی اور کیسے ہو سکتا ہے - یہ بات تو عقل باور ہی نہیں کر سکتی کہ پوری کائنات تو اللہ کے قانون کی اطاعت کے نظام پر چل رہی ہو اور کائنات کا ایک جزو ہونے کی حیثیت سے میرا اپنا وجود بھی اضطراراً اسی نظام پر عامل ہو مگر میں اپنی شعوری اور اختیاری زندگی کے لیے کوئی اور رب تلاش کروں - کیا پوری کائنات کے خلاف میں اکیلا ایک دوسرے رُخ پر چل پڑوں - خالق بھی وہی ہے اور آمر بھی وہی ہے - گویا اسلام کا مل نام ہے توحید عبادت اور توحید طاعت کا - پوری سورت کا موضوع بھی دو توحیدیں ہیں - منشا یہ ہے کہ جب اللہ ہی ہر چیز کا رب ہے تو میں آخر کس طرح اس کے سوا کسی اور کو رب بناؤں اور اپنی زندگی میں

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کسی اور کی شرکت تسلیم کروں، عقلاً جو معبود ہے وہی مطاع ہونا چاہیے۔ حضرت ابراہیم نے بھی اسلام کا یہی تصور پیش فرمایا تھا۔ پجاریوں سے الوہیت کے موضوع پر مناظرہ اور نمرود سے ربوبیت کے موضوع پر محاجہ قرآن میں آیا ہے۔ پتہ نہیں لوگ اتنی واضح اوصاف حقیقت کیوں نہیں سمجھتے ہیں اور توحید کے دائرے کو پوری زندگی سے سمیٹ کر مسجد کی چہار دیواری میں کیوں محدود کرتے ہیں۔

قانونِ الٰہی کے تین اہم اصول

۲۱۹۔ اور دیکھو ہر آدمی اپنے کردار سے جو کچھ کماتا ہے۔ اس کی ذمہ داری اس پر ہے کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا پھر بالآخر تم سب کو اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہے۔ وہ بتلائے گا جن باتوں میں تم اختلاف رکھتے تھے۔ کفار مسلمانوں سے توحید وغیرہ میں جھگڑتے تھے اور کہتے تھے کہ تم توحید کی راہ چھوڑ کر ہمارے راستہ پر آجاؤ اگر اس میں کوئی گناہ ہو تو وہ ہمارے سر۔

وقال الذین کفروا للذین آمنوا اتبعوا سبیلنا ولنحمل خطایاکم

کافر اہل ایمان سے کہتے ہیں کہ تم ہماری راہ پر چلو ہم تمہارا بوجھ اٹھالیں گے۔

یہاں اس کا جواب دے دیا کہ ہر ایک کا گناہ اسی کے سر ہے کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ باقی تمہارے جھگڑے اور اختلافات خدا کے یہاں سب جا کر سب طے ہو جائیں گے۔ یہ دُنیا فیصلہ کی جگہ نہیں ہے امتحان و آزمائش گاہ ہے جیسا کہ اگلی آیت میں بیان فرمایا[1] پہلی آیت میں توحیدِ طاعت کے چہرے سے نقاب اٹھایا تھا۔ اس آیت میں ان لوگوں کو جو اس زندگی میں اللہ کے سوا دوسروں کی طاعت کر رہے ہیں اور ان لوگوں کو جن کی اطاعت کی جا رہی ہے کھول کر بتایا ہے کہ بنیادی طور پر یہ سنگین غلط فہمی ہے کہ جن کی اطاعت کی جا رہی ہے وہ ہمارے کام آجائیں گے۔ فرمایا کہ مطیع ہوں یا مطاع ہر شخص اپنے عمل کا ذمہ دار ہے۔ اس سے اس کے اعمال کے بارے میں دریافت کیا جائے گا۔ اس میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ انسان اپنے ہی عمل کے نتائج سے بندھا ہوا ہے اور جو برائی بھی اسے پیش آتی ہے خود اسی کے اعمال کی پیداوار ہے۔ اسی قانون کو قرآن نے ان لفظوں میں بھی پیش کیا ہے لہا ما کسبت و علیہا ما اکتسبت ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے اس کا پھل اس کو ملے گا اور جو برائی کی ہے اس کا وبال اسی کو بھگتنا ہے۔ یہ اللہ کے قانون مجازات کا قاعدہ کلیہ ہے کہ انسان کی جزا و سزا خود انسان ہی کی کمائی ہے جیسی کسی کی کمائی ہوگی ویسا ہی نتیجہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پیش آئے گا۔ اگر ایک انسان نے اچھے کام کرکے اچھی کمائی کی ہے تو اس کے لیے اچھائی ہے۔ اگر کسی نے برائی کرکے برائی کمائی تو اس کے لیے برائی ہے کل امرئ بما کسب رھین میں بھی یہی قانون بتایا ہے۔ اسی طرح قوموں اور جماعتوں کی نسبت بھی یہی عام قانون بتایا ہے تلك امة قد خلت لها ما كسبت ولكم ما كسبتم ایک مشہور حدیث قدسی میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ حدیث طویل ہے آخر میں فرمایا ہے:

> اے میرے بندو یاد رکھو یہ تمہارے اعمال ہی ہیں جن کی میں تمہارے لیے انضباط اور نگرانی رکھتا ہوں اور پھر ان ہی کے نتائج بغیر کمی و بیشی کے تمہیں واپس دے دیتا ہوں لہٰذا جو کوئی تم میں اچھائی پائے چاہیے کہ اللہ کی حمد و ثنا کرے اور جس کسی کو برائی پیش آئے چاہیے کہ اپنے سوا کسی کو ملامت کا نشانہ نہ بنائے۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے جس طرح موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے۔ اسی طرح اس نے ہر عالم کے لیے ایک نظام اور تقدیر قائم کی ہے جس کے مطابق اس عالم کا کاروبار انجام پاتا ہے۔ اگرچہ اس آیت کو عام شارحین قرآن نے آخرت کی جزاو سزا سے متعلق بتایا ہے لیکن کچھ شارحین کی رائے میں اس کا تعلق جس طرح اخروی معاملات اور نتائج سے ہے اسی طرح یہ قانون دنیوی کاروبار پر بھی چسپاں ہے جیسے آخرت میں ہر شخص اسی کے پانے کا حقدار ہوگا جو اس نے کمایا ہے اور اس کے سامنے اس کی کمائی ہی نتیجے کی شکل میں پیش ہوگی۔ ٹھیک اسی طرح معاشی زندگی میں بھی ہر ایک کا نصیب اور حصہ اس کی محنت اور مشقت کی مناسبت پر مبنی ہے وہ جتنی محنت جانفشانی کرتا ہے اسی حساب سے وہ حصہ بھی پاتا ہے یعنی اجرت بمقدار محنت معاشیات میں قرآن کا اصول ہے بلکہ ابوبکر الجصاص نے اسی سے دوسرے کے املاک میں مالک کی اجازت کے بغیر تصرف کو ناجائز قرار دیا اور دلیل یہی دی ہے کہ اللہ سبحانہ نے ہر شخص کو اپنے افعال کا ذمہ دار قرار دیا ہے اور اسی سے یہ قانونی نکتہ بھی حل کیا ہے کہ بالغہ لڑکی کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے۔ بہرحال قرآن نے ہمیں یہ اصول بتایا ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور اللہ کی عدالت میں جوابدہ ہے۔ اس آیت سے تین اہم اصول مستنبط ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہر شخص اپنے فعل کا ذمہ دار ہے دوسرے یہ کہ ایک شخص کے فعل کی ذمہ داری دوسرے پر نہیں ڈالی جاسکتی ہاں یہ کہ اس فعل کے صدور میں اس کا اپنا کوئی حصہ ہو۔ تیسرے یہ کہ کوئی شخص اگر چاہے بھی تو کسی دوسرے شخص کے فعل کی ذمہ داری کو اپنے سر نہیں لے سکتا۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ کوئی شخص دنیا میں اپنی محنت کی کمائی کے سوا کسی چیز کا مالک نہیں ہوسکتا۔ اور آخرت میں کوئی شخص دوسرے کے عمل سے مستفید نہیں ہوسکتا علی الاطلاق درست نہیں ہے۔ اول

اس لیے کہ زکوٰۃ اور صدقات میں لینے والے کی محنت بالکل نہیں ہوتی ہے لیکن ان سے استفادہ از روئے قرآن جائز ہے اجرت بمقدار محنت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہدایا تحف، ترکہ، صدقات وخیرات سے کوئی مستفید نہیں ہو سکتا حقداری اور چیز ہے اور فضل واحسان اور ہے جب کہ خیرات بندوں کی جانب سے احسان ہے۔ وراثت انتقال ملکیت کی قانونی شکل ہے اور یہ اللہ کے قانون کے تحت ہے۔

باقی رہا آخرت سے متعلق جس کو ہماری زبان میں ایصال ثواب کہتے ہیں تو اس کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ عامل عمل کرتا ہے اور عمل کے بعد خدا کی جناب میں درخواست کرتا ہے کہ اس کا ثواب فلاں کو میری جانب سے دے دیا جائے۔ مردوں کے لیے دعا کا نافع ہونا قرآن سے ثابت ہے۔

ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان

اور دعا کے سود مند ہونے کا کوئی منکر نہیں ہے انشاء اللہ اس کی تفصیلات ہم ۲۷ جلد میں پیش کریں گے

اس آیت میں دوسرا اہم اصول یہ بتایا گیا ہے لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے ایک کی گناہ کی پاداش میں کسی دوسرے کو نہ پکڑا جائے گا الا یہ کہ اس گناہ میں اس کا کوئی حصہ ہو۔ قرآن میں یہ قانون ایک سے زیادہ مقامات پر پیش کیا گیا ہے۔ سورہ اسراء میں گمراہیوں کے تذکرے میں فرمایا گیا ہے۔

ومن ضل فانما یضل علیھا ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ

اور جو کوئی بھٹک گیا تو بھٹکنے کا خمیازہ اسی کو ہو گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

اور سورہ فاطر میں اسی طرح ہے۔

ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ وان تدع مثقلۃ الی حملھا لا یحمل منہ شیئ ولو کان ذا قربی

اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور اگر کوئی بوجھ والا اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے کسی کو پکارے گا تو اس کے بار کا کچھ حصہ بھی کوئی نہ اٹھائے گا چاہے وہ رشتہ دار ہی ہو۔

اور سورہ زمر میں ہے۔

وان تشکروا یرضہ لکم ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ

اور اگر تم شکر کرو گے تو وہ اس کو تمہارے لیے پسند کرتا ہے اور کوئی بوجھ اٹھانے والا

کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔

اور اسی کا حضرت ابراہیم کی تعلیمات کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے سورہ نجم میں اس طرح ذکر کیا ہے۔

وابراھیم الذی وفّی ان لا تزر وازرۃ وزر اخرٰی وان لیس للانسان الا ماسعی وان سعیہ سوف یری ،

اور ابراہیم جس نے وفاداری کا حق ادا کر دیا یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے کوشش کی اور یہ کہ اس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی۔

ان سب مقامات کا گہری نظر سے مطالعہ کرو سب کی روح یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ یہ بات ان لوگوں کو سنائی جا رہی ہے جو اہل ایمان سے کہتے تھے کہ اس دُنیا کی زندگی میں اطاعت نبوت کی نہ کرو بلکہ ہماری کرو۔ ہم تمہارے گناہوں کے ذمّہ دار ہیں۔ مطیعون اور مطاعوں کو بتایا جا رہا ہے کہ ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھائے گا اور جو آج بوجھ اٹھانے کا نعرہ لگا رہے ہیں یہ خود دوہرے بوجھ سے اس روز لدے ہوں گے ایک بوجھ ان پر خود گمراہ ہونے کا ہوگا اور دوسرا بوجھ دوسروں کو گمراہ کرنے کا بھی ان پر لادا جائے گا۔ اس بات کو یوں سمجھئے کہ ایک شخص خود بھی چوری کرتا ہے اور اس کے ساتھ کسی دوسرے شخص سے یہی کہتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ چوری کے کام میں حصہ لے۔ اب اگر وہ دوسرا شخص اس کے کہنے سے چوری کرے گا تو کوئی عدالت اسے اس بنا پر ہرگز نہ چھوڑے گی کہ اس نے دوسرے کے کہنے سے جرم کیا ہے چوری کی سزا تو بہر حال اسے ملے گی اور کسی اصُول انصاف کی رُو سے بھی یہ درست نہ ہوگا کہ اسے چھوڑ کر اس کے بدلے کی سزا اس پہلے چور کو دے دی جائے جس نے اسے بہکا کر چوری کے راستے پر ڈالا تھا۔ لیکن چوری کی ہدایت کرنے والا اپنے جرم کے ساتھ اس جرم کی سزا بھی پائے گا کہ اس نے چوری میں دوسرے کی رہنمائی کی۔ قرآن میں دوسرے مقام میں گمراہوں کے ساتھ گمراہ کرنے والوں کی یہ سزا بتائی گئی ہے۔

لیحملوا اوزارھم کاملۃ یوم القیامۃ ومن اوزار الذین یضلونھم بغیر علم۔

تاکہ وہ قیامت کے روز اپنے بوجھ پورے اٹھائیں اور ان لوگوں کے بوجھ بھی اٹھائیں جن کو بغیر علم دُنیا میں گمراہ کرتے تھے۔

بلکہ جن کے بارے میں خود اطاعت کرنے والے کہیں گے :

ربنا انا اطعنا سادتنا وکبراءنا فاضلونا السبیلا ربنا اٰتھم ضعفین من العذاب

والعنهم لعناً کبیراً

اے ہمارے رب ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی انہوں نے ہمیں گمراہ کیا خداوندا تو ان کو ڈبل عذاب دے اور ان پر بڑی لعنت کر۔

جن کو اس آیت میں سادہ اور کبرار کہا ہے ان کو ہی اس سورت میں اکابر مجرمین کہہ کر پکارا ہے اور ان کو قرآن نے اسی سورت میں الشیاطین کہا ہے۔ یہی اسلام کے نظام حیات کے مقابلے میں اپنے خود ساختہ نظام حیات کی دعوت دیتے تھے اور یہی اہل ایمان سے اس موضوع پر مجادلہ کرتے تھے اور ان کے ہی بارے میں قرآن نے اہل ایمان کو ہدایت کی تھی کہ وان اطعتموهم انکم لمشرکون مسلمانو! اگر تم نے ان کی اطاعت کی تو یقیناً تم مشرک ہو۔ روز قیامت ان کی اطاعت کرنے والے کہیں گے ۔

یا لیتنا اطعنا اللہ واطعنا الرسولا

اے کاش ہم اللہ کی اطاعت کرتے اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرتے ۔

اس آیت میں تیسرا اہم اصول یہ بتایا گیا ہے کہ ثم الی ربکم مرجعکم تم سب کو اللہ کے حضور میں پیش ہونا ہے۔ یہی تصور ایمانی زندگی کا اصل اصول ہے اور یہی اسلام اور کفر کے درمیان حد فاصل ہے۔ کفر بے قیدی اور بے راہ روی ہے۔ وہ ایک ایسی زندگی ہے جس میں افراد اور جماعتوں کے ارادوں پر کوئی بالاتر ضابطہ حیات اور اعلیٰ تر آئین زندگی حکمران نہیں ہوتا۔ کفار کا ارادہ بے قید اور ان کا نفس بے لگام ہوتا ہے اور انسان سے بالاتر کسی اور اقتدار کے آگے جھکنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ کبھی تو وہ عجز و درماندگی کی آخری حد تک پہنچ جاتے ہیں اور بے جان اشیاء تک کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں اور کبھی وہ غرور اور فرعونیت کے نشہ میں اس قدر سرشار ہوتے ہیں کہ انسان سے بالاتر کسی ہستی کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اپنے ہی جیسے انسانوں کی غلامی اور چاکری انہیں گوارا ہے لیکن قانون الٰہی کی اطاعت سے انہیں بیر ہے۔ ان کو خدا کی جناب میں پیش ہونے اور اپنے اعمال کا حساب دینے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ عدالت الٰہی میں پیش ہونے کا یقین انسان میں ذمہ داری کا احساس پیدا کرتا ہے اور اس کے بارے میں بے یقینی انسان کو حیوانات کی صف میں لے جا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ خدا کی عدالت میں پیش ہونے کا یقین ہی انسان کو اتباع ہوا سے بچاتا ہے عادلانہ زندگی میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے۔ اسی لیے آخر میں فینبئکم بما کنتم فیہ تختلفون یعنی جب خدا کے حضور میں پیش ہو گے تو وہ تمہارے سامنے تمہارے اختلافات کی حقیقت کھول دے گا یعنی تمہارے اس اختلاف کی حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی کہ مطاع کون ہے وہ ہے جن کی تم اطاعت کرتے رہے ہو یا وہ اللہ ہے جو تمہارا خالق و مالک ہے۔ یہاں اپنی شعوری زندگی میں اپنے من مطاع بناتے

ہوسکے ہو اور دن رات اپنے ہی جیسے انسانوں کی چاکری میں لگے ہوئے ہو۔ یا خدا کو چھوڑ کر اوروں کی عبادت کرتے ہو۔ عبادت ہو یا طاعت قرآن کی دعوت یہی ہے کہ اللہ کی ہونی چاہیے جبکہ کفر کی دعوت یہ ہے کہ اتبعوا سبیلنا ہماری اتباع کرو۔ قرآن کا عبادت اور اطاعت کی حد تک یہی مطالبہ ہے کہ غیر اللہ کے سامنے عجز و نیاز پر مشتمل کوئی پیمانہ نہ اختیار کیا جائے اور بس۔

زمین میں انسان کا مرتبہ

۲۰۲- اور وہی ہے جس نے زمین میں تمہیں ایک دوسرے کا جانشین بنایا ہے اور تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ یعنی خدا نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا کہ تم اس کے دیے ہوئے اختیارات سے کام لے کر کیسے کیسے حاکمانہ تصرفات کرتے ہو یا تم کو باہم ایک دوسرے کا خلیفہ بنایا ایک قوم جاتی ہے تو دوسری قوم اس کی جانشین ہوتی ہے اور تمہارے اندر باہم بے حد فرق مدارج رکھا چنانچہ شکل و صورت میں رنگت، لہجہ، اخلاق اور ملکات، محاسن و مساوی، رزق و دولت، عزت و جاہ وغیرہ میں افراد انسانی کے بیچ بے شمار درجات ہیں[1]

اس ارشاد میں دو اہم اور بنیادی باتیں بتائی گئی ہیں۔ پہلے یہ بتایا گیا کہ اس کائنات مالک و آقا یگانہ خدا اور مخلوقات کی تمام عبادتوں اور طاعتوں کا وہی مستحق ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اولاً اس کائنات میں انسان کی حیثیت خلائف کی ہے۔ خلائف جمع خلیفہ کی ہے۔ خلیفہ وہ ہوتا ہے جو کسی کی ملک میں اس کے تفویض کردہ اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ خلیفہ مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے منشا کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس کا کام مالک کے منشا کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کردہ اختیارات کو من مانے طریقے سے استعمال کرنے لگے یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کر کے اس کے منشا کی پیروی اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے تو یہ سب غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔

یہ بات کن سے کہی جا رہی ہے۔ پوری انسانیت سے یا خاص طور پر اہل ایمان سے۔ اگر پوری انسانیت مخاطب ہے تو مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تم کو حضرت آدم کی تبعیت میں زمین کا خلیفہ بنایا یا یہ کہ پہلے لوگوں کے جانے کے بعد خلیفہ بنایا۔ اور اگر خطاب اہل ایمان سے ہے تو مطلب یہ ہے کہ اللہ تم کو اب خلافت عطا فرمائے گا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہماری رائے میں مخاطب قریشِ مکہ ہیں ماضی کے صیغے اس کا صاف قرینہ ہیں اور مطلب یہ ہے کہ حکمران ہونے کی حیثیت میں اس دنیا میں تم پہلی قوم نہیں ہو تم سے پہلے کتنی قومیں یہاں آئیں اور غائب ہو گئیں یہاں تک کہ خدا نے تم کو ان کی جگہ دی تم نے بجائے نیابت کے اپنی انانیت کا ڈنکا بجایا اور یہاں خدا کی بغاوت کی۔ خدا کی اطاعت کی جگہ اپنی اطاعت کی طرف لوگوں کو بلانے لگے۔ تم اللہ کی زمین میں بنائے ہوئے نائب ہو۔ نائب ہونے کی حیثیت میں تمہارا کام یہ اور صرف یہ ہے کہ عبادت اور طاعت میں توحیدِ الٰہی کے علمبردار بن کر رہو لیکن تم بتوں کو پوجتے ہو، پتھروں کو سجدہ کرتے ہو، درختوں کے آگے جھکتے ہو، جانوروں کو دیوتا بناتے ہو۔ جنات اور ارواحِ خبیثہ کے نام کی دہائی دیتے ہو انسانوں کو ارباب مانتے ہو۔ ان کی غلامی اور بندگی کرتے ہو۔ تم حقیقت میں انسان کے درجہ اور مرتبہ سے ناواقف ہو۔ مطیع اور مطاع دونوں سے کہا جا رہا ہے۔ مطیعون سے کہا جا رہا ہے کہ تم خدا کے نائب ہو، تمہارا فرض تھا کہ نائب ہونے کی حیثیت میں اللہ کی اطاعت کرتے اور کر یہ رہے ہو کہ خدا کو چھوڑ کر اپنے ہی جیسے انسانوں کی طاعت کر رہے ہو جن کی اطاعت کا خدا کی جانب سے تمہارے پاس کوئی پروانہ نہیں ہے اور مطاعوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم خدا کے نائب ہو کر اپنی اطاعت کرا رہے ہو حالانکہ تم اس لیے آئے تھے کہ لوگوں سے اللہ کی اطاعت کراؤ۔ اور عابدوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم خلافت کا سر پر تاج رکھ کر اپنی جیسی مخلوق کی عبادت کر رہے ہو حالانکہ تم کو یہ رتبہ بلند اس لیے ملا تھا کہ ساری مخلوقات سے برتر بن کر رہو۔ اور معبودوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم نے عہدۂ خلافت لے کر غداری کی ہے تمہیں بھیجا اس لیے گیا تھا کہ ہماری عبادت ساری مخلوق سے کراؤ اور تم اپنی عبادت کرا رہے ہو۔

دوسری بات خلافت کے ساتھ یہ جتائی گئی ہے کہ و رفع بعضکم فوق بعض درجات مطلب یہ ہے کہ یوں تماشہ گاہ عالم کی بنیاد ہی صفات کے تفاوت پر مبنی ہے۔ جمادات میں وہ صفات نہیں پائے جاتے جن کا نباتات کو مالک بنایا گیا ہے نباتات ان صفات سے مفلس ہیں جن سے حیوانات سرفراز ہیں۔ حیوانوں کو ان کمالات سے بہرہ نہیں ملا ہے جن پر انسان کی انسانیت کی بنیاد قائم ہے اور صفات، کمالات کے تفاوت کا یہ قصہ اتنا دراز ہے کہ کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ گلاب کی دو پنکھڑیاں باہم یکساں نہیں ہیں۔ صوفیائے کرام نے اسی کو تجلیات میں تکرار نہیں کے عنوان سے تعبیر کیا ہے۔ غالب مرحوم نے اس مصرعہ میں اسی واقعہ کو دہرایا ہے۔

لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

آیت میں اعلان کیا گیا ہے کہ تفاوتِ صفات کی وجہ سے افرادِ انسانی میں مدارج و مراتب کا جو فرق پیدا ہوا ہے یہ کسی دوسرے کا نہیں بلکہ اللہ کا قائم کردہ ہے یعنی کسی کو ایسی صفت دی گئی جو نتیجے کے لحاظ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہے اور کسی کو ایسا کمال عطا کیا گیا جو اپنے ثمرات کے لحاظ سے انمول و قیمتی ہے ایک کا درجہ

دوسرے سے بلند ہو گیا۔ تو یہ اللہ کی دین کا نتیجہ ہے کہ کوئی حاکم ہے کوئی محکوم، کوئی فقیر ہے کوئی غنی کوئی جاہل ہے کوئی عالم کوئی بیوقوف ہے کوئی عقل مند، کوئی ضعیف ہے کوئی قوی۔ یہ خلق اور اخلاق میں سعادت میں تفاوت اس لیے نہیں کہ تم سرکش ہو جاؤ اور اپنی آقائی کا ڈنکا پیٹنے لگو بلکہ یہ تو صرف اس لیے ہے۔

فرق مراتب کا منشا ابتلا و آزمائش ہے

۲۲۴۔ تاکہ جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے، بلاشبہ تمہارا پروردگار جلد سزا دینے والا ہے اور بلاشبہ وہ بخشنے والا رحمت ہے۔ یعنی ظاہر ہو جائے کہ ان حالات میں کون کہاں تک خدا کا حکم مانتا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے فیما اتاکم سے وہ مختلف احوال و درجات مراد لیے ہیں جن میں حسب استعداد و لیاقت ان کو رکھا جاتا ہے اس تقدیر پر آزمائش کا حاصل یہ ہوگا کہ مثلاً غنی حالت غنی میں رہ کر کہاں تک شکر ادا کرتا ہے اور فقیر حالت فقر میں کس حد تک صبر کا ثبوت دیتا ہے وقس علی ہذا۔ بہرحال اس آزمائش میں جو بالکل نالائق ثابت ہوں گے حق تعالیٰ ان کے حق میں سریع الحساب ہے اور جس سے قدرے کوتاہی رہ گئی اس کے حق میں غفور اور جو پورا اترا اس کے حق میں رحیم ہے[1] مطلب یہ ہے کہ یہ پوری زندگی اپنی بوقلموں نعمتوں کے ساتھ ایک امتحان گاہ ہے اور جس کو جو کچھ بھی خدا نے دیا ہے اسی میں اس کا امتحان ہے کہ اس نے کس طرح خدا کی امانت میں تصرف کیا کہاں تک امانت کی ذمہ داری کو سمجھا اور اس کا حق ادا کیا اور کس حد تک اپنی قابلیت اور نا قابلیت کا ثبوت دیا۔ اسی امتحان کے نتیجے پر زندگی کے دوسرے مرحلہ انسان کے درجہ کا تعین منحصر ہے[2] منشا یہ جتانا ہے کہ جو کچھ تمہیں ملا ہے تمہاری خوبیوں اور قابلیتوں کا ثمرہ نہیں ہے بلکہ اللہ کی طرف سے تمہارا امتحان ہے کہ تم شکر گزار بنتے ہو یا ناشکرے۔ نیکیوں اور بدیوں کی جزا کا دن آگے آنے والا ہے یہ نہ سمجھو کہ وہ بہت دور ہے وہ جلد آنے والا ہے۔ اس دن ہر شخص اپنی نیکی اور بدی دیکھ لے گا۔

یہاں ابتلا و بلا کا جو فعل اللہ سبحانہٗ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ وہ اس امتحان سے جو ایک مخلوق دوسری مخلوق کا لیتی ہے قطعاً مختلف ہے۔ قرآن میں ایک جگہ نہیں متعدد جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی پوری کی پوری زندگی ابتلا و امتحان ہی کی زندگی ہے۔ مطلب یہی ہے کہ زندگی کا کوئی خاص پہلو نہیں بلکہ پوری زندگی امتحان ہے۔ تمام کائنات کے مقابلے میں بشری فطرت میں دو راہوں میں سے کسی ایک راہ یا دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کے انتخاب و اختیار کرنے کی جو خصوصیت رکھی گئی ہے درحقیقت فطرت کے اسی اقتضا

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

کے صحیح استعمال کے مطالبہ کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ آدمی کی پوری زندگی ابتلائی ہے۔ یعنی انسانی فطرت میں اقتدار و اختیار، انتخاب و ترجیح کی جو قوت رکھی گئی ہے اسی قوت کے صحیح کے مطالبہ کا نام ابتلاء امتحان ہے۔

الحمدللہ سورہ انعام کی تفسیر دارالعلوم الشہابیہ میں ختم ہوئی ہے۔

دوشنبہ ۷ بج کر ۴۵ منٹ صبح

۲۸ ربیع الاول ۱۳۹۹ھ

۲۶ فروری ۱۹۷۹ء

مَعَالم العُرآن

سُورۃ اعراف مکّی

رکوع ——— ۲۴

آیات ——— ۲۰۶

نام

اس سورت کا نام اعراف ہے۔ یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس سورت میں اعراف کا ذکر ہے۔

موضوع

اس سورت کا اصلی موضوع رسالت ہے۔ رسالت کا اثبات، رسالت کی دعوت، اس معنے کے اعتبار سے یہ سورت پہلی سورت کا مثنیٰ ہے گویا پہلی سورت کا موضوع اگر لا الٰہ الا اللہ ہے تو اس سورت کا موضوع محمد رسول اللہ ہے۔ پوری سورت کے مضامین اسی موضوع کے اردگرد چکر لگاتے ہیں اور مخاطبوں کو رسالت کی پیروی اختیار کرنے کی دعوت دی جارہی ہے۔ اس دعوت میں تبشیر کی جگہ انذار کا پہلو غالب ہے۔ اس میں، قریش کو دھمکی دی جارہی ہے کہ اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو خدا کا عذاب آرہا ہے۔ پہلے ان کے جرم کی سنگینی بتائی گئی اس کے بعد تفصیل کے ساتھ گزشتہ ان قوموں کی تاریخی کہانی سنائی جو اس ملک میں برسراقتدار رہی ہیں۔ اسی کے ساتھ یہود کو بھی لے لیا ہے اور ان کو بھی تنبیہہ فرمائی۔

زمانۂ نزول

عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن الزبیر ہی نہیں بلکہ سب کا اس پر اجماع ہے کہ اس سورت کا زمانۂ نزول حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ اس سورت کا نزول یکبارگی ہوا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ یہ سورت سورۂ انعام سے پہلے نازل ہوئی ہے کیونکہ سورۂ انعام مکی دور کے آخری زمانہ میں نازل ہوئی ہے۔ اگرچہ مکی سورتوں کے متعلق ہمارے پاس ایسی کوئی تاریخی دستاویز نہیں ہے جس کی مدد سے ہم زمانۂ نزول اور موقع نزول کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرسکیں کیونکہ اس زمانہ کی تاریخ اس قدر جزئی تفصیلات کے ساتھ مرتب نہیں ہوئی ہے۔ مکی سورتوں کے بارے میں ہم کو تاریخی شہادتوں کی جگہ زیادہ تر ان اندرونی شہادتوں پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جو مختلف سورتوں کے موضوع، مضمون اور انداز بیان میں پائی جاتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ صرف یہی ہے کہ ایک طرف ہم مکی سورتوں کی اندرونی شہادتوں کو رکھیں اور دوسری طرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کو رکھیں اور پھر دونوں کا تقابل کرکے یہ رائے قائم کریں کہ کون سی سورت کس زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔ انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نبوت کا بے حد پُرآشوب زمانہ ہے یہ آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے لیے انتہائی سختی اور مصیبت کا زمانہ تھا۔ مکہ میں آپ کے لیے زندگی دوبھر ہوگئی تھی۔ آپ طائف تشریف

لے گئے وہاں بھی پناہ نہ ملی۔ حج کے موقعہ پر آپ ایک ایک قبیلے سے اپیل کرتے رہے کہ آپ کی آواز پر لبیک کہیں اور آپ کا ساتھ دیں لیکن ہر طرف سے صاف جواب تھا۔ ادھر اہلِ مکہ بار بار یہ مشورہ کرتے کہ آپ کو قتل کر دیں یا قید کر دیں یا اپنی بستی سے نکال دیں۔ سورت کے آغاز ہی میں لا یکن فی صدرک حرج حالات کی سنگینی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ یعنی یہ فرمانا کہ بغیر کسی جھجک کے لوگوں تک پہنچا دو۔ بتا رہے ہیں کہ مخالفتوں اور مزاحمتوں کا طوفان کس قدر زیادہ تھا۔

شانِ نزول

اس سورت کے نزول کا پس منظر بھی سورت کے مضامین ہی سے مقرر ہو سکتا ہے۔ اصلی پس منظر وہ افکار اعمال اور اخلاق ہیں جن پر اس میں ضرب لگائی جا رہی ہے۔ رسالت سے ان کا انکار، ان کی سرکشی اس کا پس منظر ہے۔ کیونکہ لوگوں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تسلیم کرانا اور ان کو اس بات پر آمادہ کرنا کہ وہ عقائد و عبادات کی زندگی کے ہر شعبے تک تمام معاملات میں آپ کی مکمل اطاعت و پیروی قبول کر لیں۔ یہ دعوتِ اسلامی کا دوسرا بنیادی نکتہ ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے بغیر دین عملاً قائم نہیں ہو سکتا۔ رسول پر ایمان اور بالفعل اس کی اطاعت کے بغیر صرف توحید کو مان لینا لاحاصل ہے۔ اور اگر ذرا بنظرِ عمیق دیکھا جائے تو اس بات کو معلوم کر لینا کچھ دشوار نہیں ہے کہ اللہ کی توحید کا اقرار مخاطبوں کے لیے جس قدر دشوار تھا اس سے کہیں زیادہ مشکل آپ کی رسالت کو ماننا تھا۔ اول تو یہی بات ان کے لیے کچھ آسان نہ تھی کہ جو شخص چالیس برس تک ان کے معاشرے میں عام انسانی زندگی گزار رہا تھا یکایک اس کے متعلق یہ باور کر لیں کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔ ثانیاً جو لوگ صدیوں سے بے لگام آزادی کے عادی تھے ان کے لیے اب ایک شخص کی بے چون و چرا طاعت اور اپنی پوری زندگی میں اس کے پیش کردہ قانون کی پیروی کو قبول کر لینا بھی آسان نہ تھا۔ ثالثاً، بڑی دشواری ان رہنمایانِ قوم اور فرمانرواؤں کے لیے تھی جو اب تک اپنے اپنے قبیلوں اور گروہوں کے صاحبِ امر تھے۔ اور ان مذہبی پیشواؤں کے لیے جو ملک بھر میں شرک کے بڑے بڑے مراکز کا کاروبار چلا رہے تھے، ان کاہنوں کے لیے تھی جو غیب دانی کے مدعی تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے یہ رسالت گویا کھلا کھلا پیغامِ موت تھی جسے قبول کرنا تو درکنار ٹھنڈے دل سے سننا بھی ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ قرآن نے رسالت ہی کو منوانے کے لیے رسالت کی پوری تاریخ اس سورت میں پیش کی ہے۔ از آدم تا موسیٰ علیہما السلام کا ذکر کیا اور بتایا کہ جو روش تم نے اپنے پیغمبر کے مقابلے میں اختیار کی ہے ایسی ہی روش تم سے پہلی قومیں اختیار کر چکی ہیں اور اس کا انجام دیکھ چکی ہیں۔

مضامین کا موضوع سے تعلّق

سُورت کے موضوع کے تعلق سے اس میں جو مضامین بیان ہوتے ہیں ان پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کر

اوّلاً، اس میں جو باتیں پیش کی گئی ہیں وہ دعوتِ اسلامی کے اس دور سے تعلّق رکھتی ہیں جب اسلامی زندگی میں اجتماعیت نہ تھی بلکہ افراد منتشر تھے۔ بالخصوص نبوّت کی ذات کے لیے یہ مرحلہ بہت زیادہ صبر آزما تھا۔ ظاہر ہے کہ عفو و درگزر کے لیے سب سے زیادہ موزوں یہی وقت ہو سکتا ہے۔

ثانیاً، اس کے مضامین میں انذار کا پہلو غالب ہے۔ یہ اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ مخاطبوں میں انکار اپنی شدّت کے اعتبار سے آخری مرحلوں میں تھا۔

ثالثاً، اس سُورت میں یہودیوں کی عبادت اور طاعت میں بے راہ روی کو کھول کر بتایا گیا ہے۔

آیاتہا ۲۰۶ — (۷) سُوْرَةُ الْاَعْرَافِ مَكِّيَّةٌ (۳۹) — رکوعاتہا ۲۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓصٓ ۝۱ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ
حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲ اِتَّبِعُوْا
مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ
قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳ وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا
بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ۝۴ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ
جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝۵

الف، لام، میم، صاد، اے پیغمبر یہ کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اس لیے کہ اس کے ذریعے تم لوگوں کو آگاہ کر دو اور اس لیے کہ اہل ایمان کے لیے نصیحت ہو لہٰذا اس بارے میں تمہارے اندر کسی طرح کی تنگی راہ نہ پائے ۔ لوگو! جو کچھ تمہارے رب کی جانب

سے تمہاری طرف نازل ہوا ہے اسی کی پیروی کرو، اور خدا کے سوا اپنے مددگاروں کی پیروی نہ کرو تم بہت ہی کم نصیحت قبول کرتے ہو۔[2] اور دیکھو کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو ہم نے تہس نہس کر ڈالا بس ایسا ہوا کہ لوگ رات کو سو رہے تھے یا دن کو قیلولہ کر رہے تھے کہ ہماری گرفت آگئی جب ان پر عذاب آیا اس وقت ان کی پکار اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ بلاشبہ ہم ظلم کرنے والے تھے۔[3]

معانی مفردات

المص، لکھنے میں یہ مرکب ایک لفظ معلوم ہوتا ہے لیکن پڑھنے میں یہ الگ الگ بولے جاتے ہیں جیسے الف لام میم صاد۔ اگرچہ حروف ہونے کی وجہ سے ان میں معنویت نہیں ہے لیکن بہت سے علماء نے اسے حروف تنبیہہ قرار دیا ہے۔ التحاف السادہ میں ہے کہ حربی کی رائے ہے کہ ان کو حروف تنبیہہ قرار دینا زیادہ قرین صواب ہے۔ ان کے خیال میں حضور انور کے لیے یہ تنبیہہ ہوتی ہے۔ لیکن ہماری رائے میں تنبیہہ سامعین کے لیے ہے مکہ میں مشرکین مدینہ میں اہل کتاب، ویسے عربی میں الا اور ہلا وغیرہ حروف تنبیہہ ہیں لیکن یہ قرآن کا اعجاز بلاغت ہے کہ اس نے تنبیہہ کے لیے ان حروف کو اپنایا ہے۔ ان کو سنتے ہی مخاطب چونک جاتے اور سننے کے لیے متوجہ ہو جاتے

حرج، تنگی مضائقہ، گناہ، تنگ، اصل میں تو حرج کے معنے کسی چیز کے مجتمع ہونے کی جگہ کے ہیں۔ درختوں کا ایسا جھرمٹ کہ راہ گیر کو راستہ ہی نہ ملے حرج کہلاتا ہے اور ایک جگہ جمع ہونے میں چونکہ تنگی کا تصور ہے اس لیے تنگی اور گناہ کو حرج کہا جاتا ہے مقصود دل

کی تنگی ہے۔ ذکریٰ، نصیحت کرنا، ذکر کرنا، یاد کرنا، پند و موعظت، مصدر ہے، کثرت ذکر کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہ ذکر سے زیادہ بلیغ ہے۔ ترکیب میں منصوب ہے اس کا فعل محذوف ہے تذکر اصل میں لتذکر ذکری ہے۔ اس کا عطف لتنذر پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفار کو ڈرانے اور اہل ایمان کو نصیحت کرنے کے لیے یہ کتاب نازل ہوئی ہے۔ باس، لڑائی، دبدبہ، سختی، آفت جنگ کی شدت، اصل میں اس کے معنی سختی اور آفت کے ہیں۔ لڑائی اور غلبہ کے معنے میں اس کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں مراد عذاب ہے۔ بیاتا، اصل میں بات یبیت کا مصدر ہے۔ راغب نے اس کے معنے رات کو دشمن پر حملہ کرنے کے لکھے ہیں۔ لیث نے اس کے معنے رات میں داخل ہونے کے بتلائے یہ مصدر فاعل معنے میں ہو کر حال ہے یعنی بائتین قائلون یہ قال یقیل سے اسم فاعل ہے اس کا مصدر قیلولہ ہے۔ اس کے معنے دوپہر میں آرام کرنے کے ہیں خواہ نیند آوے یا نہ آوے۔ یہاں بیاتا کے مقابلہ میں ہونے کی وجہ سے دوپہر میں سونا مراد ہے۔ یہ اجوف یائی ہے۔ باع یبیع کی طرح اور اجوف واوی قال یقول ہے۔ اس کے معنے کہنے کے ہیں مصدر قول ہے اسم فاعل دونوں کا قائل آتا ہے۔

اسلام کی غربت اور بے چارگی

یہ ہم پہلے بتا آئے ہیں کہ یہ پوری سورت ایک بار نازل ہوئی ہے۔ اس میں اسلام کی غربت اور بے چارگی کے زمانہ میں نبوت کو اولاً اور پیروان دعوت کو ثانیاً تسلی دی گئی۔ یہ حقیقت ان کے دلوں میں نقش کی گئی کہ ظاہری اسباب کتنے ہی مخالف ہو جائیں بالآخر دعوت حق کی کامیابی یقینی ہے۔ مخالف جماعتیں جس قدر اپنی سرگرمی میں بڑھتی جائیں گی، اتنا ہی زیادہ ان کی تباہی کا وقت قریب آتا جائے گا۔ آیئے اب واقعات کی روشنی میں اسلام کی غربت کا مطالعہ کیجئے۔ خواجہ ابو طالب اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی وفات ہو چکی ہے۔ ان دونوں حادثوں کے بعد ایک طرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر غم کا پہاڑ ٹوٹا اور دوسری طرف یکایک قریش یہ دیکھ کر کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا اب پشتبان کوئی نہیں رہا آپ کے مقابلے میں بہت دلیر ہو گئے ہیں۔ ابو طالب کی زندگی میں جو اذیتیں آپ کو نہیں پہنچا سکتے تھے۔ وہ اب پہنچانے لگے ہیں۔ ابن اسحاق نے قریش کی بڑھتی ہوئی جرأتوں کی ایک مثال اسی زمانہ کی عروہ ابن الزبیر کے حوالہ سے بیان کی ہے کہ ایک روز قریش کے ایک اوباش نے سر بازار حضور انور کے سر مبارک پر مٹی ڈال دی۔ آپ اسی حال میں گھر تشریف لے گئے۔

صاحبزادیوں میں سے ایک آپ کا سر مبارک دھوتی جاتی تھیں اور روتی جاتی تھیں اور حضور ان کو تسلی کی خاطر یہ فرما رہے تھے رو نہیں میری بیٹی اللہ تیرے باپ کا حامی ہے۔

امام بخاری نے کتاب الطہارت، کتاب الصلاۃ، کتاب الجزیہ، کتاب الجہاد اور کتاب المغازی میں یہ روایت حضرت عبداللہ بن مسعود کی زبانی نقل کی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے اور قریش کے لوگ اپنی اپنی مجلسوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا تم میں سے کون ہے جو فلاں جگہ سے ذبح شدہ اونٹنی کے پیٹ کی الائش لا کر اس شخص کی پیٹھ پر سجدے کی حالت میں رکھ دے۔ اس پر عقبہ ابن معیط اٹھا اور یہ گندگی لا کر اس نے سجدے کی حالت میں حضور انور کی پیٹھ پر رکھ دی۔ قریش کے لوگ یہ منظر دیکھ کر ہنستے رہے، اتنے میں جا کر کسی نے یہ خبر آپ کے گھر پہنچا دی۔ حضرت فاطمہؓ دوڑی ہوئی آئیں اور انہوں نے یہ گندگی کا انبار ہٹایا۔ نماز ختم کرنے کے بعد آپ نے فرمایا کہ خدایا قریش سے نمٹ لے۔

اگرچہ اس حدیث میں زمانے کی تعیین نہیں لیکن حضرت فاطمہ کا آنا اور الائش کو ہٹانا اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ حضرت فاطمہ کی عمر اس وقت کم و بیش ۹، ۱۰ سال کی ہے۔ حافظ ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ حضرت فاطمہ کی ولادت اس وقت ہوئی تھی جب آپ کی عمر ۴۱ سال کی تھی۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ کی عمر اس وقت نو سال کی ہوگی۔

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ دعوت میں مزاحمتوں اور مخالفتوں کا اس وقت کیسا طوفان تھا۔ اسی لیے سورت کا آغاز یہ کہہ کر کیا گیا ہے کہ حالات کی ساری سنگینی کے باوجود دعوت و تبلیغ میں کسی طرح کی دل تنگی محسوس نہ کریں۔ آپ کا کام انکار و بدعملی کے نتائج سے خبردار کرنا ہے اور بس۔

۱ھ الف، لام، میم، صاد، اے پیغمبر یہ کتاب ہے جو تمہاری طرف اتاری گئی ہے۔ اس لیے کہ اس کے ذریعے تم لوگوں کو آگاہ کرو اور اس لیے کہ اہل ایمان کے لیے نصیحت ہو۔ لہٰذا اس بارے میں تمہارے اندر کسی طرح کی دل تنگی راہ نہ پائے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے حرج کی تفسیر شک سے کی ہے۔ گویا فلا یکن فی صدرک حرج کے معنے اور فلا تکونن من الممترین کے معنے ایک ہیں۔ یعنی پیغمبر جس پر خدا نے کتاب اتاری ہے اس کی شان یہ نہیں ہے کہ ذرا سا بھی کھٹکا یا شبہ کتاب کے احکام و اخبار کے متعلق اس کے دل میں راہ پائے۔ دوسرے مفسرین نے الفاظ کو ظاہری پر رکھا جیسا کہ حضرت شیخ الہند نے اختیار فرمایا کہ تیرا جی تنگ نہ ہو۔ یعنی تمام خلائق میں سے چن کر جس پر خدا نے اپنی کتاب اتاری اسے لائق نہیں کہ احمقوں اور معاندین کے طعن و تشنیع یا بیہودہ سوالات سے گھبرا کر اس کتاب کے کسی حصہ کی تبلیغ سے منقبض اور دل تنگ ہو۔

فلعلك تارك بعض ما یوحی الیك وضائق به صدرك ان یقولوا لولا انزل الیه
کنز او جاء معه ملك

اے پیغمبر کیا تو ایسا کرے گا کہ جو کچھ تجھ پر القا کیا جاتا ہے اس میں سے کچھ باتیں چھوڑ دے گا اور اس کی وجہ سے دل تنگ رہے گا اور یہ اس لیے کہ لوگ کہیں گے کہ اس پر کوئی خزانہ آسمان سے کیوں نہیں اتارا گیا، یا ایسا کیوں نہیں ہوا کہ اس کے ساتھ ایک فرشتہ آتا۔

اگر بالفرض خود پیغمبر کے دل میں کتاب اور اس کے مستقبل کی طرف سے کامل وثوق و انشراح حاصل نہ ہو تو وہ اپنے فرض انذار و تذکیر کو کس طرح قوت و جرأت کے ساتھ ادا کر سکے گا۔ اسی لیے واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ کتاب کے اتارنے سے غرض یہ ہے کہ تم ساری دنیا کو اس کے مستقبل سے آگاہ کرو اور بدی کے انجام سے ڈراؤ اور ایمان لانے والوں کے حق میں خاص طور پر یہ ایک مؤثر پیغام نصیحت ثابت ہو۔[1]

اس آیت میں تین باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ دعوت انسانی نہیں بلکہ دعوتِ الٰہی ہے اور سرتاسر حق ہے۔ اس میں ملاوٹ کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ نزولِ قرآن کا مقصد تذکیر اور انذار ہے۔ تیسری یہ کہ راہِ دعوت میں حالات خواہ کیسے سنگین سے سنگین تر ہو جائیں۔ عزم و استقلال اور صبر و ثبات کا دامن چھوڑ کر پیش پا افتادہ حالات کی بنا پر مستقبل کو مشکوک نگاہوں سے نہ دیکھنا چاہیے اور مطمئن رہنا چاہیے کہ خواہ کتنی ہی مشکلیں آئیں لیکن بالآخر حق کی فتح مندی اٹل ہے۔ لہٰذا مشکلات کے ہجوم سے دل تنگ اور افسردہ خاطر نہ ہو۔

پہلی بات کے لیے اصل ارشاد میں تعبیر کتاب انزل الیك کی آئی ہے۔ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور کتاب کی تنکیر تعظیم اور تفخیم کے لیے ہے یعنی یہ وہ عظیم الشان کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے یعنی کتاب بھی قدر و منزلت والی ہے اور جس پر اتاری گئی ہے وہ ذات بھی بے حد قدر و منزلت والی ہے اسی لیے وہ رات بھی لیلۃ القدر ہے جس میں کتاب کے نزول کا آغاز ہوا اور چونکہ اس کتاب کا نزول عرش بریں سے ہوا ہے اس لیے نازل کرنے والے کی ذات ہر قسم کے تعارف سے بے نیاز ہے۔ ایجاز کی خاطر فعل مجہول آیا ہے۔

دوسری بات یہ بتائی ہے کہ نزولِ قرآن کا مقصد انذار اور تذکیر ہے۔ انذار یعنی انکار و بدعملی کے نتائج سے آگاہ کرنا اور تذکیر یعنی پند و موعظت کے ذریعے بیدار کرنا، اس کے لیے اصل ارشاد میں لتنذر بہ و ذکری

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

للمومنین کی تعبیر آئی ہے۔ انذار و تذکیر دونوں دعوت کے اہم پہلو ہیں۔ انذار بیگانوں میں اور تذکیر یگانوں میں ہوتی ہے۔ نبی کا سب سے پہلا اور اہم کام دعوت و تبلیغ ہے یعنی جو سچائی اسے خدا کی جانب سے ملی ہے اس کو دوسروں تک پہنچائے اور جو علم اس کو عطا ہوا ہے اس سے اوروں کو بہرہ ور کرے۔ خدا کا جو پیغام اس تک پہنچا ہے وہ لوگوں کو سنائے اللہ نے اسے جس صداقت سے آگاہ کیا ہے اس سے اپنے ہم جنسوں کو باخبر کرنا۔ جو مالی، جانی، زبانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی طاقتیں اس کو بخشی گئی ہیں ان کو اس راہ میں صرف کرنا اور اس کو سمجھانے اور راہِ راست پر لانے میں صداقت کی ہر تاثیر سے کام لینا۔ اس اعلان و دعوت میں جو تکلیف درپیش آئے اس کو راحت جاننا، جو مصیبت بھی درپیش ہو اس کو آرام سمجھنا، جو کانٹے بھی اس وادی میں اس کے تلوؤں میں چبھیں ان کو رگِ گل سمجھنا۔ یہ ہے نبوت کے انذار و تذکیر کا مفہوم۔ دُنیا میں جس قدر پیغمبر آئے انہوں نے اپنے فرض کو ایثار اور قربانی کے ساتھ انجام دیا۔ نبوت کی دعوت میں تذکیر و انذار دونوں ہوتے ہیں۔ وہ خیر خواہی سے مشفقانہ اور مربیانہ انداز میں نصیحت کرتا ہے اور ساتھ ہی نہ ماننے والوں کو خدا کے جلال سے ڈراتا عذابِ الٰہی سے خوف دلاتا ہے اور لوگوں کو ان کے انجامِ بد سے آگاہ کرتا ہے اور یہ انذار و تذکیر قرآن کے ذریعے ہوتی تھی۔ یہاں بہٖ کا لفظ یہی بتانے کے لیے ہے کہ اسلامی تبلیغ کا درسِ اولین قرآن اور صرف قرآن تھا۔ قرآن حکیم اسلام کے دعویٰ اور دلیل دونوں کا مجموعہ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے صحابہ تبلیغ و دعوت میں صرف قرآن کی سُورتیں پڑھ کر سناتے تھے اور جہاں ان کو اس کا موقعہ مل جاتا وہاں اس کی تاثیر اپنا کام کر جاتی تھی اور یہ فرض خود قرآن نے آپ کا یہ کہہ کر قرار دیا تھا لتنذر بہٖ۔ قرآن کی دعوت کے لیے جہاد کی ضرورت تھی مگر اس جہاد کا ہتھیار لوہے کی تلوار نہیں بلکہ قرآن کی تلوار تھی جس کی ضرب کی روک خَود اور سپر سے بھی ممکن نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مکی زندگی میں اپنے پیغمبر کو اس تلوار سے جہاد کرنے کا حکم دیا فرمایا جاھدھم بہٖ جھاداً کبیراً قرآن کے ذریعے ان سے بڑا جہاد کرو۔ اس پیغامِ الٰہی کے اترنے کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ خدا ترس لوگوں کو ان کا عہد یاد دلاتے فرمایا فذکر بالقرآن من یخاف وعید یہی قرآن اسلام کی طاقت اور نبوت کا اصلی ہتھیار تھا جس کی کاٹ نے کبھی خطا نہیں ہے۔

یہاں اس فقرے میں یعنی لتنذر بہٖ و ذکریٰ للمومنین میں پہلے فعل کے دونوں مفعول حذف کر کے اشارہ کر دیا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کسی خاص ملک اور قوم کے لیے نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کا فرض یہ ہے کہ اس کتابِ الٰہی کے ذریعے سے لوگوں کو تکذیبِ رسول کے نتائج اور قیامت کے احوال سے اچھی طرح آگاہ کر دیں۔ ذکریٰ للمومنین کا عطف

تو لفظ نذیر ہی پر ہے لیکن یہاں اس کے فعل کو محذوف کر دیا گیا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ جہاں تک انذار کا تعلق ہے وہ تو آپ ان کفار کو کر دیں لیکن اس سے یاد دہانی کا فائدہ صرف اہل ایمان کو ہوگا۔

تیسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ راہ دعوت میں حالات خواہ کیسے سنگین در پیش آئیں آپ عزم و استقلال اور صبر و ثبات کا مثالی پیکر بن کر رہیں۔ اس کے لیے تعبیر فلا یکن فی صدرک حرج کی اختیار کی گئی ہے۔ لفظ حرج کے معنے حضرت عبداللہ بن عباس اور امام مجاہد نے شک کے کیے ہیں اور اس کا مطلب عام شارحین قرآن نے یہ بتایا ہے کہ نبوت کی شان یہ نہیں ہے کہ ذرا سا بھی شک و شبہ کتاب کے احکام کے بارے میں اپنے دل میں لائے لیکن ہماری رائے میں ان بزرگوں کا منشا یہ بتانا ہے کہ حالات میں خواہ کتنی سنگینی ہو حق کی کامیابی اور فتح مندی کے بارے میں آپ کو مستقبل کو شک کی نگاہوں سے نہ دیکھنا چاہیے۔ قرآن جب کہتا ہے کہ فلا تکونن من الممترین تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ معاذ اللہ قلب نبوت میں احکام الٰہی کے بارے میں کوئی شک ہو رہا ہے بلکہ مصائب کے ہجوم اور تکذیب کے طوفان میں نتائج کے لیے دل پریشان ہوتا ہے اسی موقعہ پر قرآن آپ کو تسکین و تسلی دیتا ہے کہ آپ مخالفوں کی مخالفتوں سے پریشان نہ ہوں کامیابی بہرحال آپ کی ہے۔ یہ سارا ہنگامہ وقتی ہے اور دوسرے شارحین قرآن نے لفظ حرج کو اپنے لغوی معنے میں لیا ہے دل میں حرج ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ مخالفتوں اور مزاحمتوں کے طوفان میں اپنا راستہ صاف نہ پا کر آپ کا دل آگے بڑھنے سے رک جاتے۔ آپ پورے شرح صدر کے ساتھ کام کرتے جائیں اور حالات کی پروا نہ کریں۔ اور بھی اس کا مطلب بتایا گیا ہے کہ اس وقت کفار و مشرکین کی دشمنی حد کمال کو پہنچ چکی تھی، آیات الٰہی کی تکذیب، احکام شرعی کا مذاق، مسلمانوں پر جور و جفا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم و ستم ان کا مقصد حیات بن کر رہ گیا تھا۔ انہیں راہ راست پر لانے کے لیے بظاہر ساری کوششیں بے اثر معلوم ہو رہی تھیں جس سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت صدمہ تھا اس لیے یہاں فرمایا کہ آپ ان کفار کے معاندانہ رویہ سے دل تنگ نہ ہوں بلکہ اپنا فرض ادا کرتے جائیں اور تبلیغ میں سرگرم رہیں۔

یہ سب باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ دین حق کی علمبرداری یعنی اس کی اطاعت اور اقامت ہے اور وہ بھی مقامی اور علاقائی نہیں، قومی اور ملکی نہیں بلکہ بین الاقوامی اور پورے عالم میں اس کی اقامت اور تمام ادیان پر اس کا غلبہ ایک ایسا نصب العین ہے جس کی مشکلات کی بے پایانی اور جس کی ذمہ داریوں کی گراں باری اپنا کوئی نظیر نہیں رکھتی ہے۔ دوست، دشمن، موافق اور مخالف، مومن اور منکر سب اس امر واقعی کا یکساں اعتراف کرتے ہیں۔ غیر اس کا اظہار اس نصب العین کی خاطر تگ و دو کرنے والوں کو علانیہ فریب خوردہ بلکہ مجنون کہہ کر کرتے ہیں۔ بہرحال جہاں تک کام کی دشواری کا تعلق ہے

سارے اہلِ جہاں یک زبان ہو کر پکارتے ہیں کہ اس وادی پُرخون میں قدم رکھنا ہر شخص کا کام نہیں۔ حد یہ ہے کہ اس نظریہ کی
صداقت سے نہ تو اس کو انکار ہے جس نے یہ عظیم الشان ذمہ داری اپنے بندوں پر ڈالی ہے اور نہ انہیں جن کو اس کار
اعظم کی سربراہی دے کر اس دُنیا میں روانہ کیا گیا ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان الفاظ کو پیشِ نظر رکھیے جو اس نصب العین
کے آخری تذکیر اور دینِ حق کے آخری علمبردار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس منصب پر سرفراز کرتے وقت فرمائے
گئے انا سنلقی علیک قولاً ثقیلاً، یہ قولِ ثقیل کس چیز کو کہا گیا ہے۔ واقعات شاہد ہیں۔ بعد میں نازل ہونے والے
احکام بتلاتے ہیں اور خود آیت کا سیاق وسباق بتاتا ہے کہ اس سے مراد اللہ کی وہی کتاب تھی۔ جس کے نزول کا
آغاز ہو چکا تھا اور جس میں بتدریج نوعِ انسانی کے لیے آخری اور مکمل ضابطہ حیات ہونے کے باعث ایک ایک
شعبۂ زندگی سے متعلق ہدایات آنے والی تھیں اس لیے نبی پر نت نئی ذمہ داریوں کا بارِ گراں پڑنے والا تھا۔
قرآن کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس کی آیات کا بڑا حصہ اصلاً صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلّی کی
خاطر نازل ہوتا رہا ہے۔ آیات ہی نہیں بلکہ پوری پوری سورتیں اسی مقصد کو لے کر اتریں۔ جب بھی ایسا ہوا
اور ایسا ہونا کسی صبح بھی غیر متوقع نہ تھا کہ حالات کی ناسازگاریاں قلبِ مبارک پر شاق گزرتیں تو فوراً رحمتِ حق
حرکت میں آتی اور الفاظ قرآن کے لباس میں جلوہ گر ہو کر ٹوٹتے ہوئے دل کو سنبھالتی، ڈھارس بندھاتی اور ایک نئے
جوش اور ایک تازہ عزیمت کی توانائیوں سے معمور کر دیتی تاکہ اسی استقلال کے ساتھ اقامتِ حق کا کام پیہم
جاری رہے کہیں ارشاد ہوتا۔

ولقد نعلم انک یضیق صدرک بما یقولون

ہم اس سے خوب باخبر ہیں کہ لوگوں کی باتوں سے تمہارا دل رُکنے لگتا ہے۔

یعنی لوگ دعوتِ حق کے بارے میں باتیں کرتے ہیں اس سے تمہیں پریشانی لاحق ہوتی ہے کہ جن لوگوں کی
ہٹ دھرمی اور ضد کا حال یہ ہے آخر ان کو ہدایت پر کیسے لایا جائے گا اور کبھی ارشاد ہوتا

واصبر وماصبرک الا باللہ ولا تحزن علیھم ولا تک فی ضیق مما یمکرون

اے پیغمبر صبر کر اور تیرا صبر اللہ کی مدد سے ہے اور ان لوگوں کے حال پر غمگین نہ ہو اور نہ ان کی
مخالفانہ تدبیروں سے دل تنگ ہو۔

یہ بات خالص دعوت کے موقعہ پر فرمائی ہے اور کہیں فرمایا ہے۔

فلعلک تارک بعض مایوحی الیک وضائق بہ صدرک

اے پیغمبر کیا تو ایسا کرے گا کہ جو کچھ تجھ پر وحی کیا جاتا ہے اس میں سے کچھ باتیں چھوڑ دو گے
یا اس وجہ سے دل تنگ ہو جاؤ گے۔

ظاہر ہے کہ ایک شخص ایک مطمئن اور خوش و خرم قوم کے سامنے کھڑے ہو کر اچانک اعلان کرتا ہے کہ تمہاری زندگی سرتاسر غلط ہے، عبادت غلط اور طاعت غلط اگر باز نہ آئے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ کتنا بڑا اور عجیب اعلان ہے کتنی عظیم اس کی ذمہ داری ہے اور کس درجہ ما فوق انسانیت صبر و تحمل کی ضرورت ہے کہ وہ سب کچھ برداشت کیا جائے جو یہ اعلان سن کر لوگوں کی زبانوں سے نکلے گا۔ یہی مرحلہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو درپیش تھا اسی لیے وحی الٰہی جا بجا اس پر زور دیتی ہے کہ لوگوں کی باتوں سے دل تنگ نہ ہو اور اعلانِ حق میں ذرا بھی تامل نہ کرو۔ ان حالات میں دل تنگی ایک امرِ طبعی ہے۔ اسی امرِ طبعی سے یہاں روکا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ نہ تو پیش پا افتادہ حالات سے پریشان ہوں اور نہ لوگوں کی تکذیب و انکار سے دل گیر ہوں اور دعوت کے مستقبل کو مشکوک نگاہوں سے دیکھیں۔ انذار و تذکیر رسول ہونے کی حیثیت میں آپ کا کام ہے نتائج پیدا کرنا اور دعوتِ حق کو کامیاب بنانا اللہ کا کام ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعوت کا کام کرنے والوں کا کام یہ ہے کہ نگاہ فرائض پر رکھیں نہ کہ نتائج پر۔

انکارِ نبوت پر کفار کو دھمکی

۲- لوگو! جو کچھ تمہارے رب کی جانب سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور خدا کے سوا اپنے مددگاروں کی پیروی نہ کرو تم بہت ہی کم نصیحت قبول کرتے ہو۔ آدمی اگر حق تعالیٰ کی تربیت عظیم اپنے آغاز و انجام اور طاعت و معصیت کے نتائج پر پوری طرح دھیان کرے تو کبھی اس کو جرأت نہ ہو کہ اپنے رب کریم کی اتاری ہوئی ہدایات کو چھوڑ کر شیاطین الانس والجن کی رفاقت میں ان ہی کے پیچھے چلنا شروع کر دے گزشتہ اقوام میں سے جنہوں نے خدا کی کتابوں اور پیغمبروں کے مقابلہ میں ایسا رویہ اختیار کیا ان کو جو ذیری سزا ملی وہ آگے ہے ہے[1]

سمجھ یہ لیا گیا ہے کہ آیت کی مخاطب اُمتِ اجابت ہے اور اس مفروضہ کی بنا پر منکرینِ حدیث اور منکرینِ فقہ دونوں نے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ ہماری رائے میں مخاطب پوری انسانیت ہے اور آیت میں انذار عام ہے۔ اصل میں پوری بات اس طرح ہے قل یا ایھا الناس اتبعوا اے پیغمبر کہہ دو اے لوگو اس ضابطہ حیات کی پیروی کرو جو تمہارے پروردگار کی جانب سے اتارا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو دُنیا میں زندگی گزارنے کے لیے جس ہدایت کی ضرورت ہے اپنی اور کائنات کی حقیقت سمجھنے کے لیے جو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

علم اسے درکار ہے اور اپنے اخلاق اور تہذیب معاشرت اور تمدن کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جن اصولوں کا وہ محتاج ہے ان سب کے لیے اسے صرف اللہ سبحانہٗ کو اپنا ہادی سمجھنا چاہیے اور صرف اسی کی ہدایت کی پیروی کرنی چاہیے جو اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعے بھیجی ہے۔

یہ مثبت انداز ہے اس کے بعد منفی انداز فرمایا ہے لا تتبعوا من دونہ اولیاء اللہ کے سوا اپنے میں سے اور جنات میں سے اولیاء نہ بناؤ۔ یعنی اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی طرف ہدایت کے لیے رجوع کرنا اور اپنے آپ کو اس کی رہنمائی کے حوالے کر دینا انسان کے لیے بنیادی طور پر غلط کاری ہے۔ اس کا نتیجہ ہمیشہ تباہی کی صورت میں نکلا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ

> نبوت جو کچھ خدا کی جانب سے لے کر آئی ہے اس کو چھوڑ کر کسی اور سے تعلق پیدا نہ کرو اگر تم نے ایسا کیا تو تم حکم الٰہی سے ہٹ گئے اور غیر کے ہو گئے۔

اور زمخشری نے اس کا یہ مطلب بتایا ہے:

> شیاطین الانس والجن میں سے کسی سے ولایت کے روابط نہ رکھو وہ تم میں خواہشوں اور بدعتوں کی انگیخت کریں گے۔

اور علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ

> اپنے اس رب کو چھوڑ کر جس نے آسمان سے تمہارے لیے ہدایت نامہ روانہ کیا ہے شیاطین اور کاہنوں کی باتوں کو قبول نہ کرو وہ تم کو جادۂ حق سے ہٹا دیں گے اور بدعات و اہواء میں ڈال دیں گے۔

اس آیت میں قرآن نے اللہ اور انسان دونوں کی حیثیت متعین کر دی ہے۔ اللہ کی حیثیت رب ہونے کی ہے یعنی وہ صرف خالقیت، رزاقیت، حکمت و رحمت، رافت و محبت، عطا و بخشش اور عفو و درگزر جیسے کمالات ہی کا پیکر نہیں بلکہ ساتھ ہی وہ مدبر کائنات اور مالک الملک بھی ہے۔ مقتدر اعلیٰ اور شہنشاہ بھی ہے، ہادی اور قانون ساز بھی ہے۔ آمر و حاکم بھی ہے۔ اور انسان کی حیثیت مخلوق و مرزوق، مرحوم، مملوک، محکوم اور مامور کی ہے۔ یعنی مکمل باوفا، غلام، حقیقی فرمانبردار اور طاعت گزار رعیت ہی کی ہو سکتی ہے اور جب یہ دونوں حیثیتیں کھل کر اس آیت کے ذریعے سامنے آگئیں تو یہ بات خود بخود معلوم ہو گئی کہ اسلام بس دین نام ہے اللہ رب العالمین کی مکمل اور والہانہ اتباع و اطاعت کا اور اس کا لازمی اور بنیادی تقاضا یہ ہے کہ وہ طرز فکر وہ طرز عمل وہ ضابطہ زندگی مسائل حیات کے وہ حل اللہ تعالیٰ کی یاد اور پرستش کے وہ طریقے نیکی و خدا ترسی کے وہ تصورات اور فلاح و نجات کے وہ ذرائع جنہیں انسان کو اختیار کرنا ہے سب کے سب

اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح متعین اور منضبط شکل میں موجود ہوں کیونکہ طاعت کا تصور حکم کے تصور کو لازم ہے حکم کے بغیر اطاعت کا فعل وجود میں آ نہیں سکتا اس لیے بالبداہت ضروری ہے کہ اطاعت کا مطالبہ کرنے سے پہلے مطالبہ کرنے والے نے اپنے احکام بھی دیئے ہوں۔ اور چونکہ یہاں اتباع کا حکم ہے اور اتباع نام ہے قدم بقدم چلنے کا اس لیے ناگزیر ہے کہ حکم کے ساتھ اس پر عمل کا نمونہ بھی موجود ہو کیونکہ اگر نمونہ کوئی نہ ہو تو حکم اطاعت تو ہو سکتا ہے لیکن اتباع کا مطالبہ نہیں ہو سکتا۔ شاید حافظ ابن کثیر نے اسی وجہ سے آیت کی تشریح یہ فرمائی ہے

فتتبعوا آثار النبی الامی الذی جاءکم بکتاب انزل الیکم من رب کل شیئ وملیکہ

اس نبی امی کے نقش قدم پر چلو جو تمہاری طرف ہر چیز کے مالک اور بادشاہ کی جانب سے دستور لے کر آیا ہے۔

اگر قرآن کا مطالبہ اللہ کی کامل اتباع و طاعت ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ انسان کے سامنے اس کے وہ احکام بھی لازماً پوری تفصیل سے موجود ہوں جن کی اسے اطاعت کرنی ہے۔ اسی کو قرآن نے یہاں ما انزل فرمایا ہے یعنی وہ احکام و قوانین جو نبی خدا کی جانب سے لے کر آیا ہے۔ اسی تقاضے کے تحت قرآن نے یہاں یہ مطالبہ کیا ہے اور ساری انسانیت سے کیا ہے اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم اور ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ ولا تتبعوا من دونہ اولیاء یعنی اللہ کو چھوڑ کر کسی کی پیروی نہ کرو۔ یہاں قاضی ثناء اللہ پانی پتی بہت گہری بات لکھ گئے کہ من دونہ کی قید احترازی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کو ولایت کا پروانہ اللہ کی جانب سے نہیں ملا ہے ان کی اطاعت نہ کرو اور جن کو ولایت کا پروانہ اللہ کی جانب سے ملا ہوا ہے جیسے انبیاء اور علماء ان کی اطاعت میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ ولایت کا پروانہ کیا ہے۔ قرآن نے خود ولایت کا پروانہ انذار و تذکیر کو قرار دیا ہے۔ انبیاء انذار و تذکیر کرتے ہیں اس لیے ان کی اطاعت کی جاتی ہے اور اس کے بعد امت میں وہ تمام طبقے جو نبوت کی نیابت میں امت میں انذار کا کام کرتے ہیں ان کی طاعت کی جاتی ہے ارشاد ہے:

فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون۔

ایسا کیوں نہ کیا گیا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکل آتی ہوتی کہ دین میں فہم و دانش پیدا کرے اور جب تعلیم و تربیت کے بعد اپنے گروہ میں واپس جاتی اور لوگوں میں انذار کا کام کرتی تاکہ لوگ برائیوں سے بچیں۔

اگر انذار ہو اور منذرین کی طاعت نہ ہو تو انذار میں کوئی معنویت نہیں رہتی ہے۔ حیرت ہے کہ لوگ

نے من دونہ کی ضمیر کا مرجع ماانزل اللہ قرار دے کر نبوت کے عمل سے گریز کی راہ تلاش کی ہے۔ ان کے اشتباہ کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں شرع اور وضع قانون کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تسلیم کیا گیا ہے کہ وہی اصل شارع ہے۔ اب اگر رسُول کے لیے بھی ماانزل اللہ سے الگ شرع بنانے کا حق تسلیم کیا جائے تو خدا کے سوا ایک اور شارع تسلیم کرنا ہوگا۔ پہلا جواب تو یہ ہے کہ ہم رسُول کو شارع نہیں مانتے بلکہ کتاب الٰہی کا شارح مانتے ہیں، کیا عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر جج جب حکومت کے قانون کی توضیح و تشریح کرتا ہے تو وہ اپنے عمل سے سلطانِ وقت بن کر واضع قانون کا منصب اختیار کر لیتا ہے یا صرف قانون کے مفہوم کا شارح ہوتا ہے۔ یہی حیثیت آسمانی عدالت کے اس قاضی کی ہے جس کو ہم نبی اور رسُول کہتے ہیں قرآن کی اس آیت کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ ماانزل اللہ کی نبوت کی بتائی ہوئی تشریح، تعلیم اور تبیین پر عمل نہ کرو۔ ایسا کہنا قرآن کا انکار اور عقل و فہم کا ماتم ہے۔

یہاں یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ جو لوگ ہنوز نبوت کے منکر ہوں ان سے رسُول کا تعلق صرف تبلیغ و نصیحت پند و موعظت اور سمجھانے کا ہوتا ہے لیکن جو خوش قسمت اقرارِ نبوت کی سعادت حاصل کر لیں تو پھر ان کا تعلق رسُول سے اُمتی کا ہو جاتا ہے۔ اب رسُول اس کے لیے حاکم، قاضی، مطاع، متبوع، معلم، مبین، مذکر، مبشر، محلل، محرم، آمر، ناہی، داعی، شاہد اور ہادی ہوتا ہے۔ کوئی حکومت دوسرے ملک کے کسی باشندے کو زبردستی اپنی رعایا نہیں بناتی لیکن اگر کوئی از خود اس کی حکومت کا شہری بن جاتے تو پھر اس کو اس کے قانون کی پیروی پر بزور مجبور کیا جائے گا اور کہا جائے گا۔

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ

منکرین سے متعلق مخاطباتِ قرآنی میں مومنین کے واجبات تلاش کرنا بہت بڑی زیادتی اور روح خطاب سے بے خبری ہے۔

اور اس سے زیادہ حیرت ان پر ہے جنہوں نے اس آیتِ قرآنی سے ائمہ اربعہ کی تقلید کے حرام ہونے اور قیاس و اجتہاد کے باطل ہونے پر استدلال کیا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں حافظ ابن حزم کا یہ دعویٰ نقل کیا ہے کہ تقلید حرام ہے اور ان کی زبانی اس دعویٰ کے لیے اس آیت کو دلیل بنا کر پیش کیا ہے۔ حالانکہ اس ارشادِ گرامی کا اس دعویٰ سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے دراصل ان بزرگوں پر عبادت اور طاعت کے بارے میں قرآن کا نقطہ نظر واضح نہیں ہے۔ یہ دونوں کو ایک سمجھ بیٹھے ہیں حالانکہ از روئے قرآن دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ عبادت تقاضئے محبت ہے محبت میں نیابت نہیں ہے اس لیے عبادت خدا کے علاوہ نہ رسُول کی ہو سکتی ہے اور نہ کسی اور کی برخلاف طاعت کے کہ وہ تقاضائے حاکمیت ہے اور سب جانتے اور مانتے ہیں کہ حاکمیت میں خلافت ہے۔ نبی کو براہِ راست خلافت ملتی ہے اس لیے

نبی کی طاعت کی جاتی ہے اور ارباب علم نبوت کی پیروی کی وجہ سے خلافت ملتی ہے اس لیے ان کی مشروط طاعت کی جاتی ہے۔ پورا قرآن پڑھ جائیے آپ کو یہ بات کہیں نہ ملے گی۔ اعبدوا اللہ و رسولہ لیکن یہ بات آپکو قدم قدم پر ملے گی اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول بلکہ اس سے بھی آگے یہ بات بھی آپ قرآن میں پڑھیں گے اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم قانون کی حدود میں علماء کے اجتہاد و قیاس کی حیثیت مثبت کی نہیں بلکہ مظہر کی ہے یعنی یہ منشاء الٰہی کو ظاہر کرتے ہیں اور بس۔

آخر میں فرمایا ہے قلیلا ما تذکرون اس کے دو معنے ہیں تم بہت تھوڑی نصیحت قبول کرتے ہو یا یہ کہ بہت تھوڑے وقت کے لیے مانتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تم میں اکثریت نصیحت قبول نہ کرنے والوں کی ہے حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس آیت میں یہی بتایا گیا ہے کہ اکثریت دنیا میں باطل پرستوں کی ہے اور اس کی حیثیت وہی ہے جو قرآن میں ان آیات کی ہے وما اکثر الناس ولو حرصت بمومنین دنیا میں لوگوں کی اکثریت ایمان سے خالی خواہ کیسے ہی ان کے ایمان خواہش کریں۔ یہ بھی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خطاب کفارِ قریش سے ہے۔

انذار کے لیے تاریخ کی گواہی

۴۔ اور دیکھو کتنی بستیاں ہیں جن کو ہم نے تہس نہس کر دیا۔ پھر ایسا ہوا کہ لوگ رات کو سو رہے تھے یا دن کو قیلولہ کر رہے تھے کہ ہماری گرفت آگئی، جب ان پر عذاب آیا اس وقت ان کی پکار اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ بلا شبہ ہم ظلم کرنے والے تھے۔ یعنی جب ان کے ظلم و عصیان اور کفر و عدوان کی حد ہو چکی تو دنیا کی لذات و شہوات میں منہمک اور عذاب الٰہی سے بالکل بے فکر ہو کر خوابِ استراحت کے مزے لینے لگے کہ یکایک ہمارے عذاب نے آدبوچا۔ پھر ہلاکت آفرینیوں کے اس دہشتناک منظر اور ہنگامہ دار و گیر میں سارے طمطراق بھول گئے۔ چاروں طرف سے انا کنا ظالمین کی چیخ و پکار کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ گویا اس وقت انہیں واضح ہوا اور اقرار کرنا پڑا کہ خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا ہم خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ فجاءھا بأسنا کی فاء میں مفسرین کے کئی قول ہیں۔ غالباً حضرت شیخ الہند نے اپنے ترجمہ میں اس کو اھلکناھا کی تفسیر و تفصیل قرار دیا ہے جیسے کہا جاتے توضاء فغسل وجھہ و ذراعیہ فلاں شخص نے وضو کیا تو چہرہ اور ہاتھ دھوئے۔ اس مثال میں منہ ہاتھ اور ہاتھ دھونا وضو کرنے کی تفصیل و تفسیر ہے۔ اسی طرح یہاں ہلاک کرنے کی تفسیر و تفصیل کیفیتِ عذاب کے بیان سے ہوتی [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں اس انذار کے لیے جس کا ذکر نبوّت کے مقاصد میں پہلے ہوا ہے ایک تاریخی شہادت پیش کی گئی ہے اور آگاہ کیا گیا ہے کہ آج بھی یہ تاریخ دُہرائی جا سکتی ہے۔ آیت میں لفظ قریہ لایا گیا ہے۔ اس کا اطلاق بستی پر بھی ہوتا ہے اور بستی والوں پر بھی اور لفظ کم خبریہ بہات کے معنے بتانے کے لیے آیا ہے یعنی بہت سی بستیاں ہیں جن کو ہم نے انبیاء کی تکذیب کی پاداش میں ہلاک کر دیا۔ یعنی تمہاری عبرت کے لیے ان قوموں کی مثالیں موجود ہیں جو نبوّت کی تکذیب کر کے انسانوں اور شیطانوں کی قیادت میں چلتی رہی ہیں اور اس قدر بگڑ یں کہ زمین پر ان کا وجود ناقابلِ برداشت لعنت ہو گیا اور خدا کے عذاب نے ان کو تباہ کر دیا۔ اور خدا کا یہ عذاب دو طرح سے آیا ایک تو یہ کہ رات کے وقت میں آیا جیسے قوم لوط پر آیا، دوسرے یہ کہ دوپہر کو آیا جیسے قوم شعیب پر آیا، یہ دونوں وقت آرام و استراحت کے ہیں پہلے کے لیے بیاتا اور دوسرے کے لیے قائلون کی تعبیر آئی ہے اس میں اشارہ ہے کہ عقلمند کو رات کے سکون اور دن کے آرام میں غافل نہ ہونا چاہیے۔ ان اوقات کے بیان کرنے سے عذاب کے اوقات بتانا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا کا عذاب شب کی تاریکیوں میں چپ چپاتے اور دن میں ڈنکے کی چوٹ آجاتا ہے نہ اس کو کوئی روک سکتا ہے اور نہ کوئی اس سے بچ سکتا ہے صرف وہ بچتا ہے جس کو اللہ بچائے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے بھی نبوّت کی پیروی نہ کی تو یہی حشر تمہارا بھی ہونا ہے۔

اس میں اشارہ ہو گیا تلافی کا وقت گزر جانے کے بعد ہوش میں آنا اور اپنی غلطی کا اعتراف کرنا بے کار ہے سخت نادان ہے وہ شخص اور وہ قوم جو خدا کی دی ہوئی مہلت کو غفلتوں اور سرشاریوں میں ضائع کر دے اور داعیانِ حق کی آواز کو بہرے کانوں سے سُنتے جاتے اور ہوش میں صرف اس وقت آئے جب اللہ کی گرفت کا مضبوط ہاتھ اس پر پڑ جاتے۔

اور اس میں مخاطبوں کو یہ تنبیہہ بھی ہے کہ افراد کی زندگیوں میں بھی اور اقوام کی زندگیوں میں بھی ایک دو نہیں بے شمار واقعات تمہارے سامنے گزر چکے ہیں کہ جب کسی کی غلط کاریوں کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور وہ اتنی مہلت کی حد تک پہنچ جاتا ہے تو پھر خدا کی گرفت اچانک آجاتی ہے اور ایک بار پکڑ میں آنے کے بعد چھٹکارے کی کوئی سبیل نہیں ملتی۔ پھر جب تاریخ کے دوران ایک بار نہیں سینکڑوں اور ہزاروں بار بھی کچھ ہو چکا ہے تو آخر کیا ضروری ہے کہ انسان اسی غلطی کا بار بار اعادہ کیے چلا جاتے اور ہوش میں آنے کے لیے اس آخری ساعت کا انتظار کرتا ہے جب ہوش میں آنے کا کوئی فائدہ حسرت و اندوہ کے سوا نہیں ہوتا۔[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝
فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ
الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝
وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۝

پس ضرور بالضرور ہم ان لوگوں سے دریافت کریں گے جن کی طرف خدا کی جانب سے رسول روانہ کیے گئے اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے[۴]۔ پھر یقیناً ہم ساری سرگزشت پورے علم کے ساتھ ان کو سنائیں گے اور ہم غائب نہ تھے[۵]۔ اور اس دن اعمال کا وزن برحق ہے پھر جس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگا تو کامیابی ان کی ہی ہوگی اور جن کا پلہ ہلکا ہوگا تو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کیا کیونکہ ہماری آیات کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتے تھے۔

معانی مفردات

لَنَقُصَّنَّ قص یقص مضارع بانون تاکید کا جمع متکلم ہے۔ قصص مصدر ہے اگر اس کے بعد علیٰ آئے تو واقعہ بیان کرنے کے معنے ہوں گے جیسے یہاں ہے ورنہ اس کے معنی نقش قدم پر چلنا اور پیروی کرنا ہیں۔ اسی سے قصاص اس بدلہ کو کہتے ہیں جو اصل جرم کے برابر ہو یعنی اصل جرم کا نقشِ قدم ہو۔ علمٌ، علم، دانش، جاننا، یہ علم یعلم کا مصدر ہے۔ علم حق سبحانہٗ کی ایک صفت قدیم ہے جو ازل سے ذاتِ الٰہی کے ساتھ قائم ہے لہٰذا جہل کا ہونا اس کے حق میں محال ہے۔ ثَقُلَتۡ، ثقل سے ماضی ہے جس کے معنے گرانبار ہونے کے ہیں۔ اسی سے ثقیل گراں اور بھاری کو کہتے ہیں اسی کی جمع ثقال آتی ہے۔ موازینٌ میزان کی یا موزون کی جمع ہے ترازو یا وزن کیے جانے والے اعمال۔ اس کا مصدر وزن آتا ہے اس کے معنے تولنے کے ہیں کسی چیز کی مقدار کی پہچان عوام کے نزدیک کسی چیز کو ترازو سے تولنے کو وزن کرنا کہتے ہیں (راغب) خفتۡ، اس کا مصدر خفتہ ہے اس کے معنے ہلکا ہونا ہے اسی سے صفت کا صیغہ خفیف ہے اس کی جمع خفاف آتی ہے۔

آخرت کی بازپرس اور جزاء

قرآن نے حقائق کی دو قسمیں کی ہیں ایک وہ جن کا تعلق عالم غیب سے ہے اور دوسرے وہ جن کا تعلق عالم شہادت سے۔ اس عالم طبیعت سے پہلے اور عالم طبیعت کے بعد جو کچھ ہے اس کا تعلق عالم غیب سے ہے یہ ہمارے محسوسات کی سرحد سے باہر ہے۔ یہاں سے قرآن نے مابعد الطبیعت کا تعارف پیش کیا ہے، اس کے بعد دوسرے رکوع میں مافوق الطبیعت کے چہرے سے نقاب اٹھائے گا ما قبل الطبیعت ہو یا مابعد الطبیعت دونوں کا تعلق عالم غیب سے ہے، جسے ہم آخرت کہتے ہیں۔ اس کا تعلق مابعد الطبیعت سے ہے۔ اس عالم میں جو کچھ ہوگا وہ اگرچہ ہمارے ادراک سے بالا ہے تاہم چونکہ فہم انسانی کی مجبوری کی وجہ سے وہ اسی زبان و محاورات میں ادا کیا گیا ہے، جو اس مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہیں اس لیے یہ الفاظ جن مادی خصائص کو مستلزم ہیں باہم ان کے دیکھنے اور سننے کے اس دنیا میں عادی ہوگئے ہیں۔ ان لفظوں کو سن کر بعینہٖ وہی سمجھنا چاہتے ہیں جو اس دنیا میں ان لفظوں سے سمجھتے رہے ہیں اسی وجہ سے بعض کم فہم وہاں کے

وقائع واحوال کا بیان سن کر ان میں سے بعض کو محال اور ناممکن کہہ اٹھتے ہیں اور بعض ان کی تشریح و تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ لفظ و معنے میں ادنیٰ اشتراک بھی باقی نہیں رہتا۔ یہ دونوں راستے سخت خطرناک ہیں۔ اسی لیے قرآن عزیز نے ان نازک و دقیق عالم غیب سے تعلق رکھنے والے اسرار کے بیان میں انسانی فطرت کی کمزوریوں کا پورا لحاظ کیا ہے۔ اس نے نہ تو یہودیوں کی طرح ان واقعات کو سرتاپا مادی کہہ کر عالم آخرت کو عالم آب و گل بنادیا ہے اور نہ عقل و خرد کے بعض نادان مدعیوں کی طرح ان کو مادے سے اتنا بلند و برتر کر دیا ہے کہ ان کا وجود ہی موہوم اور فرضی ہو گیا ہے بلکہ انسانی عقلوں کے اختلاف مراتب کا لحاظ کر کے بزم کے اہلِ نظر اور تماشائیوں دونوں کو تشفی اور تسکین کا سامان کیا ہے۔

۴۔ پس ضرور بالضرور ہم ان لوگوں سے دریافت کریں گے جن کی طرف خدا کی جانب سے رسول روانہ کیے اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے۔ یعنی جن امتوں کی طرف پیغمبر مبعوث ہوتے ان سے سوال ہو گا ماذا اجبتم المرسلین تم نے ہمارے پیغمبروں کی دعوت کو کہاں تک قبول کیا تھا اور خود پیغمبروں سے پوچھیں گے ماذا اجبتم تم کو امت کی طرف سے کیا جواب ملا تھا[1]

یہی اس سورت کا مرکزی موضوع ہے۔ اصل دعوت جو اس سورت میں دی گئی ہے وہ یہی ہے کہ انسان کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے نبوت کی ضرورت ہے جو علم اسے درکار ہے اور اخلاق، تہذیب، معاشرت، اور تمدن کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جن اصولوں کا وہ محتاج ہے ان سب کے لیے اسے نبوت سے استفادہ کرنا چاہیے اور صرف اسی کی رہنمائی کو قبول کرنا چاہیے۔ اسی کی روزِ قیامت بازپرس ہوگی۔ نون تاکید کے ساتھ بات اس لیے کہی کہ عرب کے مخاطب اوّل دعوت میں نبوت کے ایسے ہی منکر تھے جیسے وہ قیامت کے منکر تھے۔ تمام امتوں کے ہر فرد سے دریافت کیا جائے گا کہ رسول کی دعوت پر کہاں تک عمل کیا۔ دوسری آیات میں اس اجمال کی تفصیل آئی ہے۔ سورۃ انعام میں اسی جلد میں گزر چکا ہے کہ پوچھا جائے گا الم یاتکم رسل منکم یقصون علیکم آیاتی و ینذرونکم لقاء یومکم کیا تمہارے پاس خود تم میں سے وہ پیغمبر نہیں آئے تھے جو تم کو میری آیات سناتے تھے اور اس دن کے انجام سے ڈراتے تھے۔ اور سورہ قصص میں ہے کہ ویوم ینادیھم فیقول ماذا اجبتم المرسلین اور جس روز خدا ان کو پکارے گا اور پوچھے گا کہ جو رسول بھیجے گئے تھے انہیں تم نے کیا جواب دیا تھا۔ یعنی خدا نے جو رسول تمہاری ہدایت کے لیے بھیجے تھے ان کی دعوت کا تم نے کیا جواب دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ سوال امت سے جرم کی سنگینی ظاہر کرنے کے لیے ہوگا کہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اللہ سبحانہ نے تمہاری ہدایت کا یہ سامان کیا کہ اپنے رسول بھیجے کہ ہر پہلو سے تم پر حق واضح ہو جائے بتاؤ تم نے اس اہتمام کی کیا قدر کی۔ اور صرف یہی سوال نہ ہوگا بلکہ قرآن و سنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف نوعیتوں کے سوالات ہوں گے اگرچہ تفصیلات اپنے موقعہ پر آئیں گی لیکن سردست اجمالی بات سن لیجیے۔ سورۃ نحل میں ہے تاللہ لتسئلن عما کنتم تفترون بخدا تم سے اس بارے میں ضرور باز پرس ہوگی کہ تم حقیقت کے خلاف کیسے افترا پردازیاں کرتے رہے۔ یہی بات سورہ عنکبوت میں دہرائی ہے ولیسئلن یوم القیامۃ عما کانوا یفترون؟ ان سے ان کی افترا پردازیوں کے بارے میں ضرور پوچھا جائے گا۔ یعنی ان بدعتوں کے بارے میں دریافت کیا جائے گا جو انہوں نے ایجاد کیں لیکن ان کو منسوب اللہ کی طرف کیا اور ان کی حمایت میں اتنا غلو کیا کہ ان کو ہی مدار نجات بنا دیا۔ یہ بزرگوں کی نذریں، قبروں کے چڑھاوے، ان پر سالانہ میلے، ان کے نام کے بکرے اور چڑھاوے جو قبور کی کرتے ہیں۔ اور سورۃ نحل ہی میں تعمیم کے ساتھ ذکر ہے لتسئلن عما کنتم تعملون اور سورہ حجر میں ہے کہ فو ربک لنسئلنھم اجمعین تیرا پروردگار شاہد ہے کہ ان سب سے ضرور ان کے اعمال کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ احادیث میں اس موضوع پر بہت بڑی تفصیلات آئی ہیں۔ مثلاً عبداللہ بن عمر کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

تم سب نگران ہو سب سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا سربراہ مملکت سے شہریوں کے بارے میں، مرد سے اہل و عیال کے بارے میں، بیوی سے شوہر کے گھر کے بارے، غلام سے آقا کے مال کے بارے میں۔

طبرانی میں حضرت انس بن مالک کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

تم سب راعی ہو سب سے اپنی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا لہٰذا سوالات کے لیے جواب کی تیاری کرو، صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ جواب کیا ہے فرمایا نیک کام اور نیکیاں۔

طبرانی نے کبیر میں حضرت مقداد کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قوم کا ہر سربراہ روز قیامت اس طرح پیش ہوگا کہ ہاتھ میں جھنڈا لوگ اس کے پیچھے ہوں گے سربراہ سے لوگوں کے بارے میں اور لوگوں سے سربراہ کے بارے میں سوال ہوگا۔

طبرانی نے اوسط میں حضرت انس کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضور انور کا ارشاد ہے:

روز قیامت سب سے پہلا سوال بندے سے نماز کے بارے میں ہوگا۔

امام مسلم نے عبداللہ بن مسعود کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضور انور نے فرمایا:

روزِ قیامت سب سے پہلے فوجداری معاملات کا فیصلہ کیا جائے گا۔

یعنی قیامت کے دن سب سے پہلے جس معاملہ کا فیصلہ کیا جائے گا وہ انسان کا خون ہے۔ نماز کے بارے میں سب سے پہلے سوال اور انسانی خون کے بارے میں سب سے پہلے فیصلہ دونوں میں کوئی تعارض نہیں جن کاموں میں محاسبہ ہوگا ان میں اولیت نماز کو دی جائے گی اور جن کاموں کا فیصلہ کیا جائے گا ان میں اولیت انسانی خون کی ہوگی۔ محاسبہ اور قضا میں جوہری فرق ہے۔ امام ترمذی نے حضرت ابو برزۃ الاسلمی کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

> کوئی شخص اس وقت تک اپنی جگہ سے نہ ہٹے گا جب تک چار سوالوں کے جواب نہ دے چکے گا، اول عمر کو کس چیز میں گنوایا، دوسرے علم پر کس قدر عمل کیا، تیسرے مال کی آمدنی اور خرچ کی مدات، چوتھے جسم کے بارے میں کاہے میں لگایا۔

ایک طرف اُمتوں سے سوال ہوگا۔ اُمتِ دعوت سے بھی اور اُمتِ اجابت سے بھی۔ اُمتِ دعوت سے سوال ہوگا کہ رسولوں کی دعوت کو کہاں تک قبول کیا اور اُمتِ اجابت سے سوال ہوگا کہ قبول کر لینے کے بعد ایمان کے تقاضے کہاں تک پورے کیے اور پھر اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جہاں ایک ایک فرد کو اپنی انفرادی ذمہ داریوں کے بارے میں جوابدہی کرنی ہوگی وہیں پوری اُمت کو ایک اُمت کی حیثیت سے بھی اپنی اجتماعی جوابدہی کرنی پڑے گی۔ پھر یہ بھی معلوم رہنا چاہیے کہ یہ جوابدہی کوئی معمولی جوابدہی نہ ہوگی بلکہ کچھ اس طرح کی ہوگی جس طرح انبیاء علیہم السلام کی ان کی اپنی اپنی پیغمبرانہ حیثیتوں میں ہوگی کیونکہ اُمتِ محمدیہ اگرچہ اصطلاحی طور پر پیغمبر نہیں مگر پیغمبروں کا فریضہ ضرور رکھتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح عام لوگوں سے ان کے اپنے فرض کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے انبیاء کی دعوت کا کیا جواب دیا تھا اسی طرح خود انبیاء سے بھی پوچھا جائے گا کہ انہوں نے اللہ کا دین لوگوں تک کس طرح پہنچایا تھا اور اس کا انہیں کیا جواب ملا تھا۔ اُمتِ مسلمہ ایک پیغمبر کی سی ذمہ داریاں رکھتی ہے تو اس اصولی اعلان کا کھلا تقاضا یہ ہے کہ وہ سوال اس سے بھی ہو جو پیغمبروں سے ہونے والا ہے اور اس سے پوچھا جائے کہ ہمارے بندوں کے سامنے تو نے ہمارے دین کی شہادت کس طرح دی تھی اور انہوں نے اس کا کیا جواب دیا تھا۔

ایک سوال کا جواب

ممکن ہے کہ آپ یہاں اپنے ذہنوں میں یہ خلش محسوس کریں کہ یہ آیت بتا رہی ہے کہ لوگوں سے عام سوال ہوگا لیکن قرآن کی دوسری آیات بتاتی ہیں کہ مجرموں سے ان کے گناہوں کے بارے میں سوال نہ ہوگا۔ سورہ رحمان

یں ہے فیومئذ لا یسئل عن ذنبہ انس ولا جان۔ شارحین قرآن نے اس کے متعدد جواب دیے ہیں۔ مثلاً یہ کہ قیامت میں مختلف مواقف اور مناظر ہوں گے مثلاً یہ کہ قبر سے اٹھتے وقت سوال نہ ہوگا بعد میں ہونا اس کے منافی نہیں یا یہ کہ معلومات حاصل کرنے کے لیے سوال نہ ہوگا ہاں بطور توبیخ ضابطہ کا سوال ہوگا لیکن اصل یہ ہے کہ جس آیت میں سوال نہ کرنے کا ذکر ہے یعنی سورہ رحمان کی آیت فیومئذ لایسئل وہ اپنی جگہ بے غبار ہے کیونکہ وہاں خود قرآن نے اس سوال کا جواب دے دیا ہے کہ سوال کیوں نہ ہوگا فرمایا اس لیے کہ یعرف المجرمون بسیماھم یہ استیناف بیانی ہے یعنی اس لیے نہ ہوگا کہ مجرم وہاں اپنے چہروں سے پہچانے جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس عظیم الشان مجمع میں جہاں تمام اولین وآخرین جمع ہوں گے یہ پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ کون لوگ مجرم ہیں نہ کسی شخص سے یہ دریافت کرنے کی ضرورت ہوگی کہ وہ مجرم ہے یا نہیں۔ مجرموں کے سیاہ چہرے ان کی خوفزدہ آنکھیں، ان کی پست آوازیں اور ان کے چھوٹتے ہوئے پسینے خود ہی یہ راز فاش کرنے کے لیے کافی ہوں گے کہ یہ مجرم ہیں۔

اس آیت میں سوال کے لیے امتوں اور رسولوں کا تقابلی مطالعہ اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ معلوم ہو جائے کہ آخرت کی بازپرس کا مرکزی نقطہ رسالت ہی ہوگا۔ ایک طرف انبیاء سے دریافت کیا جائے گا کہ تم نے نوع انسانی کو خدا کا پیغام پہنچانے کے لیے کیا کچھ کیا دوسری طرف جن لوگوں تک خدا کے رسولوں کا پیغام پہنچا ان سے سوال ہوگا کہ اس پیغام کے ساتھ تم نے کیا برتاؤ کیا۔ جس شخص یا جن انسانی گروہوں تک انبیاء کا پیغام نہیں پہنچا ان کے بارے میں تو قرآن ہمیں کچھ نہیں بتاتا کہ ان کے مقدمہ کا کیا فیصلہ کیا جائے گا۔ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ محفوظ رکھا ہے لیکن امتِ مسلمہ کی دوسری امتوں کے مقابلے میں قرآن نے خود ذمہ داریاں بتائی ہیں کہ:

ھو اجتباکم وماجعل علیکم فی الدین من حرج ملۃ ابیکم ابراھیم ھو سماکم المسلمین من قبل وفی ھذا لیکون الرسول شھیداً علیکم وتکونوا شھداء علی الناس۔

اس نے تمہیں چن لیا ہے تمہارے لیے دین میں کسی طرح کی تنگی نہیں رکھی، وہی طریقہ اپناؤ جو تمہارے باپ ابراہیم کا تھا۔ اس نے تمہارا نام مسلم رکھا پچھلے وقتوں میں بھی اور اس قرآن میں بھی تاکہ رسول تمہارے سامنے حق کی گواہی دینے والا ہو اور تم تمام انسانوں کے سامنے حق کی گواہی دینے والے ہو جاؤ۔

اگر یہ حقیقت ہے اور حقیقت نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جبکہ قرآن کی چیختی ہوئی صدا یہی ہے کہ اس

اُمت کو نبوت کا کام سونپا گیا ہے تو اس کا واضح اور صاف مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں تک انبیاؑ کا پیغام نہیں پہنچا ہے ان کے بارے میں اس اُمت سے پوچھا جائے گا کہ ان کو پیغام کیوں نہیں پہنچایا تم نے اپنے فرض میں کیوں کوتاہیاں کی ہیں۔ آج دُنیا میں ساری انسانیت کا بوجھ اس اُمت کے کاندھوں پر ہے۔ غور کیجئے اگر اُمت نے اپنے اس فرض کو ادا نہ کیا تو کتنی سخت ہوگی اس کے لیے وہ گھڑی اور کتنی مشکل ہوگی جوابدہی۔

علمِ کامل اور علمِ صادق پر مبنی اطلاع

۵۔ پھر ہم یقیناً ساری سرگزشت پورے علم کے ساتھ ان کو سنا دیں گے اور ہم غائب نہ تھے۔ یعنی تمہارا کوئی جلیل و حقیر اور قلیل و کثیر عمل یا ظاہری و باطنی حال ہمارے علم سے غائب نہیں۔ ہم بلا توسط غیرے ذرہ ذرہ سے خبردار ہیں۔ اپنے اس علم ازلی محیط کے موافق سب اگلے پچھلے احوال تمہارے سامنے کھول کر رکھ دیں گے ملائکہ اللہ کے لکھے ہوئے اعمال نامے بھی علمِ الٰہی کے سرمو خلاف نہیں ہو سکتے۔ ان کے ذریعہ سے اطلاع دینا محض ضابطہ کی مراعات اور نظامِ حکومت کا مظاہرہ ہے ورنہ خدا اپنے علم میں ان ذرائع کا معاذ اللہ محتاج نہیں ہو سکتا[1]

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جب اُمتوں سے یہ سوال ہوگا کہ ماذا اجبتم المرسلین؟ تم نے انبیاؑ کی دعوت کہاں تک قبول کی تو اس وقت انہیں کوئی جواب نہ آئے گا فعمیت علیھم الانباء یومئذٍ اور باہم بھی کچھ پوچھ نہ سکیں گے فھم لا یتساءلون لیکن جب انبیاؑ سے دریافت کیا جائے گا ماذا اجبتم کہ تمہاری دعوت کو ان لوگوں نے کہاں تک شرفِ قبول بخشا تو انبیاؑ جواب میں فرمائیں گے لا علم لنا انک انت علام الغیوب یعنی آپ کے علمِ کامل و محیط کے سامنے ہمارا علم ہیچ ہے جو کچھ ہمیں علم ہے وہ بھی اپنی زندگی تک کا ہے اور زندگی میں ان کے ظاہر کا۔ آپ کی ذات گرامی تو علام الغیوب ہے۔ آپ تو ہمارے بعد کے حالات سے اور ان کے باطنی احوال سے واقف ہیں بلکہ جو کچھ ہمیں علم ہے اس کا بھی آپ کو علم ہے۔ اسی موقعہ پر اللہ سبحانہٗ نے ان کو ان کے تمام اعمال بتائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم رسولوں اور ان کی اُمتوں کو ساری گزری ہوئی رُوداد پورے علم و خبر کے ساتھ سنا دیں گے کہ ہمارے رسُولوں نے کس طرح حق تبلیغ ادا کیا اور ان کی تکذیب کرنے والوں نے جان بوجھ کر تکذیب کی۔ فرمایا کہ ہم ایک لمحہ کے لیے ان حالات سے بے تعلق یا بے خبر نہ تھے جو کچھ ہوا ہے ہمارے سامنے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس سے معلوم ہوا کہ قیامت میں سوال اس لیے نہ ہوگا کہ معلومات فراہم کی جائیں بلکہ اس لیے ہوگا کہ ان کو جتایا اور بتایا جائے۔ یعنی سوال استعلام کے لیے نہیں بلکہ اعلام کے لیے ہوگا۔ علیم کے بعد ما کنا غائبین کا اضافہ یہ بتانے کے لیے کہ علم الٰہی براہ راست ہوتا ہے اپنے ہونے کے لیے دلائل و سائل قرائن اور ذرائع کا محتاج نہیں ہوتا۔ اور جس کا علم بالذات ہو وہ ہر آن ہر لمحہ حاضر ناظر ہی ہوتا ہے وہاں غائب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وھو معکم اینما کنتم اللہ کے سوا سب کے علوم وسائل اور ذرائع کے ذریعے ہوتے ہیں انبیاء کا علم وحی کے ذریعے اولیاء کا علم الہام کے ذریعے، فقہاء کا علم اجتہاد کے ذریعے محدثین کا علم روایت کے ذریعے اور فلاسفر کا علم دلائل کے ذریعے ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر حاضر ناظر صرف وہ ذات ہے جس کا علم خود بخود ہو اور یہ اسی کا ہو سکتا ہے جس کی ذات خود بخود ہو۔ اب آپ ہی انصاف فرمائیں کہ خود بخود اللہ کے سوا کون ہے؟ اس لیے ماکنا غائبین یعنی حاضر ناظر ہونا بھی اس کی شان ہے باقی سب مخلوق میں چاہے ملائکہ ہوں یا انبیاء، کوئی بھی حاضر ناظر نہیں ہے۔ عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اے میرے یسوع میں ایمان رکھتا ہوں کہ تو ہر جگہ حاضر موجود ہے[1] اس کی تشریح میں پادری عماد الدین فرماتے ہیں یعنی یسوع ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں[2] افسوس کہ مسلمانوں میں سے شیعوں نے بھی اپنے ائمہ کے بارے میں یہی عقیدہ بنا لیا ہے ورنہ اہل اسلام کی رائے عامہ نے کبھی اس کو قبول نہیں۔ انشاء اللہ اس پر تفصیلی بحث معالم القرآن جلد ۲۲ میں آرہی ہے

اعمال کے وزن کے لیے اللہ کی میزان

۶ - اور اس روز اعمال کا وزن برحق ہے لہٰذا جن کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگا تو کامیابی ان کی ہی ہوگی اور جن کا پلہ ہلکا ہوگا تو یہی وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کیا کیونکہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ظالمانہ سلوک کرتے تھے۔ یعنی قیامت کے دن سب لوگوں کے اعمال کا وزن دیکھا جائے گا۔ جن کے اعمال قلبیہ اور اعمال جوارح وزنی ہوں گے وہ کامیاب ہیں اور جن کا وزن ہلکا ہوگا وہ خسارے میں ہے حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہر شخص کے عمل وزن کے مطابق لکھے جاتے ہیں ایک ہی کام ہے اگر اخلاص و محبت سے حکم شرعی کے موافق کیا اور بر محل کیا تو اس کا وزن بڑھ گیا اور اگر دکھاوے کو اور ریس کو کیا یا موافق حکم نہ کیا یا ٹھکانے پر نہ کیا تو وزن گھٹ گیا۔ آخرت میں وہ کاغذ ملیں گے جس کے نیک کام بھاری ہوتے تو برائیوں سے درگزر ہوا اور ہلکے ہوتے تو پکڑا گیا۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ اعمال جو اس وقت

---

[1] کیتھولک عبادت کی کتاب ص ۶۰ [2] تفتیش الاولیاء ص ۱۰۸

اعراض ہیں وہاں اعیان کی صورت میں مجسد ہوجائیں گے اور خود ان اعمال ہی کو تولا جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے اعمال تو غیر قار الذات اعراض ہیں جن کا ہر جزو وقوع میں آنے کے ساتھ ہی ساتھ معدوم ہوجاتا ہے۔ پھر ان کا جمع ہونا اور تلنا کیا معنے رکھتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ گراموفون میں آج کل لمبی چوڑی تقریریں بند کردی جاتی ہیں کیا وہ تقریریں اعراض میں نہیں؟ جن کا ایک حرف ہماری زبان سے اس وقت ادا ہو سکتا ہے جب اس سے پہلا حرف نکل کر فنا ہوجائے پھر یہ تقریر کا سارا مجموعہ گراموفون میں کیسے جمع ہوگیا۔ اسی سے سمجھ لو کہ جو خدا گراموفون کے موجد کا بھی موجد ہے اس کی قدرت سے کیا بعید ہے کہ ہمارے کل اعمال کے مکمل ریکارڈ تیار رکھے جس میں سے ایک شوشہ اور ذرہ بھی غائب نہ ہو۔ باقی رہا ان کا وزن کیا جانا تو نصوص سے ہمیں اس قدر معلوم ہوچکا ہے کہ وزن ایسی میزان کے ذریعہ ہوگا جس میں کفتیں (دو پلڑے) اور لسان وغیرہ موجود ہیں لیکن وہ میزان اور ان کے دونوں پلڑے کس نوعیت و کیفیت کے ہوں گے اور اس سے وزن معلوم کرنے کا طریقہ کیا ہوگا۔ ان باتوں کا احاطہ کرنا ہماری عقول و افہام کے احاطہ سے باہر ہے۔ اسی لیے ان کے جاننے کی ہمیں تکلیف نہیں دی گئی۔ ایک میزان کیا عالم غیب کی جتنی چیزیں بھی ہیں بجز اس کے کہ ان کے نام سن لیں اور ان کا کچھ اجمالی سا مفہوم جو قرآن و سنت نے بیان کردیا ہو عقیدہ میں رکھیں اس سے زیادہ تفصیلات پر مطلع ہونا ہماری حد پرواز سے باہر ہے کیونکہ جن نوامیس و قوانین کے تحت اس عالم کا وجود اور نظم و نسق ہوگا ان پر ہم اس عالم میں رہتے ہوئے کچھ دسترس نہیں پاسکتے۔ اسی دنیا کی میزانوں کو دیکھ لو کتنی قسم کی ہیں۔ ایک میزان وہ ہے جس سے سونا چاندی اور موتی تلتے ہیں ایک میزان سے غلہ اور سوختہ وزن کیا جاتا ہے۔ ایک میزان عام ریلوے سٹیشنوں پر ہوتی ہے جس سے مسافروں کا سامان تولتے ہیں۔ ان کے سوا مقیاس الحرارۃ اور مقیاس الہوا وغیرہ بھی ایک طرح کی میزان ہیں جن سے حرارت اور ہوا کے درجات معلوم ہوتے ہیں۔ تھرمامیٹر ہمارے بدن کی اندرونی حرارت کو جو اعراض میں سے ہے تول کر بتلاتا ہے کہ اس وقت ہمارے جسم میں اتنی ڈگری حرارت پائی جاتی ہے جب دنیا میں بیسیوں قسم کی میزانیں ہم مشاہدہ کرتے ہیں جن سے اعیان و اعراض کے اوزان و درجات کا تفاوت معلوم ہوتا ہے تو اس قادر مطلق کے لیے کیا مشکل ہے کہ ایک ایسی حسی میزان قائم کردے جس سے ہمارے اعمال کے اوزان و درجات کا تفاوت صورۃ و حساً ظاہر ہوتا ہو۔[1]

عالم آخرت کے حالات سمجھنے میں اشکالات اور اعتراضات اس لیے در پیش آتے ہیں کہ ہم وجود اور اس کے تمام موجودہ قوانینِ فطرت کو اس طرح لازم و ملزوم سمجھتے ہیں کہ جب کسی چیز کا تذکرہ کیا جائے تو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

معاً اس کی وہی خصوصیات و لوازم سامنے آئیں گے جن کے دیکھنے کے ہم اس دُنیا میں عادی ہیں۔ حالانکہ ارباب عقل نے یہ طے کر دیا ہے کہ اس موجودہ دُنیا کے معلولات و مسببات اور ان کے موجودہ علل و اسباب میں جو لزوم ہے وہ محض عادی ہے۔ یعنی اس لیے ایسا ہے کہ ہم ایسا دیکھتے ہیں یہ نہیں کہ اس لیے ایسا ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے اس بنا پر اگر صرف اتنی سی بات ذہن نشین کر لی جائے کہ موجودہ مادی دُنیا میں جو قوانینِ فطرت اور علل و اسباب اور ان کے نتائج کار فرما ہیں وہ صرف اسی عالم اور موجودہ دُنیا کے قوانین ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کوئی نئی دُنیا بنائے یا نیا عالم خلق کرے تو ضروری نہیں کہ یہی موجودہ قوانینِ فطرت وہاں بھی کار فرما ہوں بلکہ بالکل ممکن ہے کہ اس نئے عالم میں نئے قوانین پر عمل ہو۔ نئی خصوصیات کے جسم ہوں، نئی قسم کی زندگیاں، نئی قسم کی آگ ہو، نئے قسم کے باغ اور ان کے پھل ہوں، نئی قسم کی موجودات و مخلوقات ہوں۔ نئے علل و اسباب ہوں اور نئے قوانین فطرت ہوں۔ قرآن نے اس نئے عالم کے متعلق کہا ہے یوم تبدل الارض غیر الارض والسماوات، اب کون کہہ سکتا ہے کہ اس نئے زمین اور نئے آسمان میں بھی وہی مادی قانون جاری ہوں گے جو اس موجودہ زمین و آسمان میں جاری ہیں۔ اس بنا پر جسمانیت و مادیت کے وہ تمام اعتراضات اور آئندہ حیات کے متعلق وہ تمام اشکالات جو اس دُنیا اور اس کے قوانین کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں۔ اس ضروری تمہید کے بعد آیات کی تشریح گوش گزار فرمایئے۔ ارشاد ہے والوزن یومئذ الحق وزن کے معنے تولنے اور کسی چیز کی مقدار معلوم کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس روز اللہ سبحانہٗ انبیاء اور ان کی اُمتوں سے دریافت کرے گا اور اُمتوں کو جواب نہ آئے گا اور انبیاء لا علم لنا کا اعتراف کریں گے۔ اس روز وزن صرف حق کا ہوگا۔ ظاہر یہی ہے کہ الوزن الحق مبتدا و خبر ہے اور تعریف طرفین قصر کا فائدہ دے رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ روزِ قیامت جو وزن ہے وہ حق ہے اور جو حق ہے اسی کا وزن ہوگا۔ قیامت کے دن جو ترازو نصب ہوگی وہ حق کی مقیاس ہوگی۔ وہ بتائے گی کہ کسی عمل میں حق کا حصہ کتنا ہے گویا یہ ترازو اعمال میں حق معلوم کرنے کا آلہ ہوگی یہاں امام غزالی نے المضنون میں یہ بات خوب لکھی ہے۔

بدن کا روح سے تعلق یہاں کشف حقائق کے لیے ایک حجاب ہے۔ موت کے ساتھ یہ حجاب ہٹ جائے گا اور ہر شخص پر یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ اعمال میں قرب و بعدِ الٰہی کے لحاظ سے کس قدر تاثیر ہے۔ اعمال کی یہ تاثیر ہی مقدار بھی روزِ قیامت معلوم ہوگی۔ اللہ کی قدرت سے یہ بعید نہیں ہے کہ وہ کوئی ایسا آلہ ایجاد کر دے کہ پل جھپکنے میں مقادیر اعمال معلوم ہو جائیں۔ میزان تو نام ہی اس آلہ کا ہے جس کے ذریعہ کمی زیادتی معلوم ہو۔ اس عالم میں یہ میزانیں مختلف ہیں۔ ایک میزان وہ ہے جس سے آپ اشیا کا وزن کرتے ہیں۔ ایک اصطرلاب بھی میزان ہے جس سے فلاک کی حرکات اور اوقات معلوم ہوتے ہیں۔ ایک میزان مسطر بھی

ہے جس سے خطوط کا اندازہ ہوتا ہے ایک میزان عروض بھی ہے جس سے آوازوں کی حرکات معلوم ہوتی ہیں۔ اگر حقیقت میزان بھی کہ اس سے مقادیر معلوم ہوں۔ بوجھ کی مقدار، حرکت کی مقدار، مسافت کی مقدار، حرارت کی مقدار، ہوا کی مقدار، روزِ قیامت اللہ سبحانہ ایک ایسی میزان تخلیق فرمائیں گے جس سے حق کی مقدار معلوم ہوگی یعنی یہ بتائے گی کہ کس عمل میں حق کتنا ہے۔ جس میں جتنا ہوگا اتنا ہی وہ عمل وزن دار ہوگا اور فیصلہ جو کچھ بھی ہوگا وزن کے لحاظ سے ہوگا جن کے اعمال میں حق کی مقدار زیادہ ہوگی وہ کامیاب ہوں گے اور جن کے پلڑے مقدار حق سے ہلکے ہوں گے وہ خسارے میں ہوں گے۔

ان آیات میں اعمال کے اعتبار سے دو قسمیں بتائی ہیں ایک مفلحین دوسرے خاسرین۔ دونوں سے کون مراد ہیں۔ کچھ تو یہ کہتے ہیں کہ دونوں اہل ایمان ہیں کیونکہ کافروں کے اعمال کا وزن ہی نہ ہوگا۔ ارشاد ہے: لا نقیم لھم یوم القیامۃ وزنا "ہم قیامت کے روز ان کے لیے کوئی وزن قائم نہ کریں گے۔ حافظ ابن تیمیہ کا بھی یہی خیال ہے کہ ان الکفار لا یحاسبون کافروں کا کوئی حساب نہ ہوگا۔ علامہ آلوسی نے اسی کو اکثر کا مذہب بتایا ہے۔ اور کچھ کا خیال ہے کہ سب کے اعمال کا وزن ہوگا۔ دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت ہو قرآن نے یہاں ان لوگوں کا ذکر نہیں کیا جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی۔ ان کا بھرپور چہرہ اسی پارے میں اصحاب الاعراف کے نام سے آگے آرہا ہے۔ اگر آیت میں یہ تقسیم فرمانبردار اور نافرمان پر مشتمل ہے اور مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان گنہ گار اور نیکوکار کے اعمال کا وزن ہوگا۔ اور اگر آیت میں یہ تقسیم کافر اور مومن پر مشتمل ہے تو دونوں صورتوں میں بما کانوا بآیاتنا یظلمون کا متعلق بکفرھم محذوف ہوگا پہلی تقسیم کی صورت میں کفر سے کفر عملی مراد ہوگا اور دوسری تقسیم میں کفر سے کفر واقعی مراد ہوگا۔

ایک اہم سوال

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ وزن سے مراد کیا ہے۔ اس کے جواب میں علماء نے دو راہیں اختیار کی ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ وزن سے مراد عدل تام ہے اور کچھ فرماتے ہیں کہ وزن سے مقصود واقعی تولنا اور مقدار حق معلوم کرنا ہے۔ حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں لکھا ہے:

جمہور کا مذہب یہی ہے کہ واقعی وزنِ اعمال ہوگا لیکن کچھ یہ کہتے ہیں کہ وزن سے مقصود عدل ہے لیکن راجح مذہب جمہور ہے۔

اور جمہور جو وزن کے واقعی اور حقیقی ہونے کے قائل ہیں ان میں بھی کچھ اختلاف ہے۔ کچھ کہتے ہیں اعمال کا وزن ہوگا، کچھ کہتے ہیں نامہائے اعمال کا وزن ہوگا اور کچھ کہتے ہیں کہ ارباب عمل کا وزن ہوگا۔

اس میں بھی جمہور کا مذہب یہی ہے کہ نفس اعمال کا وزن ہوگا۔ اعمال اگرچہ اعراض ہیں اور قائم بالذات نہیں ہیں مگر روزِ قیامت اللہ تعالیٰ ان کو جسمانی لباس عطا فرماتے گا۔ امام محی الدین بغوی معالم التنزیل میں رقمطراز ہیں کہ:

حضرت عبداللہ بن عباس سے یہی مروی ہے کہ وزن اعمال کا ہوگا اور حدیث صحیح سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ارشاد ہے کہ روزِ قیامت سورہ بقرہ اور آلِ عمران دو بادل یا دو چھتریوں یا دو پرندوں کی طرح آویں گی اور ارشاد ہے کہ مومن کے پاس قبر میں ایک خوبصورت اور خوش رنگ خوشبودار جوان سامنے آتے گا تو مومن پوچھے گا کہ تو کون ہے وہ کہے گا کہ میں تیرا عمل صالح ہوں۔ اور ارشاد ہے کہ روز قیامت قرآن ایک نوجوان کی صورت میں آتے گا دریافت کیا جاتے گا کہ کون ہے؟ جواب ملے گا، میں وہ قرآن ہوں جو تجھے رات کو بیدار رکھتا اور دن کو پیاسا رکھتا تھا۔

جمال الدین قاسمی لکھتے ہیں کہ عناصر کی اس دُنیا میں جو اعمالِ اعراض ہیں وہ روزِ قیامت جواہر کے لباس میں ملبوس ہوکر آئیں گے۔ اور یہی موزوں ہوں گے۔

بعض کی رائے ہے کہ اعمال نہیں تولے جائیں گے بلکہ نامہائے عمل کا وزن ہوگا۔ اس کی تائید ترمذی اور مسند احمد میں اس ارشادِ نبوت سے ہوتی ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرو کے حوالہ سے آیا ہے کہ:

قیامت کے روز ایک شخص لایا جاتے گا جس کے ننانوے نامۂ اعمال کے طومار میزان کے ایک پلڑے میں رکھے جائیں گے اور طومار حد بصر تک ہوگا۔ اس کے بعد ایک کارڈ لایا جاتے گا جس میں لا الٰہ الا اللہ لکھا ہوگا۔ وہ شخص کہے گا کہ اے پروردگار ان طوماروں میں یہ کارڈ کیا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے گا، تجھ پر ظلم نہ ہوگا، پھر اس کارڈ کو ترازو کے دوسرے پلڑے میں رکھا جاتے گا اور وزن کیا جاتے گا تو گناہوں کے طومار والا پلڑا ہلکا ہو جاتے گا اور کارڈ والا پلڑا بھاری ہو جاتے گا۔

اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عمل نہیں بلکہ نامۂ عمل کا وزن ہوگا۔

کچھ علماء یہ کہتے ہیں کہ نہ عمل کا وزن ہوگا اور نہ نامۂ عمل کا بلکہ وزن خود صاحبِ عمل کا ہوگا۔ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے ارشادِ نبوت آتا ہے کہ،

روزِ قیامت ایک بھاری بھرکم موٹا آدمی پیش ہوگا مگر تول میں اللہ کے پاس ایک مچھر کے پَر سے زیادہ نہ ہوگا۔

مسند امام احمد میں حضرت عبداللہ بن مسعود کے مناقب میں حضور کا یہ ارشاد ہے کہ،

کیا تم عبداللہ بن مسعود کی باریک ٹانگوں پر حیران ہو بخدا یہ تو روزِ قیامت میزان میں اُحد پہاڑ سے زیادہ وزنی ہوں گی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روزِ قیامت میزان میں، صاحبِ عمل کا وزن ہوگا۔

حافظ ابن کثیر نے ان تینوں میں اس طرح مفاہمت کرائی ہے کہ حدیثوں میں تینوں کی موید ہے اس لیے تینوں باتیں درست ہیں کبھی نفسِ عمل کا وزن ہوگا کبھی نامۂ اعمال کو اور کبھی صاحبِ عمل کا وزن ہوگا۔

بہرحال جمہور کا مذہب یہی ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اکثر انسانوں کے اچھے یا بُرے دونوں قسم کے اعمال ہوتے ہیں۔ ایک قسم کا عمل کم ہوگا اور دوسرا زیادہ یا دونوں برابر۔ دو مادی چیزوں کے تفاضل اور گھٹ بڑھ کا علم ہم کو تولنے یا گننے سے ہوتا ہے اس لیے وزن سے عموماً عدل و انصاف حق اور ٹھیک ٹھیک کا مفہوم ادا کیا جاتا ہے۔ اعمالِ انسانی کے متعلق خدا نے فرمایا ہے کہ انسان کو اس کے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ ملے گا۔ جزاء وفاقا، اس برابری اور کمال عدل و انصاف کے مفہوم کو ترازو کی ناپ اور عدالت کی میزان کے استعارہ سے ادا کیا ہے۔ اس مفہوم میں یہ استعارہ قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ ایک جگہ ہے:

اللہ الذی انزل الکتاب بالحق والمیزان

وہ اللہ جس نے کتاب کو حق کے ساتھ اتارا اور میزان کو۔

یعنی کتابِ الٰہی حق کے ساتھ اتری ہے اور اسی کے ساتھ میزان بھی، جس سے مراد عدل ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نظامِ کائنات کی ہر چیز میں جو اعتدال کامل رکھا اس کو بھی میزان کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ ووضع المیزان۔

ان آراء میں سب سے زیادہ قابلِ ترجیح جمہور کی رائے ہے کہ نفسِ اعمال کو تولا جائے گا اور سلف صالحین کی اکثریت اسی کی قائل ہے اور اعمال اگرچہ بظاہر اس وقت اعراض ہیں روزِ قیامت ان کو اعیان اور اجسام کی صورت میں مجسم بنا دیا جائے گا اور خود نفسِ عمل کو میزانِ الٰہی میں رکھ کر تولا جائے گا۔

احادیث سے یہ ثابت ہے کہ قیامت کے روز ایک میزان ہوگی جس میں کفتیں دو پلڑے اور ایک زبان ہوگی۔ رہی یہ بات کہ اس میزان کے دو پلوں کی نوعیت اور کیفیت کیا ہوگی یا اس میں وزن معلوم کرنے کا طریقہ کیا ہوگا تو یہ چیزیں ہمارے احاطہ عقل اور سرحدِ ادراک سے بالا ہیں۔ عالمِ غیب سے متعلق باتوں کے ہم جاننے کے نہیں ماننے کے مکلف ہیں۔

کچھ بھی ہو قیامت میں جو فیصلہ بھی ہوگا وزن کے لحاظ سے ہوگا کسی دوسری چیز کا ذرہ برابر لحاظ نہ کیا

جاتے گا۔ وزنی کیفیت نیکیوں میں ہوگی اور بے وزنی برائیوں میں ہوگی اور اس میزان کے ذریعے قیامت میں انسانی زندگی کے سارے کارنامے دو حصوں میں تقسیم ہو جائیں گے با وزن اور بے وزن۔ با وزن صرف حق کو ماننا جانا اور حق کی پیروی میں حق ہی کی خاطر کام کرنا ہوگا۔ آخرت میں صرف یہی چیز وزنی اور قیمتی ہوگی۔ اس کے برعکس حق سے غافل ہو کر یا حق سے منحرف ہو کر انسان جو کچھ بھی اپنی خواہش نفس یا دوسرے انسانوں اور شیطانوں کی پیروی کرتے ہوئے کرتا ہے۔ وہ سب بے وزن ہوں گے۔ لہٰذا آخرت میں انسان کی فلاح اور کامرانی کا تمام تر انحصار اس پر ہوگا کہ اس کے کارنامۂ زندگی کے وزن دار اعمال اس کے بے وزن اعمال پر غالب ہوں۔ وہ شخص جس کے بے وزن اعمال اس کے تمام وزن دار کو دبالیں تو اس کا حال اس دیوالیہ تاجر کا سا ہوگا جس کی ساری پونجی خساروں کا بھگتان پورا کرنے میں صرف ہو جاتے اور پھر بھی کچھ نہ کچھ تقاضے باقی رہ جائیں۔ اس تقابلی مطالعہ سے حضرت مولانا تھانوی نے یہ خوب نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ اس مادی عالم میں جن لوگوں کی غالب حالت صلاح کی ہو انہیں صالح ہی سمجھا جائے گا۔

قرآن کی ان دو آیتوں کی رہنمائی یہ ہے کہ ہر فرد اور جماعت کو ویسے ہی نتائج ملیں گے جیسے کچھ اس کے ہوں گے۔ کامیاب انسان وہ ہوں گے جن کی بھلائیاں برائیوں سے زیادہ ہوں گی۔ نامراد وہ ہوں گے جن کی برائیوں کے وزن سے بھلائیاں دب جائیں گی۔ دُنیا میں اشیا کے موازنہ کے لیے ترازو کام دیا کرتا ہے۔ اسی طرح اعمال کے موازنہ کے لیے بھی اللہ سبحانہٗ نے ایک میزان مقرر کر دی ہے جس کی تول میں کبھی غلطی نہ ہوگی۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا
مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿١٠﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا
لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ
مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿١١﴾ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ
اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿١٢﴾
قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ
مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿١٣﴾ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿١٤﴾ قَالَ
اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿١٥﴾ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ
الْمُسْتَقِيْمَ ﴿١٦﴾ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ
اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿١٧﴾ قَالَ
اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَـَٔنَّ
جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿١٨﴾ وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ

فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٩﴾ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ
عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ
الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿٢٠﴾ وَ
قَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿٢١﴾ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا
ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ
الْجَنَّةِ ؕ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ
لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٢٢﴾ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ
اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ
الْخٰسِرِيْنَ ﴿٢٣﴾ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي
الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٢٤﴾ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَ
ع ٢ ١٥ ٩ فِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿٢٥﴾

اور بلاشبہ ہم نے ہی تمہیں زمین میں جگہ دی ہے اور زندگی کے
سروسامان مہیا کیے تم بہت ہی کم شکرگزاری کرتے ہو۔ اور
ہم نے ہی تمہیں پیدا کیا ہے پھر تمہاری شکل وصورت بنائی پھر
ہم نے فرشتوں سے کہا سجدہ کرو آدم کو سب نے سجدہ کیا
مگر ابلیس کہ سجدہ کرنے والوں میں سے نہ تھا، اللہ نے ابلیس
سے کہا کس بات نے تجھے سجدہ کرنے سے روکا جبکہ میں نے
حکم دیا تھا، اس نے کہا اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں
تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور تو نے اسے مٹی سے پیدا کیا ہے
فرمایا اُتر جا یہاں سے تیری یہ ہستی نہیں کہ یہاں رہ کر سرکشی کرے
یہاں سے نکل دُور ہو یقیناً تو ان میں سے ہے جو ذلیل وخوار ہیں۔
ابلیس نے کہا کہ مجھے اس وقت تک کے لیے مہلت دے جب
لوگوں کو اٹھایا جائے گا فرمایا، تجھے مہلت ہے۔ ابلیس نے

کہا کہ چونکہ تو نے مجھ پر راہ بند کر دی ہے تو اب میں بھی ایسا کروں گا
کہ تیری سیدھی راہ سے بھٹکانے کے لیے بنی آدم کی تاک میں بیٹھوں
سامنے سے، پیچھے سے، داہنے سے بائیں سے ان پر آؤں گا
اور تو ان میں سے اکثروں کو شکر گزار نہ پائے گا[۱۲]۔ خدا نے
فرمایا کہ یہاں سے نکل جا ذلیل اور ٹھکرایا ہوا، بنی آدم میں
سے جو کوئی تیری پیروی کرے گا تو میں ضرور ایسا کروں گا کہ
تم سب سے جہنم بھر دوں گا[۱۲]۔ اے آدم تو اور تیری بیوی دونوں جنت
میں رہو اور جس جگہ سے جو چیز پسند ہو شوق سے کھاؤ مگر دیکھو
اس درخت کے قریب بھی نہ جانا اگر گئے تو یاد رکھو کہ زیادتی
کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے[۱۲]۔ پھر شیطان نے ان دونوں
کو بہکایا تاکہ ان کے ستر جو ان سے چھپے تھے ان پر کھول دے
اس نے کہا کہ تمہارے پروردگار نے اس درخت سے جو تمہیں

روکا ہے تو صرف اس لیے کہ کہیں ایسا نہ ہو تم فرشتے بن جاؤ یا دائمی زندگی تمہیں مل جائے، اس نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ میں تم دونوں کی خیر خواہی سے نیک بات سمجھانے والا ہوں، بہرحال وہ ان کو فریب میں لے آیا[14]۔ پھر جونہی انہوں نے درخت چکھا تو اُن کے ستر اُن پر کھل گئے[15]۔ اور باغ کے پتے اُوپر تلے رکھ کر اپنے جسم پر چپکانے لگے[16]۔ اس وقت ان کے پروردگار نے کہا کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہیں روک دیا تھا اور کیا میں نے تم سے نہ کہہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے، ان دونوں نے عرض کیا پروردگار ہم نے اپنا نقصان کیا اگر تو نے ہمارا قصور نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہمارے لیے بربادی کے سوا کچھ نہیں[17]۔ فرمایا یہاں سے نکل جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، اب تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے اور یہ ایک خاص وقت تک وہاں سامان

زندگی سے نفع اٹھانا ہے اور فرمایا کہ تم اسی میں زندہ رہو گے اسی میں مرو گے اسی میں مرنے کے بعد نکالے جاؤ گے۔[۱۸]

معانی مفردات

مکنّا، جمع متکلم، ماضی معروف تمکین مصدر، ہم نے تم کو جماؤ عطا کیا۔ ہم نے تم کو اقتدار دیا۔ مکنۃ اشیانہ مکنات جمع ہے مکنٌ مکانۃ حاکم کے پاس عزت پائی مرتبہ حاصل کیا۔ تمکین جماؤ عطا کرنا، توانا اور با اقتدار بنا دینا۔ تمکن با اقتدار ہونا۔ کبھی لام کے ساتھ آتا ہے اور کبھی بغیر لام کے، بغیر لام کے ہو تو معنے اقتدار عطا کرنا اور لام کے ساتھ ہو تو اقتدار کے وسائل بہم پہنچا دینا۔ **معایش**، اس کا واحد معیشت ہے سامان زندگی، معاش وقت، زندگی اور ہمیشہ زندگانی اور گزران کو کہتے ہیں یہ عاش یعیش سے بنا ہے جو باب ضرب سے آتا ہے اور جس کے معنے جینے کے ہیں۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ عیش اس زندگی کو کہتے ہیں۔ جو حیوان کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ حیاۃ سے اخص ہے کیونکہ حیاۃ کا استعمال عام ہے۔ جاندار باری تعالیٰ، اور فرشتہ سب کے لیے ہوتا ہے۔ **خلقنا**، ہم نے پیدا کیا، اصل میں خلق کے معنے صحیح اندازہ ٹھہرانے کے ہیں اور اس کا استعمال بغیر نمونہ کے پیدا کرنے اور ایجاد کرنے کے معنے میں بھی ہوتا ہے یہاں معنے ہیں ہم نے تم کو پیدا کیا، بنایا۔ **اھبط**، ہبوط سے امر کا صیغہ ہے۔ شیطان مخاطب ہے۔ ہبوط کے معنے بلندی سے پستی میں اترنے کے ہیں۔ اس کے معنے اونچے درجہ سے نچلے درجہ پر لانے کے ہی ہیں۔ اس لحاظ سے ہبوط کی دو قسمیں ہیں ایک حسی دوسرے معنوی۔ یہاں دونوں ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ ان تتکبر یہ کہ تو تکبر کرے۔ تکبر کے معنی بڑائی مارنے اور گھمنڈ کرنے کے ہیں۔ تکبر دو طرح کا ہوتا ہے۔ ۱۔ فی نفسہٖ کسی میں خوبیاں اور صفات حسنہ سب سے زیادہ ہوں۔ ۲۔ واقع میں تو صفات حسنہ سے خالی ہو اور مدعی ہو کمال صفات کا اول محمود ہے اور دوسرا مذموم ہے اس لیے اول معنے کا لحاظ کرتے ہوئے متکبر اللہ کی صفت ہے۔ اور دوسرے معنے کے لحاظ سے شیطان یا کافر یا مغرور انسان پر بولا جاتا ہے اور یہ مذموم ہے۔ تکبر کی بدترین قسم یہ ہے کہ آدمی اللہ

کی طاعت اور فرمانبرداری سے سرکشی کرے اور خود سر بن جاتے۔ مفردات القرآن۔ الصاغرین، ذلیل وخوار، صاغر کی جمع ہے۔ صغار سے بنا ہے۔ صغر یصغر باب کرم سے آتا ہے جس کے معنے ذلیل ہونے کے ہیں۔ اسی سے صغیر صفت آتی ہے۔ اس کے معنے چھوٹے کے ہیں۔ انظرنی، تو مجھے مہلت دے انظار مصدر ہے باب افعال سے آتا ہے اس کے معنے ڈھیل دینے اور مہلت دینے کے ہیں۔ اغویتنی، تو نے مجھے بے راہ کیا۔ اغوار سے ہے اس کے معنے غوایۃ میں ڈالنا، غوایت رشاد کی ضد ہے۔ اصل لغت میں خراب ہونے کے معنے میں اونٹ کا بچہ دودھ زیادہ پی لے اور اس کے نتیجہ میں اس کا پیٹ خراب ہو جاتے اس وقت کہتے ہیں غوی الفصیل اسی سے بہک جانے بے راہ ہو جانے کے معنے پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ محمد الدین فیروز آبادی نے قاموس میں لکھا ہے یا ناداں ہو جانا جیسا کہ مفردات میں امام راغب نے لکھا ہے یا ناکام ہو جانا۔ جیسا کہ مرتضیٰ زبیدی اور منظور افریقی نے تاج العروس اور لسان العرب میں لکھا ہے مذءوماً اسم مفعول مذمت کیا ہوا عیب دار اور اس کے مصدر دو بتائے گئے ہیں ذام اور ذیم ذام یذام اور ذام یذیم دونوں کے معنے ایک ہیں استعمال دونوں طرح ہوتا ہے۔ مدحوراً یہ بھی دحر سے اسم مفعول ہے۔ اسی کا مصدر دحور آتا ہے۔ اس کے معنے بھگانا، ہانکنا، دھتکارنا اور دور کرنا یہاں معنے میں رحمت سے دور کیا ہوا، ہنکایا ہوا اور نکالا ہوا۔ ووری ا، یہ موارات سے ماضی مجہول ہے چھپایا گیا ہے۔ یہ ورار مصدر سے بنا ہے جو بطور ظرف استعمال ہوتا ہے جس کے معنے آڑ، حد، فاصل، کسی چیز کا آگے پیچھے ہونا۔ موارات کسی چیز کے پیچھے ہو کر چھپانا۔ اس کا مجرد باب فتح سے آتا ہے۔ سوا تھما، سوآت سوآۃ کی جمع ہے، ان دونوں کی شرم گاہیں۔ سوآۃ کے معنے لاش، عیب، فضیحت کے آتے ہیں۔ علامہ زمخشری فرماتے ہیں کہ سوآۃ کے معنے فضیحت کے ہیں کیونکہ اس میں برائی ہوتی ہے۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ سوآۃ شرم گاہ کے لیے کنایہ ہے اور ابن الاثیر کا بیان ہے کہ اصل میں سوآۃ کے معنے شرمگاہ کے ہیں۔ بعد میں اسے ہر اس شے کے معنے میں نقل کر لیا گیا کہ جب وہ ظاہر ہو تو اس سے حیا آتے۔

مخلوقات میں انسان کا مرتبہ

مرکزی موضوع سورت کا یہ ہے کہ انسان کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے نبوت کی ہدایت اور رہنمائی کی

ضرورت ہے۔ اپنے اخلاق، تہذیب، معاشرت اور تمدن کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جن اصولوں کا وہ محتاج ہے ان سب کے لیے اسے صرف نبوت کو رہنما تسلیم کرنا چاہیے اور صرف اسی ہدایت کی پیروی کرنی چاہیے جو خدا کی جانب سے اللہ کا رسول لے کر آیا ہے۔ رسول کو چھوڑ کر کسی دوسرے رہنما کی طرف ہدایت کے لیے رجوع کرنا خواہ وہ فرد ہو یا جماعت انسان کے لیے بنیادی طور پر غلط ہے یہ غیر الٰہی طاعت ہے اس کا نتیجہ شرف و مجد کی تباہی ہے۔ یہی توحید طاعت ہے۔ اب یہاں ان آیات میں بتایا جا رہا ہے کہ اس عالم خلق میں انسان کی حیثیت اور درجہ کیا ہے اور نبوت کا ان سے مطالبہ کیا ہے۔ قرآن نے انسانوں کو وحی کی زبان سے یہ بات سمجھائی کہ انسان اس عالم خلق میں تمام مخلوقات میں اشرف، احسن اور اکرم ہے اور وہ اس دنیا میں خدا کی نیابت کا فرض انجام دینے آیا ہے۔ حضرت آدم کا قصہ محض داستان نہیں بلکہ انسان کی اصلی حیثیت کو عیاں اور نمایاں کرنے والی تعلیم کا اولین دیباچہ ہے۔ اس کو فرشتوں کا مسجود بنانا گویا تمام کائنات کا مسجود بنانا تھا اس کو تمام اسماء کا علم عطا کرنا گویا تمام اشیا کو اس کے تصرف میں دینا تھا۔ وہ انی جاعل فی الارض خلیفہ کی رو سے اس عالم میں خدا کا نائب ہے اور اس کا سر خلافت الٰہی کے تاج سے ممتاز ہے۔ کروڑوں مخلوقات الٰہی میں خدا کی امانت کا حامل ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے اور حقیقت نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب کہ قرآن کہہ رہا ہے تو اب انسان عالم کائنات میں خدا کے سوا کس کی عبادت کرے۔ روئے زمین کی تمام چیزیں تو اس کے لیے بنی ہیں اور اب روئے زمین کی کس ہستی کی اطاعت کرے۔ مشرک عبادت میں بت ستارہ قوائے فطرت اور اثار کے آگے جھک کر یہ ثبوت دیتے ہیں کہ ان کے لیے نہیں بلکہ وہ چاند سورج کے لیے بنے ہیں اور طاعت میں نمرود، فرعون، ہامان، شداد اور قارون کے اشاروں، حکموں، دستوروں اور قانون پر چل کر یہ ثبوت دیتے ہیں کہ وہ خدا کی مخلوقات میں اشرف نہیں بلکہ اشرف نمرود، فرعون ہیں جن کی زبانوں کو انسانی خون کی چاٹ لگی ہوئی ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز انسان کے لیے بنی ہے اور انسان اللہ کی عبادت اور طاعت کے لیے بنا ہے۔ اور انسانی تخلیق کے سلسلے میں آخر میں نبوت کی تاریخ بھی بتا دی ہے۔ اور اشارہ کر دیا ہے کہ نبوت کا تعلق انسان کی خلافت سے ہے۔

۷۔ اور بلاشبہ ہم نے ہی تمہیں زمین میں جگہ دی ہے اور زندگی کے لیے سر و سامان مہیا کیے ہیں تم بہت ہی کم شکر گزاری کرتے ہو۔

یہاں سے بعض آیات آفاقیہ و انفسیہ کا بیان شروع کیا ہے جس سے ایک طرف حق تعالیٰ کے وجود پر کارخانۂ عالم کے حکیمانہ نظم و نسق سے استدلال اور احسانات و انعامات الٰہیہ کا تذکرہ فرما کر اس کی شکر گزاری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور دوسری طرف نبوت کی ضرورت انبیاء علیہم السلام کی آمد، ان کی سیرت، ان کے

متبعین و مخالفین کا انجام جو اس سورت کا اصلی موضوع معلوم ہوتا ہے اس کے بیان کے لیے یہ آیات بطور توطئہ اور تمہید کے مقدم کی گئی ہیں[1] اصل ارشاد میں مکناکم فی الارض و جعلنا لکم فیھا معایش کی تعبیر آئی ہے اس میں اللہ سبحانہ نے اپنے انعامات اور احسانات میں سے دو کا ذکر کیا ہے۔ ایک یہ انعام ہے کہ اللہ نے نوع انسانی کو اس زمین کے گول کرے میں قدرت و اختیار کے ساتھ بسا دیا۔ لفظ تمکین میں قرار، ملک، اقتدار اور تصرف و اختیار سب آ گئے۔ بات کو سادہ طریق پر کہنے کے بجائے لام اور قد کے ذریعہ موکد بنا کر کہا گیا ہے تاکہ ان لوگوں کو چوکنا کر دیا جائے جن کو اس انعام کا احساس نہیں ہے۔ علامہ آلوسی نے اس اندازِ تعبیر کو نبوت کی دعوت کی پذیرائی کیلئے ترغیب قرار دیا ہے لیکن علامہ طیبی نے اس کو بھی ترہیبی انداز بتایا ہے اور لکھا ہے کہ یہ بھی انذار کی ایک قسم ہے اور اپنے مضمون کے لحاظ سے یہ بھی اتبعوا ما انزل الیکم سے مربوط ہے۔ پوری بات یوں ہے کہ کہو دو تم بخدا ہم نے ہی زمین کو تمہارے لیے جائے قرار بنایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طیبی کی رائے میں یہ قریش کو دھمکی ہے تو اس صورت میں تمکین فی الارض سے زمین میں اقتدار و اختیار بخشنا ہے اور زمین سے مراد سرزمین حرم ہے جس میں قریش کو اقتدار حاصل تھا۔ سورہ قصص میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے اولم نمکن لھم حرما اٰمنا کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے پر امن حرم کو ان کے لیے جائے قرار بنایا ہے دوسرے یہ کہ ہم نے اس میں تمہارے لیے معاش کی راہیں کھول دی ہیں۔ اگر قریش ہی مخاطب ہیں تو اس سے اشارہ ان معاشی سہولتوں کی طرف معلوم ہوتا ہے جو ایک وادی غیر ذی زرع میں حضرت ابراہیم کی دعا اور بیت اللہ کی برکت سے اہل عرب کو عموماً اور قریش کو خصوصاً حاصل ہوئیں۔ قرآن میں ان معاشی برکتوں کا بار بار ذکر ہوا ہے۔ سورہ قصص میں ہے یجبیٰ الیہ ثمرات کل شیئ جس کی طرف ہر چیز کے پھل کھینچے چلے آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ حرم جس کے امن و امان اور جس کی مرکزیت کی بدولت تم اس قابل ہوئے ہو کہ دنیا بھر کا مال تجارت اس وادی غیر ذی زرع میں کھینچا چلا آ رہا ہے۔ اس کی یہ معاشی خوش حالی تمہاری کسی تدبیر کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اللہ کا بنایا ہوا ہے۔ اب کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جس خدا نے تمہیں یہ نعمت دی اس کے رسول سے منحرف اور باغی ہو کر تم پھلو پھولو گے اور اگر نوع انسانی سے خطاب ہے تو پھر الارض سے مراد کرۂ ارض ہے اور تمکین فی الارض سے زمین کو جائے قرار بنانا اور معاش سے مراد معاشی وسائل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ذات پاک جس نے اے انسانو تمہیں اس کرۂ ارض پر آباد کیا اور مزید براں اس میں تمہاری معیشت کے وہ تمام وسائل جو زندگی کے لیے ضروری تھے سب مہیا کر دیے۔ لفظ معایش بے قید لا کر اشارہ کر دیا کہ نسلِ انسانی کے رزقی و معاشی نظام

---

[1] افادات شیخ الاسلام

میں جو غیر محدود فراخی اور بے پناہ کشادگی پیدا کی ہے اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے تو قرآن کے نقطہ نظر سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کائنات کا سارا نظام جعلنا لکم فیھا معایش کا نظام ہے یعنی اللہ سبحانہ نے اس نظام کو اس لیے قائم فرمایا ہے تاکہ انسان اپنی معاشی سہولتوں کے لیے بالواسطہ یا بلا واسطہ اس سے استفادہ کرے نفع اٹھائے پھر معایش کے اس عظیم کارخانے کو قرآن کا انسان کے سامنے یہ رکھنا اور زمین کے اندر غذائی مواد کا جو ذخیرہ محفوظ کیا گیا ہے اس کی طرف زمین کی طرف تخلیق کے سلسلہ میں یہ کہہ کر قدر فیھا اقواتھا انسانوں کو متوجہ کرنا اور پھر ان سب غذائی اور معاشی وسائل کے بارے میں سواء للسائلین کا صلائے عام اور ان تمام معایش یعنی معاشی پیداوار کو فضل اللہ کے احترامی نام سے موسوم کر کے جدوجہد کی توانائیوں کو وابتغوا من فضل اللہ کے تشریعی حکم سے بیدار کرنا اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ ان معاشی ذرائع یعنی معایش سے استفادہ کرنا نسل انسانی کا بلاتمیز حق ہے زمین میں تمہارے لیے ہم نے زندگی و معیشت کے سارے سروسامان مہیا کر دیے۔ جعلنا لکم معایش لیکن کس طرح مہیا کیے؟ اس طرح کہ اگرچہ ہر چیز کے ہمارے پاس ذخیرے ہیں لیکن ان کی بخشش ایک مقررہ اندازے کے ساتھ ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ بغیر کسی اندازے کے تمام چیزیں بکھیر دی ہوں۔

آخر میں قلیلاً ما تشکرون، فرما کر مرکزی موضوع کی طرف اشارہ کر دیا کہ اگر زمین میں آبادکاری اور معاشی وسائل کی بہم رسانی ہم کر رہے ہیں اور تم ان سے دن رات استفادہ کر رہے ہو تو تمہیں تو ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے تھا اور اس شکر گزاری میں ہمارے کہے پر چلنا چاہیے تھا لیکن ہو یہ رہا ہے کہ تم میں شکر گزاری کم سے کم تر ہے دونوں معنے ہو سکتے ہیں تمہاری شکر گزاری بہت کم ہے اور تمہارے شکر گزاری کے اوقات بہت کم ہیں مطلب یہ ہے کہ تم اپنے منعم کے شکر گزار نہیں ہو۔ اس سے ایک نکتہ یہ بھی سمجھ میں آیا کہ دنیا اور اس کی مادی نعمتیں قرآن کی نظر میں بری نہیں ہیں اگر اللہ کی شکر گزاری کے ساتھ ہوں۔ دراصل شکر نام ہے حقائق و واقعات کے مطابق اپنے علم کی تصحیح کا واقعہ جب یہ ہے کہ نعمتوں کی شکل میں جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ موجود ہے وہ جعلنا لکم فیھا معایش کا مظاہرہ ہے گویا اس فقرے میں سارا عالم سمٹ کر آ گیا۔ اب اگر آپ کا علم اسی واقعہ سے مطابقت پیدا کرے۔ یعنی جیسا کچھ ہو رہا ہے ویسا ہی کچھ آپ کا علم بھی ہو تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا کی چیزوں کے ساتھ خدا کی مرضی کے مطابق طریقہ عمل اختیار کرے گا۔ اسی علم کو مستحکم اور مضبوط بنانے کے لیے اسلام میں حکم دیا گیا ہے کہ زبان سے ظاہری اعضا سے بھی شکر کرنا چاہیے کیونکہ عموماً آدمی کا باطن ظاہر سے متاثر ہوتا ہے۔ بخاری میں ہے:

> جب کوئی پانی پیتا ہے کھانا کھاتا ہے تو خدا پسند کرتا ہے کہ کھانے والے پینے والے اس کے گن گائیں اور تعریف کریں۔

کھانے پینے پہننے الغرض نعمتوں کے حصول کے وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جن دعائی منزلوں کو مسلمانوں کے لیے چھوڑا ہے سب کا مطلب یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مسلمان اپنے اندر نعمتوں کے بارے میں صحیح علم اور اس کے احساس کو زندہ اور بیدار رکھنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ عمل کو آسان کرنے کا یہی ایک نفسیاتی طریقہ ہے۔ مختصراً اس سارے کاروبار کا نام خواہ عملی صورت میں ہو یا علمی۔ زبان سے ہو یا جوارح سے سب کا نام شکر ہے۔ قرآن یہاں انعامات سے فائدہ اٹھانے والوں سے اسی کی قلت کی شکایت کر رہا ہے۔ قرآن میں یہ اعلان بھی ہے لئن شکرتم لازیدنکم اگر شکر کرو گے تو میں ضرور زیادہ دوں گا اور اس کے ساتھ یہ دھمکی بھی ہے لئن کفرتم ان عذابی لشدید اگر ناشکری کرو گے تو یاد رکھو میرا عذاب سخت ہے۔

سعادت وشقاوت کی ابتدائی سرگزشت

۸- اور ہم نے ہی تم کو پیدا کیا ہے پھر تمہاری شکل وصورت بنائی۔ پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ سجدہ کرو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس کہ سجدہ کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ اللہ نے ابلیس سے کہا کہ کس بات نے تجھے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے حکم دیا تھا۔ اس نے کہا کہ اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔ یعنی تمہاری تخلیق سے پہلے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا سامان کر دیا۔ پھر تمہارا مادہ پیدا فرمایا۔ پھر اس مادے کو ایسا دلکش نقشہ اور حسین وجمیل صورت عطا کی جو کسی دوسری مخلوق کو عطا نہیں کی گئی تھی۔ پھر اس تصویر خاکی کو وہ روح اور حقیقت عطا فرمائی جس کی بدولت تمہارے باپ آدم علیہ السلام جن کا وجود تمام افراد انسانی کے وجود پر اجمالاً مشتمل تھا۔ خلیفۃ اللہ اور مسجود ملائکہ بنایا پھر جس نے اس وقت سجود تعظیمی سے سرتابی کی وہ مردود ازلی ٹھہرا کیونکہ وہ سجود خلافت الٰہیہ کے نشان کے طور پر تھا۔ ملائکۃ اللہ جو بحث وتمحیص اور صریح امتحان کے بعد آدم کی علمی فضیلت پر اور روحانی کمالات پر مطلع ہو چکے تھے حکم الٰہی سنتے ہی سجدے میں گر پڑے اور اس طرح خلیفۃ اللہ کے روبرو اپنے پروردگار حقیقی کی کامل وفاشعاری اور اطاعت پذیری کا ثبوت دیا اور ابلیس جو ناری الاصل ہے مگر کثرت عبادت کی وجہ سے زمرۂ ملائکہ میں شامل ہو گیا تھا آخر کار اپنی اصل کی طرف لوٹا۔ اس کی نظر آدم کی مادی ساخت سے نفخت فیہ من روحی کے راز تک نہ تجاوز کر سکی۔ اس لیے صریح حکم الٰہی کے مقابلہ میں انا خیر منہ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین کا دعویٰ کرنے لگا۔ آخر اسی استکبار اور نص صریح قاطع کو محض رائے اور ہوا سے رد کر دینے اور خدا سے بحث ومناظرہ کی ٹھان لینے کی پاداش میں ہمیشہ کے لیے مرتبۂ قرب سے نیچے گرا دیا اور رحمت الٰہیہ سے بہت دور پھینک دیا گیا۔ فی الحقیقت جس چیز پر اسے بڑا فخر تھا کہ وہ آگ

سے پیدا ہوا ہے وہی اس کی ہلاکت ابدی کا سبب ہوئی۔ آگ کا خاصہ خفت وصوت، سرعت وطیش اور علو ور فساد ہے۔ بخلاف مٹی کے کہ اس میں مستقل مزاجی، متانت اور متواضعانہ حلم وتثبت پایا جاتا ہے۔ ابلیس جو ناری الاصل تھا سجدہ کا حکم سن کر آگ بگولا ہو گیا اور رائے قائم کرنے میں تیزی اور جلد بازی دکھائی۔ آخر تکبر وتعلی کی راہ سے آتش حسد میں گر کر دوزخ کی آگ میں جاگرا برخلاف اس کے آدم علیہ السلام سے جب غلطی ہوئی تو عنصر خاکی نے خدا کے آگے فروتنی، خاکساری اور انقیاد واستکانت کی راہ دکھلائی۔ چنانچہ ان کی استقامت وانابت نے ثم اجتباہ ربہ فتاب علیہ وھدی کا نتیجہ پیدا کیا۔ اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ ابلیس لعین نے مادی و عنصری لحاظ سے بھی اپنی تفضیل کے دعوے میں ٹھوکر کھائی۔ چنانچہ حافظ ابن القیم نے بدائع الفوائد میں پندرہ وجوہ سے مٹی کا آگ سے افضل ہونا ثابت کیا ہے [1]

پہلے یہ بتایا کہ ہم نے تمہیں زمین میں بسایا اور ہم نے تمہارے لیے زمین میں وسائل معیشت فراہم کیے اس کے بعد فرمایا ہے کہ ہم نے تمہاری تخلیق کی۔ اس سے اشارہ ہو گیا کہ مکین سے پہلے مکان بن چکا تھا۔ اس آیت کی تشریح میں حضرت عبداللہ ابن عباس سے اگرچہ تین روایات آئی ہیں لیکن سب سے زیادہ صحیح وہ روایت ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ تخلیق مردوں کی پیٹھوں میں ہوئی اور تصویر ماؤں کے پیٹوں میں ہوئی۔ لیکن حافظ ابن کثیر نے اس کو اور اس قسم کی دوسری روایات کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ اس کے بعد ثم قلنا للملائکۃ اسجدوا اس لیے لازماً مراد حضرت آدم ہیں اور پوری انسانیت کو خطاب کی وجہ یہ ہے کہ حضرت آدم ابو البشر ہیں۔ خواہ کچھ ہو ذکر اولین پیدائش کا ہے۔ اصل ارشاد یہ ہے ولقد خلقناکم ثم صورناکم ثم قلنا للملائکۃ بے شک ہم نے تمہاری تخلیق کا منصوبہ بنایا اور تمہارا مادہ آفرینش تیار کیا پھر اس مادے کو انسانی صورت عطا کی پھر جب آدم کی صورت میں ایک زندہ ہستی وجود میں آگئی تو اسے سجدہ کرنے کے لیے فرشتوں کو حکم دیا۔ سوال یہ ہے کہ تخلیق انسانی کے آغاز کی تفصیلی صورت کیا تھی۔ کیا یہ تخلیق بتدریج اس طرح ہوئی ہے کہ کائنات ایک ابتدائی حالت سے ترقی کرتی ہوئی چلی آرہی تھی اور نوع انسانی ایک اور نوع حیوانی کی ترقی یافتہ صورت ہے جو اپنے جسم دماغ اور نظام عصبی کی ساخت میں انسان سے کمتر درجہ کی تھی اور یہ نوع حیوانی اس سے بھی کمتر درجہ کی ایک نوع سے پیدا ہوئی تھی۔ وھلم جرا، یہاں تک کہ ہم اس ایک خلیہ کے حیوان کی نوع تک پہنچ جاتے ہیں جو سب سے پہلے ظہور میں آیا تھا۔ یہ بات ان لوگوں نے کہی ہے جو ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے دلدادے ہیں۔ ہمارے معاصرین میں ڈاکٹر محمد رفیع اس فکر کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ قرآن کی

[1] افادات شیخ الاسلام

روح سے قطعاً ہم آہنگ نہیں ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق انسان اول کی پیدائش صرف حق تعالیٰ کے تکوینی ارادے کے تحت ہوتی ہے۔ حضرت آدم کی تخلیق کے متعلق قرآن کے تفصیلی بیانات اور مسئلہ ارتقاء پر نظر کرنے کے بعد دونوں میں ہم آہنگی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس قسم کی کوشش ان لوگوں نے کی ہے جو قرآن کریم میں بے محل تاویلات کی اہمیت نہیں سمجھتے۔ فلسفہ قدیم کے افلاک تسعہ اور عقول عشرہ کو بھلا اسلامی افلاک سبعہ اور ملائکہ سے کیا نسبت ہے مگر یہاں بھی بے جوڑ تطبیق کی کوشش کی گئی تھی اور اب قرآن کی بیان کردہ تخلیق اور نظریۂ ڈارون میں تطبیق کی کوشش کی جا رہی ہے وہ بھی خلاف واقع تھا اور یہ بھی خلاف واقع ہے اور یہ کچھ مرعوبیت کے نتائج ہیں۔ پہلے فلسفہ قدیم سے دنیا مرعوب تھی اور اب فلسفہ جدید سے متاثر ہے۔ مرحوم ڈاکٹر رفیع الدین تو یہاں تک کہہ گئے۔

> حقیقت ارتقاء کا تصور دنیا کے علمی مسلمات میں ہی داخل نہیں بلکہ قرآن پر غور و فکر کے بعد ہم نہایت آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ یہ تصور روح قرآنی کے عین مطابق ہے اور صحیح ہے اور اس تصور کے بارے میں قرآن کا موقف وہی ہے جو حکماء نے اختیار کر رکھا ہے یعنی ارتقاء کائنات کے حیاتیاتی مرحلہ کا ارتقاء یا اس کے کسی ایک مرحلہ کا ارتقاء نہیں ہے بلکہ کائنات کا مجموعی ارتقاء ہے جس میں ہر چیز اپنی بساط کے مطابق ارتقاء کر کے اپنا حصہ لیتی ہے۔ قرآن میں پہلے انسان کے یکایک پیدا ہو جانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

ہمیں یہاں مولانا آزاد مرحوم کی یہ بات بے حد پسند آئی ہے کہ موجودہ زمانے میں اجرام سماویہ کی ابتدائی تخلیق اور کرہ ارضی کی ابتدائی نشو و نما کے جو نظریے تسلیم کر لیے گئے ہیں۔ قرآنی اشارات بظاہر ان کی تائید کرتے ہیں اور اگر ہم چاہیں تو ان بنیادوں پر شرح و تفصیل کی پوری عمارت کھڑی کر سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا صحیح نہ ہوگا۔ یہ نظریے کتنے ہی مستند تسلیم کر لیے گئے ہوں لیکن پھر نظریے ہیں اور نظریات جزم و یقین کے ساتھ حقیقت کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ پھر اس کا کیا فائدہ کہ ان کی روشنی میں قرآن کے مجمل اور محتمل اشارات کی تفسیر کی جائے۔ فرض کرو آج ہم نے دخان اور دخان کے انقسام کا مطلب اسی روشنی میں آراستہ کر دیا جو وقت کے نظریوں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ کل کو کیا کریں گے اگر ان نظریوں کی جگہ دوسرے نظریے پیدا ہو گئے صاف بات یہ ہے کہ یہ معاملہ عالم غیب سے تعلق رکھتا ہے جس کی حقیقت ہم اپنے علم و ادراک کے ذریعے معلوم نہیں کر سکتے۔ قرآن کا مقصود ان اشارات سے تخلیق عالم کی شرح و تحقیق نہیں ہے خدا کی قدرت و حکمت کی طرف انسان کو توجہ دلانا ہے[1]

---

[1] ترجمان القرآن

دراصل نوعِ انسانی کے بارے میں یہ دو مختلف نظریے ہیں۔ ایک وہ جسے قرآن پیش کرتا ہے۔ یعنی جو کچھ ہوا اللہ سبحانہ کے ارادہ تکوینی کے تحت ہوا ہے۔ دوسرا وہ جو موجودہ زمانہ میں ڈارون کے نام سے پیش کیا جاتا ہے یعنی یہ کہ انسان غیر انسانی حالت کے مختلف مدارج سے ترقی کرتا ہوا مرتبہ انسانیت پر پہنچا ہے۔ مولانا مودودی کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے کہ

انسانیت کی تاریخ کے متعلق یہ دو مختلف نظریے ہیں اور ان سے انسانیت کے دو مختلف تصور پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تصور کو اختیار کیجئے تو آپ کو انسان اصل حیوانی کی ایک فرع نظر آئے گا۔ اس کی زندگی کے جملہ قوانین حتیٰ کہ اخلاقی قوانین کے لیے بھی آپ بنیادی اصول ان قوانین میں تلاش کریں گے جن کے تحت حیوانی زندگی چل رہی ہے اس کے لیے حیوانات کا سا طرزِ عمل آپ کو بالکل ایک فطری عمل معلوم ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ جو فرق انسانی طرزِ عمل اور حیوانی طرزِ عمل میں آپ دیکھنا چاہیں گے وہ بس اتنا ہی ہوگا کہ حیوانات جو کچھ آلات صنائع اور تمدنی آرائشوں اور تہذیبی نقش و نگار کے بغیر کرتے ہیں۔ انسان وہی سب کچھ ان چیزوں کے ساتھ کرے۔ اس کے برعکس دوسرا تصور اختیار کرتے ہی آپ انسان کو جانور کے بجائے انسان ہونے کی حیثیت سے دیکھیں۔ آپ کی نگاہ میں وہ حیوانِ ناطق یا متمدن جانور نہیں ہوگا بلکہ زمین میں خدا کا خلیفہ ہوگا۔ آپ کے نزدیک وہ چیز جو اسے دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے اس کا نطق یا اس کی اجتماعیت نہ ہوگی بلکہ اس کی اخلاقی ذمہ داری اور اختیارات کی وہ امانت ہوگی جسے خدا نے اس کے سپرد کیا ہے اور جس کی بنا پر وہ خدا کے سامنے جوابدہ ہے

اس طرح انسانیت اور اس کے جملہ متعلقات پر آپ کی نظر پہلے زاویہ نظر سے یکسر مختلف ہو جائے گی۔ اب انسان کے لیے ایک دوسرا ہی فلسفہ حیات اور ایک دوسرا ہی نظام اخلاق و تمدن و قانون طلب کرنے لگیں گے اور اس فلسفے اور اس نظام کے اصول و مبادی تلاش کرنے کے لیے آپ کی نگاہ خود بخود عالمِ اسفل کے بجائے عالمِ بالا کی طرف اٹھنے لگے گی[1]

قرآن نے یہاں انسان کے مرتبہ کے اظہار کے لیے صرف یہ کہنے پر اکتفا نہیں کیا ہم نے پیدا کیا اور ہم نے اس میں نقاشی کی بلکہ فرمایا ثم قلنا للملائكة اسجدوا یعنی پیدا کرنے، صورت گری، علم عطا فرمانے اور خلیفہ بنانے کے بعد ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کر لیا۔ اللہ اکبر! ایک مٹی سے بنی ہوئی ہستی کو یہ تکریم اور اس کے درجہ کی یہ بلندی کہ اسے مسجودِ ملائکہ بنا دیا اور دنیا کی تمام قوتیں اس کے اختیار و تصرف میں دے دی گئیں۔ سجدے کے لفظی معنے محض تواضع اور تذلل کے ہیں۔ سجدہ نماز کو

[1] تفہیم القرآن

بھی سجدہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ تواضع و تذلل کا بہترین مظہر ہے۔ خود محاورہ قرآن میں سجود کا اس معنے میں استعمال عام ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ سجدہ عالم غیب کا ہے عالم شہادت کا نہیں یا یوں کہہ دیجئے کہ عالم ارواح میں ہوا ہے اس عالم مادی اور ناسوت میں نہیں ہے۔ اور تکلیفات شرعیہ کا تعلق اسی عالم شہادت سے ہے۔ عالم ارواح عالم غیب ہے اور عالم غیب کے حالات کے بارے میں ہم اپنی رائے سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہم مانتے ہیں کہ فرشتوں سے حضرت آدم کو سجدہ کرایا گیا لیکن سوال یہ ہے کہ سجدہ کی نوعیت کیا تھی یہ کس قسم کا سجدہ تھا۔ وہ بات جو حضرت شیخ الہند نے فرمائی کہ حضرت آدم کو سجدہ عبادت نہیں بلکہ سجدہ خلافت تھا۔ مجمل اور مختصر ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اسے تفصیل کے ساتھ پیش فرمایا ہے اور قبلہ نما میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے فرماتے ہیں کہ جب حضرت آدم خلیفہ ہوتے تو جیسے جانشینان شاہی کے لیے جانشینی کے بعد آداب شاہی بجالانا ضروری ہوتے ہیں۔ بالخصوص ان کے ذمے جن کو اس معاملہ میں مشتبہ نگاہوں سے دیکھا جاتا ہو۔ فرشتوں نے خواہ کسی وجہ سے یہ بات کہی تھی لیکن خلافت آدم کے اعلان پر یہ بات ضرور کہی تھی اتجعل فیھا من یفسد فیھا و یسفک الدماء آپ ایسی ہستی کو خلیفہ بنائیں گے جو زمین کو فساد اور خونریزی کا گہوارہ بنا دے گی۔ اب خلافت کی تاجپوشی کے وقت میں ان ہی کو مخاطب کر کے کہا گیا اسجدوا لآدم یہ ان کا آدم علیہ السلام کی خلافت میں نیک نیتی پر مبنی شبہ تھا۔ اس لیے ضروری ہوا کہ فرشتے حضرت آدم کو سجدہ خلافت کریں تاکہ انکار عملاً اقرار بن جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اگرچہ فرشتے معصوم ہیں، اور انسان سراپا گناہ ہیں لیکن چونکہ فرشتے مظہر قدرت ہیں اور انسان مظہر علم ہے اور قدرت علم کے توابع میں سے ہے اس لیے فرشتوں کا فرض ہے کہ وہ انسان کے فرمانبردار بن کر رہیں۔ الغرض مسجودیت آدم حق خلافت خداوندی ہے اور خلافت خداوندی علم کا نتیجہ ہے۔

ایک خلش اور اس کا جواب

شاید آپ یہاں یہ خلش محسوس کریں کہ اگر بنائے خلافت علم ہے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بنیاد پر مسجود ملائکہ ہی نہیں بلکہ مسجود کائنات ہونا چاہیے کیونکہ آپ کی ذات گرامی منبع العلوم ہے اور آپ کو قرآن نے علمك مالم تكن تعلم کے خطاب سے نوازا ہے۔ واقعی آپ کو مسجود ملائکہ اور مسجود خلائق ہونا چاہیے لیکن ایسا نہیں ہوا کیونکہ حضرت آدم کی خلافت میں ملائکہ اور جنات کو کلام تھا، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی علم و کمال میں چونکہ کوئی اپوزیشن نہ تھی اس لیے سجدہ خلافت کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ مولانا محمد قاسم کی تعبیر یہاں بھی بے حد دلآویز ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم اور دوسرے انبیاؑ اور ملائکہ میں وہی فرق ہے جو بادشاہ اور اس کے خادموں میں ہوتا ہے جیسے خادموں کو بادشاہ کی ہمسری کا خیال نہیں آتا۔ ایسے ہی بمقابلہ رسولِ عربی اگر گزشتہ انبیاؑ موجود بھی ہوتے تو ان کو اس کا دسواں تک نہ آتا۔ اور یہ ممکن ہی کیوں کر ہے۔ قمر اور کواکب میں آفتابِ عالم تاب کی ہمسری کا یارا کب ہے۔ حضور انور کے سوا جو مخلوق بھی ہے فرشتے ہوں یا جنات یا پھر اولادِ آدم سب کے سب کمالات علمی و عملی میں حضور انور کے دروازے کے دریوزہ گر ہیں۔

اور اس بات کی دلیل کہ یہ سجدہ تکریم اور سجدۂ خلافت تھا اور اس طرح اللہ سبحانہٗ نے عالمِ غیب میں فرشتوں کی طاعت اور بندگی کا امتحان لیا تھا۔ خود ابلیس کا اقرار ہے ارایتک ھذا الذی کرمت علی کیا تیرا یہی فیصلہ ہوا کہ اس ہستی کو مجھ پر بڑائی دی۔ ظاہر ہے کہ آدم کے سر پر خلافت کا تاج ہے اور فرشتوں سے آدم کو سجدہ کرا کے تکریم کرائی جا رہی ہے۔ اسی تکریم پر ابلیس میں حسد کی آگ بھڑکی تھی۔

ابلیس کے کردار پر بازپرس

آگے قرآن نے بتایا ہے کہ ابلیس کے اس کردار اور اس سرکشی پر اللہ نے اس سے بازپرس کی کہ تجھے کس چیز نے سجدہ سے روکا جب کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا۔ اصل ارشاد میں تعبیر مامنعک ان لا تسجد اذ امرتک کی آئی ہے۔ یہاں بازپرس کی اساس اذ امرتک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مقصود آدم نہیں بلکہ میرے حکم کی پابجائی ہے۔ اس حکم عدولی کی وجہ کیا ہے۔ یعنی اگر خدا سجدہ کرنے کا حکم نہ دیتا تو خود آدم سزاوارِ سجدہ نہ تھے وہ خدا کے حکم کی بنا پر سجدہ کے سزاوار ہوتے۔ ابلیس کا جواب یہ تھا کہ میں اس سے اچھا ہوں کیونکہ میری تخلیق نار سے ہوئی ہے جبکہ آدم کی تخلیق خاک سے ہوئی ہے۔ اصل ارشاد یہ ہے خلقتنی من نار وخلقتہ من طین، یعنی اپنے انکار کی توجیہ کرتے ہوئے ابلیس نے کہا کہ میں آتش زادہ ہوں اس لیے اس خاک زادے سے افضل ہوں اور افضل اپنے سے کمتر کو سجدہ کیونکر کر سکتا ہے یعنی ابلیس آدم کو نہ پہچان سکا اور ظاہری حالت سے دھوکہ کھا کر خاک زادہ قرار دیتے ہوئے آدم کا جو مقام تھا اس کو گرا دینا چاہا دوسرے الفاظ میں گویا آپ کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت کے متعلق مختلف قوموں کو جو مغالطہ لگنے والا تھا آغازِ کار ہی میں اس مغالطہ کے ازالہ کا سامان کر دیا گیا۔ سوچئے آج جو لوگ انسانوں کو یہ سبق پڑھا رہے ہیں کہ انسان بجائے آدم زادہ ہونے کے حیوان زادہ ہے۔ ان کی اس بات اور ابلیس کے اس دعویٰ میں کہ آدم کیا ہے صرف خاک زادہ ہے کیا فرق ہے۔ دونوں میں انسان کو اس کے مرتبہ انسانیت سے

گرانے میں ہم آہنگی ہے۔ نظریات دونوں میں ایک انسان کو طینی کہتا ہے اور دوسرا بوزینی۔ بتائیے فرق کیا ہے
مولانا گیلانی نے اس موقعہ پر کیا خوب کہا ہے۔

اس نے طینی کہہ دیا اور اس نے بوزینی کہا سچ تو یہ ہے کہ ڈارون ابلیس سے
کچھ کم نہ تھا

قرآن کو ہمیشہ سے اس پر اصرار رہا ہے اور ہے کہ آدمی بہرحال آدمی ہے وہ جب دنیا میں پیدا کیا جاتا ہے تو اس وقت بھی وہ انسان اور آدمی بن کر پیدا ہوتا ہے جب تک زمین کے اس کرے پر جیتا ہے تو آدمی ہی بن کر جیتا ہے۔ حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی دوسری زندگی کو سے کر جب وہ میدانِ قیامت آئے گا تو اس وقت بھی وہ آدمی ہی رہے گا۔ اور جزا و سزا کے فیصلوں کے بعد جو جنت میں جائیں گے وہ بھی آدمی ہونے کے سوا اور کچھ نہ ہوں گے۔ برناڈ شا نے نظریہ ارتقاء کے بارے میں صحیح کہا تھا۔

ہم اس نئے انکشاف کی لذت میں ایسے مدہوش ہوئے کہ فوراً شیطان کے ہمسفر
ہو گئے۔

بہرحال بات ہو رہی تھی شیطان کے اس ادعا کی کہ میں ناری ہوں اور آدم پر اس کی کہ یہ طینی ہے میں ناری ہو کر کیسے جھک سکتا ہوں۔ آپ اس جواب کو پڑھ کر آگے نہ چلیں۔ ذرا اس کے اندر جھانک کر دیکھئے کہ خدا کے روبرو اس جواب میں ہمارے لیے کتنے اسباق ہیں۔

اس میں سب سے پہلا سبق یہ ہے کہ خدا کی بات پر اپنے میلانِ طبع اور رجحانِ نفس کے خلاف ہونے کی وجہ سے اعتراض صراحۃً کفر ہے۔ اسی میں وہ شخص بھی داخل ہے جو خدا کی بات کو خلافِ عقل کہہ کر رد کر دیتا ہے۔ قرآن نے سمجھایا ہے کہ اگر ایک طرف ہمارے شخصی مفادات، عقلی تقاضے، ذاتی ولولے ہوں اور دوسری طرف حکمِ الٰہی ہو تو حکمِ الٰہی کی پیروی ضروری ہے۔

دوسرا سبق یہ بھی ملتا ہے کہ خدا کے حکم کے سامنے تجتیں پیش کر کے اعتراض کرنا شیوہ بندگی نہیں ہے۔
تیسرا سبق یہ بھی ہے کہ حکمِ الٰہی کی پابجائی کو اپنی خواہش، رائے، بصیرت کے موافق ہونے کی شرط کرنا طاعت سے سرتاسر انحراف ہے بلکہ اپنے کو مقامِ بندگی سے نکال کر خدا کے مدِ مقابل بنانا ہے۔ اگر ہر ادارے کے ملازمین بھی فیصلہ کر لیں کہ رئیس ادارے کی صرف ان باتوں میں اطاعت کی جائے گی جن میں ان کی ہوائے نفس کی ترجمانی ہو گی تو بتائیے اس ادارے کی تباہی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی

یہ نکتہ آفرینی یہاں برمحل ہے کہ ہر ایسا شخص شیطان کا وارث ہے جو اپنی رائے اور رویت کو چاہے وہ کشف پر مبنی ہو یا وجدان و ذوق پر شریعت کے مقابلہ میں ترجیح دیتا ہے۔ (ماجدی)

ابلیس کے اس استدلال میں کہ میں نار زادہ ہونے کی وجہ سے خاک زادہ سے افضل اور اچھا ہوں اس بات کی بھی نشاندہی ہے کہ شرف و عزت کا تعلق نسل و نسب سے ہے اور اس اعتبار سے وہ انسان سے اشرف ہے کہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے آدم مٹی سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور آگ مٹی سے افضل ہے۔ ابلیس کا یہ استدلال قطعاً غلط ہے آگ مٹی سے افضل نہیں مٹی آگ سے افضل ہے۔ قرآن نے یہاں رہنمائی دی ہے کہ شرف و عزت کو نسل و نسب سے متعلق سمجھنے کا فلسفہ ابلیس کی ایجادات میں سے ہے اور جہاں کہیں بھی یہ موجود ہے اسی کی وراثت کی حیثیت سے موجود ہے۔ اللہ کے یہاں جو چیز عزت و سرخروئی کا سبب ہے وہ صرف اللہ کے حکم کی اطاعت ہے۔ اس کے سوا کوئی چیز بھی خدا کے یہاں عزت پانے کا ذریعہ نہیں ہے۔

بہرحال ابلیس حضرت آدم کی ظاہری شکل و صورت میں کھویا اس کو یہ بھی یاد رہا کہ آدم کی تخلیق خاک سے ہوئی ہے اور اس کی آگ سے اور آگ افضل ہے خاک سے اس اعلیٰ کو کب زیب دیتا ہے کہ ادنیٰ کو سجدہ کرے اس نادان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ آدم کے سر پر تاج خلافت ہے۔ اس کا دل وہ آئینہ ہے جس میں حقیقت کا حسن و جمال ہے نفخت فیہ من روحی اس کو یہ نظر نہ آیا کہ آدم کو خلعت بیدی کا شرف حاصل ہے اور اس پر یہ بھی خیال نہیں کیا۔ جب نوری مخلوق سجدہ کناں ہے تو نار کی حقیقت ہی کیا ہے اور یہ بھی اس کی کج نظری تھی کہ خاک کے مقابلہ میں آگ افضل ہے۔ اپنی صفات و خصوصیات کے لحاظ سے جو مقام خاک کا ہے وہ آگ کو حاصل نہیں۔ آگ کا خاصہ تباہی و بربادی ہے اس کی طبیعت میں خفت حدت اور تیزی ہے جبکہ خاک میں متانت، وقار، حلم، صبر اور سکون و ثبات ہے۔ مٹی انسان اور حیوان کی غذاؤں کا خزانہ اور لباس و آرائش، وسائل معاش کا ذریعہ ہے، خاک سامان برکت ہے۔ غرور، ارتفاع اور بڑائی آگ کے لوازم ہیں جب کہ خاکساری، نیازمندی خاک کی خصوصیت ہے۔ آگ کی حیثیت حروف کی ہے کہ قائم بالذات نہیں ہوتے بلکہ اپنے مطالب کے لیے اسم اور فعل کے محتاج ہوتے ہیں۔ آگ بھی اپنے وجود کے لیے دوسرے کی محتاج ہوتی ہے۔ اس کا اپنا وجود ذاتی نہیں ہے۔ اس کے برعکس خاک کی اپنی ہستی ہے یہ اپنے ہونے کے لیے کسی کی محتاج نہیں ہے۔ آگ خاک کی محتاج ہے خاک آگ کی محتاج نہیں ہے بہرحال خاک کے مقابلہ میں آگ ہیچ در ہیچ ہے اس لیے یہ ابلیس کی کج فہمی تھی کہ اس نے آگ کو خاک سے برتر سمجھا۔

ابلیس اور قیاس

یہاں مفسرین نے امام الحسن البصری کے حوالہ سے یہ روایت درج کی ہے کہ سب سے پہلا قیاس کرنے والا ابلیس ہے۔ ابن کثیر نے اس کی سند کو سند صحیح بتایا ہے۔ اس کی مدد سے کچھ لوگوں نے ابلیس کے اس استدلال سے قیاس شرعی کے وجود کا انکار کر دیا ہے حالانکہ ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ یہاں ابلیس نے رائے کے ذریعے امرِ الٰہی کا مقابلہ کیا ہے۔ یعنی اپنی خود بینی اور رائے سے نص کو رد کیا ہے اور یہی منشا ہے اذا امرتک کا۔ ایسا قیاس سب کے نزدیک ناجائز ہے جس میں رائے کے زور سے اصول کو رد کر دیا جائے جس قیاس کو حجتِ شرعیہ کی حیثیت سے اسلامی قانون میں مصدر مانا گیا ہے وہ صرف دو ہیں ایک یہ کہ کسی حکم کو جو کسی خاص امر سے متعلق ہے کسی دوسرے امر پر منطبق کیا جائے بشرطیکہ ان دونوں امور کے مابین کوئی علت مشترک ہو۔ اس طرح جب دو امور میں کوئی مشابہت پائی جائے اور ان میں کسی ایک کی نسبت شریعت کا کوئی حکم موجود ہو تو دوسرے کے متعلق یہ مان لیا جاتا ہے کہ اس کا بھی حکم یہی ہے، کیونکہ دونوں کی علت مشترک ہے گویا حکم بھی موجود ہو اور حکم کی علت بھی موجود ہو اس پر قیاس کر کے کسی ایسے معاملہ کا فیصلہ کیا جائے جس میں علت مشترک ہو مثلاً قرآن میں ہے:

يسئلونك عن المحيض قل هو اذى فاعتزلوا النساء

دیکھئے یہاں حکم بھی موجود ہے کہ زمانہ حیض میں عورتوں کے قریب جانا منع ہے اور علت بھی موجود ہے کہ حیض گندگی اور نجاست ہے۔ اب حیض کے علاوہ جہاں یہ علت پائی جائے گی حکم بھی موجود ہو گا نفاس کو بھی اسی پر قیاس کیا جائے گا۔ قیاس کی دوسری صورت یہ ہے کہ قیاس حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیش کردہ ہو۔ مثلاً حضور انور نے خالہ، بھانجی اور پھوپھی بھتیجی کو نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا اور علت یہ بتائی کہ قطعتم ارحامکم ایسا کرنے سے تم قطع رحمی کا ارتکاب کرو گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے اسے ان تجمعوا بين الاختين پر قیاس کیا ہے۔ ان دو قیاسوں کے حجت شرعی ہونے پر امتِ اسلامیہ کی اکثریت متفق ہے۔ اس لیے قیاس ممنوع یہ ہے۔ گمان اور رائے کے زور سے اصول کو رد کر دیا جائے یہاں ابلیس نے رائے کے زور سے اصل علم کو رد کر دیا ہے اسی لیے توبیخ میں اذا امرتک، فرمایا ہے قرآن کی اس آیت کا قیاس شرعی سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے اور ہو بھی کیسے سکتا ہے اس پر سب کا اتفاق ہے کہ احکام متناہی ہیں اور حوادث و واقعات جو روزانہ نت نئے پیش آ رہے ہیں وہ ان گنت ہیں۔ الشہرستانی رقمطراز ہیں۔

ہمیں اس کا قطعاً علم ہے کہ حوادث و واقعات خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے بے حساب اور بے شمار ہیں اور یہ بھی ہمیں پتہ ہے کہ ہر ہر واقعہ اور حادثہ کے بارے میں صاف اور صریح حکم نہیں ہے اور ایسا ممکن بھی نہیں ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہے کہ حوادث و واقعات ان گنت ہیں اور احکام مقرر ہیں تو اس کا نتیجہ لازماً یہ ہے کہ لامتناہی متناہی کی گرفت میں نہیں آ سکتا اس لیے یہ بات حتمی اور قطعی ہے کہ اسلام میں قیاس کا خاص مقام ہے تاکہ ہر پیش پا افتادہ حالت کے لیے قیاس کے ذریعہ راستہ معلوم کیا جا سکے[1]

قرآن نے ان حوادث کے لیے اعتبار و استنباط اور نبوت نے اجتہاد کا اُمت کو پیمانہ دیا ہے کہ ایک طرف اسلامی قانون کو بازیچہ اطفال بننے سے محفوظ کر دیا اور دوسری طرف اسلامی معاشرے کو بے راہ روی آوارگی اور بے قید زندگی کی برائیوں سے بچا لیا۔ اس بنا پر گنتی کے چند لوگوں کو چھوڑ کر پوری اُمت نے قیاس کی قانونی حیثیت کو مانا ہے۔

امام شافعی کے مشہور شاگرد امام مزنی قیاس پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لے کر آج تک دینی معاملات میں فقہاء قیاس سے برابر کام لیتے رہے ہیں۔ ان کا اس پر اجماع ہے کہ حق کی نظیر حق ہے اور باطل کی نظیر باطل ہے لہٰذا قیاس کا انکار درست نہیں ہے کیونکہ وہ مماثل اشیاء پر مماثل احکام کا نام ہے[2]

حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پیش آنے والے حوادث میں اجتہاد سے کام لیتے تھے اور بعض احکام کو بعض احکام پر قیاس کرتے تھے اور ایک نظیر سے دوسری نظیر قائم کرتے تھے[3]

امام ابوبکر شمس الائمہ سرخسی نے اس موضوع پر مفید بحث کی ہے وہ فرماتے ہیں :

قیاس سے شریعت میں کام لینا صحابہ اور ان کے بعد تابعین اور ائمہ دین کا مذہب ہے۔ سب سے پہلا شخص جس نے قیاس کے جواز کا انکار کیا ہے وہ ابراہیم نظام ہے۔ بغداد

---

[1] الملل والنحل [2] جامع بیان العلم [3] اصول سرخسی۔

کے کچھ متکلمین نے اس کی پیروی کی ہے - بعدازیں داؤد آئے اور انہوں نے متقدمین کے اس سے متعلق افکار معلوم کیے بغیر ہی قیاس پر عمل کے ابطال کا اعلان کر دیا اور لوگوں کو بتایا کہ شریعت میں قیاس حجت نہیں، ان کی پیروی میں وہ تمام ظاہریہ جو غور و فکر کی نعمت سے ان کی طرح محروم ہیں یہی کچھ کہنے لگے اور ان میں سے کچھ نے یہی بات قتادہ مسروق اور ابن سیرین کی طرف منسوب کی ہے - یہ ان بزرگوں پر اتہام ہے - ان کا مقام اس سے کہیں بالا و بالا ہے کہ اس قسم کی بات کہیں [1]

حافظ ابن عبدالبر مغربی نے حافظ ابوالقاسم بغدادی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ

> نظام سے پہلے قیاس کا منکر میرے علم میں کوئی نہیں ہے -

اور اپنا یہ تاثر بھی ظاہر کیا ہے کہ

> فقہاء اور تمام اہل السنت کا موقف یہ ہے کہ عقائد میں قیاس روا نہیں ہے - اور احکام میں درست ہے - داؤد نے احکام میں بھی انکار کیا ہے [2]

الغرض یہ مسئلہ اہل حق میں کوئی خاص اختلافی نہیں ہے -

کبر کا نتیجہ ذلت و خواری ہے

۹ - فرمایا اتر جا یہاں سے تیری یہ ہستی نہیں ہے کہ یہاں رہ کر سرکشی کرے - یہاں سے نکل دور ہو - یقیناً تو ان میں سے ہے جو ذلیل و خوار ہوں گے - یعنی جنت یا آسمانوں میں خدا کی وہ مخلوق رہ سکتی ہے جو خدا کی پوری مطیع و فرمانبردار ہو - نافرمان منکروں کے لیے وہاں کوئی گنجائش نہیں ہے - بہرحال ابلیس لعین عزت کے اس مقام سے جس پر کثرت عبادت وغیرہ کی وجہ سے اب تک جائز تھا بڑا بول بولنے کی بدولت نیچے دھکیل دیا گیا - ابلیس کی مدت دراز تک زمرۂ ملائکہ میں شامل رکھنے سے متنبہ کر دیا کہ حق تعالیٰ نے مکلفین میں کسی کی فطرت ایسی نہیں بنائی ہے کہ وہ صرف بدی کی طرف جانے کے لیے مجبور و مضطر ہو جائے بلکہ خبیث سے خبیث ہستی بھی اصل فطرت کے اعتبار سے اس کی صلاحیت رکھتی ہے کہ اپنے کسب و اختیار سے نیکی اور پرہیزگاری میں انتہائی ترقی کر کے زمرۂ ملائکہ میں جا ملے [3] جانتے بوجھتے خدا کے حکم سے سرکشی تکبر ہے - حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین

[1،2] جامع بیان العلم [3] افادات شیخ الاسلام

میں لکھا ہے کہ خدا کی سب سے پہلی نافرمانی تکبر اور حرص کے ذریعے وجود میں آئی ہے۔ تکبر ابلیس کی معصیت ہے اور اس کا انجام معلوم ہے اور حرص حضرت آدم کا گناہ ہے اور اس کا انجام توبہ اور ہدایت ہے۔ تکبر کی معصیت نے ابلیس کو خدا کے مقابلے میں کٹ حجتی اور گناہ کے اصرار پر آمادہ کر دیا۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ متکبر مشرک سے بھی بدتر ہے کیونکہ مشرک تو غیر اللہ کی عبادت کرتا ہے لیکن متکبر تو اللہ کی عبادت سے سرکشی اختیار کرتا ہے۔ جو اس تکبر میں مبتلا ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو خدا سے بڑا یا اس کا ہمسر ٹھہراتا ہے۔ کبریائی صرف خدا کے لیے زیبا ہے جو اس میں حصہ بٹانے کے مدعی بنتے ہیں ان پر خدا کی طرف سے ذلت کی مار پڑتی ہے۔ متکبر کے لیے خدا کی جنت میں کوئی جگہ نہیں۔ متکبرین کا مقام جہنم ہے۔ سورۃ زمر میں جہنم کے ذکر میں ہے فلبئس مثوی المتکبرین اور سورہ غافر میں ہے فلبئس مثوی المتکبرین۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

جس دل میں رائی برابر کبر ہوگا جنت میں داخل نہ ہوگا

اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کا اصل جرم تکبر تھا۔ جس کی پاداش میں اسے جنت سے نکالا گیا۔ اصل ارشاد میں تعبیر اس طرح ہے فاھبط منھا فما یکون لک ان تتکبر فیھا فاخرج انک من الصاغرین۔ ہبوط کے معنے اونچی جگہ سے نیچی جگہ آنے کے بھی ہیں اور درجہ اعلیٰ سے درجہ ادنیٰ میں ہونے کے بھی ہیں۔ اس لحاظ سے ہبوط مادی اور معنوی دونوں طرح کا ہوتا ہے۔ منہا کی ضمیر کا مرجع الجنۃ بھی ہو سکتا ہے اور وہ درجہ بھی ہو سکتا ہے جو ابلیس کو ملائکہ میں حاصل تھا۔ حافظ ابن کثیر نے اسے بھی ایک احتمال بتایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سرکشی کی پاداش میں جنت سے اتر جا یا یہ کہ اس مرتبہ عالیہ سے نیچے ہو جا۔ حضرت مولانا اشرف علی کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ کبر کی بنا پر درگاہ الٰہی سے نکالا جانا اس کی دلیل ہے کہ کبر وصول حق سے مانع ہے۔ یاد رہے کہ عمل کی دنیا میں کبر چار طرح کا ہوتا ہے ایک یہ کہ اللہ کے حکم کا مقابلہ فکر عقل سے کیا جاتا ہے، دوسرا یہ کہ اللہ کی وحی کا مقابلہ رائے اور قیاس سے کیا جاتا ہے، تیسرا یہ کہ اللہ کی وحی کا مقابلہ وجدان و ذوق سے کیا جاتا ہے، چوتھے یہ کہ اللہ کی وحی کا مقابلہ سیاست اور ملکی و قومی مصالح اور مفادات سے کیا جاتا ہے۔ پہلا کبر فلاسفہ اور مناطقہ کا، دوسرا کبر فکری آوارگی اور فکری صلاحیتوں سے محروم قانون دانوں کا، تیسرا کبر کشف وجد اور ذوق و شوق کی طرف مائل صوفیاء کا اور چوتھا کبر ان حکمرانوں اور فرماں رواؤں کا جو ہر قدم پر شریعت اور قانون الٰہی کے مقابلے میں اپنی سیاسی مصالح اور قومی مفادات کو ترجیح دیتے ہیں۔ کبر کی ہر نوع مذموم ہے خواہ کہیں ہو، کبر کا مآل ذلت و صغار ہے انک من الصاغرین میں یہی بات بتائی گئی ہے۔ صاغرین صاغر کی جمع ہے۔ اصل میں اس شخص کو کہتے ہیں جو ذلت و صغار اور چھوٹی حیثیت کو خود اختیار کرے۔ مطلب یہ ہے کہ بندہ اور مخلوق ہونے کے باوجود تیرا اپنی بڑائی

اور گھمنڈ میں مبتلا ہونا اور اپنے رب کے حکم سے اس بنا پر سرتابی کرنا کہ اپنی عزت و برتری کا جو تصور تو نے خود قائم کر لیا ہے اس کے لحاظ سے وہ حکم تجھے اپنے لیے موجب توہین نظر آتا ہے۔ یہ دراصل یہ معنے رکھتا ہے کہ تو خود اپنی ذلت چاہتا ہے۔ بڑائی کا جھوٹا پندار عزت کا بے بنیاد ادعا اور کسی ذاتی استحقاق کے بغیر اپنے آپ کو خواہ مخواہ بزرگی کے منصب پر فائز سمجھ بیٹھنا تجھے بڑا اور ذی عزت اور بزرگ نہیں بنا سکتا بلکہ یہ تجھے چھوٹا اور ذلیل ہی بناتے گا۔

قیامت تک حق و باطل کی آویزش

۴ ۔ ابلیس نے کہا کہ مجھے اس وقت تک کے لیے مہلت دے دے جب لوگوں کو اٹھایا جائے گا۔ فرمایا، تجھے مہلت ہے۔ یعنی جب تو نے یہ درخواست کی تو سمجھ لے کہ یہ پہلے سے علم الٰہی میں طے شدہ ہے کہ تجھ کو مہلت دی جاتے جب حکمت الٰہی مقتضی ہوئی کہ حق تعالیٰ اپنی صفات کمالیہ و شہنشاہانہ عظمت و جبروت کا مظاہرہ کرے تو اس نے عالم کو پیدا فرمایا اللہ الذی خلق سبع سماوات و من الارض مثلھن یتنزل الامر بینھن لتعلموا ان اللہ علی کل شیءٍ قدیر و ان اللہ قد احاط بکل شیءٍ علماً، یعنی زمین و آسمان کی تخلیق اور ان کے کل نظم و نسق سے مقصود یہ ہے کہ خدا کی قدرت کاملہ اور علم محیط وغیرہ صفات کی معرفت لوگوں کو حاصل ہو۔ اسی معرفت الٰہیہ کو آیت وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون میں بعض سلف کی تفسیر کے مطابق عبادت سے تعبیر فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ تخلیق عالم سے یہ غرض بوجہ اتم جب ہی پوری ہو سکتی ہے کہ مخلوقات میں اس کی ہر قسم کی صفات و کمالات کا اظہار ہو اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ عالم میں مطیع و فرمانبردار اور باغی و مجرم ہر قسم کی مخلوق موجود ہو۔ نیز اعداء اللہ کو پوری زور آزمائی اور ان کے پیدائشی اختیار و قوت کے تمام وسائل استعمال کرنے کی آخری حد تک مہلت و آزادی دی جاتے۔ پھر انجام کار حکومت الٰہیہ کا لشکر غالب ہو۔ دشمن اپنے کیفر کردار کو پہنچیں اور بعد امتحان آخری کامیابی دوستوں کے ہاتھ رہے۔ اس کے بغیر تمام صفات کمالیہ کے ظاہر ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ پس خیر و شر اور منبع خیر و شر کا پیدا کرنا اسی حکمت سے ہے کہ جو غرض تخلیق عالم کی ہے یعنی صفات کمالیہ کا مظاہرہ وہ بغیر اس کے پوری نہ ہو سکتی تھی ولو شاء ربک لجعل الناس امۃً واحدۃً ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربک ولذالک خلقھم (ہود رکوع ۱۰) اسی لیے ضروری ہوا کہ عدو اکبر ابلیس لعین کو جو منبع شر ہے پوری مہلت دی جاتے کہ وہ تا قیام قیامت اپنے قویٰ و وسائل کو جی کھول کر استعمال کرے لیکن یہ چیز ظاہر ہے کہ

براہِ راست اس محیط کل اور قادر مطلق کے مقابلہ پر ممکن نہ تھی۔ اس لیے ضرور ہوا کہ خدا کی طرف سے بطور نیابت و خلافت ایک ایسی مخلوق مقابلہ پر لائی جائے جس سے ابلیس لعین کو آزادی کے ساتھ جنگ آزمائی کا موقع مل سکے، قرآن میں ہے :

واجلب علیھم بخیلک ورجلک وشارکھم فی الاموال والاولاد وعدھم وما یعدھم الشیطان الا غرورا ،

اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا دے مال اور اولاد میں ان کے ساتھ ساجھا لگا اور ان کو وعدوں کے جال میں پھنسا دے اور شیطان کے وعدے ایک دھوکہ کے سوا اور کچھ ہی نہیں۔

اور پھر جب تک وہ مخلوق حق نیابت اور وظیفہ خلافت ادا کرتی رہے خاص شاہی فوج (ملائکہ) سے اس کو کمک پہنچائی جائے اور باوجود ضعف و قلت کے اپنے فضل و رحمت سے انجام کار دشمنوں کے مقابلہ میں مظفر و منصور کیا جائے۔ بس خوب سمجھ لو کہ یہ زمین ابلیس اور آدم کا میدانِ جنگ ہے۔ اور چونکہ پوری طرح جان توڑ مقابلہ اسی وقت ہو سکتا تھا کہ دونوں حریف ایک دوسرے سے خار کھاتے ہوں اس لیے تکوینیاً دو صورتیں ایسی پیش آگئیں جن سے ہر ایک کے دل میں دوسرے کی دشمنی جاگزین ہو جائے ابلیس آدم کو سجدہ نہ کرنے کی بنا پر نیچے گرایا گیا اور آدم علیہ السلام کو ابلیس کی وسوسہ اندازی کی بدولت جنت سے علیٰحدہ ہونا پڑا۔ ان واقعات سے ہر ایک کے دل میں دوسرے کی عداوت کی جڑ قائم ہو کر معرکہ کارزار گرم ہو گیا۔ والحرب سجال وانما العبرۃ للخواتیم[1] ابلیس کو چونکہ ذلت کے ساتھ جنت سے یا مرتبہ بالا سے ہٹایا گیا تھا۔ اس وجہ سے اس کو خیال ہوا کہ اب اس کے لیے سعی و عمل کی کوئی مہلت نہیں دی۔ اس پر اس نے خدا سے درخواست کی کہ مجھے مہلت عطا کی جائے کہ میں ثابت کر سکوں کہ انسان فی الواقع اس شرف کا سزاوار نہیں ہے جو اسے بخشا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ مہلت دی۔ یہی وہ موڑ ہے جہاں سے انسان کی تکلیفی زندگی ابتلائی بنتی ہے۔ یعنی شیطان کو اپنا پورا زور اس پر لگانا ہے کہ وہ انسان کو نالائق ثابت کرے اور انسان کی سعادت یہ ہے کہ وہ یہ ثابت کرے کہ وہ فی الواقع اس شرف کا جو خلافت کی صورت میں اسے ملا ہے اہل ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ پیدا کرنے والے نے انسان کو جس نصب العین کی تکمیل کے لیے پیدا کیا ہے جو

[1] افادات شیخ الاسلام

جتنا اس نصب العین سے ہٹتا ہے شیطان کی صورت میں قدرت کا انتقامی تازیانہ اس پر برستا رہتا ہے۔ ٹھیک جیسے بل سے نکلنے والے چوہے کو بلی دبوچ لیتی ہے اپنے نصب العین سے ہٹنے والے انسانوں کو شیطان بھی اسی طرح دبوچ لیتا ہے۔

سعی و عمل کی مہلت چونکہ انسان کو موت تک حاصل ہے اس لیے شیطان کو بھی ورغلانے اور بہکانے کا موقع صرف انسان کی موت تک ملا ہے۔ مرجانے کے بعد جس طرح انسان پر سعی و عمل کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اسی طرح شیطان کے لیے اس زور آزمائی کی راہ بھی مسدود ہو جاتی ہے لیکن یہ فیصلہ کہ کون جیتا ہے اور کون ہارا، قیامت کے دن ہونا ہے۔ اسی لیے ابلیس نے مہلت الی یوم یبعثون مانگی جس کے معنے یہ ہوئے کہ اس نے اپنی یہ درخواست منظور کرا کے انسان کے شرف و عزت کے اظہار کا فیصلہ قیامت پر ملتوی کرا دیا۔ اب وہیں یہ فیصلہ ہوگا کہ انسان تاج زریں کا سزاوار ہے۔

ابلیس کا چیلنج

۱۱۔ ابلیس نے کہا کہ چونکہ تو نے مجھ پر راہ بند کر دی ہے تو اب میں بھی ایسا کروں گا کہ تیری سیدھی راہ سے بھٹکانے کے لیے بنی آدم کی تاک میں بیٹھوں گا سامنے سے پیچھے سے داہنے سے بائیں سے ان پر آؤں گا اور تو ان میں سے اکثروں کو شکرگزار نہ پائے گا۔ یعنی رہزنوں کی طرح ان کے ایمانوں پر ڈاکہ ماروں گا جن کے سبب یہ روزِ بد دیکھنا پڑا۔ اور میں ہر طرف سے ان پر حملہ آور ہوں گا۔ جہاتِ اربعہ کا ذکر تعمیم جہات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہے اور اکثر کے ناشکرگزار ہونے کا تخمینہ خود ابلیس کا تھا جو صحیح نکلا و لقد صدق ابلیس ظنہ فاتبعوہ (السباء رکوع ۲)[1] اصل ارشاد میں فبما اغویتنی آیا ہے۔ اس کے معنی غوایۃ میں ڈالا ہیں۔ باسببیت کے لیے ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اس وجہ سے کہ تو نے مجھے آدم کی خاطر بے راہ بنا دیا ہے میں ضرور اولاد آدم کی راہ ماروں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان اپنی نافرمانی کا کل ذمہ داری حق سبحانہ پر ڈال رہا ہے کہ تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا۔ گویا اسے شکایت ہے کہ آدم کے آگے سجدہ کا حکم دے کر تو نے مجھے فتنہ میں ڈالا اور میرے نفس کے تکبر کو ٹھیس لگا کر مجھے اس حالت میں مبتلا کر دیا کہ میں نفسی تیری نافرمانی کی۔ گویا اس احمق کی خواہش یہ تھی کہ اس کے نفس کی چوری پکڑی نہ جاتی بلکہ جس پندار غلط اور جس سرکشی کو اس نے اپنے اندر چھپا رکھا تھا اس پر پردہ ہی پڑا رہنے دیا جاتا۔ یہ ایک کھلی ہوئی سفیہانہ بات تھی جس کا جواب دینے

لہ افادات شیخ الاسلام

کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے سرے سے اس کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ صراط مستقیم نبوت کے ذریعے خدا کی جانب سے آئی ہوئی علم و عمل کی وہ راہ ہے جس کا تعارف سورہ فاتحہ میں صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین ہے جب تک انسان اس راہ پر قائم رہتا ہے اس وقت تک وہ سست رو اور آبلہ پا ہو کر رو بمنزل رہتا ہے۔ اس وجہ سے دیر سویر منزل پر پہنچ ہی جاتا ہے۔ برعکس اس کے اگر وہ نبوت سے ہٹ جائے تو اصل منزل سے رو گرداں ہو جاتا ہے اور پھر جتنے قدم بھی وہ آگے بڑھتا ہے اس کا ہر قدم ایک نئی ضلالت کو دعوت دیتا ہے۔ یہ رمز ہے جس کی وجہ سے شیطان کو انسان پر پوری فتح کا اس وقت تک پورا موقعہ نہیں ملتا جب تک وہ نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے علماً و عملاً وابستہ رہتا ہے۔ اور جونہی نبوت کی شاہراہ سے ہٹتا ہے شیطان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ شیطان نے اپنے چیلنج میں یہاں صاف کہہ دیا کہ انسان کی گھات میں نبوت کی صراط مستقیم پر بیٹھے گا اور اس راہ سے اس کو بے راہ کرنے کی کوشش کرے گا اور صرف کوشش ہی نہیں کرتا بلکہ ہمہ جہت حملہ آور ہوتا ہے۔ اسی چیلنج میں یہ بھی ہے کہ ثم لاٰتینّھم من ایدیھم و من خلفھم و عن ایمانھم و عن شمائلھم اس میں شیطان کے حملہ کی قوت وسعت اور ہمہ گیری کا خود اس کی زبان سے وہ ہر جہت ہر سمت ہر پہلو سے انسان پر حملہ کرے گا۔ وہ اس کے مشاہدات، احساسات، جذبات، خواہشات ہر منفذ سے اس کے اندر گھسنے کی کوشش کرے گا۔ وہ اس کے فکر، فلسفہ، علم ادراک ہر چیز کو مسموم کرے گا۔ وہ اس کی تحقیق، تنقید، تصنیف و تالیف ادب آرٹ لٹریچر ہر چیز میں زہر گھولے گا۔ وہ اس کی تہذیب، تمدن، معیشت، معاشرت، فیشن، کلچر، سیاست اور مذہب ہر چیز کے اندر فساد پیدا کرے گا۔ یہی اس کا کام ہے۔ قرآن میں مختلف مقامات میں

ان عبادی لیس لک علیھم سلطان

میرے بندوں پر تجھے قابو حاصل نہیں ہے

کے اعلان کے ساتھ اس کو حکم دیا گیا ہے

واستفزز من استطعت منھم بصوتک واجلب علیھم بخیلک و رجلک و شارکھم فی الاموال والاولاد وعدھم ما یعدھم الشیطان الا غرورا۔

ترجمہ جس جس کو اپنی دعوت سے پھسلا سکتا ہے پھسلا لے، ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا مال اور اولاد میں ساجھا لگا اور ان کو وعدوں کے جال میں پھانس اور شیطان کے وعدے دھوکہ اور فریب کے سوا کچھ نہیں۔

نبوت کی راہ سے انحراف زندگی رکھنے والے جو چیختے چلاتے بھی جاتے ہیں چلتے بھی جاتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ بڑھتے بھی جاتے ہیں تو فی الواقع وہ خود نہیں بڑھتے بلکہ یہ شیطان ہی ان کو بڑھاتا اور چڑھاتا جاتا ہے۔ اسی موقع پر شیطان کی زبانی یہ الفاظ نقل کیے گئے کہ اس نے آدم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

لاحتنکن ذریتہ الا قلیلاً

تھوڑوں کے سوا میں اس کی اولاد کو ڈھائی لگاؤں گا۔

کبھی گدھوں اور گھوڑوں کے منہ پر بجائے لگام کے لوگ رسی باندھ کر کھینچ لے جاتے ہیں۔ اسی کو اردو میں ڈھائی لگانا اور عربی میں احتناک کہتے ہیں۔ یعنی جیسے گدھوں اور گھوڑوں کو ڈھائی لگانا ان کی تذلیل ہے شیطان نے دعویٰ کیا ہے کہ میں لوگوں کو گھسیٹوں گا اور ذلت کے ساتھ گھسیٹوں گا۔ گھسٹنے والوں کا یہ تماشا کتنا دردناک ہے۔ اس کا کام ہی یہ ہے کہ جس چیز میں درحقیقت غنا بخشی کی قوت نہیں وہ باور کراتا ہے کہ یہی آدمی کو غنی بناتی ہے۔ خلود بخشی کی خاصیت سے جو واقع میں محروم ہے دھوکہ دیتا رہے کہ یہی خلود بخش ہے جن اعمال و افعال کا بالآخر کوئی نتیجہ نہیں شیطان باور کراتا رہتا ہے کہ وہی نتیجہ خیز ہیں۔ جس راہ پر چلنے والوں کو کچھ نہیں ملتا سکھاتا رہتا ہے کہ سب کچھ اسی راہ میں ملتا ہے۔ الغرض جو ہے شیطان کی تسلیط کے بعد یہ نظر آتا ہے کہ وہی نہیں ہے اور جو نہیں ہے وہی نظر آتا ہے کہ ہے۔ یہی مطلب ہے کہ و مایعدھم الشیطان الا غروراً کا۔ اس آیت سے شیطان کے پروپیگنڈے کے زور اور اس کی وسعت کا بھی پتہ چلتا ہے اور یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے منصوبے کو بروئے کار لانے کے لیے سیاسی ہتھکنڈے بھی استعمال کرے گا۔ البتہ ایک پہلو اس میں تسلی کا ہے ان عبادی لیس لک علیھم سلطان میرے بندوں پر تجھے اقتدار نہ ہوگا۔ وہ صرف اس بات کا مجاز ہوگا کہ ان کو غلط فہمیوں میں ڈالے، جھوٹی امیدیں دلائے بدی اور گمراہی کو ان کے سامنے خوشنما بنا کر پیش کرے۔ لذتوں اور فائدوں کے سبز باغ دکھا کر غلط راستوں کی دعوت دے لیکن اسے یہ طاقت نہیں ہے کہ خدا کے بندوں کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اپنے راستے پر کھینچ لے۔ اگر وہ خود راہ راست پر چلنا چاہیں تو انہیں چلنے نہ دے۔ آخر میں فرمایا ہے ولا تجد اکثرھم شاکرین اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت نبوت کے علم و عمل کی نعمت سے بیگانہ رہے گی اور اس نعمت کا شکر ادا نہ کرے گی اور اپنی زندگی کے مسائل میں عبادت اور طاعت کے لیے تیرے سوا اپنی توجہات کا مرکز اوروں کی بناتے گی۔ عبداللہ ابن عباس کے لفظوں میں شاکرین کی تفسیر موحدین سے کرد۔ اور الحسن البصری کی زبان میں مطیعین سے کہ دحاصل دونوں کا ایک ہے۔ مطلب یہی ہے کہ تیری عبادت اور طاعت نہ کریں گے۔ تیرے سے ہٹ کر اوروں کے ہو جائیں گے۔

خدا کی فیصلہ کن بات

۱۲۔ خدا نے فرمایا کہ یہاں سے نکل جا ذلیل اور ٹھکرایا ہوا، اولادِ آدم میں سے جو بھی تیری پیروی کرے گا تو میں ضرور ایسا کروں گا تم سب سے جہنم بھروں گا۔ یعنی اکثر آدمی ناشکرے ہوں گے تو ہمارا کیا بگاڑیں گے انجام کار ان ہی تھوڑے وفاداروں کے لیے کامیابی و فلاح ہو گی اور ناشکروں کی کثرت دوزخ کی نذر ہو جائیں گی۔ گویا اس طرح واضح کر دیا جائے گا کہ جنود الشیطان کی اس کثرت کے باوجود بھی خلیفۃ اللہ کی قلیل التعداد لشکر کو مغلوب و مقہور نہیں کر سکی لیے شیطان کو منہ مانگی مہلت تو مل گئی لیکن ساتھ ہی ذلیل و خوار ہو کر جنت سے بھی نکالا گیا اور ہمیشہ کے لیے نکالا گیا کیونکہ جنت منکرین اور سرکشوں کا مقام نہیں ہے اور ساتھ ہی ان لوگوں کا انجام بھی بتا دیا جو انسانوں میں سے اس کی پیروی کریں گے فرمایا لمن تبعك منهم لا ملئن جهنم منكم اجمعين ان میں سے جو بھی تیری پیروی کریں ان سے تیرے سمیت جہنم کو بھروں گا۔ جواب پر غور کیجئے اس میں کیسی شان بے نیازی ہے اور کس قدر جبروت کا اظہار ہے۔ آیت میں جہنم کی تنگنائی کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جہنم مظہرِ غضب ہے اور جنت مظہرِ رحمت ہے۔ مظہرِ رحمت مظہرِ غضب کے مقابلے میں وسیع سے وسیع تر ہے۔ اور منهم لا کر یہ بھی بتایا ہے کہ جہنم سب سے نہیں کچھ سے بھری جائے گی۔ اگر سب سے جہنم بھری جاتی تو تعبیر لا ملئن جهنم بكم اجمعين ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مومنین و موحدین میں سے کچھ گناہوں میں شیطان کے پیروکار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو معاف کر دے گا۔

آدم کی زندگی کا دورِ اوّل

۱۳۔ اے آدم تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو اور جس جگہ سے جو چیز پسند ہو شوق سے کھاؤ، مگر دیکھو اس درخت کے قریب بھی نہ جانا اگر گئے تو یاد رکھو کر زیادتی کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ یعنی آدم اور حواؑ کو اجازت تھی کہ بلا روک ٹوک جو چاہیں کھائیں پئیں بجز ایک معین درخت کے جس کا کھانا ان کی بہشتی زندگی اور استعداد کے مناسب نہ تھا اسے فرما دیا کہ اس کے پاس نہ جاؤ ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ میرے نزدیک یہاں فتکونا من الظالمین کا ترجمہ اگر یوں کیا جاتا تو زیادہ موزوں ہوتا تو پھر ہو جاؤ گے تم نقصان اٹھانے والے،

لہ افادات شیخ الاسلام

ظلم کے معنے نقصان اور کمی و کوتاہی کے آتے ہیں جیسے ولم تظلم منه شیأً کہف میں ہے[1]

اس آیت میں الجنۃ سے کیا مراد ہے۔ اس کا ذکر پہلی جلد میں ہو چکا ہے لیکن یہاں اتنی بات ضرور سمجھ لیجئے کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو اپنے فضل سے جس جنت میں جگہ دی تھی وہ پہلے ان کو اور ان کی نسل کو ہمیشہ کے لیے دے دی گئی تھی مگر چونکہ اتفاقاً ان سے گناہ سرزد ہوا اس لیے وہاں سے نکال کر زمین میں بھیج دیے گئے مگر ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ آدم علیہ السلام کا زمین میں آنا تو ان کی پیدائش سے پہلے مقدر ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق سے پہلے ہی فرشتوں پر ظاہر کر دیا تھا انی جاعل فی الارض خلیفہ حضرت آدم کا زمین میں خلیفہ ہونا ان کے زمین میں سکون پذیر ہونے کی پیشین گوئی ہے مگر زمین میں بھیجنے سے پہلے ان کو جنت میں رکھنا پھر گناہ کے بعد وہاں سے ان کو نکال کر زمین میں بھیجنا، یہ اشارہ رکھتا ہے کہ آدم اور ان کی نسل کی اصلی جگہ یہی جنت ہے مگر اس سے دوری ان کے گناہ کی وجہ سے ہے اور اس کا حصول خدا کی اطاعت کے ذریعہ ہوگا۔ اسی لیے جنت کو قرآن میں وراثت کہا ہے تلك الجنة التی اورثتموها وہی جنت ہے جس کا تمہیں وارث بنا دیا ہے لیکن وراثت انسان کو اپنے اعمال خیر ہی کے ذریعے ملے گی بہر حال وراثت کے اشارے سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم کی یہ جنت جس میں آدم کو زمین میں آنے سے پہلے رکھا گیا تھا اولادِ آدم کو وراثت میں ملے گی اور جس جنت میں آدم زمین میں آنے سے پہلے تھے خود قرآن نے اس کا چہرہ یہ پیش کیا ہے۔

ان لك الا تجوع فيها ولا تعرى وانك لا تظمأ فيها ولا تضحى

اس جنت کا تعارف یہ ہے کہ اس میں تو بھوکا نہ ہوگا ننگا اور پیاسا نہ ہوگا اور دھوپ کی تپش نہ اٹھائے گا۔

آدم اس جنت سے نکلے تو ان کو بھوک بھی لگی ننگے بھی ہوتے، پیاس بھی معلوم ہوتی اور دھوپ کی تپش کی تکلیف بھی ہوتی اور زمین میں آکر ان کو ان ہی چار چیزوں کی مشقت میں گرفتار ہونا پڑا۔ روٹی پانی، کپڑا اور مکان یہی چار انسان کی مختصر ضروریات ہیں۔ ان ہی کو اپنی ہوا و ہوس سے پھیلا کر ضروریات کا ایک عالم بنا لیا جس کے مہیا کرنے میں ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے اور عمدہ بنانے میں اپنی موجودہ زندگی کی تمام تر توجہ مصروف کر کے اصل جنت کی طلب سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہیں سے شریعت کی تکلیف عائد ہوئی اور جائز اکل و شرب جائز لباس اور جائز مسکن کے حصول کے طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں سے احتراز کا حکم ہوا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اسی سے شریعت کے اصول، معاملات اور اخلاقِ انسانی کی ذمہ داریاں پیدا ہوئیں اور پھر اس لیے تاکہ اس حیاتِ فانی میں پھنس کر حیاتِ غیر فانی کی طلب کو وہ بھول نہ جائے۔ عرفانِ الٰہی اور عبادتِ الٰہی و اطاعتِ الٰہی کی تلقین ہوئی جو جنت کی اصل غذا اور روزی ہے۔

آیت میں اسکن انت و زوجک الجنۃ فرما کر اشارہ کر دیا کہ عورت رہائش اور معیشت میں مرد کے تابع ہے اور فکلا من حیث شئتما میں ایک طرف جنت کی پہنائی اور وسعتیں بتا دی ہیں اور دوسری طرف معاشی ذخائر کے لامحدود ہونے کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس زندگی میں انسان کی خواہشیں لامحدود ہیں اور نعمتیں محدود ہیں۔ اور جنت میں خواہشیں بھی لامحدود ہوں گی اور نعمتیں بھی لامحدود ہوں گی من حیث شئتما میں دونوں آگئے۔

آخر میں فرمایا کہ لا تقربا ھذہ الشجرۃ اس درخت کے دونوں قریب نہ جاؤ۔ اس پر تبصرہ ہم پہلی جلد میں کر چکے ہیں۔ یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ الشجرہ پر الف لام داخل ہے جس سے یہ بات تو واضح ہوتی ہے کہ مخاطبوں کی حد تک یہ درخت مقرر اور معین ہے رہا یہ سوال کہ یہ درخت کس چیز کا تھا تو اس سوال کا جواب نہ قرآن نے صراحتاً دیا ہے اور نہ کسی صحیح حدیث ہی میں اس کا جواب موجود ہے۔ ہمارے نزدیک صحیح مسلک حافظ ابن جریر کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم تعین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ درخت کس چیز کا ہے۔ کیونکہ اس تعیین کے لیے کوئی دلیل نہ تو ہمیں قرآن ہی میں ملتی ہے نہ حدیث ہی میں۔ اور علامہ آلوسی نے بھی حافظ ابن جریر کی ہمنوائی کی ہے۔

ناصح کے انداز میں شیطان کی فریب کاری

۱۴۔ پھر شیطان نے ان دونوں کو بہکایا تاکہ ان کے ستر جو ان پر چھپے تھے ان پر کھول دے، اس نے کہا کہ تمہارے پروردگار نے اس درخت سے جو تمہیں منع کیا ہے تو صرف اس لیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم فرشتے بن جاؤ یا دائمی زندگی تمہیں مل جائے، اس نے قسمیں کھا کر یقین دلایا کہ میں تم دونوں کی خیر خواہی میں نیک بات سمجھانے والا ہوں بہر حال وہ دونوں کو فریب میں لے آیا۔ آدم و حوا شیطان کی قسموں سے متاثر ہوئے کہ خدا کا نام لے کر کون جھوٹ بولنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ شاید وہ سمجھے کہ واقعی اس کے کھانے سے ہم فرشتے بن جائیں گے یا پھر کبھی فنا نہ ہوں گے اور حق تعالیٰ نے جو نہی فرمائی تھی اس کی تعلیل یا تاویل کر لی ہوگی لیکن غالباً فتکونا من الظالمین اور ان ھذا عدو لک و لزوجک فلا یخرجنکما من الجنۃ فتشقیٰ وغیرہ سے نسیان ہوا اور یہ بھی خیال نہ رہا کہ جب وہ مسجودِ ملائکہ بنائے جا چکے پھر ملک بننے کی کیا ضرورت

رہی فنسی ولم نجدلہ عزماً (طٰہٰ رکوع ۶) واضح ہو کہ امر و نہی کبھی تو تشریعاً ہوتے ہیں اور کبھی شفقۃً۔ اس کو یوں سمجھو کہ مثلاً ایک نوریل میں بدون ٹکٹ سفر کرنے کی ممانعت ہے یہ تو قانونی حیثیت رکھتی ہے جس کا اثر کمپنی کے حقوق پر پڑتا ہے اور ایک جو گاڑی میں لکھا ہوا ہے کہ "مت تھوکو اس سے بیماری پھیلتی ہے" یہ نہی شفقۃ ہوتی ہے جیسا کہ بیماری پھیلنے کی تعلیل سے ظاہر ہے۔ اسی طرح خدا کے اوامر و نواہی بعض تشریعی ہیں جن کی خلاف ورزی کرنے والا قانونی مجرم سمجھا جاتا ہے اور جن کا ارتکاب کرنا ان حقوق کے منافی ہے جن کی حفاظت کرنا تشریع کا منشا تھا۔ دوسرے وہ اوامر و نواہی ہیں جن کا منشا تشریع نہیں ہے محض شفقت ہے۔ جیسا کہ طب نبویؐ کی بہت سی احادیث میں علماء نے تصریح کی ہے۔ شاید آدم علیہ السلام نے اکل شجرہ کی نہی کو نہی شفقت سمجھا۔ اسی لیے شیطان کی وسوسہ اندازی کے بعد اس کی خلاف ورزی کرنے کو زیادہ بھاری نہیں سمجھا مگر چونکہ انبیاء علیہم السلام کی چھوٹی سی لغزش بھی ان کے مرتبہ قرب کے لحاظ سے زیادہ ثقیل اور عظیم بن جاتی ہے اس لیے اپنی غلطی کا ظاہری نقصان اٹھانے کے علاوہ مدت دراز تک توبہ و استغفار میں مشغول گریہ و بکا کرتے رہے۔ آخر کار ثم اجتباہ ربہ فتاب علیہ و ھدٰی کے نتیجہ پر پہنچ گئے۔

بود آدم دیدہ نور قدیم
موے در دیدہ بود کوہ عظیم [1]

اصل ارشاد میں فوسوس لھما الشیطان آیا ہے۔ وسوسہ کے معنی عربی میں کسی بُری چیز کا دل میں پیدا کرنا اندرونی اغواء کہتے اور شکاری کی ہلکی آواز کو بھی کہتے ہیں۔ ہوا کے جھونکے سے ہوا کی ہلکی سی سرسراہٹ بھی وسوسہ کہلاتی ہے۔ شیطان نے آدم و حوّا پر وسوسہ اندازی کی۔ وسوسہ کی نسبت شیطان کی طرف کر کے اشارہ کر دیا کہ گناہ آدم کی جبلت اور طبیعت نہیں ہے۔ یعنی انسان میں اللہ کی نافرمانی فطری اور حقیقی نہیں ہے بلکہ اضافی ہے۔ اس میں طنز ہے ان لوگوں پر جو گناہ کو انسان کی فطرت بتاتے ہیں۔ تورات میں اغواء آدم کے سلسلے میں شیطان کا نہیں بلکہ سانپ کا ذکر ہے اور شاید ہمارے تفسیری ذخیرے میں شیطان کے سانپ میں حلول کر کے جنت میں داخل ہونے کی روایت کا ماخذ تورات ہی ہو۔ ورنہ ارباب تحقیق نے اس روایت کو لغو اور مہمل قرار دیا ہے۔ امام رازی نے اس کی رکاکت کا اعلان کیا ہے۔ یہاں تثنیہ کی ضمیر لھما لاکر قرآن نے بائبل کی یہ غلطی بھی واضح کر دی کہ شیطان نے حضرت حوّا کو بہکایا تھا۔ قرآن نے بتا دیا کہ دونوں پر ذمہ داری یکساں ہے۔ بائیبل میں ہے:

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور عورت نے جوں دیکھا کہ یہ درخت کھانے میں اچھا ہے اور دیکھنے میں خوشنما اور عقل بخشنے میں خوب ہے تو اس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے خصم کو بھی کھلایا۔ (پیدائش ۳ - ۶)

لیبدی لھما میں لام عاقبت ہے یعنی شیطان کی اس وسوسہ اندازی کا انجام یہ ہوا کہ آدم و حوا جنت کی پوشاک سے محروم ہو جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کی پہلی چال جو اس نے انسان کو فطرت انسانی کی سیدھی راہ سے ہٹانے کے لیے چلی یہ تھی کہ اس کے اس جذبہ شرم و حیا پر ضرب لگائے اور برہنگی کے راستہ سے اس کے لیے فواحش کا دروازہ کھولے اور اس کو جنسی معاملات میں بدراہ کر دے۔ بالفاظ دیگر اپنے حریف کے محاذ میں ضعیف ترین مقام جو اس نے حملہ کا تلاش کیا وہ اس کی زندگی کا جنسی پہلو تھا اور پہلی ضرب جو اس نے لگائی وہ اس محافظ فصیل پر لگائی جو شرم و حیا کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں رکھی تھی۔ ہمارے فقہا نے آیت کے اشارے سے یہ قانونی نکتہ دریافت کیا ہے کہ ستر کا کھولنا اہم ممنوعات میں سے ہے۔ نسفی نے مدارک میں اور قرطبی نے الجامع لاحکام القرآن میں تصریح کی ہے۔
آگے شیطان کی بات ہے وقال ما نھاکما ربکما عن ھذہ الشجرۃ یہاں شیطان نے حضرت آدم کو یہ سبز باغ دکھایا کہ اس درخت کا پھل کھاتے سے یا تو وہ فرشتوں کے مرتبے میں آجائیں گے اور یا انہیں ابدی زندگی حاصل ہو جائے گی۔ گویا دو باتوں کا حضرت آدم کو علم تھا ایک تو یہ کہ مسجودِ ملائکہ ہونے کے باوجود وہ فرشتوں کے ہم پلہ نہیں ہیں دوسرے یہ کہ زندگی ان کو حاصل ہوتی ہے اس میں ابدیت نہیں ہے۔ اگر آدم کا یہ ذہن نہ ہوتا تو ابلیس ان کے ورغلانے میں کامیاب نہ ہوتا۔

تورات میں ہے کہ جنت میں دو درخت تھے۔ ایک نیک و بد کی پہچان کا اور دوسرا حیاتِ جاوداں کا تورات کی رُو سے اسی نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا تھا لیکن آدم نے اس کو کھا لیا اور اس کی وجہ سے سب سے پہلے ان کو برہنگی کا احساس ہوا۔ قرآن پاک میں اس درخت کا نام جس کا پھل کھانے سے روکا گیا تھا تصریحاً مذکور نہیں اور کسی صحیح ارشادِ نبوت میں بھی اس کی کوئی نشاندہی نہیں کی گئی ہے لیکن قرآن کی ایک آیت سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیک و بد کی شناخت کا درخت تھا۔ شیطان نے یہ کہہ کر ان کو کھلایا کہ یہ حیاتِ جاوید اور ملک جاوداں کا درخت ہے مگر اس کے کھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو برہنگی کا علم ہو گیا جو نیک و بد کی تمیز کا نتیجہ ہے۔ قرآن میں دوسری جگہ شیطان کا مقولہ نقل کیا گیا ہے۔
ھل ادلک علی شجرۃ الخلد و ملک لا یبلیٰ، سوال یہ ہے کہ حیاتِ جاوداں سے مقصود کیا ہے ظاہر ہے کہ جنت ہے۔ شیطان کا منشا یہ تھا کہ اس جنت میں جس میں اب تم ہو ہے در در سر ہمیشہ رہنے کا تم کو نسخہ بتاتا ہوں۔ حضرت آدم نے خواہش کی تو اس نے نیک و بد کی تمیز کے درخت کا پھل بتا دیا۔ یہ بھی

ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نیک وبد کی تمیز ہی پر انسان کی شرعی تکلیف اور مواخذہ کا دار ومدار ہے۔ یہ مولانا سید سلیمان کا یہاں لطیف استنباط ہے اور اس سے بھی لطیف وہ استنباط ہے جو مولانا مناظر حسن گیلانی نے پیش کیا ہے۔ لیجئے ان کی زبانی سنیے۔ فرماتے ہیں۔ اگر حضرت آدم کے اس قصے کو صرف قصہ کی حیثیت سے نہ پڑھا جائے بلکہ اولاد آدم کی موجودہ زندگی میں اس قصہ کے اجزاء سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کیا جائے تو دوسرے اجزاء سے قطع نظر کرتے ہوئے ہیں الشجرہ کے متعلق یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن ہی میں جب یہ موجود ہے کہ شیطان نے حضرت آدم کو کہا هل ادلك على شجرة الخلد اور اس جگہ اسی کی شرح شیطان کی زبان سے اس طرح پیش کی گئی ہے کہ اس نے آدم وحوا کو یہ سمجھایا تھا کہ خدا نے اس الشجرہ سے تم دونوں کو اس لیے روکا ہے کہ اس کے استعمال کے بعد تم دونوں کو خلود حاصل ہو جائے گا یعنی تکونا من الخالدین۔

اب ایک طرف اس مسئلہ کو سامنے رکھ لیجئے اور دوسری طرف سورہ ھمزہ کے اس مضمون پر غور کیجئے کہ آدمی مال اور سرمایہ کے متعلق یہ خیال کرتا ہے کہ اس میں خلود بخشی کی طاقت پائی جاتی ہے۔ اس سے اگر یہ سمجھا جائے کہ حضرت آدم جس عالم میں اس وقت تھے اس وقت ان کے سامنے خواہ کسی شکل میں پیش ہوئی ہو لیکن آدم کی اولاد کے سامنے وہی چیز مال اور سرمایہ کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ تو جہاں تک قرآن کا اقتضا ہے یہ خیال چنداں بعید نہیں ہے ذرا ان امور پر غور کیجئے۔

اولاً حضرت آدم اور ان کی بیوی کو حکم دیا گیا تھا کلا منها رغداً حیث شئتما ولا تقربا هذه الشجرة فتکونا من الظالمین۔ آج بھی دیکھا جاتا ہے کہ اولادِ آدم کے سوا زندگی کی تمام ضرورتوں کی محتاج ہستیاں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں اس طور پر زندگی گزار رہی ہیں کہ صبح سے شام تک خوب کھاتی ہیں۔ لیکن ان میں کوئی بھی اپنی ضرورتوں کے متعلق خلود اور دوام کی ضمانت میں سرگرداں نہیں ہے۔ ایک آدم زاد جو آج کی ضرورتوں کی تکمیل کے بعد کل کے متعلق ہمیشہ غیر مطمئن رہتا ہے۔ عدم اطمینان کی اسی کیفیت کے ازالہ کے لیے وہ اس چیز کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے جس کے متعلق خلود بخشی کا خیال اس میں پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی یحسب ان ماله اخلده مال اور سرمایہ جو آج مل رہا ہے کل وہی ملتا ہے سمجھا جاتا ہے کہ اس کی ضمانت مال اور سرمایے میں مستور ہے۔

ثانیاً حضرت آدم کے قصہ میں ہے کہ شجرۃ الخلد کے چکھنے کے ساتھ ہی ان کی سوأۃ چھپانے کی چیزیں کھل گئیں۔ آدم کی اولاد میں بھی یہی سمجھا جاتا ہے بلکہ قرآن ہی ہے میں کہ مال کی محبت میں جب بخل کی راہ اختیار کی جاتی ہے تو الحسنیٰ یعنی اچھی باتوں کی تکذیب شروع کر دیتا ہے۔ گویا اس طرح مال اور سرمائے کی محبت اس کے عیوب کھول دیتی ہے۔

وأما من بخل واستغنیٰ وکذب بالحسنیٰ ،

ثالثاً ، اسی الشجرہ کے چکھنے کا نتیجہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ ان کو ہبوط اتر جانے کا حکم دیا گیا ۔ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں قرب کا جو مقام ان کو حاصل تھا اسی سے وہ اتار دیے گئے ۔ آدم کی اولاد میں بھی یہی دیکھا جاتا ہے کہ مال اور سرمایہ پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس کے سارے احتیاجی تعلقات اسی مال کے ساتھ قائم ہو جاتے ہیں ۔ بندے اور خدا کے درمیان جو احتیاجی تعلق رہنا چاہیے وہ تعلق باقی نہیں رہتا ۔ قرآن کی بالا آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے ۔

رابعاً ، مال میں جیسے غنا بخشی کی کیفیت بظاہر لوگوں کو محسوس ہوتی ہے گویا عدم احتیاج کا جو ایک پہلو فرشتوں میں پایا جاتا ہے ۔ اسی ملکوتی پہلو کی تکمیل کی ایک شکل مال میں پائی جاتی ہے ۔ حضرت آدم کو شیطان نے من جملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا تھا کہ اس الشجرہ کے استعمال سے چونکہ فرشتے بن سکتے ہو اس لیے خدا نے تم کو اس سے روکا ہے ۔

خامساً ، شیطان نے اس شجرۃ الخلد کی ایک صفت یہ بھی بتائی ہے کہ ملک لا یبلیٰ یعنی یہ ایک ایسی چیز ہے جو پرانی اور کہنہ نہیں ہوتی ۔ معاشیات کے ماہرین بتاتے ہیں کہ سونے اور چاندی کی یہی خصوصیت ہے کہ ان میں کہنگی اور فرسودگی نہیں آتی ۔

سادساً ، یہ بھی ہے کہ اسی شجرۃ الخلد کی سزا میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمہارے بعض بعض کے دشمن ہوں بعضکم لبعض عدو آدم کی اولاد میں جتنے جھگڑے ہیں عموماً اسی مال و دولت کے سبب ہوتے ہیں ۔

بہر حال یہ میرا ذہنی انتقال ہے ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کہاں تک صحیح ہے ۔ دماغ میں ایک بات آئی اس کا اظہار کر دیا ۔ والعلم عند اللہ ۔

مولانا گیلانی نے جو کچھ فرمایا ہے میرے خیال میں بھی اس کی حیثیت ایک علمی لطیفہ سے زیادہ نہیں ۔ کچھ بھی ہو اس سے یہ اشارہ ضرور ملتا ہے کہ انسان کے اندر معالی امور مثلاً بشریت سے بالاتر مقام پر پہنچنے یا حیات جاوداں حاصل کرنے کی ایک فطری پیاس موجود ہے اور شیطان کو اسے فریب دینے میں پہلی کامیابی اسی ذریعہ سے ہوئی کہ اس نے انسان کی اس خواہش سے اپیل کی ۔ شیطان کا سب سے چلتا ہوا حربہ یہ ہے کہ وہ آدمی کو بلندی پر لے جانے اور موجودہ حالت سے بہتر حالت پر پہنچا دینے کی اُمید دلاتا ہے اور پھر اس کے لیے وہ راستہ پیش کرتا ہے جو اسے اُلٹا پستی کی طرف لے جاتے ۔

آخر میں فرمایا وقاسمھما انی لکما لمن الناصحین لفظ قاسم باب مفاعلہ سے ہے اور مشارکت کے لیے آتا ہے ۔ لیکن کبھی یہ تکثیر اور مبالغہ کے معنی بھی دیتا ہے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کو آدم کو

ورغلانے کے لیے بہت زیادہ محنت کرنی پڑی، بار بار قسمیں کھا کر یقین دلانا پڑا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے محض بربنائے خیر خواہی کہہ رہا ہے۔ اس میں کسی بدنیتی کو قطعاً دخل نہیں ہے۔ اور اس ساری کارگزاری کا نتیجہ یہ نکلا فدلّٰھما بغرور۔ غرض دونوں کو قرب سے نیچے لے آیا۔ دلّٰی تدلیہ سے ماضی ہے اس کے معنے ہیں آہستہ آہستہ نیچے لے آنا۔ یعنی شیطان کو مقصد برآری میں کافی محنت کے ساتھ کافی وقت بھی صرف کرنا پڑا اور بڑی تگ و دو کے بعد آدم اور حوا کو اپنے ڈھب پر لایا۔ مطلب یہ ہے کہ دونوں کو چکنی چپڑی باتوں اور دھوکہ فریب کے ساتھ بالائی مرتبہ سے نچلے مرتبہ میں یعنی مقام طاعت سے معصیت میں اتار لایا اور اس طرح شیطان اپنی سازش میں کامیاب ہو گیا۔

عصیان سے جنتی لباس اتر گیا

۱۵۔ پھر جونہی انہوں نے درخت چکھا تو ان کے ستر ان پر کھل گئے۔ یعنی عدول حکمی کرا کر لباس بہشتی ان پر سے اتروا دیا۔ کیونکہ جنتی لباس حقیقت میں لباس تقویٰ کی ایک محسوس صورت ہوتی ہے کسی ممنوع کے ارتکاب سے جس قدر لباس تقویٰ میں رخنہ پڑے گا اسی قدر جنتی لباس سے محرومی ہوگی۔ غرض شیطان نے کوشش کی کہ عصیان کرا کر آدم کے بدن سے بطریق مجازات جنت کا خلعت فاخرہ اتروا دے۔ یہ میرا خیال ہے لیکن حضرت شاہ صاحب نے نزع لباس کو اکل شجرہ کے ایک طبعی اثر کے طور پر لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حاجت استنجا اور حاجت شہوت جنت میں نہ تھی۔ ان کے بدن پر کپڑے تھے جو کبھی اترتے نہ تھے کیونکہ اتارنے کی حاجت نہ ہوتی تھی۔ آدم و حوا اپنے اعضا سے واقف نہ تھے۔ جب یہ گناہ ہوا تو لوازم بشری پیدا ہوتے اپنی حاجت سے باخبر ہوئے اور اپنے اعضا دیکھے، گویا اس درخت کے کھانے سے جو پردہ انسانی کمزوریوں پر پڑا تھا وہ اٹھ گیا۔ سوآۃ کے لغوی معنے میں بہت وسعت ہے۔ قابیل و ہابیل کے قصہ میں سوآۃ اخیہ فرمایا اور حدیث میں ہے احدی سوأتک یا مقداد اب تک آدم کی نظر میں صرف اپنی سادگی اور معصومیت تھی اور ابلیس کی نظر میں صرف اس کی خلقی کمزوریاں تھیں لیکن اکل شجرہ کے بعد آدم کو اپنی کمزوریاں پیش نظر ہو گئیں اور جب اس غلطی کے بعد توبہ و انابت اختیار کی تو ابلیس لعین کو ان کے اعلیٰ کمال اور انتہائی نجابت و شرافت کا مشاہدہ ہو گیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ یہ مخلوق لغزش کھا کر بھی میری مار کھانے والی نہیں ہے۔

ان عبادی لیس لک علیہم سلطان

شاید اسی لحاظ سے ابن قتیبہ صاحب معارف کی نقل کے مطابق اس درخت کو شجرۃ علم الخیر والشر سے موسوم کیا ہے۔[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

حاصل دونوں کا ایک ہے۔ عصیان سے جنتی لباس اترا ہو یا درخت کے کھانے سے اترا ہو۔ اگر تعبیر فلما عصیا ربہما بدت لہما سوآتہما ہوتی تو لباس کے اترنے میں عصیان ہی علت مؤثرہ ہوتا لیکن تعبیر فلما ذاقا الشجرۃ بدت لہما آئی ہے اس لیے شجرہ ممنوعہ کا مزہ چکھنا ہی لباس اترنے کی علت ہے اور یہی منطوق قرآنی ہے۔ یہاں خبر نہیں مولانا مودودی نے یہ بات لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس کی کہ

یہ گمان کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں کہ شجرہ ممنوعہ کا مزہ چکھتے ہی آدم و حوا کے ستر کا کھل جانا اس درخت کی خاصیت کا نتیجہ تھا۔ درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے سوا کسی اور چیز کا نتیجہ نہ تھا۔

حالانکہ مال دونوں کا ایک ہے درخت کے قریب جانے سے اللہ نے ہی منع فرمایا تھا اور اگر بالفرض درخت میں یہ خاصیت بھی ہو تو یہ بھی خدا کی جانب سے مخفی مقصود تو انسانی زندگی کو ابتلائی بنانا ہے۔

برہنگی پر شرمندگی فطری ہے

۱۶ــ اور باغ کے پتے اوپر تلے رکھ کر چپکانے لگے۔ یعنی برہنہ ہو کر شرمائے اور بدن پتوں سے ڈھانپنے لگے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ آدمی پیدائش کے وقت ننگا پیدا ہوتا ہے مگر فطری حیا مانع ہے کہ ننگا رہے[1] لباس کا بنیادی مقصد چونکہ ستر ہے اور اس سے اچانک محرومی کا اولین اثر انسان پر بے پردگی کے احساس کی شکل میں بطور ایک حادثہ کے پڑتا ہے۔ اسی صورت حال کو ظاہر کرنے کے لیے طفقا یخصفان علیہما من ورق الجنۃ کا انداز بیان اختیار فرمایا۔ یعنی آدم و حوا پر اس اچانک حادثہ سے ایسی گھبراہٹ طاری ہوئی کہ جوں ہی ان کو ننگے ہونے کا احساس ہوا تو اسے چھپانے کی فکر لاحق ہوئی اور جو کچھ دستیاب ہوا اسے ہی استعمال کرنے لگے۔ جب کوئی چیز نہ ملی تو باغ کے پتے ہی چپکانے لگے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اندر شرم و حیا کا جذبہ فطری ہے اور اس کا اولین مظہر وہ شرم ہے جو اپنے جسم کے مخصوص حصوں کو دوسروں کے سامنے کھولنے میں آدمی کو فطرۃً محسوس ہوتی ہے۔ قرآن کی رہنمائی یہ ہے کہ یہ شرم انسان کے اندر تہذیب کے ارتقاء سے مصنوعی طور پر پیدا نہیں ہوئی ہے اور نہ یہ اکتسابی چیز ہے۔ جیسا کہ شیطان کے بعض شاگردوں نے قیاس کیا ہے بلکہ درحقیقت یہ وہ فطری چیز ہے جو اول روز سے انسان میں موجود تھی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ چیزیں محض عادت کی پیداوار ہیں ان کا یہ خیال قرآن کے خلاف ہے۔ جس طرح توحید فطرت ہے شرک

[1] افادات شیخ الاسلام

انسان مصنوعی طور پر اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح حیا فطرت ہے بے حیائی انسان مصنوعی طور پر اختیار کرتا ہے۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں کشف العورۃ قبیح من لدن آدم کہہ کر اسی کو واضح کیا ہے۔ قاضی بیضاوی کی یہاں یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ یہ آیت بتا رہی ہے کہ ستر کھولنا خلوت میں اور بیوی کی موجودگی میں بغیر ضرورت کے برا ہے اور لطیف طبائع کے لیے ناقابل برداشت ہے۔

جناب الٰہی میں آدم و حوا کی توبہ

۱۷۔ اس وقت ان کے پروردگار نے فرمایا کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہیں روک دیا تھا اور کیا میں نے تم سے نہیں کہہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے، ان دونوں نے عرض کیا پروردگار ہم نے اپنا نقصان کیا اگر تو نے ہمارا قصور نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہمارے لیے بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ یعنی اللہ سبحانہ نے حضرت آدم سے کہا کہ میں نے درخت سے تمہیں روکا تھا اور شیطان کی دشمنی اچھی طرح واضح کر دی تھی۔ اس کا اور اس کی پیروی کرنے والوں کا انجام بھی بتا دیا تھا۔ جب اللہ سبحانہ نے حضرت آدم سے یہ کہا تو حضرت آدم و حوا نے کیا جواب دیا قرآن کہتا ہے کہ دونوں کا جواب یہ تھا ربنا ظلمنا.. الخ یعنی جب دونوں کو ان کے قصور پر تنبیہہ کی گئی تو انہوں نے شیطان کی طرح سرکشی نہیں کی بلکہ اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے وہ نادم ہو گئے اپنے قصور کا اعتراف کر کے معصیت سے طاعت کی طرف پلٹ آئے اور معافی مانگ کر اپنے رب کے دامانِ رحمت میں پناہ ڈھونڈنے لگے اور بول پڑے اے ہمارے رب ہم نے شیطان کے کہے میں لگ کر اور تیری نافرمانی کر کے اپنی جانوں پر ستم کیا۔ اب طاعات کی حدود میں اپنی کمزوری اور بیچارگی کا علم ہو گیا۔ اب اگر آپ نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور آئندہ کے لیے اپنی ہدایت و توفیق کا دروازہ کھول کر ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے۔ حضرت آدم نے گناہ کے بعد یہ دعا مانگ کر انسانی راہ اور شیطانی راہ میں ایک محسوس اور مرئی حد قائم کر دی۔ شیطانی راہ یہ ہے کہ بندگی و طاعت سے منہ موڑے، خدا کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرے متنبہ کیے جانے کے باوجود پورے استکبار کے ساتھ اپنے باغیانہ طرزِ عمل پر اصرار کیے جائے اور جو لوگ جادۂ طاعت کے راہرو ہوں ان کو بھی بہکائے اور معصیت کی راہ پر لانے کی کوشش کرے برخلاف اس کے جو راہ آدم کے لائق وہ یہ ہے کہ اول تو وہ شیطانی اغواء کی مزاحمت کرے اور اپنے اس دشمن کی چالوں کو سمجھنے اور ان سے بچنے کے لیے ہر وقت چوکنا رہے لیکن اگر کبھی اس کا قدم بندگی و طاعت کی راہ سے ہٹ جائے تو اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی ندامت و شرمساری کے ساتھ فوراً اپنے رب کی طرف پلٹے اور اس قصور کی تلافی کر دے جو اس سے سرزد ہو گیا ہے۔ یہی وہ اصل سبق ہے جو اللہ تعالیٰ اس قصہ سے یہاں دینا چاہتا ہے۔ ذہن نشین یہ

یہ کرانا مقصود ہے کہ جس راہ پر تم لوگ چل رہے ہو یہ شیطان کی راہ ہے۔ یہ تمہارا خدائی ہدایت سے بے نیاز ہو کر شیاطین جن وانس کو اپنا دلی دوست سرپرست بنانا دراصل خالص شیطانی رویہ ہے۔ تم اپنے ازلی دشمن کے جال میں گرفتار ہو گئے ہو اور اس سے شکست کھا رہے ہو۔ اس کا انجام وہی ہے جس سے شیطان خود دوچار ہونے والا ہے اگر تم حقیقت میں خود اپنے دشمن نہیں ہو گئے ہو تو سنبھلو اور ہوش میں آؤ۔

آدم علیہ السلام کی دوسری زندگی

۱۸۔ فرمایا یہاں سے نکل جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اب تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے اور ایک خاص وقت تک وہاں سامانِ زندگی سے فائدہ اٹھانا ہے اور فرمایا کہ تم اسی میں زندہ رہو گے، اسی میں مرو گے پھر اسی سے مرنے کے بعد نکالے جاؤ گے۔ مفسرین کے نزدیک یہ خطاب آدم و حوا اور ابلیس لعین سب کو ہے کیونکہ اصل عداوت آدم اور ابلیس کی ہے اور اس عداوت کا دنگل ہماری زمین بنائی گئی جس کی خلافت آدم کو سپرد ہوتی تھی[1] یہ خطاب حضرت عبداللہ بن عباس اور بعض دوسرے شارحین قرآن کے نزدیک حضرت آدم و حوا اور ابلیس سے ہے اور ابن زید کی رائے میں آدم اور حوا اور ان کی ذریت سے ہے۔ زیادہ صحیح حضرت عبداللہ بن عباس کا موقف ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہاں یہ جو فرمایا بعضکم لبعض عدو تو یہ دشمنی اپنی فطری بنیاد اگر رکھتی ہے تو آدم اور ابلیس ہی کے اندر رکھتی ہے۔ آدم و حوا کے مابین دشمنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آدم و حوا کے درمیان تو فطری علاقہ الفت و محبت کا ہے۔ اسی طرح اولادِ آدم میں بھی فطری ربط و تعلق اخوت اور بھائی چارے کا ہے۔ ان میں اگر دشمنی اور عداوت ہوتی ہے تو اس کا باعث بھی شیطان ہے۔ شیطان اور آدم کی اس فطری عداوت کا قرآن میں بالتصریح بھی ذکر آیا ہے ارشاد ہے:

ان ھذا عدو لك ولزوجك

یہ ابلیس تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس رکوع میں اس بات کی تصریح ہے کہ جس طرح آدم کو جنت سے نکلنے کا حکم ملا تھا اسی طرح ابلیس کو بھی قال فاھبط منھا فما یکون لك ان تتكبر فیھا فاخرج انك من الصاغرین۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ یہاں اس حکم کے ساتھ جمیعاً کا لفظ بطور تاکید آیا ہے۔ اگر یہ خطاب صرف آدم و حوا

[1] افادات شیخ الاسلام

سے مانا جائے تو پھر جمیعاً کا لفظ کچھ غیر ضروری ہو جاتا ہے اس لیے یہی صحیح ہے کہ مخاطب آدم و حوا کے ساتھ ابلیس ہے۔
بعضکم لبعض عدو جس مقابلہ کا ابلیس نے چیلنج دیا تھا اس کا میدان دُنیا کو بنا دیا گیا۔ حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہے کہ آدم و حوا جنت سے نکلیں اور اس دُنیا میں رہ کر وہ اور ان کی ذریت شیطان اور اس کی ذریت سے مقابلہ کریں۔ پھر اس میدان میں جو شیطان سے بازی لے جائیں وہ اسی جنت کے وارث ٹھہریں۔ گویا مقابلہ تو وہ ہی رہا لیکن میدانِ مقابلہ جنت کی جگہ یہ دُنیا بنا دی گئی۔ اب اس میدان میں آدم و ابلیس کو اتارا ہی دو محارب فریق کی حیثیت سے گیا ہے۔ اس کے بعد ان مراحل کا ذکر کیا ہے جن سے اس دُنیا میں آدم اور اولادِ آدم کو گزرنا ہے فرمایا فیہا تحیون فیہا تموتون و منہا تخرجون یعنی تمہارا عود مسکن اصلی و معاد بھی زمین ہے اگر خرقِ عادت کے طور پر کوئی شخص کسی وقت ایک معین مدت کے لیے اس سے اوپر اٹھا لیا جائے مثلاً حضرت مسیح علیہ السلام تو وہ اس آیت کے منافی نہیں۔ کیا جو شخص چند روز یا چند گھنٹے کے لیے زمین سے جدا ہو کر ہوائی جہاز میں مقیم رہا ہو یا فرض کیجیے وہیں مر جائے وہ فیہا تحیون و فیہا تموتون کے خلاف ہو گا کیونکہ وہ اس وقت زمین میں نہیں ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے منہا خلقتکم و فیہا نعیدکم الخ جو اموات زمین میں مدفون نہ ہوں ان کو فیہا نعیدکم میں کیسے داخل کیا جائے گا۔ معلوم ہوا کہ اس قسم کے قضایا کلیہ کے رنگ میں استعمال نہیں ہوتے [1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

يٰبَنِىۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكُمۡ لِبَاسًا يُّوَارِىۡ سَوۡاٰتِكُمۡ وَرِيۡشًا ؕ
وَلِبَاسُ التَّقۡوٰى ذٰ لِكَ خَيۡرٌ ؕ ذٰ لِكَ مِنۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمۡ
يَذَّكَّرُوۡنَ ۝۲۶ يٰبَنِىۡۤ اٰدَمَ لَا يَفۡتِنَنَّكُمُ الشَّيۡطٰنُ كَمَاۤ اَخۡرَجَ
اَبَوَيۡكُمۡ مِّنَ الۡجَـنَّةِ يَنۡزِعُ عَنۡهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوۡاٰتِهِمَا ؕ
اِنَّهٗ يَرٰٮكُمۡ هُوَ وَقَبِيۡلُهٗ مِنۡ حَيۡثُ لَا تَرَوۡنَهُمۡ ؕ اِنَّا جَعَلۡنَا
الشَّيٰطِيۡنَ اَوۡلِيَآءَ لِلَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ۝۲۷

اے اولادِ آدم ہم نے تمہارے لیے ایسا لباس مہیا کر دیا کہ جو جسم کی ستر پوشی کرتا ہے اور ایسی چیزیں بھی جو زیب و زینت کا ذریعہ ہیں[19]۔ نیز تمہیں پرہیزگاری کی راہ دکھا دی کہ تمام لباسوں میں بہترین لباس ہے[20]۔ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے تا کہ لوگ نصیحت پذیر ہوں[21]۔ اے اولادِ آدم کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں اسی طرح بہکا دے جس طرح تمہارے ماں باپ کو بہکا کر جنت سے نکلوا

دیا تھا اور اُن کے لباس اُتروا دیے تھے کہ اُن کے ستر اُن کو دکھا دے۔"[22]

شیطان اور اُس کا گروہ تمہیں اس طرح دیکھتا ہے کہ تم اسے نہیں دیکھتے ہو۔[23] یاد رکھو ہم نے شیطانوں کو ان کا رفیق و مددگار بنا دیا ہے جو ایمان نہیں رکھتے ہیں۔"[24]

انسانی زندگی میں لباس

لباس اور انسان میں فطری تعلق ہے، اور یہ تعلق آغازِ آفرینش سے ہے۔ یہ اپنی نوعیت اور کیفیت کے لحاظ سے مختلف مدارج طے کرتا رہا ہے لیکن نفس ستر پوشی انسانی فطرت کا ہمیشہ سے تقاضا رہا ہے۔ اب جو لباس مختلف قوموں اور ملکوں میں نظر آتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ابتداء بھی ایسا ہی ہو لیکن کوئی چیز ضرور تھی جو ستر پوشی اور آرائش کا کام دیتی تھی۔ اسی میں تمدن و تہذیب کی ترقی کے ساتھ ترقی ہوتی رہی ہے۔

ان آیات میں دو قسم کے لباسوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک جسمانی اور مادی لباس جو جسم کی پوشش اور حفاظت کا کام کرتا ہے۔ دوسرا لباس تقویٰ جو روحِ انسانی اور اخلاقی حفاظت اور آرائش کا کام دیتا ہے۔ یہاں آغاز میں ہی لباس کا خصوصیت سے ذکر اس لیے کیا ہے کہ اس میں انسان کی عقلی زندگی کا سب سے بڑا مظاہرہ تھا جب وہ لباس پہننے لگا تو یہ گویا اس حقیقت کا اعلان ہوا کہ اس کا اخلاقی شعور اُبھر آیا ہے۔ صنعت و اختراع کی راہوں سے آشنا ہو گیا ہے اور عام حیوانی زندگی کی جگہ انسانی زندگی کی خصوصیات نشو و نما پا رہی ہیں۔ لباس کا اوّلین مقصد تو ستر پوشی ہے لیکن زیب و زینت بھی اس کے مقاصد میں داخل ہے۔ اللہ سبحانہٗ نے جو کچھ بھی پیدا فرمایا ہے اس میں مختلف پہلو رکھے ہیں اور یہ سارے ہی پہلو ہماری فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہیں۔ ستر پوشی کے لیے تو لنگوٹی بھی کافی تھی لیکن اللہ سبحانہٗ نے اتمامِ نعمت کے طور پر ہمارے لیے ایسے لباس کا انتظام فرمایا جو ستر پوش بھی ہو، سردی اور گرمی سے بھی ہماری حفاظت کرے اور اس سے ہماری شخصیت، ہمارے وقار ہمارے حسن اور ہماری شان میں بھی اضافہ ہو۔ ان میں سے کوئی مقصد بھی بجائے خود معیوب نہیں ہے البتہ

افراط و تفریط سے جس طرح ہر چیز میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح اس میں بھی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں قرآن نے زینت کو مقاصد لباس میں داخل کرکے اس راہبانہ اور جوگیانہ تصور کی نفی کر دی جو لباس کو ایک آلائش اور عریانی یا نیم عریانی کو دینی تقدس کا درجہ دیتے ہیں۔

۱۹ ۔ اے اولاد آدم ہم نے تمہارے لیے ایسا لباس مہیا کر دیا کہ جو جسم کی ستر پوشی کرتا ہے اور ایسی چیزیں بھی جو زیب و زینت کا ذریعہ ہیں۔ اتارنے سے مراد اس کا مادہ وغیرہ مہیا کرنا اور اس کے تیار کرنے کی تدبیر بتلانا ہے۔ گو انزال یعنی اتارنے کا لفظ اکثر اس موقعہ پر بولتے ہیں جہاں ایک چیز کو اوپر سے نیچے لایا جاتے مگر بہت دفعہ اس سے مکانی فوق و تحت مراد نہیں ہوتا بلکہ جو مرتبہ کے اعتبار سے اونچا ہو اس کی طرف سے کوئی چیز نیچے والوں کو عطا کیے جانے پر بھی یہ لفظ اطلاق کیا جاتا ہے جیسے فرمایا وانزل لکم من الانعام ثمانیۃ ازواج یا ارشاد ہے وانزلنا الحدید فیہ باس شدید[1]

یہاں قصہ آدم میں شیطان کی وسوسہ اندازی کے نتیجے میں آدم و حوا کے ستر کھل جانے کا ذکر ہوا ہے۔ جنت میں یہ ستر پوشی اللہ سبحانہ، کے انتظام سے تھی بالکل ایسے ہی جیسے تمام مخلوقات کی تکوینی طور پر ہوتی ہے لیکن شیطان کے اغواء کے نتیجے میں خدا کی نافرمانی ہوئی تو تکوینی حالت ہٹ گئی اور تکلیفی حالت رونما ہوئی یعنی خدا کی تکوینی حفاظت ہٹائی گئی اور تکلیفی حالت کے مطابق ان کے ارادہ و اختیار کے حوالے کر دیا گیا۔ اور عالم تکلیف میں سب سے پہلی جو ہدایت ہوئی وہ قابل شرم حصوں کی پردہ پوشی تھی۔ یعنی انسان کی عقلی زندگی کا سب سے پہلا مظاہرہ اس طرح ہوا کہ وہ لباس پہننے لگا۔ لباس نے گویا حیوانی زندگی سے انسانی زندگی کو سب سے پہلے امتیازی مقام دیا۔ اور اہل عرب انسانی زندگی سے گر کر عام حیوانی زندگی کی سطح پر اس طرح اُگئے تھے کہ اس بارے میں شرم و حیا کا وجود نہ رہا تھا۔ حج کعبہ میں لاکھوں آدمی جمع ہوتے لیکن قریش کے سوا باقی سب مادرزاد ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے۔ عورتیں جب ننگی ہو کر طواف کرتیں تو لوگوں سے کہتیں کہ کوئی ہم کو اتنا کپڑا دیتا کہ ستر عورت ہو جاتا، پھر یہ شعر پڑھتیں۔

الیوم یبدو بعضہ او کلہ
قد بدا منہ فلا احلہ

آج بدن کا کچھ حصہ یا سارا حصہ کھلے گا اور جو کچھ بھی کھلا ہے اس سے لطف حلال نہیں ہے
صحیح مسلم میں باب التفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس سے یہ روایت ہے کہ

[1] افادات شیخ الاسلام

نہاتے وقت اوٹ نہیں کرتے تھے کھلے میدان میں بے پردہ نہاتے۔

ابوداؤد میں ہے کہ پیشاب پاخانہ کے وقت پردہ نہیں کرتے تھے اور جلسوں میں بیٹھتے تو بیویوں سے ہم صحبتی کے تمام واقعات بیان کرتے۔ اور یہ صرف عربوں ہی کی خصوصیت نہ تھی، دنیا کی اکثر قومیں اسی بے حیائی میں مبتلا رہی ہیں اور آج تک ہیں اس لیے آیت میں خطاب تمام انسانوں کے لیے عام ہے اور سارے انسانوں کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ دیکھو یہ شیطانی اغوار کی ایک کھلی ہوئی علامت تمہاری زندگی میں موجود ہے۔ گویا اس آیت میں جس بے حیائی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ برہنگی ہے اور جس زینت کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ستر پوشی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کپڑے سے مقصود ستر پوشی کے علاوہ زیب و زینت بھی ہے۔ اس آیت کو پڑھ کر ایک لمحہ کے لیے بھی اس وسوسہ کی گنجائش نہیں کہ مغرب کے راہبانہ اور مشرق کے جوگیانہ میلانات کے لیے قرآنی تعلیمات میں کوئی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے قد انزلنا علیکم لباساً یواری سوآتکم وریشاً کی پکار بتا رہی ہے کہ انسانی زندگی میں لباس کے دو بنیادی مقصد ہیں ایک پوشش دوسرے آرائش، قرآن کے اس حوصلہ پرور ندائے عام سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس افسردہ قنوطی پیغام کو کیا مناسبت ہے جس میں غریب انسان کو یہ بتایا جاتا ہے کہ پوشاک اور آرائش تمہارے لیے نہیں ہے۔ انسانیت کا کمال ارتقاء اسی گمریز اور فرار کے ساتھ وابستہ ہے جو ان امور کے متعلق اختیار کیا جاتے۔ حتی کہ اسی بنا پر صرف سُنا نہیں بلکہ دیکھا جا رہا ہے کہ کتنوں کے بدن سے کپڑے اتروائے گئے بلکہ کبھی کبھی تو اس جنون نے اس حد تک ترقی کی ہے کہ اسی آدمی کو جو ہوا کے بغیر عام فطری حالت میں غالباً چند منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا اسی بیچارے کو حبس دم کے نام سے ہوا میں سانس لینے کے حق سے محروم کر دیا۔ سوچنے کی بات ہے کہ لباس تو بڑی چیز ہے زندگی کی ضرورت کے لحاظ سے جن کا درجہ اس سے برتر ہے مثلاً سونا چاندی، نشان زدہ گھوڑے، مویشی اور کھیتی کے متعلق قرآن کا اعلان ہے:

زین للناس حب الشھوات من النساء والبنین والقناطیر المقنطرۃ من الذھب والفضۃ والخیل المسومۃ والانعام والحرث۔

سنواری گئی آدمی کے لیے خواہشوں کی چاہ یعنی عورتوں کی اور بیٹوں کی ڈھیروں ڈھیر سونے اور چاندی کی، خوبصورت گھوڑوں کی اور مویشیوں اور کھیتوں کی۔

یعنی جس قدرت نے انسان اور انسان کی فطرت بنائی ہے اسی نے آدمی کی جبلت میں ان امور کی آرائی پیدائشی طور پر پیدا کی ہے۔ جیسا کہ لفظ "زین" کے مجہول صیغہ کا اقتضاء ہے یعنی ان امور کی پسندیدگی اور ان کے حبّ و میلان کو آدمی نے خود اپنے اختیار سے اپنے اندر نہیں پیدا کیا ہے بلکہ پیدا کرنے والے

آدمی کو ان امور کے میلان و حب کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ قرآن نے یہاں لباس کے لیے انزال کا لفظ ہی بتانے کے لیے بولا ہے۔ انزلنا کا مادہ نزول ہے نزول کے معنی اترنا اور انزال کے معنے اتارنا ہیں۔ انزال سے مقصود یہاں اولادِ آدم کے لیے لباس کا مادہ روئی اون وغیرہ پیدا کرنا اور اس کی پیدائش کے لیے توتیں واعضا اور لباس بنانے کے وسائل فراہم کرنا ہے۔

لباس کا یہ انعام آغاز آفرینش میں جو کچھ تھا اس کی حیثیت تو بالکل ابتدائی تھی۔ اس دور میں اللہ کے انعامات اس سلسلے میں بے پایاں ہیں۔ اس بے پایانی کا ایک سرسری اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جرمنی میں کپڑے کی صنعت، مشینی آلات کے ذریعہ اتنی ترقی یافتہ ہو چکی ہے کہ ایک زمانے میں قیصر جرمنی کے سامنے ایک دنبہ پیش کیا گیا۔ قیصر کپڑے کا کارخانہ دیکھنے گیا تھا۔ سارے کارخانے کو دیکھ کر جب واپس ہونے لگا تو ایک سلا سلایا سوٹ پیش کیا گیا اور بتایا گیا کہ اسی دنبہ کی اون سے تیار ہوا ہے جو آغاز میں آپ کو دکھایا گیا تھا یعنی صرف دو گھنٹے میں اون اتاری گئی صاف کی گئی، کاتی گئی، کپڑا بنا گیا، سیا گیا اور سوٹ تیار ہو گیا۔ نعمتوں کی فراوانی کے لحاظ سے شکر کی فراوانی بھی ہونی چاہیے۔

تقویٰ انسان کا باطنی لباس ہے

۲۰ ۔ نیز تمہیں پرہیزگاری کی راہ دکھا دی کہ یہ تمام لباسوں سے بہترین لباس ہے۔ یعنی اس ظاہری لباس کے علاوہ جس سے صرف بدن کا تستر یا تزین ہوتا ہے ایک معنوی پوشاک بھی ہے جسے قرآن نے لباس التقویٰ فرمایا باطن کی زینت و آرائش کا ذریعہ بنتی ہے بلکہ اگر غور کیا جاتے تو ظاہری بدنی لباس بھی اس باطنی لباس کو زیب تن کرنے کے لیے شرعاً مطلوب ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ دشمن نے جنت کے کپڑے تم سے اتروائے پھر ہم نے تم کو دنیا میں تدبیر لباس سکھا دی۔ اب وہی لباس پہنو جس میں پرہیزگاری ہو یعنی مرد ریشمی لباس نہ پہنے اور دامن دراز نہ رکھے اور جو منع ہوا سو نہ کرے اور عورت باریک لباس نہ پہنے کہ لوگوں کو بدن نظر آتے اور اپنی زینت نہ دکھاتے[1] عام شارحین قرآن نے لباس تقویٰ سے معنوی اور مجازی لباس مراد لیا ہے۔ زید بن اسلم کہتے ہیں کہ اس سے مراد اسلام ہے۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ ایمان و عمل صالح ہے اور اس سلسلے میں حضرت عثمان کی ایک تقریر الحسن البصری کے حوالے سے پیش کی گئی ہے حضرت عثمان نے برسر ممبر فرمایا لوگو! خلوتوں اور تنہائیوں میں اللہ سبحانہ کی نافرمانی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سے بچو، میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے بخدا کوئی شخص کبھی کوئی عمل خلوت میں نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ جلوت میں اسی عمل کے مطابق اس کو پوشاک عطا کر دیتا ہے، اگر خیر ہو تو خیر کی پوشاک دیتا ہے اور اگر شر ہو تو شر کی پوشاک دے دیتا ہے۔ اس کے بعد حضورؐ نے قرآن کی یہی آیت تلاوت فرمائی۔

اور کچھ نے لباسِ تقویٰ سے مادی لباس مراد لیا ہے۔ چنانچہ امام زید بن علی بن الحسین نے اس کی تفسیر جنگی لباس سے کی ہے۔ یعنی زرہ، خود اور وہ تمام آلات جو میدانِ جنگ سپاہی کی حفاظت کا سامان ہوں۔ اور ابو مسلم اصفہانی نے بھی لباسِ تقویٰ سے لباس مادی مراد لیا ہے۔ بہرحال لباس مجازی ہو یا لباس مادی۔ یہ حقیقت ہے کہ لباس انسان کے لیے کوئی مصنوعی چیز نہیں ہے بلکہ انسان کی فطرت کا ایک اہم مطالبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم پر حیوانات کی طرح کوئی لباس پیدائشی طور پر نہیں رکھا۔ اسی لیے انسان کو بشر کہا ہے انی خالق بشرا، یعنی انسان کو بشر اس لیے کہتے ہیں کہ دوسرے حیوانات میں تو کسی کی کھال اُون سے ڈھکی ہوتی ہے اور کسی کی بالوں سے مگر انسان کی کھال سب حیوانات کے برخلاف کھلی ہوتی ہے۔ انسان کے جسم پر حیوانات کی طرح پوشش کا کوئی سامان نہیں بلکہ حیا و شرم کا مادہ اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے اس نے انسان کے اعضائے صنفی کو محض اعضائے صنفی نہیں بلکہ سوآۃ بنایا ہے جس کے معنی عربی زبان میں ایسی چیز کے ہیں جس کے اظہار کو آدمی معیوب سمجھے۔ اس فطری شرم کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے اللہ نے انسان کو لباس کا الہام فرمایا۔ اس لباس کا انسان کے لیے صرف ستر پوشی اور وسیلہ زینت ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ فی الحقیقت اس معاملہ میں جس بھلائی تک انسان کو پہنچنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اس کا لباس تقویٰ کا لباس ہو۔ یعنی پوری طرح ساتر بھی ہو زینت میں بھی حد سے بڑھا ہوا یا آدمی کی حیثیت سے گرا ہوا نہ ہو۔ فخر و غرور اور تکبر و ریا کی شان لیے ہوتے نہ ہو۔ یعنی وہ لباس پہننا چاہیے جو تقویٰ اور پرہیزگاری کا منشا ہو۔ اور جو لباس تقویٰ اور پرہیزگاری کا منشا ہے اس کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں قولی اور عملی تفسیر سے ظاہر فرما دیا ہے۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اس آیت پر ترجمہ قرآن کے حواشی میں لکھتے ہیں:

> اب وہی لباس پہنو جس میں پرہیزگاری ہو۔ مرد ریشمی لباس نہ پہنے اور دامن دراز نہ رکھے اور جو منع ہوا ہے سو نہ کرے اور عورت بہت باریک نہ پہنے کہ لوگوں کو نظر آوے اور اپنی زینت نہ دکھاوے۔

اسلام میں لباس و پوشاک کی حد بندی اس کے سوا کچھ نہیں کی گئی ہے۔ اس حد بندی کی تفصیل احادیث میں اس طرح آئی ہے۔ مردوں کو کسی ضرورت اور مجبوری کے بغیر خالص ریشم کا بنا ہوا کپڑا نہیں پہننا چاہیے

کیونکہ یہ ان ذہنی امراض کی غمازی کرتا ہے جن کی بنا پر مرد زنانہ پن اختیار کرتے ہیں اور وہ اس عیش و تنعم کی زندگی کی یاد تازہ کرتا ہے جو مردوں کی جدوجہد اور محنت کی زندگی کے خلاف ہے۔ صحیح بخاری اور مسلم میں بحوالہ انس بن مالک ارشاد ہے کہ:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص دُنیا میں ریشمی لباس پہنے گا وہ آخرت میں ہرگز نہ پہنے گا۔

ضرورت اور مجبوری کی تشریح یہ ہے کہ جیسے لڑائی میں زرہ کے نیچے ریشمی کپڑے پہنتے ہیں تاکہ لوہے کی کڑیاں بدن پر اثر انداز نہ ہوں یا کسی کے بدن میں کھجلی ہو تو سوتی کپڑے کے کھردرے پن سے بدن کے چھل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لیے ان دونوں جگہوں میں ریشمی کپڑے پہن سکتے ہیں۔ محدثین کی ایک جماعت نے حضرت انس کے حوالہ سے یہ ارشادِ نبوت نقل کیا ہے:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت زبیر کو خارش کی وجہ سے ریشمی کپڑا پہننے کی اجازت دی۔

اور اگر کوئی دو چار انگل کی ریشم کی دھجی کپڑے میں لگالے تو اس کی بھی اجازت ہے۔ صحیح مسلم میں بحوالہ عمرؓ یہ اجازت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو انگشت تین یا چار انگشت کی مقدار سے زیادہ ریشمی کپڑے کے استعمال سے منع کیا ہے۔

اسی طرح مردوں کے لیے عورتوں کی سی پوشاک اور عورتوں کے لیے مردوں جیسی پوشاک پہننا جائز نہیں ہے کیونکہ اس سے دونوں کی اخلاقی تنگ دامانی کی کھلی شہادت ملتی ہے۔ مسند امام احمد اور سنن ابی داؤد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں پر جو مردوں کے لباس کی مشابہت کریں اور ان مردوں پر جو عورتوں کے لباس کی نقالی کریں لعنت فرمائی ہے۔

عربوں میں لباس کا دامن اتنا لمبا یا تہبند اتنا نیچا ہوتا کہ وہ زمین پر گھسٹتا ہوا چلے بڑائی کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ ان کے بڑے بڑے امراء اور رئیس اتنے ہی لمبے دامن رکھتے تھے اور اتنا ہی نیچا اُزار پہنتے تھے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے لباس التقویٰ کی رُوح کے خلاف سمجھ کر منع فرمایا۔ امام بخاری اور امام مسلم حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ:

جو کوئی اپنا اُزار فخر و غرور اور بڑائی کے اظہار کے لیے گھسیٹ کر چلے گا اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نظر نہیں کرے گا۔

اسی لیے مرد کو پائجامہ کی مہریوں اور تہبند کو اتنا نیچا نہیں کرنا چاہیے کہ ٹخنے چھپ جائیں بلکہ آپ نے پسند فرمایا ہے کہ پائے جامہ اور ازار نصف ساق تک ورنہ کم از کم ٹخنوں سے اُونچا رہے فرمایا ازار نیچے لٹکانا غرور کی نشانی ہے اور خدا غرور کو پسند نہیں کرتا۔ تکبّر نہ ہونا اور تواضع اختیار کرنا ہی متقیانہ سیرت ہے۔

لباس تقویٰ ہی کے پیشِ نظر مرد اور عورت کو ایسا باریک کپڑا نہ پہننا چاہیے جس سے ستر دکھائی دے۔ عورتوں کے لیے خصوصیت سے آپ نے فرمایا،

بہت سی پہننے والیاں ننگی عورتوں کے حکم میں ہیں جو خود مائل ہوتی ہیں، دوسروں کو مائل کرتی ہیں ایسی عورتیں جنت میں داخل نہ ہوں گی اور نہ وہ جنت کی بُو پائیں گی۔

ایسا کپڑا پہننا جس سے پوری ستر پوشی نہ ہو یعنی اس سے ستر کے پورے حدود نہ چھپیں جائز نہیں۔ ایک دفعہ حضرت عائشہ کی بڑی بہن حضرت اسماء کوئی ایسا ہی باریک کپڑا پہن کر حضور کے سامنے آئیں تو آپ نے فرمایا اے اسماء جب عورت جوان ہو جاتے تو اس کو چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ان کے سوا کھولا جائز نہیں ہے۔

لباس تقویٰ ہی کی روح کو پیشِ نظر مردوں کے لیے شوخ رنگ خصوصاً سُرخ رنگ کے کپڑے پہننے ناپسند فرمائے ہیں۔ صحیح مسلم میں ہے حضرت عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ حضور انور نے مجھے دو سُرخ رنگ کے کپڑے پہنے دیکھا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کافروں کا پہناوا ہے یہ نہ پہنا کرو۔ اگرچہ علما نے اسے کراہت تنزیہی بتایا ہے۔ یہ بھی اس وقت جبکہ کپڑے سُرخ ہوں لیکن سُرخ دھاری والے ہوں تو جائز ہیں۔ سُرخ دھاریوں کی چادر آپ نے خود پہنی ہے۔ زرد رنگ کے کپڑے پہنے جا سکتے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم زرد رنگ کا پورا لباس کبھی پہنتے تھے۔ سبز رنگ کی چادر بھی آپ نے اوڑھی ہے اور اس رنگ کا تہبند بھی آپ نے باندھا ہے۔ سیاہ رنگ کا عمامہ بھی زیبِ سر فرمایا۔ البتہ زعفرانی رنگ کو آپ نے مردوں کے لیے پسند نہیں فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سونے کی انگوٹھی، ریشمیں کپڑا پہننے سے، رکوع و سجود میں قرآن کی تلاوت سے اور زعفران کے رنگے ہوتے کپڑا پہننے سے منع فرمایا ہے۔

بہرحال ظاہری لباس کے ساتھ ایک باطنی لباس بھی انسان کو عطا ہوا ہے اور وہ تقویٰ کا لباس ہے۔ درحقیقت یہ تقویٰ کا لباس ہی ہے جو ظاہری لباس کی بھی حقیقی افادیت کو نمایاں کرتا ہے بلکہ سچ پوچھیے تو آدمی اس ظاہری لباس کو اختیار ہی اپنے اس باطنی لباس کی تحریک سے کرتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو آدمی کپڑے پہن کر بھی ننگا رہتا ہے۔ یہ لباس تقویٰ خشیتِ الٰہی اور احساسِ عبدیت سے بنتا ہے اور جس کی قامت پر اللہ اپنی مہربانی اور عنایت کی یہ پوشاک ڈال دیتا ہے دیکھنے کے قابل اسی کا وقار اور جمال ہوتا ہے۔ یہ انسانوں کی صورت

ہیں مقدس فرشتہ ہوتا ہے جو بھی اسے دیکھتا ہے ماھذا بشرا ان ھذا الا ملك کریم کا نعرہ لگاتا ہے۔

لباس بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ہے

۲۱۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے تاکہ لوگ نصیحت یاب ہوں۔ یعنی ان نشانات میں غور کرکے حق تعالیٰ کے قادرانہ انعام واکرام کے معترف اور شکر گزار ہوں[1] ذالک کا مشار الیہ انزال لباس ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لباس کا معاملہ بھی اللہ کی ان بے شمار نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ جو دنیا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ اور حقیقت تک پہنچنے میں انسان کی مدد کرتی ہیں بشرطیکہ انسان خود ان سے سبق لینا چاہے۔ اوپر جن حقائق پر ہم نے اشارہ کیا ہے انہیں اگر تامل کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ لباس کس حیثیت سے اللہ تعالیٰ کا ایک اہم نشان ہے۔

اس فقرے میں خاص طور پر قریش کو تنبیہہ کی گئی ہے کہ لباس اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے ننگے ہوکر عبادت کرنا اور اسے بطور فیشن اپنانا اللہ کی نعمت کی بہت بڑی ناقدری ہے۔ علامہ زمخشری فرماتے ہیں کہ آدم و حوا کے کشف ستر اور پھر پتوں سے پردہ پوشی کے ذکر کے بعد یہ فقرہ یہ بتانے کے لیے آیا ہے کہ لباس کی تخلیق اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور جیسے ستر پوشی میں انسانی عظمت کا راز اور تقویٰ کا بلند مقام ہے ٹھیک اسی طرح بے پردگی اور عریانی میں انسانی شرف کی پامالی اور سیرت کی بہت بڑی رسوائی ہے۔ اور اس میں اشارہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے انسان کو جیسے دنیاوی نعمتوں سے بھی مالا مال کیا ہے ایسے ہی دین کی نعمت سے بھی سرفراز کیا ہے۔ لباس مادی اگر کرتہ پاجامہ اور چادر ہے تو لباس تقویٰ ایمان اور عمل صالح ہے۔ دونوں نعمتوں میں ہم آہنگی پیدا کرکے بتادیا ہے کہ انسان کی کامیابی کا راز دونوں کی یکجائی میں ہے۔

شیطان سے بچنے کی ہدایت

۲۲۔ اے اولادِ آدم کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں اس طرح بہکادے جس طرح تمہارے ماں باپ کو بہکا کر جنت سے نکلوادیا تھا۔ اور ان کے لباس اتروادیے تھے کہ ان کے ستران کو دکھادے۔ اخراج و نزع کی اضافت ان کے سبب کی طرف کی گئی ہے۔ یعنی آدم و حوا کو جنت سے علیحدہ کرنے اور کپڑے اتارے جانے کا سبب وہ ہوا اب تم اس کے فریب میں مت آؤ اور اس کی مکاریوں سے ہوشیار رہو[2]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یا بنی آدم کا خطاب یہاں بتکرار آیا ہے۔ یہاں اس خطاب میں خاص معنویت ہے۔ اس میں بتا دیا ہے کہ آدم کا غیور و باوفا فرزند قرآن کی ان آیات کو سنے گا تو اس کی رگ رگ شیطان کے خلاف جوش حمیت و غیرت سے بھڑک اٹھے گی۔ یہ صرف بے غیرت ہی اولاد ہو سکتی ہے جو اس خطاب کے باوجود بھی ٹس سے مس نہ ہو گی۔

فتنہ کے معنے امتحان اور آزمائش کے آتے ہیں۔ سونار سونے اور چاندی کو کٹھالی میں رکھ کر کھوٹ معلوم کرتا ہے اس کو فتن الصائغ بولتے ہیں اسی سے اس کسوٹی کو فتانہ کہتے ہیں جس پر رگڑ کر سونے کا کھرا یا کھوٹا ہونا معلوم کیا جاتا ہے۔ لا یفتننکم کا مطلب یہ ہے کہ تم نہ اپنے سے غافل ہو اور نہ شیطان کی وسوسہ اندازی سے خبر نہیں کس وقت اس کا داؤ تم پر چل جائے اور وسوسہ اندازی کر کے تم کو جادۂ حق سے ہٹا دے جیسا کہ اس سے پہلے تمہارے والدین آدم و حوا کو ہٹا چکا ہے۔ اس کی وسوسہ اندازی ہی آدم و حوا کے جنت سے نکلنے کا سبب بنی۔ تمہیں خبردار رہنا چاہیے بلا شبہ وہ فتنہ جو مفتون کو دخول جنت سے محروم کرتا ہے اس فتنہ کے مقابلہ ہیچ اور معمولی ہے جو مفتون کو جنت سے نکالنے کا باعث بنا ہے۔

دراصل اس آیت میں قرآن نہایت بلیغ انداز میں اولاد آدم کو بتا رہا ہے کہ اس جنت کو حاصل کرنے کی کوشش کرو جس میں اللہ نے تمہارے والدین کو جگہ دی تھی۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو جس جنت میں رکھا تھا وہ پہلے ان کو اور ان کی اولاد کو ہمیشہ کے لیے دے دی گئی تھی۔ مگر چونکہ ان سے اتفاقاً گناہ ہو گیا تھا اس لیے وہاں سے نکال کر زمین میں بھیج دیے گئے مگر ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ آدم کا زمین پر آنا ان کی پیدائش سے پہلے مقدر ہو چکا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق سے پہلے فرشتوں پر ظاہر کر دیا تھا انی جاعل فی الارض خلیفۃ حضرت آدم کا زمین میں خلیفہ ہونا ان کے زمین میں سکونت پذیر ہونے کی پیش گوئی ہے مگر زمین میں رکھنے سے پہلے ان کو جنت میں رکھنا پھر گناہ کے بعد وہاں سے ان کو نکال کر زمین میں روانہ کرنا یہ اشارہ رکھتا ہے کہ آدم اور ان کی نسل کی اصلی جگہ یہی جنت ہے مگر اس سے دوری ان کے گناہ کی وجہ سے ہے اور اس گناہ کا سبب شیطان بنا ہے۔ اور اس جنت کا حصول شیطان کی فتنہ گری اور وسوسہ اندازی سے بچ کر خدا کی اطاعت کے ذریعہ ہو گا۔ یہاں قرآن نے صرف یہ ہی نہیں بتایا کہ شیطان کی وسوسہ اندازی نے آدم و حوا کو جنت سے نکلوایا بلکہ ان حالات کی تصویر بھی پیش کی جن میں دونوں کا جنت سے اخراج ہوا۔ فرمایا ینزع عنھما لباسھما لیریھما سوآتھما یعنی ان دونوں کو جنت سے اس حال میں نکالا کہ ان کا لباس اتار لیا تھا اور اس کے نتیجے میں ان کی برہنگی ظاہر ہو گئی تھی۔ سمجھ میں یوں ہی آتا ہے کہ زمین پر آنے کے بعد دونوں برہنگی کی حالت میں زندگی گزار رہے تھے حتیٰ کہ حضرت آدم کے بارے میں اللہ کی جانب سے ہدایت ہوئی۔ گویا یہ آدم کی مدنیت کا آغاز ہوا۔ جنت میں جن چار چیزوں کی ضمانت دی گئی تھی

وہ یہ تھیں:

ان لک الا تجوع فیھا	تو بھوکا نہ رہے گا
ولا تعری	تو ننگا نہ رہے گا
وانک لا تظمؤا فیھا	تو پیاسا نہ رہے گا
ولا تضحیٰ	تو دھوپ میں نہ رہے گا۔

یعنی کھانے کے لیے روٹی، پہننے کے لیے کپڑا، پینے کے لیے پانی اور رہائش کے لیے مکان۔ آدم جنت سے نکلے تو ان کو بھوک بھی لگی پیاس بھی معلوم ہوئی، ننگے بھی ہوئے اور دھوپ کی تپش بھی ہوئی۔ یہی انسان کی چار مختصر ضروریات ہیں۔ ان ہی کو اس نے اپنی ہوا و ہوس سے پھیلا کر ضروریات کا ایک عالم پیدا کر لیا۔ جس کے مہیا کرنے، ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے اور عمدہ بنانے میں اپنی موجودہ زندگی کی تمام تر توجہ کو مصروف کر کے اصل جنت کی طلب سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہیں سے شریعت کی تکلیف عائد ہوئی۔ بتانا یہ ہے کہ اب جبکہ تمہیں شیطان کی موروثی عداوت کا حال بخوبی معلوم ہو گیا ایسے اعمال ہرگز نہ کرنا جس کے نتیجے میں جنت کی وراثت سے محروم ہو جاؤ، آگے اس کی علت بتائی ہے۔

شیطان کی فتنہ سامانی

۲۷۔ شیطان اور اس کا گروہ تمہیں اس طرح دیکھتا ہے کہ تم اسے نہیں دیکھتے ہو یعنی جو دشمن ہم کو اس طرح دیکھ رہا ہو کہ ہماری نظر اس پر نہ پڑے اس کا حملہ سخت خطرناک اور مدافعت سخت دشوار ہوتی ہے۔ اس لیے تم کو بہت مستعد و بیدار رہنا چاہیے۔ ایسے دشمن کا علاج ہی یہ ہے کہ ہم کسی ایسی ہستی کی پناہ میں آئیں جو اسے دیکھتی ہے پر وہ اسے نہیں دیکھتا۔ لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر۔[1]

انسان صرف روح یا صرف جسم نہیں بلکہ روح و جسم دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ جسم انسانی کے لیے بھی بیماریاں ہیں اور روح انسانی کے لیے بھی امراض ہیں۔ جسم انسانی کے امراض کی تولید اگر جراثیم سے ہوتی ہے تو روح انسانی کی بیماریاں شیاطین سے پروان چڑھتی ہیں۔ جیسے اجسام انسانی کو جراثیم خراب کرتے ہیں ایسے ہی روح انسانی کو شیاطین تباہ کرتے ہیں۔ اگر شیاطین بھی جراثیم کی طرح خوردبین کے ذریعے ایسے ہی نظر آجاتے جیسے اطبا کو جراثیم کا مشاہدہ ہو جاتا ہے تو انسان خود بغیر کسی وصیت کے ان سے بچ جاتے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

لیکن یہاں قرآن نے بتایا ہے کہ شیاطین عام انسانی نگاہ کی گرفت میں نہیں آتے اس لیے ان سے بچنا ناگزیر ہے جسم کی حد تک جیسے جراثیم سے محفوظ رہنے کے دو طریقے ہیں ایک یہ کہ ان اسباب کو اپنایا جائے جن سے جسم انسانی جراثیم سے محفوظ رہے دوسرے یہ کہ اچھی غذاؤں اور بدن کی صفائی کے ذریعے اتنی جسمانی طاقت فراہم کر لی جائے کہ خود مدافعت کر سکے۔ ٹھیک اسی طرح روح انسانی کو شیاطین کی دستبرد سے بچانے کے لیے طب روحانی کے ماہرین کی رائے پر عمل کیا جائے۔ ان سے بچنے کے بھی دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ روح کو ایمان باللہ ایمان بصفات اللہ، عبادت مناجات اور اخلاص و انابت کے ذریعے اتنا طاقتور بنا دیا جائے کہ شیاطین کی مدافعت کر سکے، دوسرے یہ کہ ذکرِ الٰہی، توبہ و استغفار کے ذریعے شیاطین کا مداوا کیا جائے۔ خواطر اور ہواجس شیطانی کی مدافعت میں ذکر اللہ ایک بہت ہی موثر طاقت ہے۔ صحیح حدیث میں آیا ہے اذا ذکر اللہ خنس آدمی جب اللہ کو یاد کرتا ہے تو شیطان پیچھے سرک جاتا ہے۔

کچھ علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ انسانوں کے لیے جنات کا دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن دوسرے علماء کو ان کے اس موقف سے اتفاق نہیں ہے۔ یہ علماء اہل السنہ ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے۔ مولانا عثمانی فرماتے ہیں:

> انہ یراکم ھو وقبیلہ من حیث لا ترونھم قضیہ مطلقہ ہے۔ دائمہ نہیں ہے۔ یعنی بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ ہم کو دیکھتے ہیں اور ہم ان کو نہیں دیکھتے۔ اس کہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی وقت بھی کوئی شخص کسی صورت میں ان کو نہ دیکھ سکے۔ پس آیت سے رویت جن کی بالکلیہ نفی پر استدلال کرنا کوتاہ نظری ہے۔

اور مولانا اشرف علیؒ فرماتے ہیں:

> مطلب اس کا یہ ہے کہ انسان کا جنات کو دیکھنا عادت فاشیہ و شائعہ کے خلاف ہے اور دیکھنے کی قطعاً نفی نہیں ہے۔ بس بعض اوقات بعض انبیاء علیہم السلام کا یا غیر انبیاء کا خواص یا عوام سے جنات کو دیکھنا اس آیت کے خلاف نہیں ہے۔

قاضی بیضاوی، علامہ آلوسی، علامہ قرطبی نے یہی موقف اختیار کیا ہے لہٰذا صحیح یہی ہے کہ جنوں کی رویت ممکن ہے۔ احادیث میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوں کو دیکھا ہے۔ اور زکوٰۃ رمضان کی نگرانی کے قصہ میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے ایک جن کو پکڑ لیا۔ اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج رات میری نماز قطع کرنے کے لیے میرے پاس ایک سرکش جن آگیا۔ اگر میرے بھائی سلیمان علیہ السلام کی دعا نہ ہوتی تو میں اسے پکڑ کر مسجد کے ستون سے باندھ دیتا اور صبح کو مدینے کے

بچے اس سے کھیلتے۔ نیز یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے نصیبین کے جنوں کو دیکھا ہے۔ اب رہا امام شافعی کا یہ فرمانا کہ جو شخص جنات کی رویت کا دعویٰ کرے اس کی شہادت مردود ہے تو اس سے امام شافعی کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ان کو اپنی اصلی شکل میں دیکھنے کا دعویٰ کرے ۔

بے ایمانوں کے لیے شیاطین کی ولایت

۲۷۔ یاد رکھو ہم نے شیاطین کو ان لوگوں کا رفیق بنا دیا ہے جو ایمان نہیں رکھتے ہیں۔ یعنی جب انہوں نے اپنی بے ایمانی سے خود شیاطین کی رفاقت کو اپنے لیے پسند کر لیا جیسا کہ چند آیات کے بعد آرہا ہے :

انهم اتخذوا الشياطين اولياء من دون الله ويحسبون انهم مهتدون ۔

تو ہم نے بھی ان کے اس انتخاب میں کوئی مزاحمت نہیں کی جس کو انہوں نے اپنا رفیق بنانا چاہا اسی کو رفیق بنا دیا گیا[1]

آیت میں قانون یہ بتایا گیا ہے کہ شیاطین ان ہی لوگوں کے رفیق بنائے جاتے ہیں جو ایمان سے تہی دامن ہوتے ہیں۔ یعنی شیطانوں کو دست اندازی کا موقعہ وہاں ملتا ہے جہاں ایمان کا فقدان ہوتا ہے بے ایمانی اور کفر میں شیطان کی رفاقت قبول کرنے کی پوری پوری صلاحیت ہوتی ہے ۔ اس کی مثال مادی دنیا میں یہ ہے کہ جراثیم کا اثر بیماریوں کے لیے وہ جسم قبول کرتے ہیں جن میں اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے جو ان اسباب سے نہیں بچتے جو بیماریاں پھیلاتے ہیں، ایسے ہی شیاطین ان ہی روحوں پر دسترس رکھتے ہیں جو ایمان سے کورے ہوتے ہیں ۔ ایمان سے کورے ہونے تہی دامن ہونے اور محروم ہونے کا مطلب یہ ہے جو انبیاء کی رہنمائی کو قبول نہیں کرتے اور خدا پر یقین نہیں رکھتے۔ شیطان کی دستبرد سے محفوظ رہنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ نبوت کی رہنمائی قبول کی جائے اور زندگی میں اسی کی پیروی کی جائے۔ اگر ایسا ہوگا تو قرآن نے لاخوف عليهم ولا هم يحزنون کی ضمانت دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شیاطین کو مسلط ہونے کا موقع انہی پر دیتا ہے جو خدا اور اس کی ہدایت پر ایمان سے محروم ہوتے ہیں۔ ان کے دل خالی گھر کے مانند ہوتے ہیں اس وجہ سے شیطان ان میں ڈیرہ جما لیتا ہے ۔

خانہ خالی را دیو مے گیرد

اس کے برعکس جن کے دل خدا اور اس کی ہدایت پر ایمان سے آباد ہوتے ہیں۔ ان کے اندر شیاطین

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کو گھسنے کا موقع نہیں ملتا۔ یہی بات دوسری جگہ اس انداز میں فرمائی ہے۔

و من یعش عن ذکر الرحمان نقیض لہ شیطانا فھو لہ قرین

اور جو آنکھیں چراتا ہے رحمان کی یاد سے تو ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں۔ پھر وہی اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔

یہ قانون سب کے لیے ہے اور ذکر الرحمان سے اعراض کی سزا شیطانی تسلط کی صورت میں سب کو بھگتنی پڑتی ہے دولت مند ہوں یا غریب حاکم ہوں یا محکوم اس جرم کا ارتکاب اگر غریبوں کی طرف سے یا عام شہریوں کی طرف سے ہوگا تو اس قدرتی تازیانے سے وہ بھی ایسے ہی محفوظ نہ ہوں جیسے امیر لوگ اور حکمران طبقہ۔ مطلب یہ ہے کہ نبوت اور ایمان کی راہ سے ہٹ کر جو بھی چلنا چاہے گا۔ دکھ کے ساتھ اسے واپس ہونا پڑے گا۔ آج نہیں تو کل اسے پچھتانا پڑے گا۔ ایک کانٹا نکلے گا تو دس کانٹے چبھیں گے۔ اگر ایک گرہ کھلے گی تو کھل کر وہی بیسیوں گرہوں کی صورت اختیار کرے گی۔ عارف رومی نے اپنے تمثیلی بیان میں اسی مضمون کو کتنے اچھے پیرائے میں ادا فرمایا ہے۔

کس بزیر دم خر خارے نہد		خر نداند دفع او برمی جہد

ایک شخص کسی گدھے کی دم کے نیچے کانٹا چبھا دیتا ہے گدھا کانٹا نکالنے کی تدبیر سے چونکہ ناواقف ہے اس لیے کودتا پھاندتا پھرتا ہے۔

می جہد آں خار محکم تر زید		عاقلے باید کہ آں خارش کند

کودتا ہے اور کانٹا اور زیادہ چبھتا جاتا ہے۔ ضرورت کسی عقل والے کی ہے جو اس کانٹے کو اندر سے نکال دے۔

خر ز بہر دفع خار از سوز درد		جفتہ می انداخت صد جا زخم کرد

گدھا کانٹے کو نکالنے کے لیے جلن اور درد کے مارے رگڑوں پر رگڑے لگا کر سینکڑوں جگہ زخم پیدا کر لیتا ہے۔

آج دنیا اسی حال میں مبتلا ہے۔ پرستش کے معاملہ میں بھی اور بندگی کی راہ میں بھی۔ شیاطین ان ہی دوراہوں پر شب خون مارتے ہیں۔

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا
بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ
مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٨﴾ قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ ۖ وَأَقِيمُوا
وُجُوهَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ
كَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ ﴿٢٩﴾ فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ
الضَّلَالَةُ ۗ إِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ اللَّهِ
وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُم مُّهْتَدُونَ ﴿٣٠﴾

اور یہ لوگ جب کسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے اور خدا نے ہمیں ایسا ہی کرنے کا حکم دیا ہے[25]۔ اے پیغمبر فرما دیجئے کہ خدا کبھی بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم خدا کے نام پر ایسی بات کہنے کی جرأت کرتے ہو جس کے لیے تمہارے پاس کوئی علم نہیں

ہے۔[۲۶] فرما دیجئے میرے پروردگار نے جو کچھ حکم دیا ہے وہ تو یہ ہے کہ ہر بات میں راہِ اعتدال کو اپناؤ۔[۲۷] اپنی تمام عبادتوں میں خدا کی طرف توجہ ٹھیک رکھو اور حکم برداری میں اسی کے ہو کر اس کو پکارو۔[۲۸] جب اس نے تم کو پہلی بار بنایا ہے اسی طرح دوسری بار بنو گے۔[۲۹] دو گروہ ہیں ایک گروہ کو اس نے راہِ حق دکھائی اور ایک گروہ پر گمراہی و بے راہ روی ثابت ہو گئی کیونکہ انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیاطین کو اپنا رفیق بنا لیا اور سمجھتے ہیں کہ راہِ راست پر ہیں۔[۳۰]

گمراہی کا سب سے بڑا سرچشمہ

اس آیت میں خود ساختہ گمراہیوں کا اصلی سبب بتایا ہے اور متنبہ کیا کہ برائیوں کا سارا سرچشمہ اپنے بڑوں کی تقلید ہے۔ اگرچہ شارحین قرآن نے یہاں فاحشہ سے مراد مشرکین کا بیت اللہ کا ننگے طواف کرنا بتائی ہے۔ لفظ فاحشہ عام ہے۔ یہ لفظ فحش سے نکلا ہے جس کے معنے حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں اور اس کے دوسرے معنے لازمی قبح یعنی برائی کے ہیں کیونکہ جس چیز کی جو حد خالقِ فطرت نے مقرر کر دی ہے اس سے آگے بڑھنا قبح یعنی بُرائی ہے یا یہ کہ جو بُرائی حد سے زیادہ ہو جائے وہ فاحشہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوتِ شہوانی کی تسکین کے لیے کچھ حدیں مقرر کر دی ہیں اب جو ان حدوں سے آگے نکل جاتا ہے وہ فاحشہ کا مرتکب ہے۔ زنا کو بھی اسی لیے فاحشہ کہا گیا ہے اور وسعت سے اس کا اطلاق ہر فحش گوئی فحش کاری پر ہوتا ہے جس کی ہر نوع سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو باز رہنے کی تاکید کی ہے۔ قرآن فاحشہ کو نکرہ لے کر آیا ہے

یعنی کوئی بے حیائی کا کام، خواہ اس کا تعلق کسی سے ہو۔ یہاں یہ جتانا ہے کہ بُرائی کرنا اور بزرگوں کے نام سے کرنا اور پھر یہ کہنا کہ اللہ نے ہی ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس جُرم کی شناعت اور سنگینی کو دوبالا کرتا ہے۔ انسانی طبیعت کی یہ بہت بڑی کمزوری ہے کہ جب ایک برائی کرتی ہے اور اس کے پاس اس کے جواز کے لیے دلیل کی کوئی طاقت نہیں ہوتی ہے تو وہ ایسے موقعہ پر بزرگوں کا سہارا تلاش کرتا ہے اور بزرگوں کی عقیدت کا بوجھ اس قدر ہوتا ہے کہ اس کو امرِ الٰہی بتانے لگتا ہے۔ یہ ایک جاہلانہ حربہ ہے جسے لوگ حق کے خلاف استعمال کرتے ہیں قرآن نے ان آیات میں اسی جاہلانہ موقف پر ضرب کاری لگائی ہے۔ بزرگوں کی تقلید کا موقف اس قدر لچر اور بیہودہ ہے کہ قرآن نے یہاں صراحتہً اس کے متعلق کچھ کہنا بھی گوارا نہیں کیا بلکہ اس عمارت کو ڈھایا جو اس اساس پر کھڑی کی گئی تھی اور فرمایا ان اللّٰہ لا یامر بالفحشاء جو کام فحش ہے اور جسے تم خود بھی جانتے ہو کہ یہ فحش ہے اس کے متعلق یہ تصور کتنی بڑی دیدہ دلیری ہے کہ خدا نے اس کا حکم دیا ہوگا۔ کسی فحش کام خدا کی طرف سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔

۲۵ - اور یہ لوگ جب کسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے اور خدا نے ہمیں ایسا ہی کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہاں فاحشہ سے مراد وہ عبادات ہیں جو انہوں نے از خود ایجاد کر رکھی تھیں۔ مثلاً ننگے ہو کر بیت اللّٰہ کا طواف کرنا۔ اس آیت میں مشرکین کے اپنی بے حیائی اور بدکاری پر قائم رہنے کے لیے دو عذر بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم نے اپنے بڑوں کو ایسا ہی کرتے پایا ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مشرکین مکہ بیت اللہ کے طواف کو ننگا کرنے کے جواز اور وجوب کے لیے دو قسم کے سہارے پیش کرتے۔ ایک سہارا تو یہی تھا کہ باپ دادا کی ریت ہے اور دوسرا یہ کہ اسے حکم شریعت سمجھتے تھے۔ اگرچہ قریش خود تو اپنے آپ کو اس سے بالاتر رکھے ہوئے تھے لیکن دوسروں کے لیے مرد ہوں یا عورت انہوں نے اس عریانی کو عبادت قرار دے رکھا تھا۔ ان کا فتویٰ یہ تھا کہ قریش سے باہر کے عرب اپنے کپڑوں میں خانہ کعبہ کا طواف نہ کریں۔ یا تو وہ قریش سے اس کام کے لیے کپڑے مستعار لیں ورنہ ننگے طواف کریں۔ گویا دوسروں کے کپڑے آلائش دُنیا اور زینتِ دُنیا میں داخل ہیں جس سے اس عبادت کی حرمت کو بٹہ لگتا۔ اس بدعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ طواف جیسی مقدس عبادت فساق و فجار کی نظر بازیوں اور شرارتوں کی جولانگاہ بن گئی۔ اور حرم میں نظر بازیوں کی لذیذ و رنگین داستانیں ان کی فاسقانہ شاعری میں بھی نمایاں ہو گئیں۔ اللہ اکبر عقلِ انسانی حیران رہ جاتی ہے کہ کس کامیابی کے ساتھ شیطان نے حرم میں گھسنے کے لیے کیسا مقدس مذہبی لبادہ اختیار کیا اور کس کامیابی کے ساتھ اس نے اللہ کی سب سے بڑی عبادت کو اپنی عبادت میں تبدیل کر دیا۔ یہ اسی طرح کی عیاشی اور نفس پروری کی ایک

مگر وہ شکل تھی جس کی بے شمار مثالیں مزارات پر آپ دیکھتے ہیں۔ عورتوں اور مردوں کا اختلاط، رقص و سرود کی محافل کا انعقاد وغیرہ وغیرہ۔ انا للہ فالی اللہ المشتکی ۔

حکم الٰہی کی پہچان کا معیار

۲۶ — اے پیغمبر فرما دیجئے کہ خدا کبھی بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دیتا کیا تم خدا کے نام پر ایسی بات کہنے کی جرأت کرتے ہو جس کے لیے تمہارے پاس کوئی علم نہیں ہے۔ پہلے سُن چکے ہو کہ مشرکین اپنی بے حیائی اور بدکاری کے جواز کے لیے دو عذر پیش کرتے تھے ایک آبائی تقلید دوسرے یہ کہ اللہ نے ان کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے پہلا عذر چونکہ بطور واقعہ صحیح تھا اس لیے یہاں اس کی تردید نہیں کی۔ قاضی بیضاوی، زمخشری اور امام رازی نے لکھا ہے کہ اس عذر کا جواب اس لیے نہیں دیا کہ اس کا فساد جانا بوجھا ہے کیونکہ اگر تقلید آبائی کسی کام کے جواز کی دلیل ہو تو ادیان متناقضہ کا حق ہونا لازم آتا ہے اور یہ بالبداہت غلط ہے۔ اس موضوع پر قرآن نے اصولی بات یہ بتا دی ہے اولو کان آباءھم لا یعقلون شیئاً ولا یھتدون، دوسرا عذر چونکہ واقعۃً بھی غلط تھا اور بطورِ دلیل بھی، یعنی ان کا ایسا کہنا عقلاً اور نقلاً غلط ہے۔ عقلاً اس لیے کہ یہ کردار یعنی بیت اللہ کا ننگے طواف کرنا سب کے نزدیک برائی ہے اور اس کے برائی ہونے میں دو رائیں نہیں ہیں۔ اور معلوم ہے کہ اللہ کی ذات اپنے کمال مطلق کی وجہ سے اس سے بالا ہے کہ وہ اس فاحشہ کا حکم دے۔ اس کا حکم تو مجمع النقائص ہی دے سکتا ہے اور وہ شیطان ہے۔ قرآن میں ہے الشیطان یعدکم الفقر ویامرکم بالفحشاء۔ اور نقلاً اس لیے کہ خدا کے اوامر اور نواہی محض دعوے سے ثابت نہیں ہوتے۔ بلکہ ضروری ہے کہ اس کی پشت پر وحی الٰہی کی طاقت ہو۔ اور معلوم ہے کہ وحی الٰہی نے یہ بات نہیں بتائی۔ اللہ کبھی بے حیائی اور بے شرمی کا حکم نہیں دیتا۔ خدا کے احکام، اس کی صفات اور انسانی فطرت کے تقاضوں کے مطابق، جب اس کی صفات میں کوئی صفت بھی ایسی نہیں جو اس بے حیائی کو گوارا کر سکے تو وہ اس کا حکم کیسے دے سکتا ہے۔ پھر جب اس نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ آغازِ شعور سے لے کر مرتے دم تک وہ کبھی پسند نہیں کرتا کہ دوسروں کے سامنے عریاں ہو تو وہ اسی انسان کو یہ کیسے حکم دے سکتا ہے کہ وہ علی الاعلان اس کے حرم میں ساری خدائی کے سامنے ننگا ہو جائے اور ننگے ہو کر اس کے آگے پھیرے لگائے۔ آخر خدا اور اس کی پاکیزہ صفات انسان اور اس کی سلیم فطرت کے ساتھ اس بیہودہ حرکت کا کیا جوڑ ہے۔ خدا پر ایسی بیہودہ تہمت کیوں لگاتے ہو؟

حضرت مولانا عثمانی نے اس آیت پر اپنے افادات میں جو تبصرہ کیا ہے وہ بہت زیادہ جامع ہے

فرماتے ہیں "بُرے اور بے حیائی کے کام مثلاً مرد و عورت کا برہنہ طواف کرنا جو ان آیات کی شانِ نزول ہے جن سے عقلِ سلیم اور فطرت صحیحہ نفرت کرتی ہے خدائے قدوس کی شان نہیں ہے کہ ان کی تعلیم دے۔ وہ تو پاکی اور حیا کا سرچشمہ ہے۔ گندے اور بے حیائی کے کاموں کا حکم کیسے دے سکتا ہے۔ اصل میں بے حیائی اور بُرائی کی تعلیم دینے والے وہ شیاطین ہیں جن کو انہوں نے اپنا رفیق بنا رکھا ہے۔ دیکھو تمہارے سب سے پہلے ماں باپ کو شیطان نے فریب دے کر برہنہ کرایا مگر وہ شرم و حیا کے مارے درختوں کے پتے بدن پر لپیٹنے لگے۔ معلوم ہوا کہ برہنگی شیطان کی جانب سے اور ستر کی کوشش تمہارے باپ کی طرف سے ہوئی۔ پھر برہنہ طواف کرنے پر باپ دادوں کی سند لانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ نیز بقول حضرت شاہ صاحب، سُن چکے ہو کہ پہلے باپ نے شیطان کا دھوکہ کھایا پھر باپ کی کیوں سند لاتے ہو۔ یہ کس قدر بے حیائی کی بات ہے کہ جو کام شیطان کے حکم سے ہو رہا ہے اسے کہا جائے کہ ہم کو خدا نے یہ حکم دیا ہے[1]

دراصل اس آیت میں اللہ سبحانہٗ نے مشرکین مکہ کے جاہلانہ عقائد پر بہت بڑی ضرب لگائی ہے ایک طرف وہ عبادت میں برہنگی کو اختیار کرتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ برہنگی کو ایک شرمناک حرکت بھی تصور کرتے تھے۔ اسے بے حیائی سمجھنے کے ساتھ ان کا یہ دعویٰ بھی تھا کہ طواف میں برہنگی کی رسم اللہ نے مقرر کی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ جس کام کو خود فاحشہ کہتے ہیں اور مانتے ہیں کہ فاحشہ ہے پھر اس کے متعلق یہ کیسے کہتے ہیں کہ اللہ نے اس کا حکم دیا ہے۔ کسی فاحشہ کے حکم کی نسبت خدا کی طرف ہرگز نہیں ہو سکتی۔ کسی بھی مذہب میں ایسے حکم کا پایا جانا اس بات کی صریح علامت ہے کہ یہ مذہب خدا کی جانب سے نہیں ہے۔

عمل میں اعتدال راہِ حق کی بنیاد ہے

۲۷۔ فرما دیجئے میرے پروردگار نے جو کچھ حکم دیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ ہر بات میں راہِ اعتدال اپناؤ۔ روح المعانی میں ہے القسط علی ما قال غیر واحد العدل وھو الوسط من کل شیٔ المتجافی عن طرفی الافراط والتفریط آیت کا حاصل یہ ہوا کہ حق تعالیٰ نے ہر کام میں راہِ اعتدال پر رہنے اور افراط و تفریط سے بچنے کی ہدایت کی ہے پھر بھلا فواحش کا حکم کیسے دے سکتے ہیں[2]

شارحین قرآن نے قسط کے مفہوم میں وہ تمام چیزیں داخل کی ہیں جسے ہم عام بول چال میں عدل و

[1] [2] افادات شیخ الاسلام

انصاف، راستی و حق، اچھے کام، اچھی بات، اچھے افکار، توحید، کلمۂ اخلاص کہتے ہیں۔ ابو مسلم اصفہانی کی رائے میں ساری طاعات مراد ہیں اور حاکم نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ اصل میں اس کے معنے عدل کے آتے ہیں۔ اس کی ضد ظلم اور جور ہے۔ فکر، عمل قول اخلاق کردار، مظاہر اور اشکال غرض ظاہر و باطن کے ہر گوشے میں ایک نقطہ توازن ہے جو ہر چیز کے خالق و فاطر کی بنائی ہوئی فطرت اور اس کے مقرر کیے حدود و قیود کے اندر ہے۔ اسی کو نقطۂ اعتدال کہتے ہیں۔ اگر کسی گوشے میں اس نقطے سے شوشے کے برابر بھی انحراف واقع ہو جائے، تو یہ بات عدل و قسط کے خلاف ہوگی۔ اعتبارات اور نسبتوں کی تبدیلی سے تعبیرات بدل جائیں گی۔ کسی دائرے میں ہم اس انحراف کو ظلم و جور سے تعبیر کریں گے۔ کسی گوشے میں بدصورتی سے۔ اسی طرح کسی پہلو میں اس اعتدال کو حق و عدل سے تعبیر کریں گے کسی محل میں حسن و جمال سے لیکن اصل حقیقت ہر جگہ ایک ہی ہوگی۔ وہ یہ کہ ایک چیز اپنے اصل مقام سے ہٹ گئی تو بگاڑ پیدا ہو گیا اور اگر اپنے جوڑ سے پیوست ہو گئی تو بناؤ نمودار ہو گیا۔

جیسا کہ علامہ آلوسی نے بتایا ہے کہ اکثر مفسرین کے خیال میں قسط زندگی کے سارے گوشوں میں عدل و استقامت کا نام ہے۔ آلوسی کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کیونکہ اصل یہ ہے کہ اسلامی زندگی کا جہاں تک تعلق ہے اس کے متعلق بلا شائبہ اختلاف اور بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ اضداد کی کامل ترین وحدت اور ترکیب کا نام ہے اس لیے کہ یہ نظام جن افکار و تصورات کے مجموعہ سے عبارت ہے ان میں سے کسی ایک تصور پر غیر متوازن زور نہیں دیا گیا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کیا ہے کہ لا تغلوا فی دینکم اپنے دین میں غلو نہ کرو کیونکہ غلو کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس اصول یا پہلو میں غلو کیا جاتا ہے اسی کی نفی ہو جاتی ہے۔ مذہبی جزئیات و فروعات پر ایک حد مناسب سے زیادہ زور دیجیے لامحالہ کوئی نہ کوئی اصول باطل ہو جائے گا۔ خدا کی صفات میں سے کسی ایک صفت میں یک طرفہ مبالغہ کیجیے اس کی کوئی دوسری صفت مجروح ہو جائے گی۔ اسی لیے ہر اصول ہر قاعدے ہر حکم ہر اخلاقی ہدایت کی اسلام نے ایک خاص حد مقرر کی ہے اس کے آگے بڑھو گے تو نفع کی جگہ نقصان، ثواب کی جگہ گناہ اور خدا کی خوشنودی کی جگہ اس کی ناخوشی مول لو گے۔

دنیا کے تمام نظاماتِ فکر و عمل اور سارے مذاہب و ادیان میل و انحراف اور افراط و تفریط میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ انہوں نے جن تصورات کو دنیا کے سامنے پیش کیا ان پر اس بے اعتدالی کے ساتھ زور دیا کہ ان کی حقیقت باطل ہو گئی۔ غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ ہر مذہب غیر متوازن افکار و میلانات کا حامل اور بے اعتدالی کا شکار ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی

نظام میں افراط و تفریط کے مابین ایک عجیب و غریب قسم عدل و توازن پایا جاتا ہے۔ قرآن نے دوسرے مقامات میں اسی حقیقت کو سمجھانے کے لیے میزان یعنی ترازو کی تعبیر اختیار کی ہے۔ اور اس ترازو سے بہتر اس بات کو سمجھانے کے لیے کوئی عام فہم اور دل نشین تعبیر نہیں ہو سکتی۔ سورۂ آل عمران کی مشہور آیت میں قائماً بالقسط کہہ کر اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا۔ یعنی کائنات میں اس کے تمام کام عدالت کے ساتھ قائم ہیں اور اس نے قیام ہستی کے لیے یہی قانون ٹھہرایا ہے۔ جب عدالت کا قانون کائنات کے ہر گوشہ میں کارفرما ہے۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ انسان کے افکار و اعمال کے لیے بے اثر ہو جاتے۔ یہاں بھی وہی عمل مقبول ہوتا ہے جو افراط و تفریط اور میل و انحراف کی جگہ فطرت کے عدل و قسط پر مبنی ہوتا ہے۔ اسی کو قرآن کی زبان میں ایمان اور عمل صالح کہتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن نے مسلمانوں کو دُنیا میں قوّامین بالقسط کے لقب سے سرفراز فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا ہر قول و فعل اسی باٹ اور اسی ترازو سے تولا ہوا ہو اور تم اسی پر قائم رہنے والے اور اسی کو قائم کرنے والے ہو اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ شہداء بالقسط یعنی صرف اس پر قائم رہنا ہی تمہاری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ تم دُنیا کے سامنے اللہ کی طرف سے اسی قسط و اعتدال کے داعی اور گواہ ہو اور یہی بات تمہارے فرائض میں داخل ہے۔ بہرحال قسط ایک جامع حقیقت ہے جو تمام انسانی زندگی کی سمان ہے۔ یعنی ہر چیز میں ٹھیک ٹھیک نقطہ عدل و اعتدال کا اہتمام اس کا تعلق زندگی کے ایک ہی پہلو سے نہیں ہے بلکہ ہر پہلو سے ہے۔ عقائد میں، اعمال میں، عبادات میں، اخلاق میں، معیشت میں، معاشرت میں، قانون میں، سیاست میں غرض کہ ہر شعبۂ زندگی میں یہی وہ اصل الاصول ہے جس پر شریعت الٰہی مبنی ہے۔ موقع و محل کے اعتبار سے اس کی تعبیریں بدل جائیں گی لیکن اصل حقیقت اپنی جگہ قائم رہے گی۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ انسان اپنی زندگی کو عدل و راستی کی بنیاد پر قائم کرے۔

عبادت میں توجہ فرمانبرداری میں اخلاص

۲۸۔ اپنی تمام عبادتوں میں خدا کی طرف توجہ ٹھیک رکھو اور حکم برداری میں اسی کے ہو کر اسی کو پکارو۔ حضرت شیخ الہند نے مسجد کو غالباً مصدر میمی بمعنی سجدہ کے کر تجوزاً اس کا ترجمہ نماز سے فرمایا ہے اور وجوہ کو اپنے ظاہر پر رکھا ہے۔ یعنی نماز ادا کرنے کے وقت اپنا منہ سیدھا کعبہ کی طرف رکھو مگر دوسرے بعض مفسرین اقیموا وجوہکم سے مراد یہ لیتے ہیں کہ خدا کی عبادت کی طرف ہمیشہ استقامت کے ساتھ دل سے متوجہ رہو۔ حافظ ابن کثیر کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی عبادات میں سیدھے رہو۔ جو راستہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اس سے ٹیڑھے ترچھے نہ چلو۔ عبادت کی مقبولیت دو ہی چیزوں پر موقوف ہے۔ خالص خدا کے

لیے ہو جس کو آگے فرمایا وادعوہ مخلصین له الدین اور اس مشروع طریق کے موافق ہو جو انبیاء علیہم السلام نے تجویز فرمائی ہے۔ اس کو واقیموا وجوھکم میں ادا کیا گیا۔ بہرحال اس آیت میں اوامر شرعیہ کی تمام انواع کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو بندوں کے معاملات سے متعلق ہیں وہ سب قسط میں آگئے اور جن کا تعلق خدا سے ہے اگر قالبی ہیں تو وہ واقیموا وجوھکم میں اور اگر قلبی ہیں تو وادعوہ مخلصین له الدین میں مندرج ہو گئے[1]

حضرت شاہ عبدالقادر نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح فرمایا ہے:

اور سیدھے کرو اپنے منہ ہر نماز کے وقت اور پکارو اس کو نرے اس کے حکم بردار ہو کر۔

شاہ صاحب نے اس ترجمہ کے ذریعے آیت کی بہت گہری معنویت کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ بندوں کے اللہ سے محبوب ہونے کی وجہ سے پرستش کے اور حاکم ہونے کی وجہ سے بندگی کے تعلقات ہیں۔ انسان کی ہمیشہ سے کمزوری یہ رہی ہے کہ ان ہی دو تعلقات کو اس نے ملاوٹ کے ذریعے خراب کیا ہے۔ اگر اس نے اپنی دعاؤں اور طلبگاریوں میں کسی ہستی کو بھی شریک کر لیا تو گویا اس نے خدا کی پرستش میں شریک کر لیا دعا، استعانت، رکوع و سجود، عجز و نیاز، اعتماد و توکل اور اس طرح کے تمام عبادت گزارانہ اور نیاز مندانہ اعمال وہ اعمال ہیں جو خدا اور اس کے بندوں کا پرستش میں باہمی رشتہ قائم کرتے ہیں۔ اگر ان اعمال میں کسی دوسری ہستی کو شریک کیا گیا تو خدا کے رشتہ پرستش کی یگانگت قائم نہ رہی۔

اسی طرح پوری کائنات کا جس کا ہماری یہ دنیا بھی ایک چھوٹا سا حصہ ہے مقتدر اعلیٰ اللہ ہے۔ حکم دینے اور منع کرنے اور اپنی مرضی پوری کرانے کا اصل مستحق صرف وہی ہے حقیقی اور واقعی قانون ساز بھی وہی ہے کسی مخلوق کا فریضہ متعین کرنے، اس کے معاملے میں فیصلہ کرنے اسے معاف کرنے یا سزا دینے کا اختیار بھی پورے کا پورا اسی کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی نہیں جو کسی کے لیے قانون بنانے اور اپنا حکم چلانے کا ذاتی استحقاق رکھتا ہو اور جس کی بے قید اطاعت جائز ہو۔ اب اگر کوئی شخص کسی اور کے لیے بھی حکم دینے اور قانون بنانے کا حق مانتا ہے اور اسی کی اطاعت بھی اللہ کی اطاعت کی طرح کرتا ہے تو اللہ کے رشتہ بندگی میں دوسروں کو شریک کرتا ہے۔ یہ دونوں رشتے خالص خدا سے بغیر کسی ملاوٹ کے ہونے چاہئیں اس آیت میں یہی مطالبہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کی توحید کا یہ تصور نہ صرف انسان کی انفرادی زندگی کے لیے ضروری ہے بلکہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اجتماعی زندگی کے اعلیٰ ترین مقاصد کا حصول بھی خدا کی پرستش اور بندگی کے صحیح تصور ہی سے وابستہ ہے اجتماعی زندگی ایسا ادارہ ہے جو افراد کی تکمیل ذات وارتقائے شخصیت کے وسائل مہیا کرتا ہے۔ اور شخصیت کی تکمیل عبارت ہے قابو یافتہ ارادہ سے۔ ایسا ارادہ جس میں بے قیدی اور بے آئینی معدوم ہو چکی ہو اور اعلیٰ درجہ کا ضبط پایا جاتا ہو اور بس۔

بہر حال شاہ صاحب نے اپنی اس مختصر تعبیر میں قرآن کی بلیغ معنویت کی طرف اشارہ کیا ہے اور آیت میں دین کے معنے حکم برداری فرما کر بتا دیا کہ خدا کے سوا عابدانہ اعمال میں کسی اور کی پرستش کا شائبہ تک نہ ہو اور رہنمائی و تائید و نصرت کے لیے خدا ہی سے دُعا مانگے مگر شرط یہ ہے کہ دُعا مانگنے والا اور خدا کی پرستش کرنے والا اپنی حکم برداری اور طاعت یعنی بندگی کو خدا کے لیے خالص کرے یہ نہ ہو کہ زندگی کا سارا نظام تو کفر و شرک اور معصیت اور دوسروں کی بندگی پر چل رہا ہو اور پرستش کی حد تک صرف خدا سے رابطہ رکھے یہ عابدانہ زندگی کا تضاد ہے۔

کچھ شارحین قرآن نے آیت کا یہ مطلب بھی بتایا ہے کہ اقیموا وجوھکم انسان کے ظاہری افعال سے متعلق ہے اور وادعوہ مخلصین لہ الدین انسان کے قلب اور باطن سے تعلق رکھتا ہے۔ پہلے فقرے میں لفظ مسجد اکثر شارحین قرآن کے نزدیک بمعنے سجدہ آیا ہے اور معنی یہ ہیں کہ ہر عبادت اور نماز کے وقت اپنا رُخ سیدھا کرو رُخ سیدھا کرنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قبلہ رو ہو کر نماز پڑھو اور یہ بھی کہ اپنے ہر قول و فعل اور ہر عمل میں اپنے کو اپنے رب کے حکم کے تابع رکھو اس سے اِدھر اُدھر نہ ہو اس معنے کے لحاظ سے یہ حکم پوری زندگی سے متعلق ہے اور دوسرے حکم کا منشا یہ ہے کہ عبادت میں اخلاص پیدا کرو۔ اس میں کسی کی شرکت کسی حیثیت سے نہ ہو یہاں تک کہ شرک خفی سے بھی پاک ہو۔ ان دونوں حکموں کی پیوندکاری میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان پر لازم ہے کہ اپنے ظاہر و باطن کو احکام شریعت کے مطابق درست کرے۔ نہ صرف ظاہری اطاعت بغیر اخلاص کافی ہے اور نہ محض اخلاص باطنی بغیر ظاہری اتباع شریعت کے کافی ہو سکتا ہے بلکہ ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ اپنے ظاہر کو بھی شریعت کے مطابق کرے اور باطن کو بھی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خالص رکھے۔ اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو جاتی ہے جو شریعت اور طریقت کو مختلف راہیں سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ طریقت کے مطابق باطن کو درست کر لینا کافی ہے خواہ شریعت کے خلاف کرتے رہیں۔ یہ کھلی گمراہی ہے۔

بہر حال آیت کا مطالبہ یہ ہے کہ خدا کے حقوق میں کسی دوسرے کو شریک نہ کیا جائے۔ عبادت صرف

خدا کا حق ہے اور عبادت کا سزاوار نہیں ہے اس وجہ سے نہ کسی غیر اللہ کے لیے مسجدیں بن سکتی ہیں نہ کسی مسجد میں اللہ کے سوا کسی اور کی طرف رُخ کیا جا سکتا ہے۔ سجدہ خدا کے لیے زیبا ہے اس لیے مسجد اپنی فطرت کے اعتبار سے خدا ہی کے لیے خاص ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اپنے رُخ اللہ ہی کی طرف کرو۔ اس آیت سے امام ابوبکر الجصاص نے یہ بات بھی سمجھی ہے کہ:

> نماز مسجد میں پڑھی جائے اس سے پتہ چلا کہ فرض نماز باجماعت واجب ہے، کیونکہ مسجدیں قیام جماعت کے لیے بنائی گئی ہیں۔

اور صاحب تفسیرات احمدیہ ملا جیون کی یہ نکتہ آفرینی بھی خوب ہے کہ:

> اس آیت سے نماز میں قیام کی فرضیت ثابت ہوتی اور یہ کہ نماز مسجد میں ادا کی جائے لیکن کسی خاص مسجد کی خصوصیت نہیں ہے۔

خدا کی پرستش اور بندگی کیوں؟

۲۹- جیسا کہ اس نے تمہیں پہلی بار بنایا ہے اسی طرح دوسری بار بنو گے یعنی انسان کو اعتدال، استقامت اور اخلاص کی راہوں پر چلنے کی اس لیے ضرورت ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی ملنے والی ہے جس میں موجودہ زندگی کے نتائج سامنے آئیں گے۔ اس کی فکر ابھی سے ہونی چاہیے ولتنظر نفس ما قدمت لغد۔[1]

یہ دراصل مضمون سابق کہ پرستش اور بندگی کے تعلقات بندوں کو اللہ ہی سے قائم کرنے چاہئیں۔ اللہ کے سوا کسی سے یہ تعلقات نہ ہونے چاہئیں۔ منشا یہ ہے کہ خدا ہی کی عبادت اور خدا ہی کی طاعت اس لیے کرو کہ جس خدا نے تم کو پیدا کیا ہے پھر اسی کی بارگاہ میں تمہیں پیش ہونا ہے اور جیسے تم اس دنیا میں بے یار و مددگار تن تنہا آئے تھے اسی طرح بے یار و مددگار تنہا ہی اس کی طرف لوٹو گے۔ تمہارے مزعومہ شرکاء اور شفعاء میں سے کوئی بھی تمہارے ساتھ نہ ہوگا۔ قرآن کی بلاغت کے قربان جائیے کہ کل دو لفظ ہیں اور دو لفظوں میں اس نے آخرت اور توحید دونوں کا تعلق بھی واضح کر دیا۔ اور آخرت کی ایک نہایت واضح دلیل بھی بیان کر دی۔

لوگوں کو روزِ جزاء اور قیامت پر یقین کرنے سے جو وہم مانع تھا وہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد پھر کوئی جیتا نہیں تو قیامت کے دن کیوں کر جلائے جائیں گے۔ یہ حقیقت میں استبعادی شبہ ہے یعنی چونکہ مر کر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دوبارہ جینا اب تک انسان کے تجربہ میں نہیں آیا اس لیے اس کو دوبارہ زندگی کا خیال مستبعد معلوم ہوتا ہے ورنہ اس کے آن ہونی اور محال ہونے پر کوئی عقلی دلیل نہیں ہے۔ قرآن نے اس گتھی کو اس طرح سلجھایا کر کفار کے استبعاد کے وہم کو اس طرح دور کر دیا کہ،

۱۔ مر کر جینے کے بعد تاریخی مثالیں پیش کیں جیساکہ حضرت ابراہیم، حضرت عزیر اور اصحاب کہف کے قصوں میں مذکور ہیں اور ان سے استدلال کیا کہ چند آدمی یا پرند مر کر جی سکتے ہیں تو پوری دُنیا بھی مر کر جی سکتی ہے۔

۲۔ دوبارہ زندگی پر استبعاد اس لیے ہے کہ خدا کے دائرہ قدرت کی پوری وسعت سمجھ میں نہیں آئی، جس نے آسمان بنائے زمین بنائی، آسمان سے پانی برسایا۔ مردہ زمین سے کھیتیاں سبزہ اور درخت اُگائے اور پانی کے ایک قطرہ سے انسان بنایا کیا ان کے فنا کے بعد دوبارہ ان کی ایجاد پر قادر نہیں ہے۔

۳۔ زندگی کا یہ تمام کارخانہ پہلے نیست و معدوم تھا۔ خدا نے اس کو ہست و موجود کیا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کو معدوم کر دیا تو جس نے پہلے بغیر کسی مثال سابق اس کارخانہ کو پیدا کیا وہ کیا دوبارہ اس کو پیدا نہیں کر سکتا۔ جس نے نقش اول بنایا کیا نقش ثانی کھینچنے پر اس کو قدرت نہیں۔

ہدایت وضلالت کی کشمکش

۳۰۔ دو گروہ ہیں ایک گروہ کو اس نے راہ حق دکھائی اور ایک گروہ پر گمراہی اور بے راہ روی ثابت ہو گئی۔ کیونکہ انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیاطین کو اپنا رفیق بنالیا اور سمجھتے ہیں کہ راہ راست پر ہیں۔ یعنی جن پر گمراہی مقرر ہو چکی یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا دوست اور رفیق بنالیا ہے اور تماشا یہ ہے کہ اس صریح گمراہی کے باوجود سمجھتے یہ ہیں کہ ہم خوب ٹھیک چل رہے ہیں اور مذہبی حیثیت سے جو روش اور طرز عمل ہم نے اختیار کر لیا ہے وہ بھی درست ہے جیساکہ دوسری جگہ فرمایا ہے۔

الذین ضل سعیھم فی الحیاۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا"

وہ لوگ جن کی ساری کوششیں دُنیا کی زندگی میں کھوئی گئیں اور وہ اس خیال میں مگن رہے کہ خوب کارنامہ کر رہے ہیں۔

آیت کے عموم سے ظاہر ہوا کہ کافر معاند کی طرح کافر مخطی بھی جو واقعی اپنی غلط فہمی سے باطل کو حق سمجھ رہا ہو فریقاً حق علیھم الضلالۃ میں داخل ہے۔ خواہ یہ غلط فہمی پوری طرح غور وفکر نہ کرنے کی وجہ سے ہو یا اس لیے کہ اگرچہ اس نے بظاہر پوری قوت غور و فکر میں صرف کر دی لیکن ایسے

صریح اور واضح حقائق تک نہ پہنچنا خود بتلاتا ہے کہ فی الواقع اس سے قوت فکر و استدلال کے استعمال میں کوتاہی ہوئی ہے۔ گویا جن چیزوں پر ایمان لانا مدار نجات ہے وہ اس قدر واضح اور روشن ہیں کہ ان کے انکار کی بجز عناد یا قصور فکر و تامل کے اور کوئی صورت نہیں۔ بہرحال کفر شرعی ایک ایسا سنکھیا زہر ہے جو جان بوجھ کر یا غلط فہمی سے کسی طرح بھی کھایا جائے انسان کو ہلاک کرنے کے لیے کافی ہے۔ اہل السنہ والجماعۃ کا مذہب یہی ہے۔ اور روح المعانی میں جو بعض کا اختلاف اس مسئلہ میں نقل کیا ہے اس بعض سے مراد جاحظ وغیرہ ہیں جو اہل السنہ میں داخل نہیں بلکہ باوجود معتزلی کہلاتے جانے کے خود معتزلہ کو بھی ان کے اسلام میں کلام ہے۔ اسی لیے صاحب روح المعانی نے ان کا مذہب نقل کرنے کے بعد لکھ دیا ہے و للہ الحجۃ البالغۃ والتزام ان کل کافر معاند بعد البعثۃ و ظھور امر الحق کفار علی علم۔[1]

دراصل یہ فقرہ ترکیب میں حال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ روز قیامت تم اللہ کی بارگاہ میں پیش ہوگے تو تمہارا حال یہ ہوگا کہ تم دو حصوں میں منقسم ہوگے۔ ایک فریق تو وہ ہوگا جس کو انبیاء کی رہنمائی میں دُنیا میں زندگی گزارنے کا موقعہ ملا ہوگا۔ اور دوسرا فریق وہ ہوگا جو انبیاء کی رہنمائی چھوڑ کر دُنیا میں راہِ حق سے ہٹ گیا ہوگا۔ یہ فریق راہِ حق سے کیوں ہٹا؟ اسی اُٹھتے ہوئے سوال کا جواب دیا کہ انھم اتخذوا الشیاطین انھوں نے دُنیا میں رہنمائی کے لیے انبیاء کو چھوڑ کر شیاطین کی رہنمائی قبول کی تھی اور یہ اپنی جگہ خیال کر رہے تھے کہ ہم راہِ راست پر ہیں۔ شیاطین کو اولیاء بنانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ان کی طاعت کرتے تھے۔

ایسے لوگوں کی تعداد دُنیا میں بہت تھوڑی رہی ہے جو حق کو حق سمجھ کر محض عناد اور کبر کی وجہ سے حق سے روگرداں رہے ہوں۔ بیشتر لوگ وہ ہی ہیں جو عقائد و افکار اور اعمال میں گمراہی کا شکار ہوئے ہیں اور یہ گمراہی شیاطین کی امامت اور قیادت کی وجہ سے یا پھر غلط نظریات اور لغو آراء کی وجہ سے ہوئی ہے پہلا طبقہ اگر معاند ہے تو دوسرا طبقہ خطاکار ہے۔ کفر میں خطاکاری کو اگر قابلِ قبول عذر قرار دیا جاتے تو ہر دور میں دُنیا میں بیشتر کفر پیشہ لوگ معذور ہوں گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قانون سے بے خبری اور ناواقفیت کوئی عذر نہیں ہے۔ ایک شخص اگر غلط راستہ کو صحیح سمجھ کر پورے اخلاص کے ساتھ اختیار کرتا ہے تو وہ اللہ کے نزدیک معذور نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو دانش و بینش سے اس لیے سرفراز فرمایا ہے کہ وہ اس سے کام لے کر کھرے کھوٹے اچھے اور بُرے میں امتیاز کرے اور پھر اس پر بس نہیں کی بلکہ انبیاء روانہ کیے ہیں جن کے ذریعے حق و باطل

[1] افادات شیخ الاسلام

اور صحیح و غلط کو خوب کھول کر واضح کر دیا ہے۔

یہاں آیت میں حق قبول کرنے والوں کے لیے فریقاً ھدی اور ہدایت قبول نہ کرنے والوں کے لیے فریقاً حق علیھم الضلالۃ کی تعبیر اختیار فرمائی ہے لیکن پہلے جملہ کی علت نہیں بتائی اور دوسرے کی انھم اتخذوا سے علت بتائی ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ حق کی پذیرائی اصل ہے اور ضلالت اضافی ہے۔ حالانکہ ہدایت ہو یا ضلالت دونوں کا وجود علمِ الٰہی کے تحت ہوتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دُنیا میں ہدایت ہو یا ضلالت دونوں اسباب کے تحت ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس گروہ پر گمراہی مسلط ہو گئی ہے۔ اس نے شیاطین کو اپنا دوست بنا رکھا ہے اور یہ شیاطین ان کو اپنی گمراہیوں میں پھنساتے ہوتے ہیں اور اپنی شامتِ اعمال سے گمان یہ کیے ہوئے ہیں کہ وہ راہِ ہدایت پر ہیں۔ شیاطین کو دوست بنانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ان کی زندگی کے معاملات میں اطاعت کرتے ہیں۔ خدا کو چھوڑ کر دوسروں کی یہی اطاعت تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا

تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ

الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ

اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ

لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾

ہر نماز میں حاضری کے وقت اے اولادِ آدم آرائش کو اختیار کرو۔[31] اور کھاؤ پیو البتہ اسراف نہ کرو، اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔[32] ان سے دریافت کرو کس نے حرام کیا ہے اللہ کی اس زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہے اور کھانے کی صاف ستھری چیزوں کو،[33] کہدو کہ وہ دُنیا کی زندگی میں اہلِ ایمان کے لیے ہیں قیامت کے دن صرف ان ہی کے لیے ہوں گی۔[34] اسی طرح ہم آیات کو ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتے ہیں جو اہلِ علم ہیں۔[35]

معانی مفردات

زینۃ، زیبائش، آرائش، سنگھار، گہنا، اسم ہے - امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں "زینت حقیقی وہ ہے جو انسان کو کسی حال میں بھی معیوب نہ ہو نہ دنیا میں نہ آخرت میں - لیکن جو چیز ایک حالت میں تو انسان کو رونق دے اور دوسری حالت میں نہ دے وہ ایک حیثیت سے معیوب ہے -" مختصر الفاظ میں زینت کی تین قسمیں ہیں - زینتِ نفسی، جیسے علم اور صحیح عقائد، زینت بدنی، جیسے قوی اور بلند و بالا ہونا، زینت خارجی، جیسے مال و جاہ آیت کریمہ حبّب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم زینت نفسی سے متعلق ہے اور زیرِ تشریح کا زینتِ بدنی سے تعلق ہے - مسجد، ظرف مکان اور ظرف زمان دونوں ہو سکتا ہے - معنے جیسے سجدہ کی جگہ کے ہیں، سجدہ کے وقت کے بھی ہیں یہاں مراد دوسرے معنے لیے گئے ہیں - اور کچھ بزرگوں نے اسے مصدر میمی قرار دے کر اس سے مراد نماز لی ہے - لا تسرفوا، اسراف سے فعل نہی ہے - حدِ اعتدال سے تجاوز کرنے کو اسراف کہتے ہیں - الجصاص رقمطراز ہیں، اعتدال سے تجاوز کی دو صورتیں ہیں - ایک صورت یہ ہے کہ حلال سے حرام کی طرف بڑھنا، اور دوسری صورت یہ ہے کہ خرچ میں حد سے تجاوز کر جانا - لا تسرفوا کا تعلق آیت میں تینوں سے ہے زینت میں کھانے اور پینے میں حد سے تجاوز نہ کرو -

---

اسلام میں رہبانیت نہیں ہے

رہبانیت کا رد اور اس اصل عظیم کا اعلان کر دنیوی زندگی کی آسائشیں اور زینتیں اسلام کے خلاف نہیں ہیں بلکہ ان کو کام میں لانا عین منشائے اسلام کی تعمیل ہے - اسلام سے پہلے عام پیروان مذاہب کی عالمگیر گمراہی یہ تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ روحانی سعادت جب ہی مل سکتی ہے کہ دنیا ترک کر دی جائے اور خدا پرستی کا مقتضا یہ ہے کہ زینتوں اور آرائشوں سے کنارہ ہو جائیں - فلاطینوس صاف لفظوں میں کہتا ہے "جب روح وجدان کی منزل میں پہنچتی ہے تو وہ عالم معقولات کا تصور کرتی ہے لیکن جب اسے خدا کا شعور حاصل ہوتا ہے تو وہ ہر چیز ترک کر دیتی ہے" (بحوالہ تاریخ تصوف قبل از اسلام) اور یہ کہ حقیقی سعادت و فلاح تو صرف ان بندشوں سے مکمل آزادی سے حاصل ہو سکتی ہے - ان میں تبدیلی سے نہیں - آپ زنجیر دل

کو نرم اور ملائم کر دیں لیکن زنجیروں کی ماہیت نہیں بدل سکتی۔

عرفانی حکماء تو اس اندازِ فکر کے منطقی نتائج کی انتہا تک پہنچے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ انسان کی روحانیت کی بہترین دلیل یہ ہے کہ وہ اس مادی دُنیا سے مکمل بیزاری اور نفرت کا اظہار کرے۔

فلاطینوس کے شاگرد فرافوریس کا بیان ہے کہ اسے اپنے جسم سے ہمیشہ نفرت رہی۔ عیسائیوں کے ایک فرقہ کا جو ویلیسن کہلاتا تھا یہ عقیدہ تھا کہ نجات کے لیے آختہ ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح ایک اور فرقہ جو اسکوپسی کہلاتا تھا اور جو غالباً ۱۷۵۷ء میں رُوس میں قائم ہوا تھا اپنے اراکین کے خصیے نکلوا دیتا تھا۔ یہ لوگ اپنے کو خدا کی جماعت کہتے تھے۔ تھرسٹن کا بیان ہے کہ ہندوستان میں برہمن روحانی زندگی کے لیے اپنے خصیے نکلوا دیا کرتے تھے۔ ہندوؤں کے یہاں سنیاس یعنی مکمل ترکِ دُنیا اور مکمل ترکِ خواہش کا سچی خدا پرستی کی شرط لازم قرار پانا تو ایک معروف حقیقت ہے۔ چنانچہ ان کی سب سے مشہور کتاب گیتا کہتی ہے کہ :

> دانش مند تو صرف وہی ہوگا جو پندار اور نادانی سے پاک ہو کر، دل پر فتح پا کر اپنی ذات میں ہمیشہ محو ہو کر خواہشوں سے کنارہ کر کے اور رنج و راحت دونوں سے بے تعلق ہو کر اس لازوال مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں سورج چاند اور آگ کی روشنی کا دخل نہیں اور جہاں پہنچ کر بازگشت نہیں ہوتی۔ (باب ۱۵، منتر ۵، ۶)

تاریخ ادیان میں اس طرزِ فکر اور طرزِ عمل کی اتنی کثیر مثالیں موجود ہیں کہ کوئی صاحبِ نظر اس سے ناواقف نہیں ہو سکتا۔ اس لیے مزید حوالے بالکل غیر ضروری ہوں گے۔ یہ رہبانیت، یہ سنیاس، جو لوگ یہ برہمچاریہ اسی ترکِ زینت، ترکِ دُنیا کی عملی شکلیں ہیں۔ کوئی کامل، کوئی ناقص، کوئی کلی، کوئی جزئی کوئی خالص، کوئی مخلوط۔

یہاں قرآن نے بتایا ہے کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے تم سمجھتے ہو کہ زندگی کی زینتیں اس لیے ہیں کہ ترک کر دی جائیں۔ حالانکہ وہ اس لیے ہیں کہ کام میں لائی جائیں۔ دُنیا اور دُنیا کی تمام نعمتوں کو ٹھیک طور پر کام میں لانا مشیتِ الٰہی کو پورا کرنا ہے۔ یہ آیت قرآن کا ایک انقلاب انگیز اعلان ہے جس نے انسان کی دینی ذہنیت کی بنیادیں الٹ دیں۔ وہ دُنیا جو نجات و سعادت کی طلب میں دُنیا ترک کر رہی تھی۔ اب اسی نجات و سعادت کی دُنیا تعمیر و ترقی میں ڈھونڈنے لگی۔

۳۱ ۔ ہر نماز میں حاضری کے وقت اے اولادِ آدم آرائش کو اختیار کرو۔ پہلی آیت میں مساجد کے باطنی احترام کا حکم تھا اس آیت میں مسجد کے ظاہری احترام کا حکم فرمایا۔ باطن میں جس عقیدے نے جڑ پکڑ لی ظاہر میں اس کے برگ و بار پیدا ہونے ضروری ہیں۔ جس کی عزت ہم دل میں کریں گے یقینی طور پر عمل سے اس کو

ظاہر کرنے کی بھی کوشش کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ درجہ کمال میں ایمان و اسلام یکجا ہوتے ہیں۔ ایک طرف تصدیق بالجنان کا حکم ہے تو دوسری طرف عمل بالجوارح کا بھی مطالبہ موجود ہے تو جب قرآن نے مساجد کے باطنی احترام کا حکم فرمایا لہٰذا ساتھ ہی ظاہری اہتمام کو بھی نہ چھوڑا۔ مطلب یہ ہے کہ جب عرض و نیاز کے لیے مناجات سرگوشی کے لیے دربارِ الٰہی میں آؤ تو صاف ستھرا لباس زیب تن کر لیا کرو جو پاک و صاف اور شرعی حدود کے مطابق ہو۔ تم احکم الحاکمین کے سامنے اس کے دربار میں حاضری دے رہے ہو تو ظاہری آداب کا بھی پورا پورا لحاظ رکھو تاکہ ظاہری طور پر بھی کسی کو بے ادبی کا شبہ نہ ہو۔

یہ درست ہے کہ وہ پہلے دل کی گہرائی کو دیکھتا ہے مگر دل کی صفائی کا اثر جسم پر ہونا بھی ضروری ہے۔ اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ دل کی ویرانی کے ساتھ جو زیب و زینت ہوتی ہے وہ کسی درجہ میں مطلوب نہیں لیکن موجودہ دور میں دین کی رسمی محبت کی وجہ سے لباس میں جو بے پروائی ہو گئی ہے وہ بھی کسی درجہ میں پسندیدہ نہیں ہے اس آیت سے مسجد کے لیے حُسنِ ہیئت کا حکم بھی معلوم ہوتا ہے جو مسجد کی بزرگی و احترام کا ایک دلنشیں طریقہ ہے۔ حافظ ابن کثیر رقمطراز ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے وقت ہیئت اچھی سے اچھی ہونی چاہیے۔ صاحبِ تفسیرات احمدی لکھتے ہیں:

> سنت ہے کہ نماز کے لیے اچھی سے اچھی ہیئت اختیار کرے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں ستر عورت واجب ہے۔

اس آیت میں لباس کو زینت اور زینت کو لباس قرار دینے میں بظاہر اس طرف اشارہ ہے کہ جس لباس سے بجائے سنورنے کے آدمی کی ہیئت اور بگڑ جائے اسے لباس ہی نہ قرار دینا چاہیے۔

نماز اور لباس و طہارت

یہ آیت بتا رہی ہے کہ نماز اگرچہ ایمان کا ذائقہ روح کی غذا اور دل کی تسکین کا سامان ہے مگر اس کے ساتھ وہ مسلمانوں کی اجتماعی، اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی اصلاحات کا بھی ایک کارگر آلہ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اخلاق و تمدن و معاشرت کی جتنی اصلاحیں وجود میں آئیں، ان کا بڑا حصہ نماز کی بدولت حاصل ہوا۔ اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے ایک ایسی بدوی قوم کو جس کو پہننے اور اوڑھنے کا بھی سلیقہ نہ تھا چند سال میں ادب و تہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا۔ اور آج بھی اسلام جب افریقہ کے وحشی سے وحشی ملک میں پہنچ جاتا ہے تو وہ کسی بیرونی تعلیم کے بغیر صرف نماز کے اثر سے مہذب و متمدن ہو جاتا ہے۔ متمدن قوموں میں جب نماز پہنچتی ہے تو ان کے تخیل کو بلند سے بلند تر پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنا

دیتی ہے۔ نماز کے ان معاشرتی فائدوں میں بالکل ابتدائی چیز لباس اور زیب وزینت کا خیال ہے۔ انسان کا شرم وحیا کی نگہداشت کے لیے اپنے جسم کے بعض حصوں کو چھپانا نہایت ضروری ہے۔ عرب کے بدو اس تہذیب سے ناواقف تھے بلکہ شہروں کے باشندے بھی اس سے بے پروا تھے۔ یہاں تک غیر قریشی عورتیں جب حج کے لیے آتی تھیں تو اپنے کپڑے اتار دیتی تھیں۔ اور اکثر ننگی ہو کر طواف کرتی تھیں۔ اسلام آیا تو اس نے ستر پوشی کو ضروری قرار دیا یہاں تک کہ بغیر اس ستر پوشی کے اس کے نزدیک نماز ہی درست نہیں۔ اس تعلیم نے جاہل بدو اور وحشی عربوں کو ستر عورت پر مجبور کر دیا اور نماز کی تاکید نے دن میں پانچ بار ان کو اس فرض سے آشنا کر کے ہمیشہ کے لیے ستر پوش بنا دیا۔ افریقہ اور ہندوستان میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے لباس پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اسلام نے تمدن کے اس ابتدائی سبق میں دنیا کی کتنی بڑی مدد کی ہے۔

نماز اور طواف کی درستگی کے لیے ستر عورت کو سب ہی فقہا ضروری قرار دیتے ہیں لیکن ستر عورت کے ساتھ لباس میں تزئین و تجمل کو واجب تو نہیں مگر سنت سب ہی بتاتے ہیں۔ اور تعبیر آیت میں عند کل مسجد کی تعبیر بتا رہی ہے کہ یہ صرف مسجد حرام سے متعلق حکم نہیں بلکہ تمام مساجد کا یہی حکم ہے یہ اس جوگ اور رہبانیت کی کلی نفی ہے جو عریانی کو تقرب الٰہی اور وصول الی اللہ کا ذریعہ سمجھتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض بزرگوں نے زینت و جمال کی حد تک اس آیت سے یہ بات سمجھی ہے کہ نماز میں بہترین لباس زیب تن کیا جاتے۔ حضرت الحسن علیہ السلام کے متعلق صاحب روح نے نقل کیا ہے کہ نماز کے لیے جاتے تو بہترین پوشاک زیب تن فرماتے کوئی دریافت کرتا تو فرماتے کہ اللہ سبحانہٗ جمیل ہیں جمال کو پسند کرتے ہیں اس لیے میں اپنے مولیٰ و مالک کے دربار میں بن ٹھن کر پیش ہوتا ہوں۔ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے۔ خذوا زینتکم عند کل مسجد) اور اسلام کا یہ جمالیاتی نقطہ صرف نماز ہی تک نہیں نماز سے آگے زندگی کے سارے گوشوں میں پھیلا ہوا ہے بلکہ زندگی کے دائرے سے بڑھ کر موت تک کو اپنی آغوش میں لیے ہوتے ہے۔ ترمذی کی مشہور حدیث ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

جب کوئی تم میں سے اپنے بھائی کو کفن پہنائے تو چاہیے کہ بہترین اور اچھا کفن پہنائے۔

قبر تک میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ مبارک کسی بد ہیئتی اور بھونڈے پن کو برداشت نہیں کرتی تھی۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ اتفاقاً کسی قبر میں کچھ رخنہ رہ گیا تھا پورے طور پر برابر نہ تھی۔ حضرت انس کا بیان ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس رخنے کو دیکھ نہ سکے فرمایا کہ اس رخنہ کو بند کیا جاتے۔ ایک صحابی نے کہا کہ حضرت اس بیچارے مردے کو کیا نفع پہنچے گا۔ حضورؐ نے فرمایا

بے شک اسے نہ نقصان پہنچ سکتا ہے اور نہ نفع لیکن اس سے زندوں کی آنکھ کو ضرور ٹھنڈک پہنچتی ہے یعنی مردے کو نہیں بلکہ زندوں کی آنکھیں اس سے خنکی حاصل کرتی ہیں۔ اللہ اکبر قبر تک میں جو دین آنکھوں کی خنکی تلاش کرتا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دنیا کی دوسری چیزوں کے متعلق حسن کاری اور زینت میں اس کا پاکیزہ مذاق کتنا بلند اور ستھرا ہو گا۔

اسلام کے جمالیاتی نقطہ نظر کو سمجھانے کے لیے آج یہ بتانے کی کس میں جرأت ہے کہ مساجد میں جس الجھی ہوئی داڑھی، پریشان بال، بے تکے لباس کو دین کا پیمانہ بتایا جا رہا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ مبارک میں وہ ہی بے دینی کی علامت شمار ہوتی تھی۔ مجمع الفوائد میں امام مالک کی سند سے یہ حدیث مذکور ہے :

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تھے، اتنے میں ایک شخص آیا جس کے سر اور داڑھی کے بال الجھے ہوئے اور پریشان تھے۔ حضور اقدس نے اس کی طرف کچھ اشارہ فرمایا۔ گویا اسے حکم دے رہے ہیں کہ اپنے بال اور داڑھی کو درست کرے۔ اس شخص نے یہی کیا واپس پلٹ کر آیا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا یہ اچھا نہیں ہے اس بات سے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے سر کے بالوں کو پریشان کیے ہوئے ہو گویا وہ کوئی شیطان ہے۔

یہ کانّہ شیطان کے آخری الفاظ ان کے لیے بہت زیادہ قابل توجہ ہیں جنہیں اپنی الجھی ہوئی داڑھی والی شکل پر ملکوتیت کا مغالطہ ہوا ہے۔ جن مسلمانوں کو اپنی پریشان داڑھی پر ناز ہے ان کو نبوت محمدیہ کے سب سے بڑے مذاق شناس فاروق اعظم کا یہ اثر یاد رکھنا چاہیے جسے بخاری کی شرح میں علامہ (بدر) الدین عینی نے نقل کیا ہے :

حضرت عمر نے ایک شخص کو دیکھا جس نے اپنی داڑھی اتنی چھوڑ رکھی ہے کہ وہ بہت ہی بڑھ گئی، حضرت عمر اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ قینچی لاؤ قینچی منگائی اور ایک آدمی کو حکم دیا تو اس نے داڑھی کا جتنا حصہ ہاتھ کے نیچے تھا اسے چھوڑ کر چھانٹ دیا۔

فاروق اعظم نے اسی پر بس نہیں کی لکھتے ہیں کہ اس کام کو ختم کرنے کے بعد فرمایا :

تم میں سے کچھ لوگ اپنے آپ کو اس طرح چھوڑ دیتے ہو کہ گویا وہ درندوں میں سے ایک درندہ ہے۔

درندوں میں سے ایک درندہ بن جانا ایک بڑا معیار ہے ان لوگوں کے لیے جن کی سمجھ میں اب تک یہ نہیں آیا کہ انسانیت کی تکمیل اور اس میں حسن و جمال پیدا کرنے والا اسلام ان سے کیا چاہتا ہے؟

بقائے صحت کا راز

۲۱۱۔ اور کھاؤ، پیو البتہ اسراف نہ کرو اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔ یہ آیات ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئیں جو کعبہ کا طواف برہنہ ہو کر کرتے تھے اور اسے بڑی قربت اور پرہیزگاری سمجھتے تھے اور بعض اہل جاہلیت ایام حج میں سدرمق سے زیادہ کھانا اور گھی یا چکنائی وغیرہ کا استعمال چھوڑ دیتے تھے۔ بعضوں نے بکری کا گوشت اور دودھ سے پرہیز کر رکھا تھا۔ ان سب کو بتلا دیا کہ یہ کوئی نیکی اور تقویٰ کی باتیں نہیں ہیں۔ خدا کی دی ہوئی پوشاک جس سے تمہارے بدن کا ستر اور آرائش ہے اس کی عبادت کے وقت دوسرے اوقات سے بڑھ کر قابل استعمال ہے تاکہ بندہ اپنے پروردگار کے دربار میں اس کی نعمتوں کا اثر لے کر حاضر ہو۔ خدا نے جو کچھ پہننے اور کھانے پینے کو دیا ہے اس سے تمتع کرو۔ بس شرط یہ ہے کہ اسراف نہ ہونے پائے۔ اسراف کے معنے ہیں حد سے تجاوز کرنا جس کی کئی صورتیں ہیں مثلاً حلال کو حرام کرنے یا حلال سے گزر کر حرام سے بھی متمتع ہونے لگے یا اناپ شناپ بے تمیزی اور حرص سے کھانے پر گر پڑے یا بغیر اشتہا کھانے لگے یا بے وقت کھائے یا اس قدر کھائے جو صحت جسمانی اور قوت عمل کے باقی رکھنے کے لیے کافی نہ ہو یا مضر صحت چیزیں کھائے وغیر ذالک، لفظ اسراف ان سب امور کو شامل ہو سکتا ہے۔ بیجا خرچ بھی اس کی ایک فرد ہے۔ اسی تعمیم کے لحاظ سے بعض سلف نے فرمایا ہے جمع اللہ الطب کلہ فی نصف آیتہ خدا نے ساری طب کو آدھی آیت میں جمع کر دیا ہے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ جس طرح لباس تقویٰ اور دینداری کے خلاف نہیں ہے اسی طرح کھانا پینا اور اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا بھی دینداری کے خلاف نہیں ہے۔ دینداری اور تقویٰ کے خلاف جو چیز ہے وہ اسراف ہے۔ کیونکہ اسراف روح شریعت کے خلاف ہے جیسے قسط تمام اسلامی زندگی کی جان ہے اللہ مقسطین یعنی عدل و اعتدال پر قائم رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ایسے ہی اسراف یعنی بے اعتدالی ساری اسلامی زندگی کے خلاف افراط و تفریط ہے اور یہ دونوں خدا کو ناپسندیدہ ہیں اور نہ وہ یہ پسند

[1] افادات شیخ الاسلام

کرتا ہے کہ آدمی کھانے پینے پہننے کو مقصود بناتے اور شب و روز اسی کی سرگرمیوں میں لگا رہے اور نہ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ ان چیزوں پر راہبوں اور جوگیوں کی طرح لات مارے۔ افراط اور تفریط دونوں ہی شیطان کی نکالی ہوئی راہیں ہیں۔ خدا زندگی کے ہر پہلو میں عدل و اعتدال کو پسند کرتا ہے۔

پوری آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ نماز اور ادائے عبادت کے اوقات میں بن ٹھن کر، سج دھج کر اللہ کے حضور میں آؤ۔ اچھی اور ستھری چیزیں کھاؤ اور مفید مشروبات پیو مگر اسراف نہ کرو بلکہ دامانِ اعتدال تھامے رکھو۔ اللہ مسرفین کو پسند نہیں کرتا ہے بلکہ اسراف پر مفاسد اور مضرات کی نشو و نما کے اعتبار سے سزا دے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لاتسرفوا کے ذریعے جس بات سے روکا گیا ہے اس کا تعلق صرف کھانے پینے ہی سے نہیں بلکہ اختیارِ زینت سے بھی ہے یعنی ان تینوں میں اسراف نہ کرو۔ ان تینوں میں اسراف سے شخصی، خانگی اور قومی مفاسد کو نشو و نما پانے کا موقعہ ملتا ہے۔

یہ سوال کہ ان تینوں میں نقطہ اعتدال کیا ہے اور حدِ اسراف کیا ہے اس کا جواب سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ معلوم کر لیا جاتے کہ اسلام نے قانوناً جن افعال و اعمال سے روکا ہے ان راہوں پر صرف دولت کا نام قرآن کی اصطلاح میں تبذیر ہے۔ قرآنی آیت "ولا تبذر تبذیرا" میں اس بنیادی امتناعی قانون کا ذکر ہے۔ اگرچہ عام طور پر تبذیر اور اسراف کو شارحینِ قرآن ہم معنے خیال کر کے دونوں کا ترجمہ فضول خرچی کر دیتے ہیں لیکن جیسا کہ معلوم ہوگا کہ صرف دولت کی یہ دو مستقل دفعات ہیں۔ فضول خرچی کے تو معنی یہ ہیں کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے مثلاً اگر کسی کا پیٹ جو کی روٹی سے بھر سکتا ہے گیہوں کی روٹی اس کے لیے کھانا یہی معنی فضول خرچی ہوتی۔ پھر کیا قرآن کے نزدیک یہ جرم ہے بتایا جا چکا ہے کہ جب اسلام زیب و زینت اور آرائش تک کی ممانعت نہیں کرتا تو بھلا بجائے جو کے گیہوں کی روٹی جو کھاتا ہے اس کو وہ کیسے مبذر قرار دے سکتا ہے خصوصاً جب ہم اسی آیت کے تحت دیکھتے ہیں کہ قرآن بتا رہا ہے:

ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین۔

شیطان کا بھائی ہونا اور اس کی صفت کفوریت میں مبذرین کو شریک کرنا کیا یہ سزا قرآن اس شخص کی تجویز کر رہا ہے جو بجائے جو کے باوجود قدرت کے گیہوں کی روٹی کھا رہا ہے۔

اصل یہ ہے کہ تبذیر کا مادہ بذر ہے۔ بذر کے معنے تخم کے ہیں۔ تبذیر تخم چھڑکنے کو کہتے ہیں پھر جیسے اپنے کھیت میں دانے ڈالتا ہے اور بغیر اس خیال کے چھڑکتا جاتا ہے کہ دانے کہاں گریں گے کہاں نہ گریں گے۔ یہی حال اس شخص کا ہے جو اپنی دولت خرچ کرتا چلا جاتا ہے لیکن اس صرف میں اس کو اس کی پروا نہیں ہوتی کہ جائز خواہشوں پر خرچ کر رہا ہے یا ان خواہشوں پر خرچ کر رہا ہے

جن کی تکمیل قانوناً جرم ہے۔ یہاں تک تو مبذر کسان کے مشابہ ہے لیکن آگے کسان کے دانے تو ایک سے ستو پیدا کرتے ہیں۔ اس معاملہ میں مبذر اس سے جدا ہو جاتا ہے بلکہ ٹھیک جو حال شیطان کا ہوتا ہے وہی حالت اس کی ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب شیطان اس قوت کا نام ہے جو بجائے خیر کے شر اور برائی پر صرف ہوتی ہے یہی حال مبذر کا ہے کہ خدا کی دی ہوئی مالی طاقت کو وہ بھی برائی اور شر کے حصول میں خرچ کرتا ہے۔ اسی لیے اس کا بھائی ہے اور جس طرح شیطان اپنی قوت کے غلط استعمال سے خدا کا ناشکرا ہوتا ہے یہی حال اس کی ناشکری کا ہے۔ خلاصہ یہ کہ تبذیر کے صحیح معنی جو خود قرآن سے معلوم ہوتے ہیں وہ یہی ہیں کہ مال جو انسان کو جائز خواہشوں کی تکمیل کے لیے دیا گیا ہے اسے ناجائز خواہشوں اور غیر قانونی اعمال و افعال پر خرچ کیا جائے۔ مثلاً قمار بازی، حرام کاری، شراب خوری وغیرہ قانونی جرائم پر جو دولت کو صرف کرتا ہے وہ مبذر ہے لہٰذا تبذیر کے حقیقی معنے یہی ہیں۔ باقی رہا اسراف وہ اس سے بالکل جداگانہ ہے جب تبذیر کی حقیقت واضح ہو گئی تو اب اس کا پتہ چلانا کہ مصارف کا کون سا سلسلہ تبذیر کے تحت داخل ہے اس کے لیے اسلامی جرائم کی فہرست اپنے سامنے رکھنی چاہیے اور سمجھ لینا چاہیے کہ ان جرائم میں سے ہر چیز پر دولت کا صرف کرنا تبذیر ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے تبذیر کی یہی تفسیر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ولو دانقا اگرچہ ایک پیسہ ہو۔

ظاہر ہے کہ جرائم پر ایک پیسہ بھی خرچ کرنا ایسا ہے جیسے کوئی ایک روپیہ خرچ کرے اور اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ تبذیر کے معنی فضول خرچی کے نہیں ہیں ورنہ لازم آئے گا کہ ضرورت سے زیادہ ایک حبہ بھی خرچ کرنا شیطان کا بھائی بنتا ہے۔ الغرض باطل افکار کی اشاعت یا فحش باتوں کی اشاعت حرام ہے۔ ان کے لیے مال صرف کرنا تبذیر ہے۔ یہی حال دوسرے حرام کاموں کا ہے۔

تبذیر کے بعد صرفِ دولت کے متعلق اسلام میں دو امتناعی قانون اور بھی ہیں جن میں ایک کا نام اسراف ہے جس کا ذکر یہاں اس آیت میں ہو رہا ہے دوسرے کی تعبیر ریاء الناس ہے جس کا ذکر دسویں پارے میں آ رہا ہے۔

اسراف قرآن حکیم کی ایک جامع اصطلاح ہے اس کا اطلاق ہر ایسے طرز عمل پر ہوتا ہے جو صحیح انسانی اور اسلامی طرز عمل سے ہٹا ہوا ہو لیکن صرف مال اور استعمال ملکیت کے سلسلے میں اس کے معنے کچھ محدود ہیں جس غرض کی تکمیل مال و املاک کی ایک مخصوص مقدار صرف کر کے کی جا سکتی ہے اس پر دانستہ اور بلا مزید فائدے کے زائد مقدار میں صرف کرنا اسراف ہے۔

مال کے خرچ کرنے سے آدمی کی غرض ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے، سہولت اور آرام و سکون کی

خاطر بھی مال خرچ کیا جاتا ہے اور مال و املاک کے بعض استعمال زینت اور آرائش کے لیے بھی کیے جاتے ہیں جن سے انسان کے ذوق جمال کی تسکین ہوتی ہے۔ یہ تینوں قسم کی غرضیں اسلام کی نظر میں بجا اور مناسب ہیں۔ بشرطیکہ اعتدال اور اخلاقی حدود کو ملحوظ رکھا جائے اور جو فائدہ مطلوب ہے اس کے لیے اتنا ہی مال صرف کیا جائے جو کافی ہو۔

دراصل اسراف نام ہے ضروریات کی تکمیل کے لیے مقدار یا وضعی معیار کے اعتبار سے زائد از ضروریات مال صرف کرنے کا۔ یہاں ضرورت کو ایک وسیع مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے نہ کہ ناگزیر حاجات کے معنی میں احتیاجات کا تعلق ناگزیر ضروریات، سہولت اور آرام کا ذریعہ بننے والی اشیاء اور زیب و زینت کے سامانوں سب سے ہو سکتا ہے۔ سہولت اور آرام یا زیب و زینت کے لیے مال صرف کرنا اسراف نہیں بشرطیکہ اعتدال ملحوظ رکھا جائے بلکہ یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس نے فقط ضرورت کی حد تک مصارف کو محدود کرنے کا حکم نہیں دیا ہے جیسا کہ عموماً دنیا کے تمام مذاہب کے رجحانات ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو ضرورت میں بھی کمی کی جائے بلکہ ضرورت تو بہرحال ضرورت ہے اسلام زینت و آرائش کی حدود تک جانے والوں کو بھی مذہبی دائرے میں بلند سے بلند مقام عطا کرنے کے لیے تیار ہے۔ سلیمانی تخت پر ہی مذہبی مدارج کا سب سے بلند ترین درجہ یعنی نبوت تک ملی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ برحق حضرت عثمان رض الغنی کے لقب کو اپنے لیے باعث فخر قرار دے سکتے ہیں اور یہ اسلام کی وہ خصوصیت ہے جس پر بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

اسراف کا اطلاق ہر ایسے طرز عمل پر ہوتا ہے جو صحیح انسانی اور اسلامی طرز عمل سے ہٹا ہوا ہو۔ لیکن صرف مال اور استعمال ملکیت کے سلسلہ میں اس کے معنے کچھ محدود ہیں جس غرض کی تکمیل مال و املاک کی ایک مخصوص مقدار صرف کر کے کی جا سکتی ہے اس پر دانستہ اور بلا مزید فائدے کے زائد مقدار میں صرف کرنا اسراف ہے۔ صرف مال سے آدمی کی غرض ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے۔ سہولت اور آرام و سکون کی خاطر ہی مال صرف کیا جاتا ہے اور مال و املاک کے بعض استعمال زینت اور آرائش کے لیے بھی کیے جاتے ہیں جن سے انسان کے ذوق جمال کی تسکین ہوتی ہے۔ یہ تینوں قسم کی اغراض اسلام کی نظر میں بجا اور مناسب ہیں بشرطیکہ اعتدال اور اخلاقی حدود کو ملحوظ رکھا جائے اور جو فائدہ مطلوب ہے اس کے لیے اتنا ہی مال صرف کیا جائے جو کافی ہو۔

ضرورت سے زیادہ مقدار مال صرف کرنے کے مختلف محرکات ہو سکتے ہیں۔ نام و نمود اور اظہار ثروت وغیرہ غیر شرعی محرکات کے تحت ضرورت سے زیادہ مال صرف کرنا اسراف ہے لیکن حد ضرورت سے زیادہ مال

صرف کرنے کی دوسری صورتیں بھی ممکن ہیں مثلاً ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مالک کے پاس مال و املاک کی بہتات ہو اور یہ افراط اسے قدر اعتدال کو ملحوظ رکھنے سے غافل کر دے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وسائل کے محدود ہونے کے باوجود مالک ان کے استعمال میں دور بینی، عاقبت اندیشی اور ذمہ داری کا رویہ نہ اختیار کرے، اور لاپرواہی برتے۔

جو بات مقدار کے بارے میں کہی گئی وہی اگر اشیائے استعمال کے وصفی معیار کے بارے میں بھی سامنے رکھی جائے تو اسراف کا ایک دوسرا پہلو واضح ہوتا ہے۔ ایک حاجت کی تشفی اگر ایک مخصوص وصفی معیار کے حامل سامان سے اتنی ہی ہو سکتی ہے جتنی کہ اس سے برتر وصفی معیار سے تو اس حاجت کی تشفی کے لیے مطلوبہ سامان کے برتر وصفی معیار کی طلب ایک مسرفانہ طلب قرار دی جا سکتی ہے الا یہ کہ بہتر چیز کو زینت اور حسن و جمال کی خاطر پسند کیا گیا ہو۔

اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسراف نام ہے ضروریات کی تکمیل کے لیے مقدار یا وصفی معیار کے اعتبار سے زائد از ضرورت مال صرف کرنے کا۔ یہاں ضرورت کو ایک وسیع معنے میں استعمال کیا گیا ہے کہ ناگزیر حاجت کے معنے ہیں۔ احتیاجات کا تعلق ناگزیر ضروریات سہولت و آرائش کا ذریعہ بننے والی اشیاء۔ زیب و زینت کے سامانوں سب سے ہو سکتا ہے۔ سہولت اور آرام یا زیب و زینت کے لیے مال صرف کرنا اسراف نہیں ہے بشرطیکہ دامان اعتدال ہاتھ سے نہ جانے دے۔

شاید اسی لیے آیت میں لاتسرفوا کا مفعول حذف کر دیا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ زینت اور کھانے پینے میں اعتدال ملحوظ رکھو۔

احادیث میں اسراف کی ممانعت کے ساتھ اس کے تصور کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ صحیح بخاری کتاب اللباس میں ہے کہ :

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کھاؤ پیو پہنو اور صدقہ کرو مگر اس میں اسراف اور گھمنڈ نہ ہو۔ عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ اسراف اور گھمنڈ سے بچتے ہوئے جو جی چاہے کھاؤ پیو پہنو۔

قرآن کی آیت اور اس ارشاد نبوت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسراف کی ممانعت کا مقصد انسان کو صرف مال میں ایک معتدل اور متوازن روش پر قائم رکھنا ہے یہ اسی وقت ممکن ہے جب اشیاء صرف سامان استعمال کو مقدار اور وصف دونوں کے اعتبار سے ضرورت کے مطابق رکھا جائے۔ غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے یا دولت کے نشہ میں چور ہو کر یا غیر اسلامی محرکات کے تحت بلا لحاظ ضرورت و افادیت زیادہ

مقداروں یا برتر اوصاف کی قابل اشیاء کے صرف سے پرہیز ضروری ہے۔ اسراف کی ممانعت کا یہی مقصد ہے

خدا کی نعمتوں پر خدا کی جانب سے کوئی پابندی نہیں

۳۲۔ ان سے دریافت کرو کہ کس نے حرام کیا ہے اللہ کی اس زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہے اور کھانے کی صاف ستھری چیزوں کو یعنی اللہ کی جائز کی ہوئی نعمتوں کو حرام کر دینے کا حق کس مخلوق کو حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی کو نہیں اور جو لوگ اس میں مبتلا ہیں وہ گناہ ہی میں پڑے ہوتے ہیں۔ من حرّم ؟ میں استفہام انکاری ہے اور انکار میں زور تاکید ہے۔

آیت میں زینۃ اللہ ' اللہ کی زینت کہا گیا ہے۔ اللہ کی زینت سے کیا مراد ہے۔ لباس فاخرہ آیت میں سب کے نزدیک مراد ہے۔ جیسا کہ امام قرطبی نے لکھا ہے لیکن اکثر نے اسے وسعت دے کر جملہ سامان آرائش اس میں داخل کر دیے ہیں۔ زمخشری اور قاضی بیضاوی کا میلان اسی طرف ہے۔ امام رازی نے مزید دقت نظر سے کام لے کر اس کے اندر سواری زیور وغیرہ سارے مرغوبات بجز ان کے جو کسی نص سے حرام ہو چکے ہیں تمام انواع زینت کو آیت کا مصداق قرار دیا ہے۔ الطیبات من الرزق یعنی کھانے پینے اور استعمال کی جائز پاکیزہ اور لذیذ اشیاء علامہ قرطبی نے الطیبات کی تفسیر پر لذیذ کھانے سے کی ہے امام رازی نے اس کے مفہوم میں کھانے پینے کی تمام لذیذ اور پسندیدہ چیزوں کو داخل کیا ہے۔

آیت سے ضمناً یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں کچھ چیزیں حلال ہیں اور کچھ ناجائز اور حرام ہیں۔ فقہا نے آیت سے عید اور دعوت کے موقعہ پر خوش لباسی کے استحباب پر بھی استدلال کیا ہے اور محققین نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف لذت کی بنا پر کسی چیز سے کبھی لذیذ غذا سے احتراز نہیں کیا ہے۔ بہرحال آیت بتا رہی ہے کہ مطعومات، مشروبات، ملابس اور زیب و زینت کی ساری قسموں میں اصل اباحت ہے اور یہ آیت اس اصل عظیم کا بھی اعلان کر رہی ہے کہ دنیوی زندگی کی آسائشیں اور زینتیں تورع اور خدا پرستی کے خلاف نہیں ہیں بلکہ ان کو کام میں لانا عین منشاء خداوندی کی تعمیل ہے۔ قریش اور اہل کتاب کی یہ گمراہی تھی کہ سمجھتے تھے کہ روحانی سعادت جب ہی مل سکتی ہے کہ دنیا ترک کر دی جائے اور خدا پرستی کا تقاضا یہ ہے کہ زینتوں اور آسائشوں سے کنارہ کش ہو جائیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے تم سمجھتے ہو کہ زندگی کی زینتیں اس لیے ہیں کہ ان کو ترک کر دیا جائے حالانکہ وہ اس لیے ہیں کہ کام میں لائی جائیں۔ دنیا اور دنیا کی تمام نعمتوں کو ٹھیک طور پر کام میں لانا مشیت الٰہی کو پورا کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق اس طرح کی ہے کہ

اس میں اپنی آیات وسنن کو نمایاں کرنے کی بھرپور استعداد رکھی ہے۔ انسان میں فطری طور پر علم کی طرف میلان ہے اور صرف علم ہی نہیں بلکہ انسان کی طبیعت میں مجہولات کی بحث و تحقیق کا داعیہ ہے اور اس کے ہر انسان زینت کی چاہت اور طیبات کی رغبت زندگی میں نیرنگیوں اور بوقلمونیوں کا سامان ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو انسان کی شخصی اور نوعی زندگی دوسرے جانداروں کی طرح کمالات سے محروم ہو کر رہ جاتی۔ اور علوم وفنون میں سے کسی چیز کا بھی ظہور نہ ہوتا، زینت کی چاہت میں درحقیقت زندگی کی ساری ترقیوں کا راز ہے۔ اور اسی راہ سے انسانی استعداد کو کائنات میں اللہ کی سنن کو معلوم کرنے کا موقعہ ملا ہے اس لیے زینت مذموم نہیں بلکہ اس میں اسراف مذموم ہے۔ یہاں حافظ ابن جریر نے یہ بات بہت خوب لکھی ہے کہ قرآن کی اس آیت کی روشنی میں وہ لوگ بلاشبہ خطاکار ہیں جو روئی اور کتان کے ملبوسات کو چھوڑ کر بال اور اون کے کپڑے پہنتے ہیں اور گیہوں کی روٹی گوشت کو چھوڑ کر سبزیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عمدہ چیزوں کے چھوڑنے میں کوئی پرہیزگاری نہیں۔ لوگ زندگی کی جن زینتوں کو خدا پرستی کے خلاف سمجھتے ہیں قرآن ان کو ہی زینۃ اللہ سے تعبیر کرتا ہے۔

یہ آیت قرآن کا ایک انقلاب انگیز اعلان ہے جس نے انسان کی دینی ذہنیت کی بنیادیں الٹ دیں۔ وہ دنیا جو نجات وسعادت کی طلب میں ترک دنیا کر رہی تھی۔ اب اسی نجات وسعادت کو دنیا کی تعمیر و ترقی میں ڈھونڈنے لگی۔ حد ہے کہ جن مشاغل اور پیشوں کو عام طور پر دنیوی کاروبار میں شمار کیا جاتا ہے اسلام نے ان سب پر اخروی اجر و ثواب مرتب کر کے ان کو وہی مقام عطا کر دیا ہے جو عام دینی فرائض وعبادات کا سمجھا جاتا ہے کہاں یہ نقطہ نظر کہ جو جس حد تک دنیوی کاروبار سے الگ ہو کر زندگی بسر کرنے لگا۔ اسی حد تک خدا کے حضور میں بلندی حاصل کرے گا اور کہاں یہ عقیدہ کہ دنیا کے مشغلوں میں انہماک اور ان کے ساتھ اشتغال ہی کو خدا کی خوشنودی اور نزدیکی کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ مذہب کے ان غیر فطری غلط رجحانات کے استیصال میں اسلام نے کہاں تک کام کیا ہے ضرورت ہے کہ اس پر ایک مستقل کتاب لکھی جائے۔ بہرحال آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تو دنیا کی ساری زینتیں اور پاکیزہ چیزیں بندوں ہی کے لیے پیدا کی ہیں۔ اس لیے اللہ کا منشا تو بہرحال یہ نہیں ہو سکتا کہ انہیں بندوں کے لیے حرام کر دے۔ اب اگر کوئی مذہب یا کوئی روحانی نظام ایسا ہے جو انہیں حرام یا قابل نفرت یا ارتقائے روحانی میں سدّراہ قرار دیتا ہے تو اس کا یہ فعل خود ہی اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہے۔ یہ بھی ان حجتوں میں سے ایک اہم حجت ہے جو قرآن نے مذاہب باطلہ کے رد میں پیش کی ہے۔

دُنیوی نعمتوں کے حقدار اہلِ ایمان ہیں

۳۴- کہہ دو کہ وہ دُنیا کی زندگی میں اہلِ ایمان کے لیے ہیں۔ قیامت کے دن صرف ان ہی کے لیے ہوں گی ، عالم کی تمام چیزیں اس لیے پیدا کی گئی ہیں۔ کہ آدمی ان سے مناسب طریقہ پر منتفع ہو کر خالق جل و علاء کی عبادت، وفاداری اور شکرگزاری میں مشغول ہو۔ اس اعتبار سے دُنیا کی ساری نعمتیں اصل میں مومنین و مطیعین ہی کے پیدا ہوئی ہیں۔ البتہ کافروں کو بھی ان چیزوں سے روکا نہیں گیا۔ وہ بھی اپنے اعمال و تدابیر سے دُنیوی مفاد حاصل کر سکتے ہیں، بلکہ جب اہلِ ایمان قوت ایمان و تقویٰ میں کمزور ہوں تو یہ غاصبین اپنی عملی تگ و دو میں بظاہر زیادہ کامیاب معلوم ہوتے ہیں جسے کچھ تو کفار کے اعمال فانیہ کا ثمرہ سمجھنا چاہیے۔ اور کچھ مومنین کے حق میں تنبیہ و توبیخ ،

(من کان یرید الحیاۃ الدنیا و زینتھا نوف الیھم اعمالھم وھم فیھا لا یبخسون اولئک الذین لیس لھم فی الاخرۃ الا النار وحبط ما صنعوا فیھا وباطل ما کانوا یعملون۔

اور جو کوئی دُنیا ہی کی زندگی اور اس کی رونق کو مدنظر رکھتا ہے تو ہم ان لوگوں کو ان کے اعمال کی جزاء اسی دُنیا میں پوری طرح دے دیتے ہیں اور ان کے لیے اس میں قطعاً کمی نہیں کرتے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں ہے اور ان کی ساری کارگزاریاں آخرت میں بے کار اور سارے اعمال اکارت ہو کر رہ جائیں گے۔

(سورہ ہود، رکوع ۲)

رہی آخرت کی نعمتیں وہ خالص اہلِ ایمان کا حصہ ہیں۔ بعض علماء نے خالصۃ یوم القیامۃ کے معنی یہ لیے ہیں کہ دُنیوی نعمتیں خالص نہیں کیونکہ ان کے ساتھ بہت سے غم و فکر اور کلفتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ آخرت کی نعمتیں ہر قسم کی کدورات سے خالی ہوں گی اور ابن عباس سے درمنثور میں آیت کے یہ معنے نقل کیے ہیں کہ دُنیوی نعمتیں اس شان سے کہ آخرت میں وبال نہ بنیں صرف مومنین کے لیے ہیں کفار کے حق میں یہاں کا تنعم ان کے کفر اور حق ناشناسی کی وجہ سے عذاب و وبال بن جائے گا[1] خلاصہ یہ ہے کہ واقعہ اور حقیقت کے اعتبار سے تو خدا کی پیدا کردہ ساری نعمتیں اس دُنیا

[1] افادات شیخ الاسلام

میں بھی اہلِ ایمان ہی کے لیے ہیں لیکن دُنیا کا موجودہ نظام چونکہ ابتلا اور امہال کے قانون پر قائم ہے اس لیے یہاں اکثر خدا کی نعمتیں بے ایمانوں اور کافروں کو بھی ملتی رہتی ہیں بلکہ بسا اوقات اہلِ ایمان سے زیادہ اہلِ کفر کو نعمتوں سے نوازا جاتا ہے۔ البتہ آخرت میں زندگی کی آرائشیں سب کی سب صرف اہلِ ایمان کے لیے مخصوص ہوں گی۔ اور اہلِ کفران میں سے کچھ نہ پا سکیں گے۔ جنہوں نے اپنے رزق پر پلنے کے بعد اپنے رب ہی کے خلاف سرکشی کی۔ مطلب یہ ہے کہ دُنیا کی ساری نعمتیں دُنیا میں اہلِ ایمان کا حصّہ ہیں اور تبعاً اہلِ کفر بھی شریک ہیں اور آخرت میں تو خاص الخاص اہلِ ایمان ہی کے لیے ہوں گی۔ قرطبی فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس، ضحاک، الحسن، قتادہ، ابن جریج اور ابن زید سے یہی تفسیر منقول ہے۔ علامہ زمخشری فرماتے ہیں کہ پوری بات اس طرح تھی ھی للذین آمنوا ولغیرھم فی الحیاۃ الدنیا خالصۃ یوم القیامۃ دُنیوی نعمتیں دُنیا میں اہلِ ایمان اور اہلِ کفر سب کے لیے ہیں لیکن قیامت کے روز صرف اہلِ ایمان کا حق ہیں۔ لغیرھم کی تصریح نہ کرنے میں نکتہ بلاغت یہ ہے کہ اصالۃً تو ان نعمتوں کے حقدار اہلِ ایمان ہی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے تبعاً اہلِ کفر کو بھی اس میں شامل کر دیا ہے۔ باقی آخرت میں سو فی صد اہلِ ایمان ہی کا حصّہ ہوگا۔ کافروں کا ان میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ آیت کا مطالبہ یہ ہے کہ اس دُنیا میں اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا اہلِ ایمان ہی کا کام ہے اور یہ بات دینداری کے ہرگز منافی نہیں ہے۔ جو لوگ اللہ کی نعمتوں کو مایا کا جال سمجھتے ہیں اور ان سے دستبرداری کو تقربِ الٰہی کی شرط ٹھہراتے ہیں اُن کا خیال صحیح نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ، اللہ کے شکر گزار رہو۔ اعتدال اور میانہ روی اختیار کرو۔ امام ابوبکر الجصاص نے قرآن کی آیت انشاکم من الارض واستعمرکم فیھا کے تعبیری پیمانہ سے اگر یہ بات سمجھی ہے کہ

یہ آیت بتاتی ہے کہ زمین کا آباد کرنا، کھیتی باغبانی اور عمارات کے ذریعے سے واجب ہے۔

تو یہ کوئی مبالغہ نہیں بلکہ ھی للذین آمنوا کا ناگزیر تقاضا ہے۔ ان کے خیال میں بات صرف جائز اور سنت کی نہیں بلکہ واجب اور فرض کی ہے۔ اگر جملہ فعلیہ سے ابوبکر الجصاص دُنیا کی آبادکاری کو واجب اور فرض بتا رہے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ جملہ اسمیہ ھی للذین آمنوا سے مسلمانوں کے لیے دُنیا کی نعمتوں سے استفادہ واجب اور فرض نہ ہو۔ شاید قرآن کے اسی طرز خطاب سے متاثر ہو کر مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ ابوالمکارم علاء الدولہ سمنانی نے یہ فیصلہ فرمایا ہے۔ مولانا جامی نے اپنی کتاب نفحات الانس میں ان کا یہ فیصلہ نقل کیا ہے:

اللہ تعالیٰ نے زمین اور کھیتوں کو حکمت سے پیدا فرمایا ہے اور خدا چاہتا ہے کہ یہ آباد رہیں اور ان سے مخلوق کو نفع پہنچے۔ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتے کہ دُنیا کی آبادکاری

جس سے فائدہ اور آمدنی مقصود ہو۔ فضول خرچی کے طور پر یہ آبادکاری نہ ہو۔ اس میں کتنا ثواب ہے اگر لوگوں کو اس کا صحیح علم ہو تو ہرگز آبادکاری کا کام نہ چھوڑیں۔
آگے اس کی مزید توضیح فرماتے ہیں:

جو کوئی زمین کا ایسا قطعہ رکھتا ہے کہ اس سے ہزار من غلہ سالانہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر اس کی کوتاہی اور کاہلی و سستی سے بجائے ہزار من کے نو سو من غلہ اس زمین سے حاصل ہوا اور اس کی وجہ سے سو من غلہ مخلوق کے حلق میں نہ پہنچ سکا تو قیامت کے دن اس سے اس سو من کی باز پرس ہو گی۔

آخر میں فرماتے ہیں:

اپنی کاہلی سے جو زمین کی آبادکاری چھوڑ بیٹھے اور اس کا نام ترک دنیا اور زہد رکھے تو یہ شیطان کی پیروی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ظاہر ہے جو بھی للذین آمنوا فی الحیاۃ الدنیا کے حکم سے اعراض کر کے دوسری مخالف راہ اختیار کرے گا تو یہ شیطان کا پیروکار نہیں تو اور کیا ہے۔

اُمتِ محمدیہ اہلِ علم ہیں

۳۵۔ اسی طرح ہم آیات کو ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتے ہیں جو اہلِ علم ہیں۔ یعنی زینت اور طیبات من الرزق کے بارے میں یہ بات کھول کر ہم نے ان لوگوں کے لیے بیان کی ہے جو اس دُنیا کی زندگی میں اجتماعی قوانین سے واقف ہیں اور جن کو انسان کے طبعی تقاضوں اور مصلحتوں اور صالح تمدن کا علم ہے نزولِ قرآن سے پہلے انسانی زندگی اس موضوع پر مادیت اور رہبانیت کے دوراہے پر کھڑی تھی۔ قرآن نے انسانی سعادت کے اُصول بتائے۔ شارحینِ قرآن نے یہاں قلم کی کوتاہی کا مظاہرہ کیا ہے لیکن دوسرے عُلماء نے دادِ تحقیق دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمان تمام علوم بشریہ میں کافروں سے زیادہ علم رکھتے ہیں اور مسلمان فرقوں میں اہل السنۃ تمام اہلِ بدعت سے زیادہ علم والے ہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے اور حقیقت نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب کہ سارے عرب کو جاہلیت اور بداوت سے نکال کر اس نورِ علمی سے منور ہی قرآن و نبوت نے کیا ہے جس کے ذریعے وہ خود ٹھیک ہوئے اور پوری دُنیا کو صالح بنا دیا۔ دینی زندگی، علمی زندگی، فنی زندگی اور اخلاقی زندگی میں تمام علوم کے احیاء کا صدرِ اول کے مسلمان باعث بنے۔
دین دراصل نام اس خدائی رہنمائی کا ہے جو اہلِ عقل و فہم کو ان کے ارادہ و اختیار کے ساتھ دُنیا کی زندگی

میں وہ وسائل فراہم کرتی ہے جس کے ذریعے اولاً دنیا میں اور آخراً آخرت میں انسانی زندگی کامیابی سے ہمدوش ہو یا یوں کہہ دیجئے کہ جس کے ذریعے سعادتِ دارین حاصل ہو۔ واضح بات ہے کہ جس دین کی بنیاد ہی فطرتِ انسانی پر ہو، جس کا کہنا یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جس مخلوق کو بھی پیدا کیا ہے اسے ٹھیک ان ہی صلاحیتوں، قوتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے جو اس کے مقصد آفرینش کے لیے مطلوب اور ضروری تھیں۔ جو انسان کی خالص مادی خواہشوں کی تکمیل کو بھی ثواب کا کام اور دینداری قرار دیتا ہو۔ جس نے انسان کی پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بارے میں ایک جامع و ہمہ گیر نظام دے رکھا ہو، جس نے اپنے تمدنی اور سیاسی نوعیت کے احکام کو صراحتہً اللہ کی قائم کی ہوئی حدود اور دین فرمایا ہو اور ان کی خلاف ورزی پر عذاب کی دھمکی دے رکھی ہو، وہ دین اس بات کو کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ اس کے پیروکار دنیا سے بے خبر، فقیر اور ضعیف بن کر رہیں اور اس طرح گویا اپنی زبانِ حال سے اس خیال کے فیصلے کا اعلان کریں کہ ان کے اندر جو گوناں گوں قسم کی فطری قوتیں اور مختلف قسم کے جذبات و احساسات پائے جاتے ہیں، معاذ اللہ اللہ سبحانہ نے فضول پیدا کیے ہیں۔ قرآن کے نزدیک یہ طرزِ فکر عالمانہ نہیں ہے انسان کے اپنے ذہن کی ایجاد ہے۔

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٣﴾

اے پیغمبر کہہ دو کہ میرے رب نے صرف یہ چیزیں حرام کی ہیں، بے حیائی کی باتیں جو کھلے طور پر ہوں یا چھپا کر کی جائیں گناہ کی باتیں ناحق کی زیادتی، یہ کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی سند نہیں اتاری ہے اور یہ کہ خدا کے نام سے ایسی بات کہو جس کے لیے تمہارے پاس کوئی علم نہیں ہے۔

معانی مفردات

حَرَّمَ، اس نے حرام کیا، اس نے منع کیا، تحریم سے جس کے معنے حرام کر دینے اور سختی سے روک دینے کے ہیں۔ صیغہ واحد مذکر ماضی معروف، اسی سے حرام ہے حرمت والا اور ممنوع جمع حرم، امام راغب لکھتے ہیں کہ جس چیز سے منع کیا جائے وہ حرام ہے خواہ بہ تسخیر الٰہی ممنوع ہو یا بہ منع قہری یا عقل کی رو سے یا شرع و قانون کی راہ سے یا اس شخص کی وجہ سے جس کا حکم مانا جاتا ہے۔ تسخیر الٰہی سے حرام ہونے کی مثال

وحرمنا علیہ المراضع (اور ہم نے دائیوں کا دودھ اس پر حرام کر دیا) ہے کہ اللہ نے اپنی تسخیر سے دائیوں کا دودھ پینے سے روک دیا۔ اور منع قہری سے حرمت کی مثال جیسے ان اللہ حرمھا علی الکافرین یعنی بزورِ قوت کافروں کو اس سے محروم کر دیا۔ باقی وجوہِ حرمت کی مثالیں ظاہر ہیں۔ الفواحش جمع فاحشہ کی بے حیائی کے کام، کھلے گناہ، قاموس میں ہے حد سے بڑھی ہوئی بدی۔ مرزا ابوالفضل کہتے ہیں، ایسی بے حیائی جس کا اثر دوسروں پر پڑے۔ منتہی الارب میں ہے ہر وہ چیز جس کی اللہ نے ممانعت کر دی ہو بری بات یا برا کام، یہ لفظ فحش سے نکلا ہے جس کے اصلی معنے حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں اور اس کے دوسرے لازمی معنے قبیح یعنی برائی کے ہیں۔ الاثم، گناہ اس کی جمع آثام آتی ہے اور آثام اثم کی جزا کے معنے میں آتا ہے جیسے ومن یفعل ذالک یلق اثاما اور جو شخص یہ کرے گا وہ سزا پاوے گا۔ اثم کے اصلی معنے کوتاہی کے ہیں۔ آثمہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تیز چل سکتی مگر جان کر سست چلے اسی سے اس لفظ میں گناہ کا مفہوم آیا ہے۔ البغی، یہ لفظ کسی پر زیادتی یا دست درازی کے معنے میں آیا ہے اور لغت میں حد سے تجاوز اور ایسی چیز کی تلاش جو اس کا حق نہ ہو۔ اسی سے زخم کے خراب ہونے کو بغی الجرح بولتے ہیں۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ بغی زیادہ تر حقوق العباد میں دست درازی پر بولا جاتا ہے اگر لفظ عدوان کے ساتھ ہو تو بغی کے معنے بالذات حرام کے ذریعے ظلم کاری کے آتے ہیں جیسے چوری، جھوٹ وغیرہ سوسائٹی کے حقوق میں بغی و عدوان کی وہی حیثیت ہے جو حقوق اللہ میں اثم و عدوان کی ہے۔ اللہ سبحانہ کا حق ہو یا بندوں کا یعنی ان دونوں میں حق سے تجاوز اور حق میں کوتاہی پر بولا جاتا ہے۔

خدا کی حرام کردہ اصل چیزیں

اس سے پہلی آیات میں بتایا تھا کہ انسانوں نے ازراہِ تقدس لباس طیبات من الرزق اور زینت کو حرام قرار دے رکھا ہے۔ اب یہاں بتایا جاتا ہے کہ یہ چیزیں حرام نہیں ہیں۔ خدا کی حرام کردہ تو صرف یہ ہیں کردار میں فواحش یعنی برائی اور بے حیائی کے سارے کام خواہ خلوت میں ہوں یا جلوت میں۔ دوسرے گناہ کے کام اور تیسرے ناحق زیادتی، یہ تینوں اخلاقی رذائل ہیں اور ان کا تعلق انسان کے کردار سے ہے۔ دوسرے جس چیز کو حرام کیا ہے اس کا تعلق کردار سے اور افکار سے ہے یعنی شرک باللہ تیسرے جس چیز کو حرام کیا ہے اس کا تعلق گفتار سے ہے یعنی قول علی اللہ بغیر علم، یہی اصول محرمات ہیں۔

یہ گویا ایک اٹھتے ہوتے سوال کا جواب ہے۔ حالات نے خود یہ سوال پیدا کر دیا کہ اگر یہ حرام نہیں تو پھر حرام کیا ہے۔ فرمایا اے پیغمبر کہہ دو کہ میرے رب نے صرف یہ چیزیں حرام کی ہیں۔ محرمات کی یہ انواع تمام ادیان اور ساری ملل میں حرام رہی ہیں۔ ان کی حرمت دائمی ہے۔ یہ کبھی حلال نہیں ہوئی ہیں۔ یہ سب انبیاء کی بتائی ہوئی اجماعی برائیاں ہیں۔ ان برائیوں کی اگر تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ درحقیقت بُرائی اور بے حیائی کے کام ہیں اور دین و شرافت کی نگاہ میں گناہ اور ناپسندیدہ ہیں۔ اگر ان کو جائز ٹھہرایا جاتے تو افراد کے باہمی حقوق سے امان اٹھ جائے گی اور کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو سلامت نہ رہے گی فواحش اثم اور بغی میں منطقی لحاظ سے مانعۃ الخلو ہے یعنی کسی بداخلاقی میں ان تینوں کا اجتماع تو ہو سکتا ہے مگر کوئی بداخلاقی ان تینوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں ہو سکتی یعنی ہر بداخلاقی میں تینوں کا یا تینوں میں سے ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔

قرآن میں محرمات دو قسم کے ہیں۔ محرم بالذات اور محرم بالعرض۔ محرم بالذات وہ ہیں جن کا ارتکاب کسی حال میں بھی دُرست نہیں ہے۔ یہ چاروں اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ آیت گرامی میں ان کی ترتیب میں خاص نکتہ بلاغت یہ ہے کہ ان میں جرم کے اعتبار سے جو زیادہ سنگین ہے وہ سب سے آخر میں ہے یعنی ترقی من الادنی الی الاعلیٰ کو ملحوظ رکھا گیا ہے پہلے فواحش کا ذکر کیا گیا پھر فواحش سے زیادہ سنگین جرائم اثم اور بغی بغیر الحق کو بیان کیا گیا ہے۔ پھر اثم اور بغی سے زیادہ سنگین جرم کو پیش کیا، یعنی شرک باللہ اور آخر میں سب سے زیادہ عظیم جرم قول علی اللہ بغیر علم کو بیان کیا ہے۔ یہ محرمات میں سب سے بڑا جرم ہے، یہی شرک کی جڑ ہے اسی سے کفر کو پلنے اور پھولنے کا موقعہ ملتا ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ دُنیا کی ساری ضلالتوں کا شجرہ نسب بالواسطہ اور بلاواسطہ اسی سے ملتا ہے تو یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

۶۳۔ اے پیغمبر کہہ دو کہ میرے رب نے یہ چیزیں حرام کی ہیں، بے حیائی کی باتیں جو کھلے طور پر ہوں یا چھپا کر کی جائیں اور گناہ کی باتیں۔ اثم سے مراد عام گناہ ہیں اور بعض مخصوص گناہوں کی مناسبت مقام یا اہمیت کی وجہ سے بیان فرما دیا اور بعض کے نزدیک اثم وہ گناہ ہے جس کا تعلق گناہ کرنے والے کے سوا دوسرے لوگوں سے نہ ہو[1]

اس آیت میں بطور استیناف یہ بتایا ہے کہ اللہ سبحانہ نے کیا حرام کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کو تم نے حرام قرار دے رکھا ہے وہ حرام نہیں حرام تو صرف یہ چیزیں ہیں۔ اور اللہ نے ان کو وقتی طور

[1] افادات شیخ الاسلام

پر نہیں بلکہ ساری کتابوں میں اور سارے نبیوں کی زبانی حرام کیا ہے۔ ان کی حرمت دائمی ہے۔ کسی حال میں کبھی حلال نہیں ہوتی ہیں۔ ان میں پہلی چیز فواحش ہیں ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔ فواحش فاحشہ کی جمع ہے۔ صفت کا صیغہ ہے موصوف محذوف ہے یعنی ایسے افعال، ایسے اقوال، ایسے اخلاق جن کی برائی کو سلیم الفطرت اور عقل صحیح صاف صاف مانتی ہو۔ اہلِ عرب زنا، لواطت، بخل، بہتان اور یا وہ گوئی کو فاحشہ کہتے ہیں۔ بظاہر الفواحش مختصر سا لفظ ہے مگر درحقیقت اس میں اللہ سبحانہ' نے ان لوگوں کے جاہلانہ عقائد کے خلاف ایک بہت بڑی دلیل پیش کی ہے۔ اس طرزِ استدلال کو سمجھنے کے لیے دو باتیں بطورِ مقدمہ کے پہلے سمجھ لینی چاہئیں۔ ایک یہ کہ اہلِ عرب اگرچہ اپنی بعض مذہبی رسموں میں برہنگی اختیار کرتے تھے اور اسے ایک مقدس مذہبی فعل سمجھتے تھے لیکن برہنگی کا بجائے خود ایک شرمناک فعل ہونا خود ان کے یہاں بھی مسلم تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ لوگ برہنگی کو شرمناک جاننے کے باوجود ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے اپنی عبادت کے موقعہ پر اختیار کرتے تھے اور چونکہ اپنے مذہب کو خدا کی طرف سے سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کا دعویٰ تھا کہ یہ رسم بھی خدا کی طرف سے مقرر ہوتی ہے۔ اس پر قرآن نے بتایا ہے کہ فواحش ظاہر ہوں یا پوشیدہ، اللہ نے حرام کیے ہیں، قرآن میں زنا، عمل قوم لوط، برہنگی، جھوٹی تہمت اور باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنے کو فحش افعال میں شمار کیا گیا ہے۔ حدیث میں چوری اور شراب نوشی اور بھیک مانگنے کو من جملہ فواحش کہا گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے شرمناک افعال بھی فواحش میں داخل ہیں۔ اور ارشادِ الٰہی یہ ہے کہ اس قسم کے افعال علانیہ اور پوشیدہ حرام ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ اہلِ جاہلیت اگرچہ علانیہ زنا کو ناجائز سمجھتے تھے لیکن چوری چھپے جائز سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ کھلم کھلا کرنا تو کمینہ پن ہے لیکن چھپ کر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے آج کی جدید جاہلیت جبری زنا کو ناجائز کہتی ہے لیکن رضامندی سے زنا کیا جائے تو اس پر کوئی قانونی قدغن نہیں ہے۔

عام طریقہ کے علاوہ نکاح کی اور چند قسمیں جاری تھیں جو حقیقت میں فواحش ہی کی قسمیں تھیں۔ مثلاً ایک یہ کہ کوئی بہادر شخص ہوتا تو اپنی عورت کو اس کے پاس بھیج دیتے تھے کہ اس سے ہم بستر ہو، بچہ پیدا ہوتا تھا تو سمجھتے تھے کہ اس میں بھی وہی جوہر آجائیں گے جس کا یہ نطفہ ہے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ چند آدمی جن کی تعداد ایک وقت میں دس ہوتی تھی کسی عورت کے پاس جاتے اور سب اس سے ہم صحبت ہوتے جب وہ حاملہ ہوتی اور بچہ جنتی تو سب کو بلا لیتی اور کسی ایک سے کہتی کہ یہ بچہ تمہارا ہے اس کو قبول کرنا پڑتا اور پھر وہ اس کا بیٹا سمجھا جاتا۔ تیسرا طریقہ یہ تھا کہ فاحشہ عورتیں جو برسرِ بازار جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں ان کے لڑکا پیدا ہوتا تو قیافہ شناس کو بلایا جاتا وہ صورت و شکل دیکھ کر بتاتا کہ فلاں شخص کا نطفہ ہے۔

عورت اس کو بلا کر کہتی کہ یہ تمہارا بچہ ہے۔ صحیح بخاری کتاب النکاح میں یہ تینوں طریقے تفصیل سے مذکور ہیں۔
ایک اور قسم عارضی نکاح کی بھی اور وہ یہ تھی کہ کسی عورت سے مدت مقررہ کے لیے نکاح کر لیتے تھے اس مدت کے گزر جانے کے بعد اس کی اجرت دے کر اس کو الگ کر دیتے اس کو متعہ کہتے تھے۔ اسلام نے شروع میں اس کو ضرورت سے چندے باقی رکھا پھر ہمیشہ کے لیے اس کو حرام کر دیا۔
یہ تو پہلے سن چکے ہو کہ حج میں مادرزاد ننگے ہو کر طواف کرتے۔ صحیح مسلم باب التفسیر میں حضرت عبداللہ ابن عباس سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نہاتے وقت اوٹ نہ کرتے تھے کھلے میدان میں بے ستر ہو کر نہاتے تھے۔ ابوداؤد میں ہے کہ پاخانہ پیشاب کے وقت پردہ نہیں کرتے تھے۔ جلسوں میں بیٹھتے تو بیویوں سے ہم صحبتی کے تمام واقعات بیان کرتے۔ سوتیلی ماؤں پر وراثۃً قبضہ کر کے ان کو بیوی بنا لیتے۔ یہاں قرآن نے ان سب کو فواحش قرار دے کر حرام کیا ہے۔
دوسری چیز جو اس آیت میں محرمات میں شمار کی گئی ہے وہ اثم ہے۔ لغت میں اثم ہر ایسے کردار کو کہتے ہیں جو برا بھی ہو اور نقصان دہ بھی ہو۔ اس لیے لفظ اثم کی وسعتوں میں سارے گناہ آجاتے ہیں خواہ کبائر ہوں یا صغائر۔ کبائر جیسے فواحش اور شراب اور صغائر جیسے اپنی بیوی کے علاوہ کسی عورت کو شہوت سے دیکھنا یا چھونا، اسی کو قرآن میں لمم کہا ہے۔ سورہ نجم میں اسی کا ذکر ہے۔

الذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش الا اللمم

جو لوگ بچتے ہیں بڑے گناہوں سے اور بدکاریوں سے مگر کچھ آلودگی۔

اس آیت میں فواحش کا عطف کبائر اثم پر ہے اثم پر نہیں ہے۔ یہ عطف خاص بر عام ہے۔
قرآن نے فواحش کی طرح اثم کے بارے میں یہ بات بتائی ہے کہ اثم کھلم کھلا ہو یا پوشیدہ دونوں کو چھوڑ دینا چاہیے۔ ارشاد ہے:

وذروا ظاهر الاثم وباطنه

گناہ ظاہر ہو یا پوشیدہ دونوں کو چھوڑ دو۔

ہر گناہ کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک اس کا باطنی پہلو دوسرا اس کا ظاہری پہلو۔ اس بات کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک تو اس کی حقیقت ہوتی ہے جس کا مقام انسان کا نفس اور اس کا دل ہوتا ہے۔ دوسرے اس کے وہ مظاہر و قوالب ہوتے ہیں جن میں انسانی زندگی کے اندر وہ نمایاں ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دونوں سے بچ کر رہو، شرک کے عقیدہ و تصور سے بھی بچو اور اس کے مظاہر اشکال سے بھی دور رہو۔

یہاں بعض شارحین نے اثم سے مراد شراب بتائی ہے۔ عبداللہ بن عباس اور الحسن البصری سے بھی یہی منقول ہے اور کچھ اہلِ لغت کا یہی میلان ہے لیکن ابن الانباری کو اس پر اصرار ہے کہ اہلِ عرب نے کبھی زمانہ جاہلیت میں اور زمانہ اسلام میں لفظ اثم بول کر شراب مراد نہیں لی۔ اور ابو حیان اندلسی نے یہ کہہ کر اس تفسیر و تشریح کی صحت ہی سے انکار کر دیا ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور شراب غزوۂ اُحد کے بعد مدینہ میں حرام ہوئی ہے۔

تیسری چیز آیت میں جو حرام کی گئی ہے وہ بغی ہے اس کے معنے کسی پر زیادتی یا دست درازی کرنا ہیں۔ قرآن میں ہے :

خصمان بغی بعضنا علی بعض دو جھگڑے والے ہیں ہم میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔

اصل لغت میں بغی کے معنے حد سے تجاوز کر جانے کے ہیں۔ زخم زیادہ خراب ہو جائے تو بغی الجرح بولتے ہیں۔ قرآن میں زمین میں بغاوت کرنا جن آیات میں آیا ہے اس سے مراد بھی حد سے تجاوز ہے۔ اور جب لفظ کا صلہ علی آتے تو اس کے معنے لوگوں کی جان، مال اور آبرو پر دست درازی کرنے کے ہیں۔ آیت میں جس بغی کو حرام کیا گیا ہے وہ گناہ ہے جس میں حق کی حدود سے تجاوز کیا جائے یا لوگوں کے حقوق پر دست درازی کی جائے۔ یہاں بغی چونکہ لغوی معنے میں آیا ہے اس لیے اس میں بغیر الحق کی قید لگائی ہے۔
حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ اثم وہ ہے جس کی جنس حرام ہو اور عدوان وہ ہے جس کی مقدار حرام ہو۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ بغی میں غالب استعمال یہ ہے کہ لوگوں کے حقوق میں دست درازی ہو اور اگر بغی عدوان کے ساتھ آئے تو مطلب یہ ہے کہ محرم الجنس کے ذریعے لوگوں پر ظلم ہو رہا ہے۔ مثلاً چوری کر کے، جھوٹ بول کر، بہتان لگا کر یہ سب چیزیں بالذات حرام ہیں۔ بغی و عدوان کی حیثیت حقوق العباد میں بالکل وہی ہے جو اثم و عدوان کی حیثیت حدود اللہ میں ہے۔

آیت میں چوتھی چیز جسے حرام قرار دیا ہے یہ ہے ان تشرکوا باللہ مالم ینزل بہ سلطانا، سلطان کے معنے بُرہان اور دلیل کے ہیں۔ جہاں تک خدا کو ماننے کا تعلق ہے وہ تو عقل و فطرت کا ایک بدیہی تقاضا ہے اور مشرک بھی خدا کو مانتا ہے۔ رہی یہ بات کہ عبادت میں خدا کا کوئی شریک بھی ہے تو اس کا مشرک مدعی ہے اور مدعی کے ذمہ دلیل ہے لیکن مشرک کا دامن دلیل سے خالی ہے یہاں بتایا ہے کہ اللہ نے اس بات پر کہ عبادت میں اس کا کوئی بھی شریک ہے کوئی دلیل نہیں اتاری ہے۔ یعنی اس کائنات میں مشرک کے دعویٰ شرک پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ ایک موقعہ پر اسی بات کو اس انداز میں پیش کیا ہے۔

من یدع مع اللہ الٰہا اخر لا برھان لہ بہٖ

جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی معبود کو پکارتا ہے تو اس کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

ایک دوسرے موقعہ پر اللہ تعالیٰ کی صفت رزاقیت، خالقیت اور حاکمیت پیش فرمانے کے بعد مشرکوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر تم ان کا انتساب کسی اور کی طرف بھی کرتے ہو تو اپنے اس دعویٰ شرک پر کوئی دلیل بھی تو پیش کرو۔

قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین

سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔

قرآن کا موقف یہ ہے کہ مشرک مدعی ہے اور دلیل پیش کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔ بارِ ثبوت مدعی کے ذمہ ہوتا ہے لیکن اس کے ترکش میں دلیل کا کوئی تیر نہیں ہے۔ قرآن نے توحید کے موضوع پر بھی فطری دلیل پیش کی تھی۔ لیکن افسوس ہمارے متکلمین کا ایک گروہ بلا وجہ خود مدعی بن بیٹھا اور محض اس غلط طریقہ کار کی وجہ سے ان کو تمانع وغیرہ اجتماعی دلائل پیش کرنے پڑے۔ اور تکلف یہ ہے کہ توڑ مروڑ کر قرآنی آیتوں کو بھی ان خودساختہ دلائل پر منطبق کرنا پڑا۔ جس دلیل کا نام متکلمین نے "برہان تمانع" رکھا ہے اور قرآن کی جس آیت سے وہ اسے نکالنا چاہتے ہیں ہم انشاء اللہ پارہ سترہ میں اس پر تفصیلی بحث کریں گے۔

آخری چیز جو آیت میں حرام بتائی گئی ہے وہ قول علی اللہ بغیر علم ہے۔ یہ محرمات میں سب سے زیادہ سنگین ہے۔ حافظ ابن القیم نے لکھا ہے کہ اس آیت میں ترقی من الادنیٰ الی الاعلیٰ ہے۔ یعنی جو چیز سب سے آخر میں ہے وہ حرمت میں سب سے بڑھ کر ہے۔ دین میں تمام تحریفات اور ساری بدعات کی اصل و اساس یہی قول علی اللہ بغیر علم ہے۔ فکری بدعات ہوں یا عملی بدعات سب کا سرچشمہ یہی قول علی اللہ بغیر علم ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کے بعد جس طرح بدعت کی تردید فرمائی ہے شاید ہی کسی اور چیز کی تردید فرمائی ہو۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ بدعت سے دین کا اصلی حلیہ اور صحیح نقشہ بدل جاتا ہے اور اصل و نقل، حق و باطل میں کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔ قرآن نے صراحت سے بتایا ہے کہ دین کے بگڑ جانے اور مٹ جانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے قول علی اللہ بغیر علم، اس کے نتیجے میں اللہ کا دین لوگوں کی خواہشات اور آراء کا ایک کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔ جس کا جی چاہا کسی چیز کو اپنی مرضی سے دین بنا دیا اور جس کی خواہش ہوئی کسی چیز کو دین سے خارج کر دیا۔ علامہ جمال الدین قاسمی نے علامہ حشمی سے یہ بات بہت اچھی لکھی ہے کہ جیسے پہلی آیت من حرم زینۃ اللہ الخ، تمام

مباحات کے لیے جامع ہے ایسے ہی یہ آیت گرامی اپنے دامن میں تمام محرمات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ فواحش اور اثم میں سارے گناہ صغیرہ و کبیرہ افعال قبیحہ غیر قانونی معاملات، بری باتیں، غلط افکار داخل ہیں ماظہر منہا و مابطن میں افعال جوارح، افعال قلوب، خیانات مکر، دھوکا سمیٹے ہوتے ہیں اور جیسے بغی میں ساری زیادتیاں، ساری دست درازیاں اور حکام کی ساری چیرہ دستیاں داخل ہیں ایسے ہی ان تشرکوا باللہ میں سارے شرک پر مبنی اعمال سارے مشرکانہ عقائد اور ساری مشرکانہ عبادات داخل ہیں۔ اور آخر میں ان تقولوا فرماکر ساری بدعات سارے قرآن و سنت سے بیگانہ فتاوی، ہر قسم کی جھوٹی شہادت پر قدغن قائم کر دی ہے۔

حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین میں اس آیت پر بڑا ہی درد انگیز اور بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

آیت میں قول علی اللہ بغیر علم تمام محرمات میں باعتبار حرمت عظیم تر اور بلحاظ گناہ سب سے زیادہ سنگین ہے۔ اسی لیے آیت میں اس کا ذکر چوتھے درجہ میں کیا ہے۔ اس آیت میں جن محرمات کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر و پوشیدہ فواحش، اثم، بغی، شرک اور قول علی اللہ بغیر علم، یہ تمام آسمانی شریعتوں اور الہی ادیان میں، ہمیشہ حرام رہے ہیں اور کبھی کسی حال میں بھی ان کی اباحت نہیں ہوئی۔ ان کی حیثیت مردار، خون، لحم، خنزیر کی نہیں ہے کہ حالت اختیار میں حرام اور حالت اضطرار میں حلال ہیں۔ محرمات دو قسم کے ہیں کچھ وہ ہیں جو بالذات حرام ہیں اور کسی حال میں حلال نہیں اور کچھ وہ ہیں کہ جن کی حرمت عارضی ہے ایک وقت حرام ہیں اور ایک وقت حرام نہیں۔ اس آیت میں ان محرمات کا چہرہ پیش کیا گیا ہے جو بالذات حرام ہیں۔ سب سے پہلے فواحش کا ذکر کیا بعد ازیں ان محرمات کا ذکر کیا جو فواحش سے بھی زیادہ حرام ہیں۔ یعنی اثم اور بغی بغیر الحق، پھر اس محرم کا بیان کیا جو فواحش، اثم اور بغی بغیر الحق سے بھی سنگین ہے یعنی شرک باللہ، اس کے بعد اس جرم کا تذکرہ کیا جو شرک سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔ یعنی قول علی اللہ بغیر علم، یہ سب سے زیادہ سنگین جرم ہے اور اس کی سنگینی کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ایک طرف اللہ کے بارے جھوٹ اڑانا ہے اور خدا کی طرف ایسی بات کو منسوب کرنا ہے جو اس کے شایان شان نہیں ہے۔ دوسری طرف دین الہی کی تحریف و تبدیلی ہے۔ باطل کو حق کے نام پر اور حق کو باطل کے نام پر پیش کرنا ہے۔ اس لیے اللہ کے نزدیک اجناس محرمات میں سنگینی کے اعتبار سے اس سے زیادہ سنگین گناہ کوئی نہیں ہے۔ یہی دنیا میں شرک و کفر کی اساس ہے اور اسی پر بدعات و ضلالات کی عمارت بنتی ہے۔ ہر ضلالت خیز بدعت کا نسب نامہ بواسطہ یا بلا واسطہ قول علی اللہ بغیر علم سے

وابستہ ہے۔

یہاں امام رازی نے یہ نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ یہ آیت سب سے طاقتور دلیل ہے۔ اس کی کہ بلا دلیل کچھ کہنا غلط ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دلیل وحجت کی ترازو پر تولے بغیر دین کی زندگی میں محض تقلیداً کچھ کہنا درست نہیں ہے۔ قاضی بیضاوی نے بات کو زیادہ کھول کر بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ جس دعویٰ کی پشت پر دلیل کی طاقت نہ ہو اس کی پیروی حرام ہے۔ یاد رہے کہ اسلام میں دلائل اور مصادر قانون کی حیثیت جیسے قرآن وسنت کو حاصل ہے ایسے ہی اجماع اور اجتہاد کو بھی حاصل ہے۔ یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں ہے انشاء اللہ ہم اس موضوع پر تفصیلی تبصرہ پارہ ۱۴ میں کریں گے۔ یہاں صرف یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ دلائل کا یہ تصور خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا ہے۔ حضرت معاذ بن جبل کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یمن کا گورنر بنا کر روانہ کیا تو آپ نے ان کو یہ ہدایت دی کہ:

> اے معاذ تو پیش یا افتادہ معاملات میں فیصلہ کیسے کرے گا۔ حضرت معاذ نے فرمایا کہ میں اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ تمہیں کتاب اللہ میں نہ ملے تو پھر کیا کرو گے بولے کہ میں اللہ کے رسول کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا، ارشاد ہوا کہ اگر سنت میں بھی نہ ملے تو پھر کیا کرو گے بولے کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، یہ سن کر آپ نے فرمایا الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے قاصد کو اس کی توفیق عطا فرمائی جس پر اللہ تعالیٰ کا رسول راضی ہے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٣٤﴾

اور ہر اُمت کے لیے ایک مقررہ مدت ہے لہٰذا جب کسی اُمت کا ٹھہرایا ہوا وقت آگیا تو پھر نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتی ہے، نہ ایک گھڑی آگے۔ ۳۴

معانی مفردات

اُمَّۃ، جماعت ام سے بنا ہے اس کی جمع امم آتی ہے۔ عربی میں ام کا اطلاق تمام ایسی چیزوں پر ہوتا ہے جو ایک طرح کی جامعیت اور مرکزیت رکھتی ہوں یا بہت سی چیزوں میں مقدم اور نمایاں ہوں، پھر کوئی ایسی اوپر کی چیز ہو جس کے نیچے اس کے بہت سے توابع ہوں۔ سر کے درمیانی حصہ کو ام الراس کہتے ہیں کیونکہ وہ دماغ کا مرکز ہے۔ فوج کے جھنڈے کو ام کہتے ہیں، کیونکہ تمام فوج اسی کے نیچے جمع ہوتی ہے۔ مکہ کو ام القریٰ کہتے تھے کیونکہ مکہ عرب کی تمام آبادیوں کے جمع ہونے کی جگہ تھی۔ سورہ فاتحہ کو ام القرآن کہتے ہیں کیونکہ قرآن کی ساری سورتیں اٹھ اٹھ کر اس کے پیچھے لگتی ہیں۔ امۃ اقوام دنیا میں ایسی جماعت جس میں جامعیت اور مرکزیت ہو یا خود دنیا کی تمام قوموں میں اپنی نمایاں اور مقدم جگہ رکھتی ہو۔ اجَلٌ، اس کے معنے مدت کے آتے ہیں۔ اجل افراد کی بھی ہوتی ہے اور اُمتوں کی بھی ہوتی ہے۔ ساعۃ، لغت میں وقت کی کمترین مدت کو کہتے ہیں۔ اور علم النجوم کی اصطلاح میں ساعت دن اور رات کے تمام وقت میں سے $\frac{1}{24}$ کو کہتے ہیں۔

اقوام دنیا کے لیے قانونِ تاجیل

پچھلی سورت میں افراد کی اجل کا ذکر کیا گیا تھا، یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ افراد کی طرح جماعتوں کی موت و حیات کے لیے بھی مقررہ قوانین ہیں، اور ان کے احکام اٹل ہیں۔ جب ایک جماعت کا شر و فساد اس حد تک پہنچ جاتا ہے جو جماعتوں کی ہلاکت کے لیے ٹھہرا دی گئی ہے تو پھر ظہورِ نتائج میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں ہوتی۔

یہاں اس اشارے سے مقصود رؤسائے مکہ کی تنبیہ اور اہلِ ایمان کی تذکیر ہے کہ انقلابِ حال کا وقت آگیا ہے اور ضروری ہے کہ نتائج کا ظہور ہو۔

جس طرح مادیات میں ہر حالت میں بتدریج نشوونما پاتی ہے اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لیے ایک خاص مقدار، ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اعمال کے نتائج کے لیے بھی مقدار و اوقات کے احکام مقرر ہیں اور ضروری ہے کہ ہر نتیجہ ایک خاص مدت کے بعد اور ایک خاص مقدار کی نشوونما کے بعد ظہور میں آئے۔ مثلاً فطرت کا قانون یہ ہے کہ اگر پانی کو آگ پر رکھا جائے گا تو وہ گرم ہو کر کھولنے لگے گا لیکن پانی کے گرم ہونے اور کھولنے کے لیے حرارت کی ایک خاص مقدار ضروری ہے اور اس کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ ایک مقررہ وقت تک انتظار کیا جائے۔

اس صورتِ حال سے تدریج و امہال کی حالت پیدا ہو گئی اور ظہورِ نتائج کے لیے تاجیل یعنی ایک مقررہ مدت کا قانون ضروری ہو گیا۔ نتائج ہمیشہ اپنے مقررہ وقت پر ظاہر ہوں گے۔ اس تاجیل کے لیے کوئی ایک ہی مقررہ مدت نہیں ہے۔ ہر حالت کا ایک خاصہ ہے اور ہر گرد و پیش اپنا ایک خاص تقاضا رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک خاص حالت کے لیے مقررہ مدت کی مقدار بہت تھوڑی ہو اور ہو سکتا ہے کہ بہت زیادہ ہو۔

۳۷۔ اور ہر امت کے لیے ایک مقررہ مدت ہے لہٰذا جب کسی امت کا ٹھہرایا ہوا وقت آگیا تو پھر نہ ایک گھڑی پیچھے رہ سکتی ہے اور نہ ایک گھڑی آگے۔ بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ جب وعدے کا وقت آ پہنچا تو تاخیر کا تو امکان عقلی ہے اس لیے اس کی نفی ضروری ہوئی مگر تقدیم تو عقلاً ممکن ہی نہیں ہے اس کی نفی سے کیا فائدہ ہے۔ اسی شبہ کی وجہ سے بعض مفسرین نے لا یستقدمون کا عطف جملہ شرطیہ اذا جاء اجلہم پر مانا ہے اور بعض نے جاء اجلہم سے قرب و دنو مراد لیا ہے۔ میرے نزدیک ان تکلفات کی حاجت نہیں ہے۔ محاورات میں کسی ایسی چیز کو جس کے مقابل طرفین ہوں۔ زور و تاکید

سے ثابت کرنے کے لیے بسا اوقات ایک طرف کی جو محتمل الثبوت ہو نفی مقصوداً کی جاتی ہے اور دوسری طرف کی جو پہلے سے غیر محتمل ہو نفی کو محض مبالغہ تاکید اور تحسین کلام کے طور پر استطراداً ذکر کر دیتے ہیں۔ ایک خریدار دکاندار سے کسی چیز کی قیمت معلوم کر کے کہتا ہے کچھ کم و بیش، دکاندار بھی کہہ دیتا ہے کہ کم و بیش نہیں ہو سکتا۔ دونوں جگہ کم کا ذکر مقصود ہے اور بیش کا لفظ محض تعیینِ قیمت کی تاکید و مبالغہ کے لیے محض استطراداً ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں بھی غرض اصلی کلام سے یہ ہے کہ خدا کا وعدہ جب آ پہنچے تو پھر اٹل ہے ایک منٹ کی تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔ مقصود تاخیر کی نفی کرنا ہے۔ تقدیم جو پہلے سے ظاہر الانتفاء ہے اس کی نفی کرنا محض وعدے کے اٹل ہونے پر زور ڈالنے کا ایک پیرایہ ہے۔ یعنی خدا پر افتراء کرنے والے اور اس کی طرف نسبت کر کے حرام کو حلال بنانے والے خدا کی ڈھیل پر مغرور و بے فکر نہ ہوں۔ ہر اُمت اور ہر فرد کی خدا کے یہاں ایک معین مدت ہے۔ جب سزا کی گھڑی آ جائے گی تو ٹل نہ سکے گی۔[1]

اس آیت کی واو کے ذریعہ پہلے سے پیوندکاری کی گئی ہے۔ اس کا معطوف علیہ پہلی آیت میں انما حرم ربی الفواحش ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر کہہ دو خدا کی حرام کردہ چیزیں وہ نہیں جن کو تم حرام بتاتے ہو حرام تو وہ ہیں جن کو اللہ نے حرام کیا ہے اور اے پیغمبر کہہ دو کہ ہر اُمت کی حیات اور بقاء کی علمِ الٰہی میں ایک مدت مقرر ہے جب وہ پوری ہو جائے گی تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہو گی نہ آگے بڑھے گی۔ اسی مدت کو قرآن نے یہاں اجل کہا ہے۔

یہاں دو باتیں سمجھ لینی چاہئیں۔

ایک یہ کہ افراد اور اقوام کے بارے میں خدا نے اجل کے پیمانے الگ الگ رکھے۔ افراد کی اجل کا پیمانہ تو سالوں، مہینوں، دنوں، گھنٹوں اور منٹوں کے حساب سے پورا ہوتا ہے۔ جب وہ پورا ہو جاتا ہے فرد ختم ہو جاتا ہے۔ قوموں اور اُمتوں کا معاملہ اس سے ذرا مختلف ہے۔ ان کا حساب ان کے ایمانی، اخلاقی زوال سے ہوتا ہے۔ یعنی ہر قوم کو دُنیا میں جو کام کرنے کا موقعہ دیا جاتا ہے اس کی ایک اخلاقی حد مقرر کر دی جاتی ہے بایں معنے کہ اس کے اعمال میں خیر اور شر کا کم سے کم کتنا تناسب ہے۔ جب تک ایک قوم کی بُری صفات اس کی اچھی صفات کے مقابلہ میں تناسب کی اس آخری حد سے فروتر رہتی ہیں۔ اس وقت تک اسے اس کی تمام برائیوں کے باوجود مہلت دی جاتی رہتی ہے اور جب وہ اس حد سے گزر جاتی ہے تو پھر اس بدکار و بدصفات قوم کو مزید مہلت نہیں دی جاتی۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

دوسری یہ کہ قوموں اور اُمتوں کی حد تک اجل دو قسم کی ہے۔ ایک اس اُمت کی اجل جسے نبوت مخاطب کرتی ہے اور جس کی طرف نبی کی بعثت ہوتی ہے۔ نبوت کے مخاطب نبوت کی دعوت کو کبر وعناد کی وجہ سے رد کر دیتے ہیں۔ نبوت سے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ نبوت ان کے مطالبہ پر ان کو معجزات دکھاتی ہے اور ساتھ ہی اُن کو آگاہ کر دیتی ہے کہ نہ ماننے کی صورت میں ہلاکت یقینی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں قریش کو تقریباً ۱۳ برس تک دعوت دی۔ اور ان تیرہ سالوں میں اس راہ میں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کی اور آیاتِ ہدایت کے مختلف نمونے ان کو دکھاتے۔ بالآخر شق القمر کا معجزہ بھی ان کی نگاہوں کے سامنے سے گزرا اور آخر وہ وقت آیا جو اپنے اپنے پیغمبروں کے سامنے دوسری قوموں پر آچکا تھا یعنی قبیلہ قریش میں سے وہ افراد صالحہ جو بے خوف و خطر حق کو قبول کر سکتے تھے۔ انہوں نے حق کو قبول کیا اور صرف وہ رؤسائے قریش رہ گئے جو قبولِ حق کی مطلق صلاحیت نہ رکھتے تھے یا وہ ضعفاء تھے جو ان رؤسا کی موجودگی میں حق کا ساتھ دینے کی قوت نہیں رکھتے تھے اور اس لیے ضرورت ہوتی کہ ان رؤسا کے وجود سے ارضِ حرم کو پاک کیا جاتے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مایوس ہو کر طائف تشریف لے گئے لیکن وہاں بھی کوئی حق سننے والا نہ تھا۔ بازار اور راستہ میں شریروں نے آپ کو پتھر مارے یہاں تک کہ قدم مبارک خون آلود ہو گئے۔

اس آیت میں قریش کو تنبیہہ کی گئی ہے کہ نبوت کی مخاطب قوموں کے لیے اللہ نے جو مدت مقرر کی ہوئی ہے اس سے تم بھی مستثنیٰ نہیں ہو یعنی یہ سنت اللہ جس طرح تمام سرکش و باغی قوموں کے باب میں پوری ہوتی ہے تم پر بھی لازماً پوری ہوگی۔ یہ مہلت جو تمہیں ملی ہے اس وجہ سے ملی ہے کہ اللہ نے ہر اُمت کی ہلاکت کے لیے ایک مدت مقرر کر رکھی ہے۔ اسی میں قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم فرعون اور قوم لوط تباہ ہوئی ہیں۔ ہلاکت کی یہ قسم نبیوں کی مخاطب قوموں کے ساتھ مخصوص ~~ہے~~ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے یہ قسم ختم ہو چکی ہے۔ اب رہتی دنیا تک نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ نبیوں کی دعوت کی تکذیب کے نتیجے میں کوئی قوم ہلاک ہوگی۔ وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین۔

دوسری قسم کی اجل یہ ہے کہ اللہ نے اس دنیا میں ہر اُمت کی سعادت و شقاوت کا ایک پیمانہ مقرر کر رکھا ہے۔ اس کا تعلق اخلاقی و ایمانی زوال سے ہے۔ اخلاقی زوال، فساد کی ایک خاص حد مقرر ہے جو کسی قوم کے پیمانہ کے بھر جانے کی نشانی ہے۔ جب قوم گرتے گرتے اس حد کو پہنچ جاتی ہے۔ اس کا سفینہ غرق ہو جاتا ہے۔ دراصل یہاں صرف سعادت و شقاوت ہی نہیں بلکہ ہر حالت، ہر تاثیر، ہر انفعال کے ظہور کے لیے ایک خاص مدت مقرر کر دی گئی ہے اور ضروری ہے کہ بتدریج مختلف منزلیں پیش آئیں۔

پھر ہر منزل اپنے آثار و انداز رکھتی ہے اور آنے والے نتائج سے خبردار کرتی ہے۔ زندگی اور موت کے قوانین پر غور کرو۔ کس طرح زندگی بتدریج نشو و نما پاتی اور کس طرح بتدریج مختلف منزلوں سے گزرتی ہے اور پھر کس طرح موت کمزوری و فساد کا ایک طول طویل سلسلہ ہے جو اپنے ابتدائی نقطوں سے شروع ہوتا اور یکے بعد دیگرے مختلف منزلوں سے گزرتا ہوا آخری نقطہ تک پہنچتا ہے۔ ہم بدپرہیزی کرتے ہیں تو یہ نہیں ہوتا کہ فوراً ہی ہلاک ہوجائیں بلکہ بتدریج موت کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ اور بالآخر ایک خاص مدت کے اندر جو ہر صورتِ حال کے لیے یکساں نہیں ہوتی درجہ بدرجہ اترتے ہوئے موت کی آغوش میں جاگرتے ہیں۔ نباتات کو دیکھو درخت اگر آبیاری سے محروم ہوجاتے ہیں، یا نقصان و فساد کا کوئی دوسرا سبب عارض ہوجاتا ہے تو یہ نہیں کہ ایک ہی دفعہ مرجھاکر گرجاتے یا کھڑے کھڑے اچانک گرجاتے بلکہ بتدریج شادابی کی جگہ پژمردگی کی حالت طاری ہونا شروع ہوتی ہے اور پھر ایک خاص مدت کے اندر جو مقرر کی گئی ہے یا تو بالکل مرجھاکر رہ جاتے ہیں یا جڑ کھوکھلی ہوکر گر پڑتے ہیں۔

یہی حال کائنات کے تمام تغیرات و انفعالات کا ہے۔ کوئی تغیر ایسا نہیں جو اپنا تدریجی دور نہ رکھتا ہو۔ ہر چیز بتدریج بنتی ہے اور اسی طرح بتدریج بگڑتی ہے۔ بناؤ ہو یا بگاڑ ممکن نہیں کہ ایک خاص مدت گزرے بغیر کوئی حالت بھی اپنی کامل صورت میں ظاہر ہوسکے۔ یہ مدت جو ہر حالت کے ظہور کے لیے اس کی اجل ہے مختلف گوشوں میں مختلف مقدار رکھتی ہے۔

قرآن اس تدریجی رفتارِ عمل کو تمتع، تمہیل و امہال سے تعبیر کرتا ہے۔ اگر تدریج کی یہ فرصتیں نہ ہوتی تو دُنیا میں ایک وجود بھی فرصت حیات سے فائدہ نہ اٹھا سکتا۔ ہر غلطی، ہر کمزوری، ہر نقصان اچانک بیک دفعہ بربادی اور ہلاکت کا باعث ہوجاتا۔

تدریج کا یہ عمل اور تاجیل قدرتی طور پر اچھائی اور بُرائی دونوں کے لیے ہے۔ اچھائی کے لیے اس لیے تاکہ زیادہ نشو و نما پاتے، بُرائی کے لیے اس لیے تاکہ متنبہ اور خبردار ہوکر اصلاح و تلافی کا سامان کرے۔

اگر قوانینِ فطرت کی ان مہلت بخشیوں اور تاجیل سے فائدہ اٹھاکر نقصان و فساد کی اصلاح کرلی جائے۔ مثلاً آپ نے بدپرہیزی کی تھی اسے ترک کردیں تو پھر یہ بھی سنت اللہ ہے کہ اصلاح و تلافی کی کوشش قبول کرلی جاتی ہے۔ اور نقصان و فساد کے جو نتائج نشو و نما پانے لگتے تھے ان کی ترقی رک جاتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اگر اصلاح ہر وقت اور ٹھیک ٹھیک کی گئی ہے تو پچھلے مضر اثرات بھی زائل ہوجائیں گے لیکن اللہ کی مقرر کردہ مہلت بخشیوں سے فائدہ نہ اٹھایا تو بلاشبہ وہ آخری حد نمودار ہوجاتی ہے جہاں پہنچ کر اللہ کا آخری فیصلہ صادر ہوجاتا ہے اور پھر جب فیصلہ صادر ہوجاتا ہے تو اس

میں تاخیر و تقدیم نہیں ہو سکتی اسی کو یہاں اذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون،
سے تعبیر فرمایا ہے اگرچہ شارحین قرآن نے یستاخرون اور یستقدمون کو متاخرون اور متقدمون کا مرادف
قرار دیا ہے۔ لیکن اگر دستور کے مطابق استفعال کا سین طلب کے لیے ہے تو اس میں زیادہ معنویت ہے۔
طلب قول اور فعل دونوں سے ہو سکتی ہے۔ اگر ایک شخص کسی چیز کے اسباب فراہم کرتا ہے، وہ
بلاشبہ اس کا طالب ہے۔ لہٰذا وہ امت جو ہلاکت کے اسباب فراہم کر رہی ہے وہ زبان حال اور اپنے
کردار سے ہلاکت کی جویا اور متلاشی ہے۔ آیت میں شرط کی معنویت یہ ہے کہ ہر امت اجل آنے سے
پہلے ہلاکت کو مؤخر کر سکتی ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ گناہوں، بدکاریوں کے ارتکاب کو چھوڑ دے
ظلم و بغی سے بے رخی اختیار کرے۔ فساد فی الارض اور زندگی میں اسراف اور ان تمام چیزوں سے بچ کر
رہے جس سے امت کا ایمانی و اخلاقی زوال رونما ہوتا ہے۔

اسی قانون تاجیل کی وجہ سے انبیاء کی قوموں کے مطالبہ معجزات میں تاخیر کی جاتی ہے کیونکہ معجزات پر
ایمان نہ لانے کے بعد پیغمبر کو ہجرت کا حکم ہو جاتا ہے اور منکرین کا گروہ ہلاک کر دیا جاتا ہے چنانچہ اس
کی مثالیں قوم نوح، نمرود اور فرعون سے لے کر قریش تک کی تاریخ پیش کرتی ہیں۔ اور قرآن کریم اس
کو بتصریح بیان کر دیا ہے۔ حضرت صالح کی امت نے نشانی طلب کی خدا نے کہا کہ نشانی تمہیں دکھا دی
جائے گی لیکن اس کے بعد بھی ایمان نہ لائے تو تمہاری ہلاکت یقینی ہے لیکن جس طرح افراد کی موت و
حیات کا ایک زمانہ مقرر ہے اسی طرح قوموں کی ہلاکت و بربادی کی بھی ایک خاص مدت متعین ہے
اسی بنا پر اس قسم کے معجزات کے ظہور میں اس مدت متعینہ تک کے لیے تاخیر کی جاتی ہے اور پیغمبر اور
مخالفین پیغمبر دونوں اس کے منتظر ہوتے ہیں۔

انما الغیب للہ فانتظروا انی معکم من المنتظرین

غیب تو صرف خدا کے ساتھ خاص ہے تم لوگ اس کے ظہور کا انتظار کرو، میں بھی انتظار کر رہا ہوں۔
یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے مطالبات کی پرواہ نہیں کرتے تھے کیونکہ آپ جانتے
تھے کہ ان کے مطالبے اور تحدی کے مطابق معجزہ آنے کے بعد ان کو مہلت نہ ملے گی اور وہ برباد ہو جائیں گے۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح افراد کی موت کا وقت اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں اسی طرح
قوموں اور امتوں کے فنا ہونے کا صحیح وقت کا علم بھی اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے دہی جانتا ہے کہ کب کوئی
قوم اپنے اخلاقی زوال کے اعتبار سے اس آخری حد پر پہنچ گئی کہ اب اس صفحۂ زمین پر باقی رہنا حکمت الٰہی کے
خلاف ہے۔

يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ إِمَّا يَأۡتِيَنَّكُمۡ رُسُلٞ مِّنكُمۡ يَقُصُّونَ عَلَيۡكُمۡ ءَايَٰتِي
فَمَنِ ٱتَّقَىٰ وَأَصۡلَحَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُونَ ۝٣٥ وَ
ٱلَّذِينَ كَذَّبُواْ بِـَٔايَٰتِنَا وَٱسۡتَكۡبَرُواْ عَنۡهَآ أُوْلَٰٓئِكَ أَصۡحَٰبُ ٱلنَّارِۖ
هُمۡ فِيهَا خَٰلِدُونَ ۝٣٦

اے اولادِ آدم اگر تمہارے پاس خود تم میں سے ایسے رسول آئیں جو تمہیں میری آیات سنا رہے ہوں تو یاد رکھو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنی اصلاح کرے گا اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا کوئی موقع نہیں ہے[۳۸]۔ اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان کے مقابلہ میں سرکش بن کر رہیں گے وہی دوزخی ہیں ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے[۳۹]۔

معانی مفردات

رُسُل، رسُول کی جمع ہے۔ رسُول رسالت سے بنا ہے۔ رسالت کے معنے بھیجنے کے

آتے ہیں۔ رسُول فعول کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ یہ مرسل بالفتح کا مبالغہ ہے لیکن فعول کا استعمال اس انداز سے بالکل نادر ہے۔ عام تحقیق تو یہی ہے کہ نبی و رسُول ہم معنے ہیں۔ جیسا کہ المسائرہ میں ابن الہمام نے لکھا ہے لیکن محققین کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔ النبوات میں حافظ ابن تیمیہ نے اس موضوع پر مبسوط کلام کیا ہے اور بتایا ہے کہ نبی وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ بتلاتا ہے اور جو کچھ اللہ اس کو بتاتا ہے اگر وہ اس کی تبلیغ ان کو کرتا ہے جن کی طرف وہ مبعوث ہوا ہے اور وہ لوگ اس کے مخالف ہیں تو وہ رسُول ہے لیکن اگر وہ کسی پہلی شریعت پر عامل ہو اور کسی کی طرف وہ بھیجا نہ گیا ہو تو وہ نبی ہے رسُول نہیں ہے۔ اور قاضی ناصر الدین عبداللہ بن عمر البیضاوی لکھتے ہیں۔ رسُول وہ ہے جسے اللہ نے شریعت جدیدہ دے کر مبعوث فرمایا ہو تاکہ وہ لوگوں کو اس کی طرف دعوت دے اور نبی اس کو بھی عام ہے اور اس کو بھی جس کو شرع سابق کو برقرار رکھنے کے لیے بھیجا ہو۔ مشہور محدث ملا علی قاری شرح الفقہ الاکبر میں فرماتے ہیں۔ زیادہ تر مشہور فرق جو ان دونوں میں منقول ہے یہ ہے کہ نبی رسُول سے اعم ہے کیونکہ رسُول وہ ہے جو تبلیغ پر مامور ہو اور نبی وہ ہے جس کی طرف وحی کی جاتی خواہ وہ تبلیغ پر مامور ہو یا نہ ہو۔

آیاتٍ، یہ آیت کی جمع مونث سالم ہے جمع تکسیر آی آتی ہے۔ یہ تای سے ہے جس کے معنے ہیں کسی بات پر ثابت قدم ہونا۔ اور آیۃ کے معنے ظاہر نشان کے ہیں۔ اس لیے اونچی اور بلند عمارت کو بھی آیۃ کہتے ہیں (تبنون بکل ریع آیۃ الشعراء ۲۶، ۱۲۸) اور آیت پیغام الٰہی کو بھی کہتے ہیں اور یہ دلیل اور معجزہ کے معنے میں بھی بولا جاتا ہے۔ یہی معنے آیت کے عموماً زیادہ موزوں ہیں، اس لیے آیات سے یہاں کچھ مفسرین نے کتب منزلہ مراد لی ہیں اور قرآن حکیم کے ہر جملہ کو جو کسی حکم پر دلالت کرتا ہے آیت کہا جاتا ہے خواہ وہ ایک سُورت ہو، خواہ وہ ایک فصل ہو یا اس کی کئی فصلیں ہوں۔ اور کچھ کی رائے میں آیت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ آیت کے معنے جماعت کے ہیں اور ہر آیت میں الفاظ و حروف کی ایک جماعت ہوتی ہے اور یا یہ وجہ ہے کہ آیت کے معنے نشان کے ہیں اور قرآن حکیم کی آیات اعجازی نشان ہیں۔

اولادِ آدم کے لیے مدارِ نجات

یہ نسلِ انسانی کے حق میں ابتدائے آفرینش میں اللہ کا مستقل فرمان اور اولادِ آدم کے لیے ضابطہ نجات ہے۔ ارشاد میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ انسان کا کام خود راستہ تجویز کرنا نہیں ہے بلکہ بندہ ہونے کی حیثیت میں وہ اس پر مامور ہے کہ اس راستہ کی پیروی کرے جو اس کا رب اس کے لیے تجویز کرے۔ اور اس راستے کے معلوم ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو کسی انسان کے پاس براہِ راست اللہ کی طرف سے وحی آئے، یا پھر وہ اس انسان کا اتباع کرے جس کے پاس وحی آئی ہو۔ کوئی تیسری صورت یہ معلوم ہونے کی نہیں ہے کہ رب کی رضا کس راہ میں ہے۔ ان دو صورتوں کے ماسوا ہر صورت غلط ہے بلکہ غلط ہی نہیں سراسر بغاوت بھی ہے جس کی سزا جہنم کے سوا اور کچھ نہیں۔

قرآن حکیم میں آدم کی پیدائش اور نوعِ انسانی کی ابتداء کا یہ قصہ سات مقامات پر آیا ہے جن میں پہلا مقام الم البقرہ میں ہے، پھر سورت الاعراف میں ہے۔ الحجر رکوع ۳، بنی اسرائیل رکوع ۷، الکہف رکوع ۷، طٰہٰ رکوع ۷، ص رکوع ۵۔

بائیبل کی کتاب مقدس باب اول دوم سوم میں بھی یہ قصہ بیان ہوا ہے لیکن دونوں کا مقابلہ کرنے سے ہر صاحبِ نظر محسوس کر سکتا ہے کہ دونوں قرآن اور بائیبل میں کیا فرق ہے۔ آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت اللہ اور فرشتوں کی گفتگو کا ذکر تلمود میں بھی آیا ہے مگر وہ بھی اس معنوی روح سے خالی ہے جو قرآن کے بیان کردہ قصے میں پائی جاتی ہے۔ حضرت آدم کے اس واقعہ میں ایسے راہنما حقائق موجود ہیں جن سے وہ سوالات حل ہوتے ہیں جن پر اسلامی فکر و فلسفہ اور اسلامی نظام کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں مثلاً یہ کہ اس دنیا میں انسان کا مقام کیا ہے۔ انسان دنیا میں خود مختار و مطلق العنان ہے یا پابند و محکوم؟ مسئول ہے یا غیر مسئول؟ مجبور ہے یا با اختیار؟ اس کو کسی نے اس دنیا میں بھیجا ہے یا وہ خود بخود اس میں آگیا ہے۔ اس کا وجود محض ایک انفرادی وجود ہے یا وہ اپنی اجتماعی ہستی بھی رکھتا ہے۔ اس کی رہنمائی کے لیے اس کی اپنی عقل کافی ہے یا اس کے علاوہ کسی اور ما فوق رہنمائی کا بھی محتاج ہے اس کائنات کے دوسرے عناصر کے ساتھ اس کے ربط کی نوعیت کیا ہے۔ یہ اپنی فطرت کے لحاظ سے بدی کی مخلوق ہے یا نیکی کی غرض اس قسم کے بہت سے بنیادی سوالات جن کا جواب ان آیات کے اندر موجود ہے۔

۳۸ - اے اولادِ آدم اگر تمہارے پاس خود تم میں سے ایسے رسول آئیں جو تمہیں میری آیات سناتے ہوں

تو یاد رکھو کہ جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنی اصلاح کرے گا اس کے لیے کسی خوف و رنج کا کوئی موقعہ نہیں ہے۔ ابن جریر نے ابو یسار سلمی سے نقل کیا ہے کہ یہ خطاب یا بنی آدم اما یاتینکم ساری اولادِ آدم کو عالم ارواح میں ہوا تھا جیسا کہ سورہ بقرہ کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے قلنا اهبطوا منها جميعاً فاما ياتينكم منى هدى اور بعض محققین کے نزدیک جو خطاب ہر زمانے میں ہر قوم کو ہوتا رہا یہ اس کی حکایت ہے۔ میرے نزدیک دو رکوع پہلے سے جو مضمون چلا آرہا ہے اس کی ترتیب و تنسیق خود ظاہر کرتی ہے کہ جب آدم و حوا اپنے اصل مسکن جنت سے جہاں ان کو آزادی و فراخی کے ساتھ بلا روک زندگی بسر کرنے کا حکم دیا جا چکا تھا عارضی طور پر محروم کر دیے گئے تو ان کی مخلصانہ توبہ و انابت پر نظر کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوا کہ اس حرمان کی تلافی اور تمام اولادِ آدم کو اپنی آبائی میراث واپس دلانے کے لیے کچھ ہدایات کی جائیں۔ چنانچہ ہبوطِ آدم کا قصہ ختم کرنے کے بعد معاً یا بنی آدم قد انزلنا علیکم لباساً سے خطاب شروع فرما کر تین چار رکوع تک ان ہی ہدایات کا مسلسل بیان ہوا ہے۔ ان آیات میں کل اولادِ آدم کو گویا بیک وقت موجود تسلیم کر کے عام خطاب کیا گیا ہے کہ جنت سے نکلنے کے بعد ہم نے بہشتی لباس و طعام کی جگہ تمہارے لیے زمینی لباس و طعام کی تدبیر فرما دی۔ گو جنت کی خوشحالی اور بے فکری یہاں میسر نہیں۔ تاہم ہر قسم کی راحت و آسائش کے سامان سے منتفع ہونے کا تم کو موقع دیا تاکہ تم یہاں رہ کر اطمینان سے اپنا مسکن اصلی اور آبائی ترکہ واپس لینے کی تدبیر کر سکو۔ چاہیے کہ شیطان لعین کے مکر و فریب سے ہوشیار رہو۔ کہیں ہمیشہ کے لیے تم کو اس میراث سے محروم نہ کر دے۔ بے حیائی، اثم و عدوان سے بچو۔ اخلاص و عبودیت کا راستہ اختیار کرو۔ خدا کی نعمتوں سے تمتع کرو، مگر حدود و قیود مالک حقیقی نے عائد کر دی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو پھر دیکھو ہر قوم اپنی مدت موعودہ پوری کر کے کس طرح اپنے ٹھکانے پر پہنچتی ہے۔ اس اثنا میں اگر خدا کسی وقت تم ہی میں سے اپنے پیغمبر مبعوث فرماتے جو خدا کی آیات پڑھ کر سنائیں جن سے تم کو اپنے باپ کی اصلی میراث جنت حاصل کرنے کی ترغیب و تذکیر ہو اور مالک حقیقی کی خوشنودی کی راہیں معلوم ہوں ان کی پیروی اور مدد کرو۔ خدا سے ڈر کر برے کاموں کو چھوڑ دو اور اعمالِ صالحہ اختیار کرو۔ پھر تمہارا مستقبل بلا خوف و خطر ہے۔ تم ایسے مقام پر پہنچ جاؤ گے جہاں سکھ اور امن و اطمینان کے سوا کوئی چیز نہیں۔ جو لوگ اس آیت سے ختم نبوت کی نصوص کے خلاف قیامت تک کے لیے انبیاء و رسل کی آمد کا دروازہ کھولنا چاہتے ہیں ان کے لیے اس جگہ کوئی موقع مطلب برآری کا نہیں ہے[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم کی ابتدا ہی میں جن باتوں کی اولادِ آدم کو بنیادی طور پر تعلیم دی گئی تھی ان میں ایک بعثتِ رسول دوسرے رسولوں کے انسان ہونے کا عقیدہ تھا۔ اسی عقیدے کے مطابق خدا کے بہت سے رسول آتے جن کی صحیح تعداد خدا ہی کو معلوم ہے مگر قرآن سے جو کچھ اجمالاً معلوم ہو سکا ہے یہ ہے کہ سب سے پہلے منصبِ نبوت کے لیے دو انسان منتخب ہوئے تھے۔ پھر افراد و اشخاص کی جگہ خاندانوں کا انتخاب کیا گیا۔ آخر میں بنی اسماعیل کا انتخاب عمل میں آیا اور آخری رسول جناب محمد رسول اللہ کو روانہ کر کے اس سلسلہ کو ختم کر دیا گیا۔ نبیوں میں بڑا نبی وہ ہوتا ہے جس کو اس پیغمبرانہ بعثت کے ساتھ ایک اور بعثت ملتی ہے اور وہ یہ کہ مرادِ الٰہی یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کے ذریعہ سے اس کی قوم اور اس کی قوم کے ذریعے دوسری قومیں ظلمت سے نکل کر نور میں آئیں تو اس قوم کی بعثت کا نام اجتماعی بعثت ہوتا ہے۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم پر انفرادی بعثت کو ختم کر کے رہتی دُنیا تک کی ہدایت کے لیے اجتماعی بعثت قائم کر دی گئی۔ قرآن کی آیت کنتم خیر امۃ اخرجت للناس میں اسی اجتماعی بعثت کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ان کی اُمت کی طرف ہوئی ویسی ہی ان کی اُمت کی بعثت دُنیا کی دوسری قوموں کی طرف ہوئی۔ اسی لیے زمانۂ نبوت انفرادی کے خاتمہ پر وحیِ الٰہی نے یہ اعلان کیا الیوم اکملت لکم دینکم اسی تکمیل کا یہ اثر ہے کہ کسی بعد میں آنے والے پیغمبر کی پیشین گوئی نہیں نہ کسی نئے کلام کے نزول کی خبر دی نہ کسی نئی شریعت کا منتظر کیا کہ تکمیل کے بعد اب کسی نئے آنے والے، کسی نئے کلام اور کسی نئی شریعت کا موقعہ کہاں اور اسی بنا پر قرآن نے ہر جگہ ما انزل من قبلک (جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے نازل ہوا) پر ایمان لانے کی تاکید کی لیکن ما انزل من بعدک کے قبول کرنے کا کہیں اشارہ تک نہیں کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کو تمام کتابوں کا صرف مصدق نہیں بلکہ مہیمن بتایا یعنی وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیمات پر مشتمل اور ان کا محافظ ہے۔ یہ حیثیت قرآن کے سوا کسی دوسرے صحیفہ کو حاصل نہیں ہے۔ اور مصدق و مہیمن ہونے کے ساتھ قرآن کے تاقیامت محفوظ رہنے کی ضمانت دی گئی اور بتایا گیا کہ قرآن ہمیشہ کے لیے باقی اور محفوظ رہے گا۔ اس کی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی اور فرمایا:

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون،

ہم نے ہی اس کتاب کو اتارا ہے اور بلاشبہ ہم ہی اس کے نگران ہیں۔

ان تمام باتوں کا نتیجہ اگرچہ خود یہ ہے کہ محمد رسول اللہ کے بعد کسی نبی کی قرآن کے بعد کسی صحیفہ کی اور اسلام کے بعد کسی دین کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس کے باوجود قرآن نے ہر شک کے ازالہ کے

لیے یہ بات کھول کر بتادی ہے کہ نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہوگیا ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کی حاجت نہیں ہے کیونکہ دین کامل ہو چکا اور صحیفہ الٰہی محفوظ ہو چکا ہے اور اُمت کی بعثت کی وجہ سے ہدایت ربانی کے دروازہ کے بند ہونے کا خطرہ دُور ہوگیا۔ چنانچہ خود تاریخ انسانی گواہ ہے کہ بعثت محمدی کے بعد سے دُنیا کی حالت بدل گئی۔ متفرق قومیں پیوستہ ہوگئیں۔ زمین کے کونے ایک دوسرے سے مل گئے۔ اور توحید کامل کا غلغلہ عرش سے فرش تک بلند ہوگیا اور خدا کے تمام رسُولوں کو سچا اور صادق ماننے کا ولولہ آہستہ آہستہ ترقی پانے لگا یہاں تک کہ اُن قوموں نے بھی جو مسلمان نہیں ہوئیں ان دونوں صداقتوں کو اصولاً تسلیم کرلیا۔

اس آیت سے یہ سمجھنے کی کوئی گنجائش نہیں کہ تا قیامت نبوت کا سلسلہ جاری رہے گا۔ یہ اس آیت کا منہ بگاڑنا ہے۔ کیونکہ آیت میں خطاب یا ایھا الذین آمنوا نہیں ہے بلکہ یا بنی آدم کہہ کر خطاب کیا ہے۔ یہ اندازِ خطاب کہہ رہا ہے کہ اولادِ آدم اس کی مخاطب اس وقت ہوئی تھی جب اس کی آفرینش ابھی عالمِ ناسوت میں بھی نہ ہوتی تھی اور ابھی وہ عالمِ ارواح ہی میں تھی۔ یہ کہنا بالکل بے محل اور بے موقعہ بات ہے کہ نبوت ایک نعمت ہے اس سے اُمتِ محمدیہ باوجود خیر الامم ہونے کے کیسے محروم رہ سکتی ہے۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ ان کو ختمِ نبوت کا صحیح مفہوم سمجھنے ہی میں چند غلط فہمیاں ہوگئی ہیں۔ شاید اس کا مفہوم یہ سمجھا گیا ہے کہ نبوت پہلی اُمتوں کے لیے ولایت و صدیقیت کی طرح ایک ممکن الحصول کمال تھا۔ اب یہ اُمت دوسرے اور مراتب تو حاصل کر سکتی مگر کمالِ نبوت کو حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ سخت غلط فہمی اور حقیقتِ نبوت سے قطعی جہالت کی دلیل ہے۔ نبوت ان کمالات ہی میں نہیں ہے جو ریاضیات اور مجاہدات کے صلے میں بطورِ انعام کسی وقت بھی بخشا گیا ہو بلکہ یہ ایک خدا کی جانب سے منصب ہے جس کا تعلق تشریعی، ضرورت اور براہِ راست اللہ تعالیٰ کی صفتِ اجتبا۔ اور اصطفا سے ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے اس منصب کے لیے چن لیتا ہے۔ اگر نبوت ان کمالات میں سے ہوتی جو مجاہدات، ریاضات، پاکبازی و حسنِ نیت کے صلے میں انعامی طور پر ملتے ہیں تو یقیناً اس کے لیے سب سے موافق زمانہ خود نبی کی موجودگی کا زمانہ ہوتا کیونکہ جس قدر عملی جدّوجہد، اتباعِ شریعت کا جذبہ خود زمانۂ نبوت میں ہوتا ہے اس کے بعد نہیں ہوتا۔ مگر نبوت کی تاریخ اس کے برعکس ہے۔ یعنی جب زمین شر و فساد، طغیان و سرکشی اور تکبر و تمرد سے بھر گئی۔ صلاح و تقویٰ عنقا ہوکر رہ گیا۔ رُشد و ہدایت کے آثار ناپید ہوگئے۔ وہی انبیاؑ کی تشریف آوری کے لیے سب سے زیادہ موزوں زمانہ ہوا۔ بلاشبہ اس سے بآسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ نبوت وہ انعام نہیں ہے جو ولایت و صدیقیت کی طرح اُمتوں میں تقسیم کیا جاتے بلکہ دُنیا کی انتہائی دورِ ضلالت میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ ہدایت کا

ذاتی تقاضا ہے۔ ذاتی تقاضے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کسب و اکتساب، ماحول کی موافقت ناموافقت کو کوئی دخل نہیں۔ نبوت کا ماحول تو چاہتا ہے کہ خدائی رحمت کی جگہ خدا کا قہر و غضب نازل ہو مگر خدا کی صفتِ ہدایت کا تقاضا یہ ہے کہ جب ملک کا ملک اور قوم کی اس کا راستہ گم کر دے اور بھولے سے نہیں بلکہ شرارت اور شیطنت کی بنا پر تو وہ اپنی طرف سے ان کی طرف ہدایت کا دروازہ کھول دے۔

ختمِ نبوت کے معنے یہ نہیں ہیں کہ کمالات ختم ہو گئے ہیں۔ نبوت کا ختم ہونا خدائی نعمت کے اتمام اور دین کے انتہائی ارتقاء کے عروج کی دلیل ہے۔ ورنہ جہاں تک کمالات کا معاملہ ہے تو یہ روایات سے ثابت ہے کہ اُمت محمدیہ کے کمالات تمام اُمتوں سے زیادہ ہیں۔ اور اتنے زیادہ ہیں کہ حضرت موسٰی جیسے نبی کو اس اُمت کے کمالات سُن کر اس اُمت کا ایک فرد ہونے کی تمنا ہو سکتی ہے۔

علامہ خفاجی شفاء قاضی عیاض کی شرح میں حضرت انس سے ایک روایت نقل کرتے ہیں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے موسٰی علیہ السلام پر وحی روانہ کی۔ جو شخص احمد کا انکار کر کے میرے پاس آئے گا میں اسے دوزخ میں ڈالوں گا۔ عرض کیا کہ یہ احمد کون ہیں؟ ارشاد ہوا۔ یہ وہ ہیں جن سے زیادہ مجھے اپنی مخلوق میں کوئی عزیز نہیں۔ زمین و آسمان سے پہلے ہی میں نے ان کا نام اپنے نام کے ساتھ ساتھ عرش پر لکھ دیا تھا اور یہ بات طے کر دی تھی کہ جب تک وہ اور ان کی اُمت جنت میں نہ داخل ہو لیں کوئی اور جنت میں نہ داخل ہو سکے گا موسٰی علیہ السلام نے اس اُمت کے اوصاف پوچھے، ارشاد ہوا کہ وہ اُمت ہر وقت ہماری تعریف کرے گی۔ بلندی پر چڑھے گی تو تعریف کرتی ہوئی پستی میں اترے گی۔ غرض ہر حال میں ہماری حمد و ثنا کرے گی۔ اپنی کمریں باندھنے والی، اپنے اعضاء دھونے والی، دن کی روشنی میں شیر کی طرح بہادر اور رات کی تاریکی میں درویش صفت ہو گی۔ ان کا تھوڑا سا عمل قبول کروں گا اور کلمہ شہادت پر جنت دوں گا۔ موسٰی علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ تو مجھے اس اُمت کا نبی بنا دے۔ ارشاد ہوا کہ اس کا نبی تو خود ان میں سے ہو گا۔ عرض کیا اچھا تو پھر اُس نبی کی اُمت ہی میں بنا دے، ارشاد ہوا کہ تم ان سے پہلے ہو وہ تمہارے بعد آئیں گے۔ البتہ میں اپنے دارِ جلال میں تمہیں ان کے ساتھ جمع کر دوں گا۔

مسند ابو داؤد طیالسی، مسند احمد اور مسند ابی یعلیٰ میں ہے:

کادت هذه الامة ان تكون انبياء كلها

یہ اُمت مجموعی لحاظ سے بلحاظ کمالات انبیاء ہونے کے قریب ہے۔

بشارات، الہام، تحدیث مع الملائکہ، اجتہاد، نظم و نسق اُمت، بدعت اور تحریف فی الدین کی اصلاح حتیٰ کہ خلافت حقہ کا قیام یہ سب اس اُمت کے مناصب و کمالات میں داخل ہیں۔ کتاب اللہ کی حفاظت دین کی تکمیل ایک ایسی مضبوط جماعت کا بقا۔ جو ہمیشہ جادہ حق پر مستقیم رہے اور حسبِ ضرورت ایسی جماعتوں کی بعثت جو پوری ذمہ داری کے ساتھ تحریفات کی اصلاح کرتی رہیں۔ ان سب اُمور کا اللہ سبحانہ نے اُمت کو مبعوث فرما کر خود تکفل فرمالیا ہے۔ آپ ہی سوچئے کہ اب اس کے بعد کون سا کمال باقی ہے جو پہلی اُمتوں میں تھا اس اُمت میں نہیں ہے اور جس کے لیے نبوت کی ضرورت ہے۔

بہرحال نبوت ایک عہدہ اور منصب ہے۔ اس کی حیثیت دوسرے کمالات کی نہیں جو جدوجہد، محنت و ریاضت سے حاصل ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اس غلط فہمی میں پڑ کر اس آیتِ قرآنی کو اجراء نبوت کی دلیل بنایا ہے۔ یاد رکھو یہ قرآن میں صریح تحریف ہے۔

نبوت کا مقابلہ اور اس کی تکذیب

۳۹ ۔ اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان کے مقابلہ میں سرکش بن کر رہیں گے وہی دوزخی ہیں ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ یعنی اگر ہماری آیات کو جھٹلایا اور تکبر کر کے ان پر عمل کرنے سے کترائے تو مسکن اصلی اور آبائی میراث جنت سے دائمی محرومی اور ابدی عذاب و ہلاکت کے سوا کچھ نہ ملے گا[1] مطلب یہ ہے کہ ہمارے رسول آیاتِ الٰہی سنانے آئیں گے تو جو لوگ ان کو جھٹلائیں گے اور متکبرانہ ان سے روگردانی اختیار کریں گے وہ دوزخ میں پڑیں گے۔ سورہ بقرہ میں کفروا وکذبوا کی تعبیر آئی ہے لیکن یہاں صرف کذبوا پر اکتفا فرمایا ہے۔ کُفر کے معنے انکار کے ہیں اور تکذیب کے معنے جھٹلانے کے ہیں۔ چونکہ تکذیب کے لیے کُفر لازم ہے اس لیے موقعہ کے لحاظ سے صرف تکذیب کا ذکر کیا ہے اور تکذیب کے زور کو ظاہر کرنے کے لیے واستکبروا عنھا کا اضافہ کیا ہے اور استکبار کے ساتھ عن لا کر اشارہ کر دیا کہ یہ لوگ صرف بڑائی کے نشہ میں تکذیب ہی نہیں کرتے بلکہ اللہ کی آیات سے اعراض بھی کر رہے ہیں۔ یعنی آیاتِ الٰہی کی متکبرانہ انداز میں تکذیب کرتے ہیں اور ان سے منہ موڑے ہوتے ہیں۔ آیات کا لفظ قرآن عزیز میں ان دلائل اور نشانیوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو زمین و آسمان اور آفاق و انفس کے ہر گوشے میں موجود ہیں۔ اور جو خدا کی قدرت و حکمت، اس کی توحید اور اس کے قانونِ جزا و سزا کی گواہی دے رہے ہیں۔ ان معجزات کے لیے

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

بھی استعمال ہوا جو نبوت کے ذریعے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ قرآن کی ان آیتوں کے لیے بھی آیا ہے جن سے قرآن کی سورتیں مرکب ہیں۔ قرآن عزیز کی آیات کے لیے اس لفظ کا استعمال اس حقیقت پر دلیل ہے کہ ان کی حیثیت بے دلیل احکام کی نہیں ہے بلکہ ان میں سے ہر آیت ایک دلیل و شہادت اور ایک حجت و برہان کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔

یہ آیات اللہ، خدا کے وجود اور اس کی صفات کمالیہ کی علامات ہیں۔ جس طرح ہر اہرام کی عمارت معمار کے وجود کو۔ اور ایک زخمی کی مرہم پٹی اور اس کے آرام و آسائش کا اہتمام تیماردار کے رحم و کرم کے صفات کو ظاہر کرتا ہے اسی طرح آیات اللہ ایک خالق و صانع کے وجود کو بتاتی ہیں۔ کفران ہی کے دلوں میں پرورش پاتا ہے اور ان کی تکذیب وہی کرتے ہیں جو ان آیات الٰہی میں غور و فکر نہیں کرتے اور ان کی جلوہ گری سے حقیقی جلوہ آرا ہستی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

جس طرح یہ آیات الٰہی عام بندہ اور خدا اور خالق و مخلوق کے تعلق اور رابطہ کو نمایاں کرتی ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کسی خاص بندے سے اپنے تعلق اور ربط کو اپنے مخصوص علامات و آیات کے ذریعہ نمایاں کرتا ہے۔ تبلیغ و دعوت میں دین الٰہی کی نصرت اور اشاعت میں مخالفین کی شکست اور ہزیمت میں صلحاء کو مزید ایمان اور تسکین کے حصول میں عجیب و غریب مافوق فہم نشانات ظہور پذیر ہوتے ہیں جن کو عرف عام میں معجزات کہتے ہیں۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ آیات دو قسم کی ہیں ایک ظاہری اور مادی اور دوسری باطنی اور روحانی۔ ظاہری اور مادی آیات تو وہ دلائل ہیں جن کو لوگ عام طور پر معجزات کہتے ہیں۔ اور باطنی نشانات و آیات خود مدعی نبوت کی پیش کش، اس کی صداقت و معصومیت، تزکیہ، تاثیر، تعلیم ہدایت ارشاد فلاح اور تائید ہے۔ اہل نظر اور حقیقت شناسوں کے لیے یہی روحانی آثار و آیات نبوت کی حقیقی نشانیاں ہیں۔ باقی ظاہری نشانیاں اور معجزات صرف سطحی اور ظاہر بین نگاہوں کے لیے ہیں جو ہر چیز کو ان ظاہری آنکھوں سے دیکھ کر پہچانتی ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اللہ سبحانہ کی جانب سے معجزات عطا ہوتے ان میں سب سے بڑا معجزہ خود قرآن حکیم ہے۔ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے اسی کو سب سے بڑا معجزہ قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے:

> پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر معجزات عنایت کیے ہیں جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے لیکن جو معجزہ مجھے مرحمت ہوا ہے وہ قرآن ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اتارا۔ اس لیے میں امید کرتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے پیروؤں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی۔

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۚ أُولَٰئِكَ
يَنَالُهُمْ نَصِيبُهُم مِّنَ الْكِتَابِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَتْهُمْ رُسُلُنَا
يَتَوَفَّوْنَهُمْ قَالُوا أَيْنَ مَا كُنتُمْ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ قَالُوا
ضَلُّوا عَنَّا وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ ﴿٣٧﴾ قَالَ
ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ
فِي النَّارِ ۖ كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا ۖ حَتَّىٰ إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا
جَمِيعًا قَالَتْ أُخْرَاهُمْ لِأُولَاهُمْ رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ أَضَلُّونَا فَآتِهِمْ عَذَابًا
ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ۖ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَلَٰكِن لَّا تَعْلَمُونَ ﴿٣٨﴾
وَقَالَتْ أُولَاهُمْ لِأُخْرَاهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ فَذُوقُوا
٤ ع ٨ ١١ الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿٣٩﴾

لہٰذا ان سے بڑا ظلم کار کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان اُٹھاتے اور اس سے
بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا کی آیتیں جھٹلاتے ہیں[٤٠]۔ ان ہی لوگوں کو کتاب میں

سے اپنا حصہ ملے گا۔[41] حتیٰ کہ جب وہ وقت آجاتے گا کہ جب ہمارے فرستادے ان کی روحیں قبض کرنے کے لیے ان کے پاس آئیں گے وہ ان سے دریافت کریں گے بتاؤ اب تمہارے معبود کہاں ہیں جن کو تم خدا کے سوا پکارتے تھے وہ جواب میں کہیں گے وہ تو ہم سے کھو گئے اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ فی الواقع کافر تھے۔[42] اللہ فرماتے گا جاؤ تم بھی اسی جہنم میں جاؤ جس میں تم سے پہلے جن و انس جا چکے ہیں۔[43] ہر گروہ جب جہنم میں داخل ہو گا تو اپنے پیش رو گروہ پر لعنت کرتا ہوا داخل ہو گا۔[44] تا آنکہ جب سب اس میں گر چکیں گے تو بعد والا گروہ پہلوں کے بارے میں کہے گا اے پروردگار ہماری گمراہی کا سبب یہی لوگ ہیں لہٰذا ان کو جہنم کا دگنا عذاب دے، اللہ فرماتے گا سب کو دوگنا ہی عذاب ہو گا لیکن تمہیں پتہ نہیں ہے۔[45] اور پہلا گروہ دوسرے گروہ سے کہے گا کہ اس فیصلہ خداوندی کے بعد اب تمہیں

ہم پر کوئی فوقیت نہیں ہے لہذا سب اپنی کمائی کے بدلے میں سزا کا مزہ چکھو۔ ۴۶

معانی مفردات

من دون اللہ عربی زبان میں سوا، ورے اور نیچے سب ہی آتے ہیں۔ من دون کے معنے غیر اور سوا کے دیکھ کر بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ مشرکین عرب اللہ کو بالکل چھوڑ کر غیروں کو پکارتے تھے لیکن یہ ان کی غلطی ہے قرآن کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مشرکین بندگان خدا کو محض سفارشی سمجھتے تھے اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ان کو ذریعہ سمجھتے تھے۔ قرآن نے خود ان کی زبانی بندگان خدا کی تصویروں سے ان کے عابدانہ تعلقات کی یہ توجیہ پیش کی ہے ھؤلاء شفعاؤنا عند اللہ اور ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ، قرآن کی ایک سے زیادہ آیات میں من دون کے معنے ورے کے ہیں۔ حضرت موسیٰ مدین پہنچے تو تو وہاں ایک کنوئیں پر پہنچے تو لوگوں کی بھیڑ سے ورے دو عورتوں کو کھڑا پایا۔ ارشاد ہے و وجد من دونھم امراتین یہاں من دون کے معنے غیر اور سوا کے نہیں ورنہ معنے یہ ہوں گے کہ وہاں لوگ نہ تھے صرف یہ دو عورتیں تھیں۔ یہ قرآن کے مدعا کے خلاف ہے مطلب یہ ہے کہ مردوں کے ورے دو عورتیں کھڑی تھیں۔ اسی طرح قرآن کی دوسری آیات، احادیث اور اشعار عرب میں بھی یہ لفظ ورے کے معنے میں آیا ہے۔

ضلوا، وہ بہکے وہ گمراہ ہوتے وہ گم ہوتے وہ کھو گئے۔ ضلال اور ضلالۃ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب ہے۔ علامہ جمال الدین قرشی لکھتے ہیں ضلال بالفتح ضائع ہونا، گم ہونا اور مغلوب ہونا، ضل الماء فی اللبن بولا جاتا ہے یعنی پانی اتنا مغلوب ہوا کہ دودھ میں اس کا اثر ظاہر نہیں ہوتا اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی زبانی کہ ان ابانا لفی ضلال مبین کہ ہمارے ابا تو ان دونوں کی محبت میں مغلوب ہیں۔

ضعف، دوگنا، دونا، دوچند، امام راغب فرماتے ہیں۔ ضعف لفظ متضائفہ میں سے ہے کہ ان میں ایک کا وجود دوسرے کے وجود کا مقتضی ہے جیسے کہ نصف اور زوج۔ ضعف کے معنے دو مساوی قدروں کی ترکیب کے ہیں۔ اور یہ خاص طور پر عدد میں ہوتا ہے۔ کسی چیز کا ضعف وہ ہے جو اسے ڈبل کر دے اور جب اس کی اضافت کسی عدد کی طرف ہو تو وہ عدد اور اتنا ہی اور مراد ہوگا۔ اور جب بولا جائے گا اعطہ ضعفی واحد تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک اور اس کا دوچند اس کو دے دو یعنی سہ چند اور اگر یوں کہیں کہ اعطہ ضعفین تو مطلب یہ ہوگا کہ اسے دوچند دے دو۔

نیکی اور بدی میں تعدیہ ہے

ان آیات میں ان لوگوں کے مناقشہ کی تصویر کشی فرماتی ہے جو دنیا میں ایک دوسرے کے تابع اور متبوع، لیڈر اور پیرو، ساتھی اور مددگار بنے رہے۔ ایک دوسرے کے گن گاتے اور حق کی مخالفت کا جھنڈا اٹھائے پھرتے رہے۔ سلامیاں اور ایڈریس پیش کرتے تھے لیکن دوزخ میں داخل ہوتے ہی ہر گروہ دوسرے کو برا بھلا کہے گا۔ تابعین اپنے متبوعین سے کہیں گے کہ تم ملعون ہو تمہاری وجہ سے ہم تباہ و برباد ہوئے متبوعین کہیں گے کہ تم خود شامت زدہ تھے اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔

دراصل نیکی ہو یا بدی دونوں ہی اپنی فطرت کے اعتبار سے متعدی چیزیں ہیں۔ یہ اپنے کرنے والوں ہی کی ذات تک محدود نہیں رہتی ہیں بلکہ ان کے اثرات دوسروں تک بھی منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وراثت در وراثت ہو کر نیکی کا ایک ذرہ احد پہاڑ کے برابر ہو سکتا ہے اور بدی کا ایک تخم فساد ایک لق و دق جنگل کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ ان آیات میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جب کوئی جماعت برائی میں مبتلا ہوتی ہے تو خود بھی گمراہ ہوتی ہے اور دوسروں کے لیے گمراہی کی مثال قائم کر دیتی ہے۔ یہ برائی کا تعدیہ ہے۔ یہی اصول اس ارشادِ نبوت میں بیان ہوا ہے۔

جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ رائج کیا اس کے لیے اس کا اجر ہے اور ان لوگوں کے عمل کا اجر ہے جو اس کے بعد اس پر عمل کریں گے بغیر اس کے کہ ان کی مزدوریوں میں کوئی کمی آتے اور جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ رواج دیا تو اس پر اس کا گناہ ہے اور ان لوگوں کے عمل کا گناہ ہے جو اس پر عمل کریں گے بغیر اس کے کہ ان کے گناہ میں کوئی کمی

کی جاتے۔

نیکی میں تعدیہ تو عام قانون ہے۔ قرآن کی ایک سے زیادہ آیات میں اسے بتایا گیا ہے لیکن بُرائی میں تعدیہ مخصوص ہے ان لوگوں کے لیے جو اغواء اور اضلال کا کام کریں اور برائی میں قائد ہو کر کام کریں۔ ایک عذاب خود گمراہی اختیار کرنے کا اور دوسرا عذاب دوسروں کو گمراہ کرنے کا۔ ایک سزا اپنے جرائم کی اور دوسری سزا دوسروں کو جرائم پر آمادہ کرنے کی۔

۴۰ – لہٰذا ان سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان اٹھاتے اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی آیتیں جھٹلاتے۔ یعنی ان سچے پیغمبروں کی تصدیق کرنا ضروری ہے جو واقعی خدا کی آیات سناتے ہیں۔ باقی جو شخص پیغمبری کا جھوٹا دعویٰ کرے اور جھوٹی آیات بنا کر خدا پر افتراء کرے یا کسی سچے پیغمبر کو اور اس کی لائی ہوئی آیات کو جھٹلاتے۔ ان دونوں سے زیادہ ظالم کوئی نہیں ہے[1] شیخ الاسلام کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ اس آیت میں جھوٹے پیغمبر اور سچے پیغمبر کی تکذیب کرنے والوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ الفاظ میں اس کی گنجائش ہے لیکن سیاق قرآنی سے مناسب یہ ہے کہ آیت میں ان کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جاتے۔ ایک وہ جو اللہ پر جھوٹا طوفان اٹھائیں اور اللہ نے جو بات نہ فرمائی ہو وہ اللہ کا نام لے کر پیش کریں۔ مثلاً عبادات کے نقشے خود بنائیں اور محرمات خود تجویز کریں۔ قانون خود بنائیں اور لوگوں کو بتائیں کہ یہ اللہ کا حکم ہے، دوسری یہ کہ خدا کا حکم نبوت کی وساطت سے اس کی زبان سے اور برائی میں کردار سے اس کی تکذیب کریں، اس کا مذاق کریں اس کے مقابلہ میں دوسرے قوانین کو ترجیح دیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب صورت حال یہ ہے کہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ انبیاء انسانی زندگی میں رہنمائی کے لیے خدا کا پیغام لے کر آتے ہیں تو اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو نبوت کی موجودگی میں حلال و حرام کے پیمانے خود بناتے اور جھوٹی کر کسی خدا کے نام پر چلاتے یا نبوت کی جانب سے خدا کے احکام سن کر ان کو گفتار و کردار کے ذریعے جھٹلاتے۔ اس معنے کے اعتبار سے آیت کی معنوی وسعتوں میں کفر، شرک اور بدعت سب آجاتے ہیں۔ افتراء علی اللہ یہی ہے کہ نبوت کی رہنمائی سے بے پروا ہو کر اپنے جی سے حلال و حرام ٹھہرانا، اپنی خواہشوں کی پیروی میں بدعتیں ایجاد کرنا۔ من مانے طور پر شریعتیں تصنیف کرنا اور ان ساری چیزوں کو خدا کی طرف منسوب کرنا کہ خدا نے ان کا حکم دیا ہے۔ بدعت کا سرچشمہ ہی دین میں افتراء علی اللہ کذبا ہے۔ اس لیے آیت کے مدلول میں وہ تمام بدعات رسوم جو دین کے نام پر قائم کی جائیں اور ان کا دین ہونا ثابت نہ ہو، داخل ہیں

[1] افادات شیخ الاسلام

ایسے دکذب بآیاتہ میں وہ تمام افکار و نظریات اور سارے نظام ہائے حیات جو نبوت کے نظریے اور نظام کے مقابلے میں اپنائے جائیں داخل ہیں۔

کتابِ الٰہی میں اس کے مخاطبوں کا حصہ

۴۱۔ ان ہی لوگوں کو کتاب میں سے اپنا حصہ ملے گا۔ یعنی دُنیا میں عمر، رزق وغیرہ جتنا مقدر ہے یا یہاں کی ذلت و رسوائی جو ان کے لیے لکھی ہے وہ پہنچے گی پھر مرنے کے وقت اور مرنے کے بعد جو گت بنے گی اس کا ذکر آگے آتا ہے اور اگر نصیبہم من الکتاب سے دُنیا کا نہیں عذاب اُخروی مراد لیا جائے تو حتٰی اذا جاءتھم سے اس پر تنبیہہ ہو گی کہ اس عذاب کے مبادی کا سلسلہ اسی دُنیا کے آخری لمحات میں شروع ہو جاتا ہے[1]

آیت میں لفظ کتاب سے مراد کیا ہے۔ حضرت امام مجاہد فرماتے ہیں کہ اس سے وحی الٰہی پر مشتمل وہ کتابیں ہیں جو انبیاء لے کر آتے رہے ہیں۔ اس بنا پر آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ کتابِ الٰہی میں ان لوگوں سے خیر و شر کا جو وعدہ بھی کیا گیا ہے وہ اس سے ضرور دوچار ہوں گے۔ اور عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ کتاب المقادیر ہے اور مطلب یہ ہے کہ جس کی تقدیر میں جو کچھ لکھا ہو گا وہ اسے مل کر رہے گا۔ چونکہ مقادیرِ الٰہی میں سب کچھ ہے اس لیے ہر ایک نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس کی تعیین فرمائی ہے۔ کسی نے خیر و شر، کسی نے سعادت و شقاوت، کسی نے رزق و عمل اور کسی نے عمر سے تعیین کی ہے۔ لیکن اگر الکتاب سے وحی الٰہی پر مشتمل کتاب مراد ہو اور اس کی تعیین قرآن سے کی جائے تو مطلب زیادہ واضح اور صاف ہو کر سامنے آجاتا ہے کہ جو لوگ اس دُنیا میں قرآن کی تکذیب کر رہے ہیں ان کے حصہ میں کتابِ الٰہی کی تکذیب آئی ہے اور ان کو اپنا یہ حصہ مل رہا ہے جیسا کہ دوسرے موقعہ پر فرمایا ہے۔

وتجعلون رزقکم انکم تکذبون

علامہ طیبی نے اس کی تشریح اس طرح فرمائی ہے کہ تم نے تکذیب کو اپنا حصہ بنا رکھا ہے۔ شاہ عبدالقادر کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن سے قرآن کی تکذیب کا حصہ تمہیں ضرور مل کر رہے گا باقی رہے اس کے نتائج تو اس کا پتہ اس وقت لگے گا جب موت کے فرشتے آئیں گے اور زندگی کے یہ انفاس اور فرصت کے یہ لمحات ختم ہو جائیں گے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

فیصلہ نتائج کریں گے

۳۷ - حتیٰ کہ جب وہ وقت آجائے گا کہ جب ہمارے فرستادے ان کی روحیں قبض کرنے کے لیے اُن کے پاس آئیں گے وہ اُن سے دریافت کریں گے بتاؤ کہ اب تمہارے معبود کہاں ہیں جن کو تم خدا کے سوا پکارتے تھے وہ جواب میں کہیں گے وہ تو ہم سے کھوئے گئے اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ فی الواقع کافر تھے۔ یعنی جب فرشتے نہایت سختی سے ان کی رُوح قبض کر کے بُرے حال سے لے جاتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ خدا کے سوا جن کو تم پکارتے تھے وہ کہاں گئے۔ جواب تمہارے کام نہیں آتے۔ انہیں بلاؤ تاکہ اس مصیبت سے تمہیں چھڑائیں۔ اس وقت کفار کو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ہم سخت غلطی میں پڑے تھے کہ ایسی چیزوں کو معبود و مستعان سمجھتے تھے جو اس کے مستحق نہ تھے۔ آج ہماری مصیبت میں ان کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ لیکن بے ناوقت کا اقرار وندامت کیا نفع دے سکتا ہے۔ حکم ہوگا کہ ادخلوا فی امم باقی بعض مواقع میں جو وارد ہوا ہے کہ وہ اپنے کفر و شرک سے انکار کریں گے۔ اس آیت کے منافی نہیں ہے کیونکہ قیامت میں مواقف اور احوال مختلف ہوں گے اور جماعتیں بھی بے شمار ہوں گی کہیں ایک موقف یا ایک جماعت کا ذکر ہے کہیں دوسری کا[1]

مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی میں نبوّت کے وقتاً فوقتاً ظہور کی خبر آغاز ہی میں اولادِ آدم کو دی گئی تھی اسی قانون کے مطابق حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔ ان کے مخاطبوں میں دو قسم کے آدمی ہیں۔ ایک وہ ہیں جو اپنے جی سے حرام و حلال کے پیمانے بنا رہے ہیں اور من مانے طور پر شریعت تصنیف کر رہے ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو پیغمبر کی پیش فرمودہ آیات کی تکذیب کر رہے ہیں۔ فیصلہ آنے والے نتائج کریں گے اور یہ اس وقت ہوگا جب موت کے فرشتے قبض روح کے لیے آئیں گے۔ احادیث صحیح میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مرنے کے بعد قبر میں فرشتے آتے ہیں اور وہ مردوں سے توحید، رسالت کے بارے میں سوال کریں گے۔ اس کی تصدیق قرآن پاک کی اس آیت سے ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سوال این ما کنتم تدعون من دون اللہ موت کے وقت میں ہوگا۔ مشرکین بتوں کی عبادت جو کرتے ہیں اصل مقصود ان ارواح کی عبادت ہوتی ہے جن کے یہ مجسمے ہوتے ہیں جو بت کہلاتے ہیں۔ کبھی سوال بتوں کے متعلق ہوگا اور کبھی ان شخصیتوں سے متعلق

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہوگا جن کے بت تراش کر ان کی عبادت کرتے تھے یہاں چونکہ بتوں سے متعلق سوال ہے اس لیے این ما کر
آتے یعنی کہاں ہے وہ چیز اور جب سوال شخصیتوں سے متعلق ہوگا تو پوچھا جائے گا این شرکاءکم
کنتم تزعمون کہاں ہیں تمہارے وہ شرکا جن کے بارے میں تم خیال کرتے تھے کہ یہ اللہ کے شریک
ہیں ؟ مطلب یہ ہے کہ وہ شرکا۔ کہاں ہیں جن کو دُنیا کی زندگی میں قضائے حاجات اور دفع بلیات کے
لیے دُور دور سے پکارتے تھے جن کے ناموں کی دہائی دیتے تھے اور جن سے قضاء حاجات کے لیے
درخواستیں کرتے تھے۔ ان کو بلاؤ پکارو کہ وہ تمہارے کام آئیں ۔ وہ جواب دیں گے ضلوا عنا،
وہ تو لاپتہ ہوگئے ہیں ان کا کہیں نام و نشان نہیں ہے۔ ہمیں ان کا کوئی پتہ نہیں ہے یہ ان کے اعتراف
کی تعبیر ہے اور وہ اپنے اس اعتراف سے اپنے کفر کی شہادت خود اپنی زبان سے دے رہے ہیں۔ یعنی بتا
رہے ہیں کہ واقعی ہم دُنیا میں ان کی عبادت کرتے تھے جو کسی درجہ میں بھی عبادت کے مستحق نہ تھے۔ اس
اقرار کے بعد اب مزید کسی گواہی کی ضرورت نہ ہوگی ۔

کند ہم جنس باہم جنس پرواز

۴۳ ۔ اللہ فرمائے گا جاؤ تم بھی جہنم میں جاؤ جس میں تم سے پہلے جن و انس جا چکے ہیں۔ یعنی آگے
پیچھے سب کفار کو جہنم ہی میں داخل ہونا ہے [1]

یہ وہ انجام بیان کیا جا رہا ہے جو ان لوگوں کے سامنے آئے گا جن کے اس دُنیا میں غیر اللہ سے عابدانہ
تعلقات تھے، قال کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے یا فرشتوں میں سے کوئی ایک ہے ایسے مواقع پر فاعل کا
ذکر نہ کرنا بے رُخی اور بے اعتنائی کی خاطر ہے ۔ یہاں دو ظرف آئے ہیں ۔ فی امم اور فی النار، پہلا
ظرف یہ بتا رہا ہے کہ تمہارے ساتھی کون لوگ ہوں گے فرمایا جاؤ ان لوگوں کے ساتھ رہو جو جنات اور انسانوں
میں سے تم سے پہلے تمہارے جیسے افکار اور کردار کے مالک تھے ۔ فی النار کے ذریعہ ان کے مستقر و مقام
کا پتہ دیا ہے کہ تم سب کا ٹھکانا دوزخ ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے ساتھی بھی بدترین ہیں اور
تمہارے رہنے کی جگہ بھی بدترین ہے ۔ جنوں کا ذکر پہلے اس لیے کیا ہے کہ ان شیاطین ہی سے اغوا اور
اضلال کا آغاز ہوا ہے وہ انسانوں اور جنوں دونوں کی گمراہی کا باعث بنے ہیں اس طرح گویا آگے پیچھے نئے
پرانے ہر قسم کے کافر جہنم میں جمع ہو جائیں گے ۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

گمراہ تابع و متبوع کی دوستی صرف یہاں ہے

۳۴ - ہر گروہ جب دوزخ میں داخل ہوگا تو اپنے پیش رو گروہ پر لعنت کرتا ہوا داخل ہوگا یعنی اس مصیبت میں باہم ہمدردی تو کیا ہوتی۔ دوزخی ایک دوسرے پر لعن طعن کریں گے۔ شاید اتباع اپنے سرداروں سے کہیں کہ تم پر خدا کی لعنت ہو تم اپنے ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبے ہوا اور سردار اتباع سے کہیں کہ ملعونو اگر ہم گڑھے میں گر پڑے تھے تو تم کیوں اندھے بن گئے وغیر ذالک [1]

مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن جب اصل حقیقت سامنے آئے گی تو تابع و متبوع ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے اور برا بھلا کہیں گے۔ یہ صورتِ حال اس وقت کی ہے جب تابعین اور متبوع بالکل آمنے سامنے ہوں گے یعنی جب کوئی جماعت دوزخ میں داخل ہوگی اور وہاں کی رسوائیاں اور ہولناکیاں دیکھے گی تو وہ ان لوگوں پر لعنت کے ڈونگرے برسائے گی جن کی پیروی و اقتداء میں کفر کی راہ پر گامزن ہوئی قرآن کے دوسرے موقعہ پر ہے :

ویوم القیامہ یکفر بعضکم ببعض ویلعن بعضکم بعضا۔

قیامت کے روز تم ایک دوسرے کو کافر کہو گے اور باہم ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے۔

اس تذکرے سے یہاں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبوں کو یہ بتانا ہے کہ جو لوگ دعوت کے اس دور میں اپنے زیردستوں کو یہ اطمینان دلا رہے ہیں کہ وہ ان کے طریقے پر چلتے رہیں۔ قیامت کے دن وہ ان کی طرف سے جواب دہی کر لیں گے۔ ان کو بتایا جا رہا ہے کہ اس روز اس قسم کے لیڈر اور اس قسم کے پیروکار سب ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے۔ دوستی و وفاداری کے سارے دعوے اسی وقت تک ہیں جب تک اصل حقیقت سے پردہ نہیں اٹھتا۔ پردہ اٹھتے ہی سب پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس طرح کے سارے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔ ان میں سے کوئی بھی کسی کے کام آنے والا نہیں ہے۔

ہم رنگی اور ہم خیالی، کردار میں ہم آہنگی اور اعمال و اخلاق میں یکسانی کی وجہ سے ایک جماعت کو دوسری جماعت کی بہن کہا ہے۔ قاضی ثناء اللہ نے یہ نکتہ آفرینی خوب فرمائی ہے کہ یہ گمراہوں کی باہم دنیوی اخوت ہے اور اشارہ ہے کہ گمراہی و ضلالت کی اساس پر بنا ہوا بھائی چارہ آخرت میں ایک دوسرے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لعنت کا سامان ہوگا۔ دُنیا میں تو یہ ایک دوسرے کے تابع اور متبوع لیڈر اور ساتھی بنے رہے۔ ایک دوسرے کے گن گاتے اور نعرے لگاتے تھے لیکن وہاں دوزخ میں آمنا سامنا ہوتے ہی باہم ایک دوسرے پر لعنت برسائیں گے۔ تابع متبوع سے کہیں گے کہ تم پر لعنت ہو تم نے ہمارا بیڑہ غرق کیا ہے اور وہ کہیں گے تم خود ہی بدبخت تھے تم خود ہمارے پیچھے چلے۔ اس میں ہمارا کیا قصور ہے[1]

پیروکاروں کا متفقہ مطالبہ

۴۵ ۔ تاآنکہ جب سب اس میں گر چکیں گے تو بعد والا گروہ پہلوں کے بارے میں کہے گا اے پروردگار ہماری گمراہی کا سبب یہی لوگ ہیں لہٰذا ان کو جہنم کا دُگنا عذاب دے۔ اللہ فرمائے گا سب کو دوگنا ہی عذاب ہوگا۔ لیکن تمہیں پتہ نہیں ہے یعنی ایک حساب سے پہلوں کا گناہ دُگنا کہ خود گمراہ ہوئے اور دوسرے آنے والوں کے لیے راہ ڈالی۔ اور ایک طرح سے پچھلوں کا دُگنا کہ خود بہکے اور پہلوں کا حال دیکھ کر عبرت حاصل نہ کی۔ یا چونکہ ہر دوزخی کا عذاب اپنے اپنے درجہ کے موافق وقتاً فوقتاً بڑھتا رہے گا اس لیے فرمایا کہ ہر ایک کا عذاب دُگنا ہوتا جائے گا۔ ابھی آغاز تعذیب ہے تمہیں انجام کی خبر نہیں ہے یعنی پہلوں کا عذاب دگنا کرنے سے تم پچھلوں کو کوئی شفا و راحت نصیب نہ ہوگی۔ یہ تقدیر اس صورت میں ہے کہ لکل ضعف سے دونوں فریق مراد ہوں لیکن ابن کثیر کے نزدیک اس آیت میں پچھلوں کو مطلع کیا گیا ہے کہ بے شک ہم نے پہلوں میں سے ہر ایک کے لیے اس کے درجہ کے موافق دگنا ہی عذاب رکھا ہے جیسا کہ دوسری جگہ خبر دی ہے الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ زدناھم عذابا فوق العذاب۔ نحل رکوع ۱۲، ولیحملن اثقالھم واثقالا مع اثقالھم عنکبوت رکوع ۱۔ ومن اوزار الذین یضلونھم بغیر علم نحل رکوع ۳[2]

اس آیت کی تفسیر میں چند باتیں تشریح طلب ہیں۔

اوّل یہ کہ اولیٰ اور اخریٰ سے کیا مراد ہے۔ کچھ کی رائے یہ ہے کہ اولیٰ سے وہ اُمتیں مراد ہیں جو زمانہ بعید میں گزر چکی ہیں اور اخریٰ سے وہ مراد ہیں جو ان کے بعد آئی ہیں۔ مولانا آزاد کا میلان اسی طرف ہے چنانچہ فرماتے ہیں اسی لیے پچھلی اُمتیں اپنے سے پہلی اُمتوں پر لعنت بھیجیں گی اور مولانا مودودی کا بھی خیال یہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

---

[1] تدبر قرآن [2] افادات شیخ الاسلام

یعنی بہرحال تم میں سے ہر گروہ کسی کا خلف تھا تو کسی کا سلف بھی تھا۔ اگر کسی گروہ کے اسلاف نے اس کے لیے فکر وعمل کی گمراہیوں کا ورثہ چھوڑا تھا تو وہ خود بھی اپنے اخلاف کے لیے ویسا ہی ورثہ چھوڑ کر دُنیا سے رخصت ہوا۔

اس صورت میں یہ آیت مختلف زمانوں میں ہونے والی اُمتوں کے عذاب کا نقشہ پیش کر رہی ہے۔ یعنی ۱۳۰۰ھ کے لوگوں نے کچھ افکار و اعمال غلط اختیار کیے ہیں تو ۱۴۰۰ھ میں جو لوگ ان غلط افکار و اعمال کو اپنے بزرگوں کا ورثہ سمجھ کر اختیار کریں گے تو دونوں کے لیے دوہرا عذاب ہوگا لیکن اس صورت میں مورث کے لیے تو دوہرا عذاب ہونے کی بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایک عذاب اپنے جرائم کی پاداش میں اور دوسرا عذاب دوسروں کے لیے جرائم کی میراث چھوڑ کر آنے کی پاداش میں۔ لیکن وارث کے لیے اس صورت میں ڈبل عذاب کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ اور خود ان بزرگوں نے بھی اس کی توضیح نہیں فرمائی ہے شاید اسی اُلجھن سے بچنے کے لیے عام شارحینِ قرآن نے اولیٰ سے متبوع اور اخریٰ سے تابع مراد لیا ہے یا اولیٰ سے طاقتور گروہ اور اخریٰ سے کمزور مراد لیا ہے۔ قرآن میں یہ بات کئی جگہ بیان ہوئی ہے۔ کہیں سرداروں، آقاؤں اور تابعداروں کے درمیان مکالمہ ہے کہیں طاقتوروں اور کمزوروں کے درمیان گفتگو پیش ہوئی ہے اور کہیں تابع اور متبوع کے درمیان چپقلش ہے۔ حوالہ کے لیے دیکھئے پارہ دوم اور پارہ ۲۲ سورہ سبا اور احزاب۔ ابن کثیر نے اخریٰ کی تفسیر تابعین سے اور اولیٰ کی متبوعین سے کی ہے۔ آلوسی، قرطبی نے بھی اسی کو اپنایا ہے۔ ان کی تشریح کی بنا پر آیت کا مدعا یہ ہے کہ ایک ہی زمانے میں گمراہی کو اپنانے والے تابع اور متبوع کی صورت میں ہوتے ہیں۔ ان کا انجام روزِ قیامت یہ ہوگا کہ عام شہری اپنے زعماء سے رعیت اپنے بادشاہوں سے مقتدی اپنے اماموں سے، مرید اپنے پیروں سے، شاگرد اپنے اساتذہ کو مخاطب کر کے جنابِ الٰہی میں درخواست کریں گے ربنا ھؤلاء اضلونا اے ہمارے رب ہماری دُنیا میں بے راہروی کا باعث یہی لوگ بنے ہیں ان کو ڈبل عذاب دیجئے ایک خود گمراہی اختیار کرنے، دوسرا ہمیں گمراہ کرنے کا۔ ارشاد ہوگا۔ لکل ضعف سب کو ہی ڈبل ہے لیکن تمہیں پتہ نہیں ہے۔ ان کو ڈبل اس لیے کہ خود گمراہ ہوتے اور تمہیں گمراہ کیا اور تمہیں ڈبل اس لیے کہ خود گمراہ ہوتے اور گمراہوں کی پیروی کی۔ ان کی پیروی کرنا تمہارے اختیار تمیزی اور صوابدید سے ہوا۔ لکل ضعف کے ایک معنے یہ ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو جتنا تمہیں عذاب ہے اس سے دگنا ہے اور یہ معنے بھی بیان کیے گئے ہیں کہ ان میں سے اور تم میں سے ہر ایک کو اس سے دُگنا عذاب ہے جتنا کہ تم میں سے ایک دوسرے کو نظر آرہا ہے۔ کیونکہ عذاب کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور ہر ایک

دوسرے کے ظاہر کا تو ادراک کر لیتا ہے باطن کا نہیں کرتا اس لیے وہ دل میں یہ سمجھتا ہے کہ اس کو باطنی یا عذاب نہیں ہے۔ قاضی ثناء اللہ نے یہ لطیف مطلب بتایا ہے کہ تم میں سے ہر ایک کو اس کی گمراہی کے مطابق دوگنا عذاب ہوگا۔ رہنماؤں کو کفر اور کفر کی قیادت کی وجہ سے اور پیروکاروں کو کفر اور کفر میں اپنے رہنماؤں کی پیروی کی وجہ سے۔ گویا عذاب میں سب مبتلا ہیں لیکن عذاب کی کمیت و کیفیت کا ایک دوسرے کو پتہ نہیں ہے۔

متبوعین کا تابعین کو جواب

۳۹۔ اور پہلا گروہ دوسرے گروہ سے کہے گا کہ اس فیصلہ خداوندی کے بعد اب تمہیں ہم پر کوئی فوقیت نہیں ہے لہٰذا سب اپنی کمائی کے بدلے عذاب کے مزے چکھو۔ یعنی ہماری سزا میں تضعیف کا مطالبہ کرکے تمہیں کیا مل گیا؟ کیا تمہارے عذاب میں کچھ تخفیف ہو گئی، نہیں تمہیں بھی اپنی کرتوت کا مزہ چکھنا ہوگا[1] رہنماؤں کی جانب سے پیروکاروں کو جواب ہے کہ اگر صورتِ حال وہی ہے جو تم نے بتائی ہے کہ ہم نے تم کو گمراہ کیا ہے تو ہم پر تمہیں کوئی فوقیت نہیں ہے جس کی بنیاد پر تم ہمارے لیے ڈبل عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو۔ گناہ تو دونوں کا ایک ہے اور اس کا تمہیں اقرار بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم خود کب ہدایت کے طالب تھے؟ اگر ہم نے تمہیں دُنیا کا لالچ دے کر اپنا بندہ بنایا تو تم لالچی تھے جب ہی تو ہمارے دام میں گرفتار ہوئے۔ اگر ہم نے تمہیں خریدا تو تم خود بکنے کے لیے تیار تھے۔ جب ہی تو ہم خرید سکے۔ اگر ہم نے تمہیں مادہ پرستی، دُنیا پرستی، قوم پرستی اور ایسی ہی دوسری گمراہیوں اور بداعمالیوں میں مبتلا کیا تو تم خود خدا سے بیزار اور دُنیا کے پرستار تھے جب ہی تو تم نے خدا پرستی کی طرف بلانے والوں کو چھوڑ کر ہماری پکار پر لبیک کہی۔ اگر ہم نے تمہیں مذہبی قسم کے فریب دیے تو ان چیزوں کی مانگ تو تمہارے اندر ہی موجود تھی جنہیں ہم پیش کرتے تھے اور تم لپک لپک کر لیتے تھے تم خدا کے بجائے ایسے حاجت روا مانگتے تھے جو تم سے کسی اخلاقی قانون کی پابندی کا مطالبہ نہ کریں اور صرف تمہارے کام بناتے رہیں۔ ہم نے وہ حاجت روا تمہیں گھڑ گھڑ کر دے دیے تھے۔ تم کو ایسے سفارشیوں کی تلاش تھی کہ تم سے بے پروا ہو کر دُنیا کے کتے بنے رہو اور بخشوانے کا ذمہ وہ لے لیں ہم نے وہ سفارشی تصنیف کرکے تمہیں فراہم کر دیے۔ تم چاہتے تھے کہ خشک اور بے مزہ دینداری اور

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

پرہیزگاری اور قربانی اور سعی و عمل کے بغیر نجات کا کوئی اور راستہ بتایا جائے جس میں نفس کے لیے لذتیں ہی لذتیں ہوں اور خواہشات پر کوئی پابندی نہ ہو۔ ہم نے ایسے خوشنما مذاہب تمہارے لیے ایجاد کیے غرض یہ کہ ذمہ داری تنہا ہم پر نہیں ہے تم بھی برابر کے ذمہ دار ہو ہم اگر گمراہی فراہم کرنے والے ہوں تو تم اس کے خریدار تھے [1]

---

[1] تفہیم القرآن

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ
السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ
الْخِيَاطِ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ﴿٤٠﴾ لَهُمْ مِنْ جَهَنَّمَ
مِهَادٌ وَمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿٤١﴾
وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا
وُسْعَهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٤٢﴾ وَ
نَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ ۖ
وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ
لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ ۖ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۖ وَ
نُودُوا أَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٤٣﴾

یقیناً جن لوگوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور ان کے مقابلے
۴۷
میں اکڑ گئے ان کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے

اُن کا جنت میں داخل ہونا ایسا ہی محال ہے جیسے سوئی کے ناکہ میں سے اُونٹ کا گزر جانا[48]۔ اور جرم پیشہ لوگوں کو ہم ایسا ہی بدلہ دیں گے[49]۔ ان کے لیے دوزخ کا بچھونا ہے اور اسی کا اوڑھنا ہے اور ظلم پیشہ لوگوں کو ہم ایسے ہی جزا دیں گے[50]۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے اچھے کام کیے، ہم کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے یہی لوگ جنتی ہیں اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے[51] اور ان کے دلوں میں جو کچھ خفگی ہوگی اسے ہم نکال دیں گے ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی[52]۔ اور وہ کہیں گے اس اللہ ہی کی تعریف ہے جس نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا، ہم خود راہ یاب نہ ہوتے اگر اللہ ہماری رہنمائی نہ کرتا، ہمارے رب کے فرستادے واقعی حق لے کر آئے تھے[53]۔ اور ان کو پکارا جائے گا کہ یہی وہ جنت ہے جس کا تمہیں تمہارے اعمال کی وجہ سے وارث بنایا گیا ہے[54]۔

معانی مفردات

سم الخیاط، سوئی کا ناکہ، سم تنگ سوراخ کو کہتے ہیں جیسے سوئی کا ناکہ یا ناک اور کان میں جو چھید کیا جاتا ہے۔ اور سم زہر کو کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے لطف تاثیر سے بدن کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور سموم تیز گرم ہوا کو کہتے ہیں جو زہر کا اثر رکھتی ہے۔ خیاط کے معنے سوئی کے۔ مھاد، مہد سے بنا ہے اس کے معنے بچھانے کی چیز کے آتے ہیں۔ بستر میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک بچھونا اور دوسرا اوپر لینے والی چیز جیسے لحاف، غواش، غاشیہ کی جمع ہے۔ ڈھانکنے والی چیز اس مصیبت کو بھی غاشیہ کہتے ہیں جو حواس پر پردہ ڈال دے اور قیامت کو بھی غاشیہ کہتے ہیں اس سے مراد لحاف ہیں۔ نکلف، مصدر تکلیف سے بنا ہے ہم حکم کا بار ڈالتے ہیں، ہم ذمہ دار بناتے ہیں۔ وسع، اس کے اصلی معنے سمائی کے ہیں اسی سے وسع ماضی ہے باب سمع سے۔ نزعنا، نزع سے بنا ہے جس کے معنے نکالنے اور کھینچنے کے ہیں۔ غل کے معنے کینہ اور عداوت کے ہیں۔

دوزخ میں دوزخیوں اور جنت میں جنتیوں کا چہرہ

یہ مادی و جسمانی دُنیا علت و معلول اور عمل و ردعمل کے جس اصُول پر مبنی ہے۔ اس کی وسعت کے دائرے میں انسان کا ہر قول اور ہر عمل شامل اور داخل ہے۔ یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام عقاب اور اعمال صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب رکھا گیا ہے۔ قرآن نے ان ہی دونوں اصطلاحوں کو بار بار استعمال کیا ہے۔ عقاب کا لفظ عقب سے نکلا ہے جس کے معنے پیچھے آنے کے ہیں اس لیے عقاب اس اثر کا نام ہے جو فعل کے کرنے کے بعد لازم آجاتا ہے اور ثواب کا لفظ ثوب سے بنا ہے جس کے معنے لوٹنے کے ہیں اس لیے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے نتیجہ اور جزاء کے معنے میں بولا گیا ہے۔

اسی ایک بات کو اگر سمجھ لیا جائے تو ہر صاحب عقل تسلیم کرے گا کہ صحیح اور مکمل انصاف اگر ہو سکتا ہے تو اس کی صورت صرف وہی ہے جو قرآن ان آیات میں پیش کر رہا ہے اور یہیں سے

ان لوگوں کی غلط فہمیاں بھی دُور ہو سکتی ہیں جنہوں نے جزا کے لیے اسی دُنیا کی موجودہ زندگی کو کافی سمجھ لیا ہے اور ان لوگوں کی غلط فہمیاں بھی جو یہ گمان کرتے ہیں کہ انسان کو اس کے اعمال کی پوری جزاء تناسخ کی صورت میں مل سکتی ہے دراصل ان دونوں گروہوں نے نہ تو انسان کے اعمال اور ان کے اثرات و نتائج کی وسعتوں کو سمجھا ہے اور نہ منصفانہ جزا اور اس کے تقاضوں کو۔

قرآن نے بتایا ہے کہ جس طرح اس دُنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے اور وہ جب جہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں۔ جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ غرور اور خاکساری، بخل اور فیاضی، انتقام اور عفو، شجاعت اور بزدلی، تقویٰ اور فسق، ایمان اور کفر ہر ایک کا ایک نہ ایک اثر ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص و لوازم ہیں جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے، جس طرح سنکھیا سے سمیت شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی۔ اور ان معنوی، روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی مادی اور طبیعیاتی اشیا میں ہے۔

۴۷۔ یقین مانو جن لوگوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور ان کے مقابلے میں اکڑ گئے ان کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے۔ یعنی نہ زندگی میں ان کے اعمال کے لیے آسمانی قبول و رفعت حاصل ہے نہ موت کے بعد ان کی ارواح کو آسمان پر چڑھنے کی اجازت ہے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ بعد موت کافر کی روح کو آسمان کی جانب سے سجین کی طرف دھکے دیے جاتے ہیں اور مومن کی روح ساتویں آسمان تک صعود کرتی ہے۔ مفصل احوال کتب احادیث میں دیکھئے لے مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے دُنیا کی زندگی میں رہ کر نبوت کی راہ سے آتی ہوئی ہماری آیات اور ہمارے قوانین کی تکذیب کی اور صرف تکذیب نہیں کی بلکہ اس کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کر کے ان کا مقابلہ کیا ان کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے۔ دروازہ کھولنے کی تعبیر میں مفسرین قرآن نے دو تشریحیں پیش کی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے اعمال کو قطعاً شرف پذیرائی نہ ملے گا۔ اور عبداللہ بن عباس نے اسے اور زیادہ وسعت دے کر فرمایا ہے کہ ان کا کوئی عمل اور ان کی کوئی نیکی قبول نہ ہوگی۔ حضرت مجاہد اور سعید بن المسیب نے بھی اس تشریح کی تائید فرمائی ہے۔ دوسری تشریح یہ ہے کہ موت کے بعد ان کی روحوں کو آسمان میں باریابی حاصل نہ ہو گی۔ یہ بھی بحوالہ سدی عبداللہ بن عباس سے

لے افادات شیخ الاسلام

منقول ہے گویا اہلِ ایمان کے مقابلہ میں ان کو طنز کیا ہے کہ مومنین کی ارواح کے لیے تو آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے لیکن کافروں کی روحوں کو یہ شرف نہ ملے گا۔ مطلب یہ ہے کہ کافروں کا اہل ایمان کی طرح خیر مقدم نہیں ہوگا بلکہ وہ نہایت ذلت و فضیحت کے ساتھ اپنا انجام بد دیکھنے کے لیے مجرموں اور بدمعاشوں کی طرح لائے جائیں گے۔ حضرت شیخ الاسلام نے اپنے فوائد میں حافظ ابن جریر کی اتباع میں دونوں تشریحات کو اپنا لیا ہے یعنی نہ ان کی ارواح کو آسمان تک باریابی ہوگی اور نہ ان کے اعمال کو شرفِ پذیرائی ملے گا۔ اعمال کی عدم قبولیت اور ارواح کا باریاب نہ ہونا دونوں کی اس فقرہ میں گنجائش ہے۔ لیکن دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ پہلی بات قرآن کا منطوق ہے اور دوسری بات اس کا مدلول ہے۔ اور اس مدلول ہی کی احادیث میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریح فرمائی ہے۔ ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور مسند امام احمد میں براء بن عازب کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مفصل ارشاد گرامی آیا ہے جس میں آپ نے کافر و مومن کی ارواح کو قبض کرنے کے بعد فرشتوں کے ان سے سلوک کی تصویر پیش فرمائی ہے اور اسی میں آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی ہے۔

یہاں علامہ شہاب خفاجی نے حاشیہ انوار التنزیل قاضی بیضاوی میں یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ آسمانوں کے لیے دروازوں کا ہونا، اچھی اور نیک دعاؤں کے لیے ان کا کھلنا، اعمال صالحہ کا آسمانوں کی جانب چڑھنا اور ارواح کے لیے آسمانی دروازوں کا کھلنا، قرآنی نصوص اور ارشاداتِ نبوی میں صراحۃً آیا ہے اس میں تاویل کی چنداں حاجت نہیں ہے۔ پتہ نہیں صاحبِ تدبر قرآن کو یہاں اس تاویل کی کیوں ضرورت پیش آئی ہے۔

"قاعدہ ہے کہ جن کا اعزاز و اکرام مقصود ہوتا ہے ان کے لیے نہایت اہتمام سے پھاٹک کھولے جاتے ہیں۔ پھاٹک پر ان کے خیر مقدم کے لیے دو رویہ کھڑے ہوتے ہیں وہ اھلاً و سھلاً و مرحباً سلام و تحیت کے نعروں سے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں برعکس اس کے جن کی تذلیل مد نظر ہوتی ہے وہ قیدیوں کی طرح جیل کے پھاٹک کی کھڑکی سے اس کے اندر ٹھونس دیے جاتے ہیں گویا لاتفتح لھم ابواب السماء سے مقصود نفس فعل کی نفی نہیں بلکہ اس کے لیے لازم کی نفی ہے جس کی مثالیں کلامِ عرب میں بہت ملتی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دروازے کی تعبیر واقعاتی نہیں بلکہ فرضی ہے لیکن قرآن و سنت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آسمان کے لیے دروازے کی تعبیر واقعاتی ہے جیسا کہ آپ الخفاجی کی زبانی سن آئے ہیں۔

ان کا جنت میں داخلہ محال ہے

۴۰ - ان کا جنت میں داخل ہونا ایسا ہی محال ہے جیسے سوئی کے ناکے میں سے اونٹ کا گزر جانا۔ یہ تعلیق بالمحال کے طور پر فرمایا۔ ہر زبان کے محاورات میں ایسی امثال موجود ہیں جن میں کسی چیز کے محال ہونے کی دوسری محال چیز پر معلق کر کے ظاہر کرتے ہیں یعنی جس طرح یہ ناممکن ہے کہ اونٹ اپنی کلانی اور جسامت پر رہے اور سوئی کا ناکہ ایسا ہی تنگ اور چھوٹا ہو۔ اس کے باوجود اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو جائے۔ اسی طرح ان مکذبین و مستکبرین کا جنت میں داخل ہونا محال ہے کیونکہ حق تعالیٰ جہنم میں ان کے خلود کی خبر دے چکا ہے اور علم الٰہی میں یہی سزا ان کے لیے ٹھہر چکی ہے۔ پھر خدا کے علم اور اخبار کے خلاف کیسے وقوع میں آ سکتا ہے[1]

شیخ الاسلام نے مکذبین اور مستکبرین پر جنت کا دروازہ بند ہونے کی جو وجہ بتائی ہے وہ بلا ریب درست ہے کہ علم الٰہی میں یہی سزا ان کے لیے مقرر ہو چکی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ علم الٰہی میں مقرر ہونے کی وجہ کیا ہے۔

آج کل علم نفسیات نے اس مسئلہ کو بداہتہً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لیے قلبی اصلاح مقدم ہے اور انسان کے دل اور ارادے پر اگر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے۔ صحیح اور صالح عمل کے لیے ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائیں اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدے کے تحت ہم اپنے تمام کام انجام دیں۔ قرآن عزیز نے ایمان کا ذکر ہمیشہ عمل صالح سے پہلے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا ہے کیونکہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادے اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے جس پر حسنِ عمل کا دار و مدار ہے۔

قرآن نے ان لوگوں کے کاموں کی مثال جو ایمان سے تہی دامن ہوں اس راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں اور ان کا کوئی وجود نہیں رہتا۔ اسی طرح اس شخص کے کام بھی جو اس ایمان سے محروم ہے بے بنیاد اور بے اصل ہے۔ الغرض ایمان تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر عمل بے بنیاد ہے۔

بعض کم فہم لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان گناہ تو تھوڑا عرصہ کرتا ہے پھر اس کی سزا خلود فی النار کیوں رکھی گئی ہے۔ یہ لوگ اگر دنیاوی واقعات پر غور کریں تو وہ ہی ان کی تسکین کے لیے کافی ہیں۔ دنیا کا ہر بڑے

[1] افادات شیخ الاسلام

سے بڑا قانونی گناہ ایک لمحہ میں انجام پاتا ہے۔ چوری کا عمل ہو یا قتل کا جرم ہو اس کے کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے مگر اس کے معاوضہ میں سالہا سال کی قید ہم خود انسانی عدالتوں میں تجویز کرتے ہیں اور اس کے خلاف عقل ہونے کا ہمیں وسوسہ بھی نہیں آتا۔

اس سے زیادہ واضح مثال یہ ہے کہ ذراسی جسمانی بد پرہیزی اور اصولِ صحت کی معمولی غلطی کی پاداش میں وہ کبھی ہفتوں مہینوں سالہا سال تک بیمار رہتا ہے اور ایک مدت دراز میں ان غلطیوں کی تلافی کرپاتا ہے اور کبھی اس معمولی غلطی کی بدولت عمر بھر اس کے روگ میں مبتلا رہتا ہے اور آخر میں جان دے دیتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اور اس کی تلافی کی مدت میں یکسانی نہیں ہوتی ہے بلکہ ہمیشہ غلطی کی مدت کے مقابلے میں اس کی تلافی کی مدت صدہا اور ہزار ہا گنہ زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآن میں تصریح ہے کہ شرک و کفر کا گناہ کبھی معاف نہ ہو گا یعنی اس کے اخروی نتائج کی پاداش دائمی ہے۔

جرائم پیشہ لوگوں کو سزا

۴۹- اور جرم پیشہ لوگوں کو ہم اسی طرح بدلہ دیں گے۔ یعنی جیسے ہم نے تکذیب و استکبار کے جرم کرنے والوں کی سزا بیان کی ہے۔ ایسے ہی ہم جرائم پیشہ لوگوں کو سزا دیں گے۔ مجرمین کی تعبیر بتا رہی ہے کہ ان لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ جرائم جن کی صفت ہو۔ بحالتِ ایمان اکا دکا گناہ کی یہ سزا نہیں ہے۔ مومن اگر جرم کرتا ہے تو وہ اپنے ایمان کے تقاضے کے تحت طلبِ مغفرت کرتا ہے۔ اور مغفرت سے گناہ دھل جاتے ہیں۔ قرآن میں مجرمین کی تعبیر چھوٹے موٹے گناہوں کے لیے نہیں بلکہ سنگین گناہوں کے لیے آتی ہے اور ایسے تمام اعمال پر بولا جاتا ہے جس سے انسانی زندگی کا امن و سلام تباہ ہو جاتے اور انسانی زندگی کے لیے نقصان رساں ہو اسی لیے اس قسم کے لوگوں کو جو جرائم کی قیادت کرتے ہوں۔ قرآن میں اکابر مجرمین کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تکذیب و استکبار کرنے والوں کو جو ہم نے یہ سزا دی ہے کہ جنت میں داخل ہونا محال بنا دیا وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ مجرم ہیں اور مجرموں کی سزا کے بارے میں ہمارا قانون یہی ہے اور جرم یہ ہے کہ احکامِ خداوندی کی تکذیب کی۔ منشا یہ ہے کہ ان کی تکذیب اور تکبر نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان پر جنت کا دروازہ بند کر دیا اور عذاب محیط کو ان پر اس طرح مسلط کر دیا۔

عذابِ دوزخ کی ہمہ گیری

۵۰- ان کے لیے دوزخ کا بچھونا ہے اور اسی کا اوڑھنا ہے اور ظلم پیشہ لوگوں کو ہم ایسی ہی

جزا دیں گے یعنی ہر طرف سے آگ محیط ہوگی کسی کروٹ چین نہ ملے گا[1] مہاد ایسا ہی اسم ہے جیسے لفظ امام اس کے معنے بچھونا ہیں۔ مہد گھوارے کو کہتے ہیں۔ اسی سے تمہید ہے بچھانا کام کو ہموار کرنا اور غواش غاشیہ کی جمع ہے۔ اصل میں غواشی تھا۔ مراد آگ کے پردے ہر طرف سے ڈھانک لینے والی آگ۔ یعنی جہنم میں بستر بھی آگ کا ہوگا اور لحاف بھی آگ ہی کا ہوگا اور مطلب یہ ہے کہ ہر طرف سے ان کو آگ گھیرے ہوگی کسی پہلو ان کو چین نصیب نہ ہوگا۔ پہلی آیت میں مکذبین اور مستکبرین کے لیے جنت سے محرومی کا ذکر تھا اس آیت میں ان کے لیے جہنم میں عذاب بیان ہو رہا ہے جنت سے محرومی کو بیان کرنے کے بعد ان کو مجرم فرمایا اور جہنم کے عذاب کے سلسلے میں ان کا چہرہ ظالم کہہ کر پیش کیا۔ اس میں اشارہ ہے کہ نبوت کی تکذیب کرنے والے اور نبوت کا مقابلہ کرنے والے مجرم بھی ہوتے ہیں اور ظالم بھی ہوتے ہیں۔ اور جرائم اور ظلم کفر ایسے اوصاف ہیں اہلِ ایمان ان سے موصوف نہیں ہوتے۔

نیز اس آیت کی تعبیر سے یہ بھی اشارہ معلوم ہو رہا ہے کہ مکذبین و مستکبرین کو جہنم میں عذاب دائمی ہوگا جملہ اسمیہ کی تعبیر اسی دوام کو بتانے کے لیے لائی گئی۔ جمہور اہلِ سنت کا مذہب یہی ہے کہ جنت کی آسائش کی طرح دوزخ کا عذاب بھی دائمی ہے اور ان لوگوں کو جو شرک و کفر اور تکذیب کے مرتکب ہوں گے کبھی دوزخ سے نجات نہ ملے گی۔ گنہ گاروں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو گنہ گار ہیں مگر دل میں ایمان رکھتے ہیں ایسے لوگ عذاب کے بغیر یا عذاب کے بعد اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم سے سرفراز ہوں گے۔ دوسرے وہ جو ہمیشہ تکذیب نبوت اور شرک و کفر میں مبتلا رہے۔ اس سے توبہ کیے اور ایمان لاتے بغیر مر گئے۔ ایسے لوگوں کی بخشش کبھی نہ ہوگی وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں داخل کیے جائیں گے۔ ان کی گنہ گاری اس درجہ کی ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنی طرف کسی طرح جذب نہ کر سکیں گے۔ یہ وہ زمین شور ہوں گے جس میں اس رحمت عام کی بارش بھی کوئی روئیدگی پیدا نہ کر سکے گی۔

جنت میں اہلِ ایمان کا مقام

۵۱۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے اچھے کام کیے، ہم کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ نہیں ڈالتے ہیں یہی لوگ جنتی ہیں، جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ لا نکلف نفساً الا وسعھا جملہ معترضہ ہے جس سے درمیان میں متنبہ فرما دیا کہ ایمان و عمل صالح جس پر اتنا عظیم الشان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

صلہ مرحمت ہوتا ہے کوئی ایسی مشکل چیز نہیں جو انسان کی طاقت سے باہر ہو یا یہ مطلب ہے کہ ہر آدمی سے عمل صالح اسی قدر مطلوب ہے جتنا اس کی مقدرت اور طاقت میں ہو۔ اس سے زائد کا مطالبہ نہیں کیا جارہا[1]

چونکہ اس آیت میں یہ بات کھول کر بتاتی ہے کہ مدارِ نجات صرف ایمان اور عمل صالح ہے اور بس۔ کوئی نسب کوئی نسبت وغیرہ پر نجات نہیں ہے اس لیے درمیان میں بطور جملہ معترضہ واضح کردیا، کہ قانونِ الٰہی میں جس چیز کو مدارِ نجات قرار دیا گیا ہے اور جس کا انسان کو ذمہ دار بنایا گیا ہے ۔ یہ ذمہ داری ایسی نہیں جسے انسان اٹھا نہ سکے بلکہ یہ ایک چیز ہے جسے اٹھالینا ہر شخص کے بس میں ہے۔ اور منشا یہ ہے کہ ایمان و عمل کی یہ ذمہ داری جو انسانوں پر ڈالی گئی ہے ۔ ہے تو ایک بھاری ذمہ داری لیکن اس کے بھاری ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی عنایت و رحمت کا یہ پہلو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ بندوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر شخص بس اسی حد تک مکلف ہے جس حد تک اسے طاقت عطا ہوئی ہے جو چیز اس کے حدود و اختیار سے باہر ہے اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ شریعت نے خود اپنے احکام و قوانین میں اس امر کو ملحوظ رکھا ہے اور مجبوریوں کی صورت میں اس پہلو سے بندوں کو رخصت دی ہے۔ اس وجہ سے نہ تو اللہ کو یہ پسند ہے کہ بندے اپنے آپ کو کسی تکلیف مالایطاق میں ڈالیں اور نہ کسی دوسرے کے لیے یہ جائز ہے کہ ان پر کوئی ایسا بوجھ ڈالے جسے وہ اٹھا نہ سکتے ہوں۔

باہمی کدورتوں سے پاک دل

۵۲ ۔ اور ان کے دلوں میں جو کچھ خفگی ہوگی اسے ہم نکال دیں گے ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔
نزعنا ما فی صدورھم من غل سے مراد یا تو یہ ہے کہ باہم جنتیوں میں نعماتے جنت سے متعلق کسی طرح کا رشک و حسد نہ ہوگا۔ ہر ایک اپنے کو اور دوسرے بھائی کو جس مقام میں ہے دیکھ کر خوش ہوگا بخلاف دوزخیوں کے کہ وہ مصیبت کے وقت ایک دوسرے کو لعن وطعن کریں گے جیسا کہ پہلے گزرا۔ اور یا یہ مراد ہے کہ صالحین کے درمیان جو دُنیا میں کسی بات پر خفگی ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے کی طرف سے انقباض پیش آتا ہے وہ سب جنت میں داخل ہونے سے پیشتر دلوں سے نکال دیا جائے گا وہاں ایک دوسرے سے سلیم الصدر ہوں گے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ مجھے اُمید ہے کہ میں اور عثمان و طلحہ، زبیر رضی اللہ عنہم ان ہی لوگوں میں سے ہوں گے[2]

---

[1] [2] افادات شیخ الاسلام

دونوں صورتوں کا حاصل یہ ہے کہ یہ بات جنتیوں کو جنت میں حاصل ہوگی کہ جنت کی نعمتوں کے بارے میں باہم کوئی چشمک نہ ہوگی اور یا یہ کہ دُنیا میں اگر کوئی ہوتی جنت میں پہنچنے کے بعد وہ نہ رہے گی۔ ان دونوں صورتوں میں نزعنا صیغہ ماضی کو مضارع کے معنے میں لینا پڑے گا۔ آیتِ قرآنی میں صیغہ ماضی استعمال ہوا ہے اور معنے یہ ہیں کہ جو لوگ ایمان و عمل صالح کی نعمت سے اس دُنیا میں مالا مال ہوتے ہیں ہم نے ان کے دلوں میں سے جو کچھ کدورت تھی نکال دی۔ اور مضارع کے معنے یہ ہیں کہ ہم نکال دیں گے۔ اس لیے کچھ شارحین قرآن نے اسے ماضی کے معنے میں رکھ کر یہ مطلب بتایا ہے کہ ہم نے ایمان و عمل صالح والوں کے دلوں سے دُنیا ہی میں کینہ اور بغض باہمی نکال دیا ہے۔ یعنی انہوں نے غل و غش، کینہ و عداوت سے پاک زندگی گزاری ہے اور ان کے دل بغض و عناد کی کدورتوں سے پاک ہوگئے کیونکہ ایمان و عمل کی پاکی کے ساتھ کینہ و عناد کی آلودگی جمع نہیں ہوسکتی۔ علامہ آلوسی نے سچ فرمایا کہ اس کا مصداق صحابہ جیسے کامل الایمان حضرات ہیں کیونکہ یہی رحماء بینہم ہیں۔ لیکن اس صورت میں آیت اپنے مصداق کے لحاظ سے بہت محدود ہوکر رہ جائے گی۔ اور یہاں قرآن کی یہ آیت ہمارے سامنے یہ بات پیش کر رہی ہے کہ موجودہ دُنیا خیر و شر کے متضاد عناصر سے بنی ہے۔ یہاں ثواب کے ساتھ گناہ رحم کے ساتھ سنگدلی محبت کے ساتھ کینہ ہے یہ گناہ کینہ و بغض وہ آگ ہے جس نے یہاں کے قلبی امن و اماں کے خرمن میں آگ لگادی ہے ہر شخص یہاں دوسرے کی اچھی حالت کو دیکھ کر جلتا ہے اور دوسروں پر غصہ کے جوش و خروش سے ابلتا ہے۔

جنت وہ عالم ہے جہاں اس آگ اور سیلاب کا وجود نہ ہوگا ہر قسم کے گناہ سنگدلی، عداوت اور بغض اور حسد کا خاتمہ ہوگا اور خالص محبت و الفت کے دریا موجزن ہوں گے۔ حدیث صحیح ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہاں نہ دلوں کا اختلاف ہوگا نہ باہم بغض و کینہ سب کے دل ایک دل کی طرح متحد ہوں گے (صحیح مسلم) مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان جنت میں ایک دوسرے سے بڑے تپاک اور محبت سے ملیں گے۔ ایک دوسرے کا خیر مقدم کریں گے۔ آمنے سامنے بیٹھ کر باہم تبادلہ محبت و مہر کریں گے جیسا کہ قرآن میں علی سرر متقابلین سے معلوم ہو رہا ہے۔ قرآن نے یہاں نزعنا ما فی صدورہم من غل سے اہلِ جنت کی اسی حالت کا اظہار کیا ہے اور یہ بات ٹھیک دوزخیوں کی اس حالت کے مقابلے میں آئی ہے کہ وہ دوزخ میں ایک دوسرے پر لعنتیں برسائیں گے۔

ہاں اس آیت سے ہم یہ نتیجہ ضرور نکال سکتے ہیں کہ صالح انسانوں کے دامن پر اس دنیا کی زندگی میں جو داغ لگ جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان داغوں سمیت ان کو جنت میں نہ لے جائے گا بلکہ وہاں داخل کرنے سے پہلے اپنے فضل سے انہیں بالکل صاف کردے گا۔

ایسا کیوں کر ہو گا۔ ابن جریر نے السدی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ جب اہل جنت جنت کی طرف روانہ ہوں گے تو ان کو جنت کے دروازے پر ایک درخت ملے گا۔ درخت کی جڑ سے دو چشمے ابل رہے ہوں گے۔ ایک چشمہ کا پانی پئیں گے تو جس دل میں جو غل ہو گا وہ سب صاف ہو جائے گا۔ یہ شراب طہور ہے۔ اور دوسرے چشمہ سے غسل کریں گے تو جنت کی مہک والی ہوا آئے گی تو اس کے بعد ان پر کبھی میل وغیرہ نہ آئے گا۔ اللھم اجعلنی منھم، آمین۔

جنت محض فضل خداوندی ہے

۵۳۔ اور وہ کہیں گے اس اللہ کی تعریف ہے جس نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ہم خود راہ یاب نہ ہوتے اگر اللہ ہماری رہنمائی نہ کرتا۔ ہمارے رب کے فرستادے واقعی حق لے کر آئے تھے۔ یعنی خدا کی توفیق دستگیری اور رسولوں کی رہنمائی سے اس اعلیٰ مقام پر پہنچنا نصیب ہوا ورنہ ہم کہاں اور یہ مرتبہ بلند کہاں[1]۔ اہل جنت اس بات پر نہ پھولیں گے کہ ہم نے کام ہی ایسے کیے تھے جن پر ہمیں جنت ملنی چاہیے تھی بلکہ وہ خدا کی حمد و ثنا اور شکر و احسان مندی میں رطب اللسان ہوں گے اور یہ سب ہمارے رب کا فضل ہے ورنہ ہم کس لائق تھے۔ یہی اعتراف اس زندگی میں بھی صحابہ سے منقول ہے۔

واللہ لولا اللہ ما اھتدینا، ولا تصدقنا ولا صلینا فانزلن سکینۃ علینا، ونحن عن فضلک ما استغنینا،

بخدا اگر خدا نہ ہوتا تو ہم ہدایت یافتہ ہوتے نہ خیرات کرتے اور نہ نماز پڑھتے، خداوندا تو ہم پر سکون و اطمینان کی نعمت نازل فرما، ہم تیرے فضل سے کسی حال میں بھی بے نیاز نہیں ہیں۔

انداز بیان کہہ رہا ہے کہ یہ وہ شکر ہے جو کسی طویل اور مشکل سفر کے بعد منزل مقصود پر پہنچنے والا مسافر ادا کرتا ہے ھدانا لھذا میں اللہ تعالیٰ کی اس توفیق بخشی کی طرف بھی اشارہ ہے جو طالبین حق کو ہر قدم پر حاصل ہوتی ہے اور اس رہنمائی کی طرف بھی جو اللہ سبحانہ انبیاء کے ذریعے لیا فرماتا ہے۔ یہ شان عبدیت کا اظہار ہے۔ وہاں پہنچ کر بھی اس کا اقرار کریں گے لیکن الزمخشری کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے کہ یہ تقرب اور تعبد کا پیمانہ نہیں بلکہ سرور و نشاط کا اعلان ہے کیونکہ اہل جنت کو جو اللہ سبحانہ، کی جانب سے انعامات ملیں گے وہ ان کی توقعات اور امیدوں، ان کے قیاسات اور اندازوں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سے اتنی زیادہ ہوتی گئے کہ وہ اس کو خدا کا فضل ہی فضل سمجھیں گے اس میں اپنی سعی و تدبیر کے کسی دخل کا ان کو گمان بھی نہ ہوگا۔ الزمخشری نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہی معاملہ دُنیا میں بھی خدا اور اس کے نیک بندوں کے درمیان ہے۔ ظالموں کو جو نعمت دُنیا میں ملتی ہے وہ اس پر فخر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ ہماری قابلیت اور محنت کا نتیجہ ہے۔ اسی لیے وہ ہر نعمت کے حصول پر اور زیادہ متکبر اور مفسد بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس صالحین کو جو نعمت بھی ملتی ہے وہ اسے خدا کا فضل سمجھتے ہیں۔ شکر بجا لاتے ہیں۔ جتنے نوازے جاتے ہیں اتنے ہی زیادہ متواضع، شفیق اور فیاض ہوتے چلے جاتے ہیں۔ آخرت میں بھی وہ اپنے حسن عمل پر غرہ نہ کرتے ہیں۔ اپنے عمل کے بجائے خدا کے رحم و فضل سے اُمیدیں وابستہ رکھتے ہیں۔ بخاری و مسلم دونوں میں روایت موجود ہے۔ خوب جان لو کہ تم محض اپنے عمل کے بل بوتے پر جنت میں نہ جاؤ گے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ بھی، فرمایا ہاں، میں بھی الا ان یتغمدنی اللہ برحمۃ الا یہ کہ خدا مجھے اپنی رحمت اور اپنے فضل سے ڈھانک لے۔

اعمال جنت میں داخلہ کا سبب ہیں

۵۴۔ اور ان کو پکارا جائے گا کہ یہی وہ جنت ہے جس کا تمہیں تمہارے اعمال کی وجہ سے وارث بنایا گیا ہے۔ یہ آواز دینے والا خدا کی جانب سے کوئی فرشتہ ہوگا۔ یعنی آج ساری عملی جدوجہد ٹھکانے لگ گئی اور تم نے کوشش کر کے خدا کے فضل سے اپنے باپ آدم کی میراث ہمیشہ کے لیے حاصل کر لی۔ حدیث میں ہے کسی شخص کا عمل ہرگز اس کو جنت میں داخل نہ کرے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عمل دخول جنت کی علت نہیں فقط ظاہری سبب ہے دخول جنت کی علت خدا کی رحمت کاملہ ہے جیسا کہ اسی حدیث میں الا ان یتغمدنی اللہ برحمتہ کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہاں بندے پر رحمت الٰہیہ کا نزول اسی قدر ہوتا ہے جس قدر عمل کی روح اس میں موجود ہو۔ حضرت شیخ الہند فرمایا کرتے تھے کہ گاڑی تو رحمت الٰہیہ کے زور سے چلتی ہے عمل وہ جھنڈی ہے جس کے اشارے پر چلاتے اور روکتے ہیں۔[1]

شیخ الاسلام دراصل ایک اٹھے ہوئے سوال کا جواب دے رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک طرف کہا جاتا ہے عمل سے جنت ملے گی اور پھر بتایا جاتا ہے کہ رحمت کے بغیر کوئی جنت میں نہ جائے گا۔ جواب

[1] افادات شیخ الاسلام

میں بتایا ہے کہ بما کنتم تعملون - میں با مقابلہ نہیں بلکہ بار سببیہ ہے - مطلب یہ ہے کہ اعمال جنت میں داخل ہونے کا سبب ضرور ہیں مگر جنت کی قیمت نہیں ہے اور رحمت جنت میں جانے کی اصلی اور واقعی علت ہے - کسی چیز کے سبب اور علت ہونے میں بہت بڑا فرق ہے - جنت ہی پر منحصر نہیں بلکہ اہل السنۃ والجماعۃ کے نقطہ نظر سے دنیا اور آخرت کی پوری زندگی اسی نظریہ کے ارد گرد گھوم رہی ہے - جیسے پانی پیاس بجھانے کی کھانا پیٹ بھرنے کی، آگ جلانے کی علت نہیں بلکہ سبب اور بہانہ ہے - اسی طرح اعمال جنت میں پہنچنے کا سبب ہیں علت صرف اللہ سبحانہ کی رحمت ہے -

جنت انسان کی وراثت ہے

اس آیت میں جنت کو میراث کہا گیا ہے - شارحین قرآن جنت کے میراث ہونے پر مختلف الخیال ہیں - کچھ کی رائے ہے کہ جنت کو میراث اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ کسی چیز کا بدل نہیں بلکہ محض اللہ کے فضل وکرم سے ملے گی - اور کچھ کی رائے میں جنت کے میراث ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا - المنار میں السید رشید رضا نے جنت کے میراث ہونے پر تبصرہ کیا ہے لیکن وہ میراث کا کوئی واضح تصور پیش نہ کر سکے - اس لیے ہم یہاں معالم القرآن کے ناظرین کے لیے ایک سرسری جائزہ پیش کرتے ہیں -

امر واقعہ یہ ہے کہ حضرت آدم کا واقعہ جو قرآن عزیز میں آیا ہے وہ آغاز آفرینش کی محض تاریخ نہیں ہے بلکہ وہ حقیقت انسانی کی سچی اور حقیقی تصویر ہے - عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو اپنی بے پایاں رحمت سے جس جنت میں جگہ دی وہ پہلے ان کو اور ان کی نسل کو ہمیشہ کے لیے دی گئی تھی لیکن چونکہ اتفاقاً ان سے گناہ سرزد ہوا اس لیے وہاں سے نکال کر زمین میں بھیج دیے گئے - مگر ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ آدم علیہ السلام کا زمین پر آنا تو ان کی پیدائش سے پہلے ہی فرشتوں کو بتا چکا تھا، انی جاعل فی الارض خلیفہ -

حضرت آدم کا زمین میں خلیفہ ہونا زمین میں سکونت پذیر ہونے کی پیشین گوئی ہے مگر زمین میں روانہ کرنے سے پہلے ان کو جنت میں رکھنا پھر گناہ کے بعد وہاں سے ان کو نکال کر زمین میں بھیجنا یہ بتاتا ہے کہ آدم اور ان کی اولاد کی اصلی جگہ ہی جنت ہے مگر اس سے دوری ان کے گناہ کی وجہ سے ہوتی اور اس کا حصول ایمان و عمل صالح کے ذریعے ہوگا - اسی جنت سے حضرت آدم کو شیطان نے نکلوایا تھا اور بتایا تھا کہ اس جنت میں جس میں تم ہو بے درد سر ہمیشہ رہنے کا نسخہ تم کو بتاؤں - حضرت

آدم نے خواہش ظاہر کی تو نیک و بد کی تمیز کے درخت کا پھل بتا دیا اور یہ بتایا کہ

هل ادلك على شجرة الخلد و ملك لا يبلى

کیا میں تجھے حیاتِ جاودانی اور حکومت غیر فانی کا درخت بتاؤں۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ نیک و بد کی تمیز ہی پر انسان کی شرعی تکلیف اور مواخذہ کا دار و مدار ہے اسی خیر و شر کی معرفت کا لازمی نتیجہ شریعت کی تکلیف تھی چنانچہ وہ اس کے سر ڈالی گئی اور نسلِ آدم کو نیک و بد کی تمیز فطری الہام کے ذریعے عنایت ہوئی ہے فالھمھا فجورھا وتقواھا، انسان نے جہول ظلوم ہونے کی اس تکلیفِ شرعی کی امانت کو اٹھا لیا۔ یہی نیک و بد کی معرفت کا نتیجہ تھا اور اس تکلیف کا لازمی نتیجہ جزا و سزا ہے۔ خدا کی رضامندی یہی تھی کہ اس کے سب بندے اس کی رحمت اور مغفرت کے مستحق ٹھہریں کہ اس رحمت و شفقت کا اقتضا یہی ہے کہ گنہ گاروں کو معاف کرے اور نیکوکاروں پر اپنی خاص رحمت نازل کرے لیکن اگر کاشت کار اپنے کھیتوں کو ابرِ رحمت سے مستفید ہونے کے قابل نہ بنائے تو وہ اس کی برکت سے مستفید نہ ہوگا۔ اسی طرح جو بندہ شرک و نفاق میں مبتلا ہو جانے سے اپنے آپ کو اس کی رحمت کے قابل نہ بنائے تو وہ بھی اس کی رحمت کی بارش سے سیراب نہ ہو سکے گا۔

غرض اس طرح وہ مصلحت الٰہی جو انسان کی پیدائش سے تھی پوری ہوئی اور وہ حیاتِ جاویداور غیر فانی بادشاہی جس کا حصول قضائے الٰہی نے انسان کی محنت، جد و جہد اور سعی و عمل پر موقوف رکھا تھا اور جسے شیطان نے حضرت آدم کو بلا سعی و محنت محض بخت سے دلانا چاہا تھا بالآخر اس کا ملنا تقدیرِ الٰہی جد و جہد، سعی و عمل اور نظامِ ربانی کے مطابق شریعت کی پیروی کے ذریعے سے مقرر ہوا۔

جب انسان کا اصل مقام وہی حیاتِ جاوید اور مملکتِ ابدی ہے تو اس کا حصول اس کی تمام کوششوں کا محور ہونا چاہیے اور اس حیاتِ جاویداور لازوال بادشاہی کی دولت کو اپنی اس فانی زندگی اور زوال پذیر بادشاہی کے تمام کاموں کے مزد و معاوضہ میں حاصل کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنے باپ کی اس آسمانی بادشاہی کو پالے۔ حضرت آدم اس جنت سے نکلے تو ان کو بھوک بھی لگی، ننگے بھی ہوتے، پیاس بھی معلوم ہوتی اور دھوپ کی تپش کی تکلیف بھی ہوتی۔ اور زمین میں آکر چار چیزوں کی مشقت میں گرفتار ہوئے۔ کھانا، پینا، پہننا اور رہنا۔ یہی انسان کی چار مختصر ضروریات ہیں۔ ان ہی کو اس نے اپنی ہوا و ہوس سے پھیلا کر ضروریات کا ایک عالم پیدا کر دیا جس کے مہیا کرنے، ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے اور عمدہ بنانے میں اپنی مختصر زندگی کی تمام تر توجہ کو مصروف کر کے اصل جنت کی طلب سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہیں سے شریعت کی تکلیف کی بار برداری ہوئی اور جائز اکل و شرب، جائز لباس و مسکن کے حصول کے طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں

سے احتراز کا حکم ہوا، اسی سے شریعت کے اصول، معاملات اور اخلاق انسانی کی ذمہ داریاں پیدا ہوئیں - اور پھر اس لیے تاکہ اس حیات فانی میں پھنس کر حیاتِ جاوداں کو نہ بھول ، عرفانِ الٰہی اور عبادت وطاعتِ الٰہی کی تلقین ہوتی جو جنت کی اصل غذا ہے - اسی نسبت سے قرآن نے وراثت کہا ہے یہ وراثت انسان کو اپنے اعمالِ خیر کے ذریعے ملے گی - چنانچہ اہلِ جنت کو جنت میں داخلہ کے وقت یہ بشارت ملے گی -

تلکم الجنۃ اورثتموھا بما کنتم تعملون

صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی آیا ہے کہ:

جب اہلِ جنت جنت میں داخل ہو جائیں گے تو ایک منادی اعلان کرے گا - اے جنتیو! اب تم ہمیشہ زندہ رہو گے موت سے دوچار نہ ہو گے، ہمیشہ تندرست اور صحت مند رہو گے ، کبھی بیمار نہ ہو گے ، ہمیشہ جوان رہو گے کبھی بڑھاپا نہ آئے گا - ہمیشہ آرام وراحت میں رہو گے - بدمزہ اور تلخ کام نہ ہو گے - اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی - ونودوا ان تلکم الجنۃ الخ

وَنَادٰۤی اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا
وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا
نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَیْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۴﴾
الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَ
هُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَبَیْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَی الْاَعْرَافِ
رِجَالٌ یَّعْرِفُوْنَ كُلًّاۢ بِسِیْمٰىهُمْ ۚ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ
عَلَیْكُمْ ۫ لَمْ یَدْخُلُوْهَا وَهُمْ یَطْمَعُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَاِذَا صُرِفَتْ
اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ
الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۷﴾ ع ۸ ۵ ۱۲

اور جنت والے دوزخ والوں کو پکاریں گے، ہم نے ان سارے وعدوں
کو ٹھیک پا لیا جو ہمارے رب نے ہم سے کیے تھے، کیا تم نے بھی
ان وعدوں کو ٹھیک پایا جو تمہارے رب نے کیے تھے؟ وہ جواب

دیں گے ہاں[۵۵]۔ تب ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکار کر کہے گا ان ظلم پیشہ لوگوں پر خدا کی لعنت ہو جو لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے تھے، اور اس میں کجی تلاش کرتے تھے اور آخرت کی زندگی کو نہ مانتے تھے[۵۶]۔ اور ان دونوں کے درمیان ایک اوٹ ہو گی[۵۷]۔ اور اعراف پر کچھ اور لوگ ہوں گے یہ ہر ایک کو اس کی نشانی سے پہچان لیں گے اور جنتیوں سے پکار کر کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو یہ لوگ جنت میں داخل تو نہ ہوتے ہوں گے مگر اس کے اُمیدوار ہوں گے[۵۸]۔ اور جب ان کی نگاہیں دوزخیوں کی طرف پھریں گی تو بول پڑیں گے اے ہمارے پروردگار ہمیں ظلم پیشہ لوگوں میں شامل نہ فرما[۵۹]۔

معانی مفردات

یصدّون، رکتے ہیں یا روکتے ہیں۔ یہ لازم اور متعدی دونوں آتا ہے۔ راغب لکھتے ہیں کہ صدود اور صد کے معنے پھرنے اور رکنے کے ہوتے ہیں جیسے یصدون عنك صدودا" اور کبھی روکنے اور منع کرنے کے معنے میں آتا ہے جیسے فصدھم عن السبیل شیطان نے ان کو راہ ہدایت سے روک دیا ہے یہاں اس کا استعمال دوسرے معنے میں ہوا ہے۔ یبغون، تلاش کرتے ہیں۔ بغی سے بنا ہے،

اسی سے ابتغا آتا ہے۔ عوج، کجی اور ٹیڑھا پن، یہ عاج یعوج سے ہے جس کا استعمال ٹیڑھا اور کج ہونے کے لیے آتے ہیں۔ یہ اسم ہے۔ ابوزید نے جو لغت کے امام ہیں تصریح کی ہے کہ جو کجی آنکھوں سے نظر آتے اس کے لیے عَوج بالفتح آتا ہے اور جو آنکھ سے نہیں بلکہ عقل و شعور سے سمجھ میں آئے اس کے لیے عِوج، بکسر العین آتا ہے۔ حجاب، پردہ اوٹ، ملنے سے روکنا، مصدر ہے۔ حُجُب جمع ہے۔ آیت میں حجاب سے ایسا پردہ مراد نہیں جو دیکھنے سے روک دے بلکہ وہ آڑ مراد ہے جو جنت کی لذت و نعمت کو دوزخیوں تک پہنچنے سے مانع ہو۔ اور آیت وحی میں حجاب سے وہ پردہ مراد ہے جو دیکھنے سے مانع ہو۔ سیماھم، ان کی نشانی، سیما کے معنے چہرہ، نشانی اور علامت کے ہیں۔ یہ اصل میں وسمی ہے واو کو فا کلمہ کی بجائے عین کلمہ کی جگہ پر رکھا گیا جس طرح ما الطیبہ کو الیطبہ بولتے ہیں تو سومیٰ ہوا پھر واو کے ساکن اور ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے واو کو یا کر دیا گیا سیما ہو گیا۔ اعراف، عرف کی جمع ہے عرف گھوڑے کی پیشانی کی چوٹی اور مرغ کی کلغی کو کہتے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ کسی مینار یا برجی کے لیے استعمال ہوا جو کسی اونچی دیوار یا پہاڑی پر بنا دیا جاتے جہاں سے تمام اطراف و جوانب کا بیک نظر مشاہدہ ہو سکے۔ قرآن کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت و دوزخ کے درمیان جو دیوار کھڑی ہو گی یہ اعراف یعنی مینارے اور برجیاں اسی دیوار پر ہوں گے۔

اہلِ جنت، اہلِ دوزخ

ان آیات میں وہ سوال و جواب مذکور ہے جو جنتیوں اور دوزخیوں کے مابین ہو گا۔ پچھلی آیات میں جنت و دوزخ کا چہرہ پیش کیا تھا اب جنتیوں اور دوزخیوں کی گفتگو پیش ہو رہی ہے۔ یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ آخرت میں جنت و دوزخ کی تقسیم تو ایمان و کفر پر رکھی ہے مگر ان میں مراتب کی تقسیم اعمال کے واسطہ سے کی ہے۔ اللہ سبحانہٗ جس کو مراتب علیا پر فائز کرنا چاہتے ہیں اس کو یوں ہی فائز نہیں کر دیتے بلکہ اس کے اعمال حسنہ کی رفتار تیز کر دیتے ہیں اور جس کو جنت سے محروم کرنے کا ارادہ فرماتے ہیں اس کو بھی دفعتہً محروم نہیں کرتے بلکہ اس سے نیکی کی توفیق سلب کر لیتے ہیں۔ یہ ہر دو راستے بتدریج طے ہوتے رہتے ہیں۔ بندہ راہِ ترقی پر گامزن ہو یا تنزل کی راہ پر جاتے دونوں جگہ اس کی حرکت تدریجی رہتی ہے اس لیے وہ اپنی منزلِ سفر کی یومیہ ترقی یا تنزل کا احساس نہیں کرتا۔ ایک نیک شخص کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کل کہاں پڑا ہوا تھا اور کچھ عرصہ کے بعد کہاں جا پہنچا۔ نہ ایک

بداطوار کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کل تک وہ کس جگہ تھا اور آج کہاں ہے۔ ہوشمند وہ ہے جو ہر آن اپنی رفتار اور منازلِ سفر کو بغور دیکھتا ہے۔ گناہوں کی نوعیت سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ بعض قسم کے گناہوں سے سوءِ خاتمہ کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے۔ جنت و دوزخ ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں۔ صرف درمیان میں ایک دیوار ہے جس نے ایک کو دوسرے سے الگ کر دیا ہے۔ ایک قدم ادھر گئے تو دوزخ ہے آگے بڑھ گئے تو جنت ہے۔ چنانچہ سورہ حدید میں ہے کہ جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان ایک دیوار ہے جس میں دروازہ ہے اندر جاؤ تو رحمت ہے باہر رہو تو عذاب ہے۔ اسی دیوار کو یہاں اعراف کہا ہے۔ اعراف کا اطلاق ہر ایسی چیز پر ہوتا ہے جو زمین سے بلند ہو۔

۵۵- اور جنت والے دوزخ والوں کو پکاریں گے کہ ہم نے ان سارے وعدوں کو ٹھیک پالیا جو ہم سے ہمارے رب نے کیے تھے تم نے بھی ان وعدوں کو ٹھیک پالیا ہے جو تم سے تمہارے رب نے کیے تھے وہ جواب دیں گے کہ ہاں۔ ان آیات میں ان مخاطبات و مکالمات کا ذکر ہے جو جنتیوں اور دوزخیوں یا ان دونوں اور اصحاب اعراف میں ہوں گے۔ پہلی اور آخری گفتگو جو اصحاب الجنۃ اور اصحاب النار میں ادھر سے یا ادھر سے ہوگی صاف ظاہر کرتی ہے کہ یہ مخاطبات جنت اور دوزخ میں داخل ہونے کے بعد کے ہیں اس لیے نظم کلام کا تقاضا یہ ہے کہ اصحابِ اعراف کی آنے والی درمیانی گفتگو کو بھی اس کے بعد ہی مانا جاتے۔ بہر حال جنتی جنت میں پہنچ کر اپنے حال پر اظہارِ مسرت اور دوزخیوں کی تقریع و تبکیت کے لیے کہیں گے کہ جو کچھ وعدے حق تعالیٰ نے پیغمبروں کی زبانی ہم سے فرماتے تھے کہ ایمان لانے والوں کو نعیم دائم ملے گی ہم تو انہیں سچا پا رہے ہیں۔ اے اہلِ جہنم تم بولو کہ تمہارے کفر و عصیان پر جو دھمکیاں دی گئی تھیں تم نے بھی ان کو سچا پایا۔ ظاہر ہے جواب میں بجز نعم ہاں کے اور کیا کہہ سکتے ہیں[1]

جنت میں زندگی کی جو کیفیت ہوگی یہ آیت اس کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرتی ہے۔ اس دنیا میں ہر کھانے پینے کے ساتھ بول و براز، پسینہ اور سوءِ ہضم کی علت لگی ہوتی ہے اور اس کے بغیر یہاں انسان زندہ نہیں رہ سکتا مگر وہاں یہ کچھ نہ ہوگا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت کھائیں گے اور پئیں گے لیکن نہ تھوکیں گے نہ وہاں بول و براز کی حاجت ہوگی نہ وہاں ناک سے رطوبت نکلے گی نہ بلغم اور کھنگار جیسی کوئی چیز ہوگی۔ کھانا ایک ڈکار میں ہضم ہوگا وہاں کے پسینہ میں مشک کی خوشبو ہوگی جو بہشت میں داخل ہوگا اس کو وہ نعمت ملے گی کہ پھر کبھی تکلیف نہ ہوگی نہ ان کے کپڑے بوسیدہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہوں گے اور نہ ان کی جوانی زائل ہوگی۔ غور کرو وہ جسمانی زندگی ہماری موجودہ زندگی سے کتنی مختلف ہوگی اس دنیا میں تو ہمارے سمع و بصر اور ادراک و ابلاغ کی قوتیں نہایت محدود ہیں لیکن عالم آخرت میں ہر چیز لامحدود ہوگی۔ جنت کے عالم سے جب چاہیں گے اہل جنت دوزخ والوں کو مخاطب کر کے سوال و جواب کریں گے۔ اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے۔ انسان کبھی شکم مادر میں ایک بچہ کی صورت میں زندہ تھا مگر وہاں اس کی زندگی، اس کی غذا، اس کی سانس، اس کی سمع و بصر اور دوسری لوازم حیات بیرون شکم کے دنیاوی اصول حیات و قوانین زندگی سے بالکل مختلف تھے اور جس طرح شکم مادر میں بچہ کا اس بیرونی زندگی کی حکایات کو تعجب کے ساتھ سن کر آمادہ انکار ہونا دانشمندی نہ ہوگی۔ ٹھیک اسی طرح اس مادی زندگی کے خوگر اس دوسری زندگی سمع و بصر اور لوازم حیات کو سن کر آمادہ انکار ہوں تو ان کا یہ فعل بھی دانشمندی کے خلاف ہوگا۔

اور بقول سید رشید رضا اس سائنسی دور میں یہ بات ذرا بھی حیرت افزا نہیں ہونی چاہیے کہ عالم جنت کے رہنے والے عالم دوزخ کے مکینوں سے باتیں کریں گے جب کہ ہم نے ٹیلویژن بنا لیے ہیں جن پر ایک ملک کے لوگ کسی دور دراز ملک کے کسی خطیب کو اپنے ملک کے کسی مجمع کے سامنے تقریر کرتے تالیاں بجاتے اور نعرے لگاتے دیکھ اور سن سکتے ہیں۔ آخر عالم آخرت کی باتوں پر حیران کیوں ہو جہاں یہ سارے نوامیس طبعی بدل جائیں گے اور اس زمین و آسمان کی جگہ نئے آسمان و زمین پیدا ہوں گے۔

ایک منادی کی پکار

۵۶۔ تب ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکار کر کہے گا ان ظلم پیشہ لوگوں پر خدا کی لعنت ہو جو لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے تھے اور اس میں کجی تلاش کرتے تھے اور آخرت کی زندگی کو نہ مانتے تھے۔ اس وقت خدا کا ایک منادی دونوں کے درمیان کھڑے ہو کر پکارے گا۔ یوں تو گنہگار بہت ہیں مگر خدا کی بڑی پھٹکار ان ظالموں پر ہے جو خود گمراہ ہوتے اور آخرت کے انجام سے بالکل بے فکر ہو کر دوسروں کو بھی راہ حق سے ہٹاتے رہے اور اپنی کج بحثیوں سے رات دن اسی فکر میں تھے کہ صاف اور سیدھے راستہ کو ٹیڑھا ثابت کریں [1]

یہ پکارنے والا کون ہوگا؟ اس کی تنکیر بتاتی ہے کہ کوئی ہوگا اس کا معلوم کرنا مقصود نہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی فرشتہ ہی ہوگا۔ جیسا کہ عبداللہ بن عباس سے مروی ہے۔ قرطبی، نسفی اور آلوسی کا بھی خیال ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ منادی کہے گا کہ ظلم پیشہ لوگوں پر خدا کی لعنت ہو۔ یہ ظلم پیشہ لوگ کون ہیں قرآن نے خود ہی ان کا یہ چہرہ پیش کیا ہے۔ جو لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے تھے اور جو اللہ کے راستہ میں کجی تلاش کرتے تھے اللہ کے راستہ سے روکنا یہ ہے کہ لوگوں کو اس پر چلنے سے منع کرتے تھے۔ اس روکنے کی کوئی خاص ایک شکل نہیں ہے بلکہ احوال وظروف کے اختلاف اور زمان ومکان کی تبدیلی سے اس کی صورتیں مختلف رہی ہیں اور مختلف رہیں گی۔ قرآن کا بغور مطالعہ کرو کہ اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکنے کی ایک صورت وہ تھی جو نمرود نے ابراہیم کے مقابلہ میں اختیار کی، ایک وہ تھی جو فرعون نے حضرت موسیٰ کے مقابلے میں اپنائی، ایک وہ تھی جو قوم شعیب کے سرمایہ داروں نے حضرت شعیب کے مقابلہ میں اختیار کی۔

اللہ کے راستہ میں کجی تلاش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں قسم قسم کے شکوک وشبہات پیدا کرنا، طرح طرح سے رخنے ڈالنا، اس کی بھی متعدد صورتیں ہیں مثلاً توحید میں شرک کی آمیزش کرکے اسے اسلام بتانا۔ السید رشید رضا نے المنار میں اس پر عمدہ بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ایک ظلم مشرکانہ عمل ہے دوسرا ظلم مبتدعانہ زندگی ہے، تیسرا ظلم زندقہ اور نفاق کے ذریعے اسلام کے جادۂ مستقیم پر تشکیک وشبہات کی یورش ہے، چوتھا ظلم احکام میں غیر اسلامی قوانین کی اسلامی قوانین کے مقابلے میں ترجیح ہے۔

جنت اور دوزخ کے درمیان دیوار

۵۷۔ اور ان دونوں کے درمیان ایک اوٹ ہوگی۔ حجاب کے معنے پردہ اور آڑ کے ہیں۔ یہاں پردے کی دیوار مراد ہے جس کی تصریح سورہ حدید میں ہے فضرب بینھم بسور لہ باب یہ دیوار جنت کی لذتوں کو دوزخ تک اور دوزخ کی کلفتوں کو جنت تک پہنچنے سے مانع ہوگی۔ اس کی تفصیلی کیفیت کا ہمیں علم نہیں ہے [1]

ایک ایسی دیوار کے طول وعرض کا اندازہ کون کرسکتا ہے جو پورے عالم جنت اور سارے عالم دوزخ کے درمیان حدِ فاصل کا کام دے گا جبکہ صرف جنت کی وسعتوں کی تمثیل قرآن نے آسمانوں اور زمین کی وسعتوں سے دی ہے۔ دونوں کے درمیان سے مراد جنت اور دوزخ بھی ہوسکتا ہے اور جنتی اور دوزخیوں کی دونوں جماعتیں بھی ہوسکتی ہیں۔ اور ہماری رائے میں یہی درست ہے، یہ بھی کہا جا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سکتا ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک دیوار ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان ایک دیوار ہے۔ یعنی یہ دونوں عالم الگ الگ ہیں۔ ایک دیوار نے ان کو جدا کر دیا ہے۔ یہ تو عالم آخرت کی بات ہے اگر حقیقت کے رمز شناس ہو تو پالو گے کہ زندگی کے ہر گوشہ میں جنت و دوزخ کی تقسیم کا یہی حال ہے۔ دونوں کی سرحدیں اس طرح ملی ہوئی ہیں کہ ایک قدم پیچھے رہ گئے اور جنت کی جگہ دوزخ میں پڑ گئے، بسا اوقات ایک قدم کی تیزی یا کوتاہی جنت سے دوزخ میں یا دوزخ سے جنت میں پہنچا دیتی ہے۔

یک لمحہ غافل بودم وصد سالہ راہم دور شد[1]

اصحاب اعراف اور ان کا مقام

۵۸۔ اور اعراف پر کچھ لوگ ہوں گے وہ ہر ایک کو اس کی نشانی سے پہچان لیں گے اور جنتیوں سے پکار کر کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو یہ لوگ جنت میں داخل ہوتے نہ ہوں گے مگر اس کے امیدوار ہوں گے۔ اسی درمیانی بلندی پر جو مقام ہوگا اس کو اعراف کہتے ہیں۔ اصحاب اعراف کون لوگ ہیں؟ قرطبی نے اس میں بارہ قول نقل کیے ہیں۔ ہمارے نزدیک ان میں راجح وہ ہی قول ہے جو حضرت حذیفہ، ابن عباس، ابن مسعود رضی اللہ عنہم جیسے اکابر جلیل القدر صحابہ اور اکثر سلف و خلف سے منقول ہے۔ یعنی وزن اعمال کے بعد جن کے حسنات بھاری ہوں گی وہ جنتی ہیں اور جن کے سیئات غالب ہوئے وہ دوزخی۔ اور جن کے حسنات و سیئات بالکل مساوی ہوں گے وہ اصحاب اعراف ہیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انجام کار اصحاب اعراف جنت میں چلے جائیں گے۔ اور یہ ویسے بھی ظاہر ہے کہ جب عصاۃ مومنین جن کے سیئات غالب تھے جہنم سے نکل کر بالآخر جنت میں داخل ہوں گے تو اصحاب اعراف جن کے حسنات و سیئات برابر ہیں وہ ان سے پہلے داخل ہونے چاہئیں۔ گویا اصحاب اعراف کو اصحاب الیمین کی ایک کمزور سی قسم سمجھنی چاہیے۔ جس طرح سابقین مقربین فی الحقیقہ اصحاب یمین کی ایک ایسی قسم ہے جو اپنی اولوالعزمیوں کی بدولت عام اصحاب یمین سے آگے نکل گئے ہیں۔ اس کے بالمقابل اصحاب اعراف کی گری ہوئی قسم ہے جو اپنے اعمال کی کثافت کی وجہ سے عام اصحاب یمین سے کچھ پیچھے رہ گئے ہیں یہ لوگ اہل جہنم اور اہل جنت کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے دونوں طبقوں کے لوگوں کو ان کی

[1] ترجمان القرآن

مخصوص نشانیوں سے پہچانتے ہوں گے۔ جنتیوں کو ان کے سفید اور نورانی چہروں سے اور دوزخیوں کو ان کی روسیاہی اور بدرونقی سے۔ بہرحال جنت والوں کو دیکھ کر سلام کریں گے جو بطور مبارکباد ہوگا اور چونکہ خود ابھی جنت میں داخل نہیں ہوں گے اس کی طمع اور آرزو کریں گے جو آخر کار پوری کر دی جائے گی[1] اعراف والوں کے بارے میں عام رائے یہی ہے جو شیخ الاسلام نے پیش فرمائی ہے اور شارحینِ قرآن نے کثیر روایات کی وجہ سے اسی کو اپنایا ہے اور اس رائے کو اس درجہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے کہ " از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است" کا مصرعہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں اصحاب اعراف کا چہرہ رجال یعرفون الخ کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ قرآن یہ اندازِ بیان نمایاں اور ممتاز حضرات کا چہرہ بیان کرنے کے لیے اختیار کرتا ہے۔ ایسے مواقع پر تنکیر تحقیر کے لیے نہیں بلکہ تعظیم کے لیے ہوتی ہے مثلاً رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ ایسے حضرات جن کو کاروبار اور لین دین یادِ الٰہی سے غافل نہیں بناتا ہے اور رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ ایسے مردانِ کار جنہوں نے اللہ کے عہد کو سچا کر دکھایا۔ یہ اندازِ بیان کہہ رہا ہے کہ یہ عظیم شخصیتوں کا تعارف ہے۔ اور پھر ان کے اعزاز کی نشاندہی اس سے بھی ہو رہی ہے کہ جنت و دوزخ کے تمام مناظر کا مشاہدہ کرانے کے لیے ان کو اعراف پر لے جایا جائے گا۔ اعراف اونچی دیوار پر وہ برجیاں وہ مینارے جہاں سے جنت والوں اور دوزخ والوں کا مشاہدہ ہو سکے اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سوچتا ہوں کہ امام مجاہد کی وہ بات جسے حافظ ابن جریر نے ان کا نام لے کر پیش کیا ہے، قرآنی سیاق کے زیادہ مطابق ہے۔ امام مجاہد فرماتے ہیں کہ اصحابِ اعراف سے مراد علماء و صلحاء ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو دنیا میں حق و باطل کی کشمکش میں استبداد اور جبر و قہر کے سامنے حق کے علمبردار رہے۔ خیر کے داعی اور منکر سے روکنے والے بن کر رہے جنہوں نے حق کی حمایت میں اہل باطل کے مظالم برداشت کیے اور جو مظلوموں کی حمایت میں سینہ سپر ہو کر کھڑے ہوتے ایسے علماء و فقہاء محدثین اور صوفیا وہ رجال امت ہیں جو بلاشبہ قیامت کے روز اس اعزاز کے سزاوار ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اعراف کی بلندیوں سے جنتیوں اور دوزخیوں کا مشاہدہ کرائے تاکہ وہ حق و باطل دونوں کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ القاسمی نے بالکل صحیح لکھا ہے السیاق یدل علی سمو قدر ھم قرآنی انداز بتا رہا ہے کہ یہ بلند ترین شخصیتوں کا چہرہ پیش ہو رہا ہے۔ شارحینِ قرآن ان کے بارے میں مختلف خیالات رکھتے ہیں قرطبی وغیرہ نے ان کی تفصیلات پیش کی ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہمارے خیال میں حجاب دوزخیوں اور جنتیوں کے درمیان ہوگا اور اعراف والے اعراف کی بلندیوں سے سب سے پہلے جنتیوں کو سلام کریں گے لم یدخلوھا و ھم یطمعون میں ضمائر کا مرجع رجال نہیں بلکہ اصحاب الجنۃ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جنتی ابھی موقف میں ہوں گے جنت میں نہ گئے ہوں گے۔ جنت میں داخل ہونے کے امیدوار ضرور ہوں گے۔ جنتیوں کو جنت میں بھیجنے سے پہلے اہلِ اعراف کو ان کا مشاہدہ کرایا جائے گا۔ اہلِ اعراف جنتیوں کو سلام علیکم کہہ کر ان کو سلامتی اور عذاب سے محفوظ ہونے کی بشارت دیں گے۔ اس میں بھی اشارہ ہے کہ اہلِ اعراف کا اہل جنت میں سب سے اونچا مقام ہوگا۔ یہ سارا اعزاز واکرام صاف شہادت دے رہا ہے کہ اللہ کے یہاں ان کا مرتبہ و مقام کیا ہے ؟

اہل جنت کے بارے میں یہ بات کہ وھم یطمعون اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اہل جنت میدانِ حشر میں خوف و رجا کے بین بین ہوں گے۔ حلیۃ الاولیاء میں ابونعیم اصفہانی کی یہ روایت اگر تاریخی طور پر صحیح ہے کہ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ روز قیامت اعلان یہ ہو کہ سب جنت میں جاؤ لیکن ایک شخص نہ جائے تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہ ایک میں ہی ہوں گا اور اگر یہ آواز آئے کہ سب دوزخ میں چلے جاؤ مگر ایک نہ جائے تو مجھے امید ہے کہ وہ ایک میں ہی ہوں۔ تو اس کا منشا بھی اسی خوف و رجاء کا اظہار ہے جس کی طرف آیتِ قرآنی اشارہ کر رہی ہے۔ بہر حال اصحابِ اعراف کو جنتیوں کا مشاہدہ کرایا جائے گا۔ تو ان کو امن و سلامتی کی بشارت دیں گے۔

درمیان میں اہلِ اعراف کے چہرہ کا بیان کرتے ہوئے یہ بات جو فرمائی ہے کہ یعرفون کلا بسیماھم کہ وہ جنتیوں اور دوزخیوں کو ان کی علامات سے پہچانیں گے۔ قرآن و حدیث دونوں میں اس بات کے اشارات موجود ہیں کہ قیامت میں اہلِ ایمان اور اہلِ کفر دونوں اپنے اپنے علامات سے ممتاز ہوں گے۔ قرآن میں ہے :

وجوہ یومئذ مسفرۃ ضاحکۃ مستبشرۃ و وجوہ یومئذ علیھا غبرۃ ترھقھا قترۃ

کچھ چہرے اس روز چمک رہے ہوں گے ہنس مکھ خوش و خرم اور کچھ اس روز ایسے ہوں گے جن پر سیاہی ہوگی اور کدورت والے ہوں گے۔

صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کی امت میں سے جو لوگ آپ کے بعد ہوں گے آپ ان کو کیسے پہچانیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر ایک شخص کے پنج کلیان گھوڑے دوسرے گھوڑوں میں ملے ہوئے ہوں تو کیا وہ ان کو نہ پہچان لے گا۔ لوگوں نے کہا یہ بات تو ٹھیک ہے یا رسول اللہ آپ نے فرمایا کہ اسی طرح میری امت کے لوگ قیامت کے دن اپنے وضو کے آثار سے

اس طرح نمایاں ہوں گے کہ ان کی پیشانیاں اور ان کے ہاتھ پاؤں چمکتے ہوں گے۔ غرض اہل جنت ہوں یا اہل دوزخ دونوں گروہ اپنے اپنے محل میں اپنی نمایاں نشانیوں اور علامات کے ذریعے ممتاز ہوں گے اور اعراف والے ان علامات کے ذریعے اہل جنت کے صدیقین، شہداء اور صالحین و ابرار کو بھی پہچان لیں گے اور دوزخ والوں کے لیڈروں اور اشرار و مفسدین کو بھی۔

اعراف والوں کا دوسرا نظارہ

۵۹ - اور جب ان کی نگاہیں دوزخیوں کی طرف پڑیں گی تو بول پڑیں گے اے ہمارے پروردگار ہمیں ظلم پیشہ لوگوں میں شامل نہ فرما۔ جنت و دوزخ کے درمیان ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کی حالت خوف و رجا کے بیچ میں ہوگی۔ اِدھر دیکھیں گے تو امید کریں گے اور اُدھر نظر پڑے گی تو خدا سے ڈر کر پناہ مانگیں گے کہ ہم کو ان دوزخیوں کے زمرے میں شامل نہ کرنا[1] علامہ عثمانی نے لکھا ہے کہ یہ فرمایا کہ جب ان کی نگاہیں دوزخیوں کی طرف پھیری جائیں گی کیونکہ دوزخیوں کی طرف ان کا دیکھنا محبت کی بنا پر بلکہ عداوت کی بنا پر ہوگا یا اس لیے کہ وہ اہل جنت کی کامرانیوں کے مشاہدے میں بالکل محو ہو جائیں گے تو اہل دوزخ کی طرف ان کو توجہ دلائی جائے گی۔ ان پر نظر پڑتے ہی ان کی زبان سے بے تحاشا یہ دعا نکلے گی ربنا لا تجعلنا مع القوم الظالمین۔ علامہ ابو السعود کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ دعا میں درخواست اس عذاب سے بچنے کی نہیں ہے جس میں وہ مبتلا ہیں بلکہ اس کردار سے بچنے کی ہے جو اس عذاب کا سبب بنا ہے۔ اسی بنا پر علامہ عثمانی نے لکھا ہے کہ یہ آیت واضح طور پر اس بات کی دلیل ہے کہ دنیا کی زندگی میں ظالموں سے بچ کر رہنا واجبات دین میں سے ہے تاکہ آخرت میں ان کی رفاقت نہ ہو۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ قَالُوْا مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور اعراف والے دوزخیوں میں سے کچھ شخصوں کو ان کی علامات سے پہچان کر پکاریں گے[۶۰]۔ اور کہیں گے کہ آج تمہاری جمعیت اور وہ سازوسامان کیا کام آتے جس پر تم بڑا بنتے تھے[۶۱]۔ بتاؤ کیا یہ جنت والے وہی لوگ نہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ ان کو خدا اپنی رحمت سے کچھ نہ دے گا[۶۲]۔ آج ان ہی سے کہا جا رہا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ تمہارے لیے نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ تمہیں کوئی غم ہوگا[۶۳]۔

اعراف والوں کا دوزخیوں سے خطاب

اعراف والوں کا یہ خطاب ظاہر ہے صرف دوزخیوں سے نہیں بلکہ دوزخیوں کے لیڈروں سے ہوگا۔ دوزخ میں یہ لوگ اپنے نمایاں نشانوں سے ممتاز ہوں گے اس وجہ سے اہلِ اعراف پہچانے جائیں گے کہ یہ ابولہب ہے یہ ابوجہل ہے یہ فلاں اور یہ فلاں۔ ان کو مخاطب کرکے اہلِ اعراف ان سے سوال ان کی رسوائی کے لیے کریں گے ہر دور کے ائمہ کفر الگ ہوتے ہیں۔ ابوجہل، ابولہب، ولید بن مغیرہ اور العاص بن وائل قریشِ مکہ کے وہ ائمہ کفر ہیں جنہوں نے مکہ میں اسلام کے خلاف محاذ بنایا اور اہلِ ایمان ان کے جبر و استبداد کا نشانہ بنے۔ اہلِ اعراف ان کو دیکھ کر ان کو پہچان لیں گے اور ان سے دریافت کریں گے کہ وہ تمہاری جمعیت اور وہ حکومت و دولت اور سرمایہ یہاں کس کام آیا جس کے برتے پر دُنیا میں تمہارا دعویٰ تھا نحن اکثر اموالا و اولادا" و ما نحن بمعذبین۔ اس کے بل بوتے پر ہی تم لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے تھے اور اسی کی خاطر راہِ خدا پر چلنے والوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے دراصل تم فکرِ آخرت سے بے پروا ہو کر زندگی گزار رہے تھے اور دنیا کی محبت نے تمہیں اندھا بہرا بنا دیا تھا۔

۶۰۔ اور اعراف والے دوزخیوں میں سے کچھ اشخاص کو ان کی علامات سے پہچان کر پکاریں گے۔ یعنی علاوہ دوزخ میں معذب ہونے کے ان کے چہروں سے دوزخی ہونے کی علامات ہویدا ہوں گی، یا یہ مطلب ہے کہ وہ ایسے لوگ ہوں گے جن کو اصحابِ اعراف نے دنیا میں دیکھا ہوگا۔ اس لیے وہاں صورت دیکھ کر پہچان لیں گے[1] رجالاً کی تنکیر یہاں بھی عظمت ظاہر کر رہی ہے۔ یعنی اہلِ ضلالۃ و کفران کے عظماء اور کبراء کو مخاطب کرکے اعراف والے یہ سوال کریں گے اور ان کو صورتیں متغیر ہونے کے باوجود ان کی علامات سے پہچان کر ان سے دریافت کریں گے۔

ان علامات کے ذریعے خاص اشخاص کی ان کو معرفت ہوگی ورنہ دوزخیوں کے دوزخی ہونے کی معرفت تو ان کو پہلے ہو چکی ہے اور یہ معرفت میدانِ قیامت میں دوزخ میں داخل ہونے سے پہلے ہوگی۔ دوزخ میں داخل ہونے کے بعد تو محض تحصیل حاصل ہے۔ پہلے جس معرفت کا ذکر کیا ہے وہ عمومی تھی اور یہ معرفت خصوصی ہے یعنی خاص افراد کو پہچان کر کہیں گے۔ عام جنتیوں اور دوزخیوں کی تو میدانِ قیامت میں معرفت چہروں کی سپیدی اور سیاہی کے ذریعے ہوگی لیکن ان خاص افراد کی معرفت کے لیے کیا علامات

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہوں گی۔ قرآن میں ابولہب کی بیوی کے متعلق تصریح ہے کہ قیامت کے دن اس کے گلے میں اسی طرح کی ایک رسی پڑی ہو گی جس طرح کی رسی ایندھن جمع کرنے والی لونڈیاں اپنے گلے میں ڈال کر لکڑیاں چننے کے لیے نکلا کرتی ہیں۔ اس نوع کے کچھ اشارات حدیث معراج میں بھی موجود ہیں۔ غرض اسی قسم کی علامات وہاں خاص افراد میں موجود ہوں گی جن کی مدد سے وہ ان لیڈروں اور کفر کے ان زعماء کو پہچان لیں گے جن کی طاغوتی قوتیں اور کافرانہ نظام کا یہاں مقابلہ کرتے رہے۔ ان سے کیا پوچھیں گے؟ اسی سوال کا جواب آگے ہے۔

اہلِ اعراف کا ائمہ کفر و فساد سے سوال

۶۱۔ وہ کہیں گے کہ آج تمہاری جمعیت اور وہ ساز و سامان کیا کام آیا ہے جس پر تم اکڑتے تھے اور بڑا بنتے تھے۔ یعنی اس مصیبت کے وقت تمہاری وہ جماعتیں اور جتھے کہاں گئے اور دنیا میں جو بڑھ بڑھ کر شیخیاں مارتے تھے وہ اب کیا ہوئیں[1] ما اغنی میں ما نافیہ ہے یا ما استفہامیہ، کچھ شارحین قرآن نے اسے ما نافیہ قرار دے کر یہ معنے کیے اور تمہاری جماعت اور وہ چیز جس پر تم تکبر کرتے تھے تمہارے کچھ کام نہ آیا۔ اور کچھ شارحینِ قرآن نے اسے ما استفہامیہ بتایا ہے۔ ہمارے نزدیک یہی سیاق قرآن کے زیادہ مناسب ہے اس میں زور بھی زیادہ اور قرآن کے نظائر سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ تمہاری جماعت، خاندان اور حق کے خلاف جرأت اور بے باکی تمہارے کس کام آیا ہے ماکنتم تستکبرون میں ما مصدریہ ہے یعنی تمہارے اللہ کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے جمگھٹا اور سنگٹیں اور دعوت نبوت کے مقابلے میں تمہارا استکبار کیا کام آیا ہے۔ یہ سوال خود بتا رہا ہے کہ یہ دوزخیوں کے دوزخ میں جانے سے پہلے ہو رہا ہے۔ اور یہ بات ان سے ان کی رسوائی کے لیے پوچھی جا رہی ہے۔ بلاشبہ ہر دور کے ائمہ کفر کا اپنے مال و اسباب اور اپنی تعداد و جمعیت پر غرہ رہا ہے۔ یہ بات قرآن میں تفصیل سے مذکور ہے بلکہ قرآن نے ایک مقام پر اسے بطورِ ایک کلیہ پیش کیا ہے اور ایک سے زیادہ مقامات پر یہ بتایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا مقابلہ سب سے پہلے اور سب سے آگے بڑھ کر ان خوشحال طبقوں نے کیا ہے جو دولت و حشمت اور نفوذ و اقتدار کے مالک تھے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں الانعام ۱۲۳، الاعراف ۶۰، ۶۶، ۷۵، ۸۸، ۹۰۔ ہود ۲۷۔ بنی اسرائیل ۱۶، مومنون ۲۴، ۳۳ تا ۳۸، ۴۶، ۴۷، الزخرف ۲۳۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کمزور مسلمانوں کی طرف اشارہ کرکے سوال

۶۲- بتاؤ کیا یہ جنت والے وہی لوگ نہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ ان کو خدا اپنی رحمت سے کچھ نہ دے گا۔ یہ اہل جنت کی طرف اشارہ کرکے دوزخیوں سے کہیں گے کہ وہ ٹوٹے پھوٹے مساکین اور ضعیف الحال جن کو تم حقیر سمجھ کر کہا کرتے تھے کہ کیا خدا کی مہربانی سب کو چھوڑ کر ان جنتیوں پر ہو سکتی ہے اھؤلاء من اللہ علیھم من بیننا [1] میدان حشر میں کھڑے ہوئے ان کمزور جنتی اہل ایمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو دنیا میں جبابرہ اور فراعنہ کا ایمان کی پاداش میں تختہ مشق بنے ہوئے تھے دوزخیوں کے لیڈروں اور فراعنہ سے سوال کریں گے بتاؤ کیا یہ وہ لوگ نہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ یہ لوگ کبھی خدائی عنایات اور انعامات کے لائق نہیں ہو سکتے۔ قرآن نے یہ بات خاص طور پر نمایاں کرکے پیش کی ہے کہ مکہ کی آبادی میں سے بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کے لیے جو لوگ آگے بڑھے تھے وہ قوم کے بڑے اور متمول لوگ نہ تھے بلکہ چند باہمت نادار نوجوان ہی تھے۔ وہ ابتدائی مسلمان جو ان آیات کے نزول کے وقت ساری قوم کی شدید مخالفت کے مقابلے میں صداقت اسلام کی حمایت کر رہے تھے اور ظلم وستم کے اس طوفان میں جن کے سینے اسلام کے لیے سپر بنے ہوئے تھے ان میں عزت وحشمت اور جاہ واقتدار والا کوئی نہ تھا۔ سب کے سب عام شہری تھے اور سارے نوجوان تھے علی ابن ابی طالب، جعفر طیار، زبیر، طلحہ، سعد بن ابی وقاص، عمر، مصعب بن عمیر، عبداللہ بن مسعود، عبدالرحمن بن عوف، بلال اور صہیب، ابو عبیدہ بن الجراح، ابوبکر الصدیق، زید بن حارثہ، عثمان بن عفان، جیسے حضرات تھے۔ وہ ان کو دیکھ کر کہتے تھے کہ مال و دولت اور خدم وحشم ہم رکھتے ہیں اور دنیا ہماری سرداری مان رہی ہے۔ یہ لوگ مساکین و فقراء ہیں۔ بھلا ان مسکینوں پر خدا کی رحمت کیسے ہو سکتی ہے۔ سادات قریش اسلام کے خلاف یہ ایک بڑی دلیل بنا کر لاتے تھے کہ اگر اسلام میں کوئی خیر کا پہلو ہوتا تو کیا اسلام کے پیرو بھی فقراء و مساکین ہوتے۔ خدا کی ساری نعمتوں کے حقدار تو ہم بنائے گئے پھر اسلام کے لیے ان مساکین کا انتخاب کیوں ہوا۔ اعراف والے ان کے اسی عذر پر ضرب کاری لگائیں گے اور کہیں گے بتاؤ جن کو تم کسی فضل و رحمت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے وہ کہاں ہیں اور تم کہاں ہو۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جنت میں داخلہ کا پروانہ

۶۳۔ آج ان ہی سے کہا جا رہا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ تمہارے لیے نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ تمہیں کوئی غم ہو گا۔ یعنی ان کو تو آج کہہ دیا گیا کہ ادخلوا الجنۃ، حالانکہ تم اس عذاب میں مبتلا ہوئے۔
اس میں شارحینِ قرآن کا اختلاف ہے کہ یہ بات جنتیوں سے اہلِ اعراف کہیں گے یا حق تعالیٰ شانہٗ فرمائیں گے۔ شیخ الاسلام کے اندازِ بیان سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ بات اہلِ اعراف کہیں گے۔ پہلا سوال تو اہلِ اعراف نے ائمہ کفر کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ اھؤلاء الذین اقسمتم الخ اور یہ بات وہ اہلِ جنت کو مخاطب کر کے ان سے بطورِ تہنیت اور مبارکباد کہیں گے۔ اہلِ اعراف کا یہ کہنا بھی اس کی دلیل ہے کہ یہ ساری گفتگو موقف میں ہو گی جب کہ ابھی جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں نہ گئے ہوں گے۔ جن لوگوں نے اس کا تعلق جنتیوں کے جنت میں داخل ہونے کے بعد سے بتایا ہے ان کو یہاں تاویل کرنی پڑی ہے کہ عربی زبان میں فعل ہر جگہ اپنے ابتدائی معنے ہی پر دلیل نہیں ہوتا بلکہ بعض مواقع پر دوام و استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ تاویل بیکار ہے۔ یہاں اصحابِ اعراف جنتیوں سے موقف میں کہہ رہے ہیں کہ مال و جاہ کے متوالے تو تمہیں حقیر و ذلیل سمجھتے رہے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے علی الرغم تمہیں جنت کی سرفرازی بخشی ہے۔ اب تم اس میں داخل ہو جاؤ۔ اب نہ تمہارے لیے کوئی خوف ہے اور نہ کوئی غم۔ اور یہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اہلِ اعراف موقف اور میدانِ حشر میں بلند ترین شخصیتیں ہیں جن کی سب پر برتری ظاہر کی جا رہی ہے۔ یہ نہ فرشتے ہیں نہ انبیاء اور نہ وہ ہیں جن کے گناہ اور نیکیاں برابر ہیں بلکہ یہ تو وہ مردانِ کار ہیں جنہوں نے دین کی سربلندی کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ محض اعلاء کلمۃ اللہ اور دین کی سرسبزی کے لیے اپنے گھر اپنے مشاغل اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر نکلے۔ راہِ خدا میں مشقتیں اور محنتیں اٹھائیں۔ چین و آرام قربان کیا۔ کسی صاحبِ دل نے جنت کی یہ تعریف خوب کی ہے:

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد

دنیا میں کوئی بڑی سے بڑی مسرور زندگی بھی ایسی نہیں مل سکتی جس کے پہلو میں مسرت کے پھول کے ساتھ غم کا کوئی کانٹا نہ چبھ رہا ہو یا تو موجودہ مسرت کے آئندہ ختم ہو جانے کا خوف ہے اور یا گزشتہ

له افادات شیخ الاسلام

ناکامی کا افسوس ہے۔ اس بنا پر یہاں کوئی خوشی بھی کامل نہیں مگر جنت وہ مقام ہوگا جہاں نہ ماضی و حال کا غم ہوگا اور نہ مستقبل کا خوف ہوگا لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ کے ذریعے بار بار اسی کا اظہار ہو رہا ہے اور یہی بہشت کی سب سے بڑی نعمت ہوگی۔ اس میں جسمانی اور روحانی ہر قسم کی نعمتیں داخل ہیں۔

دُنیا میں کوئی انسان اس وقت تک گلے سے لقمہ نہیں اتار سکتا اور نہ کوئی چھیتڑا بدن پر رکھ سکتا ہے جب تک کہ اس کے سر کا پسینہ پاؤں تک نہ آئے۔ دُنیا کی تمام فانی مسرتیں ہماری فانی کوششوں کا نتیجہ ہیں مگر جنت کی خوشیاں بے غم و تکلیف ہماری گزشتہ فانی نیکیوں کا غیر فانی نتیجہ ہیں اور یہ محض اللہ کا فضل و کرم ہے کہ وہاں ہم کو ہماری آسائش کا تمام سامان اس قسم کی ادنیٰ زحمت و مشقت اٹھائے بغیر میسر آئے گا جس کے بغیر دنیا میں کوئی انسان زندہ نہیں رہ سکتا اور جس کی کشمکش سے یہ دُنیا ہر انسان کے لیے دوزخ بنی ہے۔

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ
الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾
الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّ لَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ
فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا
يَجْحَدُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى
وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ
يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ
رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ
فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ
عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۵۳﴾ ع ۶

اور دوزخی جنتیوں کو پکار کر کہیں گے کہ کچھ تھوڑا سا پانی ہمیں بھی دو
یا جو نعمتیں اللہ نے تمہیں عطا کی ہیں ان میں سے کچھ دو[۶۴]۔ اہلِ جنت

جواب دیں گے کہ اللہ نے یہ دونوں چیزیں ان کافروں پر حرام کردی ہیں
جنھوں نے دُنیا کی زندگی میں اپنے دین کو تماشا اور کھیل بنا لیا تھا اور جن
کو دُنیا کی زندگی نے فریب میں مبتلا کر رکھا تھا[65]۔ لہٰذا آج ہم بھی
ان کو اسی طرح بھول جائیں گے جیسے وہ اپنے اس دن کی ملاقات
کو بھولے ہوئے تھے اور ہماری آیتوں کا انکار کرتے رہے[66]۔
اور بلاشبہ ہم ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب لائے ہیں جس
میں ہم نے علمی تفصیلات فراہم کی ہیں اور یہ کتاب اہلِ ایمان کے
لیے ہدایت و رحمت ہے[67]۔ کیا یہ لوگ اعمال کے نتیجے آنکھوں سے
دیکھنا چاہتے ہیں جس روز نتائج ظاہر ہوں گے اس دن وہ لوگ
جو اسے پہلے سے طاق نسیان بنائے بیٹھے تھے کہیں گے بلاشبہ
ہمارے رب کے پیغمبر ہمارے پاس سچائی کا پیام لے کر آئے تھے[68]۔
کاش ہمیں کچھ سفارشی ملیں کہ ہماری شفاعت کر سکیں یا کاش

پھر دُنیا میں لوٹ جائیں کہ جو کچھ ہم پہلے کرتے تھے اس کی جگہ اب دوسرے طریقے پر عمل کر لیں[۶۹]۔ بلاشبہ ان لوگوں نے اپنی تباہی کا سامان کیا اور ان کی افترا پردازیوں کا نام ونشان نہ رہا[۷۰]۔

معانی مفردات

حرّمَ، حرام کیا تحریم سے ماضی کا واحد مذکر غائب، جس چیز سے روک دیا جاتے وہ حرام ہے۔ خواہ بر تسخیرِ الٰہی ممنوع ہو یا بذریعہ منع قہری یا عقل کی رو سے یا قانون کی طرف سے۔ اس آیت میں منع قہری سے حرمت ہے یعنی کافروں کو بزور قوت ان نعمتوں سے محروم کردیا۔ دینؔ، جزاء، طاعت، شریعت، بدلہ دینا، اطاعت کرنا، حکم ماننا، دین بمعنے ملت بھی آتا ہے مگر اس کا استعمال اطاعت اور شریعت کی پابندی کے معنے میں ہوتا ہے دان یدین کا مصدر ہے، جمع ادیان ہے۔ لھو و لعب، لھو اسم مصدر، سنجیدگی چھوڑ کر مزاح کی طرف میلان اور جھکاؤ لہو کہلاتا ہے اور کسی ایسے غیر مفید کام میں مشغول ہونا جس کے باعث مفید کام ترک ہو جائے لعب ہے۔ (ابوالسعود) امام راغب نے اس کا عکس بتایا ہے۔ یجحدونؔ، جحود سے مضارع کا جمع مذکر غائب ہے وہ انکار کرتے ہیں۔ جحود کے اصلی معنے دل میں جس چیز کا ثبات ہو اس کا انکار اور جس کا انکار ہو اس کا اثبات کرنے کے ہیں۔ تاویلؔ، تعبیر بنانا، کل بٹھانا بیان حقیقت، ٹھیک پڑنا، بروزن تفعیل مصدر ہے۔ اول سے بنا ہے جس کے معنے اصل کی طرف لوٹنے کے ہیں۔ اسی لیے مرجع اور بازگشت کو مؤئل کہتے ہیں کسی چیز کو خواہ وہ شی علم ہو یا فعل اس کی اصل کی طرف لوٹانے کا نام تاویل ہے علم کی مثال ومایعلم تاویلہ الا اللہ اور فعل کی مثال خود یہ آیت ہے جس کی یہاں تشریح پڑھ رہے ہو۔ شفعاءؔ، سفارشی، سفارش کرنے والے۔ شفیع کی جمع ہے۔ سارے قرآن میں اسی طرح لکھا گیا ہے مگر سورہ روم میں اس طرح مرقوم ہے۔ شفعٰؤا، یعنی واو کے ساتھ لیکن واو پڑھنے میں نہیں آتا۔

اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کی گفتگو

جنت والوں اور دوزخ والوں کی اس گفتگو سے کسی حد تک اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عالمِ آخرت میں انسانوں کی قوتوں کا پیمانہ کس قدر وسیع ہو جائے گا وہاں آنکھوں کی بینائی اس قدر وسیع پیمانے پر ہوگی کہ جنت و دوزخ کے لوگ جب چاہیں گے ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے وہاں آواز اور سماعت بھی اتنے بڑے پیمانے پر ہوگی کہ ان مختلف دنیاؤں کے لوگ ایک دوسرے سے بآسانی گفتگو کرسکیں گے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے بیانات جو آخرت کے متعلق ہمیں قرآنی مطالعہ میں ملتے ہیں، اس بات کا تصور دلانے کے لیے کافی ہیں کہ وہاں زندگی کے قوانین ہماری موجودہ دنیا کے قوانین طبعی سے بالکل مختلف ہوں گے۔ اگرچہ ہماری شخصیتیں یہی رہیں گے جو یہاں ہیں۔

جن لوگوں کے دماغ اس عالمِ ناسوت کے حدود میں اس قدر مقید ہیں کہ موجودہ زندگی اور اس کے مختصر پیمانوں سے وسیع تر کسی چیز کا تصور ان میں نہیں سما سکتا وہ قرآن وحدیث کے ان بیانوں کو بڑے تعجب اور حیرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بسا اوقات ان کا مذاق اڑا کر اپنی ضعیف العقل ہونے کا ثبوت دیتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان بیچاروں کا جتنا دماغ تنگ ہے زندگی کے امکانات اتنے تنگ نہیں ہیں۔

۵۰ - اور دوزخی جنتیوں کو پکار کر کہیں گے کہ کچھ تھوڑا سا پانی ہمیں بھی دو یا جو نعمتیں اللہ نے تمہیں عطا کی ہیں ان میں سے کچھ دو۔ دوزخی بدحواس ہو کر اہلِ جنت کے سامنے دستِ سوال دراز کریں گے کہ ہم جلے جاتے ہیں تھوڑا سا پانی ہم پر بہاؤ یا جو نعمتیں خدا نے تمہیں دے رکھی ہیں کچھ ان سے ہمیں بھی فائدہ پہنچاؤ۔[1]

افیضوا افاضہ سے ہے افاضہ کے معنے گرانے اور بہانے کے ہیں اور اس کے معنے میں بہتات پائی جاتی ہے۔ رزق کا مقابلہ بطورِ عطف پانی سے کیا ہے۔ علامہ آلوسی نے اس تقابل سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ پانی دے دو یا پینے کی جو چیز اللہ نے تمہیں عطا کی ہے وہ دے دو۔ اس طرح معطوف اور معطوف علیہ میں فعل افیضوا سے مناسبت پیدا ہو گئی ہے اور اگر مما رزق کے لیے فعل علیحدہ ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ پانی دے دو یا کھانے کی کوئی چیز جو اللہ نے تمہیں دی ہو وہ ہی دے دو۔ اس صورت میں یہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آیت اس بات کی دلیل ہے کہ دوزخ میں دوزخیوں کو بھوک اور پیاس کی شدت سے دوچار ہونا پڑے گا اور ان کا دوزخ کے اندر عذاب میں ابتلا اس سوال سے مانع نہ ہوگا۔ اور آیت سے اشارہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جنت بلند اور اونچی جگہ پر ہوگی ایسے ہی دوزخ پست اور زیریں مقام پر ہوگی۔ الجشمی نے یہ بات آیت افیضوا سے سمجھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دوزخ والے جنت والوں سے درخواست کریں گے کہ کھانے پینے کی جن نعمتوں سے وہ متمتع ہو رہے ہیں ان پر بھی ان کا کچھ فیضان کریں۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے دوزخیوں کی اس درخواست کی تشریح اس طرح کی ہے کہ ایک دوزخی جنت کے مکین اپنے بھائی سے کہے گا بھائی میری مدد کر میں جل گیا ہوں کچھ تھوڑا سا پانی بہا، کھانے سے پہلے پانی کی درخواست اس لیے کی ہے کہ جہنم میں جلن، گرمی، تپش اور پیاس کی وجہ سے دوزخیوں کو پانی کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ شائد اسی بنا پر دُنیا میں پانی کے صدقہ کی زیادہ فضیلت آئی ہے۔ بیہقی کی شعب الایمان میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ بزرگ ترین صدقہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا بہترین صدقہ پانی پلانا ہے اور فرمایا کیا تم نے دوزخیوں کی یہ درخواست نہیں سنی ہے افیضوا علینا من الماء۔ مسند احمد میں ہے کہ سعد بن عبادہ کی والدہ کا انتقال ہوا، انہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی والدہ کے لیے صدقہ کرنے کے بارے میں دریافت کیا آپ نے ہاں کہہ کر سعد کی حوصلہ افزائی کی۔ سعد نے پوچھا کہ سب سے اچھا صدقہ کونسا ہے؟ آپ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ پانی پلانا۔

نعماتِ جنت سے محرومی کی وجہ

۶۵۔ اہلِ جنت جواب دیں گے کہ اللہ نے یہ دونوں چیزیں ان کافروں پر حرام کردی ہیں جنہوں نے دُنیا کی زندگی میں اپنے دین کو تماشا اور کھیل بنالیا تھا اور جن کو دنیاوی زندگی نے فریب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ جواب ملے گا کہ کافروں کے لیے ان چیزوں کی بندش ہے یہ کافر ہی تو ہیں جو دین کو کھیل اور تماشا بناتے تھے اور دُنیا کے تنعم پر پھولے رہتے تھے۔ حرمھما میں جس حرمت کا ذکر ہے یہ قانونی اور شرعی حرمت کے معنے میں نہیں بلکہ یہ اس معنے میں ہے کہ اللہ سبحانہ نے بقہر اہلِ دوزخ کو جنت کی ان نعمتوں سے محروم کر دیا ہے۔ اہلِ جنت کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو سوال کے پورا کرنے میں تو کوئی عذر نہیں ہے۔ ان کے پاس ہر نعمت کی فراوانی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے چونکہ اہلِ دوزخ کو ان نعمتوں سے محروم کر دیا ہے اس لیے نہ یہ ان کو پہنچ سکتی ہیں اور نہ وہ ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اس کے بعد اس سوال کا جواب دیا ہے کہ اہلِ دوزخ کو ان نعمتوں سے اللہ نے کیوں محروم کیا ہے

فرمایا کہ اس محرومی کی وجہ یہ ہے کہ الذین اتخذوا دینھم لھوا و لعبا ، یعنی اللہ نے ان پر جو چیز دین کی حیثیت سے اتاری تھی اس کو انہوں نے لہو و لعب بنالیا تھا - دین اس لیے آتا ہے کہ زندگی کے ہر پہلو میں صحیح نقطہ نظر متعین کرے تاکہ لوگ ہلاکت میں پڑنے کے بجائے فلاح و سعادت سے ہمدوش ہوں لیکن جب کسی عمل کا اصل محرک کمزور پڑ جاتا ہے اور وہ رسمی طور پر یا محض ضابطہ کی پابندی کے خیال سے کیا جائے تو اس کے مطلوبہ اثرات مرتب نہیں ہوتے - اعمال تو ہوتے ہیں مگر تزکیہ کی روح سے بیگانہ ہوتے ہیں ، دین کے نام پر جو کچھ بھی کرتے ہیں اس کا مقصد یا تو محض ہوائے نفس کا تقاضا پورا کرنا اور لذت گیری ہوتا ہے کہ اس میں لگ کر مفید اعمال سے زندگی خالی ہو جاتی ہے اور یا بلا مقصد فضول کاموں کو اپنا لیتے ہیں - پہلی حالت کا نام لہو ہے اور دوسری کو لعب کہتے ہیں - دین کو لہو و لعب بنا لینے کے بعد امتوں میں دین کا تصور یہ ہو کر رہ جاتا ہے کہ وہ رواجی اعمال کا نام ہے زندگی سے اس کا تعلق ہے تو بس اتنا کہ انسان دین کو مان لے یا آج کی اصطلاحی زبان میں دین پسند ہو جائے اگر بے تعصبی اور انصاف کے ساتھ ہمارے عوام پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے جذبہ دینی میں چند رسموں اور رواجوں سے زیادہ آگے بڑھنے کی قوت مفقود ہے - دین سے جو کچھ محبت باقی ہے وہ صرف چند رسوم کی حفاظت اور بقا کی خواہش تک محدود ہے اور اب گراوٹ اس درجے ہو چکی ہے کہ اگر ایک شخص یا علی مدد کا نعرہ لگا لیتا ہے یا ریڈیو ، ٹی وی پر الصلاۃ والسلام علیک یا رسول اللہ پڑھ دیا جاتا ہے یا عمل کی زندگی میں پر تپاک طور پر گیارہویں دلاتا ہے اور غمی اور خوشی کے موقعہ رسوم کی پابجائی کر لیتا ہے تو سمجھ لیتا ہے کہ دین باقی ہے - جہاں دین کا تصور یہ ہو وہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے دینی اور اخلاقی تصورات کی قوت سے آنے والے نظام کی تعمیر میں حصہ لیں گے - جو لوگ شب و روز اپنے ذاتی اغراض خاندانی مفاد کی فکر میں منہمک ہوں انہیں اس سے کیا بحث کہ زندگی کے بارے میں دین کے مطالبات کیا ہیں اور دنیا کس نہج پر چل رہی ہے اور نظام تمدن کس طرز پر تعمیر ہونے والا ہے جس جماعت کے افراد مقابر کی سالانہ حاضری اور چند یادگاریں منا کر نجات حاصل کر سکتے ہوں اسے میدان عمل میں آکر زندگی کی نئی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کی کیا ضرورت ہے جہاں گھر بیٹھے اوراد و وظائف سے جنت حاصل ہو سکتی ہو وہاں قرآن وسنہ کو لے کر اسلام کی مخالف قوتوں کا مقابلہ کرنے اور ان پر اللہ کے دین کو غالب کرنے کا جذبہ کیوں کر پیدا ہو - دین کا یہی تصور دین کو تماشا اور کھیل بناتا ہے - لعب کھیل کود کا نام ہے - یعنی دین کے نام پر ایسے اعمال و افعال کیے جائیں جو اپنے اندر کوئی نتیجہ نہیں رکھتے - لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ بچپن میں بچے مٹی خاک کے گھروندے بنا بنا کر خوش ہوتے ہیں حالانکہ نہ ان گھروں میں کوئی رہ سکتا

ہے نہ ان سے اور کسی قسم کا کوئی فائدہ اٹھا سکتا ہے اس قسم کے اعمال دین کے نام پر کرنا بھی دین کو کھیل بنانا ہے۔ لہو کے معنے غفلت کے ہیں تماشے کے معنے دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دینی اعمال کو ان کی روح اور مقاصد سے بیگانہ کر کے اپنانا یہ دین کو تماشا بنانا ہے یعنی دین اور اس کے اعمال یوں ہی بے نتیجہ اور لاحاصل ہو کر ختم ہو جاتے ہیں۔

قرآن دُنیا کی زندگی کو کھیل اور تماشا اسی لیے بتاتا ہے کہ منکرینِ آخرت کی زندگی یہاں بے نتیجہ اور بے روح ہو کر رہ جاتی ہے حالانکہ آخرت کے مقابلے میں دُنیا اس لیے ہے کہ دوسری زندگی میں اس کے اچھے نتائج برآمد ہوں۔ دُنیا ہی کی طرح جو لوگ دین کو بھی کھیل اور تماشا بنا لیں اور افکار و اعمال، تزکیہ سے بیگانہ کر دیں یا مفید کاموں سے ہٹ کر لذتوں والے کاموں میں لگ جائیں۔ دین کو لہو و لعب بنانے کے مترادف ہے۔

آخر میں اس سفیہانہ حرکت اور دین کی حد تک بے پرواطرزِ عمل کی وجہ بتائی ہے غرتھم الحیاۃ الدنیا، یعنی وہ کیوں دین کی نہایت سنجیدہ حقیقتوں سے بے پروا بنے رہے فرمایا اس لیے کہ دُنیا کی زندگی نے ان کو دھوکہ میں رکھا ہوا ہے۔ دین جیسی اہم الاہم چیز سے جو خدا کی جانب سے اس لیئے آئی کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں فلاح و سعادت کی راہ بتائے غافل بنا کر جس چیز نے آدمی کو الجھا رکھا ہے خود ہی سوچنا چاہیے کہ سرمایہ فریب اس کے سوا کیا ہے۔ یعنی دُنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں رکھا انہوں نے دیکھا کہ وہ کھا رہے ہیں پی رہے ہیں، مزے اڑا رہے ہیں اور ان سے کوئی پوچھ گچھ نہیں ہو رہی ہے۔ اس سے وہ سمجھ بیٹھے کہ بس دُنیا اسی لیے پیدا ہوئی ہے اور اگر کسی اللہ کے بندے نے ان کو خبردار کیا تو اس کے پیچھے پڑ گئے کہ یہ قدامت پسند ہے ہماری ترقی میں رکاوٹ ڈال رہا ہے۔

آخرت فراموشی کا نتیجہ

۶۶۔ لہٰذا آج ہم بھی ان کو اس طرح بھول جائیں گے جیسے وہ اپنے اس دن کی ملاقات کو بھولے ہوئے تھے اور ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ یعنی ان کو دنیا کے مزوں میں پڑ کر آخرت کا خیال نہ آیا تھا آج ہم بھی ان کا کچھ خیال نہ کریں گے اور جس طرح انہوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا تھا آج ہم بھی ان کی درخواست منظور کرنے سے انکار کر دیں گے۔

لہ افادات شیخ الاسلام

یہ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے آیت میں نسیان بھولنے کے معنے میں نہیں بلکہ نظر انداز کرنے کے مفہوم میں ہے اور کما یہاں تشبیہ کے لیے نہیں بلکہ تعلیل کے لیے ہے یعنی چونکہ انہوں نے دُنیا میں زندگی آخرت فراموشانہ گزاری ہے اس لیے ہم بھی ان کے ساتھ ایسا معاملہ کریں گے۔

یہاں آخرت کے لیے لقاء یوم کی تعبیر آئی ہے دوسرے مواقع پر قرآن میں لقاء رب کی تعبیر بھی آئی ہے لقاء یوم ہو یا لقاء رب ہو دونوں کا حاصل ہے کہ آخرت کی توقع۔ حاصل یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا۔ یعنی اس دن میں اپنے رب کی ملاقات کو بھلائے رکھا۔ آج جزاء کے موقعہ پر ان کو طاق نسیان بنا دیا جائے گا اس کو جزاء من جنس العمل کہتے ہیں اسی کا نام مشاکلہ ہے۔

وماکانوا بآیتنا یجحدون، کا عطف کما نسوا پر ہے۔ یعنی چونکہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے تھے اس لیے بھی ہم ان کو اس روز جزاء کے موقعہ پر نظر انداز کر دیں گے۔ آیت میں نظر انداز کرنے کی دو وجہیں بتائی گئی ہیں ایک آخرت فراموشی، دوسرے اللہ کی آیات کا انکار۔ سنن ترمذی میں آخرت میں ان کو نظر انداز کرنے کی جناب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے جو منظر کشی کی ہے وہ بھی گوش گزار فرمایئے۔

ابوسعید خدری اور ابوہریرہ دونوں بیان کرتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ روزِ قیامت ایک شخص جنابِ الٰہی میں پیش ہو گا، اللہ سبحانہٗ ارشاد فرمائیں گے بتاؤ کیا میں نے تمہیں بصارت، سماعت نہیں دی تھی اور مال و اولاد کی نعمت سے نہیں نوازا تھا کیا میں نے تمہارے لیے مویشیوں اور پیداوار کو مسخر نہیں کیا تھا۔ میں نے تجھے مکان بنانے اور ریاست کرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا تو آج کے دن کی حاضری کو مانتا تھا وہ جواب دے گا نہیں اللہ سبحانہٗ فرمائے گا آج تو بھی طاق نسیان ہو گا جیسا کہ تو مجھے دُنیا میں بھولتا رہا ہے۔

قرآن میں ضروریاتِ زندگی کی تفصیل

۵۲ – اور بلاشبہ ہم ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب لاتے ہیں جس میں ہم نے علمی تفصیلات فراہم کی ہیں اور یہ کتاب اہلِ ایمان کے لیے ہدایت و رحمت ہے۔ قرآن جیسی کتاب کی موجودگی میں جس میں تمام ضروریات کی عالمانہ تفصیل موجود ہے اور ہر بات کو پوری آگاہی کے ساتھ کھول کر بیان کیا ہے چنانچہ ایمان والے اس سے خوب منتفع ہو رہے ہیں غضب ہے کہ ان متکبر معاندوں نے کچھ بھی اپنے انجام پر غور نہیں کیا پھر اب پچھتانے سے کیا حاصل[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہاں سے روئے سخن منکرینِ قرآن کی طرف ہو گیا ہے فرمایا کہ آدم کی اولاد کو ہدایت وحی کے وقتاً فوقتاً ظہور کی جو خبر دی گئی اس کے مطابق محمد رسول اللہ ایک جامع، کامل اور آخری کتاب لے کر آتے ہیں اس کتاب میں پوری تفصیل کے ساتھ بتا دیا گیا ہے کہ حقیقت کیا ہے اور انسان کے لیے دنیا کی زندگی میں کون سا رویہ درست ہے اور صحیح طرزِ زندگی کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ پھر یہ تفصیلات قیاس، گمان یا وہم کی بنا پر نہیں بلکہ خالص علم کی بنیاد پر ہیں۔ یہاں لفظ علم کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے یعنی یہ خدا کے عظیم و سیع محیط علم پر مبنی ہے اور اس کتاب کا خاص وصف یہ ہے کہ جو مانتے ہیں ان کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اول تو اس کتاب کے مضامین اور اس کی تعلیمات ہی سجائے خود اس قدر صاف ہیں کہ آدمی اگر ان پر غور کرے تو اس کے سامنے راہِ حق واضح ہو سکتی ہے۔ پھر اس پر مزید یہ ہے کہ جو لوگ اس کو مانتے ہیں ان کی زندگی میں عملاً بھی اس حقیقت کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ انسانوں کی کیسی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور کتنی بڑی رحمت ہے کہ اس کا اثر قبول کرتے ہی انسان کی ذہنیت اس کے اخلاق اور اس کی سیرت میں بہترین انقلاب شروع ہو جاتا ہے۔ یہ اشارہ ہے ان حیرت انگیز اثرات کی طرف جو اس کتاب پر ایمان لانے سے صحابہ کرام کی زندگی میں ظاہر ہو رہے تھے، جو کتاب ایسے سانچے لے کر آئی ہو، جس سے ایسے اعمال ڈھلتے ہوں جو ایسی زندگیاں بناتی ہو اگر وہ ہدایت و رحمت نہیں ہے تو اور کس نام سے اسے پکارا جا سکتا ہے۔

گویا قرآن اگر اپنی تفصیل علمی سے منکرین کے خلاف حجت ہے تو اسی حیثیت میں یہ اہل ایمان کے لیے ہدایت و رحمت ہے۔

تفصیل سے مراد یہاں تفصیل اصطلاحی نہیں ہے کہ مسائل کی ہر قسم کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا جائے اور نہ یہ مطلب ہے کہ تمام جزئیات کا احاطہ کیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ دین کی زندگی میں انسان کو جس چیز کی ضرورت ہے اور جس پر مدارِ نجات ہے وہ سب کچھ قرآن میں کھول کر بتا دیا گیا ہے۔ مثلاً انکار کی حد تک انسانی زندگی شرک کی آلودگی سے داغدار تھی اور عقل انسانی نے توحیدِ ربوبیت اور توحیدِ الوہیت میں تفریق پیدا کر رکھی تھی کہ خدا کو رب، خالق اور مدبرِ امور مانتے تھے اور ایمان رکھتے تھے کہ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے لیکن یہ بات نہیں مانتے تھے کہ عبادت کا مستحق صرف اللہ ہی ہے۔ قرآن نے پوری تفصیل کے ساتھ کھول کر توحیدِ ربوبیت اور توحیدِ الوہیت کو سمجھایا اور توحیدِ ربوبیت سے توحید الوہیت پر استدلال کیا ہے بر اور اس قسم کے دوسرے مسائل پر قرآن نے بھرپور تبصرہ کیا ہے اور قدم قدم پر ان کے شکوک و شبہات کے تفصیلی جوابات دیے ہیں۔ بالخصوص نظریۂ آخرت پر جس کے قرآن کے اولین

مخاطب منکر تھے سیر حاصل بحث کی ہے۔ قیامت کے نام، قیامت کے اوصاف، قیامت کی حقیقت اور اس کے وقوع و امکان پر دلائل۔ جزا و سزا اور اس کے اصول، عدالت، شہادت، حساب، میزان اور جنت و دوزخ کے مناظر پیش کیے ہیں۔

ظہورِ نتائج کا دن اور منکرین

۵۳۔ کیا یہ لوگ اعمال کے نتیجے آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں جس روز نتائج ظاہر ہوں گے اس دن وہ لوگ جو اسے پہلے سے طاقِ نسیان بنا چکے تھے کہیں گے بلاشبہ ہمارے رب کے پیغمبر ہمارے پاس سچائی کا پیغام لیکر آئے تھے۔ کتاب اللہ میں جو دھمکیاں عذاب کی دی گئی ہیں کیا یہ اس کے منتظر ہیں کہ جب ان دھمکیوں کے مضمون کا مصداق سامنے آجائے تب حق کو قبول کریں۔ حالانکہ وہ مضمون جب سامنے آئے گا یعنی عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوں گے تو اس وقت کا قبول کرنا کچھ کام نہ دے گا[1] مطلب یہ ہے کہ اگر منکرینِ حق سرکشی سے باز نہیں آتے تو انہیں کس بات کا انتظار ہے کیا اس بات کا کہ انکار و بدعملی کے جن نتائج کی خبر دی گئی ہے ان کا ظہور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں لیکن جس روز ان کا ظہور ہوگا اس دن اس کی مہلت ہی کب ملے گی کہ کوئی ایمان لاتے وہ تو اعمالِ انسانی کے آخری فیصلے کا دن ہوگا[2]

دوسرے الفاظ میں اس مضمون کو یوں سمجھئے کہ جس شخص کو صحیح اور غلط کا فرق نہایت معقول طریقہ سے صاف صاف بتایا جاتا ہے مگر وہ نہیں مانتا۔ پھر اس کے سامنے کچھ صحیح لوگ صحیح راستہ پر چل کر مشاہدہ بھی کرا دیتے ہیں کہ غلط روی کے زمانے میں وہ جیسے کچھ تھے اس کی بہ نسبت راست روی اختیار کرکے ان کی زندگی کتنی بہتر ہو گئی ہے مگر اس سے بھی وہ کوئی سبق نہیں لیتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ صرف اپنی غلط روی کی سزا پاکر ہی مانے گا کہ ہاں یہ غلط روی تھی جو شخص نہ حکیم کے عاقلانہ مشوروں کو قبول کرتا ہے اور نہ اپنے جیسے بکثرت بیماروں کو حکیم کی ہدایات پر عمل کرنے کی وجہ سے شفایاب ہوتے دیکھ کر ہی کوئی سبق لیتا ہے اب وہ بسترِ مرگ پر لیٹ جانے کے بعد ہی تسلیم کرے گا کہ جن طریقوں پر وہ زندگی بسر کر رہا تھا وہ اس کے لیے واقعی مہلک ہے[3]

ذرا غور فرمائیے کہ منکرینِ قرآن نے کون سی بات جھٹلائی تھی؟ یہ کہ ان ہی میں سے ایک آدمی پر اللہ کی وحی نازل ہوتی یہ بات انہیں عجیب معلوم ہوئی اس لیے فوراً تکذیب پر آمادہ ہو گئے۔ قرآن یہاں بتا

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] ترجمان القرآن [3] تفہیم القرآن

رہا ہے کہ اس تکذیب کے نتائج کی نظریاتی طور پر ہم نے خبر دی ہے تم اسے نہیں مانتے ہو بلکہ اسے جھٹلاتے ہو۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ نتائج کے بارے میں ان نظریات کو اس وقت مانوگے جب اپنی آنکھوں سے ان کا پریکٹیکل اور عملی مصداق دیکھ لوگے۔ مصداق ظاہر ہونے کا دن کون سا ہے یہ روزِ قیامت ہے جہاں اعمال کے نتائج مجسم ہو کر سامنے آجائیں گے۔ ماننے والوں کا ایمان اور نہ ماننے والوں کا کفر عیاں ہو کر آئے گا۔ اس روز حقائق کی نمائش دیکھ کر دنیا میں منکرین بھی بول پڑیں گے کہ انبیاء نے جو کچھ کہا اور جس چیز کی خبر دی وہ ایک واقعہ اور حقیقت ہے۔ یعنی جب یہ باتیں نظریات سے ہٹ کر واقعات کی صورت میں ظاہر ہوں گی تب ان کی آنکھیں کھلیں گی اور پکار اٹھیں گے کہ ہمارے رب کے رسولوں نے جن باتوں سے ہم کو آگاہ کیا تھا وہ سب بلاشبہ حقیقت ثابت ہوئیں۔ اس کے بعد کیا ہوگا یہ آگے آرہا ہے۔

مشاہدے کے بعد ماننا معتبر نہیں

۶۹۔ کاش ہمیں کچھ سفارشی ملیں کہ ہماری سفارش کر سکیں یا کاش ہم پھر دنیا میں لوٹ جائیں کہ جو کچھ ہم پہلے کرتے تھے اس کی جگہ کچھ اور عمل کریں۔ اس وقت ان کو ایسے سفارشیوں کی تلاش ہوگی جو خدا کی سزا سفارش کر کے معاف کرا دیں اور چونکہ ایسا سفارشی کا فردں کو کوئی نہ ملے گا تو یہ تمنا کریں گے کہ ہمیں دنیا میں بھیج کر امتحان کر لیا جاتے کہ اس مرتبہ ہم اپنے جرائم کے خلاف کیسی نیکی اور پرہیزگاری کے کام کرتے ہیں لیکن اب اس تمنا سے کیا حاصل ہے[1]

یہاں اہلِ کفر و تکذیب کے بارے میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں ایک یہ تمنا کہ اس مصیبت میں کوئی شفاعت کرنے والا مل جاتے، دوسرے یہ تمنا کہ اگر ہمیں دنیا میں واپس بھیج دیا جاتے تو ہم ایمان و عمل کی پونجی لے کر آئیں۔ اور یہ تمنا اس وقت کریں گے جب انبیاء کے بتاتے ہوئے نظریات کو واقعات اور حقائق کی صورت میں آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ شفاعت کی تمنا اس غلط تصور کی وجہ سے کریں گے جو خدا اور بندوں کے تعلق کی نسبت ان کے ذہن میں دنیا میں قائم تھا۔ وہ اللہ سبحانہ اور بندوں کے درمیان وہی نسبت سمجھتے تھے جو ایک قاہر و جابر بادشاہ اور اس کی رعیت کے درمیان ہوتی ہے جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور عمومی رعایا کی رسائی درباری سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر ممکن نہیں سمجھتے تھے اسی طرح وہ خدا کے دربار تک بھی بغیر سفارشیوں کے پہنچنا ممکن نہ سمجھتے تھے

[1] افادات شیخ الاسلام

اسی لیے وہ ان درمیانی ہستیوں کو خوش رکھنے کی ضرورت کے بھی معتقد تھے۔ چنانچہ وہ جن ہستیوں کی تصاویر بنا کر پوجتے تھے اسی نیت سے پوجتے تھے اور کہتے تھے ھؤلاء شفعائنا عند اللہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ قرآن نے جب ان کی مشرکانہ عبادت پر ان کو ملامت کی تو انہوں نے صاف کہا ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفی۔ ہم ان کو صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے تقرب میں نزدیک کر دیں۔

جن کی وہ مشرکانہ عبادت کرتے تھے ان کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ وہ خدا کی طرف سے دونوں عالم میں مختار ہیں۔ وہ یہاں دینے نہ دینے اور اس عالم میں بخشنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اس عقیدہ کا نام ان کے یہاں شفاعت تھا۔

قرآن نے یہاں بتایا ہے کہ دنیا میں یہ تصور رکھنے والے لوگ حقائق و واقعات ظاہر ہو جانے کے بعد حسرت سے کہیں گے اور تمنا کریں گے کہ ہے کوئی شفاعت کرنے والا جو ہماری شفاعت کرے۔ اس حسرت و تمنا کا کیا بنے گا اس کا جواب آگے قد خسروا میں آ رہا ہے۔

دوسری تمنا یہ کریں گے کہ ہے کوئی صورت کہ ہم دنیا میں واپس جائیں اور نیک عمل کی مایہ سے کر آئیں۔ یعنی دوبارہ اس دنیا میں آنے کی خواہش کریں گے اور کہیں گے کہ جس حقیقت کی ہمیں خبر دی گئی تھی اور اس وقت ہم نے نہ مانا تھا اب مشاہدہ کر لینے کے بعد ہم اس سے واقف ہو گئے ہیں لہذا اگر ہمیں دنیا میں پھر بھیج دیا جائے تو ہماری عملی زندگی وہ نہ ہو گی جو پہلی تھی۔ اس درخواست کا جواب آگے آ رہا ہے۔

دونوں تمناؤں کا جواب

۷۔ بلاشبہ ان لوگوں نے اپنی تباہی کا سامان کیا اور ان کی افتراء پردازیوں کا نام و نشان نہ رہا۔ پہلے خود اپنے ہاتھوں تباہ ہو چکے ہیں اور جو جھوٹے خیالات پکا رکھے تھے وہ سب رفو چکر ہو گئے[1]

یہ ان دو تمناؤں کا جواب ہے۔ پہلی تمنا یہ ہے کہ وہ اس روز کہیں گے کہ کوئی سفارشی مل جاتے جو ہماری سفارش کر دے دوسری تمنا یہ ہو گی کہ کوئی صورت ایسی ہو کہ ہم دنیا میں پھر واپس جائیں۔

قرآن نے قد خسروا انفسھم میں ان کی دوسری تمنا کا جواب دیا ہے کہ زندگی کی جو مہلت ان کو ملی تھی اس میں انہوں نے شرک کی گندگی اور گناہوں کی آلودگی سے اپنے کو سر تا سر گھاٹے میں رکھا ہے اعمال کی قیمت ایمان بالغیب سے پڑتی ہے اسے رد کر کے انہوں نے اپنے کاروبار میں گھاٹا اور نقصان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اٹھایا ہے اب نقصان ہونے اور دیوالیہ ہونے کے بعد اب حقائق اور نتائج کو آنکھوں سے دیکھنے کے بعد دوبارہ واپسی کی تمنا بے معنی ہے ۔ یہ لوگ آیات الٰہی کی تکذیب کر کے سخت گھاٹے میں پڑ گئے ۔ اب یہ چاہتے ہیں کہ واپس جا کر گھاٹا پورا کریں ۔ اگر بالفرض ان کو واپسی کا موقعہ فراہم کر دیا جاتے تو اس کی ضمانت کیا ہے کہ پھر وہی کچھ نہ کریں گے جو ماضی میں کر چکے ہیں ۔

ولو ردوا لعادوا لما نھوا عنہ وانھم لکاذبون ۔

اور اگر یہ لوٹا دیے جائیں تو وہی کریں گے جس سے روکے گئے تھے یہ جھوٹے ہیں ۔

پہلی تمنا کا یہ جواب دیا ہے کہ وہم و گمان اور خیالات کے زور سے جن جن کے بارے میں انہوں نے بطور خود شفاعت کا گھروندا تیار کر رکھا تھا وہ سارا خاکستر ہو کر رہ جاتے گا ۔ نجات کے بارے میں ساری افتراء پردازیاں بے جان ہو کر رہ جائیں گی ضَلَّ عنھم ما کانوا یفترون ۔ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے فرضی شفعاء اور شرکاء سب خواب و خیال ثابت ہوں گے کیونکہ ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ انہوں نے اپنے جی سے گھڑ کے خدا کی طرف منسوب کر رکھا تھا کہ خدا نے ان کو شفیع بنایا ہے ۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ
ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا
وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ
وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٥٤﴾

بلاشبہ تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا[1]، پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا[2]۔ جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے، جس نے سورج اور چاند تارے پیدا کیے سب اس کے فرمان کے تابع ہیں[3]۔ خبردار رہو اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے بڑا بابرکت ہے اللہ سارے جہانوں کا مالک و پروردگار ہے[4]۔

معانی مفردات

یوم، لغت میں یوم کے معنے مطلق وقت کے ہیں اور عرف میں طلوع شمس سے غروب

آفتاب تک کے وقت کو یوم کہتے ہیں اور یوم شرعی تاج العروس میں طلوع صبح صادق سے غروب آفتاب تک بتایا ہے۔ استوی، یہ مشترک المعانی لفظ ہے۔ استقرار اور ٹھہرنے کے معنے میں آتا ہے جیسے حضرت نوح کی کشتی کے بارے میں ہے فاستوت علی الجودی، جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی۔ ارادہ اور قصد کے معنے بھی دیتا ہے جیسے ثم استوی الی السماء ارادہ کیا متوجہ ہوا۔ قبضہ کرنے کے معنے میں بھی آتا ہے جیسے قد استوی بشر علی العراق بشر نے عراق پر غلبہ حاصل کر لیا اور قبضہ کر لیا۔ چڑھنے کے معنے بھی دیتا ہے جیسے استویت انت ومن معک علی الفلک جب تو اور تیرے کشتی پر چڑھ جائیں۔ عرش، تخت شاہی، امام ابوبکر عزیزی نزہتہ القلوب میں فرماتے ہیں، عرش کے معنے تخت شاہی کے ہیں۔ چنانچہ آیات ذیل میں عرش یہی مراد ہے ورفع ابویہ علی العرش اور اونچا کیا ماں باپ کو تخت پر اور اھکذا عرشک کیا تیرا تخت بھی ایسا ہی ہے ۔ اور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں رقمطراز ہیں عرش اصل میں مسقف چیز کو کہتے ہیں اور اس کی جمع عروش ہے اور اسی لحاظ سے عرشت الکرم کے معنے انگور کی بیلوں کے لیے ٹٹیاں اور چھتریاں لگانے کے ہیں۔ اسی لیے قرآن میں معروشات ہے اور بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ کو بھی اسی اعتبار سے عرش کہتے ہیں کہ وہ بلند ہوتا ہے۔ اور کبھی عرش عزت، غلبہ اور سلطنت سے بھی کنایہ ہوتا ہے محاورہ ہے فلاں ثل عرشہ فلاں کی عزت خاک میں مل گئی ۔

توحیدِ ربوبیت سے توحیدِ عبادت پر استدلال

ان آیات میں توحید ربوبیت سے توحید عبادت پر استدلال کیا گیا ہے۔ توحید عبادت یہ ہے کہ خدا کے سوا کوئی ہستی اس کی مستحق نہیں کہ اسے معبود بنایا جائے۔ توحید ربوبیت یہ کہ کائنات عدم سے وجود میں لانے والی اس کو چلانے والی ہستی صرف خدا ہی کی ہستی ہے۔ الا لہ الخلق والامر خلق بھی اس کی ہے اور اس کی مخلوق میں امر بھی اس کا ہے۔ عبادت بھی اس کی کی جاتی ہے اور طاعت بھی اس کی کی جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ خالق اللہ کو مان لیا جاتے لیکن عبادت اور طاعت کسی اور کی کی جاتے ۔

قرآن حکیم کے دلائل و براہین پر غور کرتے ہوتے یہ اصل ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اس کے استدلال کا طریقہ منطقی بحث و تقریر کا نہیں ہے جس کے لیے چند در چند مقدمات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور

پھر اثبات مدعا کے لیے تشکیلیں ترتیب دینی پڑتی ہیں بلکہ وہ ہمیشہ براہ راست تلقین کا قدرتی اور سیدھا سادہ طریقہ اختیار کرتا ہے عموماً اس کے دلائل اس کے اسلوب و بیان و خطاب میں مضمر ہوتے ہیں۔ وہ یا تو کسی مطلب کے لیے اسلوب خطاب ایسا اختیار کرتا ہے کہ اسی سے استدلال کی روشنی نمودار ہو جاتی ہے یا پھر کسی مطلب پر زور دیتے ہوئے کوئی ایک لفظ ایسا بول دیتا ہے کہ اس کی تعبیر میں اس کی دلیل بھی ہوتی ہے اور خود بخود مخاطب کا ذہن دلیل کی طرف پھر جاتا ہے۔ اس کی واضح مثال اس آیت میں صفت ربوبیت کا استعمال ہے یہاں آغاز ان ربکم سے کر کے انجام تبارک اللہ رب العالمین پر کیا ہے اور درمیان میں تخت شاہی اور لہ الخلق والامر لا کر اللہ کی شان حاکمیت کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ جیسے پرستش کی مستحق اللہ کی ذات ہے ایسے ہی بندگی بھی صرف اسی کی کرنی چاہیے۔ یہ واقعہ ہے کہ اللہ کی ربوبیت انسانی زندگی کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے اللہ کی ذات رب ہے اور رب کے سوا کون ہو سکتا ہے جو بندگی و نیاز کا مستحق ہو پرستش کے لیے یہاں ادعو کی اور بندگی کے لیے لا تفسدوا فی الارض کی تعبیر اختیار کی ہے۔ منشا یہ ہے کہ خلق وامر دونوں اللہ کی ذات سے ہیں یعنی وہی کائنات ہستی کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی آمر ہے تمہاری حیثیت صرف اسی کی مخلوق اور مامور ہونے کی ہے یہ نہیں کہ مخلوق تو تم اللہ کی ہو اور آمر اللہ کے سوا کوئی اور ہو۔ اسی لیے آیت میں تخت شاہی کا ذکر کیا ہے تاکہ لوگوں کو پتہ لگ جائے کہ سلطانی و حکمرانی کے سارے اختیارات جس ذات کے ہاتھ میں ہیں۔ عبادت و طاعت اور پرستش و بندگی کے تعلقات بھی اسے وابستہ ہونے چاہئیں۔

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ خدا اور مخلوق کے تعلقات کو واضح کرنے کے لیے انسانی زبان میں سے زیادہ تر وہ الفاظ، اصطلاحات، استعارات اور انداز بیان انتخاب کیے گئے ہیں جو سلطنت اور بادشاہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ طرز بیان قرآن میں اس قدر نمایاں ہے کہ کوئی شخص جو سمجھ کر قرآن پڑھتا ہو اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بعض کم فہم ناقدین کے معکوس دماغوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ کتاب جس عہد کی تصنیف ہے اس زمانے میں انسان کے ذہن پر شاہی نظام کا تسلط تھا اس لیے مصنف نے خدا کو بادشاہ کے رنگ میں پیش کیا۔ حالانکہ دراصل قرآن جس دائمی و ابدی حقیقت کو پیش کر رہا ہے وہ اس کے برعکس ہے وہ حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں میں بادشاہی صرف ایک ذات کی ہے اور حاکمیت جس چیز کا نام ہے وہ اسی ذات کے لیے خاص ہے اور یہ نظام کائنات ایک کامل مرکزی نظام ہے۔ جس میں تمام اختیارات کو وہی ایک ذات استعمال کر رہی ہے لہٰذا اس نظام میں جو شخص یا گروہ اپنی یا کسی اور کی جزوی یا کلی حاکمیت کا مدعی ہے وہ محض فریب میں مبتلا ہے۔ نیز یہ کہ اس نظام میں رہتے ہوئے انسان کے

لیے اس کے سوا کوئی دوسرا اور یہ صحیح نہیں ہو سکتا کہ اسی ذات کو واحد معبود مانا جائے اور سیاسی معنوں میں واحد مطاع تسلیم کرلے۔

قرآن میں بار بار ربوبیت کو عبادت کے لیے بطورِ دلیل پیش کیا ہے مثلاً یا ایھا الناس اعبدوا ربکم - اور اعبدوا اللّٰہ ربی و ربکم اور ان اللّٰہ ربی و ربکم فاعبدوہ - عبادت صرف پرستش ہی کا نام نہیں بلکہ پرستش اور بندگی دونوں کے مجموعہ کو عبادت کہتے ہیں۔ عبادت کی اسی جامعیت کی وجہ سے اس کے اندر وہ تمام ظاہری اور باطنی اعمال اور اقوال داخل ہیں جو اللّٰہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور جو اس کی خوشنودی کا باعث بنتے ہیں۔

۵۴ - بلاشبہ تمہارا رب اللّٰہ ہی ہے جس نے آسمان و زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ گزشتہ آیات میں معاد کا ذکر تھا۔ اس آیت میں مبداء کی معرفت کا ذکر ہے - وہاں قد جاءت رسل ربنا بالحق کہہ کر بتلایا تھا کہ جو لوگ دُنیا میں انبیاء و رسل سے منحرف رہتے تھے ان کو بھی قیامت کے دن پیغمبروں کی سچائی کی ناچار تصدیق کرنی پڑے گی۔ یہاں نہایت لطیف پیرائے میں خدا کی حکومت یاد دلاتے اور انبیاء و رسل کی ضرورت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد بعض مشہور پیغمبروں کے احوال و واقعات کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی تصدیق و تکذیب کرنے والوں کا آخرت سے پہلے ہی دُنیا میں کیا انجام ہوا۔ گویا یہ رکوع آنے والے کئی رکوعات کی تمہید ہے۔

آسمان و زمین کے چھ روز میں پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اتنے وقت میں جو چھ دن کے برابر تھا پیدا کیا۔ کیونکہ یہ متعارف دن اور رات تو آفتاب کے طلوع و غروب سے وابستہ ہیں۔ جب اس وقت آفتاب ہی پیدا نہ ہوا تھا تو دن رات کہاں سے ہوتا۔ یا یہ کہا جائے کہ عالمِ شہادت کے دن رات مراد نہیں۔ عالمِ غیب کے دن رات مراد ہیں جیسے کسی عارف نے کہا ہے :

غیب را ابرو آبے دیگر است
آسمان و آفتابے دیگر است

پہلی صورت میں پھر علماء کا اختلاف ہے کہ یہاں چھ دن سے ہمارے چھ دن کی مقدار مراد ہے یا ہزار برس کا ایک دن جیسے فرمایا وان یوماً عند ربک کالف سنۃ مما تعدون ایک روز تیرے رب کے نزدیک تمہاری شمار سے ایک ہزار سال جیسا ہے - میرے نزدیک یہ آخری قول راجح ہے بہرحال مقصود یہ ہوا کہ آسمان و زمین دفعۃً بنا کر نہیں کھڑے کیے گئے۔ شاید اول ان کا مادہ پیدا فرمایا ہو پھر اس کی استعداد کے مطابق بتدریج مختلف اشکال و صورتیں منتقل ہوتے رہے ہوں حتیٰ کہ چھ دن چھ ہزار سال میں وہ بجمیع تعلقاتہا موجودہ مرتب شکل میں موجود ہوئے جیسا کہ آج بھی انسان اور کل حیوانات و

نباتات وغیرہ کی تولید و تخلیق کا سلسلہ تدریجی طور پر جاری ہے اور یہ اس کی شان کن فیکون کے منافی نہیں ہے کیونکہ کن فیکون کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا کسی چیز کو وجود کے مختلف مدارج سے گزارنے کا ارادہ نہیں کرتا بلکہ ہر چیز کو بدون توسط اسباب و علل کے دفعۃً" موجود کرتا ہے۔[1]

یہی بات کہ تمہارا رب وہ اللہ ہے جس نے آسمان و زمین چھ روز میں پیدا فرماتے قرآن میں کئی جگہ دہرائی گئی ہے تفصیل تو انشاء اللہ پارہ ۲۴ میں آئے گی۔ یہاں اجمالاً اتنی بات ضرور سمجھ لیجئے کہ یوم سے ہمارا وہ دن مراد نہیں ہے جو طلوع شمس سے شروع ہو کر غروب آفتاب پر ختم ہو جاتا ہے بلکہ جیسا کہ شیخ الاسلام نے فرمایا ہے کہ یہ عالم شہادت کا نہیں بلکہ عالم غیب کا دن ہے۔ عالم غیب کے اسی دن کے بارے میں قرآن نے یہ بتایا ہے۔

ان یوماً عند ربک کالف سنۃ مما تعدون

ایک دن تمہاری اوقات شماری کے پیمانہ سے تیرے رب کے نزدیک تمہارے ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آسمان و زمین کی تخلیق چھ دوروں میں ہوئی۔

بعض شارحین قرآن نے ان چھ ایام سے ہماری دنیا کے چھ دن مراد لیے ہیں اور کچھ روایات ایسی نقل کردی ہیں جن میں کارنامہ تخلیق کی دنوں کے اعتبار سے تفصیل بتائی گئی ہے مثلاً مسند احمد اور صحیح مسلم کی روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ اللہ نے مٹی ہفتہ کے روز، پہاڑ اتوار کے روز، درخت پیر کے روز، مکروہ منگل کے روز، روشنی بدھ کے روز، حیوانات جمعہ کے روز اور آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن عصر کے بعد پیدا فرمایا۔

محدثین نے اس حدیث کو اپنی تنقیدات کا نشانہ بنایا ہے اور بتایا ہے کہ روایتی طور پر اس کا ارشاد نبوت ہونا ثابت نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی تخلیق سات روز میں ہوئی اور قرآن کی تصریح ہے کہ کائنات کی تخلیق چھ روز میں ہوئی۔ اسی لیے امام بخاری اور دوسرے محدثین نے اس حدیث پر کلام کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ ابوہریرہ کی کعب احبار سے روایت ہے حدیث مرفوع یعنی ارشاد نبوت نہیں ہے۔ غالباً روایت کے راوی حجاج بن الاعور کا یہ کارنامہ ہے کہ اس کی پیشانی پر قال رسول اللہ لگا دیا ہے ورنہ دراصل یہ کعب احبار کی بات ہے جس کا سرچشمہ یہودی روایات

[1] افادات شیخ الاسلام

ہیں۔ بہر حال چھ دنوں سے مراد چھ دور ہیں۔ دُنیا کا چھ ادوار میں پیدا ہونا تورات میں بھی مذکور ہے اور قرآن میں بھی بلکہ جہاں تک اس کے تدریجی ارتقاء کا تعلق ہے فلسفہ جدید بھی بڑے شدومد سے اس کا مدعی ہے۔ اس وجہ سے بجائے خود اس کائنات کا ارتقاء قدیم و جدید میں نزاعی نہیں ہے۔ ڈاکٹر محمد رفیع نے قرآن اور علم جدید میں بتایا ہے کہ :

مختصر طور پر ان سائنس دانوں کا خیال یہ ہے کہ سب سے پہلے برقی قوت کی لہریں ایک خاص قسم کی روشنی کی صورت میں تھیں جن کو کائناتی شعاعیں کہا جاتا ہے۔ اس روشنی کی لہریں فضا میں پھیلی ہوئی تھیں اور خود بخود متحرک تھیں۔ یہ ایک ہم رنگ اور یکساں قسم کا مادہ تھا جس سے بعد میں تمام کائنات ظہور میں آئی۔ پھر ان لہروں میں جا بجا گرہیں بن گئیں جو مثبت اور منفی قسم کے برقی آحاد کی صورت میں تھیں اور جنہیں الکٹرون اور پروٹان کہتے ہیں۔ پھر یہ برقی آحاد اپنی باہمی کشش سے ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے چھوٹے چھوٹے گروہ بن گئے جنہیں ہم سالمات کہتے ہیں۔ سالمات اپنے الکٹرانوں اور پروتانوں کی ترتیب اور تعداد کے لحاظ سے سو(۱۰۰) سے مختلف قسموں میں بٹ گئے۔ ہر نمونہ کے سالمات آپس میں مل کر کیمیاوی عناصر کے ذرات بن گئے۔ بعض کیمیاوی ذرات میں سالمات کی تعداد کم ہے اور بعض میں کئی سو تک ہے۔

شروع میں مادے کے ذرات دھوئیں یا گیس کے ایک بہت بڑے گھومتے ہوئے بادل کی طرح تھے یہ بادل اتنے بڑے تھے کہ ان کی اندرونی کشش ثقل ان کو سالم نہیں رکھ سکتی تھی لہٰذا وہ مختلف ٹکڑوں میں بٹ گئے۔ ہر ٹکڑا اپنے محور کے گرد گھوم رہا تھا اور اتنا بڑا تھا کہ اس کی کشش ثقل اس کے اجزاء کو بکھرنے نہیں دیتی تھی کیونکہ اگر اس کا حجم کم ہوتا تو کشش ثقل کی قلت کی وجہ سے اس کے اجزاء بکھر جاتے اور اگر زیادہ ہوتا تو وہ خود بخود تقسیم ہو کر چھوٹے ٹکڑوں میں مل جاتے۔ ان بادلوں کے اجزاء آپس میں جڑے ہوئے نہ تھے بلکہ فقط ایک دھوئیں کی شکل میں تھے اور ایک دوسرے سے الگ تھلگ تھے لیکن بادل کی مجموعی کشش ثقل کی وجہ سے اس کے اندر رہتے۔

قرآن کے اشارات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں مادہ دخانی تھا پھر اس میں انقسام ہوا یعنی بہت سے ٹکڑے ہو گئے۔ پھر ہر ٹکڑے نے ایک کرے کی شکل اختیار کر لی۔ اس آیت کو ثم استوی الی السماء وھی دخان کو ان السماوات والارض کانتا رتقا ففتقنا ھما، ملا کر پڑھیے تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ابتداء میں مادہ دخانی تھا اور یہ مادہ دخانی ملا ہوا تھا الگ الگ نہ تھا۔ پھر اس کے مختلف حصے ایک دوسرے سے جدا کر دیے گئے۔ ہر ٹکڑا کرہ کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ اور اسی کے ایک ٹکڑے سے

زمین بنی۔ پھر زمین میں کوئی تبدیلی ہوئی کہ دخانیت نے مائیت کی شکل اختیار کر لی یعنی پانی پیدا ہو گیا۔ پھر خشکی کے قطعات درست ہوتے، پھر پہاڑوں کے سلسلے نمودار ہوئے۔ پھر زندگی کا نمو شروع ہوا اور نباتات ظہور میں آگئیں۔ موجودہ زمانے میں اجرام سماویہ کی ابتدائی تخلیق اور کرۂ ارضی کی ابتدائی نشوونما کے جو نظریات تسلیم کیے گئے ہیں یہ اشارات بظاہر اس کی تائید کرتے ہیں۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس نے ان حقائق علمی کو جن کا قرآن کے مخاطبوں کو کوئی علم نہ تھا اس انداز میں پیش کر دیا کہ اس کے مخاطبوں کے لیے کوئی بوجھ نہ ہوا۔

عرش پر جلوہ فرمائی

۲۷۔ پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا۔ خدا تعالیٰ کی صفات و افعال کے متعلق یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ نصوص قرآن و حدیث میں جو الفاظ حق تعالیٰ کی صفات کے بیان کرنے کے لیے اختیار کیے گئے ہیں ان میں سے اکثر وہ ہیں جن کا مخلوق کی صفات پر بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً خدا کو حی، سمیع، بصیر، متکلم کہا گیا اور انسان پر بھی یہ الفاظ بولے گئے تو ان دونوں مواقع میں استعمال کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے۔ کسی مخلوق کو سمیع و بصیر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان موجود ہیں۔ اب اس میں دو چیزیں ہوئیں۔ ایک وہ آلہ جسے آنکھ کہتے ہیں اور جو دیکھنے کا مبداء اور ذریعہ بنتا ہے۔ دوسرا کا نتیجہ اور غرض و غایت (دیکھنا)، یعنی وہ خاص علم جو رویت بصری سے حاصل ہوا۔ مخلوق کو جب بصیر کہا مبداء اور غایت دونوں چیزیں معتبر ہوئیں۔ اور دونوں کی کیفیات ہم نے معلوم کر لیں۔ لیکن یہی لفظ جب خدا کی نسبت استعمال کیا جاتا ہے تو یقیناً وہ کیفیات جسمانیہ اور مبادی مراد نہیں ہو سکتے جو مخلوق کے خواص میں سے ہیں اور جن سے خداوند قدوس قطعاً منزہ ہے۔ البتہ یہ اعتقاد رکھنا ہوگا کہ ابصار دیکھنے کا مبداء اس کی ذات اقدس میں موجود ہے اور اس کا نتیجہ یعنی وہ علم جو رویت بصری سے حاصل ہو سکتا ہے اس کو بدرجہ کمال حاصل ہے۔ آگے یہ کہ وہ مبداء کیسا ہے اور دیکھنے کی کیفیت کیا ہے؟ تو بجز اس بات کے کہ اس کا دیکھنا مخلوق کی طرح نہیں ہے ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں لیس کمثلہ شیئ و ھو السمیع البصیر، نہ صرف سمع و بصر بلکہ اس کی تمام صفات کو اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ صفت باعتبار اپنے اصل مبداء و غایت کے ثابت ہے مگر اس کی کوئی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی اور نہ شرائع سماویہ نے اس کا مکلف بنایا ہے کہ آدمی اس طرح کی ماوراء عقل حقائق میں غور و خوض کر کے پریشان ہو۔ استواء علی العرش کو بھی اسی قاعدہ سے سمجھ لو۔ عرش کے معنے تخت اور بلند مقام کے ہیں۔ استواء کا ترجمہ اکثر محققین نے استقرار و تمکن سے کیا ہے گویا یہ لفظ تخت حکومت پر اس طرح قابض ہونے کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کا کوئی حصہ اور گوشہ حیطہ نفوذ

اقتدار سے باہر نہ ہے اور نہ قبضہ و تسلط میں کسی قسم کی مزاحمت اور گڑبڑی پائی جاتی ہے سب کام اور انتظام برابر ہو۔ اب دنیا میں بادشاہوں کی تخت نشینی کا ایک تو مبداء اور ظاہری صورت ہوتی ہے اور اب دنیا میں بادشاہوں کی تخت کا ایک تو مبداء اور ظاہری صورت ہوتی ہے اور ایک حقیقت یا غرض یعنی ملک پر پورا تسلط و اقتدار اور نفوذ و تصرف کی قدرت حاصل ہونا حق تعالیٰ کے استواء علی العرش میں یہ حقیقت اور غرض و غایت بدرجہ کمال موجود ہے یعنی آسمان و زمین کل علویات و سفلیات کو پیدا کرنے کے بعد ان پر کامل قبضہ و اقتدار ہر قسم کے مالکانہ و شہنشاہانہ تصرفات کا حق ہے۔ روک ٹوک اسی کو حاصل ہے جیسا کہ دوسری جگہ ثم استوی علی العرش کے بعد یدبر الامر وغیرہ الفاظ اور یہاں یغشی اللیل النہار سے اسی مضمون پر متنبہ فرمایا۔ رہا استوی علی العرش کا مبداء اور ظاہری صورت اس کے متعلق وہی عقیدہ رکھنا چاہیے جو ہم سمع و بصر وغیرہ صفات کے متعلق لکھ چکے ہیں کہ اس کی کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی جس میں صفات مخلوقین اور سمات حدوث کا ذرا بھی شائبہ ہو۔ پھر کیسی ہے اس کا جواب یہ ہے :

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہرچہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم !
منزل تمام گشت و بپایاں رسید عمر
باہم چناں در اول وصف تو ماندہ ایم!
لیس کمثلہ شیئ وھو السمیع البصیر[1]

صفاتِ باری میں مسلکِ تفویض

استواء علی العرش کا مسئلہ بھی اللہ سبحانہ کی صفات سے متعلق ہے۔ جیسا کہ شیخ الاسلام کی افادات میں تمہید بتا رہی ہے۔ متکلمین کے وجود میں آنے کے بعد صفاتِ الٰہیہ کی تفہیم کے لیے دو راہیں ہو گئیں۔ ایک تفویض، دوسرے تاویل۔ تفویض یہ ہے کہ کسی صفت میں کوئی تاویل نہ کی جائے۔ اصل بات کو مان کر اس کی کیفیت کو سپردِ خدا کر دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ جو بھی اس کے شایانِ شان ہو اللہ سبحانہ کے لیے تمثیل و تشبیہ کے تمام پردے ہٹا کر تنزیہہ کو مرتبہ کمال تک پہنچا دے لیکن تنزیہہ ایسی نہ ہو کہ تعطیل پیدا ہو جائے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

تنزیہہ اور تعطیل میں فرق ہے۔ تنزیہہ سے مقصود یہ ہے کہ جہاں تک انسانی عقل کی پہنچ ہے صفات الٰہی کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک اور بلند رکھا جائے۔ تعطیل کے معنے یہ ہیں کہ تنزیہہ میں نفی و نیستی کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ انسانی تصور کے لیے کوئی بات ہی باقی نہ رہے۔ تفویض میں تنزیہہ کی تکمیل ہے تعطیل کی ابتداء نہیں۔ جس طرح اثبات صفات میں غلو تشبیہ و تمثیل کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی طرح نفی صفات میں غلو تعطیل تک پہنچا دیتا ہے اور دونوں غلط ہیں۔ اگر تشبیہہ انسانی تصور کو ناآشنائے حقیقت بناتا ہے تو تعطیل عقیدے کی روح سے محروم کر دیتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ افراط و تفریط دونوں سے بچ کر رہیں۔ تشبیہہ و تعطیل دونوں کے درمیان راہ نکالی جائے۔ اسی کا نام تفویض ہے۔ یہ دونوں راہوں کے درمیان ہے اور دونوں انتہائی سمتوں سے محفوظ ہے۔

اگر اللہ سبحانہ کی صفات کے لیے کوئی ایسی صورت باقی نہ رہے جو فکرِ انسانی کی پکڑ میں آسکتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تنزیہہ کے معنے نفی وجود کے ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں فکرِ انسانی کے لیے کوئی سر رشتہ تصور باقی نہیں رہے گا کیونکہ صرف سلبی تصور کے ذریعے ہم ہستی کو نیستی سے جدا نہیں کر سکتے۔

غیر صفاتی تصور کو انسان پکڑ نہیں سکتا اور اسے طلب ایسے مطلوب کی ہے جو اس کی پکڑ میں آسکے وہ ایک ایسا جلوہ محبوبی چاہتا ہے جس کے عشق میں اس کا دل اٹک سکے۔ جس کے حسن گریزاں کے پیچھے وہ والہانہ دوڑ سکے جس کا دامن کبریائی پکڑنے کے لیے ہمیشہ اپنا دستِ عجز و نیاز بڑھاتا رہے جو اگرچہ عرش کی بلندی پر ہو لیکن پھر بھی اسے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہو۔ اذا سألك عبادی عنی فانی قریب۔

اسی لیے تفویض کی راہ ایک طرف تو تنزیہہ کو اس کے درجہ کمال تک پہنچا دیتی ہے۔ دوسری طرف تعطیل سے بھی تصور کو بچا لیتی ہے۔ وہ فرداً فرداً تمام صفات و افعال کا اثبات کرتی ہے مگر ساتھ ہی تشبیہہ و تمثیل کی بھی قطعی نفی کر دیتی ہے۔ اسی راہ کی قرآن رہنمائی کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ خدا حسن و جمال کی ان تمام صفتوں سے متصف ہے جو فکرِ انسانی میں آسکتی ہیں لیکن یہ بھی صاف صاف اور بے لچک لفظوں میں بتا دیتا ہے کہ اس سے مشابہ کوئی چیز نہیں ہے جو تمہارے تصور میں آسکے۔ وہ عدیم المثال ہے لیس کمثلہ شیئ تمہاری نگاہ اسے پا نہیں سکتی، لا تدرکہ الابصار،

راہ کی نزاکت کا یہ عالم ہے کہ اگر تنزیہہ کی طرف زیادہ جھکتے ہیں تو تعطیل میں گر جاتے ہیں۔ اگر اثبات صفات کی صورت آرائیوں میں دور نکل جاتے ہیں تو تشبیہ و تجسم میں کھوتے جاتے ہیں۔ اس لیے نجات

کی راہ صرف یہی ہے کہ دونوں کے درمیان قدم سنبھالے رکھیں۔ اثبات کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے تنزیہہ کی باگ بھی ڈھیلی نہ پڑنے پائے۔ اثبات سے اس کی صفات کا نقشہ سامنے آئے گا۔ تنزیہہ کے ذریعہ تشبیہ سے بچاؤ ہو گا۔

علم کلام کے مختلف مدارس میں تاویل و توجیہ کی نظری کاوشیں پیدا ہوئیں اور صفات کا مسئلہ بحث و نظر کا ایک معرکۃ الارا مسئلہ بن گیا۔ جھمیہ اور باطنیہ قطعی انکار کی طرف گئے معتزلہ نے انکار نہیں کیا مگر رُخ اسی طرف رہا۔

تمام صفات کی طرح اس موضوع یعنی استوار علی العرش میں بھی دو مسلک رونما ہو گئے۔ ایک ارباب تفویض کا اور دوسرا ارباب تاویل کا۔

امام بیہقی نے ابن وہب کے حوالہ سے بتایا ہے کہ میں امام مالک کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک شخص آیا اور اس نے امام موصوف سے دریافت کیا کہ اے ابو عبداللہ قرآن میں ہے الرحمان علی العرش استوی یہ بتائیے کہ اللہ عرش پر کیسے مستوی ہے۔ حضرت امام مالک نے سوال سن کر سر نیچے کر لیا اور خوف سے پسینہ پسینہ ہو گئے۔ بعدازیں سر اونچا کیا اور فرمایا کہ ایسا ہی ہے جیسے اللہ نے فرمایا کہ وہ عرش پر مستوی ہے۔ استوار معلوم ہے اور کیفیت استوار مجہول ہے اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔

ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر اور شرح قصیدہ بدء الامالی میں حضرت امام ابو حنیفہ کا بھی یہی مسلک نقل کیا ہے۔ بلکہ حافظ ذہبی نے کتاب العلو میں تمام اہل السنہ کی طرف نسبت کر کے بتایا ہے کہ:

تمام اہل السنہ کی یہی رائے ہے کہ استوار کی کیفیت ہماری فکری دسترس سے بالا اور ہمارے لیے مجہول ہے لیکن نفس استوار معلوم ہے جیسا اس کی شایان شان ہو ہم اس معاملے میں تعمق سے کام نہیں لیتے اور نہ اس کے لوازم کی گہرائیوں میں جانا چاہتے ہیں بلکہ کیفیت کی حد تک ہم سکوت اختیار کرتے ہیں۔ یہی سلف کا مذہب ہے۔ اگر اس میں تاویل کی کوئی گنجائش ہوتی تو بلاشبہ صحابہ و تابعین سے منقول ہوتی۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ اللہ سبحانہ، جیسے اپنی صفات میں عدیم المثال ہے ایسے ہی اپنے استوار میں بھی عدیم المثال ہے۔

امام ابوالحسن الاشعری اپنی مشہور کتاب الابانۃ فی اصول الدیانہ میں رقمطراز ہیں:

اگر کوئی دریافت کرے کہ تم معتزلہ، قدریہ، جھمیہ، حروریہ، روافض اور مرجیہ کی تردید کرتے ہو تم بتاؤ کہ استوار علی العرش کے بارے میں تم کیا کہتے ہو۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ

ہم وہی کچھ کہتے ہیں جو اللہ کی کتاب اللہ کے رسول کی سنت، صحابہ، تابعین، ائمہ حدیث کہتے ہیں اور یہی ہمارا اعتقاد ہے۔

امام بیہقی نے امام ابوالحسن اشعری سے نقل کیا ہے کہ

اللہ سبحانہ نے عرش میں کوئی کام کیا ہے جس کا نام اس نے استواء رکھا ہے جیسے کہ اس کے دوسرے افعال ہیں۔ ان میں سے کچھ کا نام رزق اور نعمت ہے۔ کیونکہ ثم یہاں تراخی کے لیے ہے اور تراخی افعال میں ہوتی ہے نہ کہ صفات میں۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

لوگوں کے اس آیت کی تشریح میں مختلف خیالات ہیں۔ لیکن اپنانے کی چیز صرف سلف صالحین کا مسلک ہے یعنی امام مالک، امام اوزاعی، امام ثوری، امام لیث، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق اور ان کے علاوہ قدیم اور جدید ائمہ اسلام کا اور وہ صرف یہ کہ تشبیہ اور تعطیل سے بچ کر اور کیفیت سے الگ ہو کر استواء علی العرش کو مانا جائے۔

علامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ

اس قسم کے مواقع پر مذہب سلف تفویض ہے یعنی یہ کہا جائے کہ اللہ سبحانہ مستوی علی العرش ہے جیسے اس کے شایان شان ہے استقرار و تمکن سے وہ بالا ہے۔

امام ابوالحسن نے اس موضوع پر یہی راہ اختیار کی تھی لیکن ان کے پیروکاروں کی کاوشیں تاویل میں دور تک چلی گئیں۔ متکلمین نے تاویل کی راہ اختیار کی مثلاً یہ کہ آیت میں استوی کے معنے استولی کے ہیں۔ استیلا کے معنے غالب ہونے کے ہیں لیکن خدا کی مخلوقات میں کوئی مخلوق ایسی بھی ہے جس پر اللہ کا استیلا نہیں ہے اور کیا اس سے پہلے عرش پر اللہ سبحانہ کا استیلا نہ تھا۔ بالفاظِ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کے مخلوق ہونے پر اللہ سبحانہ کا عرش اللہ کے استیلاء سے بے نیاز تھا۔ معاذ اللہ، محققین نے اسے لغت کے اعتبار سے بھی بے معنے قرار دیا ہے استوی بمعنے استولی اس وقت بولا جاتا ہے جب مقابلہ پر کوئی ہو۔ یعنی دو میں سے ایک غالب آجائے تو کہا جاتا ہے استوی فلاں علی مصر، اور جناب الٰہی میں ایسی پوزیشن کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے علامہ آلوسی نے اس تاویل کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا ہے ان تفسیر الاستواء بالاستیلاء تفسیر مرذول، یعنی استواء کی تفسیر استیلا سے کرنے میں کوئی معقولیت نہیں ہے، تاویلات اگرچہ بہت ہیں لیکن۔

ان تاویلات میں سب سے اچھی تاویل وہ ہے جو قفال مروزی نے پیش کی ہے کہ استوی علی العرش

کے معنے یہ ہیں کہ آسمان و زمین پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ تمام کائنات کی تدبیر کی طرف متوجہ ہوگیا جیسا کہ سورہ یونس میں اسی مطلب کی وضاحت یدبر الامر سے ہوتی ہے۔ شیخ الاسلام نے بھی اپنے فوائد میں اس کو اپنایا ہے۔ مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں اسی کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے "تخت پر متمکن ہوگیا"، یعنی خدا کی بادشاہت کائنات ہستی میں نافذ ہوگئی کیونکہ وہی خالق ہے اور وہی مدبر بھی ہے تمام عالم ہستی اسی کے تخت جلال کے آگے جھکی ہوئی ہے۔

مولانا مودودی نے اسی بات کو اپنے انداز میں اس طرح پیش کیا ہے۔ خدا کے استوار علی العرش کی تفصیلی کیفیت کو سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق کے بعد کسی مقام کو اپنی لامحدود سلطنت کا مرکز قرار دے کر اپنی تجلیات کو وہاں مرتکز فرما دیا ہو اور اس کا نام عرش ہو جہاں سے سارے عالم پر وجود اور قوت کا فیضان بھی ہو رہا ہے اور تدبیر امر بھی فرمائی جا رہی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ عرش سے مراد اقتدار فرمانروائی ہو اور اس پر جلوہ فرما ہونے سے مراد یہ کہ اللہ نے کائنات پیدا کر کے اس کی زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ بہرحال استوار علی العرش کا تفصیلی مفہوم خواہ کچھ ہو۔ قرآن میں اس کے ذکر کا اصل مقصد یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض خالق کائنات ہی نہیں بلکہ مدبر کائنات بھی ہے۔ وہ دنیا کو وجود میں لانے کے بعد اس سے بے تعلق ہو کر کہیں بیٹھ نہیں گیا ہے بلکہ عملاً وہی سارے جہان کے جزو کل پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ سلطانی و حکمرانی کے تمام اختیارات بالفعل اس کے ہاتھ میں ہیں، ہر چیز اس کے امر کے تابع ہے۔ ذرہ ذرہ اس کے فرمان کا مطیع ہے اور موجودات کی قسمتیں دائماً اس کے حکم سے وابستہ ہیں۔ اس طرح قرآن عزیز اس غلط فہمی پر ضرب کاری لگاتی جس کی وجہ سے انسان کبھی شرک کی گمراہی میں مبتلا ہوا ہے اور کبھی خود مختاری و خودسری کی ضلالت میں۔ اللہ کو کائنات کے انتظام سے بے تعلق سمجھ لینے کا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنی قسمت کو دوسروں سے وابستہ کر لیتا ہے اور ان کے آگے سر جھکا دیتا ہے یا پھر اپنی قسمت کا مالک خود اپنے آپ کو سمجھ کر خود مختار بن بیٹھتا ہے۔

دراصل ثم استوی علی العرش میں پہلی آیت میں بیان کردہ مضمون کا ایک بدیہی نتیجہ پیش کیا ہے کہ جس نے یہ سارا کارخانہ اس تدریج و اہتمام کے ساتھ بنایا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کو پیدا کر کے اس کی تدبیر و انتظام سے بالکل بے تعلق ہو کر کسی گوشے میں جا بیٹھے۔ اس خلق کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کو پیدا کرنے کے بعد اس کے تخت حکومت پر متمکن ہو کر اس کے تمام امور و معاملات کا انتظام بھی فرماتے۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے یہاں یغشی اللیل اور دوسرے

مواقع پر یہ جملہ آیا ہے۔

یہ مشرکین کے اس زعم باطل کی تردید ہے کہ خدا تعالیٰ خالق تو ہے مگر انتظام و انصرام اس نے اس مملکت کا اپنے دوسرے شرکاء کے سپرد کر رکھا ہے۔ ساتھ ہی ان فلاسفہ کی بھی تردید ہے جو خدا کو صرف ایک علۃ العلل کے درجہ میں مانتے ہیں۔ فرمایا کہ خدا کائنات کو پیدا کر کے عرش پر متمکن ہے اور ساری کائنات کا انتظام کر رہا ہے عرش اقتدار کی تعبیر ہے اور اس تعبیر کے ذریعے بتایا جا رہا ہے کہ اس کائنات کا انتظام اور تدبیر و تصرف صرف وہی کر رہا ہے اس لیے صرف اس کی عبادت و طاعت کرنی چاہیے۔ عابدانہ تعلقات اللہ کے سوا کسی اور سے نہ رکھنے چاہئیں اسی لیے سورہ یونس میں اس کے بعد ما من شفیع کا اور سورہ سجدہ میں مالکم من دونہ من ولی ولا شفیع کا اضافہ فرمایا ہے۔ گویا توحید ربوبیت سے توحید الوہیت پر استدلال کیا ہے۔

پوری کائنات اللہ کی فرمانبردار ہے

۴۳۔ جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے جس نے سورج، چاند اور ستارے پیدا کیے سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ یعنی رات کے اندھیرے کو دن کے اجالے سے یا دن کے اجالے کو رات کے اندھیرے سے ڈھنپتا ہے اس طرح کہ ایک دوسرے کا تعاقب کرتا ہوا تیزی سے چلا آتا ہے۔ ادھر رات ختم ہوئی ادھر دن آموجود ہوا یا دن تمام ہوا تو خود رات آگئی۔ درمیان میں ایک منٹ کا بھی وقفہ نہیں۔ شاید اس پر بھی تنبیہ فرمادی کہ اسی طرح کفر و ضلالت اور ظلم و عدوان کی شب دیجور جب عالم پر محیط ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ایمان و عرفانی کے آفتاب سے ہر چہار طرف روشنی پھیلا دیتا ہے اور جب تک آفتاب عالم تاب کی روشنی نمودار نہ ہو نبوت کے چاند تارے رات کی تاریکی میں اجالا اور رہنمائی کرتے ہیں۔ کوئی سیارہ اللہ کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا[1] جیسے اس آیت میں نظام ربوبیت سے توحید عبادت پر استدلال ہے یعنی جو رب تمام کائنات پر حکومت کر رہا ہے اور تکوینی طور پر مخلوق اس کی فرمانبرداری کر رہی ہے مثلاً سورج کو اس کے اور اس پوری کائنات کے مالک کا حکم ہے کہ وہ ایک مقررہ وقت پر نکلے اور پھر ایک مقررہ وقت پر ڈوب جائے، ٹھیک اسی طرح انسانوں کو تشریعی طور پر حکم ہے کہ اللہ کے سوا بندگی و نیاز کا سر کسی کے سامنے نہ جھکایا جائے۔ اسی طرح اس آیت میں توحید الوہیت

[1] افادات شیخ الاسلام

سے وحی ورسالت کی ضرورت پر بھی استدلال ہے اور بتایا جارہا ہے کہ جو اللہ تمہاری پروردگاری کے لیے ایسا نظام قائم کیے ہوتے ہے کیا ممکن ہے کہ اس نے تمہاری روحانی فلاح و سعادت کے لیے کوئی قانون، کوئی نظام، کوئی قاعدہ مقرر نہ کیا ہو۔ جس طرح تمہارے جسم کی ضرورتیں ہیں اسی طرح تمہاری روح کی بھی ضرورتیں ہیں۔ پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جسم کی ضروریات کی بہم رسانی کے لیے تو سورج، ستارے، رات دن، چاند زمین بنائے لیکن روح کی نشوونما کے لیے کوئی انتظام نہ کرے۔

یغشی اللیل النہار سے وقت بیں اور نکتہ رس لوگوں نے زمین کی کرویت یعنی گول ہونے پر بھی استدلال کیا ہے۔ یہ زمین کے گول ہونے کا نتیجہ ہے کہ زمین کے ایک حصہ پر رات کی تاریکی اور دوسرے حصہ پر دن کی روشنی ہوتی ہے۔ آپ رات کے بارہ بجے پاکستان میں بیٹھ کر ٹیلیفون کے ذریعے نیویارک سے معلوم کرسکتے ہیں کہ وہاں دن کے بارہ بجے ہیں۔ فلاسفہ میں سے غزالیؒ اور رازیؒ اور ائمہ نقل میں سے ابن تیمیہؒ اور ابن القیمؒ زمین کی کرویت کے قائل ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں جو حرکت بھی ہورہی ہے سب اس کے خالق اور مالک ہی کی تدبیر وانتظام سے ہورہی ہے۔ وہی ہے جو رات کو دن پر ڈھانکتا ہے اور اسی کے حکم سے اس سرگرمی سے وہ اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ وہی ہے جس نے سورج اور چاند اور دوسرے تمام نجوم وکواکب پیدا کیے۔ مسخرات بامرہ یعنی وہ اپنے اپنے معینہ فرائض اور اپنے اپنے معینہ حدود وقیود کے تحت خدا کے حکم سے پابند ہیں اور پوری سرگرمی کے ساتھ شب وروز اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں مجال نہیں کہ پل کے لیے بھی غافل ہوں یا بال برابر بھی اپنی اپنی حدود سے متجاوز ہوں۔

تکوینی اور تشریعی احکام میں یکسانی

۴۷۔ خبردار رہو اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے بڑا بابرکت ہے اللہ جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔ پیدا کرنا خلق ہے اور پیدا کرنے کے بعد تکوینی یا تشریعی احکام دینا یہ امر ہے اور دونوں اسی کے قبضے میں ہیں اس طرح وہی ساری خوبیوں اور برکتوں کا سرچشمہ ہوا[1]

یہ بیان واقعہ بھی ہے اور اظہارِ حق بھی اور پہلے مضمون کی مزید تشریح بھی ہے۔ جو استواء علی العرش کے الفاظ میں مجملاً بیان کیا گیا ہے یعنی یہ کہ اللہ سبحانہ کی ذات گرامی صرف خالق ہی نہیں بلکہ آمر اور حاکم بھی ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ذرہ ذرہ شب روز اسی کے احکام کی تعمیل میں پورے جوش و خروش کے ساتھ سرگرم کار ہے۔ اس نے خلق کو پیدا کر کے نہ تو دوسروں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ اس پر حکم چلائیں اور نہ پوری خلق کو یا اس کے کسی حصے کو خود مختار بنا دیا ہے کہ جیسے چاہے خود کام کرے بلکہ عملاً تمام کائنات کی تدبیر اللہ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ لفظ امر بول کر بتایا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے احکام دو طرح کے ہیں تکوینی اور تشریعی۔

تکوینی احکام ان حکموں کو کہتے ہیں جن کے مطابق عمل چار و ناچار کرنا ہی پڑتا ہے اور جن کی خلاف ورزی ناممکن ہوتی ہے کیونکہ مخلوق ان کی طاعت کرنے پر مجبور پیدا کی گئی ہے اور اسے پیدائشی طور پر اس کی آزادی نہیں ہے کہ چاہے تو ان پر عمل کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ مثال کے طور پر سورج کو اس کے اور اس پوری کائنات کے مالک، کا حکم ہے کہ وہ ایک مقررہ وقت پر نکلے اور پھر ایک مقررہ وقت پر ڈوب جائے۔ زمین سے ایک مقررہ فاصلہ پر رہے اور اسے روشنی اور گرمی پہنچائے۔ سورج ان احکام پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہے اسے یہ طاقت حاصل نہیں ہے کہ ان کی تعمیل سے کبھی انکار کرے۔ اسی طرح ہوا کو اس بات کا حکم ہے کہ وہ جانداروں کو زندہ رکھے۔ پانی کو حکم ہے کہ وہ پیاس بجھائے۔ آگ کو حکم ہے کہ جلائے اور انسان کو حکم ہے کہ زبان سے بولے، کان سے سنے، ناک سے سونگھے۔ اور یہ سب کے سب اس بات پر مجبور ہیں کہ ان حکموں کی پابندی کریں۔ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا ان کے بس ہی میں نہیں ہے۔ اس طرح کے احکام کو تکوینی احکام، قوانینِ طبیعی اور قوانینِ قدرت بھی کہتے ہیں اور عام طور سے یہی نام زیادہ مشہور ہیں۔

تشریعی احکام اللہ سبحانہٗ کے ان حکموں کو کہتے ہیں جن کی پیروی پیدائشی مجبوری کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ ارادی اور اختیاری ہوتی ہے۔ مخلوق کو ان پر عمل کرنے کا اختیار بھی حاصل ہوتا ہے اور عمل نہ کرنے کا بھی۔ مثلاً انسان کو حکم ہے کہ وہ ایک خدا کی بندگی کرے لیکن وہ ایسا کرنے کے لیے پیدائشی طور پر مجبور نہیں ہے بلکہ اسے اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو اسی ایک خدا کی بندگی کرے اور چاہے تو اس کے ساتھ ہزاروں کو خدا بنا لے اور چاہے تو سرے سے خدا اور خدائی ہی سے انکار کر بیٹھے۔ ان احکام کو شرعی احکام اور شرعی قوانین بھی کہتے ہیں۔

یہ دونوں قسم کے احکام یکساں طور پر اللہ ہی کے احکام ہیں۔

آخر میں فرمایا تبارک اللہ رب العالمین برکت کے اصلی معنے ہیں نمو، افزائش اور بڑھوتری کے، اور اس کے ساتھ اس لفظ میں رفعت، عظمت کا پہلو بھی ہے اور ثبات و قرار کا بھی۔ پھر ان کے ساتھ خیر اور بھلائی کا تصور لازماً شامل ہے۔ لہٰذا اللہ کے بابرکت ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی خوبیوں اور بھلائیوں کی حد نہیں ہے۔ بے حد و حساب خیرات اس کی ذات سے پھیل رہی ہیں اور وہ بہت بلند و برتر

ہستی ہے، کہیں جاکر اس کی بلندی ختم نہیں ہوتی اور اس کی یہ بھلائی و رفعت مستقل ہے عارضی نہیں ہے کہ کبھی اس کو زوال ہو۔[1]

دراصل یہ فقرہ اللہ سبحانہ کے بارے میں اس غلط فہمی کو دور کر رہا ہے جس میں مشرک قومیں عموماً مبتلا ہوئی ہیں۔ انہوں نے خدا تک رسائی کو ناممکن الحصول بنا کر پیش کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بندوں کے لیے خدا سے براہ راست تعلق و توسل ناممکن سمجھ لیا گیا اور پھر ایسے وسائط و وسائل کی تلاش ہوئی جو خدا سے مقصد برآری کا ذریعہ بن سکیں۔ صفاتِ الٰہی کے بارے میں یہ گمراہی شرک کے عوامل میں سے ایک بہت بڑا عامل ہے۔ مشرکین نے بہت سے فرضی معبودوں کی پرستش بالخصوص ملائکہ کی پرستش اسی وجہ سے کرنی شروع کی کہ یہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں۔ یہ ہم سے راضی رہیں تو یہ اپنے باپ کو ہم سے راضی رکھیں گی۔ قرآن نے یہاں تبارک اللہ رب العالمین فرما کر اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ کائنات جس طرح اپنے خالق کی بے پایاں عظمت و جبروت پر شاہد ہے اسی طرح اس کی بے پایاں برکت و رحمت پر بھی گواہ ہے۔

حافظ ابن القیم نے برکت کی دو قسمیں بتائی ہیں ایک وہ برکت ہے جو اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اس سے فعل بارک آتا ہے یہ کبھی بلا واسطہ متعدی ہوتا ہے اور کبھی علی اور فی کی وساطت سے۔ اسی سے اسم مفعول آتا ہے دوسری قسم وہ ہے جس میں برکت کی رحمت اور عزت کی طرح اللہ کی طرف اضافت کی جاتی ہے اس سے فعل تبارک آتا ہے۔ اسی لیے لفظ تبارک کا اطلاق اللہ کے علاوہ کسی پر نہیں۔ مبارک اللہ بھی ہے اور اللہ کا بندہ رسول بھی مبارک ہے۔ لیکن تبارک اللہ سے مخصوص ہے۔ اس میں تعالیٰ کی طرح مبالغہ ہے بے نہایت برتری اور درجہ کمال کی بلندی و عظمت کو ظاہر کرنے کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن

ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۵۵﴾
وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۭ
اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾

تم اپنے رب کو گڑگڑاتے اور چپکے چپکے پکارو۔[۵۵] بے شک وہ حدود سے بڑھ جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔[۵۶] اور ملک میں اس کی درستگی کے بعد بگاڑ برپا نہ کرو اور اسی کو پکارو ڈرتے ہوئے اور اُمید رکھتے ہوئے یقیناً اللہ کی رحمت ان کے قریب ہے جو حسن کار ہیں۔"

معانی مفردات

تضرّع، باب تفعّل کا مصدر ہے ضرع سے بنا ہے اس کے معنے عاجزی، خوشامد، لجاجت اور تعلّق کے ظاہر کرنے کے ہیں۔ یہ اظہار حرکات اور اداؤں سے بھی ہوتا ہے اور الفاظ و عبارات سے بھی،
خُفیۃ، یہ خفی یخفی کا مصدر ہے اس کے معنے چپکے اور رازدارانہ طرز پر کرنے کے ہیں۔ یہ علانیہ کی ضد ہے
معتدین اعتدار سے اسم فاعل ہے، اس کے معنے حد سے بڑھ جانے کے ہیں۔

توحید الوہیت کی تلقین

پہلی آیات میں بتایا تھا کہ جو خالق ہے وہی رب ہے یعنی جس نے یہ کائنات بنائی ہے وہی اس کائنات کو چلا رہا ہے۔ انتظام و انصرام اسی کا ہے اسی کی یہاں حکومت ہے، اسی کا امر و حکم یہاں چل رہا ہے۔ تکوینی اور تشریعی قوانین کا بنانا اللہ کے سوا کسی کا کام نہیں ہے۔ انسانوں کے پرستش اور بندگی کی حد تک صرف اللہ سے تعلقات ہونے چاہئیں۔ ان دونوں کے لیے نام قرآن کی زبان میں عبادت ہے۔ عبادت انسان کا مقصد رہا ہے اور اسی کی تلقین و ہدایت کے لیے انبیاء آتے رہے ہیں۔ یہی عقل کا صریح تقاضا ہے اور یہی قرآن کا فیصلہ ہے۔ عقل کا صریح تقاضا یہ اس لیے ہے کہ خدا انسانوں کا خالق اور مالک، رازق اور محسن سب کچھ ہے اسے پرستش اور بندگی دونوں کا حقدار ہونا چاہیے۔ قرآنی فیصلہ یہ اس طرح ہے کہ اس نے یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ پرستش اور بندگی دونوں اللہ کی کرنی چاہئیں اور ان میں کوئی تفریق نہ ہونی چاہیے قرآن جہاں یہ کہتا ہے کہ اللہ ہی کو سجدہ کرو۔ اسی کے نام کی پاکی بیان کرو، اسی سے دعائیں مانگو، اسی کی بڑائی کا اعلان کرو، اسی کو مدد کے لیے پکارو اور اسی کے حضور اعترافِ نعمت کرو، اسی کا نام پرستش ہے، وہیں وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اللہ ہی کو بے قید و شرط اطاعت کا مستحق اور حقیقی فرمانروا مانو۔ اسی کو مستقل بالذات قانون ساز تسلیم کرو زندگی کے ہر شعبے میں اسی کے احکام کی اطاعت کرو۔ اسی کے قوانین کے مطابق فیصلے کرو۔ اسی کے ضابطہ کو زندگی کے ضابطے بناؤ۔ اسی کے حلال کو حلال اور اسی کے حرام کو حرام سمجھو۔ اسی کا نام بندگی ہے۔ ان دونوں کے مجموعہ کا نام عبادت ہے۔ یہاں ان دونوں کی تلقین کے لیے دعا کرنے اور ملک میں فساد نہ کرنے کی تعبیر اختیار کی ہے۔ دعا اگر پرستش کا اعلان ہے تو فساد فی الارض نہ کرنا خدا کی بندگی کا عنوان ہے۔

۵۵۔ تم اپنے رب کو گڑگڑاتے اور چپکے چپکے پکارو، جب عالم خلق اور عالم امر کا مالک اور تمام برکات کا منبع وہ ہی ذات ہے تو اپنی دنیوی و اخروی حوائج میں اسی کو پکارنا چاہیے۔ الحاح و اخلاص اور خشوع کے ساتھ بدونِ ریاکاری کے آہستہ آہستہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعا میں اصل اخفا ہے اور یہی سلف کا معمول تھا۔ بعض مواقع پر جہر و اعلان کسی عارض کی وجہ سے ہوگا۔ جس کی تفصیل روح المعانی وغیرہ میں ہے [1] اس آیت میں دعا کا عنوان قائم کر کے بتایا گیا ہے کہ پرستش کے تعلقات اللہ سبحانہ سے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ہونے چاہئیں یعنی ضرورت اور شدت میں اللہ سے دعا کرنی چاہیے، اللہ کے سوا کسی کو نہ پکارنا چاہیے۔ اور دعا میں دو چیزیں ضرور ہونی چاہئیں ایک تضرع و ابتہال اور دوسرے خفیہ و اسرار، دعا میں یہ دونوں قیدیں کہ اخلاص انکساری، عاجزی کے ساتھ ہو اور آہستہ اور چپکے ہو۔ تضرع کی سب سے زیادہ مؤثر شکل ہوتی ہے۔ جب یہ الفاظ و حرکات دونوں میں کامل ہم آہنگی کے ساتھ ہو۔ اس کی بہترین شکل نماز میں ہے۔ خفیہ تضرع کے آداب میں ہے اس میں تضرع کے اخلاص کی بھی ضمانت ہوتی ہے اور اس کے وقار کی بھی۔ جو کام چپکے چپکے کیا جاتا ہے وہ ریا کے فتنہ سے محفوظ ہوتا ہے اور خدا چونکہ ہر چیز سنتا اور جانتا ہے اس لیے اس کو سنانے اور اس سے فریاد کرنے کے لیے چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہی بات ایک موقعہ پر بتائی ہے۔ فرمایا:

لوگو! اپنی جانوں پر نرمی کرو، تم اس ذات سے دعا نہیں مانگ رہے ہو جو بہری اور غائب ہو تم تو سمیع و قریب ذات سے دعا کر رہے ہو اور وہ تمہارے ساتھ ہے۔

(صحیح مسلم)

اس ارشادِ نبوت سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم دعاؤں میں آہستگی کو پسند فرماتے تھے۔ اسلام کے قانون سازادارں نے آیت سے یہی بات سمجھی ہے۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے کہ دعا آہستہ کرنی چاہیے۔ حافظ ابن القیم نے بدائع الفوائد میں آہستہ دعا کے متعدد فوائد بتلائے ہیں اور اس پر اچھی بحث کی ہے۔ مثلاً،

اولاً آہستہ دعا کرنا قوتِ ایمانی کی عظمت بتاتی ہے کیونکہ دعا مانگنے والے کو یقین کامل ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ دعا کو اللہ سبحانہ سن لیتا ہے۔ اس کی پوزیشن اس سے بے حد بلند ہے جو کہتا ہے کہ خدا بلند آواز کی دعا کو سنتا ہے آہستہ نہیں سنتا۔

ثانیاً آہستہ دعا کرنا ادب اور تعظیم کا خاص پیمانہ ہے۔ اسی بنا پر بادشاہوں کے دربار میں آہستہ بولنا ادب ہے اور بلند آواز کرنا بے ادبی ہے۔ اگر اللہ کی بارگاہ بادشاہوں سے اعلیٰ وارفع ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اللہ دعا خفی کو سن لیتا ہے تو پھر بلا وجہ دعا میں آواز کو بلند کرنا خلاف ادب ہے۔

ثالثاً، آہستہ دعا کرنا خشوع و خضوع اور انکسار و نیازمندی میں بے حد معین و مددگار ہے اور دعا میں خشوع و خضوع ہی مقصود دعا ہے۔ منکسر و نیازمند آدمی مسکینوں کی طرح عجز و انکسار سے بھیک مانگتا ہے۔ انکسار کی یہ حالت آواز کی بلندی سے حاصل نہیں ہوتی ہے۔

رابعاً، آہستہ دعا ریاکاری سے بہت دور اور اخلاص کی بہت بڑی ضمانت ہے۔ اخلاص ہی دعا

کی جان ہے۔ قرآن میں دُعا کے ساتھ اخلاص کی قید آئی ہے۔

خامساً، دُعا میں آواز کی پستی، دل کی جمعیت فراہم کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ آواز کی بلندی میں فکری انتشار اور قوت واہمہ میں نیرنگی پیدا ہوتی ہے۔

سادساً، آہستہ دُعا کرنا داعی کے لیے اللہ سے قرب کی نشانی ہے گویا آہستہ دُعا کرنے والا اس طرح اللہ سے مانگتا ہے جیسے کوئی پاس اور نزدیک والا نزدیک والے سے چپکے سے مانگا کرتا ہے نہ کہ اس طرح جیسے کوئی دور سے پکار کر مانگ رہا ہو۔ اسی بنا پر اللہ سبحانہٗ نے حضرت زکریا کی دُعا کی تعریف فرمائی اذ نادیٰ ربہ نداء خفیا، قلب میں جب بھی اللہ کے قریب ہونے کا استحضار ہوگا اور پتہ ہوگا کہ اللہ سبحانہٗ ہر قریب سے بھی قریب تر ہے تو اس تصور کے نتیجہ میں دُعا میں اخفا ہوگا۔ اسی کا نام مناجات ہے۔ مناجات کے معنے سرگوشی کرنا ہیں۔

سابعاً آہستہ اور آواز کی پستی کے ساتھ دُعا طلب اور سوال میں دوام کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس طرح نہ زبان تھکتی اور نہ اعضا میں درماندگی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس بآواز بلند دُعا میں زبان بھی تھک جاتی ہے اور قوتِ اعضا بھی جواب دے جاتی ہے۔

ثامناً، دُعا میں آواز کی پستی انسان کو فکری تشویشات سے اور وساوس سے محفوظ رکھتی ہے۔ آواز پست ہوگی تو کسی کو پتہ نہ ہوگا کہ دعا کر رہا ہے اس طرح ہر قسم کی تشویش سے محفوظ رہے گی۔

تاسعاً، عظیم ترین نعمت توجہ الی اللہ، اس کی عبادت، اس کا ہو رہنا ہے اور دُعا میں یہ سب انعامات موجود ہیں، اس نعمت سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے۔ ہر نعمت کے ساتھ حاسدوں کی چشمک ایک طبعی چیز ہے۔ اس چشمک سے حفاظت کا واحد ذریعہ کہ دُعا میں اخفا کیا جائے۔

عاشراً، دُعا نام ہے مدعو کو یاد کرنے کا اور یاد بھی اس طرح کہ اس میں اس کے اسماء و صفات کے ذریعے مدعو کی ثنا و تحمید ہو اور دست طلب بھی دراز ہو اس حیثیت سے دُعا اضافی چیز کے ساتھ ذکر بھی ہے۔ ذکر میں طلب کی آمیزش ہو اسی کو دُعا کہتے ہیں۔ حضور انور کا ارشاد ہے افضل الدعاء الحمد للہ حالانکہ حمد صرف ثنا ہے لیکن حمد کے دامن میں محمود کی محبت اس کی ثنا ہوتی ہے اس لیے حمد کو دُعا فرمایا ہے۔ ذکر اور دُعا دونوں ایک دوسرے کو متضمن ہوتے ہیں۔ شاید اسی لیے قرآن نے دونوں میں ہم آہنگی رکھی ہے۔ دُعا کے بارے میں یہاں فرمایا کہ ادعوا ربکم تضرعا وخفیہ اور ذکر کے متعلق اسی سورت کے آخر میں آرہا ہے۔

واذکر ربک فی نفسک تضرعاً وخیفۃ ودون الجہر من القول۔

اسی ہم آہنگی کی وجہ سے فقہاء نے دونوں کا حکم ایک بتایا ہے۔ انشاء اللہ اس پر تفصیلی تبصرہ نویں پارے

میں آئے گی۔

یہاں آیت کا منشایہ ہے کہ جب خدا ہی آسمان و زمین کا خالق ہے اسی کے حکم سے ستارے گردش کر رہے ہیں۔ خلق اور امر سب اس کے اختیار میں ہے تو تمہاری پرستش کا حقدار بھی وہ ہی ہے اپنے اسی رب کو پکارو اسی سے پرستاری کے تعلقات و روابط قائم رکھو اور بس۔

پرستش میں راہِ اعتدال

۵۵ ـ بے شک وہ حدود سے بڑھ جانے کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی دعا میں حدِ ادب سے نہ بڑھے۔ مثلاً جو چیزیں عادتاً یا شرعاً محال ہیں وہ مانگنے لگے یا معاصی اور لغو چیزوں کی طلب کرے یا ایسا سوال کرے جو اس کی شان و حیثیت کے مناسب نہیں۔ یہ سب اعتدار فی الدعاء میں داخل ہے[1]

اس آیت کی تشریح میں سارے شارحینِ قرآن نے یہی ایک بات فرمائی ہے کہ دعا میں حد سے تجاوز نہ کرنا چاہیے اور اس کی مختلف شکلوں کی نشاندہی بھی فرمائی ہے۔ مثلاً یہ کہ

اولاً، یہ کہ شرعاً جو چیزیں عادۃً محال ہیں ان کو نہ مانگے۔

ثانیاً، یہ کہ معاصی اور لغو چیزوں کو دعا میں نہ مانگے۔

ثالثاً، یہ کہ غیر اللہ سے نہ مانگے۔

رابعاً، یہ کہ دعا میں تکلف اور سجع سے کام نہ لے۔

حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی اس آیت کی تشریح میں یہی بات نقل کی گئی ہے کہ اعتدار سے دعا میں اعتدار مراد ہے۔ ان بزرگوں کا یہ کہنا بالکل بجا اور درست ہے لیکن جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں کہ قرآن انسانوں کے سامنے دو چیزیں پیش کرتا ہے ایک یہ کہ پرستش صرف اللہ کی کی جائے، دوسرے یہ کہ بندگی اللہ کی کی جائے۔ اسی کا نام توحیدِ الوہیت اور توحیدِ عبادت ہے اور یہی انبیاء کی بعثت کا مقصد ہے۔ ان آیات میں توحیدِ ربوبیت سے توحیدِ الوہیت پر استدلال کیا گیا ہے۔ ادعوا ربکم توحید الوہیت میں پرستش کا عنوان ہے اور لا تعتدوا توحیدِ الوہیت میں بندگی کے لیے عنوان ہے۔ یہاں پرستش کو دعا کے نام سے پیش کر کے فرمایا ہے کہ لا تعتدوا اس میں حد سے تجاوز نہ کرنا کہ اسی کے ہو کر رہ جاؤ اور بندگی کو بالکل نظر انداز کر دو۔ مذاہب کی تاریخ بتاتی ہے کہ پرستش میں اعتدار ہی سے رہبانیت نے جنم لیا ہے اور اس کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نتیجہ میں دین کا یہ تصور قائم ہو گیا کہ دنیا انسان کے لیے ایک قید خانہ ہے اس کا جسم اس کی روح کے حق میں ایک پنجرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کے اندر جو مادی خواہشیں پائی جاتی ہیں وہ اس پنجرے کی تتلیاں ہیں۔ انسان نجات اسی وقت پا سکتا ہے جب وہ اس قید خانہ کی دیواروں کو خود اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالے اور اس پنجرے سے اپنی روح کو آزاد کرائے یعنی وہ دنیا چھوڑ دے، بستیوں سے دور جا نکلے اور کسی گوشے میں اپنے خدا سے لو لگا کر بیٹھ جائے۔ اپنی خواہشوں کو دبا کر کچل ڈالے۔ صرف اسی صورت میں اس کی روح کے اوپر سے وہ پردہ ہٹ سکتا ہے جو اسے خدا کے جلووں کے دیکھ پانے اور اس کی جناب تک رسائی حاصل کرنے سے روکے ہوتے ہے۔ اس لیے انسان کا فرض ہے کہ وہ ریاضتیں کر کے مایا کے اس جال سے باہر نکل جائے۔

دین اور خدا پرستی کا یہی نظریہ ہے جسے رہبانیت کہا جاتا ہے اور یہی پرستش میں اعتداء و غلو ہے۔ قرآن میں اللہ کا تصور صرف ایک مطلوب حقیقی کا تصور نہیں ہے اور صرف اللہ کی پرستش کا انسانوں سے مطالبہ نہیں کرتا بلکہ پرستش کے ساتھ ساتھ وہ اللہ کی بندگی کا بھی مطالبہ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اللہ کی ذات انسانوں کے لیے مطلوب و محبوب ہونے کے ساتھ حقیقی فرمانروا اور حقیقی قانون ساز بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ ترک دنیا نفس کشی اور گیان دھیان کے ذریعے خدا تک پہنچ جانے کا نظریہ اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب کہ وہ انسان کا صرف مطلوب اور مقصود ہو اور اس کے سوا کچھ اور نہ ہو۔ لیکن جب حقیقت یوں نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ اس کا فرمانروا اور قانون ساز بھی ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس کے لیے اس کے کچھ احکام اور قوانین بھی ہوں جن کی اسے اطاعت کرنی چاہیے۔ اسی کا نام اللہ کی بندگی ہے۔ اس بنا پر انسان کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ اللہ کے ذکر و فکر میں مشغول رہے یعنی صرف پرستش کرے بلکہ یہ بھی ہے کہ زندگی کے میدان میں آئے اور ان احکام و قوانین کی اطاعت کر کے فرمانبردار رعیت ہونے کا ثبوت دے اسی کا نام بندگی ہے۔ یہاں پرستش کے لیے دعا کا عنوان قائم کرنے کے بعد انہ لا یحب المعتدین فرما کر اس بات پر تنبیہہ فرمائی ہے کہ پرستش میں اتنا حد سے تجاوز نہ کرنا کہ بس اسی کے ہو کر رہ جاؤ اور زندگی میں بندگی کا رشتہ ہاتھ سے جاتا رہے۔ یہی بات قرآن نے چھٹے پارے میں رہبانیت کا چہرہ پیش فرمانے کے بعد ان الفاظ میں پیش کی تھی۔

یا ایہا الذین آمنوا لا تحرموا طیبات ما احل اللہ لکم ولا تعتدوا ان اللہ
لا یحب المعتدین۔

اے اہل ایمان اللہ نے جو پاکیزہ چیزیں تمہارے لیے حلال کی ہیں انہیں حرام نہ کرو اور حد سے نہ بڑھو اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اس کا صاف اور واضح مطلب یہی ہے کہ بندگی کو نظر انداز کر کے صرف پرستش میں غلو قرآن کا منشا نہیں بقول حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی اسے دربنداری یا روحانیت کا ہیضہ کہنا چاہیے جسے رہبانیت کہتے ہیں۔ پرستش میں یہ اعتدار انتہائی انفرادیت اور خلوت چاہتا ہے جبکہ اسلام کی تعمیر جن پانچ ستونوں پر ہوئی ہے اور جن کو رسوم پرستش اور شعائرِ عبادت کہا جاتا ہے ان میں سے اکثر نماز، زکوٰۃ، حج کی ٹھیک ٹھیک بجا آوری کے لیے کسی نہ کسی قسم کی اجتماعیت ضروری ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ خلوت اور تنہائی کے گوشے میں اجتماعیت کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ غور فرمائیے جہاں اسلام کی عملی بنیادیں بھی ٹھیک طور سے نہ اٹھائی جا سکتی ہوں وہاں پورے اسلام کی تعمیر کس طرح ممکن ہو سکتی ہے۔

پرستش کی طرح خدا کی بندگی بھی لازمی ہے

۷۷۔ اور ملک میں اس کی درستگی کے بعد بگاڑ برپا نہ کرو اور اسی کو پکارو ڈرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے، یقیناً اللہ کی رحمت ... ان کے قریب ہے جو حسن کار ہوں۔ پچھلی آیتوں میں ہر حاجت کے لیے خدا کو پکارنے کا طریقہ بتلایا تھا۔ اس آیت میں مخلوق و خالق دونوں کے حقوق کی رعایت سکھائی۔ یعنی جب دنیا میں معاملات کی سطح درست ہو تم اس میں گڑبڑی نہ ڈالو اور خوف و رجا کے ساتھ خدا کی عبادت کرو۔ نہ اس کی رحمت سے مایوس ہو نہ اس کے عذاب سے مامون اور بے فکر ہو کر گناہوں پر دلیر بنو۔ میرے نزدیک یہی راجح ہے کہ یہاں وادعوہ میں دعا سے عبادت مراد ہے۔ جیسا کہ صلوٰۃ تہجد کے بارے میں فرمایا تتجافی جنوبھم عن المضاجع یدعون ربھم خوفاً و طمعاً۔[1]

مطلب یہ ہے کہ اپنے رب سے انحراف اختیار کر کے اس زمین میں فساد نہ برپا کرو۔ قرآن میں مختلف طریقوں سے یہ بات بتائی گئی ہے کہ اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا کچھ اور الٰہ ہوتے تو یہ درہم برہم ہو کر رہ جاتے۔ یہ تو قائم ہی اس بنا پر ہیں کہ ان کے اندر اللہ کے ارادے کے سوا کسی اور ارادے کی کار فرمائی نہیں ہے۔ اس تکوینی توحید کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بندے اپنے دائرۂ اختیار میں بھی اسی اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ کی عبادت و اطاعت کریں۔ کسی اور کو اس عبادت و طاعت میں شریک نہ بنائیں ورنہ اس زمین کا سارا نظامِ عدل و قانون درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اس کائنات کے قیام و بقا کے لیے جس طرح تکوینی توحید ضروری ہے اسی طرح اس زمین کے عدل کے لیے خدا کی قانونی و تشریعی توحید بھی ناگزیر ہے۔ خدا کے ملک میں کسی اور کو حاکم و الٰہ ماننا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس کے ملک میں فساد و بغاوت برپا کرنا ہے جس سے بڑا کوئی جرم نہیں ہے۔ اسی کے مرتکب قرآن کی زبان میں اکابر مجرمین کہلاتے ہیں۔

اصلاح اور فساد دونوں کو مقابلے میں پیش کیا ہے۔ انسان کا خدا کی بندگی سے نکل کر اپنے نفس یا دوسروں کی بندگی اختیار کرنا اور خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنے اخلاق معاشرت اور تمدن کو ایسے اصول و قوانین پر قائم کرنا جو خدا کے سوا کسی اور کی رہنمائی سے ماخوذ ہوں۔ خواہ یہ فرد ہو یا افراد کا مجموعہ ہو۔ یہی وہ بنیادی فساد ہے جس سے زمین کے انتظام میں خرابی کی بے شمار مثالیں رونما ہوتی ہیں اور اسی فساد کو روکنا قرآن کا مقصود ہے۔

قرآن نے انسان کو عالم غیب میں نجات اور عالم شہادت میں ہدایت کے لیے الگ الگ طریقے بتائے ہیں۔ عالم غیب یعنی آخرت میں نجات کے لیے اللہ کی پرستش کو ضروری قرار دیا ہے اور عالم شہادت میں ہدایت کے لیے اللہ کی بندگی کو اختیاری نہیں ضروری قرار دیا ہے۔ اسلام کی گاڑی ان ہی دو پہیوں سے چلتی ہے یہ دونوں اگر اُمت میں قائم ہیں تو اُمت پورے اسلام میں داخل ہے۔ یا ایھا الذین آمنوا دخلوا فی السلم کافۃ۔ اگر ان دونوں میں سے ایک بھی غلط ہو آخرت میں نجات کے لیے پرستش غیر اللہ کی کی جاتے۔ ذکر و فکر، نذر و نیاز، سجدہ و رکوع کے لیے اللہ کے لیے دوسرے سہارے تلاش کر لیے جائیں یا اخلاق معاشرت اور تمدن کے قوانین خدا کے سوا دوسروں کو ہدایت و رہنمائی سے لیے جائیں یہی اتباع خطوات الشیطان ہے جس سے قرآن نے بار بار روکا ہے و لا تتبعوا خطوٰت الشیطان۔ ان دونوں ہی کو قرآن نے مکمل طور پر دُنیا میں نافذ کرنے کا مسلمانوں کو حکم دیا ہے۔ ان میں سے ایک بھی غلط ہو تو یہ زمین کا فتنہ ہے۔

و قاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ و یکون الدین کلہ للہ۔

نبوت کی ہدایت و رہنمائی میں انسانی جان کی قتل سے مال کی چوری و غصب، لوٹ مار، ایمان کی شرک و کفر سے نسب ناموس کی زنا سے اور عقل کی مسکرات سے حفاظت کو علماء نے اصلاح سے تعبیر کیا ہے۔

یہاں قرآن نے بعد اصلاحھا فرما کر یہ بلیغ اشارہ کیا ہے کہ دُنیا میں اور اخلاق معاشرت اور تمدن میں اصل چیز فساد نہیں بلکہ صلاح ہے۔ یہ نہیں کہ فساد پر صلاح عارض ہوتی ہے بلکہ صلاح پر فساد عارض ہوا ہے۔ فساد محض انسان کی جہالت اور سرکشی کا نتیجہ ہوتا ہے بالفاظِ دیگر انسانی زندگی کا آغاز جہالت و نادانی، شرک و کفر اور اخلاقی آوارگی سے نہیں ہوا ہے جس کو دور کرنے کے لیے بعد میں بتدریج اصلاحات کی گئی ہوں بلکہ فی الواقع انسانی زندگی کی ابتداء علم و دانش، عبادت و طاعت اور اخلاق صالحہ سے ہوئی ہے کان الناس امۃ واحدۃ۔ بعد میں اس درست نظام کو غلط کار انسان اپنی حماقتوں اور شرارتوں سے

خراب کرتے رہے ہیں۔ اسی فساد کو مٹانے کے لیے اللہ کی جانب سے انبیاء علیہم السلام آتے رہے ہیں اور انہوں نے ہر زمانے میں انسانوں کو دعوت دی ہے کہ زمین کا انتظام جس اصلاح پر قائم کیا گیا اس میں فساد برپا نہ کرو۔

اس معاملہ میں قرآن کا نقطہ نظر ان لوگوں کے نقطہ نظر سے بالکل مختلف ہے جنہوں نے ارتقاء کا ایک غلط تصور لے کر یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ انسان ظلمت سے نکل کر بتدریج روشنی میں آیا ہے اور اس کی زندگی بگاڑ سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ بنی اور بنتی جا رہی ہے۔ اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ خدا نے انسان کو پوری روشنی میں زمین پر بسایا تھا اور ایک صالح نظام سے اس کی زندگی کی ابتداء کی تھی۔ پھر انسان خود شیطانی رہنمائی قبول کر کے بار بار تاریکی میں جاتا رہا اور اس صالح نظام کو بگاڑتا رہا اور خدا بار بار اپنے پیغمبروں کو اس غرض کے لیے بھیجتا رہا کہ اسے تاریکی سے روشنی کی طرف آنے اور فساد سے باز رہنے کی دعوت دیں۔[1]

صلاح کی حد تک یوں تو ہر مذہب انسانی زندگی کو ایک اخلاقی سانچہ میں ڈھالتا رہا اور افرادِ انسانی سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنا اخلاقی رویہ تبدیل کریں لیکن قرآن اس بارے میں دیگر دساتیر و قوانین پر نمایاں فوقیت رکھتا ہے کیونکہ اس نے کردار و عمل کی اس صلاح کو جس کا مطالبہ ہر نظام میں موجود ہے انسان کی خانگی، عائلی اور معاشرتی زندگی کے محدود دائرے سے وسیع کر کے ساری زندگی پر محیط کر دیا ہے۔ نیز اس نے صلاح کے اصولوں اور دینی اقدار و غایات کو انسان کی حیاتِ اجتماعی پر بھی پھیلا دیا ہے۔ جس میں اس کی سیاسی اور معاشی زندگی بھی شامل ہے۔ حالانکہ دوسرے نظاموں اور مذاہب نے صلاح کا صرف انفرادی اور معاشرتی تصور پیش کیا اور اصلاحی اصولوں کو زیادہ سے زیادہ سماجی اور عائلی زندگی تک وسعت حاصل کرنے کا موقعہ دیا۔ اس کے برعکس قرآن اپنے پیروؤں کو عالمِ انسانیت کی اجتماعی صلاح کا ذمہ دار قرار دیتا ہے اور ان سے تقاضا کرتا ہے ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحها کہ اپنی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے ہیئتِ اجتماعی میں وہ تبدیلیاں عمل میں لائیں جن سے یہ ثابت ہو جائے کہ فساد پورے عالم سے ہٹ گیا۔

غرض کہ قرآن اس معاملہ میں صرف ایک طرزِ فکر کا داعی نہیں ہے جو انسان کی اجتماعی فلاح اور اس کے نظامِ اجتماعی کی صلاح سے بالکل بے تعلق ہو بلکہ خصوصیت کے ساتھ وہ ایک طریقِ عمل ہے جس کے مطابق اپنے گرد و پیش اور اپنے اجتماعی ماحول کو بدلتا ہے۔ تبدیلی کی اسی کوشش کا نام قرآن کی زبان میں اصلاح ہے اور اصلاح اسلامی زندگی کا اصل اصول اور ایمان و عمل کا حقیقی جوہر ہے۔ اگر فریضۂ اصلاح

[1] تفہیم القرآن

کو اسلامی زندگی سے خارج کر دیا جائے تو پھر اسلام بھی کائنات کا ایک بے جان نظریہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر قرآن حیاتِ اجتماعی میں اصلاح کا داعی نہ ہوتا اور محض انفرادی صلاح کو کافی خیال کرتا تو وہ مزاحمت اور کشمکش کیسے پیدا ہوتی جس کا مقابلہ کرنے کے لیے اہلِ ایمان سے جان و مال کی قربانی کا مطالبہ کیا گیا۔ محض انفرادی صلاح سے وہ منظم مخالفت کبھی رونما نہ ہوتی جس کے لیے مسلمانوں کو عسکری زندگی اختیار کرنی پڑی۔

بہرحال یہ آیت بتا رہی ہے کہ مذہب کا اسلامی تصور اس راہبانہ طرزِ فکر کے بالکل مغائر ہے جس میں محض پرستش، ریاضت اور کشف و مراقبہ سے انسان اپنی شخصی نجات حاصل کر لیتا ہے کیونکہ شخصی نجات کا یہ طریقہ انسان کو کائنات خارجی میں اصلاح کی جدوجہد سے بے نیاز کر دیتا ہے حالانکہ قرآن انفس و آفاق میں مرضیٔ الٰہی کے مطابق صرف صلاح نہیں بلکہ اصلاح چاہتا ہے کیونکہ ظاہر و باطن کا ئنات خارجی اور نفس انسانی دونوں ایک ہی اصل کی شاخیں ہیں جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ انسان کے اخلاقی امراض اس کے نفس اور خارجی ماحول کے تعامل سے پیدا ہوتے ہیں نہ کہ ان میں سے کسی ایک سے اس لیے ایک کو چھیڑنے اور دوسرے سے تغافل برتنے سے بیماری کے اسباب کبھی دور نہیں ہو سکتے ہیں۔ جب کبھی انسان پرستش و ریاضت میں مشغول ہو کر خارجی ماحول میں اصلاح کی ضرورت سے بے خبر ہوتا ہے اس کی سوسائٹی میں بداخلاقی، بدعملی کی وبا پھوٹ پڑتی ہے جس سے وہ خود اپنا دامن محفوظ نہیں رکھ سکتا ہے خواہ راہبانہ اتقاء اور زاہدانہ پارسائی کے لحاظ سے وہ کتنا ہی بلند ہو۔ اسی طرح وہ جب بندگی کے شوق میں وہ بیرونی دنیا پر نظر جما کر محض خارجی ماحول کی اصلاح میں معاشرتی امراض کی دوا ڈھونڈتا ہے اور پرستش سے غفلت برتتا ہے بدی کی قوتیں بالکل غیر محسوس طور پر اس کے نفس میں پرورش پاتی رہتی ہیں اور بالآخر اپنے پورے زور و طاقت کے ساتھ خارج پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی معاشرت اس کی سیاست اور اس کی معیشت کا گوشہ گوشہ ان کے اثرات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔

آیت میں لا تفسدوا کے بعد فرمایا ہے وادعوہ خوفاً و طمعاً اللہ کو ڈرتے اور اُمید رکھتے ہوئے پکارو۔ بندگی کے بعد پھر پرستش کی تلقین کی گئی ہے۔ شارحین نے اسے تکرار محسوس کیا ہے لیکن فی الواقع یہ تکرار نہیں ہے بلکہ لا تفسدوا فی الارض، یعنی بندگی کو دو پرستشوں کے درمیان لا کر ایک تاریخی گمراہی کی طرف اشارہ کیا ہے پہلی گمراہی تو رہبانیت کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اور دوسری گمراہی یہ رہی ہے کہ دنیوی معاملات اور مسائل اور رباقی زندگی میں انسان آزاد ہے کیونکہ عبادت فرد کا کام ہے جماعت کا نہیں۔ اس لیے دین بھی انسان اور خدا کے درمیان کا ایک نجی معاملہ ہے جو دُنیا کے عام اجتماعی مسائل اور معاملات سے کوئی تعرض نہیں کرتا ہے نہ اسے کوئی تعرض کرنا چاہیے ان مسائل میں انسان کو اختیار ہے جو راستہ چاہے اختیار کرے

اور زندگی کا جو نظام چاہے اپنائے خدا اور مذہب کو اس سے کوئی بحث نہیں ہے۔ عیسائی پہلی کا اور یہودی اس دوسری بیماری کا شکار تھے۔ مولانا شیخ الاسلام کے الفاظ میں یہود کا لذات و شہوات دنیا اور حرام خوری میں انہماک جو تفریق فی الدین کا سبب ہوا اور نصاریٰ کا دین میں غلو اور افراط جو آخر کار رہبانیت کی صورت اختیار کر گیا۔ ان دونوں کی تردید مقصود تھی اس لیے لا تفسدوا فی الارض کو ادعوا ربکم تضرعاً الخ اور وادعوہ خوفاً و طمعاً، کے درمیان لائے اور بتا دیا کہ پرستش ذاتی اور انفرادی اصلاح اگر بندگی اجتماعی اصلاح سے بیگانہ ہو راہبانہ تصوّر ہے اور بندگی یعنی اجتماعی اصلاح اگر پرستش ذاتی اصلاح سے بیگانہ ہو تو الحاد ہے۔ اس طرح سمجھا دیا کہ اسلام صرف ایک نظری عقیدہ و فلسفہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک عظیم الشان اصلاحی قوت ہے جو اگر ایک طرف باطن میں نفس انسانی کی شرارتوں اور انسانی خواہشات کی بے قیدیوں کا مقابلہ کرتی ہے تو دوسری طرف ظاہر میں اپنے خارجی ماحول اور اپنی معاشرتی سیاسی زندگی کے مفسدات سے آمادہ پیکار رہتی ہے۔ پہلی آیت ادعوا ربکم تضرعاً الخ میں اگر خدا کو پکارنے کی ہیئت بتائی گئی ہے تو اس آیت میں وادعوہ خوفاً و طمعاً، خدا کو پکارنے کا محرک واضح کر دیا۔ اس مجموعہ سے شرک کی ہر نوع کی خواہ وہ پرستش میں ہو یا بندگی میں جڑ کٹ گئی ہے۔ تضرع استکبار کی ضد ہے۔ استکبار خدا سے بے پرواکرتا ہے۔ اگر اس کا سر کچل دیا جائے تو انسان میں احتیاج و نیازمندی پیدا ہوتی ہے اور نیازمندی کے ذریعے انسان اپنے رب سے قریب ہوتا ہے۔ نیازمندی کے دو پہلو ہیں ایک خوف اور دوسرے طمع۔ انسان کے اندرونی داعیات بھی ان ہی دو قسموں میں منقسم ہیں۔ اور اس کے خارجی عوامل و محرکات کا تجزیہ بھی یہی ہے کہ ہم اگر کچھ اندیشے رکھتے ہیں تو ساتھ ہی کچھ ارمان بھی رکھتے ہیں۔ یہاں پوری زندگی اندیشوں اور ارمانوں کی زندگی ہے قرآن نے ان دونوں حالتوں کے لیے توحید کا تقاضا یہ بتایا ہے کہ انسان ارمانوں اور اندیشوں میں صرف اللہ کو اپنا مرجع بنائے جو کچھ چاہے اس کے لیے بھی اللہ سے رجوع کرے اور جن سے اندیشہ محسوس کرے اس سے بچنے کے لیے بھی خدا ہی کی پناہ ڈھونڈے کیونکہ دینے والا بھی وہی ہے اور روکنے والا بھی وہی ہے۔

اس سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ پہلے فقرے میں جس چیز کو فساد سے تعبیر کیا تھا وہ دراصل یہی ہے کہ انسان پرستش اور بندگی میں خدا کے بجائے کسی اور کو اپنا ولی و سرپرست اور کارساز کا اقرار دے کر مدد کے لیے پکارے اور اصلاح اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان کی ہر پکار کا مرجع اللہ کی ذات ہی ہو جائے۔

خوف اور طمع کے ساتھ پکارنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں خوف بھی اللہ سے ہو اور تمہاری امیدیں بھی وابستہ ہوں تو صرف اللہ سے ہوں۔ اللہ کو پکارو تو اس احساس کے ساتھ پکارو کہ تمہاری قسمت بالکلیہ اس کی نظر عنایت پر منحصر ہے فلاح و سعادت مل سکتی ہے تو صرف اس کی مدد اور رہنمائی سے مل سکتی ہے ورنہ

جہاں تم اس کی اعانت و عنایت سے محروم ہوئے تو پھر تمہارے لیے تباہی و نامرادی کے سوا کوئی دوسرا انجام نہیں ہے۔

آیت میں کچھ علماء نے تضرعاً و خفیہ خوفاً و طمعاً" کو مفعول لہٗ قرار دیا ہے لیکن کچھ علماء کے خیال یہ حال ہیں۔ حافظ ابوالقاسم السہیلی نے بھی اسی کو اپنایا ہے اور حافظ ابن القیم نے اسی کی صحت پر مہرِ تصدیق ثبت کی ہے مطلب یہ ہے کہ لوگو! اپنے رب کو پکارو گڑگڑا کر خوف اور امید کی حالت میں۔

آخر میں فرمایا، رحمۃ اللہ قریب من المحسنین، اللہ کی رحمت حسن کاروں کے قریب ہے۔ علماء نے رحمت کی رعایت سے قریب خبر نہ لانے پر خوب دادِ تحقیق دی ہے۔ حافظ ابن القیم نے اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے لیکن ہم ناظرین کو اس خشک بحث میں الجھانا نہیں چاہتے ہیں بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ آیت کا صحیح منطوق ہدیہ ناظرین کریں۔ ارشاد میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کی رحمت خوب کار اور حسن کاروں سے بہت قریب ہوتی ہے۔ عام خیال تو یہی ہے کہ مقامِ احسان پر فائز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان بیم و رجا دونوں حالتوں میں اپنے رب کی طرف متوجہ ہو۔ لیکن اس صورت میں اس فقرہ کا تعلق صرف "وادعوہ خوفاً و طمعاً" سے ہوگا۔ ہماری رائے میں اس فقرہ کا تعلق پوری آیت سے ہے اور بتایا یہ جارہا ہے کہ حسن کار وہ لوگ ہیں جن کے پرستش اور بندگی دونوں قسم کے تعلقات اللہ سے ہوں۔ اللہ کے سوا کسی سے نہ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ پرستش و بندگی دونوں کا مجموعہ وہ خوب کاری ہے جس کا تم سے مطالبہ کیا جارہا ہے۔ اس کے جواب میں تمہارا مطلوب اللہ سے صرف اس کی رحمت ہے اور یہ واقعہ اور حقیقت ہے کہ اللہ کی رحمت ان خوب کاروں کے قریب ہوتی ہے جو مامورات کی بجاآوری کرتے ہیں۔ یہ آیت منطوق کے اعتبار سے بتارہی ہے کہ اللہ کی رحمت حسن کاروں کے قریب ہوتی ہے۔ اور مدلول کے اعتبار سے کہہ رہی ہے کہ رحمت کے قریب ہونے کی وجہ احسان ہے اور مفہوم کے اعتبار سے بتارہی ہے کہ جو محسن نہیں ہوتے وہ رحمت سے دور ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی اشارہ ہو رہا ہے کہ قرآن کی دعوت کی راہ میں کتنی مشکلات پیش آئیں لیکن اس کی کامیابی اٹل ہے۔ اور اہلِ ایمان کو اس بارے میں تنگ دل نہ ہونا چاہیے کیونکہ خدا کی رحمت نیک کرداروں سے دور نہیں ہے۔

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ حَتّٰٓى
اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ
فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ
تَذَكَّرُوْنَ ۞ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ وَالَّذِيْ
خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ
يَّشْكُرُوْنَ ۞

اور وہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے خوشخبری کی خاطر روانہ کرتا ہے۔ پھر جب وہ ہوائیں پانی سے بھاری بھرکم بادلوں کو اٹھالیتی ہیں تو ہم انہیں کسی بستی کی طرف ہانک دیتے ہیں پھر بارش برساکر اس زمین سے قسم قسم کے پھل نکالتے ہیں۔ اسی طرح ہم روزِ قیامت مردوں کو قبروں سے نکال لیں گے شاید تم اس نظارے سے نصیحت حاصل کرلو۔ جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے

رب کے حکم سے خوب سبزہ اگاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ اسی طرح ہم اپنی نشانیوں کو ان لوگوں کے لیے بار بار پیش کرتے ہیں جو خدا کے شکر گزار ہیں۔ [۵۸]

معانی مفردات

ریاح، ہوائیں ریح کی جمع، واضح رہے کہ قرآن مجید میں جہاں ارسال ریح کا تذکرہ ہے اگر بلفظِ جمع ہے یعنی ریاح کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں عام طور پر رحمت کی ہوائیں مراد ہیں۔ اور اگر ریح یعنی واحد کا لفظ استعمال ہوا ہے تو عذاب کے معنے مراد ہیں۔ علامہ سیوطی "اتقان فی علوم القرآن" میں رقمطراز ہیں کہ:

اسی قاعدہ سے ریح ہے کہ وہ بصورتِ جمع بھی قرآن میں آئی ہے اور مفرد ہو کر بھی۔ جہاں وہ سیاق رحمت میں آئی ہے جمع ہو کر استعمال ہوئی ہے اور جہاں عذاب کا ذکر ہے وہاں مفرد آئی ہے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابی بن کعب کے حوالہ سے بتایا ہے کہ قرآن میں ریاح سے ہر جگہ رحمت اور ریح سے ہر جگہ عذاب مراد ہے اسی لیے ارشادِ نبوت ہے اللھم اجعلھا ریاحا ولا تجعلھا ریحا" اے اللہ اسے ہوائیں بنا ہوا نہ بنا۔ اور اس کی حکمت یہ بتائی گئی ہے کہ رحمت کی ہواؤں کی صفات اور منفعتیں مختلف ہوتی ہیں جب بھی ان میں سے کوئی ہوا چلتی ہے تو اس کے مقابل سے ایسی چیز نمایاں ہو جاتی ہے جو اس کے زور کو توڑ دے اور پھر ان دونوں کے درمیان سے ایسی ہوائے لطیف اٹھتی ہے جو حیوان، نباتات دونوں کو نفع دیتی ہے اس لیے رحمت تو کئی ہوائیں ہیں اور عذاب کے اندر ہوا ایک ہی رخ پر آتی ہے نہ ان کو روکنے والا کوئی ہوتا ہے نہ دفع کرنے والا۔ اقلت، اقلال سے فعل ماضی کا واحد مونث ہے اس کے معنے کسی چیز کو اس طرح اٹھا لینا ہے گویا اس میں کوئی وزن نہیں ہے۔ اس معنے میں کہ ہواؤں نے اسے اٹھایا اور اپنی قوت کے لحاظ سے اسے قلیل پایا۔ اس کے استعمال میں اشارہ ہے کہ ہواؤں میں کس قدر

طاقت ہے جو لاکھوں کروڑوں من پانی کا بوجھ اٹھائے پھرتی ہیں۔

ایک معنے خیز تمثیل

پچھلی آیات میں استوار علی العرش کے فلکیات چاند سورج وغیرہ میں جو خدائی تصرفات ہیں ان کا بیان تھا درمیان میں بندوں کو کچھ ہدایات دی گئیں اب سفلیات اور کائنات الجو کے متعلق اپنے بعض تصرفات کا ذکر فرماتے ہیں تاکہ لوگ معلوم کرلیں کہ آسمان و زمین اور ان دونوں کے درمیانی حصہ کی کل حکومت صرف اسی رب العالمین کے قبضہ و قدرت میں ہے۔ ہوائیں چلانا، مینہ برسانا، قسم قسم کے پھول پھل پیدا کرنا، ہر زمین کی استعداد کے موافق کھیتی اور سبزہ اگانا یہ سب اسی کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کے نشان ہیں۔ اسی ذیل میں مردوں کا موت کے بعد جی اٹھنا اور قبروں سے نکلنا بھی سمجھادیا۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک تو مردوں کا نکلنا قیامت میں ہے ایک دُنیا میں جاہل ادنیٰ لوگوں میں (جو جہالت و ذلت کی موت سے مرچکے تھے) عظیم الشان نبی بھیجا اور انہیں علم دیا اور دُنیا کا سردار کیا۔ پھر ستھری استعداد والے کمال کو پہنچے اور جن کی استعداد خراب تھی ان کو بھی فائدہ پہنچ رہا ناقص سا۔ گویا اس پورے رکوع میں بتا دیا کہ جب خدا اپنی رحمت و شفقت سے رات کی تاریکی میں ستارے چاند سورج سے روشنی کرتا ہے اور خشکی کے وقت زمین کو سرسبز و شاداب کرنے اور انسان و حیوان کی زندگی کا سامان مہیّا فرمانے کے لیے اوپر سے بارش بھیجتا ہے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایسا مہربان خدا اپنی مخلوق کو جہل و ظلم کی تاریکیوں سے نکالنے کے لیے کوئی چاند اور سورج پیدا نہ کرے۔ اور بنی آدم کی روحانی غذا تیار کرنے اور قلوب کی کھیتیوں کو سیراب کرنے کے لیے باران رحمت نازل نہ فرمائے۔ بلاشبہ اس نے ہر زمانے کی ضرورت اور اپنی حکمت کے موافق پیغمبروں کو بھیجا جن کے منوّر سینوں سے دنیا میں روحانی روشنی پھیلی اور وحی الٰہی کی لگاتار بارشیں ہوئیں۔ چنانچہ آئندہ کئی رکوعوں میں ان ہی پیغمبروں کے بھیجنے کا ذکر ہے اور جیساکہ بارش اور زمین کی مثال میں اشارہ کیا گیا کہ مختلف زمینیں اپنی اپنی استعداد کے مطابق بارش کا اثر قبول کرتی ہیں اسی طرح سمجھ لو کہ انبیاء علیہم السلام جو خیر و برکت لے کر آتے ہیں اس سے منتفع ہونا بھی حسن استعداد پر موقوف ہے۔ جو لوگ ان سے انتفاع نہیں کرتے یا پورا انتفاع نہیں کرتے انہیں اپنی سوءِ استعداد پر رونا چاہیے۔

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

۷۸۔ اور وہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت سے آگے خوشخبری کی خاطر روانہ کرتا ہے۔ رحمت سے مراد یہاں بارش ہے۔ یہی عام شارحین قرآن کی رائے ہے۔ ریاح ریح کی جمع ہے ہوا کو کہتے ہیں۔ ہوا اللہ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے۔ اس کا ہونا ہر جاندار کی زندگی کی ناگزیر ضرورت ہے۔ اگر یہ ہو تو کوئی جاندار انسان ہو یا کوئی اور آنکھ جھپکنے میں موت کا نوالہ بن جاتے۔ ہوا کی ساری افادیت اس کے متحرک ہونے پر ہے اہل عرب کے یہاں ہوائیں چار ہیں۔ شمال، جنوب، صبا اور دبور۔ اہل عرب کی روایتی تاریخ میں یہ بات مسلم ہے کہ بارش کے لیے ایک ہوا نہیں بلکہ چاروں ہوائیں مل کر کام کرتی ہیں۔ صبا کا کام ہے بادلوں کو بنانا شمال کا کام ہے ان کو جمع کرنا، جنوب کا کام ہے برسانا اور دبور کا کام ہے ان کو منتشر کر دینا۔ یاد رہے کہ یہ صرف عرب کا اپنا تجربہ ہے ورنہ مختلف ممالک میں ہواؤں کے کام میں اختلاف ہے عربی مذاق کی رعایت سے ریاح جمع لے کر آیا ہے اور چونکہ بارش کا سامان ہوا نہیں بلکہ ہوائیں کرتی ہیں اس لیے ریاح کو خوش آئند سمجھا گیا ہے۔ حضور انور اسی معنے کے اعتبار سے یہ دعا فرماتے ہیں:

اللّٰھم اجعلھا ریاحاً ولا تجعلھا ریحاً

بارش جس پر تمام دنیا کی زندگی کا انحصار ہے ممکن نہیں ہے کہ کوئی ایک قطرہ اس کا زمین پر ٹپکا دے یہ خدا ہی ہے جو پہلے مانسون لانے والی ہوائیں چلاتا ہے پھر کچھ ہوائیں بطور مقدمۃ الجیش آگے آگے ٹھنڈی بارش کی خوشخبری لے کر آتی ہیں۔ اور بقول حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ العزیز، اللہ سبحانہٗ کی عام عادت یہ ہے کہ بارش سے پہلے ایسی ٹھنڈی ہوائیں بھیجتے ہیں جن سے خود بھی انسان کو راحت و بشاشت ہوتی ہے اور وہ گویا آنے والی بارش کی خبر بھی پہلے دے دیتی ہیں اس لیے یہ ہوائیں دو نعمتوں کا مجموعہ ہیں۔ خود بھی انسان اور عام مخلوقات کے لیے نافع اور مفید ہیں اور بارش کے آنے سے پہلے بارش کی خبر بھی دے دیتی ہیں کیونکہ ایک لطیف اور نازک مخلوق ہے کہ اس کی بہت سی ضروریات بارش کی وجہ سے بند ہو جاتی ہیں۔ جب بارش کی اطلاع کچھ پہلے مل جاتے تو وہ اپنا انتظام کر لیتا ہے اس کے علاوہ خود اس کا وجود اس کا سامان بارش کا متحمل نہیں وہ بارش کے آثار دیکھ کر پہلے ہی تیاری کر لیتا ہے۔

مُردہ زمین کی سیرابی

۷۹۔ پھر جب وہ ہوائیں پانی سے بھاری بھر کم بادلوں کو اٹھاتی ہیں تو ہم انہیں کسی مردہ بستی کی طرف ہانک دیتے ہیں پھر بارش برسا کر زمین سے قسم قسم کے پھل نکالتے ہیں۔ اقلال کے معنے

کسی چیز کو اٹھا لینا ہے۔ سحاب سحابہ کی جمع ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور حکمت بالغہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ دیکھو کس طرح ہوائیں بوجھل بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں گویا وہ روئی کے گالے ہیں۔ اور پھر ہم جدھر چاہتے ہیں ان کو ہانک کرلے جاتے ہیں اور جس جگہ چاہتے ہیں جل تھل کر دیتے ہیں کسی کی طاقت نہیں کہ ان کو اپنے پسند کردہ رُخ پر موڑ سکے۔

اصل ارشاد میں بلد میت آیا ہے مرا ہوا شہر، مرے ہوئے شہر سے وہ بستی مراد ہے جو پانی نہ ہونے کی وجہ سے ویران ہوتی ہے۔ اور بجائے زمین کے خصوصیت سے بستی کا ذکر اس لیے ہوا ہے کہ اصل مقصد بارش اور اس سے زمین کی سیرابی کا انسانی ضروریات کی ہم رسانی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانوں کے رہنے کی جگہ شہر اور بستی ہے ورنہ جنگل کی سرسبزی خود کوئی مقصد نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بارش زمین کی شادابی اور روئیدگی کا ذریعہ ہے اگر یہ نہ ہو تو زمین کی روئیدگی بھی نہ ہو لیکن بارش کیسی ہوتی ہے اور کس طرح مقررہ اندازوں اور پیمانوں کا ایک پورا نظام کام کر رہا ہے۔ پہلے سمندر سے بھاپ اٹھتی ہے اور پانی کے ذروں سے باردار ہو کر بلندی کی طرف چڑھتی ہیں۔ پھر بلندی پر سحاب ابر کی چادریں بنتی ہیں اور چادریں فضا میں پھیل جاتی ہیں۔ پھر وہی چادریں بارش کے قطرے بن کر گرنے لگتی ہیں اور زمین کے ایک ایک کونہ کو شاداب کر دیتی ہیں۔ لوگ پانی کے ذخیرے جمع کر کے نہیں رکھتے لیکن آسمان ہمارے لیے جمع کرتا رہتا ہے اور پھر انسانی و حیوانی ضروریات کے مطابق بارش کا عطیہ اللہ کی جانب سے اتار دیتا ہے۔ یہ بات کہ ہوائیں پانی کا ذخیرہ بھاری بھر کم بادلوں کی صورت میں اٹھاتی ہیں استدلال کا اصلی نقطہ ہے کیونکہ تقدیر و نظم کی یہ حالت بغیر اس کے نہیں ہو سکتی کہ ربوبیت کا کوئی ارادہ پس پردہ کام کر رہا ہے۔

اس کے بعد فرمایا فانزلنا به الماء فاخرجنا به من کل الثمرات یعنی صرف اتنی بات نہیں کہ پانی کے وافر ذخیرے بادلوں کے ذریعے اٹھائے جاتے ہیں بلکہ یہ بھی ہو رہا ہے کہ ایک خاص انتظام ایک خاص ترتیب کے ساتھ تقسیم ہو رہا ہے اور اس کے ذریعے زندگی کی ضروریات فراہم ہو رہی ہیں۔ پانی جیسا جوہر حیات پیدا کرنا اگر اللہ کی رحمت ہے لیکن یہ اس کی ربوبیت ہے جو پانی کو ایک ایک بوند کر کے ٹپکاتی۔ زمین کے ایک ایک گوشہ تک پہنچاتی ایک خاص مقدار اور حالت میں تقسیم کرتی۔ ایک خاص موسم اور محل میں برساتی اور زمین کے ایک ایک تشنہ ذرے کو ڈھونڈ کر سیراب کر دیتی ہے۔

تذکیر بالیوم الآخر

۸۰ ۔ اسی طرح ہم مردوں کو قبروں سے نکال لیں گے شاید تم اس نظارے سے نصیحت حاصل کر لو۔ اصل

ارشاد میں کذالک آیا ہے ذالک اسم اشارہ ہے یعنی جیسے ہم زمین سے پیداوار کرتے ہیں ایسے ہی ہم زمین سے مُردوں کو نکال لیں گے یا جیسے ہم مردہ زمین میں زندگی پیدا کرتے ہیں ایسے ہی زمین میں دبے ہوئے مُردوں میں زندگی پیدا کردیں گے۔ جس اللہ کی یہ نشانیاں روزانہ تمہارے مشاہدے میں آرہی ہیں مُردوں کو زندہ کرنا اس کی قدرت سے کیوں بعید سمجھتے ہو۔ ہم نے یہ نشانیاں زمین میں نمایاں ہی اس لیے کی ہیں کہ ان آثار سے تم آخرت کے لیے یاددہانی اور نصیحت حاصل کرو۔ مطلب یہ ہے کہ جب مُردہ زمین سے تم زندہ سبزیاں اُگتے دیکھ رہے ہو اور اس پر تمہیں کبھی حیرت نہیں ہوتی تو اس پر حیران کیوں ہو۔ نباتات کی زندگی اور جاندار کی زندگی میں فرق کیا ہے۔ دونوں جگہ اللہ سبحانہ کی قدرت کاملہ کام کر رہی ہے۔

آیات کی اس اجمالی تشریح کے بعد اس تمثیل کی معنویت کا بھی مطالعہ فرمالیجئے۔ سُورت کے آغاز سے یہاں تک تین مرکزی موضوع بیان ہوئے ہیں۔ ایک توحید دوسرے رسالت اور تیسرے آخرت۔ یہ آیت ان تینوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور اس آیت میں پیش کردہ تمثیل کے ذریعہ قرآن نے تینوں کو سمجھایا ہے۔

تمثیل سے توحید کی وضاحت

آیت میں توحید الٰہیت کو سمجھانے کے لیے بتایا ہے کہ خوف و طمع دونوں ہی حالتوں میں یگانہ خدا کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ کیونکہ رحمت ہمیشہ اللہ ہی کی طرف سے آتی ہے۔ بارش جس پر تمام دُنیا کی زندگی کا انحصار ہے۔ یہ خدا ہی کی کارفرمائی ہے جو پہلے مانسون لانے والی ہوائیں چلاتا ہے جو بوجھل بادلوں کو اپنے کاندھوں پر اٹھالیتی ہیں پھر خدا ان کو بے آب وگیاہ علاقوں کی طرف ہانک دیتا ہے اور وہاں ان سے پانی برسا دیتا ہے جس سے ہر قسم کے پھل اور ہر قسم کی فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔ اللہ کے سوا کون ہے جو ساری دُنیا کی پرورش کر رہا ہے اور جس نے پرورش کا یہ نظام بنایا۔ اس کے سوا کون اس کا مستحق ہے کہ بندگی و نیاز کا سر اس کے آگے جھکایا جائے۔

تمثیل سے رسالت کی وضاحت

اسی طرح اس تمثیل سے انسانی سعادت و شقاوت کے معنوی قوانین اور وحی و رسالت کی ضرورت کو بھی سمجھایا ہے۔ رسُول کی آمد اور خدائی تعلیم کے نزول کو بارانی ہواؤں کے چلنے اور ابرِ رحمت کے چھا جانے اور امرت بھری بوندوں کے برسنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اگر اللہ کی ذات رب العالمین ہے

اور اس کی ربوبیت کا یہ حال ہے کہ ہر ذرہ کی سیرابی اور ہر چھوٹی سے چھوٹی کارسازی رکھتی ہے تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ انسان کی روحانی سعادت کے لیے اس کے پاس سیرابی کا کوئی سامان نہ ہو۔ اس کی پروردگاری اجسام کی پرورش کے لیے آسمان سے پانی برساتی ہے لیکن روحوں کی پرورش کے لیے ایک قطرہ فیض کا بھی انتظام نہیں کرتی۔ تم دیکھتے ہو کہ جب زمین شادابی سے محروم ہو کر مردہ ہو جاتی ہے تو یہ اس کا قانون ہے کہ بارانِ رحمت نمودار ہوتی ہے اور زندگی کی برکتوں سے زمین کے ایک ایک ذرے کو مالامال کر دیتی ہے۔ پھر کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ جب عالمِ انسانیت ہدایت و سعادت کی شادابیوں سے محروم ہو جائے تو اس کی بارانِ رحمت متوجہ ہو کر ایک ایک روح کو پیامِ زندگی پہنچا دے۔ روحانی سعادت کی یہ بارش کیا ہے۔ یہ نبوت و رسالت اور وحی الٰہی ہے۔ تم اس منظر پر کبھی حیران نہیں ہوتے ہو کہ بارش ہوئی اور مردہ زمین زندہ ہو گئی۔ پھر اس بات پر کیوں چونکتے ہو کہ وحی الٰہی آئی اور مردہ روحوں میں زندگی کی جنبش آ گئی۔ اس آیت میں بارش کے ذریعہ سے مُردہ پڑ ہوئی زمین کے یکایک جی اُٹھنے اور اس کے بطن سے زندگی کے خزانے اُبل پڑنے کو نبوت و رسالت بطور مثال پیش کیا ہے جو نبی کی تعلیم و تربیت اور رہنمائی سے مردہ پڑی ہوئی انسانیت بحال اُٹھنے اور اس کے سینے سے بھلائیوں کے خزانے ابل پڑنے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور آیت میں لفظ رحمت کہہ کر اشارہ کر دیا ہے کہ جیسے بارش رحمت مادی ہے ایسے ہی نبوت و وحی رحمت معنوی ہے۔ معنوی ہدایت کے لیے نبوت کا خدا کی جانب سے ایسا ہی فیضان ہے جیسے جسمانی تربیت کے لیے خدا کی جانب سے بارانِ رحمت کا فیضان ہے۔ بالفاظِ دیگر خدا کی ربوبیت اور رحمت دونوں کا تقاضا ہے کہ انسان کی مادی اور جسمانی تربیت کی طرح انسان کی روحانی اور معنوی ہدایت کا سامان ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جا بجا نزول وحی، ترسیل کتب اور بعثتِ انبیاء کو رحمت سے تعبیر کیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں رحمت عالمین کہا ہے۔

تمثیل سے معاد کی وضاحت

اسی بارش کی تمثیل سے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جس طرح تم دیکھتے ہو کہ بارش بھیج کر ایک بالکل مردہ اور بے آب و گیاہ زمین کو ہم از سرِ نو زندہ کر دیتے ہیں اسی طرح ایک دن ہم تمام مُردوں کو زندہ کر دیں گے۔ گویا مُردہ زمین کی شادابی یقین دلا رہی ہے کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی ہے۔ جس طرح بارش کی مقررہ گھڑی تمام اجسام نباتی کو موت کی حالت سے زندگی کی حالت میں لے آتی ہے ضروری ہے کہ

نوعِ انسانی کے لیے بھی ایک ایسی مقررہ گھڑی ہو۔ قرآن کی اس تمثیل سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت اور مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کا معاملہ بھی موسموں کی تبدیلی کا سا معاملہ ہے۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں خزاں بہار۔ خشک سالی و سیرابی، گرمی و سردی کے مختلف موسم آتے رہتے ہیں۔ اسی طرح تبدل کائنات کا بھی ایک موسم ہے۔ اور ہمارے سال کی طرح اس کا بھی کوئی سال اور ہماری روزشماریوں کی طرح اس کی بھی کوئی روزشماری ہے لیکن ہم اپنی تقویم پر جو کائنات کے صرف ایک حقیر کرّے کی سیر و گردش کا نتیجہ ہے اس کی تقویم کو قیاس نہیں کرسکتے اس کی مدت کوئی بڑی ہی طولانی مدت ہے اتنی طولانی کہ ہماری وقت شماری کا پچاس ہزار سال اور اس کا صرف ایک دن۔ سورج معارج میں ہے تعرج الملائکۃ فی یوم کان مقدارہٗ خمسین الف سنۃ، ہمارے سال کے موسموں کی طرح اس کا بھی ایک موسم ختم ہوتا اور دوسرا موسم شروع ہوتا ہے۔ یہاں جب حیاتِ ارضی کا موسم آیا تو اس کی محرک اول بارش ہوتی ہے۔ بارش گرتی ہے اور اموات نباتات کو زندگی مل جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جب سال کائنات کا وہ مقررہ موسم آئے گا تو بارش ہی زندگی کی کوئی صورت ہوگی۔ فاذا نفخ فی الصور، اور بہ مجرد حکم تمام اموات انسانی اٹھ کھڑی ہوں گی۔ گویا بارش یہ یقین دہانی کرا رہی ہے کہ یہ کارخانہ حکمت بغیر کسی مصلحت و حکمت کے نہیں ہوسکتا اور ضروری ہے کہ انسان کی زندگی صرف اتنی نہ ہو کہ پیدا ہوا کھایا پیا اور فنا ہوگیا بلکہ اس کے بعد بھی کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔

اللہ اکبر کیا بلاغت قرآنی ہے کہ صرف ایک بارش کی تمثیل سے توحید معاد اور رسالت کے حقائق آشکارا ہوگئے۔ گویا سورت کے آغاز سے یہاں تک جو مسائل زیرِ بحث آئے تھے اصولاً وہ سب ہی سامنے آگئے

فیض بقدرِ استعداد ہوتا ہے

۸۱۔ اور جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ رب کے حکم سے خوب سبزہ اگاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا، اسی طرح ہم اپنی نشانیوں کو ان لوگوں کے لیے باربار پیش کرتے ہیں جو خدا کے شکرگزار ہیں۔ اس آیت میں بارش ہی کو موضوع بنا کر اس اہم مادی قانون کی طرف توجہ دلائی ہے کہ بارش سے صرف وہی زمین فائدہ اٹھا سکتی ہے جس میں اس کی استعداد ہو۔ شور زمین پر کتنی ہی بارش ہو سرسبز نہ ہوگی۔ اسی طرح وحی و نبوت کی صورت میں جو رحمت اللہ کی جانب سے آتی ہے اس کا فیض بھی ہر شخص کو یکساں نہیں پہنچے گا بلکہ استعداد اور صلاحیت کے اعتبار سے پہنچے گا جن کی فطری صلاحیتیں زندہ ہیں وہ تو باغ و چمن کی طرح لہلہا اٹھیں گے لیکن جنہوں نے اپنی صلاحیتیں ضائع کردی ہیں۔ ان سے عناد و عداوت کے خار و خس کے سوا اور کسی چیز کی توقع نہ رکھو مطلب یہ ہے

کہ جس طرح بارش کے نزول سے یہ ساری برکتیں صرف اسی زمین کو حاصل ہوتی ہیں جو حقیقت میں زرخیز ہوتی ہے اور محض پانی نہ ملنے کی وجہ سے جس کی صلاحیتیں دبی رہتی ہیں اسی طرح رسالت کی ان برکتوں سے بھی وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو حقیقت میں صالح ہوتے ہیں اور جن کی صلاحیتوں کو محض رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے نمایاں ہونے اور برسرکار آنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ رہے شرارت پسند اور خبیث قسم کے لوگ تو جس طرح شوریلی زمین بارانِ رحمت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتی بلکہ پانی پڑتے ہی اپنے پیٹ کے چھپے ہوئے زہر کو کانٹوں اور جھاڑیوں کی صورت میں اگل دیتی ہے۔ اسی طرح رسالت کے ظہور سے انہیں بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ اس کے برعکس ان کے اندر دبی ہوئی تمام خباثتیں ابھر کر پوری طرح برسرکار آجاتی ہیں۔

زمیں شورہ سنبل بر نیارد
درو تخم عمل ضائع مگردان

کتنی اہم حقیقت ہے جس کی وضاحت کے لیے ایک ایسی مثال بیان کی جو ہر انسان کے علم و مشاہدے میں آتی رہتی ہے۔ اللہ اکبر یہ بات کہ فیض بقدر استعداد حاصل ہوتا ہے فاعل کی قوتِ فاعلی سب کے لیے یکساں ہے لیکن مفعول میں قابلیت انفعال جدا جدا ہے۔ اس نازک اور دقیق حقیقت کے لیے کیسی صاف اور عام الورود مثال بیان فرمائی کہ جس کے معائنہ سے کوئی انسانی نگاہ بھی محروم نہیں فرمایا کہ جب پانی برستا ہے تم دیکھتے ہو کہ سب جگہ یکساں برستا ہے لیکن زمین کے کچھ حصے شاداب اور گل ریز ہو جاتے ہیں اور کچھ میں خار کے سوا کچھ نہیں اُگتا۔ پانی کی فاعلی قوت برابر ہے لیکن زمین کی انفعالی قابلیت یکساں نہیں ہے اسی طرح نبوت کے بادل سے وحی الٰہی کی بارش ہوتی ہے۔ کچھ قلوب تو موسم بہار کے پھول بن کر سامنے آتے ہیں اور کچھ عناد و عداوت کے خار و خس کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

قرآن کی اس آیت میں اللہ سبحانہ نے جو بات اُمتِ دعوت کے بارے میں فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ ایمان قبول کرنے اور نہ کرنے کا راز یہ ہے یہی بات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ارشاد میں اُمت اجابت کے بارے میں فرمائی ہے کہ ایمان قبول کرنے کے بعد اہلِ ایمان تین قسم کے ہیں۔ یہ بات کہ ارشاد کا تعلق اُمتِ اجابت سے ہے اُمتِ دعوت سے نہیں اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ امام بخاری نے اس ارشاد کو اپنی صحیح میں کتاب العلم کے مشہور عنوان فضل من علم و علم میں بطور دلیل پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ عالم ہونے اور عالم بنانے کی فضیلت کا مقام ایمان سے پہلے نہیں بلکہ ایمان کے بعد ہے پورا ارشاد سن لیجئے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب صلی اللہ علیہ وسلم کا

ارشاد ہے کہ جو ہدایت اور دین اللہ نے مجھے دے کر روانہ فرمایا ہے اس کی مثال بارش کی سی ہے جو زمین پر برستی ہے۔ زمین کے ایک حصہ نے جو بہت عمدہ تھا خوب پانی پیا، گھاس اور سبزہ اچھا اگایا اور ایک حصہ جو بنجر تھا اس نے پانی سمیٹ لیا۔ اس کے ذریعے اللہ سبحانہ نے دوسروں کو فائدہ پہنچایا خود پانی پیا دوسروں کو پلایا لیکن زمین کا ایک حصہ جو چٹیل تھا اس نے نہ پانی روکا اور نہ پیداوار کی۔ یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے اللہ سبحانہ کے دین میں تفقہ پیدا کیا اور اللہ سبحانہ نے اسے دین سے فائدہ دیا اس نے خوب سیکھا اور دوسروں کو سکھایا اور اس شخص کی مثال ہے جس نے سر اٹھا کر ادھر نہیں دیکھا اور ہدایت کو نہیں اپنایا جسے مجھے دے کر اللہ نے روانہ کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب پانی برستا ہے تو زمین بارش کے پانی سے فائدہ اٹھانے میں تین حصوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔

الف: پانی کو چوس کر پیداوار کرنے والی زمین
ب: پانی کا ذخیرہ رکھنے والی زمین
ج: ناقابل کاشت اور ناقابل ذخیرہ

ٹھیک اسی طرح علم وہدایت کے لیے انسانی قلوب کی زمین بھی تین حصوں میں منقسم ہوتی ہے۔

الف: وہ جو قرآن وسنت کا ذخیرہ رکھتے ہیں
ب: وہ جو قرآن وسنت سے مسائل کا استخراج کرتے ہیں
ج: وہ جو نہ ذخیرہ رکھتے ہیں اور نہ استخراج کرتے ہیں

پانی کا ذخیرہ رکھنے والی زمین

جو لوگ قرآن وسنت کا ذخیرہ رکھتے ہیں یعنی حفاظِ قرآن اور حفاظِ حدیث، یہ زمین کی وہ قسم ہے جسے زبانِ نبوت نے

زمین کا وہ حصہ جو بنجر تھا اس نے پانی کو روکا اور اللہ نے اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچایا لوگوں نے پانی پیا اور زمین سیراب کی۔

سے تعبیر کیا ہے، یہ قرآن وسنت کی بالذات حفاظت کرنے والے اور ان کے الفاظ کو اپنے سینوں میں سمیٹے ہوتے ہیں آیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم یہ حفاظِ قرآن اور محدثین ہیں۔ علامہ سندھی فرماتے ہیں،

یہ وہ قسم ہے جس میں بالذات علم ہی سے فائدہ ہوتا ہے جیسے اہل حفظ اور اہل روایت۔
اسی قسم کے بارے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،
خوش و خرم رکھے اللہ اس شخص کو جس نے میری بات سنی اسے محفوظ رکھا اور پوری حفاظت سے آگے روانہ کیا۔ بہت سے سمجھ رکھنے والے بات کو اپنے سے زیادہ سمجھدار تک پہنچاتے ہیں۔
امام شافعی نے اس حدیث پر یہ نوٹ لکھا ہے کہ بہت سے مسائل کے عالم مسائل کے حافظ ہوتے ہیں مگر فقیہ نہیں ہوتے۔ یعنی عُلَما، دو قسم کے ہیں حفّاظ اور فقہا۔ ہر حافظِ حدیث فقیہ نہیں ہوتا۔

پانی سے پیداوار کرنے والی زمین

کچھ لوگ صرف پانی کی حفاظت ہی کا کام نہیں کرتے بلکہ اس سے مسائل کے استخراج اور استنباط کا کام بھی کرتے ہیں۔ اس کے ثمرات سے رائے عامہ کو فائدہ پہنچاتے ہیں، نتائج کو منظرِ عام پر لاتے ہیں یہ تمثیل میں زمین کی وہ قسم ہے جسے زبانِ نبوت نے
صاف زمین جس نے پانی کو چوس لیا اور پانی کے ذریعے گھاس اور زیادہ سے زیادہ سبزہ اگایا۔
سے تعبیر کیا ہے۔ یہ لوگ کتاب و سنت کے پانی سے اپنی قوتِ اجتہاد کے ذریعے مسائل کے موتی نکالنے والے اور پانی کو نہیں بلکہ پانی کے نتائج کو شاہراہ عام پر لانے والے ہیں۔ یہ ہیں اربابِ اجتہاد اور فقہائے کرام۔
علامہ سندھی فرماتے ہیں؛
یہ وہ قسم ہے جس میں علم کے ثمرات اور نتائج سے فائدہ ہوتا ہے جیسے مجتہدین اور فقہاء۔
اسی قسم کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔
جس کے ساتھ اللہ سبحانہٗ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اسے دین میں فقاہت عطا فرما دیتے ہیں۔

صاف اور سنگلاخ زمین

جو لوگ نہ قرآن و سنت کا ذخیرہ رکھتے ہیں اور نہ قرآن و سنت سے مسائل کا استخراج کرتے ہوں اس ارشادِ نبوت میں زمین کی وہ قسم ہے جسے زبانِ نبوت میں
چٹیل صاف زمین جو نہ پانی کو جمع کرتی ہو اور نہ پیداوار کرتی ہو۔
سے تعبیر کیا ہے یعنی اُمت کا وہ طبقہ جو مسلمان ہونے کے باوجود علومِ نبوت سے بہرہ ور نہیں۔ اُمتِ اسلامیہ

میں ان کی اکثریت ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ قرآن عزیز نے بارش کی تمثیل میں اُمت دعوت کا ذکر کیا ہے اور زمین کی دو قسمیں بتائی ہیں زمین صالح اور زمین شور۔ اسی طرح نبوت کے سامنے انسانی قلوب بھی دو طرح کے ہیں۔ ایک تو زمین صالح سے مشابہ ہیں جن میں قبولیتِ حق کی استعداد ہے یہ اہل ایمان ہیں۔ دوسرے زمین شور سے مشابہ ہیں جنہوں نے استعداد کھودی ہے ان کے حصے میں محرومی اور نامرادی کے سوا کچھ نہیں، یہ اہل کُفر ہیں۔ اور ارشادِ نبوت میں بارش کی تمثیل میں اُمتِ دعوت کا نہیں بلکہ اُمتِ اجابت کا ذکر کیا ہے اور اس میں زمین کو تین قسموں میں منقسم کیا ہے۔ پانی کا ذخیرہ کرنے والی زمین، پانی سے پیداوار کرنے والی زمین اور نہ ذخیرہ کرنے والی نہ پیداکرنے والی زمین۔ ذخیرہ کرنے والے حفاظِ قرآن اور محدثینِ عظام اور پیداوار کرنے والے مجتہدین اور فقہائے کرام، یہ دونوں اسلام کا سرمایہ علمی ہیں۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں:

ایک قسم وہ حفاظ ہیں جن کا کام صرف روایات کو یاد رکھنا اور جیسی سنی ہے ویسی ہی آگے پہنچانا ہے ان کا کام مسائل معلوم کرنا اور استنباط کرنا نہیں ہے۔ دوسری قسم ان علماء کی ہے جن کا کام محفوظ سرمایہ سے مسائل نکالنا اور احکام مستنبط کرنا ہے۔ پہلی قسم جیسے حافظ ابو حاتم اور دوسری قسم جیسے امام مالک اور امام شافعی۔ خود صحابہ میں بھی حفظِ روایت اور استنباط مسائل کے لحاظ سے یہ تقسیم موجود تھی۔ عبداللہ بن عباس حبر امت اور قرآن کے ترجمان ہیں مگر اس کے باوجود آپ کی حدیثوں کی تعداد بیس سے زیادہ نہیں ہے جن میں ذاتی شنید اور دید کی تصریح ہو۔ حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عباس کے صرف فتاویٰ ضخیم جلدوں میں جمع کیے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ بھی ان کے دریائے فقاہت کی ایک چلو ہے۔ ان کے مقابلے میں ابوہریرہ ہیں۔ حفظِ روایت میں علی الاطلاق حافظِ اُمت ہیں مگر تفقہ د استنباطِ مسائل میں ابن عباس کے پاسنگ بھی نہیں ہیں۔ (الوابل الصیب)

بہر حال دونوں اس ارشادِ نبوت کا منطوق ہیں۔ اصحاب روایت بھی اور اصحاب درایت بھی۔

آخر میں ارشاد ہے كذالك نصرف الآيات لقوم يشكرون پہلی آیت کے آخر میں فرمایا تھا کہ لعلكم تذكرون تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو اور غور و فکر کرو، اب ترقی کرکے فرمایا کہ یہ سب کچھ ان کے لیے جو خدا کی نعمتوں کے قدردان ہیں۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں جو اللہ کی نعمتوں کو یاد کرے گا وہ ضرور حق شناس ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے ہم تکوینی آیات کو تمہارے سامنے پھیر رہے ہیں اور اس کے نتائج تم مشاہدہ کر رہے ہو کہ کچھ زمینیں شادابی اور گل ریزی کا نمونہ ہیں ایسے ہی ہم آیاتِ تشریعی کو تمہارے سامنے

دہرا رہے ہیں دلائل پیش کر رہے ہیں، انبیاء روانہ کر رہے ہیں۔ بارش کی یہ نعمت عام ہے لیکن اس سے فائدہ وہی اٹھاتے ہیں جو نعمت کے قدردان ہیں اور جو نعمت کی قدر نہیں کرتے ان کے لیے ساری نعمتیں بیکار ہیں۔ شکر دراصل نام ہے نعمتوں کے متعلق جو صحیح علم ہے اس کے احساس کو زندہ اور بیدار رکھنے کی مسلسل کوشش کرتے رہنے کا۔ عمل کو آسان کرنے کی یہی نفسیاتی اور تجربی راہ ہے۔ قرآن میں انسانوں سے بار بار مختلف الفاظ میں اس کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اسی سے اس کی اہمیت ظاہر ہے۔ شکر کی ضد کفر ہے۔ اس کے لغوی معنے چھپانے کے ہیں اور محاورے میں کسی کام یا احسان پر پردہ ڈالنے اور زبان و دل اور عمل سے اس کے اظہار نہ کرنے کے ہیں۔ اسی سے ہماری زبان میں کفرانِ نعمت ہے۔ اس تقابل سے معلوم ہوا کہ اگر کفر اللہ تعالیٰ کے احسانوں اور نعمتوں کی ناقدری کر کے اس کی نافرمانی کا نام ہے تو اس کے مقابلے میں شکر کی حقیقت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان کر اس کے احکام کی اطاعت اور دل سے فرمانبرداری کی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ تصریفِ آیات بہت بڑا احسان ہے بشرطیکہ لوگ اس کے قدردان ہوں کیونکہ قدردانی پر ہر نعمت کی افادیت کا انحصار ہے۔ اگر یہ قدردانی موجود نہ ہو تو سب کچھ بیکار ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ
مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۵۹
قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۶۰
قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ۝۶۱ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ
مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۶۲ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ
مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَ
لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝۶۳ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ
مَعَهٗ فِی الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ
كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ۝۶۴ ع

بلاشبہ یقیناً ہم نے حضرت نوح کو اُن کی قوم کی طرف رسُول بنا کر
روانہ کیا تھا[۸۲]۔ انہوں نے کہا کہ اے میری قوم اللہ ہی کی بندگی کرو

اس کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں ہے، مجھے اندیشہ ہے تمہارے بارے میں ایک بڑے دن کے عذاب کا[۸۳]۔ اس پر اُن کی قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے کہا کہ ہمیں تو یہ نظر آتا ہے کہ اے نوح تم کھلے اور صریح گمراہی میں پڑ گئے ہو[۸۴]۔ حضرت نوح نے فرمایا بھائیو! یہ بات نہیں کہ میں گمراہی میں پڑ گیا ہوں بلکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ میں تمام جہانوں کے پروردگار کا رسول ہوں[۸۵]۔ میں اپنے رب کے پیغامات تم تک پہنچا رہا ہوں اور تمہارا خیر خواہ ہوں اور اللہ کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جن کا تمہیں پتہ نہیں ہے[۸۶]، فرمایا لوگو! کیا تمہیں اس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ تمہارے پروردگار کا پیغام ایک ایسا شخص لے کر آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے اور اس لیے آیا ہے تاکہ تمہیں برائیوں کے نتائج سے آگاہ کرے اور تاکہ تم برائیوں سے بچ کر رہو اور تاکہ تم رحمتِ الٰہی کے قابل ہو جاؤ[۸۷]۔ پھر یہ ہوا کہ لوگوں نے

حضرت نوح کی تکذیب کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے حضرت نوح اور اُن کے ساتھیوں کو کشتی میں سیلاب سے بچا لیا اور جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تھی انہیں غرق کر دیا بلاشبہ کہ وہ لوگ بالکل اندھے تھے۔

معانی مفردات

الملاء، یہ ملا یملاء سے ہے لغوی مفہوم بھرنا ہے۔ اپنے اسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ لفظ کسی قوم کے اشراف و اعیان اور اکابر و سادات کے لیے استعمال ہونے لگا۔ مطلق جماعت کے معنے میں نہیں بلکہ اہلِ حل و عقد یا اہل الرائے کی جماعت ہے۔ آلوسی لکھتے ہیں وجوہھم و اشرافھم قوم اشراف اپنی رائے کی خوبی اور طاقت کی نمائش سے لوگوں کی خواہش کو پھیر دیتے ہیں یا اپنی قوتِ انتظامی سے دلوں میں ہیبت بھر دیتے ہیں اس لیے ان کو ملاء کہتے ہیں اور علامہ ابوالسعود کہتے ہیں کہ جو لوگ زینتِ محفل ہوں دلوں کو ہیبت و عظمت سے اور آنکھوں کو ظاہری حسن و جمال سے بھر دیں ان کو ملاء کہتے ہیں۔ امام راغب کی رائے بھی ابوالسعود کی تائید میں ہے۔ راغب نے یہ بھی لکھا ہے اس کو مِلاء العیون کہتے ہیں۔ عمین، عَم کی جمع بحالتِ نصب و جر اور بحالتِ رفع عمون ہے۔ عم اصل میں عمی یعمی سے فعل کے وزن پر صفت مشبہ ہے یہ اصل میں عمی تھا چونکہ ناقص یائی میں صفت مشبہ کی یا حذف ہو جاتی ہے اس لیے گر گئی اور عم رہ گیا اس کے معنے کوردل، دل کے اندھے اور عقل کے اندھے۔

تاریخی شہادتیں

تاریخی دلائل اور شواہد سے واضح کیا گیا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سرزمین میں اقتدار

بخشا لیکن انہوں نے اقتدار پاکر ناشکری کی روش اختیار کی زمین میں اصلاح کے بعد فساد برپا کیا عدل وانصاف کو درہم برہم کیا بالآخر اللہ نے ان میں اپنا رسول بھیجا جس نے ان کو پرستش اور بندگی میں توحید کی دعوت دی کہ اللہ سبحانہ نے ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد اس قوم کو تباہ کر دیا لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ سارا قصہ صرف ایک دو صحبتوں میں ختم ہو گیا تھا بلکہ جن حقائق تاریخی کا یہاں مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے وہ ایک نہایت طویل مدت میں پیش آئے تھے۔ قرآن کا یہ خاص انداز ہے کہ وہ واقعہ کو محض قصہ گوئی کی خاطر پیش نہیں کرتا۔ یہاں ان واقعات سے ایک طرف قریش کو یہ بتانا مقصود ہے کہ اب ان کا معاملہ بھی اسی عدالت میں ہے جس میں ان تمام قوموں کے مقدمے پیش ہو کر فیصل ہوتے اور اپنے کیفر کردار کو پہنچیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ اگر انہوں نے بھی وہی روش اختیار کی جو ان قوموں نے اختیار کی تھی تو اس بے لاگ عدالت کا فیصلہ ان کے لیے کچھ مختلف ہو خدا کا قانون سب کے لیے یکساں ہے اور دوسری طرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو سمجھایا ہے کہ اس انقلابِ حال پر متعجب نہ ہونا چاہیے کیونکہ ہمیشہ سے سنتِ الٰہی ایسی ہی رہی ہے اور ہمیشہ دعوتِ حق کی بے سروسامانیوں نے وقت کے تمام سروسامانوں پر فتح پائی ہے لیکن یہ منزل صبر آزمائیوں کی منزل ہے۔ چند سالوں کی تبلیغی سرگرمیوں کو نتیجہ خیز نہ دیکھ کر تنگدل نہ ہونا چاہیے فلا یکن فی صدرک حرج ۔ ان انبیاء کی زندگیوں کا مطالعہ کریں جنہوں نے مدتہائے دراز تک نہایت حوصلہ شکن حالات میں دعوت دی اور ذرا ہمت نہ ہاری۔

یاد رہے کہ یہاں جن قوموں کی تاریخی داستانیں بیان ہو رہی ہیں اہل عرب ان سے واقف تھے لیکن یہ واقفیت اجمالی تھی۔ قرآن نے اس اجمال کا پردہ اٹھا کر تاریخ کو از سر نو زندہ کر دیا اور اہل عرب کو دعوت دی کہ ان تاریخی شہادتوں کو توجہ سے سنیں اور ان سے عبرت حاصل کریں۔ یہ دوسروں کی کہانیاں نہیں بلکہ خود اپنی داستان ہے۔ اسی لیے قرآن یہاں قصوں کے ان اجزاء کو پیش کر رہا ہے جو اس کے مقصد و مدعا سے تعلق رکھتے ہیں باقی تمام تفصیلات کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

۵۹۔ بلاشبہ یقیناً ہم نے حضرت نوح کو ان کی قوم کی طرف رسول بنا کر روانہ کیا تھا۔ آدم علیہ السلام کا قصہ ابتدائے سورت میں گزر چکا ہے۔ ان کے بعد نوح علیہ السلام پہلے اولوالعزم اور مشہور رسول ہیں جو زمین والوں کی طرف مشرکین کے مقابلے میں بھیجے گئے۔ گو باعتبار اپنی خاص شریعت کے ان کی بعثت خاص اپنی قوم کی طرف مانی جائے تاہم ان اساسی اصول کے اعتبار سے جو تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں مشترک ہیں کہا جا سکتا ہے کہ تمام انسان ہر نبی کے مخاطب ہوتے ہیں۔ مثلاً توحید اور اقرار معاد کی تعلیم پر سارے پیغمبر متفق اللسان ہیں تو ایسی چیزوں کی تکذیب

کرنا ہے[1]

مخاطب چونکہ اہلِ عرب ہیں اس لیے پہلے ان قوموں کا ذکر کیا ہے جو عرب کے شمال یا جنوب یا شمال مغرب میں نامور ہوئی ہے۔ ترتیب یہاں بالکل تاریخی ہے۔ اس وجہ سے حضرت نوح کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے۔ حضرت نوح کی قوم اس سرزمین میں رہتی تھی جس کو ہم آج عراق کے نام سے جانتے ہیں یعنی دجلہ و فرات کا دوآبہ جو انسانی تمدن کا سب سے قدیم گہوارہ ہے۔ تاریخی لحاظ سے زمانے کی تعیین دشوار ہے بعض اندازوں کے مطابق ان کا زمانہ ۳۸۰۰ قبل مسیح تا ۲۸۵۰ ہے۔ یہ بات کہ حضرت نوح کا ظہور دجلہ و فرات کے دوآبہ میں ہوا۔ اس کی تصدیق بابل کے آثارِ قدیمہ میں بائیبل ہے۔ قدیم تر جو کتبات ملے ہیں ان سے بھی ہوتی ہے۔ ان میں تقریباً اسی قسم کا قصہ مذکور ہے جس کا ذکر قرآن کر رہا ہے۔ پھر جو روایات کردستان اور ارمنیہ میں قدیم ترین زمانے سے نسلاً بعد نسل چلی آ رہی ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کے بعد حضرت نوح کی کشتی اسی علاقہ میں کسی جگہ ٹھہری تھی۔ حضرت نوح کے قصے سے ملتی جلتی روایات یونان، مصر، ہندوستان اور چین کے قدیم لٹریچر میں بھی ملتی ہیں۔ اور اس کے علاوہ برما، ملایا، جزائر شرق الہند، اسٹریلیا نیوگنی اور امریکہ یورپ کے مختلف حصوں میں بھی ایسی ہی روایات قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصہ اس عہد سے تعلق رکھتا ہے جبکہ پوری نسلِ آدم ایک ہی خطہ میں رہتی تھی اور پھر وہاں سے نکل کر دُنیا کے مختلف حصوں میں پھیلی۔ اس وجہ سے تمام قومیں اپنی ابتدائی تاریخ میں ایک ہمہ گیر طوفان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اگرچہ مرورِ ایام سے اس کی حقیقی تفصیلات انہوں نے فراموش کر دی ہیں[2]

قوم کو اللہ کی بندگی کی دعوت

۸۳۔ انہوں نے کہا اے میری قوم اللہ ہی کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں مجھے اندیشہ ہے تمہارے بارے میں ایک بڑے دن کے عذاب کا۔ نوح علیہ السلام نے توحید وغیرہ کی دعوت دی۔ کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کے بعد دس قرن ایسے گزرے کہ ساری اولادِ آدم کلمہ توحید پر قائم تھی۔ بت پرستی کی ابتداء ابن عباس کے بیان کے موافق یوں ہوئی کہ بعض صالحین کا انتقال ہو گیا جن کے نام

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

ود، سواع، یعوق، یغوث اور نسر تھے جو سورہ نوح میں مذکور ہیں۔ لوگوں نے ان کی تصویریں بنالیں تاکہ ان کے احوال اور عبادت وغیرہ کی یاد تازہ رہے۔ کچھ مدت کے بعد ان صورتوں کے موافق مجسمے تیار کیے حتیٰ کہ کچھ دنوں کے بعد ان کی پرستش ہونے لگی اور یہ بت ان ہی بزرگوں کے نام سے موسوم ہوگئے، جب بت پرستی کی وبا پھیل گئی تو حق تعالیٰ نے حضرت نوح کو بھیجا۔ انہوں نے طوفان سے پہلے اپنی قوم کو ساڑھے نوسو برس تک توحید وتقویٰ کی طرف بلایا اور دنیا وآخرت کے عذاب سے ڈرایا [1]

حضرت نوح کے بیان سے یہ صاف بات ٹپکتی ہے کہ ان کی قوم نہ تو اللہ کے وجود کی منکر تھی نہ اس سے ناواقف تھی، نہ اسے اللہ کی عبادت سے انکار تھا بلکہ اصل گمراہی جس میں وہ مبتلا ہوگئی تھی شرک کی گمراہی تھی یعنی اس نے اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو عبادت میں حصہ دار قرار دے لیا تھا اور عبادت کے شرک میں مبتلا ہونے کے معنے یہ ہیں کہ وہ نظریات وافکار اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اعمال واخلاق ہر چیز میں جادۂ حق سے ہٹ گئی تھی۔ اس گمراہی سے بے شمار خرابیاں پوری قوم میں رونما ہوگئیں جو خود ساختہ معبود عبادت میں شریک بنائے تھے ان کی نمائندگی کرنے کے لیے قوم میں ایک طبقہ پیدا ہوگیا جو تمام مذہبی، سیاسی اور معاشی اقتدار کا مالک بن بیٹھا تھا اور اس نے انسانوں میں اونچ نیچ کی تقسیم پیدا کردی تھی۔ اجتماعی زندگی کو ظلم وفساد سے بھر دیا تھا اور اخلاقی فسق وفجور سے انسانیت کی جڑیں کھوکھلی کردی تھیں۔

اس آیت میں لفظ عبادت، پرستش اور بندگی دونوں معنے میں ہوسکتا ہے اس لیے قرآن کے ترجمہ کرنے والوں میں سے کچھ نے اس کا ترجمہ اللہ کی پرستش کرو کیا ہے اور کچھ نے اللہ کی بندگی کرو۔ جنہوں نے اول الذکر ترجمہ کو اپنایا ہے۔ انہوں نے مالکم من الٰہ غیرہ کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور جنہوں نے دوسرے ترجمہ کو اختیار کیا ہے انہوں نے مالکم من الٰہ غیرہ کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ اللہ کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں ہے۔ دراصل جن لوگوں کی نگاہ حضرت نوح کے زمانہ کے اصنام پر ہے جن کا ذکر سورہ نوح میں ہے انہوں نے ترجمہ پرستش سے کیا ہے اور جن کی نظر اس پر ہے کہ آپ کا خطاب سربرآوردہ برسراقتدار لوگوں سے ہے انہوں نے ترجمہ بندگی سے کیا ہے۔ یہاں حضرت شاہ صاحب کی دقت نظر نے عجیب نکتہ آفرینی سے کام لیا ہے۔ شاہ صاحب نے انگریزوں کے اقتدار کا ابتدائی زمانہ دیکھا ہے اور اس دور میں ارباب اقتدار کو عوام صاحب بہادر کے لقب سے یاد کرتے تھے اس لیے شاہ صاحب نے زمانہ کے مذاق کی رعایت سے آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے اے قوم بندگی کرو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اللہ کی، کوئی نہیں تمہارا صاحب اوس کے سوا۔ حضرت نوح کی دعوت ایک وقت دونوں سے تعلق رکھتی تھی۔ پرستش سے بھی کہ سب خدا کی پرستش میں ملاوٹ کر رہے تھے اور بندگی سے بھی کہ برائے عامہ اس میں اربابِ اقتدار کے زیرِ اثر تھی۔ اور شرک کے جراثیم نے اجتماعی بندگی کے سارے گوشوں میں تباہ کاری مچا رکھی تھی۔ آخر میں فرمایا انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم مجھے تمہارے متعلق ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔ بڑے دن سے یہاں مراد دنیوی عذاب کا ہولناک دن ہے یا روزِ قیامت۔ شارحین قرآن نے دونوں باتیں لکھی ہیں۔ انبیا اپنی قوموں کو دونوں عذابوں سے ڈراتے ہیں۔ ایک اس عذاب سے جو رسول کی تکذیب کے نتیجے میں دنیا میں آتا ہے اور دوسرے اُس عذاب سے جس سے جزا و سزا کے فیصلے کے دن آخرت میں لازماً دو چار ہونا پڑے گا۔ یہاں سیاق و سباق قرآنی بتا رہا ہے کہ عذابِ دنیا مراد ہے۔ اسے عذاب یوم عظیم اس لیے فرمایا کہ نبی کی تکذیب کے نتیجے میں جو عذاب آتا ہے وہ تذکیر و تنبیہ کی نوعیت کا نہیں ہوتا بلکہ عذاب استیصال ہوتا ہے جو قوم کی جڑ کاٹ دیتا ہے، اس کے بعد قومی حیثیت سے صفحہ ہستی سے اس کا نام و نشان ہی مٹ جاتا ہے۔

حضرت نوح کا قوم کو جواب

۸۴۔ اس پر ان کی قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے کہا کہ ہمیں تو یہ نظر آتا ہے کہ اے نوح تم کھلے اور صریح گمراہی میں پڑ گئے ہو۔ یعنی لوگوں نے ان کی تضلیل و تجہیل کی اور ان کی کوئی بات نہ سُنی[1] یہاں قوم کا اجمالی جواب نقل کیا گیا ہے۔ لیکن سورہ ہود میں یہ جواب مفصل ہے۔ یہاں مخاطبوں نے بات میں زور پیدا کرنے کے لیے تین قسم کی تاکیدیں استعمال کی ہیں انا لنرٰک فی ضلال مبین ہماری رائے میں تم بالکل جادۂ حق سے ہٹ گئے ہو۔ تم ہمیں ان بزرگوں کی عبادت سے منع کرتے ہو یہ تو بارگاہِ الٰہی میں ہمارا وسیلہ ہے۔ ان کی برکت سے تو ہمارے لیے قبولیت کا دروازہ کھلا ہے اور ان کے صدقے تو ہمیں سب کچھ مل رہا ہے۔ اندازِ بیان بتا رہا ہے کہ حضرت نوح اپنی بات کس قوت، کس اعتماد، کس یقین سے کہہ رہے تھے جس کے جواب میں ان کے مخاطبوں کو اتنا زور لگانا پڑا ہے۔ حافظ ابن کثیر کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ فساق و فجور کا دستور یہی ہے کہ وہ نیکوکاروں پر ضلالت اور بے راہ روی کا فتویٰ لگاتے ہیں۔ اور یہ اس لیے کہ ان کو اس میں اپنے باپ دادا کے دین کی تحقیر نظر آتی ہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

قوم کو حضرت نوح کا جواب

۸۵۔ حضرت نوح نے فرمایا بھائیو یہ بات نہیں کہ میں گمراہی میں پڑ گیا ہوں بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ میں تمام جہانوں کے پروردگار کا رسول ہوں۔ حضرت نوح نے جواب میں فرمایا کہ مجھے کوئی سرپھرا اور بھٹکا ہوا آدمی نہ سمجھو۔ میں تمام عالم کے رب کی طرف سے تمہارے پاس پیغمبر کی حیثیت سے آیا ہوں۔ رسول من رب العالمین فرما کر شرک کے پورے فلسفہ پر ضرب کاری لگادی۔ مشرک نظام کائنات کو منتشر اور متفرق صورت میں دیکھنے کا عادی ہوتا ہے۔ وہ تو یہ سمجھ سکتا ہے کہ فلاں حضرت فلاں شعبے کے مالک مالک ہیں لیکن یہ اس کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کوئی مالک الملک سارے عالموں کا تاجدار اور پروردگار بھی ہے یہ کہہ کر حضرت نوح نے جتا دیا کہ میں دعوت و اصلاح کا کام اللہ کی رہنمائی سے کر رہا ہوں اپنی ذاتی حیثیت سے نہیں بلکہ رب العالمین کے رسول کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ اس ایک فقرے میں دو دعوتیں ہیں۔ ایک اللہ پر ایمان لانے کی اور ایک حضرت نوح کی رسالت کو ماننے کی۔ حضرت نوح نے وقت کی جاہلانہ زندگی کی شہ رگ پر وار کیا جس سے آپ کے مخاطب تلملا اٹھے مگر حضرت نوح اپنی دعوت پر پہاڑ کی طرح جمے رہے۔ مخالفت کے طوفان اٹھے۔ فتنہ کی آندھیاں آئیں مگر آپ نے اپنی جگہ سے ذرا جنبش نہ کی اور مسلسل توحید و رسالت اور آخرت پر یقین کی دعوت دیتے رہے۔ آپ نے اس کے لیے ذرا بھی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہیں کیا نہ مخالفوں کی ادنیٰ رعایت کی نہ وقت کی مصلحت کے لیے اپنی دعوت میں لوچ اور لچک گوارا کی۔ توحید کی دعوت کو ہر مرض کی دوا اور ہر بند قفل کی کنجی بنا کر پیش کیا اور حالات کی ساری ناسازگاری کے باوجود بھی آپ کو اس کے بارے میں ادنیٰ "تذبذب" بھی نہیں ہوا۔ رسول من رب العالمین کہہ کر آپ نے بتادیا کہ آپ اس لیے مبعوث فرمائے گئے ہیں کہ بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر صرف خدا کی بندگی میں داخل کریں۔ تمام لوگوں کو مادی زندگی کی کال کوٹھری سے نکال کر دنیا و آخرت کی وسعتوں میں پہنچا دیں۔

حضرت نوح کا مقام

۸۶۔ میں اپنے رب کے پیغامات تم تک پہنچا رہا ہوں اور میں تمہارا خیرخواہ ہوں اور میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو۔ یعنی میں تو ذرا بھی بھٹکا نہیں۔ ہاں تم بھٹک رہے ہو کہ خدا کے پیغمبر کو نہیں پہچانتے جو نہایت فصاحت سے خدائی پیغام تم کو پہنچا رہا ہے اور تمہاری بھلائی چاہ

ہے تم کو عمدہ نصیحتیں کرتا ہے اور خدا کے پاس سے وہ علومِ ہدایت لے کر آیا ہے جن سے تم جاہل ہو۔[1] اس آیت میں حضرت نوح نے نبی ہونے کی حیثیت میں لوگوں کے سامنے اپنا مقام پیش کیا ہے جیسا کہ پہلی آیت میں رسول من رب العالمین کہہ کر اپنا منصب بتایا تھا۔ یہاں حضرت نوح نے جو اپنا مقام بتایا ہے وہ بھی ہر نبی کا اپنے مخاطبوں میں مقام ہوتا ہے فرمایا میرا کام یہ ہے کہ میں اپنے رب کے پیغامات تم تک پہنچا رہا ہوں۔ اور اس فرض کی ادائیگی میں میرا دامن ہر قسم کی غرض مندی سے بالکل پاک ہے بلکہ یہ کام میں تمہاری خیر خواہی کے جذبہ سے کر رہا ہوں۔ جذبۂ ہمدردی اور خیر خواہی کے سوا کسی اور جذبہ کا میری اس ساری تگ و دو میں کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔ مجھے یہ اندیشہ اور غم ہے کہ کہیں تم خدا کی پکڑ میں نہ آجاؤ۔ اور یہ بات اپنے علم کی بنا پر کہتا ہوں کیونکہ میں خدا کی طرف سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

ان تین باتوں میں سب سے اہم بات انصح لکم ہے یعنی میں تبلیغ حق میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ لغت میں نصحت العسل اس وقت بولا جاتا ہے جب شہد کو موم سے صاف کر لیا جائے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ نصح کے معنے کسی چیز کا کھوٹ نکالنے کے ہیں یہ معنے اسی محاورے سے ماخوذ ہیں۔ محکم میں ہے کہ نصح کھوٹ کی ضد ہے۔ ابن طریف لکھتا ہے کہ نصح قلب الانسان اس وقت بولتے ہیں جب دل میں کوئی کھوٹ باقی نہ رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل نصحت میں منصوح لہ کی درستگی اور صلاح پیشِ نظر ہوتی ہے نہ کہ ناصح کی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

> تمیم داری بیان کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا خیر خواہی کرنا ہی دین ہے۔ ہم نے عرض کیا کس کی؟ فرمایا اللہ کی اللہ کی کتاب کی، اس کے رسول کی، اسلامی حکومت کے سربراہوں کی اور سب مسلمانوں کی۔ (صحیح مسلم)

اللہ کی خیر خواہی کے معنے یہ ہیں کہ بندہ اپنے اور خدا کے درمیان کوئی کھوٹ نہ رکھے۔ سب سے بڑا کھوٹ یہ ہے کہ اس کی پرستش اور بندگی میں کسی کو اس کا شریک بنائے۔ اس کی صفات جلال و جمال کا پوری تنزیہہ کے ساتھ اعتراف نہ کرے اور اس کے اوامر و نواہی میں پوری مستعدی کا اظہار نہ کرے۔ علماء نے لکھا ہے کہ اللہ کی خیر خواہی کا حاصل بالفاظِ دیگر اپنے ہی نفس کی نصیحت اور خیر خواہی ہے۔

کتاب اللہ کی خیر خواہی کے معنے یہ ہیں کہ پورے آداب کے ساتھ اس کی تلاوت کی جائے، بدل و جان اس کے معانی کی تصدیق کی جائے۔ اس کے علوم کی نشر و اشاعت کی جائے۔ اس کی پیروی کی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تمام عالم کو دعوت دی جائے اور اس کے ہر امر ونہی کے سامنے اعتراف و تسلیم کا سر خم کیا جائے۔
رسول کی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کی رسالت کی تصدیق کی جائے۔ جو دین وہ لے کر آیا ہے اس کا ایک ایک حرف مانا جائے۔ ہر موقعہ پر اس کی نصرت کے لیے تیار رہے۔ آپ کے اصحاب اور آپ کے اہل بیت کی محبت اور ان کا ادب پورے طور پر ملحوظ رہے۔
ائمہ مسلمین کی خیر خواہی یہ ہے کہ ہر حق معاملہ میں ان کی اعانت کی جائے۔ ان کے ساتھ جہاد میں شرکت کی جائے۔

عام مسلمانوں کی خیر خواہی کے معنے یہ ہیں کہ دنیوی اور اخروی سب مفید اور اچھی باتیں ان کو بتادی جائیں۔ ان کو ایذا نہ دی جائے۔ ان کے عیوب کی پردہ پوشی کی جائے۔ الغرض نصیحت اور خیر خواہی کرنا انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا اہم جز ہے۔ شفقت و خیر خواہی گو پیغمبر کے خمیر ہی میں داخل ہوتی ہے۔ اس کی بنیاد، اخلاق و شفقت ہی پر ہوتی ہے جس میں خود غرضی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اعلم کے ساتھ من اللہ کا اضافہ یہ بتانے کے لیے بھی ہے کہ پیغمبر کا علم اپنا کسب نہیں ہوتا اللہ کی طرف سے عطا کیا ہوا ہوتا ہے۔

انسان کے رسول ہونے پر حیرت

۷۸۔ فرمایا لوگو! کیا تمہیں اس پر حیرت ہے کہ تمہارے پروردگار کا پیغام ایک ایسا شخص لے کر آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے اور اس لیے آیا ہے کہ تمہیں برائیوں کے نتائج سے آگاہ کرے تاکہ تم برائیوں سے بچ کر رہو اور تاکہ تم رحمت کے قابل ہو جاؤ۔ یعنی اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ تم ہی میں سے خدا کسی ایک فرد کو اپنی پیغام رسانی کے لیے چن لے آخر اس نے ساری مخلوق میں سے منصب خلافت کے لیے آدم علیہ السلام کو کسی مخصوص استعداد کی بنا پر چن لیا۔ تو کیوں نہیں ہو سکتا کہ اولاد آدم میں سے بعض کامل الاستعداد لوگوں کو منصب نبوت و رسالت کے لیے انتخاب کر لیا جائے تاکہ وہ لوگ براہ راست خدا سے فیض پاکر دوسروں کو ان کے انجام سے آگاہ کریں اور یہ اس پر آگاہ ہو کر بدی سے بچ جائیں اور اس طرح خدا کے رحم و کرم کے مورد بنیں۔ یعنی کیا میری بات ماننے میں یہ چیز تمہیں مانع ہو رہی ہے کہ اللہ نے تمہیں میں سے ایک شخص کو اپنا رسول بنا کر روانہ کیا ہے۔ یہاں سوال کو اس انداز میں پیش فرمایا ہے جو حسرت و افسوس کی غمازی کر رہا ہے۔ اس اندازِ بیان ہی میں اس کا جواب ہے یعنی اگر تم ذرا غور کرو تو یہ بات تمہارے لیے حیرت افزا نہ ہے۔ تمہیں تو خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ اس

نے تمہارے ہی اندر سے ایک شخص کو تمہاری نجات کی راہ دکھانے والا بنا کر روانہ کیا۔ میں تمہارے لیے کوئی اجنبی نہیں میرا ماضی وحال اور میری سیرت وکردار یعنی پوری زندگی کی کتاب کا ورق ورق تمہارے سامنے کھلا ہوا ہے اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نوح کی قوم کا آپ کی رسالت کے بارے میں شبہ یہ تھا کہ انسان خدا کا رسول کیوں کر ہو کر آیا بعینہٖ یہی شبہ مکہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کو بھی پیش آیا تھا ابعث اللہ بشرا رسولا، جو پیغام حضرت نوح کا تھا وہ ہی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا اور جو شبہات اہل مکہ کے سردار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں ظاہر کرتے تھے وہی شبہات ہزاروں سال پہلے سرداران قوم نے حضرت نوح کی رسالت میں کیے تھے۔ پھر ان کے جواب میں جو باتیں حضرت نوح کہتے ہیں بعینہٖ وہی باتیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر نبی کی قوم کا رد یہ اہل مکہ سے مشابہ ہے۔ اس سے قرآن اپنے مخاطبوں کے جملہ دماغ میں یہ بات اتارنا چاہتا ہے کہ انسان کی گمراہی بنیادی طور پر ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ انسان ہونے کی بنیاد پر رسول کی رسالت کا انکار۔ غور کرو تو معلوم ہو جائے گا کہ ہزاروں سال گزرنے پر آج بھی شیطان کی روح وہی کام کر رہی ہے۔ بیگانوں کو اس پر حیرت تھی کہ ایک انسان رسول کیسے ہو سکتا ہے اور یگانوں کو اس پر تعجب ہے کہ ایک رسول انسان کیسے ہو سکتا ہے۔ فانا اللہ والی اللہ المشتکی۔

تکذیب رسول کا انجام

۶۸۔ پھر یہ ہوا کہ لوگوں نے حضرت نوح کی تکذیب کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے حضرت نوح اور ان کے ساتھیوں کو ایک کشتی میں سیلاب سے بچا لیا اور جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تھی انہیں غرق کر دیا بلاشبہ وہ لوگ بالکل اندھے تھے۔ یعنی حق وباطل اور نفع ونقصان کچھ نہ سوجھا اندھے ہو کر برابر سرکشی اور تکذیب وبغاوت پر قائم رہے اور بت پرستی وغیرہ حرکات سے باز نہ آئے تو ہم نے معدودے چند مومنین کو بچا کر جو نوح علیہ السلام کے ہمراہ کشتی میں سوار ہوتے تھے باقی سب مکذبین کا بیڑا غرق کر دیا۔ اب جس قدر انسان دنیا میں موجود ہیں وہ ان ہی اہل سفینہ بلکہ صرف نوح کی ذریت ہیں۔[1]

مطلب یہ ہے کہ وہ بات آخر ہو کر رہی جس سے حضرت نوح نے ڈرایا تھا جب قوم نے طویل

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جدوجہد کے بعد بھی اپنے رویے کی اصلاح نہ کی تو ان لوگوں کے سوا جنہوں نے حضرت نوح کے ساتھ کشتی میں پناہ لی سب کو اللہ تعالیٰ نے غرق کر دیا۔ طوفان کی نوعیت پر ان شاء اللہ پوری بحث بارہویں جلد کے آغاز میں آرہی ہے یہاں صرف شیخ الاسلام مولانا عثمانی کی بات گوش گزار فرمایئے۔ "آخر طوفان کے عذاب نے سب کو گھیر لیا اور جیسا کہ حضرت نوح نے دعا کی تھی "رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا"، روئے زمین پر کوئی کافر عذاب الٰہی سے نہ بچا۔ بستانی نے دائرۃ المعارف میں یورپین محققین کے اقوال طوفان اور عموم طوفان کے بارے میں نقل کیے ہیں۔

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ؕ قَالَ يَٰقَوْمِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مَا لَكُم
مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُۥ ؕ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٦٥﴾ قَالَ ٱلْمَلَأُ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟
مِن قَوْمِهِۦٓ إِنَّا لَنَرَىٰكَ فِى سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ ٱلْكَٰذِبِينَ ﴿٦٦﴾
قَالَ يَٰقَوْمِ لَيْسَ بِى سَفَاهَةٌ وَلَٰكِنِّى رَسُولٌ مِّن رَّبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿٦٧﴾
أُبَلِّغُكُمْ رِسَٰلَٰتِ رَبِّى وَأَنَا۠ لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ ﴿٦٨﴾ أَوَعَجِبْتُمْ
أَن جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ ؕ
وَٱذْكُرُوٓا۟ إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِى
ٱلْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَٱذْكُرُوٓا۟ ءَالَآءَ ٱللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٦٩﴾
قَالُوٓا۟ أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ ٱللَّهَ وَحْدَهُۥ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ ءَابَآؤُنَا ۚ
فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ إِن كُنتَ مِنَ ٱلصَّٰدِقِينَ ﴿٧٠﴾ قَالَ قَدْ وَقَعَ
عَلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَغَضَبٌ ؕ أَتُجَٰدِلُونَنِى فِىٓ أَسْمَآءٍ
سَمَّيْتُمُوهَآ أَنتُمْ وَءَابَآؤُكُم مَّا نَزَّلَ ٱللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَٰنٍ ؕ

فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ﴿۷۱﴾ فَاَنْجَیْنٰهُ وَالَّذِیْنَ
مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۷۲﴾

ع ۸ وقف لازم

اور ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو رسُول بنا کر روانہ کیا[۸۹]۔ انہوں نے کہا کہ اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو اللہ کے سوا تمہاری بندگی کے لائق کوئی نہیں ہے کیا تم اللہ کی نافرمانی سے نہ بچو گے[۹۰]؟ اس پر ان کی قوم کے ان سربرآوردہ لوگوں نے کہا جنہوں نے کُفر کا شیوہ اختیار کر رکھا تھا ہماری تو تمہارے بارے میں پختہ رائے یہ ہے کہ تم اپنی عقل کھو بیٹھے ہو اور ہمارا خیال یہ ہے کہ تم جھوٹ بولنے والوں میں سے ہو[۹۱]۔ حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا بھائیو میں اپنی عقل نہیں کھو بیٹھا ہوں، بلکہ میں تمام جہانوں کے پروردگار کی جانب سے رسُول بن کر آیا ہوں۔ میرا کام تم تک اپنے رب کے پیغامات پہنچانا ہے

اور میں پوری امانت کے ساتھ تمہارا خیر خواہ ہوں[92]۔ کیا اس بات پر حیرت ہوئی ہے کہ ایک ایسے شخص کے ذریعے تمہارے پروردگار کا پیغام تمہارے پاس آیا ہے جو خود تم میں سے ہے اور اس لیے آیا ہے کہ وہ تمہیں اعمالِ بد کے نتائج سے آگاہ کرے[93]۔ خدا کا یہ احسان یاد کرو کہ قومِ نوح کے بعد اس نے تمہیں ان کا جانشین بنایا اور تمہاری نسل کو زیادہ وسعت اور توانائی عطا فرمائی، لہٰذا تمہیں اللہ کی نعمتوں کو یاد رکھنا چاہیے تاکہ تم کامیابی سے ہمدوش ہو[94]۔ انہوں نے جواباً کہا کہ کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم یگانہ اللہ سے عابدانہ تعلقات پیدا کریں اور ان معبودوں سے عابدانہ تعلقات چھوڑ دیں جن سے ہمارے باپ دادوں کے عابدانہ تعلقات تھے، اگر تم اپنے دعویٰ رسالت میں سچے ہو تو جس چیز کی ہم کو دھمکی دے رہے ہو وہ لاؤ[95]۔ حضرت ہود نے فرمایا بلاشبہ تمہارے پروردگار

کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب آچکا ہے، کیا تم مجھ سے ان ناموں کے بارے میں اُلجھ رہے ہو جو تم اور تمہارے آباؤ اجداد کے رکھے ہوتے ہیں جن کی خدا نے کوئی سند نازل نہیں فرمائی، اچھا تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں[96]۔ پھر ہم نے حضرت ہود اور اُن کے ساتھیوں کو اپنی مہربانی سے بچا لیا اور جنہوں ہماری آیات کو جھٹلایا تھا ان کی بیخ و بنیاد اکھاڑ دی۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایمان لانے والے نہ تھے[97]۔

معانی مفردات

سفاھۃ، یہ سفہ یسفہ باب کرم سے مصدر ہے بیوقوف بننا یہاں حاصل مصدر کے معنے میں ہے یعنی بے عقلی اور بے وقوفی۔ یہ باب سمع سے سفہ یسفہ بھی آتا ہے۔ لازم اور متعدی دونوں آتا ہے قرآن میں اسی سے الا من سفہ نفسہ آیا ہے اس کے معنے ہیں اس نے اپنے کو بیوقوف بنالیا۔ اور باب ضرب سے صرف متعدی آتا ہے بیوقوف بنانا۔ یہاں سفاہت کے معنے بے عقلی، بیوقوفی اور جہالت کے ہیں۔ الآء الی کی جمع ہے نعمت کے معنے ہیں۔ رجس، ناپاک، پلید، گندا عذاب، بلا، جمع ارجاس، رجس کی چار صورتیں ہیں طبعی، عقلی، شرعی اور ان تینوں کا مجموعہ۔ سلطان، زور قوت، حجت، برہان، سند اور حکومت۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں رقمطراز ہیں۔ سلطان کے معنے حجت و برہان کے ہیں۔ لا تنفذون الا بسلطان میں یہی مراد ہے۔ اور کبھی اس سے معجزہ بھی مراد

ہوتا ہے جیسے اذ ارسلنا کا الی فرعون بسلطان مبین۔ اور جب سلطان کے معنی حجت ہوں تو اس کی جمع نہیں آتی کیونکہ اس صورت میں وہ مصدر کے قائمقام ہوتا ہے۔ بصائر میں ہے کہ حجت کو سلطان اس لیے کہا گیا ہے کہ دلوں پر اس کا دباؤ ہوتا ہے۔ دابر، جڑ، بیخ، بنیاد دبور سے جس کے معنے پشت پھیرنے کے ہیں۔ اسم فاعل کا واحد مذکر ہے ہر ایک چیز کے آخر اور تابع کے معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ راغب فرماتے ہیں کہ متاخر اور تابع کو دابر کہا جاتا ہے خواہ باعتبار زماں ہو یا باعتبار مکان ہو یا باعتبار مرتبہ ہو۔

تاریخ کی ایک اور شہادت

تاریخی بیان کی ابتداء حضرت نوح اور ان کی قوم سے کی گئی تھی کیونکہ قرآن کی رُو سے جس صالح نظام زندگی پر حضرت آدم اپنی اولاد کو چھوڑ گئے تھے اس میں سب سے پہلا بگاڑ حضرت نوح کے دور میں رونما ہوا۔ حضرت نوح کے بعد عاد عرب کی قدیم ترین قوم تھی۔ مورخین عرب نے عاد کو عوص بن ارم بن شام کا حقیقی فرزند لکھا ہے۔ اس لیے ان کا زمانہ تین ہزار سال قبل مسیح ہونا چاہیے۔ یہاں قرآن نے ان کو خلفاء من بعد قوم نوح کہا ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ سرزمین شام کے دوبارہ آباد ہونے کے بعد شامی اقوام کی پہلی ترقی قوم عاد سے ہوتی ہے اس لیے اس آیت سے عاد کے زمانہ کی تعیین ہوتی ہے۔ انتہائے مدت کی تعیین کی صورت یہ ہے کہ ۱۵سو قبل مسیح میں یمن میں ایک دوسری قوت کا ظہور ہوتا ہے اور اس سے کچھ ہی پہلے حضرت موسیٰ کا زمانہ ہے۔ حضرت موسیٰ سے پہلے عاد کی تباہی عام ہو چکی تھی۔ قرآن عاد کا ذکر ہمیشہ حضرت موسیٰ سے پہلے کرتا ہے اس لیے عاد کی عظمت اور ترقی کا زمانہ ۲۲۰۰ ق م سے ۱،۷۰۰ ق م تک ہے عاد کی مرکزی آبادی قرآن کی رُو سے احقاف کا علاقہ تھا جو حجاز و یمن اور یمامہ کے الربع الخالی کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ سید صاحب فرماتے ہیں عاد کی مرکزی آبادی عرب کے بہترین حصہ یعنی یمن اور حضرموت میں سواحل خلیج فارس سے حدود عراق تک تھی۔ دراصل حکومت کا مرکز ملک یمن تھا لیکن خلیج فارس کے کنارے کنارے وہ عراق تک وسیع تھی جس سے نہایت آسانی سے وہ راہ معلوم ہو سکتی ہے جدھر سے یہ قوم عرب سے عراق میں اور عراق سے دیگر ممالک میں پھیلی اور یہی جدید تحقیقات کی رُو سے بھی امم سامیہ کا راستہ سمجھا جاتا ہے۔ عاد کا دور دراز ممالک میں جانا عربوں میں اس قدر مسلم تھا کہ وہ شعراء کے ہاں تمثیلوں میں آگیا ہے۔ ایک جاہلی شاعر کہتا ہے۔

حتی انتہی لمیاہ الجوف ظاہرۃ - مالم تر قبلہم عاد و لا ارم

وہ وسط صحرا کے تالاب پر آ کر رکا، یہ وہ رفتار تھی جو اس سے پہلے عاد وارم بھی نہیں چلے۔ تاریخی حیثیت سے اس کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی نے ارض القرآن میں تفصیلی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ تاریخ قدیم کے بعض یورپین مصنفین عاد کو صرف ایک فرضی اور مذہبی کہانی سمجھتے ہیں لیکن یہ انتہائی غلطی ہے تحقیقات جدیدہ نے فیصلہ کیا ہے کہ عرب کے قدیم باشندے ایک کثیر الافراد باعظمت جمعیت تھی جس نے بابل، مصر و شام میں بڑی بڑی حکومتیں قائم کیں۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ بارہویں جلد سورہ ہود میں آرہی ہے۔

۸۹۔ اور ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو رسول بنا کر روانہ کیا۔ عاد حضرت نوح علیہ السلام کے پوتے ارم کی اولاد میں ہیں۔ یہ قوم اسی کی طرف منسوب ہے۔ ان کی سکونت احقاف میں بھی تھی۔ حضرت ہود علیہ السلام اسی قوم سے ہیں اس لحاظ سے وہ ان کے قومی اور وطنی بھائی ہوتے ہیں[1]

حضرت ہود عاد کی سب سے زیادہ معزز شاخ خلود کے ایک فرزند تھے۔ سرخ و سفید رنگ اور وجیہ تھے ان کی داڑھی بڑی تھی۔ ان کی قوم بھی قوم نوح کی طرح خدا کی منکر نہ تھی۔ خدا کو مانتی تھی، لیکن اس کی یگانہ عبادت نہ کرتی تھی بلکہ شرک فی العبادت کرتی تھی۔ تاریخ قدیم کے بعض ماہرین کہتے ہیں کہ ان کے معبودانِ باطل بھی قوم نوح کی طرح ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر ہی تھے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک اثر مروی ہے۔ اس میں ہے کہ ان کے ایک صنم کا نام صمود اور ایک کا نام ہتار تھا۔

اخاھم کا لفظ بتا رہا ہے کہ اس دور میں قومیت کی اساس اسی طرح نسل اور خاندان تھی جیسے آج کل وطن اور زبان ہے۔ اسی سے نبی کی اُمت اور قوم کا فرق بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ اُمتِ دعوت نبی کی قوم ہوتی ہے اس کا تعلق نبی کے خاندان وطن اور زبان سے ہوتا ہے جبکہ اُمتِ اجابت نبی کی اُمت ہوتی ہے۔ پوری قومِ عاد حضرت ہود کی قوم ہیں لیکن آپ کی اُمت نہیں۔ اُمت صرف وہ لوگ ہیں جو ایمان کی نعمت سے مالا مال ہوتے ہیں اور بس۔ اور یہ تعبیر بالکل ایسی ہے جیسے رسول منھم رسول کا اپنی قوم کے اندر سے ہونا اتمامِ حجت کے نقطہ نظر سے اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم ہے۔ یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ لوگوں کے دوسرے احسانات کی طرح اس احسان کی بھی ناقدری کی ہے۔

حضرت ہود کی دعوتِ توحید

۹۰۔ انہوں نے کہا کہ اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو۔ اللہ کے سوا تمہاری بندگی کے لائق کوئی نہیں

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے کیا پھر بھی تم اللہ کی نافرمانی سے نہ بچوگے - ان لوگوں میں بُت پرستی پھیل گئی تھی - روزی دینے، مینہ برسانے تندرست کرنے اور مختلف مطالب وحاجات کے لیے الگ الگ دیوتا تیار کیے تھے جن کی پرستش ہوتی تھی - ہود علیہ السلام نے اس سے روکا اور اس جرم عظیم کی سزا سے ان کو ڈرایا - [1]

تمام انبیاءؑ انسانوں کی ہدایت کے لیے آتے تھے - یہ ایک جانی بوجھی حقیقت ہے کہ ان حضرات نے آکر لوگوں کو جس بات کی ہدایت کی واضح اور قطعی لفظوں میں یہ اور صرف یہ تھی کہ اعبدوا اللہ، اللہ کی عبادت کرو اور ظاہر ہے کہ یہی ہونا بھی چاہیے - اگر قرآن کی تصریح کے مطابق انسان اللہ کی عبادت ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ انبیاءؑ کو جو پیغام ہدایت دے کر بھیجا جاتا وہ اس سے ذرہ برابر بھی مختلف ہوتا - جب یہ حقیقت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا مشن صرف خدائے واحد کی عبادت کا پیام دینا اور انسانوں کو اس کا عابد بنانا تھا تو اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ ان حضرات نے بحیثیت نبی جو کچھ بھی بتایا اور سکھایا وہ سارے کا سارا عبادت کا کام تھا - اس کا کوئی لفظ اور کوئی شوشہ بھی عبادت کے سوا کچھ اور نہ تھا - کیونکہ یہ بوالفضولی تو ایک عام انسان سے بھی کچھ خلاف توقع ہی سمجھی جاتی کہ اسے مامور تو ایک مشن پر کیا گیا ہو لیکن وہ اپنی اس ڈیوٹی پر رہتے ہوتے کچھ غیر متعلق باتیں بھی انجام دینے لگے - پھر ایک پیغمبر کے بارے میں اس قسم کے کسی رویہ کا کیسے گمان کیا جا سکتا ہے - پیغمبر تو وہ ہوتا ہے جو سر سے پاؤں تک اطاعت ہی اطاعت ہوتا ہے جس کی نگاہیں ہمیشہ اپنے فرض منصبی ہی پر جمی رہتی ہیں جو اللہ کے بندوں کو وہی کچھ سمجھاتا اور سکھاتا ہے جس کا اس کے رب کی طرف سے حکم دیا گیا ہو اور اپنی طرف سے ایک لفظ بھی نہیں بولتا اس لیے ماننا پڑے گا کہ نبی دین کے بنیادی عقائد سے لے کر تمدن ومعاشرت کے جزئی معاملات تک کے بارے میں جو کچھ بھی بتاتا اور سکھاتا ہے - وہ کسی تقسیم یا کسی استثنا کے بغیر سب کا سب عبادت ہی کا کام ہوتا ہے ان احکام کی پیروی بھی عبادت ہوتی ہے جن میں اللہ کی بندگی کا حکم ہو یعنی انفرادی اجتماعی زندگی بسر کرنے کے ضابطے اور قوانین بتاتے گئے دوسرے لفظوں میں یہ کہ پورے دین، پوری شریعت کا اتباع ہی وہ عبادت ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا اور انبیاء کو بھیجا گیا ہے -

آخر میں یہاں افلا تتقون فرمایا ہے - تقوی کی اصل وقایہ ہے اس کے معنے بچنے کے ہیں - یہاں مراد برائیوں سے بچنا ہے خواہ وہ فکری ہوں، اخلاقی ہوں، معاشرتی ہوں، معاشی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہوں، سیاسی ہوں اور یا روحانی اور قانونی ہوں یہ لفظ اپنے عموم کی وجہ سے ساری برائیوں کو حاوی ہے۔ حضرت نوح نے فرمایا تھا کہ انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم اور حضرت ہود نے فرمایا افلا تتقون، دونوں میں باریک سا فرق ہے۔ حضرت نوح کی قوم سے پہلے عذاب کی کوئی نمائش نہ ہوئی تھی اور حضرت ہود کی قوم کے سامنے حضرت نوح کی قوم کا ماضی میں عذاب ہو چکا تھا اس لیے دونوں کی بات میں بلیغ تعبیری فرق ہو گیا۔ یہاں افلا تتقون فرمایا اور سورہ ہود میں افلا تعقلون ارشاد ہوا ہے۔ یہ قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے کہ ایک ہی واقعہ کے تکرار میں تنویع فوائد کے لیے نیرنگی پیدا کرتا ہے حضرت امام بخاری نے قرآن ہی کی اتباع میں احادیث مکررہ کے بیان میں یہ انداز بیان اپنایا ہے۔ حضرت ہود کی قوم بھی حضرت نوح کی قوم کی طرح اللہ تعالیٰ کے وجود کی منکر نہ تھی نہ اللہ سبحانہ سے ناواقف تھی اور نہ اللہ کی عبادت کی منکر تھی بلکہ اصل گمراہی جس میں وہ مبتلا ہو گئی تھی یہی تھی کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی اس کی عبادت میں شریک بنا لیا تھا۔

حضرت ہود کو سربرآوردہ طبقہ کا جواب

۹۱ - اس پر قوم کے ان سرداروں نے کہا جنہوں نے کفر کا شیوہ اختیار کر رکھا تھا کہ تم اپنی عقل کھو بیٹھے ہو اور ہمارا خیال یہ ہے کہ تم جھوٹ بولنے والوں میں سے ہو۔ یعنی معاذ اللہ تم بے عقل ہو کہ باپ دادا کی روش چھوڑ کر ساری برادری سے الگ ہوتے ہو اور جھوٹے بھی ہو کر اپنے اقوال کو خدا کی طرف منسوب کر کے خواہ مخواہ عذاب کا ڈراوا دیتے ہو[1] مطلب یہ ہے کہ یہ جو تم ہمیں قہر و عذاب سے ڈراتے ہو یہ محض تمہاری خود بافتگی ہے۔ ہماری یہ ترقیاں ہمارے مستحق عذاب ہونے کی علامت ہیں یا ہمارے منظور نظر ہونے اور صراط مستقیم پر گامزن ہونے کی۔ وانا لنظنک من الکاذبین یعنی تم جو یہ وعدہ کر رہے ہو کہ خدا کے فرستادہ ہو اور ہمارے پاس تم کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے یہ محض تمہاری دھونس ہے اور ہم تم کو بالکل جھوٹا آدمی سمجھتے ہیں۔

جواب کا یہ پیمانہ بتا رہا ہے کہ حضرت ہود کے مخاطبوں کو اپنی قوت بازو پر ناز تھا۔ اور اسی طرح ہر قوم جو مجد و تفوق پر قابض ہوتی ہے زندگی کے آخری دنوں میں بھی اپنی قوت پر مغرور رہتی ہے۔ ان کو نہ صرف اپنی فوجی و سیاسی قوت پر ناز تھا بلکہ اپنے افراد کی تعداد اور اپنی مواشی کی کثرت اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اپنے باغوں کی بہتات پر بھی ناز تھا جو اس عہد کی سب سے بڑی دولت تھی۔ قومِ عاد کے اس جواب سے ان کا ظلم و جور بھی مترشح ہے۔ یہ حاکمانہ زندگی کے لیے سب سے زیادہ زہر قاتل ہے۔ عاد کی جباری دستمگری کا ثبوت مصر کی مفتوح قوموں کی زبان سے بھی ملتا ہے۔

خدا ہم سے ناراض تھا ایک عجیب طریقے سے اطراف مشرق سے شریرالخلقت لوگ چلے آئے وہ اس قدر قوی تھے کہ ہمارے ملک میں گھس آئے اور بزور نہایت آسانی سے اس کو مسخر کر لیا۔ جب انھوں نے ہمارے سرداروں کو گرفتار کر لیا۔ ہمارے شہروں کو جلا دیا۔ ہمارے دیوتاؤں کے مندر گرا دیے۔ اور تمام باشندوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا اور نہ صرف یہ بلکہ کچھ کو ہتھیاروں سے مار ڈالا اور ان کی بیوی بچوں کو غلام بنایا۔

اور یہ بھی ان کے اندازِ جواب سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ اپنے خود ساختہ معبودوں کی پرستش کرتے تھے اور صرف حضرت ہود کی دعویٰ نبوت میں تکذیب نہ کرتے تھے بلکہ ان سب کی تکذیب کرتے تھے جو حضرت ہود کی طرح نبوت کا مشن لے کر کھڑے ہوں۔ حضرت ہود نے ان کو اس طاقت سے بھرپور نشہ والی تقریر کا جو جواب دیا قرآن نے آگے اسی کو پیش کیا ہے۔

حضرت ہود کا مقام

۹۲ ۔ حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا بھائیو! میں اپنی عقل نہیں کھو بیٹھا ہوں بلکہ میں تمام جہانوں کے پروردگار کی جانب سے رسول بن کر آیا ہوں۔ میرا کام تم تک اپنے رب کے پیغامات پہنچانا ہے اور میں پوری امانت کے ساتھ تمہارا خیر خواہ ہوں۔ یعنی میری کوئی بات بے عقلی کی نہیں۔ ہاں جو منصبِ رسالت مجھ کو خدا کی طرف سے تفویض ہوا ہے اس کا حق ادا کرتا ہوں۔ یہ تمہاری بے عقلی ہے کہ اپنے حقیقی خیر خواہوں کو جن کی امانت و دیانت پہلے سے لائقِ اطمینان ہے۔ بے عقل کہہ کر خود اپنا نقصان کرتے ہو۔[1]

جو شخص ان آیات کو پڑھتا ہے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسی ہستی کا تصور آجاتا ہے جو وقار اور متانت کا مکمل مجسمہ ہیں اور شرافت و نجابت چہرہ سے عیاں، جو کچھ فرماتے ہیں پہلے اس کو وزن کر لیتے ہیں کہ اس کا انجام کیا ہے اچھا ہے یا برا۔ قوم کی درشتی، تمسخر و استہزاء کا جواب

[1] افادات شیخ الاسلام

ضبط و صبر سے دیتے ہیں اور پھر بھی ان کی بھلائی کے جویاں نظر آتے ہیں۔ اخلاص اور حسن نیت ان کی پیشانی سے عیاں ہے قوم کہتی ہے انا لنراك فی سفاهة و انا لنظنك من الکاذبین۔ ہم آپ کو بیوقوف سمجھتے ہیں اور ہمارے خیال میں آپ جھوٹے ہیں مگر وہ ان کو یہ جواب دیتے ہیں لیس بی سفاهة ولکنی رسول من رب العالمین۔ یہ سوال و جواب ہمیں بتلاتے ہیں کہ اللہ کے برگزیدہ بندے جب کسی کی خیر خواہی کرتے اور کج رو انسانوں کی کج روی پر نصیحت کرتے ہیں تو کور چشموں، بدباطنوں کی ہرزہ سرائی تمسخر و تحقیر کی پرواہ نہیں کرتے۔ دلگیر و رنجیدہ ہو کر امر حق سے منہ نہیں موڑتے ناراض ہو کر خیر خواہی اور نصیحت کو نہیں چھوڑتے اور بلندی اخلاق، نرمی و مہربانی کے ساتھ روحانی مریضوں کے علاج میں مشغول رہتے ہیں۔

آیت بتا رہی ہے کہ تبلیغ و پیغام حق کی راہ میں بدی کا بدلہ بدی سے نہیں بلکہ نیکی سے اور تلخی کا جواب شیریں کلامی سے دیا جاتا ہے۔ اسی کو قرآن نے جادلهم بالتی هی احسن میں پیش کیا ہے۔ یعنی ان سے مجادلہ مباحثہ احسن طریقے پر کرو۔ یہی طریقہ لیس بی سفاهة کہہ کر حضرت ہود نے اختیار کیا ہے۔ ایسا اسلوب، ایسا طریق خطاب، ایسا لب و لہجہ اس طرح کے الفاظ اختیار نہیں فرماتے جو مخاطبوں کے دل کو دکھ پہنچاتے ہوں یا سننے والوں کی نظر میں ان کو ذلیل کرنے والے ہوں کیونکہ مقصد دعوت حق ہے اور دعوت نام ہے مخاطب کے دل کو نرمی و محبت سے حق کی طرف متوجہ کرنے کا نہ کہ صدمہ پہنچانے ضد میں لانے اور جوش نفرت سے بھر دینے کا۔ کس قدر بلیغ اور پیارے انداز میں فرمایا ہے کہ انا لکم ناصح امین۔ دعوت کی راہ لین دین کی راہ نہیں ہوتی سچ کو سچ مان لینے کی راہ ہوتی ہے۔ نبوت کی راہ دعوت کی راہ ہے جدل کی راہ نہیں۔ اگر جدل کرنا ہی پڑے تو صرف اس حالت میں کیا جا سکتا ہے کہ احسن طریقہ پر ہو یعنی راست بازی، دیانت، شیریں زبانی اور شائستگی سے بات پیش کی جائے۔ حضرت ہود نے ان کے اس الزام کا جواب کہ تم بے عقل ہو اور جھوٹ بول رہے ہو۔ انا لکم ناصح امین۔ سے دیا ہے۔ امانت و صداقت کے ساتھ تمہاری خیر خواہی میری سیرت کا لازمی حصہ ہے۔ ان اوصاف کے ساتھ بھلا میں عقل سے بیگانہ اور صداقت سے دور کیسے ہو سکتا ہوں۔

حضرت ہود کا مقام نبوت

۹۳۔ کیا تمہیں اس بات پر حیرت ہوئی ہے کہ ایک ایسے شخص کے ذریعے تمہارے پروردگار کا پیغام تمہارے پاس آیا ہے جو خود تم میں سے ہے اور اس لیے آیا ہے کہ وہ تمہیں اعمال بد کے نتائج

سے آگاہ کرے۔ دنیا کی یہ بیماری پرانی ہے کہ وہ سمجھتی ہے کہ روحانی ہدایت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جو صرف ایک انسان کے ذریعہ ظاہر نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ انسان سے کوئی بالاتر ہستی ہو بقول مولانا آزاد اسی خیال نے دیوتاؤں کے ظہور اور ان کی عجائب آفرینیوں کا اعتقاد پیدا کیا۔ قرآن نے ان کے اسی خیال کو ما انت الا بشر امثلنا کی صورت میں پیش کیا ہے یعنی ہر داعیٔ حق کے منکروں نے یہ بات کہی کہ تم تو ہماری طرح کے انسان ہو۔ پھر تمہارا یہ دعویٰ رسول من رب العالمین کیسے مان لیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ رسولوں کی رسالت ماننے میں سب سے بڑی رکاوٹ رسولوں کا انسان ہونا رہا ہے قرآن نے اس بات کو بڑے اصرار اور بڑے تکرار کے ساتھ زور دے کر واضح کیا ہے کہ انسانوں کی ہدایت انسان ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے کہیں اس نے منکم کہیں منہم اور کہیں متکلم کہہ کر یہ بات بتائی ہے یہاں علی رجل منکم کا مقام وہی ہے جو فیکم رسولاً منکم اور فیہم رسولا من انفسہم کا ہے۔

قوم عاد کی زمین میں حکومت

۹۴۔ خدا کا یہ احسان یاد کرو کہ قوم نوح کے بعد اس نے تمہیں ان کا جانشین بنایا اور تمہاری نسل کو زیادہ وسعت اور توانائی عطا فرمائی لہٰذا تمہیں اللہ کی نعمتوں کو یاد رکھنا چاہیے تاکہ تم کامیابی سے ہمدوش ہو۔ یعنی قوم نوح کے بعد دنیا میں تمہاری حکومتیں قائم کیں اور اس کی جگہ تم کو آباد کیا شاید یہ احسان یاد دلا کر اس پر بھی متنبہ کرنا ہے کہ بت پرستی اور تکذیبِ رسول کی بدولت جو حشر ان لوگوں کا ہوا وہ کہیں تمہارا نہ ہو۔ ان انعامات میں سے یہ بھی ہے کہ جسمانی قوت اور ڈیل ڈول کے اعتبار سے یہ قوم مشہور تھی۔ یہ احسانات اور ان کے علاوہ دوسرے بے شمار احسانات یاد کر کے اس کا شکر گزار اور فرمانبردار بننا چاہیے نہ یہ کہ منعم حقیقی سے بغاوت کرنے لگو۔[1]

اس آیت سے نہ صرف قوم عاد کے زمانے کی تعیین ہوتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ارم سامیہ اور عاد ایک ہی چیز ہیں اسی لیے قرآن نے ان کو عاد اولیٰ کہا ہے وانہ اھلک عادا الاولیٰ مگر یہ ایک عجیب بات ہے کہ تاریخ قدیم کے بعض یورپین مصنفین عاد کو محض ایک فرضی اور مذہبی فسانہ خیال کرتے ہیں چنانچہ مشہور مستشرق نولڈیکی نے جو یورپ کی سرزمین پر مشرقیات کا سب سے

[1] افادات شیخ الاسلام

بڑا فاضل سمجھا جاتا ہے۔ عاد اور عمالیق کی تحقیق میں ایک رسالہ لکھا ہے جس میں ثابت کیا ہے کہ یہ غیر تاریخی قومیں ہیں لیکن یہ کوئی نئی اپج نہیں قدیم زمانہ میں بعض ایرانیوں کو ان کے وجود سے انکار تھا۔ چنانچہ ابن جریر طبری جو مشہور مورخ ہیں عاد کے حالات میں لکھا ہے کہ

بعض ایرانیوں نے عاد سے انکار کیا ہے حالانکہ اشعار جاہلیت میں ان کا نہایت کثرت سے ذکر ہے اگر خوف تطویل نہ ہوتا تو میں نقل کرتا۔

لیکن یہ ایک کھلی اور واضح غلطی ہے۔ عاد و ثمود کے واقعات عرب کے مشہور ترین واقعات ہیں جن کا علم خود ان کو ذاتی طور پر حاصل تھا کیونکہ عاد و ثمود کی کل آبادیاں خود ان کے اندرون ملک کی آبادیاں تھیں۔ اور ان کے حالات و واقعات خاندانی طور پر ان میں نقل ہوتے چلے آتے تھے۔ مشہور مورخ ابن ہشام کلبی نے جس کا مخصوص موضوع عرب جاہلیت کی تاریخ و روایت ہے۔ ان کے حالات میں تین مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ پہلی کتاب کا نام تفرق عاد ہے یعنی عاد کی قوم عرب سے نکل کر کہاں کہاں گئی اور دوسری کتاب کا نام ہے کتاب من نقل من عاد و ثمود والعمالیق وجرھم و بنی اسرائیل من العرب یعنی عاد و ثمود، عمالیق، جرہم اور بنی اسرائیل جو عرب سے نکل کر باہر گئے ان کے حالات۔ تیسری کتاب کا نام ہے کتاب عاد الاولی والثانیہ۔

بطلیموس نے اپنے جغرافیہ میں جنوبی عرب کے قبائل میں عاد ریمیٹا اور عادیات کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ پہلا عاد ارم ہے اور دوسرا عاد ہے۔ جس کو یونانی تلفظ نے یہ صورت دے دی ہے۔ بطلیموس دوسری صدی عیسوی میں تھا۔ اس بنا پر عاد کا وجود اس زمانے تک مسلم ہے۔

حضرت امیر معاویہ کے زمانے میں عبدالرحمان مصر کے گورنر تھے۔ انہوں نے حضرموت کے منہدم شدہ قلعہ "حصن غراب"، پر ایک کتبہ پایا تھا۔ یہ کتبہ علامہ نویری نے اپنی کتاب مسالک الابصار میں نقل کیا ہے۔ ۱۸۳۴ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک مشن یمن بھیجا تھا اس کو یہی کتبہ اصل قدیم حمیری خط میں ملا۔ یہ کتبہ فارسٹر صاحب کی تحقیق کے مطابق قوم عاد کا ہے اور عرب کے قدیم ترین کتبات میں سے ہے جس کا زمانہ حضرت عیسٰی سے اٹھارہ سو برس قبل کا ہے۔ یہ کتبہ ایک منہدم عمارت میں پتھر پر کندہ تھا۔ ایک انگریز افسر جس کا نام ولسٹڈ تھا اس کا مکتشف تھا اور یہ سب سے پہلا عربی کتبہ ہے جو یورپ نے عرب کی سرزمین میں دریافت کیا۔ اصل کتبہ اور اس کا حل اولاً ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں چھپا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کا پورا ترجمہ عاد ثانیہ کی تحقیق میں اپنی مشہور کتاب ارض القرآن میں درج کر دیا ہے فرماتے ہیں:

ہم مدت تک اس وسیع قصر میں رہے۔ ہماری حالت بدنصیبی اور ادبار سے دور تھی۔ ہماری نہروں میں دریا کا پانی اُمڈ آتا تھا۔ سمندر موجیں مارتا ہوا ہمارے قلعہ کی دیواروں سے غضب ناک ہو کر ٹکریں مارتا تھا۔ ہمارے چشمے خوش آئند آواز سے بہتے تھے۔ بلند کھجوروں کے اوپر جن کے باغبان خشک چھوہارے ہماری وادیوں کے چھوہاروں کی زمین میں لگاتے تھے اور خشک چاول بوتے تھے۔ ہم پہاڑی بکروں اور جوان خرگوشوں کا شکار بنجروں اور جالوں سے کرتے تھے اور مچھلیوں کو بہلا بہلا کر باہر نکال لیتے تھے اور ہم آہستہ آہستہ خراماں رنگ برنگ کے ریشم کے کپڑے اور کاہی سبز مختلف الالوان جامہ پہن کر چلا کرتے تھے اور ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے تھے جو کمینہ خیالات سے بہت دور اور شریروں کو سزا دینے والے تھے۔ یہود کی شریعت کے مطابق اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے اور ہم معجزات کا یقین رکھتے تھے قیامت کے روز اور نبیوں کے راز پر ایمان تھا۔ راہزن دشمن گھس آتے اور وہ ہمارے ساتھ کچھ جھگڑا کرتے مگر ہم نے گھوڑوں کو پورے ڈال دیا اور ہمارے کریم نوجوان سخت اور نوکدار نیزوں کو لے کر آگے بڑھے۔ ہمارے خاندان کے مغرور بہادر مرد اور عورتیں گھوڑوں پر لڑ رہی تھیں جن کی گردنیں لمبی تھیں اور جو چمکدار کمیت رنگ کے تھے۔ ہماری تلواریں بدستور دشمنوں کو زخمی کر رہی تھیں اور چھید رہی تھیں یہاں تک کہ ان کے قلب پر حملہ کر کے ان کو مفتوح اور بالکل پست کر دیا جو بدترین نوعِ انسان تھے۔

یہ کتبہ متعدد حیثیات سے قرآن عظیم کی تائید کرتا ہے۔

اولاً یہ کہ حضرت ہود علیہ السلام کی اس سے تاریخی شخصیت معلوم ہوتی ہے۔

ثانیاً یہ کہ بقایائے عاد صرف حضرت ہود علیہ السلام کے پیروکار تھے۔

ثالثاً یہ کہ عاد ذات العماد اور عمارتوں کے بانی تھے۔

رابعاً یہ کہ وہ حقیقت میں جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے بڑے بڑے باغ، چشموں، آل اولاد اور چوپایوں کے مالک تھے۔

بہرحال عاد کا انکار تاریخ کی ایک مسلمہ حقیقت کا انکار ہے۔ تاریخ اور اکتشافات عصریہ دونوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ عرب کے قدیم باشندے ایک کثیر التعداد اور باعظمت و جبروت قوم تھی

جن کا زمانہ حضرت نوح کے بعد اور حضرت ابراہیم سے پہلے ہے۔ عرب مورخین ان کو عرب عاریہ یعنی خالص عرب کہتے ہیں۔ یہ بہت سے قبائل تھے۔ ان کو امم بائدہ بھی کہا جاتا ہے یعنی برباد شدہ قومیں۔ کیونکہ زمانہ نے ان کا نام ونشان مٹا کر رکھ دیا۔ اشعار جاہلیت میں ان کا ذکر کثرت سے آیا ہے۔ قبیلہ عاد ان قبائل میں سب سے زیادہ کثیرالافراد باعظمت جمعیت تھی جو تمام عرب عاربہ میں شوکت و جبروت کے اعتبار سے ممتاز تھی اور نوح علیہ السلام کی قوم کی بربادی کے بعد خلافت ارضی اسی کے حصہ میں آئی یہی قوم تھی جو دُنیا کی قدیم ترین تہذیب کی بانی تھی۔ ان کے افراد کی فراوانی اور قوت وشوکت کی بہتات کی طرف وزادکم فی الخلق بصطۃ میں اشارہ کیا ہے بصطۃ سے مقصود زور و قوت ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے بدن میں زور و توانائی عطا فرمائی۔ قوم عاد کے متعلق عام طور سے نہایت لغو باتیں مشہور ہیں۔ مثلاً شداد کی جنت کا قصہ کہ اس میں سونے چاندی کی اینٹیں تھیں اور لعل وگوہر پچکاری۔ اس کے سنگریزے جواہر کے تھے اور اس کی مٹی مشک وعنبر کی وغیرہ وغیرہ۔ شارحین قرآن کی ایک جماعت نے اس قصہ کو اپنی تفسیروں میں نقل کر ڈالا ہے اور ثعلبی وغیرہ نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عبداللہ بن قلابہ اس کی سیر بھی کر آئے اور تعجب یہ ہے کہ تفسیر قرطبی اور تفسیر عزیزی تک میں یہ قصہ جوں کا توں نقل کر دیا لیکن یہ محض افسانہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ چنانچہ قاضی محمد بن علی شوکانی اپنی مشہور تفسیر فتح القدیر میں فرماتے ہیں:

> یہ جھوٹ پر جھوٹ اور افتراء پر افتراء ہے اسلام اور اہل اسلام کو اس قسم کے جھوٹے دجالوں سے کہ جو کبھی بنی اسرائیل پر کبھی انبیاء پر اور کبھی صالحین پر اور کبھی خود رب العالمین پر دروغ بیانی کی جرأت کرتے ہیں سخت مصیبت عظیم نقصان اور بڑی پریشانی لاحق ہوئی۔ اور پھر ایسے لوگوں کی تصنیف اور کتاب اللہ کی تفسیر میں پیش پیش ہو جانے سے کہ جن کو صحیح، ضعیف اور موضوع روایات کا پتہ تک نہیں یہ برائی اور زیادہ ہو گئی۔ کیونکہ ان من گھڑت خرافات اور خود ساختہ فسانوں اور بنائے ہوئے قصوں کو کتاب اللہ کی تفسیر میں داخل کر کے بڑی تحریف اور تغیر و تبدل کر ڈالا۔

حیرت ہے کہ خود علامہ شوکانی نے اس بھرپور تردید کے باوجود اپنی تفسیر میں زادکم فی الخلق بصطۃ کی تشریح کرتے ہوئے عاد کے قد وقامت، ڈیل ڈول اور ان کی جسامت

کے بارے میں عجیب و غریب باتیں بے تکلف نقل کر ڈالی ہیں مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ

ابن عساکر وہب سے راوی ہیں کہ عاد کا ہر شخص ان کے گز کے اعتبار سے ساٹھ گز کا ہوتا تھا اور اس کی کھوپڑی بڑے گنبد کے مانند ہوتی تھی اور آنکھ اور اسی طرح ان کی ناک اتنی بڑی ہوتی تھی کہ جس میں درندوں کے بچے پیدا ہو جائیں اور عبد بن حمید نے قتادہ سے روایت کی ہے کہ ان کی قامت کی درازی بارہ گز کی تھی اور حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ ان کا قد اسّی ہاتھ لمبا اور گیہوں کا دانہ گائے کے گردے کے برابر تھا۔ اور انار اتنا بڑا ہوتا کہ جس کے چھلکے میں دس آدمی بیٹھ جائیں۔ اور عبداللہ بن احمد نے زوائد الزہد میں نیز ابن ابی حاتم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ قوم عاد کا ایک شخص پتھر کے دروازے کا ایک پٹ اتنا بڑا بناتا تھا کہ اس امت کے پانچ سو آدمی مل کر اس کو اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتے۔

اب یہاں بجائے اس کے کہ قاضی صاحب ان واہی تباہی حکایات کی تردید کرتے یہ کہہ کر

قوم عاد کے بڑے بڑے ڈیل ڈول ہونے میں سلف میں بہت قصے منقول ہیں۔

ان افسانوں پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اصل میں بات یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے ارشاد زادکم فی الخلق بصطۃ سے قاضی صاحب یہ سمجھے کہ یہ ان کے قد و قامت کی درازی اور ان کے ڈیل ڈول کی بڑائی کا بیان ہے چنانچہ وہ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یعنی خلقت میں درازی اور جثہ میں کلاں ان کے باپ دادا کے قد و قامت سے کہیں زیادہ تھی۔

حالانکہ بصطۃ سے مقصود زور و قوت کا بیان ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے بدنوں میں زور و توانائی زیادہ عطا فرمائی اور لطف یہ کہ خود قاضی شوکانی نے حضرت عبداللہ بن عباس سے بروایت ابن ابی حاتم و ابوالشیخ بصطۃ کی تفسیر شدۃ زور و طاقت سے نقل کی ہے۔ غور فرمائیے دوسری جگہ قرآن میں حضرت طالوت کے متعلق بھی یہی ارشاد ہے وزادہ بسطۃ فی العلم والجسم۔ اب اس سے یہ کون سمجھے گا کہ طالوت بہت ہی قد آور تھے بلکہ یہ ان کے صرف صاحب زور و قوت ہونے کا بیان ہے۔

درحقیقت عاد کے طول قامت کے بارے میں جتنی بھی روایات ہیں سب اسرائیلی فسانے ہیں جو مسلمانوں میں پھیل گئے تھے۔ اسی لیے محتاط مفسرین نے جو نقد و نظر کے مالک تھے اس بارے میں ایک حرف بھی نقل نہیں کیا۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں و زادکم فی الخلق کی تفسیر میں اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھا۔ ان کو اپنے اہل زمانہ میں شکل و صورت اور طاقت و گرفت میں سب سے زیادہ زور آور بنایا[1]

ظاہر ہے کہ اس موضوع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ارشاد منقول نہیں ہے اور جو افسانے بتائے جاتے ہیں وہ ان کتابوں میں موجود نہیں جن کے مصنفین نے صحت کا التزام کیا ہے۔ پھر ایسے غیر معمولی واقعات کے لیے جب تک کثرت سے روایات نہ موجود ہوں ان کو صحیح کیسے باور کیا جا سکتا ہے اسی بنا پر علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر جامع احکام القرآن میں جب ابن العربی کے حوالہ سے حضرت عبداللہ ابن عباس کا یہ بیان نقل کیا کہ عاد میں ہر شخص کا قد ستر گز کا تھا تو فرمایا:

یہ غلط ہے کیونکہ الصحیح میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا تو ان کا قد ساٹھ گز کا تھا پھر برابر نسل انسانی کا قد آج تک گھٹتا چلا آرہا ہے۔

حضرت آدم کے قد کے ساٹھ گز ہونے کی روایت صحیح بخاری کتاب الاستیذان میں موجود ہے لیکن اس کے متعلق حافظ عقیلی کتاب الضعفاء میں ابوالزناد کے تذکرے میں لکھتے ہیں۔

ابن القاسم کہتے ہیں میں نے امام مالک سے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا تھا جو اس حدیث کو بیان کرتا ہے جس میں لوگوں نے ان اللّٰہ خلق آدم علی صورتہ کے متعلق پوچھا تو امام مالک نے اس روایت کا نہایت سختی سے انکار کیا اور منع کر دیا کہ کوئی اس کو بیان نہ کرے[2]

اور حافظ ابن حجر عسقلانی کہ جو سرآمد علمائے متاخرین ہیں لکھتے ہیں:

ساٹھ گز قد والی روایت پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اب جو گزشتہ قوموں کے آثار موجود ہیں جیسے ثمود کی آبادیاں۔ ان کے مکانات زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ ان کے قد اور ڈیل ڈول زیادہ لانبے نہ تھے۔ اس معیار کے مطابق جس کی ترتیب

[1] البدایہ والنہایہ [2] میزان الاعتدال

سابق مقتضی ہے حالانکہ اس میں شک نہیں کہ ان کا زمانہ قدیم ہے اور جو مدت کہ ان کے اور آدم علیہ السلام کے مابین ہے وہ اس مدت سے کم ہے کہ جو اس کے اوائل اور ان کے مابین تھی اور اب تک مجھے کوئی چیز ایسی معلوم نہیں ہو سکی جو اس اعتراض کو دور کر سکے۔

ہاں حضرت آدم کے قد کے بارے میں یہ توجیہ ممکن ہے کہ یہ واقعہ آسمان کا ہو اور دنیا میں آنے کے بعد وہی قد و قامت رہ گیا ہو جو نسلِ انسانی کا عام طور پر چلا آرہا ہے۔ جس طرح دن کا معاملہ ہے کہ عالمِ بالا کا ایک دن عالم سفلی کے ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ اور جب اس عالم میں واپس جائیں گے تو پھر وہیں کے مناسب قد و قامت عطا کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اہلِ جنت کا قد و قامت ساٹھ گز کا روایات میں موجود ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ آیئے ذرا قرآن کی روشنی میں عاد کے قد و قامت والی روایت پر نظر ڈال لیجئے۔ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے و عادا و ثمودا و قد تبین لکم من مساکنہم عاد و ثمود، ان کے رہنے کی جگہیں تمہارے لیے کھلی ہوئی ہیں۔ یہ عاد و ثمود کے ان ہی مکانات کا ذکر ہے جو عہدِ نبوی میں موجود تھے اور آج بھی موجود ہیں اور جن کو مسلمان اس زمانے سے لے کر آج تک مساکن عاد و ثمود ہی مانتے ہیں۔ ورنہ ان مساکن کے مساکن عاد و ثمود ہونے میں اگر کچھ شبہ ہوتا تو قد تبین لکم من مساکنہم نہ فرمایا جاتا۔ اس لیے اس موضوع پر خود ان کی رہائش گاہوں سے بڑھ کر جو آنکھوں کی دیکھی کھلی شہادت ہے اور کون سی چیز فیصلہ کن ہو سکتی ہے۔ آخر میں فرمایا ہے واذکروا الاء اللہ لعلکم تفلحون۔ تمہیں اللہ کی نعمتوں کو یاد رکھنا چاہیے تاکہ تم کامیابی سے ہمدوش ہو۔ الاء جمع الی کی ہے اس کے معنے نعمت، انعام کرشمہ، شان کارنامہ کے ہیں۔ حضرت ہود کی یہ بات اپنے اندر امتنان اور تنبیہہ دونوں پہلو رکھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ، تمہیں جن جسمانی، عقلی، سیاسی، معاشی، افرادی قوتوں سے نوازا ہے ان کی قدر کرو، ان کا شکر کرو۔ ان کی وجہ سے فتنوں کا شکار نہ ہو۔ خدا کی نعمتوں، احسانوں، عظمتوں اور شانوں کو یاد رکھو۔ یہی فلاح و کامیابی کا راستہ ہے۔ اگر تم نے اکڑ دکھائی تو یاد رکھو خدا کی پکڑ بھی بڑی ہی سخت ہے۔

قبولِ حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ

۹۵- انہوں نے جواباً کہا کیا ہمارے پاس اس لیے آتے ہو کہ ہم یگانہ اللہ سے عابدانہ تعلقات

پیدا کریں اور ان معبودوں سے عابدانہ تعلقات چھوڑ دیں جن سے ہمارے باپ دادوں کے عابدانہ تعلقات تھے اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو جس چیز کی ہمیں دھمکی دے رہے ہو وہ لاؤ۔ عاد نے جب حضرت ہود کا یہ اعلان سنا کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور ان کے پاس علم کا ذریعہ وحی ہے تو اس اعلان کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی جگہ حیرت میں پڑ گئے اور ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ایک خدا کے سوا کسی بھی مخلوق سے بندوں کے عابدانہ تعلقات نہ ہونے چاہئیں۔ خدا کے سوا خدا کے بندوں سے عابدانہ تعلقات پیدا کرنے اور شرک کرنے کے بیچ ان کے ترکش میں دلیل کا کوئی تیر نہ تھا اس لیے انہوں نے باپ دادا کی تقلید کا سہارا لیا اور بڑی حیرت سے بول پڑے اجئتنا لنعبد اللہ وحدہ و نذر ما کان یعبد آباؤنا، کیا تو اس لیے ہمارے پاس آیا ہے کہ ہم صرف ایک ہی خدا کی پر عبادت کریں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے۔ قبول حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ آباؤ اجداد کی اندھی تقلید اور گڑھی ہوئی بزرگیوں اور روایتی عظمتوں کی پرستش ہے۔ ابتداءً جہل و فساد سے کوئی عقیدہ گڑھ لیا جاتا ہے۔ پھر جب ایک عرصہ کے اعتقاد سے اس میں نشانِ تقدیس پیدا ہو جاتی ہے تو اسے شک و شبہ سے بالاتر سمجھنے لگتے ہیں۔ اور عقل و بصیرت کی کوئی دلیل بھی اس کے خلاف تسلیم نہیں کرتے۔ وہ نبوت کی توحید عبادت کی دعوت کو باپ دادا کی توہین سمجھتے ہیں۔ وہ غصہ میں آپے سے باہر ہو جاتے جب وہ دیکھتے ہیں کہ زبانِ نبوت ان کو مشرک و کافر کہہ رہی ہے۔ قوم عاد کے نزدیک حضرت ہود کی بات مان لینے میں ان کے ان معبودوں اور بزرگوں کی توہین تھی جن کو وہ خدائے قدوس کی بارگاہ میں اپنا وسیلہ اور شفیع سمجھتے تھے۔ آخر وہ شعلہ کی طرح بھڑک اٹھے اور حضرت ہود علیہ السلام سے بگڑ کر کہنے لگے فاتنا بما تعدنا اے ہود تو نے اپنے خدا کے عذاب کی دھمکی دی اور ہم کو اس سے یہ کہہ کر ڈرایا انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم اب ہم سے تیری روز روز کی نصیحتیں نہیں سنی جاتی ہیں۔ ہم ایسے ناصح مشفق سے باز آتے اگر تو واقعی سچا ہے تو وہ عذاب جلدی لا تاکہ ہمارا تیرا قصہ پاک ہو۔

قوم کو حضرت ہود علیہ السلام کا جواب

۹۶۔ حضرت ہود نے فرمایا بلاشبہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر عذاب و غضب آچکا ہے کیا مجھ سے ان ناموں کے بارے میں الجھ رہے ہو جو تمہارے اور تمہارے باپ دادا کے رکھے ہوتے ہیں۔ جن کی خدا نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے۔ اچھا تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ

انتظار کر رہا ہوں۔ یعنی جب تمہاری سرکشی اور گستاخانہ بے حیائی اس حد تک پہنچ چکی ہے تو سمجھ لو کہ خدا کا عذاب اور غضب تم پر نازل ہی ہو چکا اس کے آنے میں اب کچھ دیر نہیں اور تم جو بتوں کو کہتے ہو کہ فلاں رزق دینے والا ہے اور فلاں مینہ برسانے والا اور فلاں بیٹا عطا کرنے والا وعلی ہذا القیاس یہ محض نام ہی نام ہیں جن کے پیچھے کوئی حقیقت اور واقعیت نہیں۔ خدائی صفات پتھروں میں کہاں سے آئیں۔ پھر نام کے معبودوں کے پیچھے جن کی معبودیت کی کوئی عقلی یا نقلی سند نہیں بلکہ کل عقلی و نقلی دلائل جسے مردود ٹھہراتے ہیں تم دعویٔ توحید میں مجھ سے جھگڑتے اور بحثیں کرتے ہو۔ جب تمہارے جہل اور شقاوت و عناد کا پیمانہ اس قدر لبریز ہو چکا ہے تو انتظار کرو کہ خدا ہمارے تمہارے ان جھگڑوں کا فیصلہ کر دے میں بھی اسی فیصلہ کا منتظر ہوں[1] مطلب یہ ہے کہ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو تو اب اس میں دیر نہیں ہے اس کو آیا ہی سمجھو اس لیے کہ جس ناپاکی اور غضب سے خدا کا غضب بھڑکتا ہے اس کی بہت بڑی کھیپ تم نے اپنے اوپر لاد لی ہے۔ رجس کا اتنا بڑا انبار جمع کر لینے کے بعد اب خدا کے صاعقہ عذاب کو دُور نہ سمجھو اتجادلو ننی بڑا ہی بلیغ فقرہ ہے یہ قوم کی اس بات کا جواب ہے کہ بھلا ہم اپنے ان معبودوں کو کس طرح چھوڑ سکتے ہیں جن کو باپ دادا کے زمانے سے پوجتے آرہے ہیں۔ فرمایا کہ تمہاری تقلید آباء کی یہ حجت بالکل بے بنیاد ہے تم جن چیزوں کو پوجتے ہو ان کے نام تمہارے اپنے رکھے ہوتے ہیں لیکن ان ناموں کا کوئی مسمی موجود نہیں ہے یعنی تم کسی کو بارش کا اور کسی کو ہوا کا اور کسی کو بیماری کا رب کہتے ہو۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی فی الحقیقت کسی چیز کا رب نہیں ہے۔ ان کے خدا کے شریک ہونے کی کوئی دلیل عقل و فطرت میں موجود نہیں ہے اور نہ خدا نے اپنے نبیوں اور رسُولوں کے ذریعے سے کہیں یہ خبر دی ہے کہ اللہ نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے۔ یہ صرف خیالی باتیں ہیں جن کا خارج میں کوئی واقعی مصداق نہیں ہے۔ اسی قسم کے اسماء وہ ہیں جو موجودہ زمانے میں لوگ بولتے ہیں مثلاً غوث، مشکل کشا، گنج بخش، داتا، غریب نواز یہ بھی صرف اسماء ہیں جن کا خارج میں کوئی مصداق نہیں ہے۔ پس درحقیقت ایسے سب نام محض نام ہی ہیں جن کے پیچھے کوئی مسمی نہیں ہے۔ جو ان کے لیے جھگڑتا ہے وہ دراصل چند ناموں کے لیے جھگڑتا ہے نہ کسی حقیقت کے لیے۔ صورتِ حال اگر یہ ہے اور نہ ہونے کی وجہ کیا ہے تو پھر وہ کیا چیز ہے جس کی بنا پر تم ان کو معبود بناتے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

بیٹھے ہو اور ان کی حمایت میں مجھ سے لڑ رہے ہو۔ جہاں تک خدا کا تعلق ہے اس کو تو تم بھی مانتے ہو وہ نزاعی چیز نہیں ہے لیکن تمہارے یہ خیالی اسماء تو ان کے حق میں تمہارے پاس کیا دلیل ہے۔
آخر میں ارشاد ہوا ہے فانتظروا ۔ مطلب یہ ہے کہ اب اگر عذاب دیکھنے ہی کا شوق ہے تو انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔ جہاں تک اسباب کا تعلق ہے وہ تو تم نے سارے فراہم کر دیے ہیں لیکن عذاب کا لانا میرا کام نہیں ہے خدا کا کام ہے تم بھی انتظار کرو میں بھی انتظار کر رہا ہوں۔

قوم عاد پر عذاب اور ان کا انجام

۷۲۔ پھر ہم نے حضرت ہود اور اُن کے ساتھیوں کو اپنی مہربانی سے بچا لیا اور جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا تھا ان کی بیخ و بنیاد اکھاڑ دی واقعہ یہ ہے کہ وہ ایمان لانے والے نہ تھے۔ یعنی ان پر سات رات اور آٹھ روز تک مسلسل آندھی کا طوفان آیا جس سے تمام کفار ٹکرا ٹکرا کر اور پٹک پٹک کر ہلاک کر دیے گئے یہ تو عاد اولیٰ کا انجام ہوا اور اسی قوم کی دوسری شاخ ثمود جسے عاد ثانیہ کہتے ہیں اس کا ذکر آگے آتا ہے[1] یہ اس سنتِ الٰہی کا بیان ہے جو رسول کے ذریعے سے قوم پر حجت تمام کر دینے کے بعد لازماً ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ رسول اور اس کے ساتھیوں کو اپنے فضل خاص سے اپنی حفاظت میں لے کر علاقہ عذاب سے نکال دیتا ہے اور رسول کے تمام جھٹلانے والوں کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے۔ یہ فیصلہ کن عذاب ہوتا ہے جو اس وقت آتا ہے جب مخاطب قوم اپنی ہٹ اور ضد سے یہ ثابت کر دیتی ہے کہ اس کے اندر صلاحیت ایمان کی کوئی رمق بھی باقی نہیں رہی ہے وما کانوا مومنین سے اسی طرف اشارہ ہے۔
قوم ہود پر عذاب کی بات خود اہلِ عرب کی تاریخی روایات سے بھی ثابت ہے اور موجودہ اثری اکتشافات بھی اس پر شہادت دیتے ہیں کہ عاد اولیٰ بالکل تباہ ہو گئے اور ان کی یادگاریں تک دُنیا سے مٹ گئیں چنانچہ مورخینِ عرب انہیں امم بائدہ کہتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی عرب کے تاریخی مسلمات میں سے ہے کہ عاد کا صرف وہ حصہ باقی رہا ہے جو حضرت ہود کا پیرو تھا انہیں بقایا تے عاد کا نام تاریخ میں عاد ثانیہ ہے اور حصن غراب کا وہ کتبہ جس کا ہم ابھی ابھی ذکر کر چکے ہیں انہی کی یادگار دل

[1] افادات شیخ الاسلام

میں سے ہے۔ اس کتبہ میں ماہرین آثار نے جو عبارت پڑھی ہے اس کے جملے پھر ذہن میں تازہ کر لیجئے۔
ہمارے حکمران ایسے بادشاہ تھے جو برے خیالات سے پاک اور اہل شر و فساد پر سخت تھے وہ ہم پر ہود کی شریعت کے مطابق حکومت کرتے تھے اور عمدہ فیصلے ایک کتاب میں درج کرتے جاتے تھے۔

یہ عبارت آج بھی قرآن کے اس بیان کی تصدیق کر رہی ہے کہ عاد کی عظمت و شوکت کے وارث آخر کار وہ لوگ ہوئے جو حضرت ہود پر ایمان لائے۔ قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ حضرت ہود اور ان پر ایمان لانے والوں کو اللہ نے عذاب سے محفوظ رکھا۔

یہ ہے عاد اولیٰ کی وہ داستان عبرت جو اپنے اندر چشم عبرت بین کے لیے بے شمار پند و نصائح رکھتی اور خدائے برتر کے احکام کی تعمیل اور تقویٰ و طہارت کی زندگی کی جانب دعوت دیتی ہے۔ شرارت، سرکشی اور خدا کے احکام سے بغاوت کے انجام بد سے آگاہ کرتی اور وقتی خوش عیشی پر گھمنڈ کر کے نتیجہ کی بدبختی پر مذاق اڑانے سے ڈراتی اور باز رکھتی ہے۔

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا
لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ هَٰذِهِ
نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً ۖ فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ ۖ وَلَا
تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٧٣﴾ وَاذْكُرُوا
إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِن بَعْدِ عَادٍ وَبَوَّأَكُمْ فِي الْأَرْضِ
تَتَّخِذُونَ مِن سُهُولِهَا قُصُورًا وَتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا ۖ
فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٧٤﴾
قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ لِلَّذِينَ
اسْتُضْعِفُوا لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ أَتَعْلَمُونَ أَنَّ صَالِحًا
مُّرْسَلٌ مِّن رَّبِّهِ ۚ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلَ بِهِ مُؤْمِنُونَ ﴿٧٥﴾
قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا بِالَّذِي آمَنتُم بِهِ كَافِرُونَ ﴿٧٦﴾
فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوا يَا صَالِحُ ائْتِنَا

بِمَا تَعِدُنَا اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٧٧﴾ فَاَخَذَتْهُمُ
الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٧٨﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ
وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ
وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿٧٩﴾

اور قوم ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی حضرت صالح علیہ السلام کو رسول بنا کر روانہ کیا[۹۸]۔ حضرت صالح نے فرمایا اے میری قوم کے لوگو اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں[۹۹]۔ دیکھو تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل تمہارے سامنے آچکی ہے یہ خدا کے نام پر چھوڑی ہوئی اونٹنی تمہارے لیے ایک فیصلہ کن نشانی ہے پس اسے کھلا چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں جہاں چاہے چرے اسے کسی طرح کا نقصان نہ پہنچاؤ کہ اس کی پاداش میں جانکاہ عذاب تمہیں پکڑے[۱۰۰]۔ اور وہ وقت یاد کرو

کہ خدا نے تمہیں قوم عاد کے بعد اس کے جانشین بنایا اور اس نے زمین میں اس طرح بسایا کہ میدانوں سے محل بنانے کا کام لیتے ہو، اور پہاڑوں کو بھی تراش کر اپنا گھر بنا لیتے ہو، پس اللہ کی نعمتیں یاد کرو اور ملک میں سرکشی کرتے ہوئے خرابی نہ پھیلاؤ[101]۔ قوم کے جن سربرآوردہ لوگوں کو اپنی دولت وطاقت کا گھمنڈ تھا۔ انہوں نے مومنوں سے کہا اور یہ اُن لوگوں میں سے تھے جنہیں کمزور حقیر سمجھتے تھے۔ کیا تم نے سچ مچ معلوم کر لیا ہے کہ صالح خدا کا بھیجا ہوا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں بے شک جس پیام حق کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے ہم اس پر پورا یقین رکھتے ہیں اس پر گھمنڈ کرنے والوں نے کہا تمہیں جس بات کا یقین ہے ہمیں اس سے انکار ہے[102]۔ غرض کہ انہوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی، انہوں نے کہا اے

صالح اگر تم واقعی پیغمبروں میں سے ہو تو اب وہ بات ہم پر لا دکھاؤ جس کا تم نے ہمیں خوف دلایا تھا۔[۱۰۳] پھر ایسا ہوا کہ لرزا دینے والی ہولناکی نے انہیں آلیا اور جب ان پر صبح ہوئی تو گھروں میں اوندھے منہ پڑے تھے۔[۱۰۴] پھر صالح ان سے کنارہ کش ہو گئے اور فرمایا اے میری قوم کے لوگو میں نے اپنے پروردگار کا پیام تمہیں پہنچایا اور نصیحت کی مگر افسوس تم پر کہ تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے ہو۔[۱۰۵]

معانی مفردات

عقروا (۱) انہوں نے کونچیں کاٹ دیں۔ عقر سے ماضی کا جمع مذکر غائب۔ کونچیں کہتے ہیں پاؤں کے پٹھوں کو جو پیچھے کی طرف ایڑی کے پاس ہوتے ہیں۔ عرب میں دستور تھا کہ اونٹ کو حلال کرنا ہوتا تو پہلے اس کی کونچیں کاٹتے تاکہ بھاگ نہ جائے۔ پھر اس کو نحر کرتے فیومی نے مصباح میں لکھا ہے کہ عقر کا استعمال صرف کونچیں کاٹنے کے لیے ہوتا ہے اور کبھی کبھی نحر کے معنے میں بھی آتا ہے۔ ازہری نے اس کی وجہ بھی یہی لکھی ہے کہ چونکہ نحر عام طور پر عقر کے بعد ہی ہوا کرتا ہے۔ اسی لیے اس سے نحر کرنا بھی مراد لے لیتے ہیں۔ جاثمین (۲) اوندھے منہ پڑنے والے زانو کے بل گرنے والے۔ جثوم سے جس کے معنے سینہ کے بل اوندھے منہ زمین پر پڑنے کے ہیں۔ اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر جاثم کی جمع۔ رجفۃ (۳) زلزلہ، بھونچال، کپکپی،

لرزش۔ اسم ہے۔ رسالۃ، پیغام ارسال ہے جس کے معنے بھیجنے کے ہیں اسم ہے۔ رسالت کی شرعی تعریف علامہ سعدالدین تفتازانی نے ان میں کی ہے۔

رسالت اللہ تعالیٰ اور اس کی ہوش مند مخلوق کے درمیان بندہ کی سفارت ہے تاکہ اس کے ذریعے ان کی ان بیماریوں کو زائل کر دیا جائے کہ جن میں ان کی عقلیں دُنیا و آخرت کی مصلحتوں سے عاجز ہو چکی ہیں۔

تاریخ کی ایک اور شہادت

ثمود حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کا نام ہے لفظ ثمود کو بعض عجمی کہتے ہیں اور بعض عربی۔ اور چونکہ یہ قبیلہ کا نام ہے اس لیے غیر منصرف پڑھتے ہیں۔ عربی ہونے کی صورت میں یہ ثمد سے مشتق ہے ثمود بروزن فعول ہے۔ ثمد اس تھوڑے سے پانی کو کہتے ہیں جو گڑھے میں جمع ہو جاتا ہے۔ سردی میں باقی رہتا ہے اور گرمی میں سوکھ جاتا ہے۔ ابوعمرو بن العلاء نے جو لغت و عربیت کے امام ہیں تصریح کی ہے:۔

چونکہ اس قوم میں پانی کی کمی تھی۔ اس لیے وہ ثمود کے نام سے موسوم ہوئی۔ ثمد تھوڑے پانی کو کہتے ہیں ان کی آبادیاں حجر میں حجاز و شام کے درمیان وادی القریٰ تک واقع تھیں۔

قاضی بیضاوی ثمود کی وجہ تسمیہ یہ بیان کرتے ہیں:

اپنے مورث اعلیٰ ثمود بن عابر بن ارم بن سام بن نوح کے نام پر پوری قوم کا نام پڑ گیا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی تحقیق اس موضوع پر بالکل منفرد ہے وہ فرماتے ہیں؛

ثمود کی لفظی تحقیق شاید عربی میں صحیح نہ مل سکے۔ ثمد عربی زبان میں تھوڑے پانی کو کہتے ہیں لیکن اس سے کوئی مناسبت معلوم نہیں ہوتی ہے۔ عبری میں ایک لفظ تامید ہے جس کے معنے دائم اور خالد کے ہیں۔ عربی کی ث اور عبری کی ت ایک چیز ہے۔ عبری زبان میں ث نہیں ہے اس لیے اکثر وہ الفاظ جو عربی میں ث سے ہیں عبری میں ت سے ہیں۔ اس بنا پر ثمود کے معنے عام سامی زبان میں وہی

ہوں گے جو عربی میں خالد کے ہیں اور بہت قبائل عرب کے نام ہیں۔

(ارض القرآن)

قوم ثمود سامی اقوام ہی کی ایک شاخ ہے۔ سامی اقوام کو عرب مؤرخین امم بائدہ (ہلاک شدہ قومیں) کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ انقلابات و حوادث کی نذر ہو کر فنا ہو گئیں۔ اور عرب عاربہ بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ عرب کے خالص النسل باشندے تھے جن میں غیر قوموں کا پیوند نہیں لگا تھا۔ اور بعض یہودیوں کی غلط اتباع میں ان کو عمالقہ بھی کہتے ہیں۔ امم بائدہ یا عرب عاربہ کا سلسلہ نسب تمام مؤرخین کے بیان کے مطابق ارم بن سام بن نوح پر ختم ہوتا ہے۔

تحقیقات جدیدہ یعنی اکتشافات عصریہ اور قدیم تاریخ دونوں اس پر متفق ہیں کہ عرب کے قدیم باشندے یعنی امم سامیہ بڑی پرشکوہ اور باعظمت قومیں تھیں۔ جنہوں نے بابل اسیریا، مصر و شام اور قرطاجنہ میں بڑی بڑی متمدن حکومتیں قائم کیں۔ اور مدت دراز تک ان ممالک کو اپنے زیرنگیں رکھا۔ عرب مؤرخین ان ہی امم سامیہ کو عرب بائدہ، یا عرب عاربہ اور ان کے مختلف قبیلوں کو عاد ثمود طسم و جدیس کہتے ہیں۔ اندرون عرب حضر موت سے سواحل خلیج فارس کے طول میں عراق تک عاد حجاز سے حدود سینا تک ثمود یمامہ میں طسم و جدیس اور یمن میں اہل معین حکمران تھے۔ ثمود کا دور کمال ہلاکت عاد اولیٰ کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔

۹۸۔ اور قوم ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح علیہ السلام کو رسول بنا کر روانہ کیا۔ حضرت صالح علیہ السلام کی بعثت قوم ثمود کی طرف ہوئی۔ قوم ثمود کون ہے کہاں ہوئی ہے اور کس زمانے میں ہوئی ہے۔ پہلے سوال کا جواب آپ تمہید میں پڑھ چکے ہیں۔ دوسرے سوال یعنی یہ لوگ کہاں آباد تھے اور کس خطہ میں پھیلے ہوتے تھے۔ اس کے متعلق یہ طے شدہ امر ہے کہ ان کی آبادیاں حجر میں تھیں، حجاز اور شام کے درمیان وادی قریٰ تک جو میدان نظر آتا ہے یہ سب ان کا مقام سکونت ہے اور آج کل فج الناقہ کے نام سے مشہور ہے۔ ثمود کی بستیوں کے کھنڈرات اور آثار آج تک موجود ہیں اور اس زمانے میں بھی بعض مصری محققین نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ وہ ایک ایسے مکان میں داخل ہوتے جو شاہی حویلی تھی۔ اس میں متعدد کمرے ہیں اور اس حویلی کے ساتھ ایک بہت بڑا حوض ہے اور یہ پورا مکان پہاڑ کاٹ کر بنایا گیا ہے۔

عرب کا مشہور مورخ مسعودی لکھتا ہے "جو شخص شام سے حجاز کو آتا ہے اس کی راہ میں ان کے مٹے نشانات اور بوسیدہ کھنڈرات پڑتے ہیں۔"

حجر کا یہ مقام موجودہ زمانے میں مدینہ اور تبوک کے درمیان حجاز ریلوے پر ایک سٹیشن پڑتا ہے جسے مدائن صالح کہتے ہیں یہی ثمود کا صدر مقام تھا اور زمانہ قدیم میں حجر کہلاتا تھا۔ اب تک وہاں ہزاروں ایکڑ کے رقبہ میں وہ سنگین عمارتیں موجود ہیں۔ نزول قرآن کے زمانے میں حجاز کے تجارتی قافلے ان آثار قدیمہ کے درمیان سے گزرتے تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کے موقعہ پر جب ادھر سے گزرے تو آپ نے مسلمانوں کو یہ آثارِ عبرت دکھاتے اور وہ سبق دیا جو ہر صاحب بصیرت انسان کو حاصل کرنا چاہیے ایک جگہ آپ نے ایک کنویں کی نشاندہی کر کے بتایا کہ یہی وہ کنواں ہے جس سے حضرت صالح کی اونٹنی پانی پیتی تھی۔ اور مسلمانوں کو ہدایت کی صرف اسی کنویں کا پانی لینا باقی کنوؤں کا پانی نہ پینا۔ ایک پہاڑی درے کو دکھا کر آپ نے بتایا کہ اسی درّے سے وہ اونٹنی پانی پینے کے لیے آتی تھی۔ ان کھنڈروں میں جو مسلمان گھوم رہے تھے ان کو آپ نے جمع کیا اور بتایا کہ یہ اس قوم کا علاقہ ہے جس پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا لہٰذا یہاں سے جلدی گزر جاؤ یہ تفریح گاہ نہیں بلکہ عبرت کی جگہ ہے۔

رہا ثمود کے زمانہ کا سوال سو اس کے متعلق کوئی فیصلہ کن منضبط وقت نہیں بتایا جا سکتا اس لیے کہ تاریخ اس بارے میں غیر مطمئن ہے۔ البتہ یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کا زمانہ ہے۔ قوم عاد کے بعد یہ قوم ہوئی ہے۔ زمانہ جاہلیت کے اشعار اور خطبوں میں بکثرت ان کا ذکر ملتا ہے۔ اسیریا کے کتبات اور یونان اسکندریہ اور روم کے قدیم مورخین اور جغرافیہ نویس اس کا ذکر کرتے ہیں۔ مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے تک اس قوم کے کچھ بقایا موجود ہے چنانچہ مورخین کا بیان ہے کہ یہ لوگ رومن افواج میں بھرتی ہوئے اور نبطیوں کے خلاف لڑے۔

حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت

۹۹۔ حضرت صالح نے فرمایا اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ ثمود بھی اپنے پیشرو عاد کی طرح خدا کے منکر نہ تھے بلکہ خدا کو مان کر اس کی عبادت میں دوسرے معبودوں کو شریک کرتے تھے اور یہی ساری بیماریوں کی جڑ ہے اس لیے حضرت صالح نے اللہ کی توحید عبادت سے دعوت و اصلاح کا آغاز کیا۔ آپ نے قوم کی نبض پر ہاتھ رکھا اور ان کے لیے توحید عبادت کی دوا تجویز کی اور معبودانِ باطل کے انکار کی تلقین فرمائی اور طاغوت کی

نافرمانی کی ہدایت فرماتی لوگوں میں کھڑے ہو کر آپ نے بآواز بلند فرمایا اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ
قوم نے اس دعوت اور اس کے مقاصد کے سمجھنے میں غلطی نہیں کی اور اس میں کچھ پیچیدگی محسوس نہیں ہوتی جیسے ہی آپ کی آواز سے سننے والوں کے کان آشنا ہوتے وہ اچھی طرح سمجھ گئے کہ یہ یگانہ خدا کی عبادت کی دعوت ایسا تیر ہے جو شرک کے نشانہ پر بیٹھ جائے گا اور جگر کے پار ہو جائے گا۔ خطرہ کے احساس سے شرک کی کڑھائی میں ابال آیا۔ مشرکانہ زندگی کے سورما آخری معرکہ کے لیے میدان میں طاقت کے نشہ میں مخمور ہو کر آگئے۔ اسی مشرکانہ زندگی کے ہر رکن نے محسوس کیا کہ مشرکانہ تہذیب کی عمارت متزلزل ہے اور پورا نظام زندگی خطرے میں ہے اس موقع پر جبر و ستم کے وہ واقعات پیش آئے جن کی طرف آگے قرآن اشارات کر رہا ہے۔ لیکن حضرت صالح اپنی دعوت پر پہاڑ کی طرح جمے رہے۔ مخالفت کے طوفان اٹھے، فتنہ کی آندھیاں آئیں مگر آپ نے اپنی جگہ سے ذرا جنبش نہ کی اور آپ کی یہی صدا آرہی تھی اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ۔
آپ پوری صراحت کے ساتھ اللہ کی عبادت کی دعوت دیتے رہے اور مشرکانہ اطوار کی برملا تردید کرتے رہے۔ آپ نے اس کے لیے ذرا بھی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہیں کیا نہ مخالفوں کی ادنیٰ رعایت کی نہ وقت کی مصلحت کے لیے اپنی دعوت میں لوچ اور لچک گوارا کی۔ اسی دعوت کو ہر مرض کی دوا اور ہر بند قفل کی چابی سمجھا اور ایک لمحہ کے لیے کبھی آپ کو اس کے بارے میں ادنیٰ تذبذب نہیں ہوا۔

دعویٰ نبوت پر حضرت صالح کی دلیل

۱۰۰۔ دیکھو تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل تمہارے سامنے آچکی ہے۔ یہ خدا کے نام پر چھوڑی ہوئی اونٹنی تمہارے لیے ایک فیصلہ کن نشانی ہے بس اسے کھلا چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں جہاں چاہے چرے، اسے کسی طرح کا نقصان نہ پہنچاؤ کہ اس کی پاداش میں جانکاہ عذاب تمہیں پکڑے۔ یعنی جو دلیل تم مانگ رہے تھے وہ آگئی۔ صالح علیہ السلام کی قوم نے ان سے قول و قرار کیا تھا کہ آپ پتھر کی ایک ٹھوس چٹان میں سے حاملہ اونٹنی نکال دیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ خدا نے حضرت صالح کی دعا سے ویسا ہی کر دیا، ان کو کہا جا رہا ہے کہ تمہارا فرمائشی معجزہ تو خدا نے دکھلا دیا اب ایمان لانے میں کیا تامل ہے۔ فرمایا کہ یہ اونٹنی خدا کی قدرت اور میری صداقت کی نشانی ہے جو میری دعا پر غیر معتاد طریقہ سے خدا نے

پیدا کی اس کے حقوق کی رعایت کرو۔ مثلاً خدا کی زمین مباح گھاس کھانے اور اس کی باری میں پانی پینے سے نہ روکو۔ غرض خدا کے اس نشان کے ساتھ جو تم نے خود مانگ کر حاصل کیا ہے برائی سے پیش مت آؤ ورنہ تمہاری بھی خیر نہیں ہے[1]

اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ یہ اونٹنی حضرت صالح علیہ السلام کی صداقت کا نشان بنا کر بطور اعجازی شاہکار پیش کی گئی اور سورہ شعراء کی آیت ۱۵۴ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالح کی قوم نے حضرت صالح سے خود ایک ایسی نشانی کا مطالبہ کیا تھا جو ان کے خدا کا پیغمبر ہونے کی کھلی دلیل ہو۔ ارشاد ہے فات باٰیۃ ان کنت من الصادقین قال ھذہٖ ناقۃ لھا شرب ولکم شرب یوم معلوم ۔ اگر سچے ہو تو کوئی نشانی پیش کرو۔ حضرت صالح نے فرمایا کہ اونٹنی ہے ایک اس کے پانی پینے کی باری ہے اور ایک روز میں تمہاری باری ہے۔ اس سے یہ بات تو بالکل بے غبار ہو کر سامنے آتی ہے کہ اونٹنی کا ظہور ہی اپنے اندر کوئی شان اعجاز رکھتا تھا۔ نیز یہ بات بھی اس اونٹنی کی اعجازی پیدائش کی نشاندہی کرتی ہے کہ حضرت صالح نے اسے پیش کر کے یہ دھمکی دی کہ اس اونٹنی کے ساتھ تمہاری زندگی وابستہ ہے ولا تمسوھا بسوء فیاخذکم عذاب الیم۔ اور پھر یہ بات کہ اونٹنی کے آزادانہ چرنے پھرنے اور باری کے ساتھ ایک دن پانی پینے کو بادل نخواستہ برداشت کرتے رہے اور آخر بڑے مشوروں اور سازشوں کے بعد انہوں نے اسے قتل کیا۔ حالانکہ حضرت صالح کے پاس کوئی طاقت نہ تھی جس کا انہیں کوئی خوف ہوتا۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ لوگ اس اونٹنی سے خوفزدہ تھے اور جانتے تھے کہ ضرور اس کی پشت پر کوئی طاقت ہے۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں مگر قرآن عزیز سے اس سلسلے میں صرف دو باتیں ثابت ہیں ایک کہ ثمود نے حضرت صالح سے ان کی صداقت کی نشانی مانگی اور حضرت صالح نے ناقہ کو بطور نشانی پیش فرمایا۔ دوسرے یہ کہ حضرت صالح نے قوم کو یہ ہدایت کی تھی کہ وہ اس کو ضرر نہ پہنچائیں اور پانی کی باری مقرر کر لیں۔ اگر اس کو نقصان ہوا تو یہی قوم کی ہلاکت کی نشانی ہو گی۔

اس سے زائد جو کچھ ہے اس کا مدار ان روایات پر ہے جو اخبار آحاد کے درجے میں شمار ہوتی ہیں اور یا پھر اسرائیلیات اور تاریخ قدیم کی روایات ہیں۔ اخبار آحاد کی حد تک ان میں محدثین کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نزدیک بعض صحیح روایات ہیں اور بعض ضعیف ہیں۔ اس موقعہ پر حافظ عماد الدین ابن کثیر نے ناقۃ اللہ کے وجود میں آنے کی روایات کو اسنادی اصول کے مطابق نقل نہیں فرمایا بلکہ ایک تاریخی واقعہ کی تحریر فرمایا ہے۔

واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ قوم ثمود جب حضرت صالح کی تبلیغ حق سے اکتا گئی تو اس کے سرخیل اور سرگروہ افراد نے قوم کی موجودگی میں مطالبہ کیا کہ اے صالح اگر تو واقعی خدا کا فرستادہ ہے تو کوئی نشانی دکھا تاکہ ہم تیری صداقت پر ایمان لے آئیں۔ حضرت صالح نے فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ نشان آنے کے بعد بھی انکار پر مصر اور سرکشی پر قائم رہو۔ قوم کے ان سرداروں نے بتاکید وعدہ کیا کہ ہم فوراً ایمان لے آئیں گے تب حضرت صالح نے ان ہی سے دریافت کیا کہ وہ کس قسم کا نشان چاہتے ہیں۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ سامنے والے پہاڑ میں سے یا بستی کے اس پتھر میں سے جو کنارہ پر نصب ہے ایک ایسی اونٹنی ظاہر کر کہ جو گابھن ہو اور فوراً بچہ دے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے درگاہِ الٰہی میں دعا کی اور اسی وقت ان سب کے سامنے پہاڑ یا پتھر میں سے حاملہ اونٹنی ظاہر ہوئی اور اس نے بچہ دیا۔ یہ دیکھ کر ان سرداروں میں سے جندع بن عمرو تو اسی وقت مشرف باسلام ہو گیا۔ اور دوسرے سرداروں نے بھی جب اس کی ہمنوائی کا ارادہ کیا تو ان کے ہیاکل اور منادر کے مہنتوں نے ان کو اس سے روکا اور اس طرح باقی دوسروں کو قبول اسلام سے منع کیا۔ اب حضرت صالح نے قوم کے تمام افراد کو تنبیہہ کی کہ دیکھو یہ نشانی تمہارے مطالبہ پر آئی ہے۔ اللہ سبحانہ، کا فیصلہ یہ ہے کہ پانی کی باری مقرر ہو۔ خبردار اسے کوئی ازار نہ پہنچے۔ اگر اسے کوئی ازار پہنچا تو تمہاری خیر نہیں ہے۔

لوگوں نے اس حیرت زا معجزے کو دیکھ کر اگرچہ ایمان قبول نہیں کیا لیکن دلوں کے اقرار نے اس کو آزار پہنچانے سے باز رکھا۔ اور یہ دستور جاری رہا کہ پانی کی باری ایک روز اونٹنی کی رہتی اور دوسرے روز قوم کی۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ بات ان کو کھٹکنے لگی اور باہم صلاح مشورے کرنے لگے کہ اس ناقہ کا کسی طرح کام تمام کر دیا جائے۔ مگر کسی کو اس کے قتل کرنے کی ہمت نہ ہوتی حتیٰ کہ ایک حسین وجمیل عورت صدوق نے خود کو ایک شخص مصدع کے سامنے اور ایک مالدار عورت نے اپنی ایک خوبصورت لڑکی کو قیدار کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا کہ اگر وہ ناقہ کو مار دیں تو یہ دونوں تمہاری ہیں۔ آخر قیدار اور مصدع اس کے لیے تیار ہو گئے اور طے پایا کہ راستہ میں چھپ کر بیٹھ جائیں۔ جب ناقہ چراگاہ جائے تو اس پر حملہ کر دیں۔

اس منصوبہ کے تحت ناقہ کو مار ڈالا اور پھر باہم ملکر قسمیں کھائیں کہ رات ہونے پر حضرت صالح اور ان کے اہل و عیال کو بھی مار دیں گے۔ اونٹنی کا بچہ بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گیا اور وہیں غائب ہو گیا۔ صالح علیہ السلام کو جب اس کی خبر ہوئی تو حسرت و افسوس کے ساتھ لوگوں سے کہا کہ آخر وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا۔ اب خدا کے عذاب کا انتظار کرو جو تین دن کے بعد تمہیں تباہ کر دے گا۔

اس پوری تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ قرآن عزیز سے یہ تو یقین کے ساتھ ثابت ہے کہ ناقۃ اللہ خدا کی ایک نشانی تھی اور اپنے اندر ضرور کوئی ایسی خصوصیت رکھتی تھی جس کی وجہ سے وہ ایسا نشان کہلا سکے جس کا ذکر قرآن عزیز اس اہمیت کے ساتھ کر رہا ہے ھذہ ناقۃ اللہ لکم آیۃ یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے نشانی ہے۔ مزید یہ کہ پانی کی باری جس طرح ناقہ اور قوم ثمود کے درمیان تقسیم فرمائی وہ خود مستقل دلیل ہے اس بات کی کہ ناقہ ضرور اپنے اندر کوئی ایسی حیثیت رکھتی تھی جس سے وہ نشانِ الٰہی کہلا سکے لیکن یہ بات کہ ناقہ کیسے وجود میں آئی۔ قرآن اس سے ساکت ہے۔ البتہ مختلف صحیح احادیث سے اس واقعہ پر ضرور روشنی پڑتی ہے مگر واقعہ کی تفصیل صراحت و وضاحت احادیث صحیحہ میں بھی موجود نہیں ہے بلکہ کتبِ تفسیر میں اسرائیلی روایات کی مدد سے بیان ہوئی ہے یا اس کا ماخذ ضعیف روایات ہیں اس لیے واقعہ کے اجمال و تفصیل میں فرقِ مراتب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ واقعہ کے جن اجزاء کے بارے میں قرآنی تصریح موجود ہے۔ وہ بغیر کسی تاویل کے واجب الاعتقاد ہے اور جس قدر صحیح روایات سے اگرچہ وہ آحاد ہی کے درجہ کی ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل سے پتہ چلتا ہے وہ اجمال کی تفصیل کی حیثیت سے قابلِ قبول ہیں اور اس سے زیادہ باقی تفصیلات کی حیثیت وہی ہے جو عام تاریخی وقائع اور اسرائیلی روایات کی ہے۔ یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اگر قرآن کی تصریح ہے کہ یہ اللہ کی اونٹنی ہے تمہارے لیے معجزہ ہے تو پھر اونٹنی میں اعجازی شان کیا ہے۔ کچھ علماء کی رائے تو یہی ہے کہ اونٹنی کا حضرت صالح کی دُعا سے پتھر کی چٹان سے پیدا ہونا معجزہ ہے۔ روایات کی حیثیتِ تاریخی کچھ ہو وہ اس خیال کی موید ہیں اور قرآن میں واقعہ کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس کے اشارات کا مقتضا بھی یہی ہے لیکن کچھ علماء اس اعجاز کو دوسری طرح بیان کرتے ہیں مثلاً

سید صاحب فرماتے ہیں:

> عام روایات میں ہے کہ یہ اونٹنی مع اپنے بچہ کے کفار کے مطالبہ پر حضرت صالح علیہ السلام کے معجزے سے ایک پہاڑ کی چٹان سے پیدا ہوئی تھی لیکن صحیح طریقہ

سے یہ روایتیں ثابت نہیں - قرآن مجید نے اپنی تمام تفصیل میں اس خاص طریقہ پیدائش کا ذکر نہیں کیا۔ اس بنا پر وہ غیر مسلم ہیں - قرآن مجید کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم جانوروں پر ظلم کرتی تھی۔ خدا نے ایک اونٹنی کو نشانی بنایا کہ جس دن تم نے اس کو ستایا وہی عذاب کا دن ہوگا۔ ثمود کی ایک پہاڑی کا نام عربوں میں فج الناقہ ہے۔ بطلیموس نے اس مقام کو یونانی تلفظ میں بنڈاناٹا لکھا ہے۔ اس تسمیہ سے نفس اونٹنی کے واقعہ کا ثبوت قرآن سے ...بیشتر ملتا ہے -

مولانا آزاد فرماتے ہیں :

پالتو جانوروں کو خدا کے نام پر چھوڑ دینے کا طریقہ بہت قدیم ہے۔ بابل اور ہندوستان میں اس کا سراغ ہزاروں برس پیشتر تک ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود کے لوگ بھی اپنے بتوں کے نام پر جانور چھوڑ دیا کرتے تھے۔ حضرت صالح نے خدا کے نام پر ایک اونٹنی چھوڑ دی اور اسی معاملہ میں قوم کے لیے اتباعِ حق کی آزمائش ہوگئی۔ اگر وہ اونٹنی کو ضرر نہ پہنچاتے تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا کہ ان کے دل ہدایت کے آگے جھک گئے ہیں مگر ان کے اندر خدا پرستی کے خلاف ایسی ضد اور شرارت پیدا ہوگئی تھی کہ اتنی سی بات بھی نہ مان سکے اور اونٹنی کو زخمی کرکے ہلاک کر دیا۔

اور مولانا اصلاحی فرماتے ہیں ،

قرآن کے الفاظ سے یہ بات کہیں نہیں نکلتی کہ یہ اونٹنی اپنی خلقت کی اعجوبگی کے پہلو سے کوئی نشانی تھی بلکہ ولا تمسوھا بسوء فیاخذکم عذاب الیم سے صاف واضح ہے کہ وہ گزند پہنچائے جانے کے انجام اور نتیجہ کے اعتبار سے نشانی تھی۔ جہاں تک علم ہے اس اونٹنی کا کسی پہاڑ یا پہاڑی سے پیدا ہونا کسی صحیح حدیث میں بھی نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان تفسیری روایات کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں ہے جن میں بیان ہوا ہے کہ یہ اونٹنی ایک پہاڑ سے پیدا ہوئی تھی۔ آیت کے معنے نشانی اور علامت کے ہیں۔ یہ اونٹنی قوم کے مطالبہ عذاب کے جواب میں جیسا کہ ہم نے عرض کیا ایک نشانی عذاب کی حیثیت سے نامزد کی گئی تھی۔ چنانچہ قرآن میں تصریح ہے کہ جب ثمود کے لیڈر نے اس کی کونچیں کاٹ دیں تو اس کے تیسرے دن عذاب الٰہی آگیا۔ یہ واقعہ قرآن کے جستہ جستہ مختلف سورتوں میں بیان ہوا ہے۔

یہ ان بزرگوں کے خیالات ہیں۔ اس صورت میں اونٹنی صرف قوم ثمود کے لیے ایک آزمائشی پرچہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں حضرت صالح کی نبوت کے لیے اعجاز کا کوئی پہلو نہیں رہتا ہے۔ حالانکہ ثمود نے حضرت صالح سے ان کی صداقت کی دلیل طلب کی تھی فات بایۃ ان کنت من الصادقین اور اس مطالبہ کے جواب میں آپ نے فرمایا ھذہ ناقۃ اللہ لکم ایۃ اس سے یہ بات کھلے طور پر سامنے آتی ہے کہ اونٹنی کا ظہور بطور ایک اعجازی شاہکار کے ہوا ہے۔ اس میں اور دوسرے انبیاء کے معجزات کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں ہے اور قرآن کی صراحت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالح نے اونٹنی کو پیش کر کے اپنے مخاطبوں کو یہ چیلنج بھی دیا ہے ولا تمسوھا بسوء فیاخذکم عذاب الیم ظاہر ہے کہ چیلنج بھی اسی چیز کا دیا جا سکتا ہے جس کا خرقِ عادت ہونا لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اور قرآن ہی سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ ایک کافی مدت تک لوگ اس کے آزادانہ چرنے چھرنے کو اور اس بات کو کہ ایک دن وہ تنہا پانی پیئے اور دوسرے روز سب کے جانور پانی پئیں باول نخواستہ برداشت کرتے رہے۔ اور آخر بڑے مشوروں کے بعد انہوں نے اسے قتل کیا۔ اگر اس کی تخلیق کوئی معجزانہ تخلیق نہ تھی تو اس میں اس اہتمام کے لیے کیا داعیہ تھا بلاشبہ تخلیقی اعجاز کی وجہ سے وہ اس اونٹنی سے خوفزدہ تھے اور جانتے تھے کہ اس کے پیچھے ضرور کوئی غیبی طاقت ہے۔ اگرچہ قرآن میں اس کی تصریح نہیں ہے کہ اس اونٹنی کی تخلیق کیسے ہوئی لیکن قرآن کے اشارات بتا رہے ہیں کہ اس کی تخلیق اعجازی ہے۔ بے شک اس موضوع پر روایات جو آئی ہیں وہ محدثانہ اصول پر پوری نہیں اترتی ہیں لیکن یہ بات کہ اونٹنی حضرت صالح علیہ السلام کا اعجازی شاہکار ہے۔ قرآن سے ثابت ہے۔ اور تاریخ میں اہل عرب ثمود کی ایک پہاڑی کو فج الناقہ کے نام سے پکارتے ہیں اور بقول سید صاحب بطلیموس نے اس فج الناقہ کا اپنے جغرافیہ میں ذکر کیا ہے بلکہ بقول مولانا دریابادی انگریز مترجم ڈاکٹر سیل نے فرنگی سیاحوں کے مشاہدے کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جس پہاڑی سے وہ اونٹنی بطور خرقِ عادت پیدا ہوئی تھی اس میں اب تک ایک سو ساٹھ فٹ کا شگاف موجود ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی میں اس اونٹنی میں اعجاز کا پہلو یہ بھی بتایا ہے کہ اونٹنی تمام چشمہ یا کنویں کا پانی پی جاتی تھی۔ یعنی سارا پانی پی جانا گویا ایک اعجاز تھا چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

حضرت صالح کی امت نے حضرت صالح سے ایک نشانی طلب کی۔ انہوں نے کہا کہ میری اونٹنی تمہاری نشانی ہے جو ایک دن میں ان کے چشمہ یا کنویں کا تمام پانی پی جاتی تھی اور دوسرے دن ان کے جانوروں کو پانی ملتا تھا۔ لیکن اس نشانی کو دیکھ کر کہ اونٹنی تمام

چشمہ یا کنوئیں کا پانی پی جاتی ہے انہیں تسکین نہ ہوتی اور اس اونٹنی کو مار ڈالا۔[1]

حالانکہ قرآن نے اونٹنی کے ایک روز پانی پینے کو بطورِ اعجاز پیش نہیں کیا۔ اگر اونٹنی کا پانی پینا معجزہ ہے تو پھر تاکل فی الارض کی وجہ سے اس کا آزادانہ چرنا بھی معجزہ ہوگا۔ یہ تو اس کے اوصاف ہیں اور یہ اوصاف اسی وقت متصور ہو سکتے ہیں جب اس کی تخلیق اعجاز ہو۔ اسی اعجاز کی بنا پر اس کے بارے میں یہ حکم ہوا ہے ولا تمسوھا بسوء فیاخذکم عذاب الیم۔ بہرحال ہمیں قرآن کا مطالعہ نہ تو اس طرح کرنا چاہیے کہ اسے عجائب پرستیوں کی داستان بنانے کے خواہشمند ہوں نہ عجائب پرستی کے الزام سے بچنے کے لیے اس درجہ بے چین ہونا چاہیے کہ ہر بے محل سے بے محل توجیہ قبول کر لیں۔ قرآن عربی زبان میں ہے۔ تمام زبانوں کی طرح عربی میں بھی اسلوب بیان کے معین اور قطعی دلالات ہیں۔ اس لیے جو بات صاف اور واضح ہو اسے قبول کر لینا چاہیے۔ اگر بہ تکلف ایک مطلب آپ اس کے منہ میں ڈال دیں گے جسے خود اس کی زبان قبول نہیں کرتی تو یہ حقیقت نہ ہوگی۔

باقی رہا یہ سوال کہ یہ اور اس طرح کے دوسرے معاملات کیونکہ عقلاً تسلیم کیے جا سکتے ہیں تو ہم اس پر تفصیلی بحث انشاءاللہ بارہویں جلد میں کریں گے۔ اور بتائیں گے کہ معجزہ کی اصلی حیثیت کیا ہے۔

ناقۃ اللہ میں ناقہ کی اضافت اللہ کی طرف ایسی ہے جیسے بیت اللہ میں بیت کی اضافت اللہ کی جانب یعنی تشریف و تعظیم اور تخصیص کے لیے ہے۔ جس طرح بیت اللہ کو ایک نشان قرار دیا گیا ہے کہ جو اسے برباد کرنا چاہے گا وہ خود برباد کر دیا جائے گا۔ ایسے ہی یہاں فرمایا ہے کہ جو کوئی اس سے تعرض کرے گا وہ عذابِ الٰہی کو دستک دے گا۔ اسی معنے کے لحاظ سے خانہ کعبہ کو قیاماً للناس، مبارک اور ہدی للعالمین فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کعبہ کا وجود کل عالم کے قیام وبقاء کا باعث ہے دُنیا کی آبادی اسی وقت تک ہے جب تک خانہ کعبہ اور اس کا احترام کرنے والی مخلوق موجود ہے جب تک اللہ سبحانہ، کو اس دُنیا کا نظام قائم رکھنا مقصود ہے کوئی طاقتور سے طاقتور قوم جس کا مقصد کعبہ کو منہدم کرنا ہو اپنے اس ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ بیت اللہ کی حیثیت پوری دُنیا کے حق میں وہی ہے جو ناقۃ اللہ کی حیثیت قوم ثمود کے حق میں تھی۔ اصحاب فیل کا قصہ تو ہر شخص نے سنا ہے۔ ان کے بعد بھی ہر زمانے میں کتنی قوموں نے اور شخصوں نے ایسے منصوبے تیار کیے ہیں، لیکن ناکام رہے ہیں۔ یہ محض خدائی حفاظت اور اسلام کی صداقت کا عظیم الشان نشان ہے اور

---

[1] سیرۃ النبی جلد سوم

اس کا حکم بھی ناقۃ اللہ کا ہے لا تمسوھا بسوء فیاخذکم عذاب الیم۔

قوم ثمود کی سیاسی اور معاشی حالت

۱۰۱۔ اور وہ وقت یاد کرو کہ خدا نے تمہیں قوم عاد کے بعد ان کا جانشین بنایا اور اس سرزمین میں اس طرح بسایا کہ میدانوں میں محل بنانے کا کام لیتے ہو اور پہاڑوں کو بھی تراش کر گھر بناتے ہو۔ اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور ملک میں سرکشی کرتے ہوتے خرابی نہ پھیلاؤ۔ یعنی احسان فراموشی اور شرک اور کفر کر کے زمین میں خرابی نہ پھیلاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قوم عاد جیسی متمدن، سرسبز ترقی یافتہ قوم کے بعد تہذیب و تمدن کا تمہیں مالک بنایا یہ مطلب نہیں کہ انہی کا ملک تمہیں دیا۔ عاد و ثمود دونوں کے مرکز بالکل جداگانہ تھے۔ عاد کا مستقر جنوب مشرقی عرب تھا اور ثمود کی جولانگاہ ترقی شمال مغربی عرب میں حجر کا علاقہ تھا۔ ان لوگوں کو وہاں بڑا عروج و اقتدار حاصل ہوا۔ ان کی بہت سی تعمیری یادگاریں آج بھی موجود ہیں۔ حضرت صالح نے ان کو جو عاد کی خلافت یاد دلائی اس کا مقصد ان کو اس پر متنبہ کرنا تھا کہ اپنے اقتدار کے نشہ میں خدا کے اقتدار کو نہ بھولو۔ اس نے جو معاملہ عاد کے ساتھ کیا وہی تمہارے ساتھ کرے گا وہ ایک ہی ترازو سے سب کے لیے تولتا ہے۔ یہ فقرہ ان کی سیاسی حالات کی غمازی کر رہا ہے۔ عاد کی طرح ان کی سیاسی قوت بے مثال تھی۔ قرآن نے سورہ نمل و مکن دامکسا کہہ کر بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ بھی قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سیاسی نظام نو پارٹیوں پر مشتمل تھا اور سب اپنی سیاسی اور انتظامی حیثیت میں شہری زندگی میں بگاڑ ہی بگاڑ پیدا کر رہے تھے۔ ان سیاسی عیاروں کو قرآن نے سورہ الشعراء میں مسرفین کہا ہے۔

لا تطیعوا امر المسرفین الذین یفسدون فی الارض ولا یصلحون۔
ان بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو ملک میں فساد بپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی سیاسی طاقت کے نشہ میں اخلاق کی ساری حدیں پھاند کر شتر بے مہار بن گئے تھے۔ قرآن نے یہاں اذ جعلکم خلفاء من بعد عاد و بوّأکم فی الارض کہہ کر اس صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کے بعد دوسرے فقرے میں ان کی مالیاتی اور معاشی

[1] افادات شیخ الاسلام

حالت کو بتایا ہے ارشاد ہے تتخذون من سھولھا قصورا و تنحتون الجبال بیوتا ان کی مالی اور معاشی برتری کا یہ حال تھا کہ میدانوں میں قصور و محلات ہی پر اکتفا نہ کرتے بلکہ پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر بھی مکان بناتے تھے۔ یہ عظمت تعمیر ان کی معاشی اور اقتصادی خوش حالی کی نشاندہی کر رہی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ معاشی اور مالی حیثیت سے اتنی خوش حال ہو وہ تمدنی اور تہذیبی اعتبار سے اپنے دور کی بہت بڑی ترقی یافتہ قوم ہوتی ہے۔ قرآن کی یہ معجزانہ بلاغت ہے کہ دو ہی فقروں میں پوری قوم کی مالی، معاشی، تہذیبی اور تمدنی ترقیوں کا سارا نقشہ پیش کیا۔ جس بات کو دو فقروں میں ادا کیا ہے دوسرے موقعہ پر قرآن میں اس سے زیادہ بلیغ لفظوں میں ایک ہی فقرے میں وا ستعمرکم کہہ کر سارے احوال و ظروف کی نقاشی کی ہے۔ لفظ استعمار میں وہ سب کچھ آگیا ہے جو یہاں بوأکم فی الارض تتخذون من سھولھا قصورا و تنحتون الجبال بیوتا۔ کے اسلوب میں پیش کیا ہے۔

حضرت صالح نے ثمود کی سیاسی، تمدنی اور معاشی برتری کے دلولوں پر عین ان کے دور عروج میں ماتم کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے بیگانہ تمدن خواہ وہ کتنا ہی ترقی کی منزلوں سے گزر چکا ہو قوم کے عروج کی نہیں بلکہ تمدن کے فساد کی دلیل ہے۔ جس تمدن کی بنیاد نبوت کے علم سے منہ موڑ کر ناخدا شناسی بلکہ خدا کی کھلم کھلا بغاوت پر قائم ہوگی۔ اس کی فلک بوس عمارتیں بالآخر اس کے عروج و کمال کے مقبرے اور مدفن بنتی ہیں اور ایک روز زاغ و زغن ان میں اپنے آشیانے بناتے ہیں۔

آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمدنی اور تعمیری ترقیاں منشا الٰہی کے خلاف ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت صالح ان کو اللہ کے انعامات کہہ کر یہ نہ فرماتے فاذکروا آلاء اللہ، بلکہ مطلب یہ ہے کہ نبوت سے رشتہ توڑ کر تمدن و تہذیب کی ترقی دیر سے یا جلدی قوم کی تباہی کا سامان ہوتی ہے۔ اگر یہی ترقیاں نبوت سے رشتہ جوڑ کر ہوں خواہ مکانات شیش محل کیوں نہ ہوں یہ بھی اللہ کی رحمت ہیں۔ حضرت سلیمان ملکہ بلقیس سے فرماتے ہیں۔

ادخلی الصرح فلما رأته حسبته لجۃ وکشفت عن ساقیھا قال انه صرح ممرد من قواریر۔

داخل ہو جا تو محل میں اس نے جو دیکھا تو سمجھی کہ پانی کا حوض ہے اور اپنے پائنچے اونچے کر لیے حضرت سلیمان نے فرمایا کہ یہ شیشہ کا چکنا فرش ہے۔

مطلب یہ ہے کہ نبوت کی قیادت میں تمدن کی اتنی ترقی کہ شیش محل تیار کیے جائیں۔ فرش

کو دیکھ کر پانی ہونے کا دھوکہ ہو مذموم نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ دنیوی علوم و فنون میں کمال بھی اللہ کی نعمتوں میں شمار ہوتا ہے اور انہیں مطلقاً ناجائز سمجھ لینا بہت بڑی زیادتی ہے۔ الجصاص نے تو سورہ ہود میں (استعمرکم) کے فقرے سے ثمود ہی کے واقعہ میں یہ نوٹ لکھ کر اس کی طرف رہنمائی کی ہے کہ

یہ آیت بتاتی ہے کہ زمین کی آبادکاری، کھیتی، باغبانی اور تعمیر کے ذریعے سے واجب ہے

اس کا مطلب یہی ہے کہ زمین کی عمارت یعنی آبادکاری خواہ زراعت کی صورت میں ہو یا باغبانی اور یا مکانوں کی تعمیر کی صورت میں ہو قرآن کی اس آیت کی بنیاد پر امام جصاص کے خیال میں صرف جائز یا سنت ہی نہیں بلکہ واجب اور فرضی عمل ہیں۔ گویا اس کام کی حیثیت وہی ہے جو نماز روزے کی ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ جو شخص عربی زبان کے طرزِ خطاب سے واقف ہے وہ الجصاص کے اس استدلال میں کوئی کمزوری نکال سکے۔

مذہب کے بارے میں آج کل جو خیالات پائے جاتے ہیں ان کو سامنے رکھ کر کون یقین کرے گا کہ اسلام نے مذاہب کی عام شاہراہ سے ہٹ کر انسان کو بتایا کہ جن مشاغل اور پیشوں کو عام طور پر دنیوی مشاغل میں شمار کیا جاتا ہے اسلام نے ان سب پر اخروی اجر و ثواب کو مرتب کر کے ان کو وہی مقام عطا کر دیا ہے جو عام دینی فرائض و عبادات کا سمجھا جاتا ہے۔ کہاں یہ نقطہ نظر کہ جو جس حد تک دنیوی کاروبار سے الگ ہو کر زندگی بسر کرے گا اسی حد تک خدا کے حضور میں بلندی حاصل کرے گا۔ اور کہاں یہ عقیدہ کہ دنیا کے مشغلوں میں انہماک اور ان کے ساتھ اشتغال ہی کو خدا کی خوشنودی اور قرب کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ بہرحال یہ ایک دوسرا موضوع ہے۔ اس کے لیے یہ محل نہیں ہے۔

آخر میں فرمایا ولا تعثوا فی الارض مفسدین اس سے معلوم ہوا کہ ثمود نے ملک میں ہر قسم کا فساد پھیلا رکھا تھا اس میں فکری فساد سے لے کر اخلاقی آوارگی، مالی بددیانتی، سیاسی مظالم، عدالتی بے انصافیاں، معاشی بے اعتدالیاں اور معاشرتی ناہمواریاں سب داخل ہیں۔ یہ تھا وہ مختصر اصلاحی منشور جو حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس میں صرف مذہبی تبلیغ ہی نہ تھی تمدنی، اخلاقی اصلاح اور سیاسی انقلاب کی دعوت بھی ساتھ ساتھ موجود تھی۔

نبوت کے منشور کا اقتدار کی جانب سے جواب

۱۰۲۔ قوم کے جن سربرآوردہ لوگوں کو اپنی طاقت و قوت کا گھمنڈ تھا انھوں نے مومنوں سے کہا اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں سربرآوردہ لوگ حقیر اور کمزور سمجھتے تھے کہ کیا تم نے سچ مچ معلوم کر لیا ہے کہ صالح خدا کا بھیجا ہوا ہے۔ انھوں نے کہا ہاں بے شک جس پیامِ حق کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے ہم اس پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ اس پر گھمنڈ کرنے والوں نے کیا تمہیں جس بات کا یقین ہے ہمیں اس سے انکار ہے۔ قوم میں جو بڑے بڑے متکبر اور سردار اور معاندین تھے وہ غریب اور کمزور مسلمانوں سے استہزاءً کہتے تھے کہ بڑے آدمی تو آج تک نہ سمجھے مگر تمہیں معلوم ہو گیا کہ صالح خدا کا فرستادہ ہے۔ مسلمانوں نے جواب دیا کہ معلوم ہونے کے کیا معنے معلوم تو تم کو بھی ہے ہاں دل سے قبول کر کے ہم ان پر ایمان لا چکے ہیں متکبرین اس حکیمانہ جواب سے کھسیانے ہو کر بولے کہ جس چیز کو تم نے مان لیا ہے ہم ابھی تک اسے نہیں مانتے پھر بھلا تمہارے جیسے چند خستہ حال آدمیوں کا ایمان لے آنا کون سی بڑی کامیابی ہے۔[۱]

انبیاء کی دعوت قبول کرنے میں پہل ہمیشہ غریبوں اور کمزوروں نے ہی کی ہے اس لیے کہ ان میں بڑائی اور کبر کی بُرائی نہیں ہوتی۔ کبر ہی وہ چیز ہے جو قبولِ حق میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کا شجرہ نسب ابلیس سے ملتا ہے بلکہ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے کہ روئے زمین پر سب سے پہلی خدا کی نافرمانی کبر ہی سے ہوئی ہے۔ منکرینِ نبوت کے لیے تعبیر الذین استکبروا اور اہلِ ایمان کے لیے الذین استضعفوا اختیار کر کے یہ لطیف اشارہ کیا ہے کہ اربابِ اقتدار منکرین تو متکبر اور گھمنڈی تھے لیکن اہلِ ایمان بجائے خود ضعیف و حقیر نہ تھے بلکہ ان کو ضعیف و حقیر سمجھ لیا گیا تھا۔ تعبیر کے اس جوہری فرق نے بتا دیا کہ استکبار تو اربابِ اقتدار کا فعل ہے اور استضعاف مومنین کا فعل نہیں بلکہ یہ بھی ان اربابِ اقتدار کا کردار ہے۔ اس لیے حقیر ہونے کی برائی اہلِ ایمان میں نہیں بلکہ ان میں ہے جو ان کو حقیر سمجھ رہے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تکبر جیسے کفر و فسق کا مزاج ہے ایسے ہی مومنین کو حقیر سمجھنا بھی ان ہی کا شیوہ ہے۔ ان اربابِ اقتدار متکبرین نے اہلِ ایمان سے یہ سوال کیا کہ کیا تمہیں یقین ہے کہ حضرت صالح خدا کے فرستادے ہیں۔ انھوں نے صرف یہ جواب نہیں دیا کہ ہاں ان کو خدا کا فرستادہ مانتے ہیں بلکہ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ ان کا جواب

[۱] افاداتِ شیخ الاسلام

یہ تھا کہ ان کے رسول ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں ہے۔ سوال تو صرف یہ ہے کہ ان کی دعوت پر لبیک کون کہتا ہے تو الحمد للہ ہمیں ان کی دعوت پر لبیک کہنے کی توفیق مل گئی ہے۔ اہل ایمان سے متکبرین کا یہ سوال استنکار کی نوعیت کا ہے اور اہل ایمان کا جواب ان کے سوال کے اصل جواب سے آگے کا ہے کیونکہ متکبرین کو اصل چڑ حضرت صالح سے نہیں بلکہ ان کی دعوت اور ان کے پیغام ہی سے تھی۔ اہل ایمان کا جواب اینٹ کے مقابلہ میں پتھر تھا۔ جس نے ثابت کر دیا کہ اب تک جو لوگ دبے ہوئے یا دبائے ہوئے تھے۔ اب وہ اس حق کے معاملہ میں کسی سے دبنے والے نہیں ہیں۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ انبیاء پر ایمان لانے میں جو چیز سب سے زیادہ موثر ہوتی ہے وہ نبی کی دعوت کی قوت و حجت ہوتی ہے نہ کہ معجزات۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنی بڑائی اور ذہانت و فطانت کے مدعی ہوتے ہیں وہ آخر تک نشانیوں اور معجزوں کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کی آنکھیں اس وقت کھلتی ہیں جب اللہ کا عذاب سامنے آجاتا ہے۔

اہل ایمان کے اس حوصلہ شکن جواب پر ارباب اقتدار نے کیا کہا وہ ہی کچھ کہا جو اقتدار جھنجھلاہٹ میں شرمندگی مٹانے کو کہا کرتا ہے یعنی تم نے حضرت صالح کو مان لیا ہے تو مان لو ہم تو اس شخص کو ہرگز ماننے والے نہیں ہم اس کا صاف انکار کرتے ہیں۔

تمرد کا آخری قدم

۱۰۳۔ غرض انہوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی۔ انہوں نے کہا کہ اے صالح اگر تم واقعی پیغمبروں میں سے ہو تو اب وہ بات ہم کو لا دکھاؤ جس کا تم نے ہمیں خوف دلایا تھا کہتے ہیں کہ وہ اونٹنی اس قدر عظیم الجثہ اور ڈیل ڈول کی تھی کہ جس جنگل میں چرتی دوسرے مواشی ڈر کر بھاگ جاتے اور اپنی باری کے دن جس کنوئیں سے پانی پیتی کنواں خالی کر دیتی۔ گویا جیسے اس کی پیدائش غیر معمولی طریقہ سے ہوئی لوازم و آثار حیات بھی غیر معمولی تھے۔ آخر لوگوں نے غیظ و غضب میں آکر اس کے قتل پر اتفاق کر لیا اور بدبخت قیدار نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ بعدہٗ خود حضرت صالح کے قتل پر بھی آمادہ ہو گئے اور اس طرح خدا کے احکام کو جو صالح اور ناقہ کے متعلق تھے پس پشت ڈال دیئے اور ناقہ کو ختم کر دینے کے بعد حضرت صالح کو یہ کہہ کر چیلنج دیا کہ اگر تو خدا کا رسول ہے تو وہ بات ہمیں دکھا جس کا تم نے خوف دلایا تھا۔ ایسے کلمات انسان کی زبان سے اس وقت نکلتے ہیں جب خدا کے قہر و غضب سے بالکل بے خوف ہو جاتا ہے۔ عاد اولیٰ کی طرح ثمود بھی اس مرتبہ پر پہنچ کر عذاب الٰہی کے

مورد بنے جس کا ذکر آگے آتا ہے[1]

اگرچہ مارا ایک شخص نے تھا جیسا کہ سورہ قمر اور سورہ شمس میں ارشاد ہوا ہے لیکن چونکہ پوری قوم اُس مجرم کی پشت پر تھی اور وہ دراصل اس جُرم میں قوم کی مرضی کا آلہ کار تھا اس لیے الزام پوری قوم پر عائد کیا گیا ہے ہر وہ گناہ جو قوم کی خواہش کے مطابق کیا جائے یا جس کے ارتکاب کو قوم کی رضا اور پسندیدگی حاصل ہو ایک قومی گناہ ہے۔ خواہ اس کا ارتکاب کرنے والا ایک فردِ واحد ہو صرف یہی نہیں بلکہ قرآن کہتا ہے کہ جو گناہ قوم کے درمیان علی الاعلان کیا جائے اور قوم اسے گوارا کرے وہ بھی قومی گناہ ہے[2]

گویا یہ قوم کے متمردین کی طرف سے تمرد کا آخری قدم تھا۔ انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور حضرت صالح کو چیلنج کیا کہ لو ہم نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں تم نے دھمکی دی تھی کہ اسے آزار پہنچاؤ گے تو عذاب میں پکڑے جاؤ گے اب لاؤ وہ عذاب اگر تم میں کوئی صداقت ہے۔ قرآن میں ہے کہ حضرت صالح نے ناقہ کے قتل کا واقعہ معلوم ہونے کے بعد قوم کو بحکم خداوندی بتادیا تھا کہ اب تمہاری زندگی کے صرف تین روز باقی ہیں فتمتعوا فی دارکم ثلاثۃ ایام ذالک وعد غیر مکذوب، تین دن مزے کرلو یہ وعدہ پکا ہے اس میں خلاف کا امکان نہیں ہے اس کا نتیجہ کیا ہوا آگے بتایا جارہا ہے۔

قوم ثمود عذاب کی گرفت میں

۱۰۴ ۔ پھر ایسا ہوا کہ لرزا دینے والی ہولناکی نے انہیں آلیا اور جب ان پر صبح ہوئی تو گھروں میں اوندھے منہ پڑے تھے۔ دوسری آیت میں ان کا صیحہ یعنی چیخ سے ہلاک ہونا بیان فرمایا ہے شاید نیچے سے زلزلہ اور اوپر سے ہولناک آواز آئی ہو[3] صرف صیحہ نہیں بلکہ قرآن عزیز نے اس ہلاکت خیزی کو ایک سے زیادہ تعبیرات میں پیش کیا ہے یہاں اس ہلاکت کے لیے لفظ رجفہ بولا ہے سورہ حاقہ میں اسی کو طاغیہ کیا ہے اور سورہ ص میں صیحہ فرمایا ہے اور سورہ سجدہ میں اسی کو صاعقہ کہہ کر پکارا ہے۔ یہ تمام تعبیرات ایک ہی حقیقت کے مختلف اوصاف ظاہر کرنے کے لیے اختیار کی گئی ہیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ خدائے تعالیٰ کے اس عذاب کی ہولناکیاں کیسی گوناگوں

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن [3] افادات شیخ الاسلام

تھیں آپ ایک ایسی کوندنے والی بجلی کا تصور کریں جو بار بار اضطراب کے ساتھ چمکتی، کڑکتی اور گرجتی ہو اور اس طرح کوندرہی ہو کہ کبھی مشرق میں ہو تو کبھی مغرب میں اور جب ان تمام صفات کے چمکتی کوندتی گرجتی لرزتی لرزاتی ہوئی کسی مقام پر ایک ہولناک چیخ کے ساتھ گرے تو اس مقام اور اس کے نواح کا کیا حال ہوگا۔ یہ ایک معمولی سی جھلک ہے اس عذاب کی جو قوم ثمود پر نازل ہوئی اور ان کو اور ان کی بستیوں کو تباہ و برباد کر کے سرکشوں کی سرکشی اور مغروروں کے غرور کا انجام ظاہر کرنے کے لیے آنے والی نسلوں کے سامنے عبرت پیش کر گیا۔

بعض شارحین قرآن نے یہاں رجفہ سے زلزلہ مراد لیا ہے اس لیے قرین قیاس ہے کہ یہ آتش فشاں زلزلہ ہو کیونکہ قدیم اور جدید جغرافیہ والوں کا اس پر اتفاق ہے کہ ارض ثمود آتش فشاں مادے سے بھری ہوئی ہے۔

حضرت صالح کی ہجرت

۱۰۵۔ پھر صالح ان سے کنارہ کش ہو گئے اور فرمایا اے میری قوم کے لوگو میں نے اپنے پروردگار کا پیغام تمہیں پہنچایا اور تمہیں نصیحت کی مگر افسوس کہ تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے ہو کہتے ہیں کہ حضرت صالح قوم کی ہلاکت کے بعد مکہ معظمہ یا ملک شام کی طرف چلے گئے اور جاتے ہوئے ان کی لاشوں کے انبار دیکھ کر یہ خطاب فرمایا۔ یا تو اسی طرح جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتولین بدر کو فرمایا تھا اور یا محض بطور تحسر فرضی خطاب تھا جیسے شعراء دیار و اطلال (کھنڈرات) وغیرہ کو خطاب کرتے ہیں اور بعض نے کہا کہ یہ خطاب ہلاکت سے پہلے تھا۔ اس صورت میں بیان میں ترتیب واقعات نہیں ہے۔ بہرحال اس خطاب میں دوسروں کو سنانا تھا کہ جو اپنے معتبر خیرخواہوں کی قدر نہیں کرتا تو ایسا نتیجہ دیکھنا پڑتا ہے [1]

یہ قوم سے حضرت صالح کی علیحدگی کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت صالح نے قوم سے علیحدگی عذاب سے پہلے اختیار کی ہو گی۔ سورہ ہود میں بتلایا گیا ہے کہ اونٹنی کے ہلاک ہونے کے بعد حضرت صالح نے ان کو تین دن کی مہلت دی ہے تمتعوا فی دارکم ثلاثۃ ایام، اس مدت کے ختم ہونے پر عذاب آیا اور یہ بھی قرآن نے بتایا ہے کہ ہم نے صالح علیہ السلام اور ان کے صحابہ کرام کو اس

---

[1] افادات شیخ الاسلام

عذاب سے بچا لیا۔

فلما جاء امرنا نجینا صالحاً والذین آمنوا برحمۃ منا

جب ہمارا فیصلہ آگیا تو ہم نے صالح اور ان کے ساتھیوں کو اپنی رحمت سے بچا لیا۔

ظاہر ہے کہ صالح اور ان کے ساتھیوں کو بچانے کی صورت یہی ہوئی ہے کہ ان کو عذاب والی جگہ سے دور لے جایا گیا۔ یہاں قرآن کی تصریح دتولی عنھم اس کی طرف رہنمائی کر رہی ہے۔ یہاں سے ہٹ کر حضرت صالح کہاں تشریف لے گئے۔ مشہور یہی ہے کہ حضرت صالح جزیرہ نما سینا کی طرف چلے گئے۔ یا جیسا کہ مولانا عثمانی فرماتے ہیں کہ مکہ معظمہ یا شام چلے گئے۔ بہرحال کہیں گئے ہوں۔ قرآن سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت صالح نے ہجرت فرمائی۔ یہاں فتولی کی فا اگرچہ بعدیت اور تعقیب بتا رہی ہے لیکن عربی زبان میں ترتیب ضروری نہیں ہے۔ اگر واقعہ یہ ہے تو پھر حضرت صالح نے یہ بات یقیناً اس وقت فرمائی ہوگی جب تین دن کی مہلت کے بعد وہاں سے روانہ ہو رہے ہوں گے۔ اور یہاں واقعہ میں بر تقدیم و تاخیر تقاضائے بلاغت سے ہوئی ہے۔ ارتکابِ جرم اور اس کے نتیجہ کو فوری طور پر نمایاں کرنے کے بعد یہاں عذاب کو عقر ناقہ کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور حضرت صالح کی ہجرت کے ذکر کو مؤخر کر دیا۔ یہاں عقر ناقہ کے ساتھ فاخذتھم الرجفۃ فرما دیا۔ فا کا تقاضا ہے کہ عقر ناقہ کے فوراً بعد عذاب آگیا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ تین دن کے بعد عذاب آیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ بات بہت بڑی دلسوزی کے ساتھ حسرت اور افسوس کے انداز میں ان کی زندگی میں کہی جا رہی ہے کہ میں نے اپنے رب کا پیغام تمہیں پہنچا دیا ہے۔ یعنی میں نے اپنا فرضِ رسالت ادا کر دیا ہے لیکن یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ تمہیں اپنے خیر خواہ پسند نہیں ہیں۔ اس میں ایک میٹھی سی چوٹ ہے۔ قوم کے ان غداروں اور ان بدخواہ لیڈروں پر جو وہاں پوری قوم کی قیادت کر رہے تھے قوم کا مزاج جب فاسد ہوتا ہے تو وہ بدخواہوں کو خیر خواہ اور خیر خواہوں کو بدخواہ سمجھنے لگتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر لازماً قوم تباہی سے دوچار ہوتی ہے۔ اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ جب کسی مریض کا یہ حال ہو جائے کہ اسے معالجوں سے دشمنی ہو جائے اور صرف انہی کے مشورے اسے پسند آئیں جو اس کی بیماری میں اضافہ چاہتے ہوں تو موت کے سوا اس کے لیے اور کیا چیز باقی رہ گئی ہے۔

اگرچہ بعض شارحین قرآن نے حضرت صالح کی اس تقریر کا محل عذاب کے بعد تجویز کیا ہے اور اس کی نوعیت ایسی بتائی ہے جیسے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر میں مشرکین مکہ کے سرداروں کی ہلاکت کے بعد مردہ نعشوں کے گڑھے پر کھڑے ہو کر فرمایا:

اے فلاں ابن فلاں اور فلاں ابن فلاں کیا تم کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پسند نہ آئی۔ بلاشبہ ہم نے وہ سب کچھ پا لیا جو ہمارے رب نے ہم سے وعدہ کیا۔ کیا تم نے بھی وہ پایا ہے جو تمہارے رب نے تم سے وعدہ کیا تھا۔

حدیث کے راوی ابوطلحہ انصاری کہتے ہیں کہ حضرت عمر نے فرمایا کہ کیا یہ سُن رہے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بخدا تم سے زیادہ میری بات سُن رہے ہیں۔

اگر یہی نوعیت ہو تو اس قسم کے خطاب کے بارے میں علماء کی رائے ہے کہ

۱- اس نوع کا انبیاء کی خصوصیت سے تعلق ہے اس لیے کہ اللہ سبحانہٗ انبیاء کی بات کو بلاشبہ مردوں کو سنوا دیتا ہے اگرچہ وہ جواب دینے سے قاصر ہیں۔

۲- یہ طریقِ خطاب حزن و ملال کے اظہار کے لیے ہوتا ہے۔ مثلاً تم نے کسی سے کہا کہ اس جگہ نہ جانا سانپ بہت ہیں اندیشہ ہے کہ کاٹ لیں مگر وہ باغ میں چلا گیا اور سانپ نے کاٹ لیا، اس کی وفات ہو گئی۔ اب جب اس کی میت تمہارے سامنے آئی تو تم بے ساختہ کہتے ہو افسوس کیا میں نے روکا نہ تھا۔

۳- اس قسم کے خطاب کے اصل مخاطب وہ زندہ انسان ہوتے ہیں جو ان مردہ نعشوں کو دیکھ رہے ہیں تاکہ ان کو عبرت حاصل ہو۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِہٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَۃَ مَا سَبَقَكُمْ بِہَا مِنْ
اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَہْوَۃً مِّنْ دُوْنِ
النِّسَاۗءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِہٖٓ
اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْہُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّہُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَہَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾
فَاَنْجَيْنٰہُ وَاَہْلَہٗٓ اِلَّا امْرَاَتَہٗ ڮ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَ
اَمْطَرْنَا عَلَيْہِمْ مَّطَرًا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَۃُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۸۴﴾

اور ہم نے لُوط کو روانہ کیا جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ کیا تم ایسی بے حیائی کا کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دُنیا میں کسی انسان نے نہیں کیا۔[۱۰۶] تم عورتوں کو چھوڑ کر نفسانی خواہش سے مردوں پر مائل ہوتے ہو۔ بلاشبہ تم ایسی قوم ہو گئے ہو جو بالکل چھوٹ اور بے لگام ہو۔[۱۰۷] اور لُوط کی قوم کے پاس اس کا کوئی جواب تھا تو یہ تھا کہ آپس میں کہنے لگے ان کو اپنی بستی سے نکال باہر کر دیہ

ایسے لوگ ہیں جو بڑے پاک بننا چاہتے ہیں[۱۰۸]۔ بس ہم نے حضرت لوطؑ
اور ان کے گھر والوں کو بچا لیا مگر اس کی بیوی نہ بچی وہ بھی پیچھے رہ
جانے والوں میں تھی، ہم نے پتھروں کی بارش کی دیکھو مجرموں
کا انجام کیسا ہوا[۱۰۹]۔

معانی مفردات

دونَ، ورے، سوا، چھوڑ کر، آگے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ دنو، کا مقلوب ہے جس کے معنے نزدیک کے ہیں۔ امام سیوطی فرماتے ہیں دون ظرف ہو کر استعمال ہوتا ہے فوق کی نقیض ہے اور مذہب مشہور پر معرب نہیں ہوتا اور بعض کہتے ہیں کہ معرب ہوتا ہے چنانچہ د منًا دون ذالک دونوں طرح پڑھا گیا ہے پیش کے ساتھ بھی اور زبر کے ساتھ بھی۔ اور اسم بھی واقع ہوتا ہے بمعنے غیر کے جیسے اتخذوا من دونہ اٰلھۃ۔ زمخشری کہتے ہیں کہ اس کے معنے کسی چیز کے ورے کے ہیں اور حالت کا فرق بتانے کے لیے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے جیسے زید دون عمر یعنی شرافت اور علم میں اس سے پیچھے ہے اور اس کے معنے میں وسعت سے کام لے کر اس کا استعمال حد سے بڑھ جانے کے لیے بھی ہوتا ہے جیسے اولیاء من دون المومنین۔ عاقبۃ، انجام، آخر، یہ اصل میں عقب یعقب کا مصدر ہے جس کے معنے پیچھے آنے کے ہیں لیکن اس کا استعمال ہر شے کے آخر اور انجام کے لیے ہوتا ہے۔ امام راغب نے تصریح کی ہے کہ اس کا استعمال ثواب کے لیے مخصوص ہے جیسے العاقبۃ للمتقین، اور جب مرکب اضافی کی صورت میں آتے کبھی عقوبت کے لیے آتا ہے جیسے کیف کان عاقبۃ المجرمین۔ اس کی جمع عواقب آتی ہے۔

ایک اور واقعاتی شہادت

حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کے برادر زادے تھے۔ ان کے والد کا نام ہاران تھا۔ حضرت لوطؑ کا بچپن حضرت ابراہیمؑ کے زیرِ سایہ گزرا۔ اسی لیے وہ اور حضرت سارہ ملت ابراہیمی کے السابقون الاولون میں داخل ہیں۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کی ہجرتوں میں ہمیشہ ساتھ رہے ہیں اور جب حضرت ابراہیمؑ مصر میں تھے تو اس وقت بھی یہ ہمسفر تھے۔ تورات میں ہے کہ مصر کے قیام میں چونکہ دونوں کے پاس کافی سازو سامان تھا اور مویشیوں کے بڑے بڑے ریوڑ تھے اس لیے ان کے چرواہوں اور محافظوں کے درمیان بہت زیادہ کشمکش رہتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کے چرواہے چاہتے تھے کہ اس چراگاہ اور سبزہ زار سے پہلے ہمارے ریوڑ فائدہ اٹھائیں اور حضرت لوطؑ کے چرواہوں کی خواہش ہوتی تھی کہ اول ہمارا حق سمجھا جائے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس صورتِ حال کا اندازہ کر کے حضرت لوطؑ سے مشورہ کیا اور دونوں کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ باہمی تعلقات کی خوشگواری اور دائمی محبت والفت کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ حضرت لوطؑ مصر سے ہجرت کر کے شرقِ اردن کے علاقہ سدوم اور عامورہ چلے جائیں اور وہاں رہ کر دینِ حنیف کی تبلیغ کریں۔ اور حضرت ابراہیمؑ کی رسالت کا پیغامِ حق سناتے رہیں اور حضرت ابراہیمؑ فلسطین چلے جائیں۔

اردن کی وہ جانب جہاں آج بحرِ میت یا بحرِ لوطؑ واقع ہے یہی وہ جگہ ہے جس میں سدوم اور عامورہ کی بستیاں آباد تھیں اس کے قریب بسنے والوں کا یہ اعتقاد ہے کہ پہلے یہ تمام حصہ جو اب سمندر نظر آتا ہے کسی زمانہ میں خشک زمین تھی اور اس پر شہر آباد تھے۔ سدوم و عامورہ کی آبادیاں اسی مقام پر تھیں۔ یہ مقام شروع سے بحر نہ تھا۔ جب قومِ لوطؑ پر عذاب آیا اور اس سرزمین کا تختہ الٹ دیا گیا اور سخت زلزلے اور بھونچال آئے تب یہ زمین تقریباً چار سو میٹر سمندر سے نیچے چلی گئی اور پانی ابھر آیا اسی لیے اس کا نام بحرِ میت اور بحرِ لوط ہے[1]

یہ صحیح ہو یا غلط بہر حال یہ مسئلہ حقیقت رکھتا ہے کہ اسی بحرِ میت کے ساحل پر وہ حادثہ رونما ہوا جو قومِ لوطؑ کے عذاب سے موسوم ہے اور جو گزشتہ دو سال کی اثری تحقیق نے بحرِ میت کے ساحل پر لوطؑ کی بستیوں کے بعض تباہ شدہ آثار ہویدا کر کے اس علمِ یقین کے سامنے

[1] بستانی

سر تسلیم خم کر دیا ہے جس کا اعلان ساڑھے تیرہ سو سال قبل قرآن عزیز نے کر دیا تھا۔

۱۰۶۔ اور ہم نے لوط کو روانہ کیا جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم ایسی بے حیائی کا کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دُنیا میں کسی انسان نے نہیں کیا۔ لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے بھتیجے ہیں جو ان کے ساتھ عراق سے ہجرت کر کے ملک شام آئے اور خدا کی طرف سے سدوم اور اس کے گرد و نواح کی بستیوں کی طرف مبعوث ہوئے تاکہ ان کی اصلاح فرمائیں اور ان گندے خلافِ فطرت اور بے حیائی کے کاموں سے باز رکھیں جن میں وہاں کے لوگ مبتلا تھے نہ صرف مبتلا بلکہ اس بے حیائی کے موجد تھے۔ ان سے پیشتر عالم میں اس بیماری سے کوئی واقف نہ تھا۔ اوّلاً یہ ملعون حرکت شیطان نے سدوم والوں کو سجھائی اور وہیں سے دوسرے مقامات میں پھیلی۔ حضرت لوط علیہ السلام نے اس ملعون و شنیع حرکت کے عواقب پر متنبہ کیا اور گندگی کو دُنیا سے مٹانا چاہا۔ موجودہ بائبل کے جمع کرنے والوں کی شرمناک جسارت پر ماتم کرنا پڑتا ہے کہ ایسے پاکباز و معصوم پیغمبر کی طرف جو دُنیا کو گندگی اور بے حیائی سے پاک کرنے کے لیے آیا تھا ایسی سخت ناپاک حرکات منسوب کیں جن کے سننے سے حیادار آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا۔[1]

قرآن میں یہاں تعبیر ذرا بدل گئی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا الی قوم لوط اخاھم لوطا جیسے سیاق میں آرہا ہے الی عاد اخاھم ھودا، الی ثمود اخاھم صالحا، حضرت لوط کا سدوم کے باشندوں سے نسبی تعلق نہ تھا لیکن جنسی اور وطنی تعلق ضرور تھا اس لیے یہاں یہ بتانے کے لیے کہ حضرت لوط کا سدوم سے نسلی اور نسبی تعلق نہ تھا تعبیر بدل دی اور بھائی ہونے کا ذکر نہیں کیا اور سورہ شعراء میں یہ بتانے کے لیے کہ حضرت لوط کا اہلِ سدوم سے وطنی اور جنسی تعلق تھا فرمایا کذبت قوم لوط المرسلین اذ قال لھم اخوھم لوط۔ گویا یہاں حذف کر کے بتا دیا کہ حضرت لوط کا ان سے نسبی تعلق نہ تھا اور وہاں تصریح کر کے بتا دیا کہ حضرت لوط کا اہلِ سدوم سے وطنی تعلق تھا۔ اس سے اشارۃً معلوم ہوا کہ قومیت جن عناصر سے ترکیب پاتی ہے ان میں نسب اور وطن کو بہت بڑا دخل ہے۔ آج کل بھی قومیں اوطان سے بنتی ہیں، زبان سے بنتی ہیں یا نسل اور نسب سے بنتی ہیں۔ اس کے برعکس اُمت صرف ایمان سے بنتی ہے۔ اُمت کا تصور زبان، وطن، اور

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

نسل سے بالا ہے۔ پتہ نہیں مولانا دریابادی نے یہاں قوم کو اُمت کے معنے میں کیوں لینے کی تکلیف فرمائی ہے حالانکہ تکذیب نبوت کے ساتھ اُمت کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ تعبیر کے ذرا سے فرق سے قرآن نے کیسی نازک تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ حضرت لُوط نے ان سے فرمایا اتاتون الفاحشۃ کیا تم بدکاری کا ارتکاب کرتے ہو۔ سوالیہ اندازِ بیان اظہار نفرت و کراہت کے لیے ہے۔ فاحشہ کھلی ہوئی بدکاری اور بے حیائی کو کہتے ہیں۔ اس کی دوسری صورت فحشاء آتی ہے یہ لفظ فحش سے بنا ہے جس کے اصلی معنے حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں اور اس کے دوسرے لازمی معنے قبیح یعنی بُرائی کے ہیں کیونکہ جس چیز کی جو حد خالق فطرت نے مقرر کر دی ہے اس سے آگے بڑھنا قبیح یعنی برائی ہے یا یہ کہ جو بُرائی حد سے زیادہ ہو جاتے وہ ہی فاحشہ کہلاتا ہے۔ مثال سے یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوتِ شہوانی کی تسکین کے لیے کچھ حد مقرر فرمائی ہے اب جو ان حدود سے آگے بڑھتا ہے وہ فاحشہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

یہاں اس فاحشہ کا نام نہیں لیا بلکہ الف لام کے ذریعے بیان کیا ہے یہ اس بات کی نشانی ہے کہ یہ بے حیائی کا کام معاشرے میں اس درجہ تھا کہ نام لیے بغیر ہر شخص سمجھتا تھا۔ جب حضرت لُوط نے اپنے مخاطبوں سے یہ بات فرمائی اور بطور کراہت و انکار سوال کا پیمانہ پیش فرمایا تو مخاطبوں کے ذہنوں میں معاً سوال اُبھرا ہوگا کہ ہم یہ کام کیوں کریں۔ فرمایا اس لیے نہ کرو ماسبقکم بھا من احد من العالمین۔ تم سے پہلے یہ شنیع حرکت کسی ایک سے بھی صادر نہیں ہوئی یعنی اس کی برائی اس قدر عیاں اور کھلی ہے کہ تاریخ میں کبھی اس کا کسی نے ارتکاب ہی نہیں کیا ہے یعنی قوم لُوط سے پہلے اس کے وجود کا تاریخ سے بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اس طرح حضرت لُوط نے اپنی قوم کو دوہری ملامت کی۔ ایک تو یہ کہ ایسی شدید بدکاری کا ارتکاب کر رہے ہو، دوسرے یہ کہ اس کے موجد بھی تم ہو۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ حضرت لُوط نے قوم کو پہلے ارتکاب فاحشہ پر ڈانٹ دی اور پھر اس بدکاری کی ایجاد پر ملامت کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ قوم لُوط صرف بُرائی کی مرتکب ہی نہ تھی بلکہ موجد بھی تھی اور اسی بنا پر اہل عرب نے اس عمل کا نام لواطت رکھ دیا ہے۔ اُردو میں بھی اس کو عمل قوم لوط کہتے ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں پہنچ کر قرآن کے قاری کے ذہن میں یہ سوال ضرور ابھرتا ہے کہ اوپر جن رسولوں کا

ذکر ہوا ہے سب کی دعوتوں کا آغاز توحید عبادت سے ہوا ہے لیکن حضرت لوط کی تقریر اس دعوت سے خالی ہے کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت لوط کی قوم پرستش اور بندگی میں اللہ کے سوا کسی سے عابدانہ تعلق نہ رکھتی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو اس پر رسولوں کی تکذیب کی فردِ جرم قرآن نہ لگاتا۔ ارشاد ہے کذبت قوم لوط المرسلین اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں تو پھر دعوتِ توحید کیوں نہیں دی گئی۔

اصل یہ ہے کہ برائی برائی میں فرق ہے ایک برائی تو وہ ہوتی ہے جو انسانوں میں پائی جاتی ہے یا پائی جا سکتی ہے خواہ کتنی سنگین ہو۔ دوسری برائی وہ ہے جس کا گھنونا پن اس قدر واضح ہو کہ کسی انسان کے اندر عادت کی حیثیت سے اور کسی سوسائٹی میں فیشن کی حیثیت سے اس کا پایا جانا بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ اس انسان یا اس سوسائٹی کی فطرت بالکل مسخ ہو گئی جہاں اس طرح کے لوگوں سے سابقہ ہو وہاں اصل قابلِ توجہ چیز وہی برائی ہوتی ہے۔ دوسری باتیں خواہ کتنی ہی اہمیت رکھنے والی ہوں سب ثانوی درجے میں آجاتی ہیں۔ آپ ایک شخص کے پاس اس کی اصلاح کی غرض سے جائیں اور دیکھیں کہ وہ کھڑا ہوا غلیظ کھا رہا ہے تو کیا آپ اسے ایمان و سلام کی تلقین کریں گے؟ حضرت لوط کو اسی صورتِ حال سے سابقہ پڑا۔ ان کی قوم میں شرک، نبوت کی تکذیب کی برائی بھی موجود تھی اور دوسری تمام برائیاں بھی۔ جو شرک و کفر کے لوازم میں موجود ہیں لیکن جن کی فطرت اتنی اوندھی ہو گئی ہو کہ مرد مردوں ہی کو شہوت رانی کا محل بناتے ہوتے ہوں ان کو تو سب سے پہلے اس غلاظت کی دلدل سے نکالنے کی ضرورت تھی۔ ان سے کسی دوسری بات کے کہنے کا مرحلہ تو بہرحال اس کے بعد ہی آسکتا ہے۔ قرآن کی نظر میں اس سے عملِ قومِ لوط کی شناعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ قرآن کی نگاہ میں اس گناہ کی سنگینی تو یہ ہے لیکن آج بھی بدکاری یورپی اور امریکی قوم کی تہذیب کا جزو لاینفک ہے اور رسالوں اور کتابوں کے ذریعے سے بتایا جا رہا ہے کہ اسے بجائے غیر طبعی کے ایک طبعی تحریک قرار دیا جاتے انا للہ فالی اللہ المشتکی۔

قومِ لوط کی فطرت سے بغاوت

۱۰۷۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر نفسانی خواہش سے مردوں پر مائل ہوتے ہو۔ بلاشبہ تم ایسی قوم ہو جو بالکل چھوٹے اور بے لگام ہو۔ یعنی صرف یہی نہیں کہ ایک گناہ کے تم مرتکب ہو رہے ہو بلکہ اس خلافِ فطرت فعل کا ارتکاب اس کی دلیل ہے کہ تم انسانیت کی حدود سے بھی باہر نکل چکے ہو[1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

یہ قابلِ نفرت فعل جس کی بدولت اس قوم نے شہرتِ دوام حاصل کی اس کے ارتکاب سے تو بدکردار انسان کبھی باز نہیں آئے لیکن یہ فخر صرف یونان کو حاصل ہے کہ اس کے فلاسفہ نے اس گھناؤنے جُرم کو اخلاقی خوبی کے مرتبے تک اٹھانے کی کوشش کی اور اس کے بعد جو کسر باقی رہ گئی تھی، اسے جدید مغربی تہذیب نے پورا کیا کہ علانیہ اس کے حق میں زبردست پروپیگنڈا کیا گیا۔ یہاں تک کہ بعض ملکوں کی مجالسِ قانون ساز نے اسے باقاعدہ جائز ٹھہرادیا حالانکہ یہ ایک بالکل صریح حقیقت ہے کہ مباشرتِ ہم جنس قطعی طور پر وضعِ فطرت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام ذی حیات انواع نر و مادہ کا فرق محض تناسل اور بقائے نوع کے لیے رکھا ہے۔ اور نوعِ انسانی میں اس کی مزید غرض یہ بھی ہے کہ دونوں صنفوں کے افراد مل جل کر ایک خاندان وجود میں لائیں اور اس سے تمدن کی بنیاد پڑے۔ اسی مقصد کے لیے مرد و عورت کی دو الگ الگ صنفیں بنائی گئی ہیں۔ ان میں ایک دوسرے کے لیے صنفی کشش پیدا کی گئی ہے۔ ان کی جسمانی ساخت اور نفسیاتی ترکیب ایک دوسرے کے جواب میں مقاصدِ زوجیت کے لیے مناسب بنائی گئی ہے اور ان کے جذب و انجذاب میں وہ لذت رکھی گئی ہے جو فطرت کے منشا کو پورا کرنے کے لیے بیک وقت داعی محرک بھی ہے اور اس خدمت کا صلہ بھی۔ مگر جو شخص فطرت کی اس سکیم کے خلاف عمل کر کے اپنے ہم جنس سے شہوانی لذت حاصل کرتا ہے وہ ایک ہی وقت میں متعدد جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔

اولاً وہ اپنی اور اپنے معمول کی طبعی ساخت اور نفسیاتی ترکیب سے جنگ کرتا ہے اور اس میں خللِ عظیم برپا کرتا ہے جس سے دونوں کے جسم نفس اور اخلاق پر بہت بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

ثانیاً، وہ فطرت کے ساتھ غداری و خیانت کرتا ہے کیونکہ فطرت نے جس لذت کو نوع اور تمدن کی خدمت کا صلہ بنایا تھا اور جس کے حصول کو فرائض اور ذمہ داریوں اور حقوق کے ساتھ وابستہ کیا تھا وہ اسے کسی خدمت کی بجاآوری اور کسی فرض اور حق کی ادائیگی اور کسی ذمہ داری کے التزام کے بغیر لیتا ہے۔

ثالثاً، وہ انسانی اجتماعی تمدن کے ساتھ کھلی بددیانتی کرتا ہے کہ جماعت کے قائم کیے ہوئے تمدنی اداروں سے فائدہ تو اٹھالیتا ہے مگر جب اس کی اپنی باری آتی ہے تو حقوق اور فرائض اور ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے بجائے اپنی قوتوں کو پوری خود غرضی کے ساتھ ایسے طریقہ پر استعمال کرتا ہے جو اجتماعی تمدن و اخلاق کے لیے صرف غیر مفید ہی نہیں بلکہ ایجاباً مضرت رساں ہے۔ وہ اپنے آپ کو نسل اور خاندان کی خدمت کے لیے نااہل بناتا ہے۔ اپنے ساتھ کم از کم ایک مرد کو غیر طبعی زنانہ پن میں مبتلا

کر دیتا ہے اور کم از کم دو عورتوں کے بھی صنفی بے راہ روی اور اخلاقی پستی کا دروازہ کھولتا ہے[1]
آخر میں ارشاد ہوا ہے بل انتم قوم مسرفون یعنی تم صرف یہ بدکاری ہی کیے بعد دیگرے نہیں کرتے ہو بلکہ تم اس میں اور زندگی میں جادۂ اعتدال سے ہٹ کر فطرت سے بغاوت کر رہے ہو۔ سورہ عنکبوت میں مختلف اعمال کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا ہے انکم لتاتون الرجال وتقطعون السبیل وتاتون فی نادیکم المنکر، یعنی تم اغلام باز ہو رہزن اور ڈاکو ہو اور تمہاری مجالس منکرات کا اڈہ ہیں۔ سورہ الشعراء میں ہے بل انتم قوم عادون۔ یعنی تم صرف بدکاری نہیں کرتے ہو بلکہ پوری زندگی میں حدودِ فطرت اور قوانینِ شریعت کی بغاوت کر رہے ہو اور سورہ نمل میں اسی کے لیے بل انتم قوم تجھلون۔ کی تعبیر اختیار کی گئی ہے یعنی تم ایک بیوقوف اور ناعاقبت اندیش قوم ہو۔ بے عقلی یہ کہ نسل اور صحت اور اخلاق کے خلاف جو جرم کیا جا رہا ہے اس کو سمجھتے نہیں ہیں اور نہیں جانتے کہ اس کا انجام حرث اور نسل کی تباہی اور فطرت سے بغاوت ہے۔

اخلاقی پستی کی آخری حد

۱۰۸۔ اور لوط کی قوم کے پاس اس کا کوئی جواب تھا تو صرف یہی تھا کہ آپس میں کہنے لگے ان کو اپنی بستی سے نکال دو یہ ایسے لوگ ہیں جو بڑے پاک بن رہے ہیں۔ یعنی آخری بات انہوں نے یہ کہی کہ جب ہم سب کو یہ گندہ سمجھتے ہیں اور آپ پاک بننا چاہتے ہیں تو گندوں میں پاکوں کا کیا کام لہذا ان کو اپنی بستی سے نکال دینا چاہیے کہ یہ روز روز کی رکاوٹ ختم ہو[2]
اس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ صرف بے حیا اور بدکردار اور بداخلاق ہی نہ تھے بلکہ اخلاقی پستی میں اس حد تک گر گئے تھے کہ انہیں اپنے درمیان چند نیک انسانوں اور نیکی کی طرف بلانے والوں اور بدی پر ٹوکنے والوں کا وجود تک گوارا نہ تھا۔ وہ گناہوں میں اس درجہ مستغرق تھے کہ اصلاح کی آواز کو بھی برداشت نہ کر سکتے تھے اور پاکی کے اس تھوڑے سے عنصر کو بھی نکال دینا چاہتے تھے جو ان کی گھناؤنی فضا میں باقی رہ گیا تھا۔ اسی حد کو پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے استیصال کا فیصلہ ہوا۔ کیونکہ جس قوم میں اجتماعی زندگی میں پاکیزگی کا ذرا سا عنصر بھی باقی نہ رہ سکے پھر اسے زمین پر زندہ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ سڑے ہوئے پھلوں کے

---

[1] تفہیم القرآن　[2] افادات شیخ الاسلام

ٹوکرے میں جب تک چند اچھے پھل موجود ہوں اس وقت تک تو ٹوکرے کو رکھا جاسکتا ہے مگر جب وہ پھل بھی اس میں سے نکل جائیں تو پھر اس ٹوکرے کا کوئی مصرف اس کے سوا کچھ نہیں رہتا کہ اسے کسی کوڑے پر الٹ دیا جائے۔[1]

یہ جو قوم لوط نے حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں کہا کہ ان کو بستی سے نکالو یہ بڑے پارسا بنتے ہیں۔ یہ کسی معاشرے کی بگاڑ کی آخری حد ہے۔ معاشرہ بگڑتے بگڑتے اس حد تک بگڑ جاتا ہے کہ ایک وقت آتا ہے جب سب اپنی ناک کٹوا دیتے اور نکٹا ہونا ہی فیشن اور تہذیب کا تقاضا بن جاتا ہے اس وقت ناک نہ ہونا عیب نہیں رہتا بلکہ اس کا ہونا ایک اعجوبہ گنا جاتا ہے اور ایسے کو اگر ظالموں کا بس چلتا ہے تو نکو بنا کر باہر نکال دیتے ہیں۔

یتطہرون کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہ حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں پر پاک ہونے کی پھبتی کس رہے تھے اور پاک ہونے پر ان کا مذاق اڑا رہے تھے۔ اور اپنی گندگی پر فخر کر رہے تھے۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ یہاں قوم کا جواب اخرجوھم من قریتکم۔ اور سورہ عنکبوت میں قوم کا جواب یہ بتایا ہے۔

فما کان جواب قومہ الا ان قالوا ائتنا بعذاب اللہ ان کنت من الصادقین۔

قوم کا جواب صرف یہ تھا کہ اللہ کا عذاب لاؤ اگر تم سچے ہو۔

بظاہر دونوں جوابوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔ دونوں باتیں درست ہیں۔ ایک موقعہ پر انہوں نے حضرت لوطؑ سے ایک بات کہی اور دوسرے وقت دوسری بات کہی۔ یہ ایک گھنٹے کی کہانی نہیں بلکہ پوری زندگی کی داستان ہے۔ حضرت لوطؑ ان کو اکثر برائیوں پر ٹوکتے رہتے۔ اس موقعہ پر جب حضرت لوطؑ نے تقریر کرتے ہوئے ان کی بدکاری پر ملامت کرتے ہوتے ان کو ٹوکا تو ان کا جواب یہی تھا کہ بڑے پارسا بنے پھرتے ہیں ان کو بستی سے نکالو۔ اور دوسرے موقعہ پر جب حضرت لوطؑ نے اس برائی کے ساتھ دوسری برائیوں پر ان کو ٹوکا اور کہا۔ تم لوگ وہ بدکاری کرتے ہو جو تم سے پہلے کسی نے نہیں کی تم مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو، ڈاکہ زنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں منکرات کرتے ہو۔ اس کے جواب میں لوگوں نے

---

[1] تفہیم القرآن

حضرت لوطؑ سے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو اللہ کا عذاب لاؤ۔ حضرت لوطؑ ہی نہیں ہر واعظ اور داعی مختلف مجالس اور مختلف اوقات میں دعوت کے نئے انداز اختیار کرتے ہیں اور مخاطبوں کا جواب بھی نیا ہوتا ہے اس لیے یہاں قرآن میں جو بات کہی گئی وہ اور ہے اور سورہ عنکبوت میں فرمائی گئی وہ اور ہے اور سورہ نمل میں جس انداز سے پیش کی گئی ہے وہ اور ہے۔ خطاب اور اس کے جواب کا یہ تنوع اوقات اور مجالس کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔

ممکن ہے کہ قاری کے ذہن میں یہاں یہ سوال بھی چٹکیاں لے کہ قوم کا جواب نقل کرنے میں قرآن نے یہ تنوع کیوں اختیار کیا ہے کہ کہیں و ما کان جواب قومہ ہے اور کہیں فما کان جواب قومہ آیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو اختلاف مجلس اور اختلاف اوقات ہی ہے لیکن مزید نکتہ بلاغت اس میں یہ ہے کہ جس تقریر میں حضرت لوطؑ نے افعال کی نسبت قوم کی طرف کی ہے مثلاً سورہ نمل میں ہے بل انتم قوم تجھلون، سورہ عنکبوت میں ہے تاتون الرجال و تقطعون السبیل و تاتون فی نادیکم المنکر، وہاں فاء لے کر آتے ہیں اور فرمایا فما کان جواب یعنی اشارہ کیا ہے کہ ان افعال کی وجہ سے ان کا جواب یہ تھا۔ کیونکہ جملہ فعلیہ میں سبب بننے کی صلاحیت ہوتی ہے لیکن جہاں حضرت لوطؑ نے تقریر میں فعل نہیں بلکہ جملہ اسمیہ استعمال کیا ہے وہاں اللہ سبحانہٗ واو لے کر آتے ہیں۔ و ما کان جواب قومہ کیونکہ جملہ اسمیہ میں سبب بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ تعبیر میں یہ دقیق رعایت قرآن پاک کے علاوہ کہیں نہیں پائی جاتی۔ علامہ آلوسی نے بھی اسی قسم کی اس تعبیری اختلاف میں نکتہ آفرینی فرمائی ہے۔

عذاب اور حضرت لوطؑ کی نجات

۱۰۹۔ پس ہم نے حضرت لوطؑ اور اُن کے گھر والوں کو بچا لیا مگر اس کی بیوی نہ بچی وہ بھی پیچھے رہ جانے والوں میں تھی۔ ہم نے پتھروں کی بارش کی دیکھو مجرموں کا انجام کیسا ہوا۔ حق تعالیٰ نے حضرت لوطؑ اور اُن کے ساتھیوں کو عزّت و عافیت کے ساتھ صحیح و سالم ان بستیوں سے نکال لیا اور ان بستیوں پر عذاب مسلّط کر دیا جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ لوط علیہ السلام کے متعلقین میں سے صرف ان کی بیوی آپ سے علیحدہ رہی اور معذبین کے ساتھ ہلاک ہوئی کیونکہ اس کی سازباز اُن معذبین سے تھی۔ لوط علیہ السلام کے یہاں جو مہمان وغیرہ آتے ان کی اطلاع بھی کرتی تھی اور ان کو بدکاری کی ترغیب دیتی تھی یا جیسا کہ بعض نے لکھا ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں میں بھی "مساحقہ"

کا رواج ہوگیا تھا۔ یہ عورت اس میں مبتلا تھی۔ بہرحال عذاب ان سب پر آیا جو اس مہلک بیماری میں مبتلا تھے اور نہایت ڈھٹائی کے ساتھ نبی کا مقابلہ اور تکذیب کرتے تھے یا جو کفر و فحش کے سسٹم میں ان کے معین و مددگار تھے۔[1]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن میں حضرت لُوطؑ کے مخالفین اناس چند لوگ کہہ رہے تھے وہ ان کے متعلقین تھے جن کو قرآن نے یہاں اھلہ، کہا ہے۔ اس اہل میں حضرت لُوطؑ کی بیوی اولاً داخل تھی۔ اسی لیے اللہ سبحانہ نے اس کو استثنا کے ذریعے خارج کیا ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اہل کے مفہوم میں بیوی داخل نہ ہو تو پھر استثنا میں کوئی معنویت نہیں رہتی۔ مطلب یہ ہے کہ لُوطؑ کی بیوی کو چھوڑ کر حضرت لُوطؑ کے خاندان کو بچالیا اور اس بچانے کی قرآن نے دوسری صورت یہ بتائی ہے کہ حضرت لُوطؑ سے فرشتوں نے کہا،

فاسر باھلک بقطع من اللیل ولا یلتفت منکم احد الا امراتک انہ مصیبھا ما اصابھم۔

بس تو کچھ رہے اپنے اہل و عیال لے کر یہاں سے نکل جا اور تم میں سے کوئی پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے مگر تیری عورت ساتھ نہ جاتے اس پر وہی کچھ پڑے گا جو اوروں پر پڑے گا۔

واقعہ کی تفصیل انشاء اللہ بارہویں پارہ میں آرہی ہے۔ یہاں تو صرف یہ بتانا ہے کہ عذاب آیا اور ہم نے لُوطؑ اور اُن کے اہل و عیال کو بچالیا لیکن ان کی بیوی عذاب سے نہ بچ سکی۔ دوسرے مقامات پر تصریح ہے کہ حضرت لُوطؑ کی یہ بیوی جو غالباً اہل سدوم سے نسبی تعلق رکھتی تھی اپنے کافر رشتہ داروں کی ہمنوا رہی اور آخر وقت تک اس نے کافروں کا ساتھ نہ چھوڑا۔

قرآن نے یہاں خاص طور پر بیوی کا ذکر اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے کیا ہے کہ نجات کا مدار صرف ایمان اور عمل صالح ہے۔ اس میں نسب اور نسبت کی قیمت نہیں ہے۔ قرآن میں حضرت نوحؑ کے بیٹے، حضرت ابراہیمؑ کے والد اور حضور انور کے چچا ابولہب کا ذکر پڑھو گے، بتایا گیا ہے کہ پیغمبر کی بیوی ہونا، پیغمبر کا بیٹا ہونا، پیغمبر کا باپ ہونا اور پیغمبر کا چچا ہونا کسی شخص کے لیے فائدہ مند نہیں ہے جب تک ایمان و عمل صالح کا مالک نہ ہو۔

آخر میں فرمایا وامطرنا علیھم مطرا، ہم نے ان پر پتھروں کی بارش کی، پتھروں کا اضافہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قرآن میں دوسری جگہ تصریح سے کیا امطرنا علیھم حجارۃ من سجیل الخ دراصل یہ بارش آگ اور پتھروں کی تھی جیسے کسی آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے کے وقت ہوتی ہے۔ عذاب کی کیفیت اور نوعیت پر تبصرہ توانشاء اللہ بارہویں جلد میں آرہا ہے۔ یہاں تو صرف یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جرائم پیشہ قوموں کے ساتھ اللہ سبحانہٗ کا یہی معاملہ رہا ہے کہ اگر وہ اپنے پیغمبر کو کسی قوم کی ہدایت کے لیے روانہ کرے اور قوم اس کی ہدایت پر کان نہ دھرے تو معجزہ عذاب اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتا جب تک آیاتِ ہدایت سے قوم کے تمام صالح اجزاء اس کے فاسد عنصر سے الگ نہیں ہوجاتے اور رسول کو بقیہ عناصر کے ایمان سے قطعی مایوسی نہیں ہوجاتی۔ یہی صورتِ حال حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت لوط کی قوموں کی ہے انہوں نے ایک طویل زمانے تک اپنی قوم کو دعوت دی اور اس کے بعد ناامید ہوکر آخری معجزہ کی دعا مانگی۔ اس موقعہ پر پہنچ کر پیغمبر کو اپنے مومنین کی جماعت کو ساتھ لے کر ہجرت کرنے کا حکم ہوتا ہے۔ حضرت نوح کو مع رفقاء کے کشتی پر چڑھا کر کفار سے الگ کیا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم نمرود کے ملک سے اپنی ہجرت کا اعلان کرتے ہیں۔ انی مہاجر الی ربی، حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلتے ہیں۔ حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت لوط سب نے اپنی اپنی جماعتوں کو لے کر اپنی نافرمان قوموں سے علیحدگی اختیار کی اور جب تک یہ ہجرت نہیں ہوجاتی معجزہ عذاب کی نمائش نہیں ہوتی ہے۔ یہی صورتِ حال حضرت لوط کے یہاں بھی پیش آتی ہے۔

عملِ قومِ لوط اور اس کی سزا

اس پر تو پوری اُمت کا اتفاق ہے کہ لواطت کبائر معاصی میں سے ہے اور یہ زنا کی طرح انتہائی گھناؤنا اور اخلاق سوز عمل ہے۔ قومِ لوط اس بیماری میں مبتلا تھی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بستی ہی کو اُلٹ دیا۔ یہ تو قرآن کی رہنمائی ہے۔ عقل یہی کہتی ہے کہ یہ فعل سراسر فطرت کے خلاف ہے کیونکہ حکمتِ الٰہی کا تقاضا تو یہ ہے کہ مرد میں قوتِ فعل اور عورت میں قوتِ انفعال ہو لہٰذا مرد میں انفعال کا پیدا ہونا فطری اصول کے خلاف ہے۔ اور پھر یہ کہ جنسی اختلاط بالذات مقصود نہیں بلکہ اصل مقصد تو الدو تناسل ہے اور لواطت اس مقصد سے بالکل تہی دامن ہے۔ نیز عورت اور مرد کے حلال جنسی تعلقات سے طرفین میں انس و محبت پیدا ہوتی ہے لیکن لواطت فاعل و مفعول کے درمیان شدید نفرت پیدا کرتی ہے۔ قدیم و جدید اطبا اس پر متفق ہیں کہ لواطت صحت کے لیے سخت مضر ہے اور اس میں مشغول ہونے والوں کا جسم دُبلا ہوتا ہے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوتی ہیں۔

چہرہ بے رونق اور دانت خراب ہوتے ہیں۔ سرخمیدہ جسم اور چہرے قبل از وقت بڑھاپے کے آثار، نگاہ کمزور، قوت فکر مختل، قوت ارادی ضعیف نامردی، احساس کمتری اور رعشہ وغیرہ عمل لواطت کے وہ انعامات ہیں جو زندگی بھر انسان کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔

قرآن میں عمل قوم لوط کو فاحشہ کہا ہے۔ اس عمل کے کرنے والوں کو مسرف، جاہل اور مجرم بتایا گیا ہے۔ احادیث میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی سے معلوم ہوا ہے کہ یہ ایک ایسا جرم ہے جس سے معاشرہ کو پاک رکھنے کی کوشش کرنا، حکومت اسلامی کے فرائض میں سے ہے اور یہ کہ اس جرم کے مرتکبین کو سنگین سزا ملنی چاہیے۔ ابو داؤد میں حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے ہمیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ ملتے ہیں۔ جس شخص کو تم قوم لوط کا عمل کرتے ہوئے پاؤ تو فاقتلوا الفاعل والمفعول بہ، فاعل اور مفعول بہ کو قتل کر دو۔ بیہقی میں حضرت ابوموسیٰ اشعری سے یہ روایت منقول ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر مرد مرد سے ہم جنسی کرے تو وہ دونوں زانی ہیں اور اگر عورت عورت سے ہم جنسی کرے تو وہ دونوں زانیہ ہیں۔ لیکن چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسا کوئی مقدمہ پیش نہیں آیا اس لیے قطعی طور پر یہ متعین نہیں ہو سکا کہ اس کی سزا کس طرح دی جائے۔ صحابہ کرام میں سے حضرت علی کی رائے ہے کہ مجرم کو تلوار سے قتل کیا جائے اور دفن کرنے کے بجائے اس کی لاش کو جلایا جائے۔ اسی رائے سے حضرت ابوبکر نے اتفاق فرمایا ہے۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان کی رائے یہ ہے کہ کسی بوسیدہ عمارت کے نیچے کھڑا کر کے وہ عمارت ان پر گرا دی جائے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس کا فتویٰ یہ ہے کہ بستی کی سب سے اونچی عمارت پر سے ان کو سر کے بل گرا دیا جائے اور اوپر سے پتھر برسائیں جائیں۔

مذکورہ بالا روایات کی بنا پر امام شافعی، امام مالک، امام احمد، امام ابویوسف اور امام محمد لواطت کو زنا کے حکم میں مانتے ہیں لیکن حد لواطت کے تعین میں ان کے درمیان اختلاف ہے۔ امام مالک فاعل اور مفعول بہ دونوں کے لیے رجم کی سزا تجویز کرتے ہیں خواہ وہ دونوں شادی شدہ ہوں یا غیر غیر شادی شدہ [1] امام شافعی اور امام احمد سے تین اقوال مروی ہیں ایک یہ کہ فاعل اور مفعول بہ پر زنا کا حکم جاری کر کے شادی شدہ کو رجم اور غیر شادی شدہ کو سو کوڑوں کی سزا دی جائے اور ایک سال کے لیے شہر بدر کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ فاعل کو رجم کر دیا جائے اور مفعول کو سو دُرّوں

[1] شرح الزرقانی۔

اور ایک سال شہر بدر کی سزا دی جائے تیسری یہ کہ دونوں کو قتل کر دیا جائے [1]

امام ابویوسف اور امام محمد فرماتے ہیں کہ لواطت مثل زنا کے ہے اس لیے اس پر زنا کا حکم جاری ہوگا اور شادی شدہ کو رجم اور غیر شادی شدہ کو سو درّے لگائے جائیں گے۔ سعید بن المسیب، عطا، حسن بصری، ابراہیم نخعی، سفیان ثوری اور اوزاعی کی بھی یہی رائے ہے۔ امام ابوحنیفہ کی رائے یہ ہے کہ لواطت زنا نہیں ہے اس لیے اس پر حد جاری نہیں کی جائے گی بلکہ تعزیر ہوگی اور اس کی صورت یہ ہے کہ فاعل و مفعول کو کسی گندی جگہ پر قید کر دیا جائے کہ وہ قید ہی میں مر جائیں یا پھر توبہ کرلیں۔ البتہ اگر کوئی شخص عادی لوطی ہو تو حاکم سزا کے طور پر اسے قتل کر سکتا ہے [2]

وہ تمام ائمہ جو لواطت کو مثل زنا مانتے ہیں ان کا استدلال روایات بالا سے ہے لیکن امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ لواطت نہ تو زنا ہے اور نہ زنا کے حکم میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کے درمیان اس کی سزا کے بارے میں اختلاف ہوا۔ کچھ نے کہا کہ آگ میں جلا دیا جائے۔ کچھ نے بتایا کہ اس پر دیوار گرا دی جائے۔ کچھ کی رائے ہوئی کہ اسے کسی اونچی جگہ سے گرا دیا جائے۔ پھر اس پر پتھر برسائے جائیں اور کچھ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ صحابہ کرام اہلِ زبان تھے۔ اگر زنا اور لواطت ہم معنے الفاظ ہوتے تو ان کے درمیان اختلاف کیوں ہوتا۔

اس تمام تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ اختلاف صرف اس میں ہے کہ اس میں خدا کی بتائی ہوئی حد ہے یا نہیں۔ قانون کی اصطلاح میں حد نام ہے اس سزا کا جو اللہ تعالیٰ کے حق کی حیثیت سے واجب ہوتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قانون میں اس کی کوئی ایسی سزا تجویز نہیں ہوتی جسے حد کہہ سکیں۔ مطلب یہ ہے کہ اختلاف سزا میں نہیں نوعیتِ سزا میں ہے۔ امام ابوحنیفہ اس کی سزا کو تعزیر کہتے ہیں۔ تعزیر اس سزا کو کہتے ہیں جس کی مقدار شریعت نے مقرر نہیں کی بلکہ اس کا انحصار حاکمِ وقت کی رائے پر ہے کہ وہ جیسے حالات و ضروریات ہوں ان کے لحاظ سے کوئی عبرتناک سزا اس پر دے۔ گویا جیسے نفس سزا میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ایسے ہی جرم کی سنگینی میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ جرم کی سنگینی تو ہے کہ احناف اس کے لیے زانی کی سزا سے زیادہ سنگین سزا تجویز کر رہے ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں کہ فاعل و مفعول کو سخت گندی جگہ پر قید کر دیا جائے کہ وہ غلاظت کی وجہ سے ہلاک ہو جائیں [3] حد کی نسبت تعزیر میں زیادہ سنگینی ہے اور اس میں گنجائش ہے کہ

---

[1] التشریع الجنائی [2] فتح القدیر۔ [3] فتح القدیر۔

عدالت پیش پا افتادہ حالات کے مطابق چاہے تو اسے قتل کر دے جیسے حضرت علی کی رائے ہے۔ چاہے تو کسی اونچے مکان سے گرا کر ہلاک کر دے۔ بہر حال اسلامی حکومت اس موضوع پر جرم کی سنگینی کے مطابق تعزیری قوانین بنانے کی مجاز ہے۔

ہمارے زمانے میں جس تیزی سے یہ بیماری پھیل رہی ہے اس کے پیش نظر ضروری ہے کہ حکومت اس سلسلے میں قانون سازی کرے اور اگر حکومت اسے زنا کے حکم میں رکھ کر شادی شدہ کے لیے سو دروں اور غیر شادی شدہ کے لیے سنگساری کی سزا کا قانون بنا دے تو اس کی بھی گنجائش ہے کیونکہ یہ بھی امام ابو یوسف اور امام محمد کا مسلک ہے۔

لواطت ان جرائم میں سے ہے جن پر قرآن نے نجاست اور خباثت کا فتویٰ لگایا ہے۔ قرآن نے سارے گناہوں میں سے شرک، زنا اور لواطت و خبیث اور نجس کہا ہے۔ شرک کی نجاست دو قسم کی ہے نجاست مغلظہ اور نجاست مخففہ۔ مغلظہ شرک اکبر ہے اور مخففہ شرک اصغر ہے۔ زنا اور لواطت کی نجاست دوسرے گناہوں کی نجاست سے زیادہ ہے اس لیے اسلام میں ان جرائم کی سنگین سزا ہے۔ حافظ ابن القیم الجوزی نے اغاثۃ اللھفان میں اور ابن حجر مکی نے الزواجر میں اس پر اچھا تبصرہ کیا ہے۔

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم
مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ
وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي
الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝
وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ
مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوا إِذْ كُنتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ ۖ
وَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ۝ وَإِن كَانَ طَائِفَةٌ
مِّنكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ وَطَائِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوا فَاصْبِرُوا حَتَّىٰ
يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ۝

اور مدین والوں کی طرف ہم نے اُن کے بھائی حضرت شعیب کو روانہ
کیا[١١٠]۔ انہوں نے فرمایا اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو اللہ
کے سوا تمہارا کوئی حاکم نہیں۔ تمہارے پاس تمہارے رب

کی طرف واضح دلیل آچکی ہے۔[111] لہٰذا وزن اور پیمانہ پورا کرو اور
لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو اور ملک میں فساد بپا نہ کرو
جب کہ اس کی درستگی ہو چکی ہو، اسی میں تمہاری بھلائی ہے اگر
تم واقعی مومن ہو۔[112] اور راستوں میں اہلِ ایمان کو دھمکانے اور خدا
کی راہ سے روکنے اور راہِ حق میں کجی تلاش کرنے کے لیے نہ
بیٹھو۔[113] اللہ کا یہ احسان یاد کرو کہ تم بہت تھوڑے تھے اس
نے تمہاری تعداد زیادہ کر دی اور غور کرو کہ مفسدین کا انجام کیا
ہوا ہے۔[114] اگر تم میں سے ایک گروہ اس تعلیم پر ایمان لے آیا
جسے مجھے دے کر روانہ کیا گیا ہے اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا
تو صبر کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہ
بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔[115]

معانی مفردات

صراط، راہ، راستہ، سیدھے اور آسان راستہ کو صراط کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ صراط اصل سراط ہے،

اس میں س کا ص سے قلب ہے تاکہ اطباق میں ط کے مطابق ہو جائے۔ اس کی اصل سرطت الطعام سے ہے جس کا استعمال کھانے کے نگلنے کے لیے ہوتا ہے گویا سراط میں اس کا تصور ہے کہ رہرو راہ کو نگل لیتا ہے یا راستہ رہرو کو ہڑپ کرتا جاتا ہے۔ عربی کی مثل ہے قتل ارضاً عالمها و قتلت ارض جاهلها زمین سے واقف نے زمین کو ختم کر دیا اور اس سے ناواقف کو زمین نے مار ڈالا۔ اس کی جمع سرطیا صرط ہے جیسے کتاب کی جمع کتب ہے۔ طائفۃ، گروہ، جماعت، کچھ لوگ، ایک اور ایک سے زیادہ۔ سب طائفہ کہلاتا ہے۔ طوف سے اسم فاعل کا واحد مونث۔ علامہ عینی عمدۃ القاری میں رقمطراز ہیں۔ لغت میں طائفہ کے معنے ہیں کسی چیز کے ایک ٹکڑے کے۔ عباب میں ہے الطائفۃ من الشئ القطعۃ، اور علامہ شہاب الدین خفاجی فرماتے ہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ طائفہ اصل میں اسم فاعل ہے طوف سے جس کے معنے چکر لگانے کے ہیں۔ یہ یا تو نفس کی صفت ہے نفس طائفۃ، اس صورت میں واحد کے لیے بولا جاتا ہے یا جماعت کی صفت ہے اور ایک سے زیادہ کے لیے بولا جاتا ہے۔ تو گویا یہ ان [illegible] معانی میں مشترک ہے اور ہر مقام پر اس مقام کے مناسب معنے پر محمول ہوتا ہے اور علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں طائفہ سے جب جماعت مراد لی جائے گی تو طائف کی جمع ہو گا اور جب اس سے واحد مراد ہو گا تو اس صورت میں اس کا جمع ہونا بھی صحیح ہے اور اس کے ذریعہ واحد سے کنایہ ہو گا اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس کو راویۃ اور علامۃ وغیرہ کی طرح قرار دیا جائے یعنی اس کی تا کو مبالغہ کی تا قرار دیا جائے نہ کہ تانیث کی۔ اس پر مزید تبصرہ انشاء اللہ گیارہویں جلد میں آرہا ہے۔

ایک اور واقعاتی شہادت

سامی قومیں عموماً اپنی آبادی اور قومیت کو اپنے بزرگوں کے نام سے موسوم کرتی ہیں۔ مدین قوم ہو یا آبادی اپنے خاندان کے بانی موسس مدین ابن ابراہیم کی طرف منسوب ہے۔

مدین نے اپنی آبادی اپنے ہی نام سے اپنے بھائی حضرت اسماعیل کے پہلو میں قائم کی۔ یہ ملک طولاً خلیج عقبہ کے سواحل پر دہانہ خلیج سے ساحل بحر احمر تک واقع تھا۔ قرآن پاک میں مدین کا ذکر دو سبب سے آتا ہے۔ اول حضرت شعیب، دوسرے حضرت موسیٰ کے تعلق سے۔ اہل مدین بڑے تجارت پیشہ لوگ تھے۔ قدیم زمانے میں جو تجارتی شاہراہ بحر احمر کے کنارے یمن سے مکہ اور ینبع ہوتی ہوئی شام تک جاتی تھی اس پر اس قوم کی بستیاں تھیں۔ اسی بنا پر عام عرب مدین سے واقف تھے۔

مدین حضرت ابراہیم کی بیوی قطورا کے بطن سے بیٹے ان کی طرف نسبت کرکے آبادی کا نام مدین ہوا، اوران کی ہی نسبت سے مدین قوم بنی۔ یعنی مدین کے علاقے کی ساری آبادی جو مدیان بن ابراہیم کے زیر اثر آئی بنی مدیان کہلائی۔ اوران کے ملک کا نام بھی مدین یا مدیان مشہور ہو گیا۔ مدین کے قبائل ایک منتظم زندگی رکھتے تھے۔ شہر میں مذہبی رسوم وآداب کی تلقین و محافظت کے لیے کاہن مذہبی عہدہ دار ہوتے تھے۔ کاہن شہر کے قانونی حاکم ہوتے تھے۔ حضرت موسیٰ کے عہد میں جو کاہن تھا اس کا نام تورات میں کہیں راعویل کہیں ثیرو، کہیں حوباب مذکور ہے لیکن مسلمان مفسرین کے نزدیک یہ شعیب تھے جو لفظاً حوباب سے بہت قریب ہے۔ حضرت موسیٰ جب مصر سے ہجرت کرکے مدین پہنچے تو اُن کے یہاں بھی مہمان ہوتے اوران کے یہاں بکریاں چرانے پر ملازم ہوگئے اور اس کے معاوضہ میں حضرت شعیب نے اپنی ایک بیٹی حضرت موسیٰ کی زوجیت میں دے دی۔ ۱۵۰۰ تا ۱۶۰۰ قبل مسیح تک حضرت موسیٰ کا عہد ہے مدین اس وقت پانچ شیوخ قبائل کے ماتحت تھا ان کے نام یہ ہیں۔ عوی۔ رقیم، صنور، حور اور ربع۔ یوسیفوس میں یہودی جو پہلی صدی مسیحی میں تھا اس کا بیان ہے کہ شہر رقیم اسی مدیانی بادشاہ رقیم کے نام سے آباد ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد قدیم میں مدین کی شمالی حد کہاں تک وسیع تھی۔ حضرت شعیب کا نسب نامہ ہمارے شارحین قرآن نے تفاسیر میں یوں لکھا ہے شعیب بن میکیل بن یشجر بن مدین ابن ابراہیم۔

۱۱۰- اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی حضرت شعیب کو روانہ کیا۔ قرآن میں دوسری جگہ حضرت شعیب علیہ السلام کا اصحاب ایکہ کی طرف مبعوث ہونا مذکور ہے۔ اگر اصحاب مدین اوراہل ایکہ ایک ہی قوم ہیں تو نبہا د نعمت اور اگر دو جداگانہ قومیں ہیں تو دونوں کی طرف مبعوث ہوتے ہوں گے اور دونوں میں کم تولنے اور کم ناپنے کی بیماری ہوگی۔ بہرحال حضرت شعیب نے توحید کی دعوت عام کے ساتھ خاص معاشرتی معاملات کی اصلاح اور حقوق العباد کی حفاظت کی طرف بڑے زور سے توجہ دلائی جیسا کہ آئندہ آیات میں مذکور ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو کمالِ فصاحت کی وجہ سے خطیب الانبیاء کہا جاتا ہے [1]۔

مفسرین اس بارے میں مختلف الخیال ہیں کہ مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی قبیلہ کے دو نام ہیں یا دو جدا جدا قبیلے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ دو جُدا جُدا قبیلے ہیں۔ مدین متمدن اور شہری قبیلہ تھا اور

[1] افادات شیخ الاسلام

اصحاب ایکہ دیہاتی اور بدوی قبیلہ جو جنگل اور بن میں رہتا تھا اس لیے اس کو بن والا کہا گیا اور دوسرے مفسرین نے دونوں کو ایک ہی قرار دیا ہے اور فرماتے ہیں کہ آب و ہوا کی لطافت نہروں اور آبشاروں کی کثرت نے اس مقام کو اس قدر شاداب و پرفضا بنا دیا تھا اور یہاں میووں، پھلوں اور خوشبودار پھولوں کے اس قدر باغات تھے کہ اگر ایک شخص آبادی سے باہر کھڑا ہو کر نظارہ کرتا ہے تو اس کو یہ معلوم ہوتا کہ یہ نہایت خوبصورت درختوں کا ایک بن ہے۔ ان مفسرین میں سے حافظ ابن کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہاں ایکہ نام ایک درخت کا تھا۔ اہل قبیلہ چونکہ اس کی پرستش کرتے تھے لہٰذا اس کی نسبت سے مدین کو اصحاب ایکہ کہا گیا ہے۔ الغرض یہ بات بڑی پیچیدہ ہے کہ مدین اور اصحاب الایکہ کون ہیں۔ اس پر تفصیلی تبصرہ انشاء اللہ ہم چودھویں جلد میں کریں گے۔ یہاں حضرت شعیب کو اہل مدین کا بھائی کہنا اس بات کی طرف کھلا اشارہ ہے کہ حضرت شعیب کا اہل مدین سے نسلی اور نسبی رشتہ ہے اور سورۂ شعراء میں اصحاب الایکہ کے موضوع پر حضرت شعیب کی اخوت سے خاموشی اس بات کی دلیل ہے کہ اصحاب الایکہ سے حضرت شعیب کا نہ نسلی اور نسبی رشتہ ہے اور نہ جنسی و وطنی۔

حضرت شعیب کی دعوت توحید

۱۱۱۔ انہوں نے فرمایا اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو، اللہ کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں ہے تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیل آ چکی ہے۔ یعنی میری صداقت کی دلیل ظاہر ہو چکی اب جو نصیحت کی بات تم سے کہوں اسے قبول کرو اور جن خطرناک عواقب پر متنبہ کروں ان سے ہوشیار ہو جاؤ۔[۱]

یہ اندازِ تعبیر بتا رہا ہے کہ حضرت شعیب کی قوم خدا کی منکر نہ تھی اور نہ خدا کی عبادت کا انکار کرتی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ پر ان کا ایمان ایک تاریخی واقعیت سے زیادہ نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ کو پروردگار سمجھنا اس کو آسمان و زمین کا خالق ماننا اور اس کو معبود تسلیم کرنا ایسا ہی تھا جیسے تاریخ کے کسی طالب علم سے پوچھا جائے کہ یہ قدیم عمارت کس کی تعمیر ہے وہ جواب دے کہ فلاں بادشاہ کی۔ اس بادشاہ کے نام سے اس کے قلب پر خوف و ہراس کی کوئی لہر نہ دوڑے نہ اس کے دماغ پر کوئی اثر پڑے۔ ان لوگوں کے دل اللہ کے خوف اور تضرع سے خالی تھے۔ اللہ کی صفات سے بالکل

[۱] افادات شیخ الاسلام

بے خبر تھے اس لیے ان کے دل میں اس کی محبت کا کوئی جذبہ اور اس کی عظمت و کبریائی کا کوئی نقش نہ تھا حضرت شعیب کے ظہور کے وقت ان کی حالت نبی کی بگڑی ہوئی اُمت کی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد مشرک قوموں میں رہتے رہتے یہ لوگ شرک سیکھ گئے تھے۔ تمدن کے جراثیم جن امراض کو پیدا کرتے ہیں وہ ایک ایک کر کے ان میں پیدا ہو چکے تھے۔ بتوں کی پرستش اور ان کے لیے قربانی ان کا مذہب تھا۔ تمام بُتوں کا سردار "بعل فور" دیوتا تھا۔ اخلاقی حالت اس قدر پست تھی کہ شرفائے خاندان کی لڑکیاں انسانیت کا بدترین نمونہ تھیں۔ مردوں کا یہ حال تھا کہ ظلم و ستمگری ہی ان کی زندگی کا معمولی پیشہ تھا[1] حضرت شعیب نے سارے انبیاء کی طرح سب سے پہلے اُن کو یگانہ خدا کی عبادت کی دعوت دی اور ہر قسم کے شرک سے بچنے کی تلقین کی۔ اور دعوت و اصلاح کا کام اس صحیح راستہ سے شروع کیا جہاں سے اللہ کے سارے نبی شروع کرتے ہیں۔ آپ نے سب سے پہلے لوگوں کو یگانہ خدا کی عبادت کی دعوت دی اور معبودانِ باطل کے انکار کی تلقین کی۔ گویا آپ نے پوری قوم سے کہا کہ لوگو کہو لا الٰہ الا اللہ۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور یہ فرمانے کے بعد آپ نے لوگوں کو بتایا کہ میرا یہ کہنا کسی لیڈر یا زعیم کا کہنا نہیں ہے۔ خدا کے رسُول کی حیثیت سے یہ بات کہہ رہا ہوں اور میرے دعویٰ رسالت کی صداقت پر صاف دلیل واضح حجت تم تک پہنچ چکی ہے قد جاءتکم بینۃ من ربکم

یہاں بینۃ سے کیا مراد ہے قرآن نے کوئی تصریح نہیں کی۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد کوئی حسی معجزہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد خود ان کی اپنی ذات اور اپنی دعوت ہو کیونکہ رسُول خود اپنی ذات میں ایک کامل بینہ اور کامل حجت ہوتا ہے۔ قرآن میں رسُول کو بینہ بتایا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

لم یکن الذین کفروا من اھل الکتاب والمشرکین منفکین حتیٰ تاتیھم البینۃ رسول من اللہ یتلوا صحفا مطھرۃ۔

اہل کتاب اور مشرکین میں سے کفر پسند لوگ اپنے کفر سے باز آنے والے نہ تھے یہاں تک کہ ان کے پاس آجاتے یعنی اللہ کا ایسا رسُول جو پاکیزہ کتاب پڑھتا ہو۔

یعنی وہ ہر پہلو سے حق کو اس طرح واضح اور مدلل کر دیتا ہے کہ ہٹ دھرم اور ضدی لوگوں کے سوا کسی کے لیے بھی اس سے روگردانی کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ معجزہ نبوت نبوت کے شرائط میں سے نہیں بلکہ ضروریات اور توابع میں سے ہے: کوئی قوم اگر مطالبہ کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اگر چاہتا ہے

[1] ارض القرآن

اتمام حجت کے طور پر نبی کے ذریعے معجزہ ظاہر کر دیتا ہے - نبی کی اصل دعوت ان بینات پر مبنی ہوتی ہے جو اللہ کی طرف سے بصورتِ احکام اس کو ملتے ہیں اور اس کی زندگی ان بینات کا مظہر کامل ہوتی ہے وہ اپنی قوم کے اندر ایک چلتا پھرتا نور ہوتا ہے - اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر کلمہ، اس کا ہر اشارہ، اس کا ہر عمل، اس کی صداقت، اس کی حکمت اور اس کے سفیر الٰہی ہونے کی ایسی گواہی ہوتا ہے کہ اس کی تکذیب صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو حقیقت سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں -

معاملات میں بددیانتی اور سیاسی بگاڑ

۱۱۲ - لہٰذا وزن اور پیمانہ پورا کرو، اور لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو اور ملک میں فساد بپا نہ کرو جب اس کی درستگی ہو، اسی میں تمہاری بھلائی ہو اگر تم واقعی مومن ہو - بندوں کے حقوق کی رعایت اور معاملاتِ باہمی کی درستی جس کی طرف ہمارے زمانہ کے پرہیزگاروں کو بھی بہت کم توجہ ہوتی ہے - خدا کے نزدیک اس قدر اہم چیز ہے کہ اسے ایک جلیل القدر پیغمبر کا مخصوص وظیفہ قرار دیا گیا جس کی مخالفت میں ایک قوم تباہ ہو چکی - ان آیات میں حضرت شعیب کی زبانی آگاہ فرما دیا کہ لوگوں کو ادنیٰ ترین مالی نقصان پہنچانا اور ملک میں اصلاحی حالت قائم ہو چکنے کے بعد خرابی اور فساد پھیلانا خواہ کفر و شرک کر کے یا ناحق قتل و نہب وغیرہ یہ کسی ایماندار کا کام نہیں ہو سکتا [۱]

بحر احمر کی جو شاخ عرب اور جزیرہ نمائے سینا کے درمیان سے گزری ہے اسی کے کنارے قوم مدین آباد تھی - چونکہ یہ جگہ شام، افریقہ اور عرب کے تجارتی قافلوں کا نقطہ اتصال تھی - اس لیے اشیاء تجارت کے مبادلہ کی بڑی منڈی بن گئی تھی اور لوگ خوشحال ہو گئے تھے - تجارت میں پیشہ ورانہ حیثیت سے غالباً دنیا کی تاریخ میں یہ پہلی قوم ہے - اس بنا پر اس میں یہ مذموم صفت پیدا ہو گئی جو حالات کے بالکل مناسب ہے - اس میں صرف خرید و فروخت کی کمی بیشی مراد نہیں ہے بلکہ سود بٹہ اور دیگر اصنافِ تجارت ممنوعہ مراد ہیں جن کے ذریعہ تاجر و صاحبِ معاملہ لوگوں کو ان کے جائز حق سے ہمیشہ کم مالیت دیتے ہیں - اسی بنا پر حضرت شعیب کی قوم نے حضرت شعیب سے کہا تھا :

او ان نفعل فی اموالنا ما نشاء ہم اپنے اموال میں جو چاہیں کریں -

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

یعنی شعیب علیہ السلام سے دریافت کیا کہ،

تمہاری یہ پوجا پاٹ نمازیں کیا اس سے بھی روکتی ہیں کہ ہم اپنے مالیاتی مسائل میں جو چاہیں کریں۔

گویا ان کا خیال یہی تھا کہ نماز دعا وغیرہ کو انسان کے معاشی کاروبار سے کیا تعلق ہے شاید وہ بھی یہی کہتے ہوں کہ اسلام محض ایک پرسنل اور شخصی مشغلہ کی حیثیت سے اگر زندہ رہنا چاہیے تو جی سکتا ہے لیکن زندگی کے عمومی اور اجتماعی شعبوں میں اس کی دخل اندازیوں کو برداشت نہیں کیا جاسکتا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ وہ مسجد کو دنیا دی کاروبار سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔

اس رائے کی تائید مفسرین کی تشریحات سے بھی ہوتی ہے۔ مشہور مفسر قرآن امام بغوی فرماتے ہیں:

کہتے ہیں کہ حضرت شعیب نے ان کو درہم دینار میں بٹہ لینے سے منع کیا تھا اور کہا کہ یہ حرام ہے۔

محدّث ابن جریر طبری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

زید بن اسلم کہتے ہیں کہ حضرت شعیب ان کو بٹہ لینے سے روکتے تھے محمد بن کعب القرظی کہتے ہیں کہ شعیب کی قوم کو بٹہ لینے کی پاداش میں عذاب ہوا۔

آیت میں خاص طور پر ناپ تول کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ تجارتی کاروبار اور لین دین میں عام طور پر اشیاء ناپی اور تولی جاتی ہیں ورنہ یہ کوئی قید احترازی نہیں۔ اصل مقصود معاملات میں دیانت اور راست بازی کی تعلیم ہے۔ ناپ تول میں کمی کرنا کوئی منفرد بیماری نہیں ہے بلکہ یہ نتیجہ ہے کسی قوم میں بہت سی اخلاقی، معاشرتی بیماریوں کا اخلاقی اعتبار سے ان میں بہت سی بیماریاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ان میں سے کچھ کی قرآن یہاں نشاندہی کر رہا ہے۔ یہ لوگ چونکہ تجارت پیشہ تھے اس وجہ سے ان میں بھی اخلاقی بگاڑ ناپ تول میں خیانت کی صورت میں ظاہر ہوا لیکن یہ خیانت صرف ناپ تول تک ہی محدود نہ تھی بلکہ ان کا پورا نظام تمدن و تہذیب اس سے بگڑا ہوا تھا۔ اسی کی طرف قرآن نے یہاں لا تفسدوا فی الارض کہہ کر اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی ظالمانہ طرز عمل اختیار کر کے سیاسی نظام کو لوگوں کے اموال پر غاصبانہ قبضہ، لوٹ مار، چوری، اور رہزنی کر کے اور قتل و غارت گری کے ذریعے نظام عدل فواحش کا ارتکاب کر کے نظام اخلاق کو تباہ و برباد نہ کرو۔ فساد سے مراد صرف فساد افکار و عقائد نہیں بلکہ اخلاق، معیشت، سیاست، معاش، معاشرت اور قانون کا فساد بھی اس میں داخل ہے۔ شرک اور کفر کے ذریعے عقائد و اعمال میں جو فساد پھیلتا ہے وہ اس کا مدلول ہے

بعد اصلاحھا کی قید فساد کی شناعت بتانے کے لیے ہے یعنی ملک میں فساد پیدا کرنا بجائے خود سب سے بڑا جرم ہے لیکن یہ جرم سنگین سے سنگین تر ہو جاتا ہے جب یہ اصلاح کے بعد واقع ہو اس لیے کہ یہ بگڑی ہوئی چیز کو بگاڑنا نہیں بلکہ بنی ہوئی چیز کو بگاڑنا ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ دینِ حق اور اخلاقِ صالحہ پر زندگی کا جو نظام انبیائے سابقین کی ہدایت و رہنمائی میں قائم ہو چکا تھا اب تم اسے اپنی اعتقادی، اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور قانونی گمراہیوں سے خراب نہ کرو۔ ہمیشہ لوگوں نے اپنی سرکشی کے سبب سے بار بار نظامِ اسلام کو درہم برہم کیا ہے اور قدرت کے ہاتھوں نے ہر بار اسے نبوّت کے ذریعے دُرست کیا ہے۔ حضرت نوح سے لے کر حضرت شعیب تک ہر قوم ہر رسُول کی تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے۔ اہلِ مدین کو بھی جو اقتدار حاصل ہوا تھا یہ لوگ دین و شریعت سے ناآشنا لوگ نہ تھے بلکہ حضرت ابراہیم کے خاندان سے نسبت رکھنے والے اور پچھلے نبیوں کی تعلیم کے حامل ہونے کے مدعی تھے۔ دوسری قوموں کی طرح انہوں نے بھی اس تعلیم کو اپنی خواہشاتِ نفس کے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ اسی بنیاد پر حضرت شعیب نے اُن سے کہا کہ ذالکم خیر لکم ان کنتم مومنین۔ اگر تمہیں ایمان کا دعویٰ ہے تو اس دعویٰ کی صداقت کے لیے ضروری ہے کہ اس فساد کی روش کو چھوڑ کر اصلاح کا وہ طریقہ اختیار کرو جس کی دعوت میں لے کر آیا ہوں۔ یہی طریقہ اس ایمان کا تقاضا ہے جس کے تم مدعی ہو۔ اس فقرے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ خود مدعیٔ ایمان تھے۔ اعتقادی اور اخلاقی فساد میں مبتلا ہونے کے باوجود ان کے اندر نہ صرف ایمان کا دعویٰ باقی تھا بلکہ اس پر انہیں فخر بھی تھا۔ اسی لیے حضرت شعیب نے فرمایا کہ اگر تم مومن ہو تو تمہارے نزدیک خیر اور بھلائی راست بازی اور دیانت ہونی چاہیے اور تمہارا معیارِ خیر و شر ان دُنیا پرستوں سے مختلف ہونا چاہیے جو خدا اور آخرت کو نہیں مانتے۔

قومِ شعیب کی باغیانہ سرگرمیاں

۱۱۳۔ اور راستوں میں اہلِ ایمان کو دھمکانے اور خدا کی راہ سے روکنے اور راہِ حق میں کجی تلاش کرنے کے لیے نہ بیٹھو۔ راستوں میں بیٹھنا دو وجہ سے تھا۔ راہ گیروں کو ڈرا دھمکا کر ظلماً مال وصول کریں اور مومنین کو شعیب کے پاس جانے اور خدا کا دین اختیار کرنے سے روکیں اور خدائی مذہب کے متعلق نکتہ چینی اور عیب جوئی کی فکر میں رہیں[1]

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اس آیت میں دراصل قوم کے سرکشوں کی ان سرگرمیوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو قوم مدین کے افراد اہل ایمان کو خوفزدہ کرنے اور راہ ایمان سے ہٹانے کے لیے اختیار کیے ہوئے تھے۔ یہ سرگرمیاں تین قسم کی تھیں ایک یہ کہ راستوں میں بیٹھ کر ان لوگوں کو ہراساں کرتے تھے جو حضرت شعیب کے پاس آتے تاکہ اس دعوت کا مطالعہ کریں جو حضرت شعیب پیش کر رہے ہیں۔ آنے والوں کو حضرت شعیب کی ملاقات اور ان کی زیارت کا موقعہ ہی نہ دیتے، ظاہر ہے کہ حضرت شعیب نے دعوت اولاً مقامی لوگوں کے سامنے پیش کی ہوگی بعدازیں دور دور رہنے والوں تک اپنی بات پہنچائی ہوگی اور باہر کے لوگوں نے اس کا استقبال کیا ہوگا۔ یہ مقامی لوگ ان بیرونی لوگوں کو پریشان کرتے ہوں گے اور راستوں ہی میں ان کو دھمکیاں دے کر خوف دلا کر کوشش کرتے ہوں گے کہ حضرت شعیب کی ہمنوائی کا راستہ اختیار نہ کریں۔ حضرت عبداللہ ابن عباس سے لا تقعدوا بکل صراط توعدون۔ کی تشریح اسی کے قریب قریب منقول ہے وہ فرماتے ہیں :

وہ لوگ راستہ میں بیٹھ جاتے اور آنے والوں سے کہتے کہ شعیب جھوٹے ہیں وہ تمہیں تمہارے دین سے ہٹانا چاہتے ہیں۔

اور یہ بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے کہ وہ راہ زنی کا کام کرتے تھے اور آنے والوں کو ڈرا دھمکا کر جو کچھ ان کے پاس ہوتا چھین لیتے۔ اور کچھ علماء نے یہ بھی تشریح کی ہے کہ شہر میں آنے والے راستوں پر لوگوں سے ان کے مالوں پر چنگی اور راہ گیری وصول کرتے تھے۔ توعدون کا مفعول محذوف ہے اس لیے سب باتوں کی اس میں گنجائش ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ لوگوں کو اللہ کے راستہ میں سے روکتے تھے۔ اللہ کے راستہ سے مراد وہ نظام حیات ہے جو حضرت شعیب اللہ کی طرف سے لے کر آتے اور جس کی دعوت دے رہے تھے یعنی چاہتے تھے کہ رائے عامہ اس دعوت کو قبول نہ کرے اور حضرت شعیب علیہ السلام کی ہمنوا نہ بنے۔ اس کے مفہوم میں یہ بات داخل ہے کہ اہل مدین نے حضرت شعیب کی دعوت اور اس کے مقاصد کو سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی اور اس میں ان کو کوئی پیچیدگی محسوس نہیں ہوئی جیسے ہی آپ کی آواز سے سننے والوں کے کان آشنا ہوئے وہ اچھی طرح سمجھ گئے کہ یہ دعوت ایسا تیر ہے جو ہمارے افکار و عقائد، ہمارے اخلاقیات، ہماری معاشیات، ہماری روحانی نظام کے گھروندے کے نشانہ پر بیٹھ جائے گا اور اسے پاش پاش کر دے گا۔ خطرہ کے اس احساس سے مدین کے تمدن و تہذیب اور اقتدار میں جوش پیدا ہوا۔ قوم کے سورما مقابلہ کے لیے میدان میں آکر پوری قوت سے حضرت شعیب

کے لائے ہوئے نظام کی راہ میں آہنی دیوار بن گئے۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ اہل مدین کی تہذیبی عمارت متزلزل ہے اور پورا نظام زندگی خطرے میں اس موقعہ پر سختی، دباؤ، ظلم و زیادتی کے جو لرزہ خیز واقعات پیش آتے ہوں گے قرآن کا یہ بلیغ فقرہ و تصدون عن سبیل اللہ ان ہی کی عکاسی کر رہا ہے۔

تیسری یہ کہ اہل ایمان میں حضرت شعیب کے پیش کردہ نظام کے متعلق شکوک و شبہات کی تخم ریزی کی جاتے اور بتایا جاتے کہ تمدن کی اس ترقی اور تہذیب کے اس دور میں وہ نظام کیسے چل سکتا ہے جو سود پر قدغن قائم کرتا ہے۔ مالیاتی مسائل کیسے حل ہوں۔ معاشی مشکلات پر قابو کیسے پایا جائے گا وغیرہ وغیرہ وہ تمام شبہات جو ہر دور میں مخالفوں کی جانب سے پیش ہوتے رہے ہیں۔ توحید رسالت، عبادات، معاملات، اخلاقیات، جزا و سزا سب پر شبہات کی ایسی بارش کر دی جاتے کہ اہل ایمان کی زمین ہل کر رہ جائے۔

اس آیت میں حضرت شعیب نے اپنے مخاطبوں کو ہدایت کی ہے کہ یہ تینوں کام چھوڑ دو۔ غور سے دیکھو ان تین باتوں کا شکار آج ہمارا معاشرہ بھی ہے کہیں دانشوروں اور فلاسفروں کی تقلید کے بہانہ اور کہیں آزادئ رائے کے سہارے نبوت کے خلاف یہ تینوں ہتھیار استعمال ہو رہے ہیں۔ افسوس کہ تفصیل کا موقعہ نہیں ہے۔

اہل مدین کی مادی اور افرادی قوت

۱۱۴۔ اللہ کا یہ احسان یاد کرو کہ تم بہت تھوڑے سے تھے اس نے تمہاری تعداد زیادہ کر دی اور غور کرو کہ مفسدین کا انجام کیا ہوا ہے۔ یعنی تعداد اور دولت دونوں میں کم تھے۔ خدا نے دونوں طرف سے تم کو بڑھایا۔ مردم شماری بھی بڑھ گئی اور دولت مند بھی ہو گئے۔ خدا کے ان احسانات کا شکر کرو اور وہ جب ہی ادا ہو سکتا ہے کہ خدا کے اور بندوں کے حقوق پہچان کر عملی درستی اور اصلاح میں مشغول رہو اور ان نعمتوں پر مغرور نہ ہو بلکہ خرابی اور فساد مچانے والوں کا جو انجام ہو چکا ہے اسے پیش نظر رکھ کر خدا کی گرفت سے ڈرتے رہو[1] مطلب یہ ہے کہ تم چھوٹے خاندان کی شکل میں اس علاقہ میں آکر بسے تھے پھر اللہ سبحانہ نے تمہاری افرادی قوت میں اضافہ کر کے تم کو ایک طاقتور قوم بنا دیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے تکثیر سے افرادی قوت کا اضافہ ہی مراد لیا ہے۔ حضرت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ابراہیم کا زمانہ ۲۱۰۰ تا ۲۲۰۰ قبل مسیح ہے۔ ان کے بیٹے مدین نے اپنی آبادی اپنے ہی نام سے آباد کی۔ ایک خاندان کو قوم کی حیثیت پیدا کرنے کے لیے کم از کم دو سو برس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے مدین تورات میں سب سے پہلے عہد یعقوب میں ۲۰۰۰ قبل مسیح سوداگران کے بھیس میں نظر آتے ہیں۔ حضرت یوسف کو جو کارواں تجارت کنعان سے مصر لے گیا تھا وہ بھی اہل مدین تھے۔ شارحین قرآن نے بھی یہی سمجھا ہے۔ یہ تجارت کی تاریخ کا سب سے پہلا صفحہ اور اسماعیلی اور مدیانی عربوں کی تجارت کا سب سے پہلا قافلہ اور مصر ان کی تاجرانہ رحلت کی اولین منزل ہے۔ اس واقعہ سے چار سو برس کے بعد جب حضرت موسیٰ کا ظہور ہوا اور دعوت حق کے جرم میں ان کو مصر سے ہجرت کرنی پڑی تو ان کا ملجا اسی قافلہ کی سرزمین تھی۔ جو ان کی قوم کو چار سو برس پہلے مصر پہنچا گئی تھی یعنی مدین اس عرصہ میں اہل مدین کی افرادی قوت میں کس قدر ترقی ہوئی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مدین حضرت موسیٰ کے زمانہ میں پانچ بادشاہوں کے تحت تھا۔ اس کا علاقہ طولاً خلیج عقبہ کے سواحل پر دہانہ خلیج سے ساحل بحر احمر ارض ثمود و حجاز تک اور شمال میں شام تک پھیلا تھا۔ بنی اسرائیل سے ایک لڑائی میں ایک لاکھ بیس ہزار اہل مدین مارے گئے تھے۔ بہرحال آیت میں تکثیر سے مراد عددی طاقت اور افرادی قوت کا اضافہ ہے۔ اور مشہور مفسر قرآن زجاج نے مادی طاقت کا اضافہ بھی مراد لیا ہے۔ ان الفاظ میں دونوں کی گنجائش ہے مطلب یہ ہے کہ تمہاری تعداد کی کثرت کے ساتھ ساتھ تمہارے اسباب معیشت و تمدن میں بھی اضافہ کیا یہاں تک کہ تم اسباب و وسائل کے اعتبار سے تم اس درجے کو پہنچے جو تمہیں آج حاصل ہے۔ اسی افرادی قوت تمول اور تمدن کی ترقی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت شعیب نے فرمایا کہ انی اراکم بخیر میں تمہیں خوشحال پاتا ہوں۔ یہ خوشحالی اللہ کا انعام ہے اور اس انعام کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ خدا کے شکر گزار بنو اور زندگی کی وہ روش اختیار کرو جو خدا کے شکر گزار بندے اختیار کیا کرتے ہیں اور جو خدا کو پسند ہے لیکن تم نے اس کے برخلاف کفران نعمت اور سرکشی کی راہ اختیار کی اور خدا کی زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد مچا رہے ہو تو مفسدین کے انجام کو نہ بھولو تمہارے دائیں بائیں قوم ثمود اور قوم لوط کے کھنڈرات آثار تباہی موجود ہیں، ان سے عبرت حاصل کرو۔

ایک شبہ کا جواب

۱۱۵- اگر تم میں سے ایک گروہ اس تعلیم پر ایمان لے آیا جسے مجھے دے کر روانہ کیا گیا ہے

اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا تو صبر کرو۔ یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کردے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ یعنی جو چیز میں لے کر آیا ہوں اگر تم متفقہ طور پر قبول نہیں کرتے بلکہ اختلاف ہی کی ٹھان رکھی ہے تو تھوڑا صبر کرو یہاں تک کہ آسمان ہی سے میرے تمہارے اختلافات کا فیصلہ ہو جائے[1]

دراصل اس میں لوگوں کے اس شبہ کا جواب ہے کہ حضرت شعیب کی دعوت کے ظہور کے بعد دو طبقے پیدا ہو گئے ہیں ایک طبقہ وہ ہے جس نے دعوتِ ایمان کو قبول کر لیا ہے اور اُمتِ اجابت بن گئی۔ اور دوسرا طبقہ اُمتِ دعوت کا ہے جس نے ابھی تک حضرت شعیب کی دعوت کو قبول نہیں کیا ہے۔ دُنیا کی زندگی میں مادی اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں جماعتیں یکساں آرام و عیش میں ہیں۔ اگر نبوت سے روگردانی کوئی جرم ہوتا تو روگردانی کرنے والوں کو ضرور سزا ملتی۔ یہ سزا نہ ملنا اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں جماعتیں یکساں ہیں۔ اسی بات کے جواب میں حضرت شعیب نے فرمایا فاصبروا جلد بازی سے کام نہ لو، اللہ سبحانہ اپنے حلم و کرم سے مجرموں کو مہلت دیتے ہیں۔ تمہارا بھی یہی حال ہے۔ اگر تم اپنے انکار سے باز نہ آتے تو عنقریب منکروں پر فیصلہ کن عذاب نازل ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ مفسدین کا یہ انجام تو یقینی ہے تمہیں جو مہلت مل رہی ہے اس سے یہ نہ سمجھو کہ میری بات درست نہیں ہے۔ اللہ کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ نے اب تک جو تمہیں مہلت دے رکھی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تم میں سے ایک گروہ نے دعوتِ حق کو قبول کر لیا ہے۔ اللہ یہ چاہتا ہے کہ تم میں سے اور بھی جن میں قبول کی صلاحیت ہے وہ علیحدہ ہو جائیں۔ بس ان ہی کی خاطر تمہیں یہ مہلت مل رہی ہے۔ اس مہلت تک انتظار کرو۔ اس کے بعد اللہ سبحانہ ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرمادے گا اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

الحمد للہ پارہ ہشتم کی تفسیر میں یہ آخری سطریں قلم بند ہوئیں اس میں جو باتیں اچھی آئی ہیں وہ اللہ کی جانب سے اور جو غلط اور نادرست ہیں وہ میری کم علمی اور بے خبری کا نتیجہ ہیں۔ اللہ سبحانہ مجھے معاف فرمائے اور کتاب کا مطالعہ کرنے والوں کو اس کے نقصان سے محفوظ رکھے۔

آج مورخہ ۱۰ محرم الحرام ۱۴۰۰ھ موافق یکم دسمبر ۱۹۷۹ء بروز شنبہ بوقت ۷ بج کر ۴۵ منٹ صبح پارہ ہشتم کی تفسیر ختم ہوئی۔ رب تقبل منی انک انت السمیع العلیم۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام